الیگزنڈر سولنسٹین

گلاگ مجمع الجزائر

دفتر سوم

(حصہ پنجم، ششم اور ہفتم)

مترجم

ڈاکٹر مظفر حنفی

ناشر

نیشنل اکاڈمی

۹- انصاری مارکیٹ- دریا گنج

نئی دہلی ۲

ترتیب

ناشر
نیشنل اکاڈمی
۹۔ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲

پہلی بار : ۱۹۸۱ء
قیمت : دس روپے (عام ایڈیشن)
بیس روپے (لائبریری ایڈیشن)

Urdu *translation of*
THE GULAG ARCHIPELAGO—Volume 3
By ALEXANDER SOLZHENITSYN

پیش لفظ

اُن قارئین کے لیے جو پہلے دو دفتروں میں پیش کردہ ظلمت اور مصائب کی تفصیلات کو برداشت کرنے کی اخلاقی سکت کے حامل ثابت ہوئے ہیں، دفتر سوم آزادی اور جدوجہد کا کشادہ آسمان پیش کرے گا۔ اس جدوجہد کا راز سوویٹ حکومت ان اذیتوں اور اس غارتگرانہ بدنظمی سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ پوشیدہ رکھتی ہے، جو اس نے اپنے کروڑوں باشندوں پر نازل کی ہے۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ کمیونسٹ حکومت اس جنگ کا راز افشا ہونے سے خوف کھاتی ہے جو اس کے خلاف بے پناہ اخلاقی قوت سے لڑی گئی ہے اور جس کی ٹکر کی جنگ بہت سے ممالک نے اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں کبھی نہیں دیکھی۔ نبرد آزمائی کرنے والوں کی باطنی قوت انتہائی بلندی پر اور کشیدگی کے آخری حد تک پہنچ جاتی ہے جبکہ وہ بے بسی کی کیفیت میں ہیں اور نظام حکومت بیش از بیش سنگدلی کے ساتھ انہیں تباہ کردینے پر آمادہ ہے۔

کمیونسٹ حکومت کو ساٹھ برسوں میں تبدیل نہیں کیا جاسکا۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ اندر سے اس کے خلاف جدوجہد نہیں کی گئی یا لوگوں نے بزدلی کے تحت گھٹنے ٹیک دیے بلکہ یہ ہے کہ اس کی طاقت اتنی غیرانسانی ہے کہ ایک طرح سے مغربی ممالک ابھی اس کا تصور تک نہیں کرسکتے۔

کنسنٹریشن کیمپوں کی دنیا میں، جو سوویٹ طریق کار کی ہر شے کی طرح ریاکارانہ ہے۔ جدوجہد کا آغاز دہشت پسندانہ کارروائیوں سے ہوا (افسوس کہ اور کوئی دوسرا طریقہ اختیار نہیں کیا جاسکا) دہشت پسندی مذموم حربہ ہے لیکن معاملے میں اس بے مثال سوویٹ سرکاری دہشت پسندی کے چالیس برسوں کا نتیجہ تھا اور برائی سے برائی پیدا ہونے کی ایک شاندار مثال اس سے پتہ چلتا ہے کہ جب برائی غیرانسانی ابعاد اختیار کرلیتی ہے تو آخرش یہ لوگوں کو اس سے محفوظ رہنے کے لیے کبھی بدی کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن چھٹی دہائی کے کنسنٹریشن کیمپ کی دہشت پسندی جس سے بعدازاں جرأت مندانہ بغاوتوں کی ابتدا ہوئی، اس بائیں بازو والی انقلابی دہشت پسندی سے بنیادی طور پر مختلف تھی جو آج تمام مغربی دنیا میں تہلکہ برپا کیے ہوئے ہے۔ امتیاز یہ ہے کہ نوجوان مغربی دہشت پسندوں کو بے پناہ آزادی میسر ہے اور وہ معصوم لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں اور اپنے مبہم مقاصد کے حصول کے لیے یا مادی مفادات حاصل کرنے کے لیے بےگناہوں کو قتل کرتے ہیں۔ چھٹی دہائی کے سوویٹ کیمپوں کے دہشت پسندی نے اپنے زندہ رہنے کے حق کی حفاظت کے لیے ان لوگوں کو مارا جو مسلّمہ غدار اور مخبر تھے۔

لیکن کسی بھی نوع کی دہشت پسندی کو بیسویں صدی کا افتخار نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس کے برعکس دہشت پسندی نے اسے انسانی تاریخ کی سب سے شرمناک صدی بنادیا ہے اور اس امر کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ ہم دہشت پسندی کے سیاہ ترین دور سے گزر آئے ہیں۔

نومبر ۱۹۷۷ء
ورمونٹ

الف۔ سینن

۵

حصّہ پنجم

کٹورگا

"ہم کٹورگا (قیدِ بامشقت) کے سائبیریا کو، دست
وپابستہ سائبیریا کو، یکسر تبدیل کر دیں گے، اُسے
سوویٹ، سوشلسٹ سائبیریا بنا کر دم لیں گے"

(اسٹالن ______)

حواشی اختتام پر ملاحظہ فرمائیے۔

پہلا باب

نصیبوں جلے

انقلاب جلد بازی میں اکثر بے سوچے سمجھے کشادہ قلب بن جاتا ہے اُسے بے شمار باتوں سے چھٹکارا پانے کی عجلت کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر لفظ کٹورگا (قیدِ بامشقت) کو ہی لیجیے یوں کٹورگا لفظ تو عمدہ ہے، باوقار لفظ ہے۔ ڈی او پی آر (لازمی مشقت کا ادارہ) یا آئی ٹی ایل (مشقتی کیمپ برائے اصلاح) جیسا بے جان لفظ نہیں ہے۔ لفظ کٹورگا جج صاحبان کے منہ سے گلوٹین (چند ممالک میں سزائے موت کے مجرمین کا گلا کاٹ دیا جاتا ہے، اس مقصد کے لیے کام میں لایا جانے والا اوزار) کے پھل کی طرح نکلتا ہے لیکن مجرم کی گردن نہیں اُڑاتا اس کے بجائے اس کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دیتا ہے، اس کی تمام اُمیدوں کو عدالت میں ہی چکنا چور کر دیتا ہے۔ کٹورزا نے (قیدِ بامشقت کے مستحق) دہشت سے لبریز ایک ایسا لفظ ہے کہ دوسرے قیدی اپنے دل میں سوچنے لگتے ہیں: "یہ لوگ واقعی قاتل ہوں گے" (انسان میں ایک کمزوری ہے جو اُس کی بزدلی کی غماز ہے، یہ سوچ کر اُسے تسکین ملتی ہے کہ صرف وہی بدکار نہیں ہے، یا صرف وہی بدتر حالات کا شکار نہیں ہے) کٹورزانے لوگوں پر نمبر پڑے ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ وہ اصلاح کے امکان سے باہر جا چکے ہیں۔ مجھ پر یا آپ پر تو کوئی نمبر نہیں ڈالے گا!..... آپ پر بھی ڈالیں گے، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!)

اسٹالن قدیم الفاظ سے بڑی رغبت رکھتا تھا اُس نے یہ رمز کبھی فراموش نہیں کیا کہ قدیم الفاظ ریاست کو صدیوں تک متحد رکھنے کے لیے اہل ہیں اُس نے کچھ ایسے الفاظ پھر مروّج کیے، جنہیں تعجیل کے تحت بیکار سمجھ کر متروک کر دیا گیا تھا اور یہ کام اُس نے پروتاریوں کی کسی ضرورت کے پیش نظر نہیں کیا تھا۔ یہ لفظ تھے ... "افسر"، "جنرل"، "ڈائرکٹر"، "سپریم" اور انقلاب فروری کے بعد جسے متروک قرار دیا گیا تھا، چھبیس سال بعد اسٹالن نے اسے بھی پھر سے رائج کیا۔ اپریل ۱۹۴۳ء میں اُسے یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ اب روبہ زوال نہیں ہے۔ ہم وطنوں کو اسٹالن گراڈ میں حاصل ہونے والی عوام کی فتح کا پہلا ثمرہ یہ دیا گیا کہ ریلوے لائنوں پر فوجی طرز کا نظام نافذ کر دیا گیا (سولی دنیا بھی ایک نفیس پرانا طریقہ ہے جو فی الفور گولی مار دینے سے کہیں بہتر ہے۔ اس سے موت اطمینان کے ساتھ سست گامی سے آنے والی چیز بن جاتی ہے، جو عوام کے انبوہ کو اپنی جزئیات کے ساتھ دکھائی جا سکتی ہے) بعد میں حاصل کردہ ہر فتحیابی نے بدنصیبوں اور قسمت کے ماروں کو ہجوم در ہجوم کٹورگا میں

پایۂ تخت دار پر پہنچا دیا۔ یا پہلے کوبان اور ہون ندیوں کے جوار میں رہنے والے لوگوں کے جتھوں کو، اور پھر بائیں ساحل یوکرین اور کورسک اوریل نیز اسمولنسک علاقوں کے گروہوں کو۔ افواج کے عقب میں معدلت گستر (ٹریبیونل) آئے جنہوں نے کچھ لوگوں کو دار القضا میں ہی فراز دار پر لٹکا دیا اور باقیماندہ کو نو تعمیر شدہ کٹور گا، جبری مشقت کے کیمپوں میں پہنچا دیا۔

ان میں سب سے پہلا کٹور گا یقیناً وورکٹا کی کان نمبر ۱۷ کا کیمپ تھا (نوری لسک، وزیز کاز کان کے کیمپ اس کے کچھ ہی عرصے بعد بنے) ان کے مقصد کو چھپانے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی تھی صاف ظاہر تھا کہ کٹورزانوں کو موت کے گھاٹ اتارنا مقصود ہے۔ یہ علی الاعلان قتل گاہیں تھیں لیکن گلائف مجمع الجزائر کی روایت کیمطابق قتل ایک ضرب میں نہیں آہستہ آہستہ چھری پھیر کر کیا جاتا تھا۔ تاکہ مقتولین زیادہ عرصہ تک تڑپ سکیں اور مرنے سے پہلے کچھ کام بھی کریں۔

انہیں سات میٹر عرض اور بیس میٹر طول والے ایسے خیموں میں رکھا جاتا تھا جیسے کہ شمالی خطوں میں عام طور پر مروج ہیں یہ تختوں سے محصور ہوتے تھے اور ان پر بُرادہ پھیلایا جاتا تھا اس طرح خیمہ ایک نوع کی خستہ حال جھونپڑی بن جاتا تھا۔ سونے کے لیے اگر تختے ہوں تو یہ خیمہ اسی آدمیوں کے لیے اور اگر سونے کے لیے چبوترے بنائے گئے ہوں تو سو آدمیوں کے لیے قیام گاہ کا کام دیتا تھا لیکن ان میں بیک وقت دو سو کٹورزانے رکھے جاتے تھے۔

پھر اوسطاً رہنے کی جگہ کم رہتی یہ دراصل جگہ کے معقول استعمال کا ایک طریقہ تھا۔ کٹورزانوں کو بارہ بارہ گھنٹوں کی دو شفٹوں میں کام پر لگایا جاتا تھا اور آرام کے لیے کوئی تعطیل مقرر نہ تھی جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ سو آدمی ہمیشہ کام پر ہوتے تھے اور سو آدمی جھونپڑے میں پائے جاتے تھے۔

کام کے دوران سنتری کتوں کے ساتھ اُن کی نگرانی کرتے تھے جب جی میں آتا سنتری انہیں زدوکوب کر سکتا تھا۔ انہیں ٹامی گن کی نوک پر زیادہ محنت کے لیے مجبور کیا جاتا تھا۔ قیام گاہ کی جانب لوٹتے ہوئے انہیں بے وجہ ٹامی گن سے خوفزدہ کر کے دوڑایا جاتا تھا اور کسی کے زخمی ہوجانے پر سپاہیوں سے کسی قسم کی باز پرس بھی نہیں کی جاتی تھی کٹورزانوں کی قطاریں دُور سے ہی پہچان میں آ جاتی تھیں۔ معمولی قیدی اس طرح مایوسی اور کرب کے عالم میں گھسٹتے ہوئے نہیں چلا کرتے۔

اُن کے کام کے بارہ بیزار کن گھنٹے آخری منٹ تک پورے شمار کیے جاتے تھے۔

نوریلسک کے قطبی برفیلے طوفانوں میں سڑک کی تعمیر کے لیے پتھر نکالنے والے قیدیوں کو بارہ گھنٹے کی شفٹ میں ایک بار تازہ ہونے کے لیے دس منٹ کی مہلت دی جاتی تھی اور بعد ازاں ان کے آرام کے بارہ گھنٹوں کو بہت بھونڈے طریقے سے برباد کیا جاتا تھا۔ یہ بارہ گھنٹے انہیں ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ میں لے جانے میں، پریڈ کرانے میں اور جامہ تلاشی میں ضائع کیے جاتے تھے جائے قیام پر پہنچتے ہی انہیں فوراً خیمے میں لے جاتے تھے جس میں ہوا کی آمد و رفت کا کوئی بندوبست نہ ہوتا تھا۔ یہ حقیقتاً کھڑکیوں سے عاری جھونپڑے تھے۔ قیدیوں کو ان میں بند کر دیا جاتا تھا۔ سردیوں میں اس مرطوب ہوا میں متعفن کھٹی سڑاند اتنی تیز ہوتی تھی کہ جو شخص اس کا عادی نہ ہو، اسے دو منٹ بھی

برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ جائے قیام کٹورزان کے حق میں کام کرنے کی جگہوں سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی تھی۔ انہیں بیت الخلا شفاخانے یا باورچی خانے کی جھونپڑی تک جانے کی قطعاً ممانعت تھی ان کی ساری ضروریات فضلے کی بالٹی اور رسد کھڑکی کے وسیلے سے پوری ہوتی تھیں یہ تھا اسٹالن کا وہ کٹورگا جو ۴۴-۱۹۴۳ء میں وجود میں آیا تھا۔ یہ مشقتی کیمپوں کے بدترین عناصر اور جیلوں کے غلیظ ترین حصوں کا امتزاج تھا[۱]

آرام کے بارہ گھنٹوں میں صبح و شام کے معائنے بھی شامل تھے جن میں صرف اُن کی گنتی ہی نہیں کی جاتی تھی جیسا کہ معمولی جیکوں[*] (قیدیوں) کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ ہر لحاظ سے مکمل باضابطہ گنتی ہوتی تھی جس میں تقریباً ایک سو کٹورزانوں میں سے ہر ایک کو چوبیس گھنٹے میں دو بار اپنا مکروہ خاندانی نام (سرنیم) اپنا پہلا نام، اپنے باپ کا نام، اپنی جائے پیدائش اور سنہ، تعزیرات کی وہ دفعہ جس کے تحت اُسے سزا دی گئی ہے۔ سزا دینے والے کا نام، مُدّت اور اس کے مکمل ہونے کی تاریخ تیزی کے ساتھ اُگلنی پڑتی تھی اور باقی ماندہ ننانوے قیدی روزانہ دو بار یہ مکالمے سُنتے اور آزار سہتے تھے۔ پھر ان بارہ گھنٹوں میں دو بار غذا تقسیم کی جاتی تھی، خوراک کے کنستر کھانا کھلانے کے چھوٹے دروازے سے اندر پہنچائے اور واپس لے جائے جاتے تھے۔ کسی کٹورزانے کو باورچی خانے میں کام کرنے کی یا کھانے کے برتن ادھر سے ادھر لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ خوراک رسانی کا تمام کام چور کرتے تھے اور جس قدر ڈھٹائی اور بے دردی کے ساتھ وہ کٹورزانوں کو ٹھگ سکتے تھے اُتنے ہی آرام سے دن گزارتے تھے اور اسی قدر کیمپ کے افسران انہیں پسند کرتے تھے۔ کیونکہ جب ۵۸ (زیر دفعہ اٹھاون سزا یافتہ سیاسی قیدی) اخراجات کے کفیل ہوں تو این کے وی ڈی (روسی خفیہ پولس) اور چوروں کے مفادات یکساں ہوتے تھے۔

کیمپ ریکارڈوں کے مطابق جن کا مقصد تاریخ کے حافظے سے اس حقیقت کو محو کرنا تھا کہ سیاسی قیدیوں کو فاقہ کشی کے ذریعے بھی مارا جاتا تھا۔ انہیں کان کنوں کا اضافی راشن اور بونس غذائی اشیاء حاصل کرنے کا حق تھا۔ یہ چیزیں جو پہلے ہی بہت ناقص ہوتی تھیں۔ ان پر چوروں کے تین گروہ اپنے ہاتھ صاف کرتے تھے یہ ایک طویل عمل تھا جو کھانا کھلانے کے دروازے سے شروع ہوتا تھا۔ فرداً فرداً نام پکارے جاتے تھے اور کوپن لے کر طشتریاں دی جاتی تھیں۔ اور بالآخر جب آپ تکان سے چُور چُور ہو کر سونے کے چبوترے پر ڈھیر ہو جاتے اور غنودگی کے عالم میں ہوتے تو شِشرا ایک مرتبہ پھر گرایا جاتا اور ایک بار پھر حاضری لی جاتی اور وہی کوپن اگلے دن کے لیے ازسرِنو تقسیم کیے جاتے (عموماً جیکوں کو کوپنوں کے سلسلے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ نورمین یعنی کوئی خاص متعینہ شخص تمام کوپن حاصل کر لیتا اور انہیں باورچی خانے میں پہنچا دیتا)

اس طرح زنداں کے ان بارہ آرام کے گھنٹوں میں سے کل چار گھنٹے کسی دخل اندازی کے بغیر سونے کے لیے بچتے تھے۔

مزید برآں کنورزان کو نہ تو کوئی رقم دی جاتی تھی نہ ہی انہیں باہر سے خطوط یا چیزیں حاصل کرنے کا حق تھا (اُن کی سابقہ آزادی کی یادیں ان کے منتشر اذہان میں جو اذیت سے مملو ہوتے تھے، بالکل محو ہو جانی چاہئیں اور آخر میں 'اس بے کراں قطبی رات میں کام اور بیرکوں کے سوا کوئی بھی چیز اُن کے دماغوں میں نہیں ٹھہر سکتی تھی)

کنورزانوں پر اس طرزِ عمل کا اثر خاطر خواہ ہوتا تھا اور وہ بہ عجلت مرجاتے تھے۔

وورکٹا میں پہلے حروفِ تہجی ــــ اٹھائیس حروف* اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ملحق ایک سے ایک ہزار تک کے اعداد ـــــ وورکٹا میں مقیم ــ ۲۸۰۰۰ قیدی ایک سال کے اندر ہی لقمۂ اجل بن گئے۔

حیرت تو اس بات پر ہے کہ وہ سب ایک ماہ کے اندر ہی پیوندِ زمین کیوں نہ ہو گئے؟

نوریلسک کی کوبالٹ کان نمبر ۲ خام معدنیات کی منتقلی کے لیے ایک گاڑی روانہ کی گئی اور کچھ کنورزا نے عذابِ زیست سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے انجن کے سامنے لیٹ گئے۔ دو درجن قیدی حواس باختہ ہو کر ٹنڈرا (برفانی علاقے) کی طرف بھاگ گئے۔ انہیں طیاروں کی مدد سے تلاش کر کے گولی مار دی گئی اور اُن کی لاشوں کا انبار ایک ایسے مقام پر لگا دیا گیا جہاں کام پر جانے کے لیے قطاریں لگا کر کھڑے ہوئے لوگ انہیں دیکھ سکیں۔

وورکٹا کی کان نمبر ۲ میں ایک زنانہ کیمپ ڈویژن تھا خواتین کی پشت پر نمبر پڑے ہوتے تھے ان سب کو زیرِ زمین کام کرنا پڑتا تھا اور واقعتًا وہ وہاں مقامی ضرورت کے مقابلے میں بہت زیادہ تعداد میں تھیں۔

لیکن مجھے اپنے ہم وطنوں اور ہم عصروں کی خشمناک آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ بند کرو بکواس، یہ لوگ ہیں کون جن کا ہمدردانہ تذکرہ تم نے چھیڑ رکھا ہے؟ وہ تباہ ہونے کے ہی لائق تھے اور اُن کی بربادی مناسب بھی تھی۔ یہ لوگ غدارِ وطن، پولیزی* برگریاسٹر تھے۔ انہیں اپنی کرنی کا پھل بھگتنا پڑا۔ یقینًا تم ان سے ہمدردی نہیں برت سکتے (اگر برتتے ہو تو پھر ہمارے دائرۂ تنقید سے خارج ہو اور تمہارا معاملہ داخلی تحفظات کے محکموں کے سپرد کر دینا چاہیے) اور وہاں جو عورتیں تھیں وہ جرمنی بیڈسٹرا (ہرچند کہ بیڈسٹرا ایک پودے کا نام ہے لیکن یہاں طنزًا مقصود ہے طوائفیں، جرمنوں کے ساتھ ہم بستر ہونے والیاں) تھیں۔ مجھے عورتوں کے گریہ و بکا کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ (کیا میں مبالغے سے کام لے رہا ہوں؟ ہماری عورتیں ہی تو دیگر عورتوں کو 'جرمن بیڈسٹرا' کہا کرتی تھیں نا؟)

آجکل کا فیشن ہے شخصیت پرستی کی مذمت کرنا۔ میں اس حربے سے کام لے سکتا تھا میں کنورزا کے اسیروں کے جملہ غیر معمولی حوالوں کو استعمال کر سکتا تھا بطور مثال ـــ تین کومسومول یا نوجوان کمیونسٹ رضاکار دوشیزاؤں کا معاملہ جو ایک جنگی بمبار طیارے پر اوپر گئی تھیں لیکن فرطِ غرت میں اپنے بم نشانے پر نہیں گرا سکیں اور ایک کھلی جگہ پر بمباری کر کے اپنے اڈے پر

حفاظت کے ساتھ واپس آگئیں اور رپورٹ کی کہ ہم نے اپنا فریضہ ادا کر دیا ہے۔ بعد ازاں اُن میں سے ایک کاکوسومول ضمیر ملامت کرنے لگا اور اُس نے اپنے فضائی اسکویڈرن کی کوسومول منتظمہ کو (جو ایک دوشیزہ ہی تھی) حقیقتِ حال سے آگاہ کر دیا اور وہ منتظمہ سیدھی شعبۂ خاص میں جا پہنچی (تینوں لڑکیوں کو بیس بیس سال کا کٹھور رگا دیا گیا) میں شرم اشرم کہہ سکتا ہوں؛ یہ سوچ کر کہ ان جیسے دیانت دار سوویٹ لوگوں کو اسٹالن کی بے لگام سنک پر اخلاقی مجرمین کی طرح سزا دی جائے، اور میں غصّے کا اظہار کر سکتا ہوں ــــ اسٹالن کی من مانی پر اتنا نہیں جتنا کہ سوسولوں ــــ اور کیونسٹوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے طرزِ عمل میں ہولناک غلطیوں کی شمولیت پر مقام مسرت ہے کہ اب یہ غلطیاں دُور کر دی گئی ہیں۔

لیکن اس سوال پر گہرائی سے غور نہ کرنا نامناسب ہوگا۔

پہلے تو دو چار لفظ اپنے وطن کی عورتوں کے بارے میں ــــ جو سب جانتے ہیں کہ اب غلامی سے نجات حاصل کر چکی ہیں۔ یہ تو سچ ہے کہ وہ پہلے کے مقابلے میں دوگنا کام کرنے سے آزادی حاصل نہیں کر سکیں لیکن مذہبی مناظروں سے، معاشرتی جکڑ بندیوں سے اور ظالم ساسوں سے وہ آزاد ہو گئی ہیں لیکن ذرا خیال فرمائیے جو عورتیں یہ تصور کرتی ہیں کہ اُن کے اجسام اور اُن کے ذاتی جذبات واقعی ان کے اپنے ہیں اگر ہم انہیں مجرم اور غدّار قرار دیتے ہیں تو کیا ہم اُن کے ساتھ، کابانیخا سے بھی بدتر سلوک نہیں کرتے؟ کیا (اسٹالن سے قبل) عالمی ادب خوش فکری کے ساتھ بہانگ دُہل یہ نہیں کہہ رہا تھا کہ محبت کو ممالک کی حد بندیوں میں قید نہیں کیا جا سکتا؟ سپہ سالاروں اور سیاست دانوں کی خواہشات کے مطابق روکا نہیں جا سکتا؛ لیکن ہم نے ایک بار پھر اسٹالن کے معیار اختیار کر لیے ہیں؛ اعلیٰ ترین سوئیٹ کے احکامات کے برخلاف محبت نہیں کرنا چاہیے! تمہارا جسم سب سے پہلے مادرِ وطن کی ملکیت ہے!

آگے بڑھنے سے پیشتر ذرا غور کر لیں کہ جب یہ خواتین دشمنوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہونے کی جگہ ہمبستری کرتی رہیں تو اُن کی عمر کیا تھی؟ بہر صورت تیس سال سے کم، اکثر حالتوں میں پچیس سے زیادہ نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں بالکل بچپن ہی سے انقلاب اکتوبر کے مطابق تربیت دی گئی تھی وہ سوویٹ اسکولوں میں سوویٹ نظریات کے مطابق پروان چڑھی تھیں! تو اس طرح ہمارا غیض و غضب اپنے ہی طرزِ عمل کے خلاف تھا۔ ان میں سے کچھ لڑکیوں نے اُن باتوں کو ذہن نشین کر لیا تھا جو ہم پورے پندرہ سال سے اُن کے کانوں میں انڈیلتے آئے تھے ــــ کہ اپنا وطن نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی ــــ کہ مادرِ وطن کا تصور ایک رجعت پسندانہ بکواس ہے۔ دوسری لڑکیوں میں ہمارے مسائل، اجلاسوں اور نمائشوں کے پاکیزہ تصورات، بغیر بوسے بازی کی فلموں اور ہاتھ بھر دُور رہ کر کیے جانے والے رقص سے بیزاری پیدا ہو گئی تھی لیکن کچھ لڑکیاں مردوں کی کورٹ شپ سے متعلق حرکتوں پر ریجھ گئی تھیں یہ کورٹ شپ ہمارے پنج سالہ منصوبے کے زمانے کے نوجوانوں کو یا فرونزے کے فوجی افسروں کو کسی

نے سکھائی نہیں تھی۔ دیگر کچھ لڑکیاں صرف گرسنہ تھیں۔ ہاں بالکل لغوی معنوں میں بھُوکی۔ اُن کے پاس پیٹ کی آگ کو سرد کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا اور شاید ایک پانچواں طبقہ بھی تھا جسے اپنے عزیزوں کے تحفظ اور اپنے خاندانوں سے جُدا ہونے سے بچنے کا اور کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔

صوبہ برانیسک کے قصبہ اسٹارو ڈب میں جہاں پسپائی پر مائل فوج حال ہی میں پہنچی تھی، مجھے بتایا گیا تھا کہ شہر کو محبانِ وطن حملہ آوروں (مقبوضہ علاقے کے پیچھے مدافعت کرنے والے باشندوں) کی یلغار سے محفوظ رکھنے کے لیے وہاں کافی عرصے سے ہنگرین گیریسن (شہر کا حفاظتی دستہ) تعینات تھا۔ اُسے دوسری جگہ تبدیل کرنے کے احکامات آئے اور وہاں کی درجنوں عورتیں شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر اسٹیشن گئیں اور اُن غاصب فوجیوں کو رخصت کرتے ہوئے اشک باری کرتی رہیں۔ ایک فوجی نے طنزاً کہا کہ اس شدت سے انہوں نے اس وقت بھی گریہ نہ کیا تھا جب اُن کے اپنے شوہر جنگ پر جانے کے لیے الوداع کہہ رہے تھے۔

کچھ دن بعد فوجی ٹربیونل اسٹارو ڈب پہنچا۔ موصولہ اطلاعات کی بنا پر کارروائی کرنے سے بھلا وہ کیوں باز رہتا؟ اس نے اسٹارو ڈب کی کچھ گریہ کرنے والی عورتوں کو دور کٹا کی کان نمبر ۲ میں بھیج دیا!

لیکن ان تمام حالات کے لیے خطاکار کسے کہا جائے؟ قصوروار کون ہے؟ میں آپ ہی سے دریافت کرتا ہوں۔ وہ عورتیں؟ یا ہمارے ہم وطن اور ہم عصر۔ ہم خود۔ سب کے سب؟ ہمارے اندر ایسی کون سی خامی تھی کہ قبضہ کرنے کے لیے آئے ہوئے فوجی ہماری عورتوں کو زیادہ دل کش معلوم ہوئے؟ کیا یہ بے شمار سزاؤں میں سے ہی ایک سزا نہیں ہے جو ہمیں بیچ بیچ میں اس لیے بھگتنی پڑ رہی ہے اور ابھی عرصے تک بھگتنی پڑے گی کہ ہم نے اپنا موجودہ رویّہ بڑی عجلت میں منتخب کیا، اس پر ہم لغزیدہ گامی سے بڑھتے گئے اور پلٹ کر کبھی اپنے نقصانات پر نگاہ نہیں کی نہ کبھی دور اندیشی کے ساتھ آگے کی طرف دیکھا؟

شاید ان تمام عورتوں اور لڑکیوں کی بداخلاقی پر تنقید جائز تھی (اگرچہ انھیں بھی اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دینا چاہیے تھا) شاید ان کی بدترین تضحیک مناسب تھی۔ لیکن انھیں کٹورگا کے لیے بھیج دینا۔ قطبی سولی گھروں میں ڈال دینا؟

"لیکن انھیں تو وہاں اسٹالن نے بھیجا تھا!" اور بیریا نے؟ معاف کیجیے بھائی، لیکن بات یہ نہیں تھی۔ جن لوگوں نے انھیں وہاں بھیجا تھا، وہاں قید رکھا تھا۔ انھیں موت کے منہ میں ڈالا تھا، وہ سب سماجی بہبود کی تنظیموں میں اور — وظیفہ خواروں کے ساتھ بیٹھے ہیں اور اخلاقی معیار کو انحطاط سے بچانے کے لیے مستعدی سے نگرانی کر رہے ہیں اور بقیہ ہم لوگ؟ ہم لفظ "جرمن بیڈ" سنتے ہیں اور تائید میں سر کو جنبش دیتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ بات کہیں زیادہ خطرناک ہے کہ ہم ان تمام عورتوں کو آج تک خطاکار گردانتے ہیں۔ بہ نسبت اس کے کہ وہ سب کبھی اندر تھیں۔

"اچھا خیر لیکن کم از کم مردوں کو مناسب وجوہ کی بنیاد پر قید کیا گیا تھا! وہ اپنے وطن کے ساتھ اپنے طبقے کے ساتھ غداری کے مرتکب ہوئے تھے۔"

یہاں بھی ہم اختلاف کر سکتے ہیں، ہم یاد دلا سکتے ہیں (یہ سراسر حقیقت ہوگی) کہ عادی مجرم یقیناً خاموشی سے بیٹھے نہیں گئے اور ٹربیونل اور رسن و دار کا انتظار نہیں کرتے رہے وہ بہ عجلت مغربی ممالک کی طرف چلے گئے اور ان میں سے بہت سے نکل بھاگے اور ادھر ہمارے محکمہ پولس نے مینے جیسے معصوم لوگوں کو حراست میں لے کر اپنے لیے مقررہ تعداد کی تکمیل کرلی (اس کام میں ہمسایوں کی مذمت اور الزام تراشیوں سے بڑی معاونت ملی) فلاں فلاں شخص نے اپنے یہاں جرمنوں کو پناہ دی تھی۔ ان لوگوں نے کس وجہ سے انھیں اتنا پسند کر لیا تھا؟ کسی دوسرے نے سلیج (کتوں والی گاڑی) پر جرمنوں کے لیے گھاس ڈھوئی تھی ــــ صاف بات ہے کہ اس نے دشمن کے ساتھ تعاون کیا تھا۔

تب ہم سارے معاملے کو معمولی بات کہہ سکتے ہیں، پھر سارا الزام اسٹالن پرستی کی لہر پر ڈال سکتے ہیں۔ زیادتیاں تو ہوئی تھیں لیکن اب ان کی تلافی کر دی گئی ہے۔ سب بالکل معمول پر آگیا ہے۔

لیکن بات چونکہ ہم نے شروع کی ہے۔ اس لیے آگے کی کیفیت بھی ملاحظہ ہو۔ اسکول کے اساتذہ کا کیا حشر ہوا؟ ان اساتذہ کا جنھیں ہماری افواج نے گھبراہٹ کے عالم میں پسپا ہوتے ہوئے ان کے اسکولوں اور طلبہ سمیت قسمت کے حوالے کر دیا تھا؟ دو سال تک اور شاید تین سال تک بھی۔ کوارٹر ماسٹر (فوج میں فوجیوں کے لیے رہائش اور رسد کے لیے ذمہ دار افسر) احمق ثابت ہوئے تھے اور جنرل بھی اچھے نہیں تھے۔ ان حالات میں اساتذہ کیا کرتے؟ اپنے طلبہ کو پڑھاتے یا نہ پڑھاتے؟ اور بچے اب کیا کرتے۔ وہ پندرہ سال کے لڑکے نہیں تھے، کہ جو مزدوری کر لیتے یا گوریلا دستوں میں بھرتی ہو جاتے۔ چھوٹے چھوٹے بچے تھے، اپنی تعلیم مکمل کرتے یا سپہ سالار اعظم کی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے دو یا تین سال تک بھیڑ بن کر رہتے! بات یہ ہے کہ اگر باپ تمھیں کان ڈھانکنے کے لیے ٹوپی نہیں دیتے تو اپنے کانوں کو برف بن جانے دو۔

کسی وجہ سے ایسے حالات ڈنمارک، ناروے، بلجیم یا فرانس میں کبھی پیدا نہیں ہوئے ان ممالک کو اپنی ہی بے وقوف سرکار کے طفیل یا بے قابو حالات کی مجبوری کے تحت جرمن اقتدار کی سپردگی میں دی جانے والی قوم کی پراگندگی کا تجربہ نہ ہوا۔ ان ممالک میں اسکول اس طرح چلتے رہے جس طرح ریلیں یا مقامی حکومتیں۔

اوسط سے کسی کے (یقیناً ان کے) دماغ ۱۸۰ درجہ مختلف تھے کیونکہ ہمارے وطن میں اساتذہ کو گمنام خطوط کثر محبانِ وطن کی طرف سے ملتے تھے: "خبردار! بچوں کو تعلیم دینے کی ضرورت نہیں ہے، تمھیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا! ریلوں پر کام کرنا بھی دشمن کے ساتھ تعاون کے

مترادف ہو گیا۔ مقامی حکومت میں حصہ لینا تو بغاوت ہی تھا۔ جس کی تعزیر کی حد مقرر نہ تھی۔
ہر شخص جانتا ہے کہ جو بچہ ایک بار اسکول سے ناطہ توڑ لیتا ہے پھر اس کا وہاں پلٹنا آسان نہیں ہوتا۔ صرف اس وجہ سے کہ ماضی، حال اور مستقبل کے اور دنیا بھر کے سب سے عظیم سیاستدان اور تمام اقوام کے رہنما (اسٹالن کو زمانۂ جنگ میں سرکاری پروپیگنڈا اس حیثیت سے پیش کرتا تھا) نے ممانعت کر دی تھی۔ اس لیے گھاس کو اس وقت تک مرجھائی رہنے دو۔ جب تک وہ اسے نہ ہٹلے، کیا وہ بڑھ سکتی تھی؟ اس اثنا میں بچوں کو تعلیم دی جانی چاہیے تھی یا نہیں؟
ظاہر ہے کچھ نہ کچھ قیمت تو چکانی ہی ہوگی۔ بڑی بڑی مونچھوں والے کی تصاویر اسکولوں سے ہٹانی ہوں گی بچے سالِ نو کی جگہ کرسمس کے موقع پر کرسمس کے درخت کے ارد گرد جمع ہوں گے اور اس تقریب پر (نیز انقلاب اکتوبر کی سالگرہ کے بجائے کسی متعینہ شاہی تقریب کے دن) صدر مدرس کو شاندار نئی زندگی کے بارے میں تقریر کرنی ہوگی، خواہ واقعتاً حالات کتنے ہی ناگفتہ بہ ہوں لیکن ایسی ہی تقاریر ماضی میں بھی کی گئی تھیں اور اس وقت بھی حالات اتنے ہی ناگفتہ بہ تھے۔
ورنہ پھر پہلے آپ کو کافی مکار بننا پڑتا تھا۔ طلبہ کو اور زیادہ جھوٹی باتیں بتانی پڑتی تھیں کیوں کہ وقت گزرنے کے ساتھ یہ جھوٹی باتیں پختہ ہو چکی تھیں اور ان نصابات کا پوری طرح حصہ بن گئی تھیں جو تدریسی طریق کار کے ماہروں اور معلموں نے سخت جانفشانی کے ساتھ کافی غور و خوض کے بعد تیار کیے تھے۔ ہر سبق میں خواہ یہ بات متعلق ہو یا نہ ہو۔ خواہ آپ جانداروں کی جسمانی ساخت کے بارے میں پڑھ رہے ہوں یا مرکب جملوں میں حروفِ جار کا استعمال سیکھ رہے ہوں، آپ کو خدا کے تصور سے روگردانی کرنی ہوگی (خواہ آپ خود خدا کے وجود پر یقین رکھتے ہوں)، آپ کو ہماری بے کراں آزادی کی ثناخوانی کرنی ہوگی (خواہ آپ خفیہ پولس کی آمد کے خوف سے رات بھر بیدار رہے ہوں)، خواہ آپ کلاس کو تر گنیف کی تخلیق سنا رہے ہوں یا اپنے رولر سے دریائے نیپر کے بہاؤ کی راہ کا تعین کر رہے ہوں، لیکن آپ کو افلاس زدہ ماضی کی مذمت اور ہماری موجودہ خوش حالی کی توصیف میں نغمہ سرائی کرنی ہوگی (حالاں کہ آپ نے اور ان بچوں نے بہت پہلے سارے کے سارے گاؤں کو فاقہ کشی نے مبتلا دیکھا ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ شہروں میں ایک بچے کا راشن تین سو گرام۔ ہے)
ان میں سے کوئی بھی بات خلاف حقیقت، بچے کے ضمیر کو غلیظ کرنے والی، روح القدس (عیسائی عقیدے کے مطابق خدا) کے تئیں گناہ میں شمار نہیں کی جاتی تھی۔
لیکن اب، عارضی اور تاحال غیر مستحکم غاصب حکومت میں، مقابلتاً بہت کم جھوٹ بولنے پڑتے تھے لیکن وہ پرانی کذب بیانیوں کا پردہ فاش کر دیتے تھے۔ دشواری یہی تھی۔
اس لیے مادرِ وطن کی آواز اور رودپوشس پارٹی کمیٹی کی پنسل بچوں کو ان کی مادری زبان جغرافیہ، ریاضی اور سائنس سکھانے کی مخالف تھیں۔ اس قسم کے کاموں کی سزا تھی۔ بیس سال کے لیے کٹھور گا۔

کامریڈ ہم وطنو! تائید میں سروں کو جنبش دو۔ دیکھو اپنی اپنی بالٹیاں لیے ہوئے وہ بیرکوں کی طرف مارچ کر رہے ہیں اور کتے لیے ہوئے پہرے داران کے ساتھ ہیں۔ انھیں سنگسار کرو۔ انھیں نے تمھارے بچوں کو تعلیم دی تھی۔

لیکن میرے عزیز ہم وطنو! (بطور خاص امتیازی اختیارات کے حامل سرکاری محکموں کے سابق کارکنوں۔ جو پینتالیس سال کی عمر میں پنشن حاصل کر کے سبکدوش ہو گئے ہیں گھونسے تان کر میری سمت بڑھو یہ کون لوگ ہیں جن کا میں طرف دار ہوں ؟ وہی تو جنھوں نے برگوماسٹروں (میونسپل کمیٹیوں کے صدر) کی حیثیت سے جرمنوں کی خدمت کی تھی۔ گاؤں کا مکھیا بن کر پولیز میلٹی (پولس) کی شکل میں، ترجمان کی صورت میں ان کی معاونت کی تھی۔ ہر طرح کی غلاظت اور کثافت کے پلندے۔

لیکن خیر ـــــ کچھ اور ژرف نگاہی سے کام لیں۔ ہم نے لوگوں کو کسی قاموس کے اندراجات کی طرح دیکھ کر سخت نقصان کیا ہے خواہ ہمیں یہ بات پسند ہو یا ناپسند لیکن مستقبل ہمیں ان کے رویوں کے اسباب پر غور کرنے کے لیے ضرور مجبور کرے گا۔

جب انھوں نے" ایٹ لوبل ایچ "(انقلاب سے پیشتر روس کا قومی ترانہ) بجانا اور گانا شروع کیا تو کسی کی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ محسوس نہیں ہوئی ؟ ہمارا فطری حب وطن جس پر سالہاسال سے پابندی عائد تھی، جسے لوگوں کو ڈرا کر دبا دیا گیا تھا، جو ہدف تنقید تھا، قابل تضحیک بن گیا تھا، یک لخت بے لگام کر دیا گیا۔ اسے بڑھاوا دیا جانے لگا۔ مقدس کہہ کر اس کی تعریف کی جانے لگی، اس وقت کسی روسی کا دل نہیں لرزا، اتحاد کی خواہش مشکور سے پھول نہیں گیا۔ فطرتاً ہم کشادہ قلب لوگوں نے غیر ملکی قصابوں کو قریب آتے دیکھ کر ہم وطن قصائیوں کو ان کی تمام سنگ دلی فراموش کر کے معاف کیوں نہیں کر دیا ؟ بعد ازاں اپنی فطری کشادہ قلبی کے بارے میں اپنی نیم شعوری غلط فہمیوں کو فراموش کرنے کا مسئلہ درپیش ہوا جس کے زیر اثر ہم لوگ ایک اور سطح سے پرجوش انداز میں غداروں کو مغلظات سنانے لگے جو واضح طور پر ہم سے بہت خراب اور ناقابل معافی لوگ تھے۔

روس گیارہ صدیوں سے موجود ہے، بہت سے دشمن دیکھ چکا ہے اور کئی جنگوں سے گزر چکا ہے لیکن کیا روس میں بہت سے غدار ہوئے ہیں ؟ کیا غدار ہجوم کی شکل میں وطن چھوڑ کر کبھی گئے ہیں ؟ میرے خیال سے نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ روسیوں کے دشمنوں نے بھی کبھی ان پر غداری، غیر وفاداری اور عقیدے تبدیل کرنے کا الزام عائد نہیں کیا۔ ہر چند کہ وہ معمولی محنت کش عوام سے عناد رکھنے والی حکومتوں میں رہتے تھے۔

اس کے بعد بہترین منصفانہ معاشرتی نظام رکھنے والے اس ملک میں ہماری تاریخ کا سب سے زیادہ مقدس زمانۂ جنگ آیا۔ اور ہمارے لاکھوں لوگ غداروں کی حیثیت سے سامنے آئے ـــــ

وہ سب کہاں سے آئے ؟ اور کیوں آئے ؟

اغلباً جنگِ عظیم کی دبی ہوئی آگ پھر بھڑک اٹھی تھی؟ شاید یہ وہ سفید (انقلاب کے مخالف) لوگ تھے جو موت کے منہ سے بچ گئے تھے؟ نہیں جناب! میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ بہت سے مخالفین انقلاب نے جو روس سے ہجرت کر گئے تھے (جن میں بدترین معتوب دینیکن بھی شامل تھا) سوویٹ یونین کا ساتھ دیا تھا اور ہٹلر کی مخالفت کی تھی۔ انھیں اپنا راستہ منتخب کرنے کی آزادی تھی اور انھوں نے آزادانہ اس رویے کا انتخاب کیا تھا۔ٰ

یہ لاکھوں لوگ۔ پولیزیٹی (پولس) اور جلاد، گاؤں کے کھیا اور ترجمان۔ تمام کے تمام معمولی سوویٹ شہری تھے اور ان میں بہت سے بچے تھے جو اب انقلاب کے بعد بالغ ہوئے تھے۔

انھوں نے کس وجہ سے ایسا کیا؟ وہ کس قسم کے لوگ تھے؟

زیادہ تر ان میں وہ لوگ تھے جو خود اپنے کنبوں سمیت تیسری اور چوتھی دہائی کے زمانے میں مسلسل مظالم کا شکار ہوئے تھے۔ وہ لوگ جن کے والدین، اقربا اور اعزا ہمارے غلیظ نظام کی منجدھار میں غرقاب ہو گئے تھے یا پھر وہ لوگ تھے جو متعدد بار غرق ہوئے اور جد و جہد کر کے کیمپوں میں اور جلاوطنی کے مقامات پر اوپر ابھر آئے۔ وہ لوگ جنھیں یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ پارسل (قیدی کے گھر سے ارسال کردہ سامان) وصول کرنے کی کھڑکی پر بے حس اور مفلوج پیروں کے ساتھ قطار میں کھڑے رہنے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں ان سنگین دہائیوں میں دنیا کی بیش قیمت ترین شے خود مادرِ زمین سے، سنگدلی کے ساتھ منقطع کر دیا گیا تھا ـــــ ہر چند کہ، ۱۹۱۷ء کے عظیم فرمان (ڈگری) کے وسیلے سے انھیں اس زمین پر رہنے کا حق دیا گیا تھا اور اس کی خاطر انھیں خانہ جنگی کے دوران اپنا خون دینے پر رضامند کیا گیا تھا (سوویٹ افسروں نے کشادہ مقامات پر جو عالیشان محلات اور ماسکو کے نواح میں وسیع و عریض بنگلے خرید لیے اور ان کی بابت وصیتیں کر گئے وہ دوسری بات ہے چونکہ وہ ہمارے ہیں اس لیے سب ٹھیک ہے) پھر کچھ لوگوں کو گیہوں یا رائی کی بالیاں توڑتے ہوئے حراست میں لیا گیا تھا۔ اور کچھ لوگوں کو اپنے پسندیدہ مقامات پر رہائش کے حق سے محروم کر دیا گیا تھا (آج کسی کو یاد نہیں رہا کہ ہم نے دستکاروں پر کیسی بے رحمی کے ساتھ مظالم کیے تھے)

آج ایسے تمام لوگوں کو (بطورِ خاص پیشہ ور انقلابیوں اور اوکتیابر* جریدے کے پرولتاری مصنفین کے نگراں دستے) کو تنفر کے ساتھ ہونٹ بچکا کر سوویٹ حکومت کے مخالفین۔" ماضی کے پسماندہ لوگ" ــــ "ماضی کے قلاقوں کی نسل"۔ "سوویٹ اقتدار سے خفیہ عناد رکھنے والے افراد" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

وہ ایک بات کہتا ہے اور دوسرا سر ہلا کر اس کی تائید کرتا ہے جیسے اس طرح بات کی وضاحت ہو جاتی ہو۔ جیسے عوامی حکومت کو اپنے باشندوں کی توہین کرنے کا حق پہنچتا ہو، جیسے یہ کسی حقیقی خامی یا برائی کی بنیاد ہو۔" دیسی لوگ"۔" پوشیدہ مخالفت کرنے والے"۔

اور کوئی بھی چیخ کر یہ دریافت نہیں کرتا کہ تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو۔ لعنت ہے تمھاری گستاخی پر۔ تم یہ تسلیم کرتے ہو یا نہیں کہ شعور، وجود کا پابند ہوتا ہے۔ یا یہ بات صرف اسی وقت

ہی تسلیم کرتے ہو جب یہ تمھارے حق میں جاتی ہو اور جب یہ تمھارے موافق نہ پڑتی ہو۔ اس وقت کیا اس کی صداقت ختم ہو جاتی ہے؟

اور پھر ہم میں سے بعض لوگ اکثر کہہ دیتے ہیں اور ہمارے چہروں پر لمحہ بھر کے لیے افسردگی طاری ہو جاتی ہے: "ہاں کچھ غلطیاں ہوئی تو تھیں۔" ہمیشہ وہی سادہ سا معصوم معروضی جملہ! "ہوئی تھیں۔" بس، یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ غلطیاں کس سے سرزد ہوئی تھیں۔ آپ اطمینان سے فرض کر سکتے ہیں کہ یہ غلطیاں عام مزدوروں نے، باربرداروں نے، اجتماعی کھیت مزدوروں نے کی ہوں گی کسی میں یہ کہنے کا حوصلہ نہیں کہ یہ غلطیاں پارٹی نے کی تھیں، ہمارے ان رہنماؤں نے کی تھیں جنھیں تبدیل نہیں کیا جا سکتا اور جو غیر ذمہ دار ہیں۔ پھر یہ غلطیاں ان لوگوں کے علاوہ کر بھی کون سکتا تھا۔ جن کے ہاتھوں میں اقتدار تھا؟ سارا بہتان اسٹالن پر منڈھ دیں؟ اگر یہ تمام غلطیاں اسٹالن سے سرزد ہوئی تھیں تو آپ لوگ سرکاری منصوبوں پر فائز لاکھوں اشخاص اس وقت کہاں تھے؟

جو بھی ہو یہ غلطیاں ہماری نظر میں دھندلی ہو کر ایک ہلکا سا معمولی دھبہ بن گئی ہیں اور اب انھیں حماقت، ناعاقبت اندیشی اور بدنیتی کا نتیجہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ وہ تمام غلطیاں اس مسلمہ غلطی کے اندر سما گئی ہیں کہ کمیونسٹوں نے کمیونسٹوں کو جیل میں ڈال دیا۔ اور ڈیڑھ پونے دو کروڑ کسان برباد ہو گئے تباہی کا سامنا کرنے کے لیے جلاوطن کر دیے گئے، ملک میں چاروں طرف منتشر کر دیے گیے، اور والدین کو یاد کرنے کے جرم میں انھیں ان کا نام لینے کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی غلطی نہیں تھی کہ وہ محض شیخی بگھار رہے تھے۔ انھوں نے ہٹلر سے نبرد آزما ہونے کے لیے کوئی تیاری نہ کی تھی کہ وہ بے حیائی کے ساتھ پسپا ہوئے۔ اور فرار ہوتے ہوئے اپنے نعرے بدلتے رہے، کہ صرف آئیوان نے مقدس روس کے لیے جنگ کرتے ہوئے جرمنوں کو وولگا پر روکا۔ یہ سب احمقانہ اور ہولناک غلطیاں نہیں تھیں۔ یہ تو اسٹالن کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔

دو ماہ کے اندر ہی ہم اپنی آبادی کا تقریباً ایک تہائی حصہ دشمن کے چنگل میں چھوڑ کر بھاگ آئے، ان میں وہ تمام خاندان شامل تھے جو مکمل طور پر تباہ نہیں کیے جا سکے تھے۔ وہ کیمپ شامل تھے جن میں کئی ہزار قیدی موجود تھے اور جو پہرے داروں کے فرار ہوتے ہی سب کے سب اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تھے اور ان میں یوکرین اور بالٹک ریاستوں کی وہ جیلیں بھی شامل تھیں جن میں سیاسی قیدیوں کو بیک وقت گولی مار دینے کے بعد فضا اب تک بارود کے دھوئیں سے آلودہ تھی۔

جب تک ہم طاقتور تھے ہم نے اپنے بدقسمت معتوبین پر مظالم توڑے، انھیں حراست میں لیا۔ روزگار سے محروم کیا انھیں گھروں سے نکالا اور جلد از جلد قبر کے منہ تک پہنچا دیا۔ جب ہماری کمزوریاں طشت از بام ہو گئیں تو ہم نے فوراً یہ مطالبہ کیا کہ وہ اپنے سارے نقصانات کو بھول جائیں اپنے والدین اور اولاد کو فراموش کر دیں۔ جو شنڈرا (برفانی علاقے) میں فاقوں سے مر گئے پھانسیوں کو بھول جائیں۔ یہ فراموش کر دیں کہ ہم نے انھیں کیسے تباہ کیا۔ ان کے ساتھ کی جانے والی ساری "عنایتوں" کو فراموش کر دیں، این۔ کے۔ وی۔ ڈی (سوویٹ خفیہ پولس) کی پر تشدد تفتیش اور

زدوکوب کو بھول جائیں۔ کیمپوں کی فاقہ کشی کو یاد نہ رکھیں —— اور فی الفور محبانِ وطن گوریلا یا پارٹیزن دستوں میں شامل ہو جائیں اور اپنی زندگی کا لحاظ رکھے بغیر مادرِ وطن کی حفاظت کے لیے پیوندِ زمین ہو جائیں (ہمیں بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے! اور یہ امید کسی نے نہ دلائی کہ جب ہم واپس آئیں گے تو ہم ان کے ساتھ مختلف رویہ اختیار کریں گے، اب ان کا تعاقب نہیں کریں گے، انہیں پریشان نہ کریں گے، جیلوں میں نہیں ٹھونسیں گے، گولیوں کا نشانہ نہیں بنائیں گے۔

ایسی صورتِ حال میں کیا ہمیں اس امر پہ تعجب ہونا چاہیے کہ جرمنوں کی آمد پر لوگوں کی کثیر تعداد نے انھیں خوش آمدید کہا یا اس بات پر حیرت کرنی چاہیے کہ خوش آمدید کہنے والوں کی تعداد اتنی کم کیوں تھی، (جرمن بعض اوقات وسیلۂ انصاف بن سکتے تھے: ان اشخاص کے انجام کو مدِ نظر رکھیے جنھوں نے سوویٹ اقتدار میں مخبری کا فریضہ انجام دیا تھا۔ مثلاً ایک شاعر نے نیبریزنو۔ نکولسکایا چرچ میں وہاں کے منتظم افسر کو گولی مار دی تھی —— اور ایسے درجنوں واقعات تھے۔

اور مذہبی لوگوں کی حالت! مکمل بیس برسوں تک مذہبی عقائد کو کچلنے کی کوشش کی گئی اور چرچ بند کر دیے گئے۔ جرمنوں کی آمد کے ساتھ ہی چرچ کے دروازے وا ہو گئے۔ (ہمارے آقاؤں کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ جرمنوں کے پسپا ہو جانے کے فوراً بعد وہ انھیں دوبارہ بند کر سکیں) مثال کے طور پر ڈان کے ساحلی شہر روسٹوف میں کلیساؤں کے باقاعدہ کھل جانے کے بعد عوام نے بڑے پیمانے پر جشن منعقد کیا تھا اور بڑا ہجوم اکٹھا ہوا تھا۔ کیا اس کے باوجود وہ جرمنوں پر دشنام طرازی کرتے۔

روسٹوف ہی میں جنگ کے ابتدائی ایام میں ایک انجینیر الگزنڈر پیٹر وایچ۔ ایم —— کو گرفتار کیا گیا اور وہ دورانِ تفتیش ایک کوٹھڑی میں دم توڑ گیا۔ کئی ماہ تک اس کی بیوی بھی اپنی گرفتاری کے خیال سے خوفزدہ رہی۔ جرمنوں کی آمد کے بعد ہی اس کے دل و دماغ کو سکون نصیب ہوا "کم از کم اب میں کچھ دیر سو سکتی ہوں"۔ کیا وہ اب سونے کی جگہ اپنے ایذا دہندگان کی واپسی کی دعائیں مانگتی!

مئی ۱۹۴۳ء میں، جب جرمن ونتسا میں تھے۔ پوڈلینایا اسٹریٹ پر (جس کے چہار جانب شہری سوویٹ نے ۱۹۳۹ء کی ابتدا میں ایک بلند فصیل ایستادہ کر دی تھی۔ اور اسے عوامی خود حفاظتی کے شعبے کے تحت "محفوظ علاقہ" قرار دیا تھا) ایک باغ میں کھدائی کے دوران لوگوں نے دیکھا کہ وہاں قبریں برآمد ہو رہی ہیں۔ جو اوپر گھاس اگ آنے کی وجہ سے پہلے نظر نہ آتی تھیں۔ انھیں ۳۹ عدد اجتماعی قبریں ملیں جو ساڑھے تین میٹر گہری تین میٹر چوڑی اور چار میٹر لمبی تھیں۔ ہر قبر میں انھیں پہلے مردہ اشخاص کے کپڑوں کی ایک تہہ ملی اور پھر لاشیں رکھی ہوئی تھیں جن میں سے ایک کا سر پہلے تھا پھر دوسرے کے پیر اور پھر یہی ترتیب آخر تک نظر آئی۔ تمام لاشوں کے ہاتھ رسی سے بندھے ہوئے تھے اور ان سب کو سر کے پچھلے حصے میں چھوٹے بور کی پستولوں سے گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ ظاہر تھا کہ انھیں جیل میں مارا گیا تھا۔ اور رات کو دفن کر دیا گیا تھا۔ جو کاغذات سڑنے سے بچ گئے تھے

ان سے علم ہوتا تھا کہ یہ لوگ کون تھے جنھیں ۱۹۳۸ء میں بیس سال کی سزا دی گئی تھی اور دورانِ اسیری وہ خط و کتابت کے حق سے محروم تھے۔ پلیٹ نمبر ۷ پر کھدائی کے مقام کی ایک تصویر ہے۔ ونتسا کے باشندے لاشیں دیکھنے یا اپنے عزیز داروں کو شناخت کرنے آئے ہیں۔ ابھی اور لاشیں باقی تھیں جون میں انھوں نے پیروگوف اسپتال کے باہر آرستوڑ اکس قبرستان کے نزدیک مزید کھدائی شروع کی اور ۴۲ دیگر قبریں پھر ملیں۔ بعد ازاں ثقافتی پروگراموں اور تفریح کے لیے تعمیر کردہ گورکی پارک کے نزدیک کھدائی کا کام شروع کیا گیا۔ یہاں جھولوں، شراب گھروں، تفریح گاہ، رقص گاہ اور کھیل کود کے مقامات کے نیچے ۱۴ مزید اجتماعی قبریں ملیں۔ یہ عالم تو صرف ونتسا میں تھا اور لاشیں اچانک ہی نظر آ گئی تھیں۔ دوسرے شہروں میں کتنی لاشیں کامیابی کے ساتھ چھپی پڑی ہیں؟ ان لاشوں کو دیکھنے کے بعد کیا عوام سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ لپک کر پارٹیزن یا بے ضابطہ فوجی دستوں میں شامل ہو جائیں گے؟

غالباً انصاف کا تقاضا یہ ہوگا کہ ہم کم از کم اتنا تو تسلیم کریں کہ جب ہمیں اور ہماری عزیز اشیا کو پامال کیا جاتا ہے۔ اس وقت اگر آپ کو اور مجھے کوفت ہوتی ہے تو انھیں بھی کم تکلیف نہ ہوتی ہوگی جنھیں اس طرح کچلا گیا تھا۔ شاید یہ انصاف کی بات ہوگی کہ ہم آخر کار یہ تسلیم کریں کہ جن لوگوں کو تباہ و برباد کرنے کی ہم سعی کرتے ہیں انھیں اس عمل سے نفرت کرنے کا حق حاصل ہے۔ یا انھیں ایسا کوئی حق حاصل نہیں؟ کیا ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اظہارِ تشکر کرتے ہوئے مر جائیں؟

ہم ان پولیز پیٹی (پولس) ان برگوماسٹروں (میونسپلٹیوں کے صدر) پر بہتان تراشتے ہیں کہ انھیں خواہ نسلی تعصب نہ ہو۔ لیکن شدید عناد ضرور ہے لیکن یہ عناد خود ہم نے ان میں پیدا کیا۔ وہ ہمارا ہی تیار کردہ فضلہ تھے۔ کرائیلنکو کا یہ قول کیسا ہے: "ہماری نگاہ میں ہر گناہ ایک خاص معاشرتی نظام کا نتیجہ ہے۔"[۵]

کامریڈو! اس عالم میں اپنے معاشرتی نظام کا اپنا ہی یہ اصول فراموش نہ کرو!

ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے جن ہم وطنوں نے ہمارے خلاف تلوار اٹھائی، یا زبانی ہماری مخالفت کی ان میں سے کچھ لوگ واقعتاً اس کام میں قطعی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ ان کی کوئی املاک ضبط نہیں کی گئی تھی (ان کے پاس کوئی جائیداد تھی ہی نہیں) انھیں کبھی کسی کیمپ میں مقید نہیں رکھا گیا (نہ ان کے عزیز داروں کو قید میں رکھا گیا تھا) لیکن بہت پہلے وہ ہمارے سارے نظام سے بیزار ہو چکے تھے؛ لوگوں کو ان کے عقائد کی بنا پر معتوب قرار دینا؛ وہ لن ترانی کہ "ایسا کوئی ملک نہیں جہاں لوگ اتنی آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں!" پرستاروں کا رہنماؤں کے سامنے سربسجود ہونا، ہر شخص کا سرکاری قرض حاصل کرنے کے لیے گھبراہٹ میں جلدی جلدی پنسل سے دستخط کرنا! فرمائشی تالیوں کی آواز کا بڑھتے بڑھتے غیر مقدمی شور میں تبدیل ہو جانا! کیا ہم یہ محسوس نہیں کر سکتے کہ نارمل اور صحت مند لوگ ہماری متعفن فضا میں کسی طرح

سانس نہیں لے سکتے تھے؟ (فادر فیوڈر ظوریا کے الزام دہندگان نے ان سے دریافت کیا تھا کہ جب رومانیہ کے لوگ ان کے ساتھ تھے تو انھوں نے اسٹالن کی بدکاریوں کا تذکرہ چھیڑنے کی جرأت کیسے کی؟" میں آپ کے بارے میں کوئی دوسری بات کہہ بھی کیسے سکتا تھا؟" ان کا جواب تھا۔" میں نے ان سے صرف وہ بات کہی جو میرے علم میں تھی میں نے انھیں وہی بتایا جو واقعی سچ تھا۔" ہم جو کچھ کرنے کی ہدایت کرتے ہیں وہ اس سے مختلف ہے۔ کذب بیانی کرو، اپنے ضمیر کے خلاف عمل کرو، موت کو لبیک کہو۔ یہ طریقِ کار اسی وقت تک جاری رہ سکتا ہے جب تک ہمارے حق میں مفید ہے۔ لیکن اگر میں غلطی نہیں کرتا تو اسے مادہ پرستی کہنا مشکل ہے۔

ستمبر ۱۹۴۱ء فوج میں بھرتی سے قبل اپنی اہلیہ کے ساتھ میں بچوں کے اسکول میں استاد تھا اور ہم نے موروزوفسک (جس پر اگلے برس جرمن قابض ہوگئے) کی بستی میں ابھی کام شروع ہی کیا تھا۔ یوں ہوا کہ ہم نے جس جگہ مکان کرائے پر لیا وہیں ایک لاولد میاں بیوی برونیوتسکی بھی رہتے تھے۔ نکولائی گیراسیووچ برونیوتسکی ایک ساٹھ سالہ انجینئر تھا وہ چیخوف کا سا چہرہ رکھنے والا بہت نرم مزاج، خوش دل اور ذہین آدمی تھا۔ اب میں اس کے چہرے کو یاد کرتا ہوں تو اس کا تصور پنس نز (ناک پر چپکنے والا بغیر فریم کا چشمہ) کے بغیر نہیں کر سکتا۔ حالانکہ ایسی عینک اس نے کبھی استعمال نہ کی ہو۔ بیوی شوہر سے بھی زیادہ پرسکون اور خوش شکل خاتون تھی جس کے سن جیسے بال چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے تھے۔ وہ اپنے شوہر سے ۲۵ سال چھوٹی تھی لیکن اپنے رویے سے جوان نہیں لگتی تھی۔ ہمارا ان سے بڑا انس تھا اور وہ لوگ بھی غالباً ہمیں چاہتے تھے۔ خاص طور پر ہمارے لالچی مالک مکان اور اس کے حریص کنبے کے مقابلے میں۔

شام کو ہم چاروں ڈیوڑھی کے زینوں پر آ بیٹھتے۔ وہ پرسکون، مطمئن، اور نرم چاندنی والی شامیں ہوتی تھیں۔ جو تاحال طیاروں کی گھڑگھڑاہٹ اور بموں کے دھماکوں سے آشنا نہیں ہوئی تھیں لیکن جرمنوں کی پیش قدمی کے خدشات ہمارے حواس پر اسی طرح طاری ہوتے جا رہے تھے جس طرح نادیدہ بادل ننھے سے غیر محفوظ ماہتاب کو بے نور کرنے کے لیے دودھیا آسمان پر چپکے سے پھیل جاتے ہیں۔ روزانہ اسٹالن گراڈ کی طرف جانے والی گاڑیوں میں بھرے ہوئے پناہ گزیں اسٹیشن پر رکتے تھے۔ یہ پناہ گزیں اس بستی کے بازار کو افواہوں اور دہشت ناک افسانوں اور سو روبل کے نوٹوں سے بھر دیتے تھے۔ جیسے ان کی وجہ سے ان کی جیبوں میں سوراخ ہو رہے ہوں۔ اور پھر وہ اپنے اگلے سفر پر روانہ ہو جاتے تھے۔ وہ ان شہروں کے نام بتاتے تھے جو سپر انداز ہو چکے تھے اور ان کے بارے میں سرکاری محکمہ اطلاعات جو عوام کو سچ بتانے سے گریز کرتا تھا۔ آئندہ کافی عرصے تک خاموش رہے گا۔ (برونیوتسکی ان شہروں کے بارے میں یہ نہیں کہتا تھا کہ وہ سپر انداز ہو گئے بلکہ کہتا تھا ان پر قبضہ کر لیا گیا)

ہم زینے پر بیٹھے ہوئے محو گفتگو تھے، ہم نوجوان لوگ اپنی بابت سوچ رہے تھے اور اپنے مستقبل کی فکروں میں غلطاں تھے لیکن ہمارے پاس کہنے کے لیے اس سے زیادہ فراست والی اور

کوئی بات نہ تھی جو اخباروں میں درج تھی۔ ہم بروئیونسکی خاندان کے ساتھ گھل مل گئے تھے اور جو سوچتے تھے وہ کہہ دیتے تھے اور واقعات کے مشاہدے میں اپنے اور ان کے نقطۂ نظر کی تفریق کو بالکل ملحوظ نہ رکھتے تھے۔

وہ غالباً ہمیں دو بھولے بھالے پُرجوش نوجوانوں کے حیرت انگیز نمونے کے طور پر دیکھتے تھے ہم نے ابھی ۴۰-۱۹۳۰ء کی دہائی کا تجربہ ہی کیا تھا اور عین ممکن تھا کہ ہم اس دہائی میں زندہ ہی نہ بچتے انھوں نے ہم سے دریافت کیا تھا کہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۹ء کے بارے میں ہمیں کون کون سی باتیں اچھی طرح یاد ہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا ہم نے جواباً کیا کہا ہوگا؟ یونیورسٹی کی لائبریری امتحانات، کھیل کود سے متعلق سفر، رقص، تفریحی موسیقی کے پروگرام اور عشقیہ کارناموں کا لطف — ہم محبت کرنے کی عمر میں تھے۔ لیکن کیا اس وقت ہمارے کسی پروفیسر کو معزول نہیں کیا گیا تھا ہاں ہمارا خیال ہے دو یا تین معزول کیے گئے تھے، ان کی آسامیاں سینئر لیکچراروں سے پُر کر دی گئی تھیں۔ اور طلبہ کے حالات کیا تھے؟ کیا ان میں سے کسی کو حراست میں لیا گیا تھا؟ ہمیں یاد آیا کہ کچھ سینئر طالب علم جیل گئے تھے۔ اور آپ نے اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا؟ کچھ بھی نہیں۔ ہم نے اپنے رقص و سرود کے پروگرام جاری رکھے اور تمھارے کسی رشتہ دار کو کبھی بھی چھیڑا نہ گیا؟ نہیں کسی کو نہیں۔

یہ ایک ہولناک بات ہے اور میں اسے بالکل حقیقی رنگ میں سنانا چاہتا ہوں۔ یہ بات اس لیے اور بھی ہولناک ہے کہ میں عنفوانِ شباب میں رقص و سرود میں محو رہنے والوں میں سے نہیں تھا نہ ہی ان کتابی کیڑوں میں سے تھا جو ہر وقت مطالعے اور فارمولوں میں مصروف رہتے تھے۔ دس سال کی عمر سے ہی سیاست میں میری گہری دلچسپی رہی، اپنے لڑکپن میں بھی جب میرا سبزہ آغاز بھی نہ ہوا تھا میں دشنسکی پر اعتماد نہیں کرتا تھا اور ان مشہورِ زمانہ مقدمات کی فریب کاری سے حیرت زدہ ہوا تھا — لیکن ماسکو کے ان حقیر مقدمات (جو اس وقت اتنے گرانڈیل نظر آتے تھے) کا تعلق اس ہمہ گیر پھیلنے والے پیمانے سے نہ جوڑ سکا۔ جو ہمارے ملک میں چل رہا تھا۔ (اس کا شکار ہونے والوں کی تعداد کی طرف ہماری توجہ کبھی مبذول نہ ہو سکی) میں نے اپنا بچپنا قطاروں میں کھڑے ہو کر گزارا تھا۔ روٹی کے لیے، دودھ کے لیے، آٹے کے لیے، (گوشت کا تو اس وقت نام و نشان بھی نہ تھا) لیکن میں روٹی کی قلت اور دیہات کی بربادی کے درمیان ربط نہ قائم کر سکا یا یہ نہ سمجھ سکا کہ ایسا کیوں ہوا؟ ہمیں ایک اور نقطہ سمجھایا گیا تھا "عارضی دشواریاں"۔ جس بڑے شہر میں اقامت گزیں تھے۔ اس میں رات کے ہر گھنٹے میں لوگوں کو جیل پہنچایا جا رہا تھا۔ لیکن میں رات میں سڑکوں پر نہیں گھومتا تھا۔ اور دن کے وقت گرفتار شدگان کے خاندان سیاہ جھنڈیاں نہ لگاتے تھے اور نہ میرے ہم جماعت اپنے والدوں کی حراست کے بارے میں کوئی لفظ کہتے تھے۔

اخباروں کے مطابق مطلع غبار آلود نہیں تھا۔ اور نوجوانوں کا پُرجوش لہو یہ سب کچھ ٹھیک سمجھنے پر آمادہ تھا۔

اب میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ برونیوتسکی خاندان کے لیے کوئی بات ہمیں بتانا کتنا دشوار تھا لیکن اس معترا انجینئر نے اپنے ماضی کی ایک جھلک ہمیں دکھائی۔ وہ اوگپو* (سوویٹ داخلی تحفظ کی ایجنسی) کے ایک انتہائی سفاکانہ وار کا شکار ہوا تھا۔ جیل میں اس کی صحت تباہ ہو گئی تھی۔ اسے ایک یا دو بار گرفتار کیا گیا تھا۔ وہ کئی کیمپوں سے واقف تھا۔ لیکن انتہائی غیض میں صرف وزیز کازگان کے ابتدائی ایام کی باتیں ہی کرتا تھا، تانبے سے زہرآلود پانی کے بارے میں مسموم ہوا کے بارے میں، قتل کی وارداتوں کی بابت، ماسکو شکایتیں بھیجنے کے کارِ فضول سے متعلق۔ وزیز کازگان لفظ سے جسم میں جھرجھری آجاتی ہے جیسے جسم پر ریگمال گھِس دیا گیا ہو یا جیسے بربریت کے افسانے سن لیے ہوں لیکن پھر بھی کیا اس وزیز کازگان کا ہمارے دنیا کو سمجھنے کے طریق کار پر کچھ اثر پڑتا تھا یہ ازخود محسوس کرنے کی چیز ہے۔ اس کے بارے میں کچھ نہ سوچنا ہی بہتر ہے، اسے بھول جانا ہی اچھا ہے!)

وزیز کازگان میں جہاں برونیوتسکی کو نظر بند علاقے سے باہر جانے کی اجازت تھی، اس کی موجودہ بیوی، جو اس وقت کم سن لڑکی تھی، اس کے نزدیک آئی تھی۔ اور وہیں ان کی شادی ہوئی تھی جس کا شاہد کانٹے دار تار تھا۔ جب جنگ کا آغاز ہوا تو کسی معجزے کے زیرِ اثر وہ موروز فسک میں آزاد تھے البتہ ان کے پاسپورٹوں پر سیاہ نشانات ثبت تھے۔ وہ کسی بے تکی تعمیری ایجنسی میں کام کر رہا تھا اور اس کی بیوی کلرک تھی۔

میں فوج میں چلا گیا اور میری اہلیہ موروزوفسک سے رخصت ہو گئی۔ اس بستی پر جرمن قابض ہو گئے۔ بعد ازاں اسے آزاد کرایا گیا اور ایک دن مورچے پر مجھے اپنی بیوی کا مکتوب ملا جس میں لکھا تھا "کیا تم باور کرو گے، وہ کہتے ہیں کہ جب جرمنی موروزوفسک میں تھے۔ اس وقت برونیوتسکی نے ان کے لیے بحیثیت برگوماسٹر خدمات انجام دی تھیں۔ کیسی ذلیل حرکت ہے؟ مجھے بھی اتنا ہی صدمہ پہنچا" کتنا گندہ کام تھا۔ میں نے سوچا۔

لیکن کچھ برس اور گزر گئے۔ کسی تاریک جیل میں سونے کے لیے بنے ہوئے تختے پر دراز دل ہی دل میں مختلف باتوں پر غور کرتے ہوئے۔ مجھے برونیوتسکی کی یاد آ گئی۔ اور اس وقت میں نوعمر لڑکوں کی طرح اپنے آپ کو اونچا سمجھنے والا آدمی نہ تھا۔ انھوں نے بے انصافی کی تھی اور اسے ملازمت سے علیحدہ کر دیا تھا۔ اسے ایسا کام تفویض کیا گیا تھا جو اس کی حیثیت سے بہت حقیر تھا، اسے جیل میں ڈالا گیا تھا۔ ایذائیں پہنچائی گئی تھیں۔ تھوکا رکھا گیا تھا، اس کے منہ پر تھوکا گیا تھا۔ آپ اس سے اب کیا توقع رکھتے ہیں۔ اس سے یہ ماننے کی امید کی جاتی تھی کہ یہ سب ترقی کی قیمت ہے اور یہ کہ اس کی اپنی مادی اور روحانی زندگی کی، اس کے اقربا کی زندگیوں کی، ہماری ساری قوم کی مشتعل زندگیوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

شخصیت پرستی کے دھندلے پردے سے، جو باریک اور ناکارہ تھا۔ زمانے کی ان درمیانی پرتوں میں جن میں ہم تبدیل ہو گئے ہیں۔ اور جن میں سے ہر ایک کا رہنا ایک اپنا نکیلا انعکاسی زاویہ ہے

ہم نہ تو اپنے آپ کو نہ چوتھی دہائی کو صحیح سیاق و سباق میں دیکھ پاتے ہیں۔ اسٹالن کو دیوتا بنا دینے والی بے پناہ اور مستحکم عقیدت ہمارے عوام کی خاصیت نہ تھی بلکہ صرف پارٹی اور کومسومول کی خصوصیت تھی۔ اسکولوں اور دانش گاہوں کے شہری نوجوانوں کی خصوصیت تھی بے مغز دانشوروں کی خصوصیت تھی (جو ان لوگوں کے منصبوں پر فائز تھے جنھیں ختم کر دیا گیا تھا، یا منتشر کر دیا گیا تھا۔ اور کچھ حد تک شہروں کے پیٹی بورژوا (محنت کش طبقہ) کی خصوصیت تھی۔ ان کے لاؤڈ اسپیکر علی الصبح اسپاسکی بلغرائی سے ابتدا کر کے نیم شب میں انٹرنیشنل بجانے تک چیختے رہتے تھے اور ان کے لیے ریڈیو اناؤنسر لیویٹن* کی صدا ضمیر کی آواز بن گئی تھی۔ (میں کچھ حد تک، اس لیے کہتا ہوں کیونکہ، بیس منٹ لیٹ، فرمان اور مزدوروں کو ان کے کارخانوں سے پختگی کے ساتھ متعلق کر دینے والے مزدور قوانین کا حامی کوئی بھی نہیں تھا) پھر بھی چند کروڑ لوگ ہوں گے، جو کبھی اس اقلیتی طبقے سے تعلق رکھتے تھے جس کی تعداد بہت کم تھی۔ ان میں کبھی نہ کبھی تھوڑی بہت جرأت آجاتی تھی۔ اور وہ ریڈیو کا پلگ باہر کھینچ لیتے تھے۔ ہر اخبار کے ہر صفحے پر انھیں جھوٹ کے طومار نظر آتے تھے اور ان کروڑوں لوگوں کے لیے ووٹ دینے کا دن انتہائی کوفت اور ذلت کا دن ہوتا تھا۔ اس اقلیتی طبقے کے لیے ہمارے وطن میں رائج تانا شاہی کی حیثیت نہ تو بورژوائی تھی نہ ہی قومی، اور (جو لوگ لفظ سوویٹ کے اصل معنوں کو سمجھتے ہیں ان کے لیے) سوویٹ بھی نہ تھی، ان کے لیے یہ ایک دیگر اقلیتی طبقے کی، چھین جھپٹ کر اقتدار حاصل کرنے والے مٹھی بھر لوگوں کی حکومت تھی جو اخلاق و تہذیب سے دور کا واسطہ بھی نہ رکھتی تھی۔

بنی نوع انسان غیر جانبدارانہ اور معروضی انداز میں سوچنے سے تقریباً عاری ہے۔ جس بات کو انسان برا تصور کرتا ہے اس میں اچھائی کا ایک پہلو بھی ہوتا ہے یہ بات اس کی سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ ہماری زندگی میں سبھی باتیں بری نہ تھیں، اخباروں کا ہر لفظ جھوٹ نہیں تھا لیکن اس اقلیتی طبقے کو جو پسماندہ دہشت زدہ اور مخبروں کا مارا ہوا تھا، ہمارے وطن کی ساری چیزیں سرتا سر نفرت انگیز محسوس ہوتی تھیں۔ وہ اخباروں کے ایک ایک لفظ کو جھوٹ سمجھتا تھا۔ یاد رکھیے کہ ان دنوں مغربی ممالک سے روسی زبان میں نشریے جاری نہ ہوتے تھے (اور ذاتی ریڈیو سیٹوں کی تعداد معدودے چند تھی) اس طرح شہری ہمارے اخبارات سے اور سرکاری ریڈیو سے ہی اطلاعات حاصل کر سکتا تھا۔ جس سے بردنیوتسکی اور اس کی نوع کے لوگ ذاتی تجربے کی بنا پر جانتے تھے کہ جھوٹی اور جھنجھلاہٹ پیدا کرنے والی خبریں نشر ہوتی ہیں۔ دیگر ممالک کی بابت ۱۹۳۰ء میں مغرب کے لازمی انحطاط کے بارے میں، مغربی کمیونسٹوں کی غداری کے بارے میں فرانکو کی تمام اسپین کی طرف سے اشتعال انگیز مخالفت کے بارے میں (یا ۱۹۴۲ء میں ہندستان کی آزادی کے لیے نہرو کے باغیانہ ارادوں کے بارے میں، جس سے ہمارے دوست برطانوی سامراج کی قوت کم ہوتی تھی) تمام باتیں جھوٹ ثابت ہوئیں۔ جنونی کیفیت میں مبتلا کر دینے والی یکسانیت کا حامل پروپیگنڈہ، جو اس اصول کے تحت کیا جا رہا تھا کہ "جو ہماری موافقت نہیں کرتا وہ ہمارا

مخالف ہے" اور اس میں ماریا اسپریہ دنوفا اور نکولس ثانی کے یومیلوم اور ہٹلر کے۔ برطانوی پارلیمانٹ اور جرمن رائخشٹیگ (مجلس شوریٰ) کے رویوں کے درمیان کبھی تفریق نہیں کی جاتی تھی۔ اس لیے جب برونیوتسکی جرمن چوراہوں پر کتابیں جلانے کے محض تخئیلی محسوس ہونے والے واقعات اور قدیم ٹیوٹونک بربریت جیسے حالات کے رونما ہونے کی بابت پڑھتا تھا (ہمیں یہ ہرگز نہ بھولنا چاہیے کہ پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں زارشاہی پروپیگنڈے میں ٹیوٹن بربریت کی بابت کچھ کذب بیانی کی گئی تھی) اس وقت اس سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی تھی کہ وہ بقیہ تمام حالات سے ہٹ کر ان واقعات کو دیکھ سکے گا۔ جرمن نازی ازم کو جس کی خدمت اس پرزور انداز میں کی گئی تھی جس میں پہلے پوئنکارے، پلسوودسکی اور برطانوی شدت پسندوں اور قدامت پرستوں کی گئی تھی) اس درندے کی شکل میں پہچان سکے گا جو انسانی صورت اختیار کر کے گزشتہ ربع صدی سے اس کا خون چوس رہا تھا اس کے وجود میں زہر گھول رہا تھا۔ پنجوں سے اسے نوچ رہا تھا اور اس کے ساتھ سارے مجمع الجزائر کو، اس روسی شہر کو، روسی گاؤں کو لہولہان کر رہا تھا پھر اخبارات ہٹلر پرستوں کے بارے میں اپنے خیالات ہمیشہ تبدیل کرتے رہتے تھے، اوّل اوّل مکار پولینڈ میں شریف پہرے داروں کے درمیان دوستانہ تصادم کی بات کہی گئی اور فرانسیسی نیز انگریز بیگروں کا مقابلہ کرنے والے دلیر سپاہیوں کے لیے ہمدردی کا اظہار کیا گیا ایک بار پراودا کے پورے صفحے پر ہٹلر کی تقریر حرف بحرف شائع کی گئی۔ اس کے بعد ایک دن صبح (جنگ کے دوسرے دن) اخباروں کی شاہ سرخیاں کچھ اس طرح نظر آئیں ــــ تمام یورپ نازیوں کے پیروں تلے قابلِ رحم حالت میں کراہ رہا ہے ــــ اس سے اس امر کی تصدیق ہوتی تھی کہ ہوا کے رخ کے ساتھ اخبارات کی کذب بیانی بدل جاتی تھی اور وہ برونیوتسکی کو یہ باور نہ کرا سکے کہ دنیا کے دوسرے قصائی بھی ہمارے ہی جیسے ہیں کیوں کہ وہ ان کے بارے میں حقیقت سے آگاہ تھا۔ اگر کسی نے بی بی سی (برٹش براڈکاسٹنگ کارپوریشن) کے خبرنامے روزانہ اس کے سامنے پیش کر کے اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کی ہوتی تو اسے زیادہ سے زیادہ اس بات کا یقین دلایا جا سکتا تھا۔ کہ ہٹلر روس کے لیے خطرہ نمبر ۲ تھا۔ لیکن بی بی سی کا کوئی بلیٹن نشر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سوویٹ محکمۂ اطلاعات اسے اس کے یوم پیدائش سے ہی ٹاس سے زیادہ لائقِ اعتماد نہیں سمجھتا تھا۔ جلاوطنوں (لوگ جرمنوں کی یلغار والے علاقے خالی کر کے آ رہے تھے) کے توسط سے آنے والی افواہیں ظاہر ہے کہ براہِ راست ملنے والی خبریں نہیں تھیں (جرمنی سے یا جرمن مقبوضہ علاقوں سے تا حال کوئی زندہ شہادت نہیں آئی تھی) جو کچھ اسے براہِ راست معلوم تھا وہ تھا دریز کا زگان کا کیمپ، ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۲-۳۳ء کا قحط سالی، علاقوں کی تباہی اور چرچ کی بربادی۔ انجام کار جب جرمن افواج قریب آ پہنچیں تو برونیوتسکی (اور اس کی طرح کے لاکھوں تنہا لوگوں نے) محسوس کیا کہ ان کا وقت آ گیا ہے وہ وقت جس کی انھوں نے بیس سال قبل امید ترک کر دی تھی، جو انسان کو صرف ایک بار ہاتھ آتا ہے اور پھر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر ہماری زندگی کو تاریخی پیمانے سے ناپا جائے تو یہ بہت ہی قلیل ہوتی ہے ایسا وقت جس میں انسان ان تمام باتوں کی مخالفت کر سکتا ہے جو اس پر نازل ہوئیں، جو مصیبتیں اس کے اقربا پر توڑی گئیں۔ کوڑے مار مار کر اور کچل کچل کر اس کے اعزا کو انھیں برداشت

کرنے پر مجبور کیا گیا' وہ اب بھی اپنے غمزدہ وطن کی کچھ تا حال غیر واضح انداز میں خدمت کر سکتا ہے' روس میں کسی نوع کی عوامی زندگی کے احیاء میں معاون ہو سکتا ہے۔ ہاں برونیوتسکی نے یہ سب کچھ یاد رکھا تھا اور کسی بھی بات کو فراموش نہیں کیا تھا۔ وہ اس حکومت کو کسی بھی طرح قبول نہیں کر سکتا تھا جس نے بے رحمی کے ساتھ روس کو دھن کر رکھ دیا تھا۔ اسے اجتماعی طور پر قلاش بنا دیا تھا۔ اخلاقی زوال کا شکار بنا دیا تھا۔ اور ایک حیران کن فوجی شکست کی منزل تک پہنچایا تھا۔ مجھ جیسے بے شمار شریف لوگوں کو دیکھ کر فرطِ غضب میں اس کا دم گھٹنے لگتا تھا کیوں کہ ہمارے نظریات کو تبدیل کر لینا اس کے بس میں نہ تھا۔ وہ اسٹالن کی جگہ کسی اور کے خواہ وہ کوئی ہو' برسرِ اقتدار آنے کا منتظر تھا! (انتہائی صورتوں کے ردِ عمل کا مشہور نفسیاتی واقعہ؛ جس بدل کرنے والی حقیقت سے ہم دوچار ہیں اس کی جگہ کچھ اور آ جائے۔ کیا ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں ہمارے حکمرانوں سے بدتر حکمران ہو سکتے ہیں؟ برسبیلِ تذکرہ یہ سب کچھ ڈان ندی کے ساحلی علاقے میں ہوا جہاں کی نصف آبادی بے قراری کے ساتھ جرمنوں کا انتظار کر رہی تھی) اس طرح برونیوتسکی نے جو تمام عمر سیاست سے بیگانہ رہا تھا' اپنی ساتویں دہائی میں ایک سیاسی کام کرنے کا ارادہ کیا۔

اس نے شہر موبدنعسک کی میونسپل کمیٹی کی صدارت قبول کر لی.....

میرا خیال ہے وہاں اسے جلد ہی جان لینا چاہیے تھا کہ اس نے اپنی ذات کو کتنی احمقانہ صورتِ حال میں مبتلا کر لیا ہے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ نو وارد لوگوں کے لیے روس ان لوگوں سے بھی زیادہ حقیر اور قابلِ نفرت تھا جو وہاں سے چلے گئے تھے — کہ آسیب کو صرف روس کے خون کی ضرورت تھی۔ خواہ اس کا جسم گل کر تباہ ہو جائے۔ نئے برگوماسٹر (میونسپلٹی کے صدر) کا کام عوامی جذبات سے لبریز روسیوں کی ذمہ داریاں قبول کرنا نہیں تھا' اس کا کام تو یہ تھا کہ جرمن پولس کے مددگار روسیوں کی ذمہ داری سنبھالے لیکن اب وہ چکر میں پھنس چکا تھا اور گردش کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکتا تھا۔ خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند۔ جلادوں کے ایک گروہ سے آزادی حاصل کر کے اب اسے دوسرے گروہ کی مدد کرنی ہوگی۔ حب الوطنی کے خیال کو جسے وہ سوویٹ نظریات کی ضد سمجھتا تھا اب اچانک اس نے ان دونوں کو لازم و ملزوم پایا' کسی نامحسوس طریقے سے حب الوطنی کا جذبہ اقلیتی طبقے سے' جس نے اسے جزوِ جاں بنا رکھا تھا' اس طرح خارج ہو گیا جیسے چھلنی سے پانی نکل جاتا ہے۔ اور یہ جذبہ اکثریتی طبقے میں سرایت کر گیا اس بات کو بھلا دیا گیا کہ لوگوں کو حب الوطنی کے جرم میں گولیوں کا نشانہ بننا پڑا تھا اور محبانِ وطن کی کس طرح توہین کی جاتی تھی۔ الغرض یہ جذبہ اب کسی دوسرے درخت کا تنا بن گیا تھا۔

اسے اور اس کی طرح کے دوسرے لوگوں کو یقیناً احساس ہو گیا ہوگا کہ وہ دلدل میں پھنس گئے ہیں۔ اور وہ ضرور خوف زدہ ہوئے ہوں گے۔ راستہ تنگ ہو گیا تھا اور صرف وادیٔ فنا یا کلوارگا کی جانب لے جاتا تھا —

ظاہر ہے وہ سب برونیوتسکی نہ تھے اور بہت سے اقتدار پسند اور خوں آشام گدھ مصیبت کے ان ایام میں عارضی طور پر موج اڑانے کے لیے جواں ہو گئے ہوں گے لیکن اس قسم کے لوگ تو جہاں لقمہ تر نظر آئے یکجا ہو جاتے ہیں۔ وہ این۔ کے۔ وی۔ ڈی (سوویٹ خفیہ پولس) کے ساتھ بھی گھل مل گئے تھے۔ ایسا ہی ایک

شخص ماموبوف تھا یا دودنسک میں اینٹونوف تھا یا پوٹی سوئی شاپکا تھا ـــ کیا ان سے بدتر جلاّدوں کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے (ملاحظہ ہو دفتر دوم) پھر بھی وہ کئی دہائیوں تک جاری رہے اور انھوں نے سیکڑوں مرتبہ عوام کا خون نچوڑا۔ ہم ابھی وارڈ رنشکاح سے ملاقات کریں گے، یہ ان لوگوں میں سے تھا جو دونوں فریقوں میں جگہ بنا لیتے ہیں۔

ہم شہروں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے ہیں۔ لیکن دیہاتوں کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ آج کل لبرل غیراقدامائی خیالات کے لوگ اکثر دیہاتوں کی سیاسی بے خبری اور توہم پرستی کے لیے ان کی مذمت کرتے ہیں لیکن قبل از جنگ گاؤں کا ہر آدمی یا اکثر لوگ متوازن اور معقول شہریوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ متوازن اور معقول ہوتے تھے۔ وہ فادر اسٹالن کو دیوتا بنانے میں قطعی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ (ظاہر ہے، کہ انقلابِ عالم جیسے مسائل کے لیے بھی ان کے پاس وقت نہ تھا) دیہات سیدھے سادے طور پر اپنے ہوش و حواس میں تھے اور انھیں بخوبی یاد تھا کہ کیسے انھیں زمین عطا کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا اور پھر زمین ان سے چھین لی گئی تھی۔ اجتماعی کاشت کے نظام سے پہلے اور بعد میں وہ کس طرح زندگی بسر کرتے تھے اور کھاتے پہنتے تھے، کس طرح بچھڑے، بھیڑیں اور مرغیاں بھی کسان کے باڑے میں نہیں رہنے دی گئیں، کس طرح کلیساؤں کو غارت کیا گیا۔ اور انھیں ناپاک کیا گیا۔ ۱۹۴۱ء میں بھی، ریڈیو کی گنگناہٹ کسانوں کے جھونپڑوں میں نہیں سنائی دیتی تھی اور ہر گاؤں میں یہ حالت نہ تھی کہ ایک آدمی بھی اخبار پڑھنے کے لائق ہو جس کے نتیجے میں روس کے دیہاتوں کے لیے وہ تمام چانگستولن، میکڈونالڈ اور ہٹلر یکساں طور پر اجنبی اور فضول سے عام انسان تھے۔

۴ر جولائی ۱۹۴۱ء کو صوبہ رائزان کے ایک گاؤں میں لاہو ربھٹی کے پاس کسان اجلاس کی ایک تقریر سننے کے لیے یک جا ہوئے جو لاؤڈ اسپیکروں سے نشر کی جا رہی تھی۔ وہ فولادی انسان جو تا حال روسی کسانوں کی آہ و زاری سے بے گانہ رہا تھا اب ایک ناکارہ بڈھے کی طرح اشکباری کر رہا تھا اور جیسے ہی اس کا پُرفریب لہجہ "بھائیو اور بہنو!" لاوڈ اسپیکر سے سنائی دیا ویسے ہی ایک کسان نے لاؤڈ اسپیکر کو جواب دیا "حرام زادے! تجھے اس کی ضرورت ہے" اور ساتھ ہی اس نے لاؤڈ اسپیکر کی سمت روسیوں میں مروّج ایک بھونڈا اشارہ کیا جس میں ایک ہاتھ سے دوسرے کی کلائی پکڑ کر ہاتھ کو پمپ کے دستے کی طرح اوپر نیچے ہلاتے ہیں۔

تمام موجود کسان قہقہے لگانے لگے۔

اگر ہم پر قصبے میں عینی شاہدوں سے استفسار کریں تو ایسے دس ہزار واقعات کا علم ہوگا جن میں سے کچھ مذکورہ بالا واقعے سے زیادہ کاٹ دار ہوں گے۔

جنگ کے آغاز میں روسی دیہات کا موڈ یہ تھا اور یہی موڈ ان ریزرو فوجیوں کا تھا جو آخری ادھا چڑھا کر اپنے عزیز و اقربا کے ساتھ ڈھول میں رقص کرتے ہوئے، راستے کے کسی موڑ پر کسی گاڑی کے منتظر تھے ان سب سے بالاتر نصف روسی تاریخ کی ایک عبرت ناک شکست، جس میں وسیع دیہاتی علاقے، جو دونوں راجدھانیوں کے قریب تک اور دولگا تک پھیلے ہوئے تھے اور جن میں لاکھوں کسان آباد تھے۔ کولخوز (اجتماعی یا سرکاری نظامِ کاشت) کے حلقۂ اثر سے آزاد ہو گئے اور ـــ کیوں کذب بیانی کرتے ہو، اور تاریخ پر حسن کا ملمع چڑھاتے ہو؟ ثابت یہ ہوا کہ جمہوریتیں صرف خودمختاری کی طلب گار تھیں! اگر نووارد ین

اتنے بدمست اور بے حس نہ ہوتے، اگر ان لوگوں نے عظیم جرمنی کی سہولت کے لیے نوکر شاہی کو ل خود نظام حکومت قائم نہ کیا ہوتا، اگر روس کو ایک نوآبادی میں تبدیل کر دینے کی مذموم کوشش نہ کی ہو؟ اور ہمیں روسی کمیونزم کی ۲۵ ویں سالگرہ منانے کی کبھی ترغیب نہ دی جاتی (کبھی نہ کبھی کوئی ہمیں ضرور مطلع کرے گا کہ جرمن مقبوضہ علاقوں میں کس طرح کسان اپنی ذاتی خواہش سے پارٹیزن (گوریلا) تحریکوں میں شامل نہیں ہوئے۔ اور کس طرح ابتدا میں انھوں نے اپنا اناج اور مویشی سونپ دینے کی جگہ ہم وطن گوریلا فوجیوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے تھے)

کیا آپ کو جنوری ۱۹۴۳ء میں شمالی کاکیشس سے ہونے والی وسیع ہجرت یاد ہے اور کیا آپ کو عالمی تاریخ میں اس نوع کی کسی دوسری ہجرت کا علم ہے! غیر فوجی آبادی اور مزید برآں کاشتکار آبادی کسی مغلوب غنیم کے ساتھ، غیر ملکی افواج کے ساتھ چلی جائے اور ان مفتوحین کے ساتھ نہ رہے جو ہم وطن تھے۔ تاحدِّ نظر جنوری کی ہولناک برفانی ہواؤں میں مال گاڑیاں گھڑگھڑاتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔

ان لاکھوں رضاکار فوجیوں کی معاشرتی جڑیں بھی یہیں تھیں جو ہٹلر کے شیطان بن جانے پر بھی اتنے بدحواس ہو چکے تھے کہ انھوں نے دشمن کی فوجی وردیاں پہن لیں۔ وقت آ چکا ہے کہ جب ہمیں غدر ِ ولاسوف* کے موقع پر ایک مرتبہ پھر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہیے۔ اس کتاب کے دفتر اول میں قارئین پوری سچائی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے (نہ مکمل صداقت کا میں امین ہوں۔ اس موضوع پر، جو میرے لیے کم اہم نہیں، خصوصی مقالات لکھے جائیں گے اور وہاں ابتدا میں جب ابھی قارئین کیمپوں کی دنیا کی شاہراہوں اور پگڈنڈیوں پر میرے ہمراہ گامزن نہ ہوئے تھے، انھیں متنبہ کیا گیا تھا، سوچنے کی دعوت دی گئی تھی اب تمام جیل گاڑیوں، عارضی زندانوں، لکڑی چیرنے والے قیدیوں کے گرد ہوں اور کیمپ قید خانوں کے بعد شاید قارئین میری بات کو تسلیم کرنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ ہوں گے۔ دفتر اول میں میں نے ان ولاسوف فسادیوں کا تذکرہ کیا تھا جنھوں نے ہر طرف سے مایوس ہو کر اسلحے سنبھال لیے تھے کیوں کہ وہ کیمپوں میں فاقہ کشی کر رہے تھے اور ان کی زندگی ہر قسم کی امیدوں سے عاری ہو چکی تھی۔ (لیکن یہاں بھی بحث و تمحیص کی گنجائش ہے۔ ابتدا میں جرمنوں نے روسی اسیرانِ جنگ کو مورچے کے عقبی حصے میں صرف غیر فوجی کاموں میں اپنے فوجیوں کے مددگار کے طور پر استعمال کیا۔ آپ سوچیں گے کہ ان لوگوں کے لیے بہترین حل یہی تھا جو اپنی جان بچانا چاہتے تھے — پھر انھوں نے ہتھیار کیوں اٹھا لیے اور سرخ فوج سے براہِ راست برسرِ پیکار کیوں ہو گئے!) لیکن اب چوں کہ اور زیادہ معلق رکھنا مناسب نہیں، اس لیے کیا میں بھی ان لوگوں کا ذکر نہ کروں جن کی ۱۹۴۱ء سے پیشتر بھی صرف ایک ہی تمنا تھی — ہتھیار سنبھالنا اور ان سرخ (کمیونسٹ) کمیساروں (اعلیٰ افسروں) چیکسٹوں (خفیہ پولس) اور اجتماعی کاشت کے افسروں کو گولی مارنا۔ لینن کے الفاظ یاد کیجیے "جو پسماندہ طبقہ اسلحہ حاصل کرنے اور انھیں استعمال کرنے کی تربیت لینے کا خواہش مند نہیں ہوتا اس کے ساتھ غلاموں کی طرح برتاؤ کرنا حق بجانب ہے:" (چوتھا ایڈیشن، جلد ۲۳، صفحہ ۸۵) اس لیے اگر جنگ روس و جرمن سے یہ ظاہر ہوا کہ ہم ویسے غلام نہیں جیسا کہ لبرل مورخین کی تمام تصانیف حقارت کے ساتھ ہمیں پیش کرتی ہیں۔ تو کیا عجب ان لوگوں میں غلامی کا جذبہ کہاں تھا، جنھوں نے بابا اسٹالن کا سر قلم کرنے کے لیے تلوار بلند کی تھی؟ اور دوسری طرف ان میں بھی

غلامی کا جذبہ کہاں تھا جنھوں نے سرخ فوج کی لمبی وردیاں پہن کر پہلی بار اپنی کمر سیدھی کی۔ یہ آزادی کا
(جس کا تصور سماجی علوم کا کوئی طالب علم قبل ازیں نہیں کر سکتا تھا)
عجیب سا مختصر وقفہ تھا۔
یہ لوگ جن کے سروں سے کمیونسٹ راحت کے چوبیس سال گزر چکے تھے، ۱۹۴۱ء تک اس بات
سے واقف تھے جو دنیا میں اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کرۂ ارض پر آج تک کی تاریخ میں اس سے زیادہ
ظالم، خون کی پیاسی اور ساتھ ہی فریبی اور دغاباز حکومت کوئی دوسری نہیں گزری۔ جتنی کہ بالشویک حکومت جو
اپنے آپ کو سوویٹ سرکار کہتی تھی۔ کہ دنیا کی کوئی بھی دوسری حکومت، جتنے لوگوں کو اس نے موت کے گھاٹ
اتارا اس تعداد کے لحاظ سے گستاخی کے اعتبار سے، اس کی خواہشات کے ناکارہ پن کے اعتبار سے، مکمل اور ہمہ گیر
اقتدار کل کے اعتبار سے اس کے مساوی نہیں کہی جا سکتی حتیٰ کہ اس کے شاگرد ہٹلر کی حکومت بھی نہیں جس نے اس
وقت مغرب کی آنکھوں کو بے نور کر دیا تھا کہ اسے اور کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ وقت آیا جب ان لوگوں کے ہاتھوں
میں اسلحہ تھے۔ کیا انھیں اپنے غضبناک جذبات کو دبا لینا چاہیئے تھا؛ بالشویزم کو ضرورت سے زاید عمر تک
زندہ چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ از سر نو مظالم اور استحصال کو برداشت کرنے کی سکت پیدا کرنی چاہیے تھی۔
اور پھر اس کے بعد اس سے متصادم ہونا چاہیے تھا! (ایسی جد وجہد دنیا بھر میں شاید کہیں بھی شروع نہیں
ہوئی) نہیں ـــ فطری بات یہ تھی کہ خود بالشویزم کا طریق کار اختیار کیا جائے جو پہلی جنگ عظیم میں خون سے
محروم ہو جانے والے روس کے جسم کو کھا گیا تھا اور دوسری جنگ عظیم میں ایسے ہی وقت پر اسے شکست دینے
کی ضرورت تھی۔

ہماری جنگ سے پہلے تھی کی خواہش ۱۹۳۹ء کی سوویٹ۔ فنش جنگ سے قبل ہی ظاہر ہو چکی تھی۔
سوویت کمیونسٹ پارٹی (سی۔ پی۔ ایس۔ یو) کے آرگ بیورو کے سابق سکریٹری اور اسٹالن کے نزدیکی
رفیق کار دی۔ جی بازنوف نے اس موڑ کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور سرخ فوج کے گرفتار شدہ
سپاہیوں کو مہاجر افسروں کی کمان میں سوویٹ حفاظتی محاذ پر روانہ کیا۔ اپنے ہی ہم وطنوں کے ساتھ
جنگ آزما ہونے کے لیے نہیں بلکہ ان کے دلوں کی تسخیر کے لیے۔ فن لینڈ کے اچانک سپرانداز ہو جانے کے
باعث یہ سعی نامشکور ہی رہی۔

جنگ روس اور جرمن کا آغاز کب ہوا؟ قتل و غارت گری سے مملو اجتماعی نظام کاشت کے نفاذ
سے دس سال بعد، اوڈین کے ہولناک قحط (جس میں ۶۰ لاکھ افراد لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ لیکن پڑوسی
یورپ کو اس کی بھنک تک نہ ملی) این۔ کے۔ وی۔ ڈی۔ کے شیطانی رقص کے چار برس بعد، مزدوری
کو نئے مزدور قوانین کے شکنجے میں جکڑنے کے ایک برس بعد ـــ اس وقت جب ڈیڑھ کروڑ انسان ملک میں
ادھر ادھر مشقتی کیمپوں میں سزائیں بھگت رہے تھے اور جب پرانی نسل کو اچھی طرح یاد تھا کہ قبل
از انقلاب زندگی کی شکل کیا تھی ـــ لوگوں کا فطری ردعمل تھا کہ ایک گہری اطمینان کی سانس لیں
اور اپنے آپ کو آزاد کرا لیں۔ ان کا فطری جذبہ تھا کہ ایسے حکمرانوں سے نفرت کریں۔ "ہم پر دفعتاً حملہ کر دیا
گیا" "دشمن کے مورچوں اور ٹینکوں کی تعداد کثیر تھی"۔ (حق تو یہ ہے کہ سرخ فوج کے پاس بحیثیت مجموعی
ہر چیز تعداد میں زیادہ تھی) غنیم نے وہ خطرناک اہم مقامات اتنی آسانی سے نہیں چھین لیے۔ ان میں سے

ایک ہی وقت میں تین لاکھ فوجی گرفتار کیے گئے تھے (بیلسٹوک، اسمولینسک) یا ساڑھے چھ لاکھ فوجی (برائینسک کیف) پکڑے گئے تھے: سارے کے سارے مورچوں کی تباہی کا سبب یہ نہ تھا۔ اور انھوں نے ہماری افواج کو اتنی تیزی سے اتنے پیچھے دھکیل دیا جس کا کہ روس نے اپنی ہزار سالہ سابقہ تاریخ میں کبھی تجربہ نہیں کیا تھا۔ یا شاید دوسرے کسی ملک نے کبھی کسی جنگ میں ایسا نہیں دیکھا تھا۔ مذکورہ بالا وجہ سے نہیں بلکہ اس کھوکھلی حکومت کے فی الفور بے جان ہو جانے کے باعث جس کی رعایا اس کی اس طرح مخالف ہو گئی تھی جیسے کسی لٹکتی لاش سے نفرت کی جاتی ہے۔ (رکیوم اور گورکوم* (دو بڑے شہر) پانچ منٹ کے اندر ہوا میں اڑ گئے اور اسٹالن کی سانس پھول رہی تھی) ۱۹۴۱ء میں یہ غدر شاید اپنی مکمل شکل میں ابھرتا (دسمبر تک سوویٹ یونین کی پندرہ کروڑ آبادی میں سے چھ کروڑ آدمی اسٹالن کی گرفت سے نجات پا گئے (اسٹالن کے فرمان نمبر ۱۹، جولائی ۱۶؍ ۱۹۴۱ء میں تشویش کی سطح مناسب ہی تھی۔ تمام (!) مورچوں پر ایسے بہت سے (!) عناصر ہیں جو دشمن سے ملنے کے لیے لپک لپک کر جا رہے ہیں (!) اور اس کے ساتھ اولین سابقے میں ہی سپر انداز ہو جاتے ہیں۔ (جولائی ۱۹۴۱ء میں بیالسٹوک مقام پر زیر حراست لے جانے والے تین لاکھ چار ہزار قیدیوں میں سے بیس ہزار مفرورین تھے) اسٹالن کو حالات اتنے بے قابو نظر آئے کہ اکتوبر ۱۹۴۱ء میں اس نے چرچل کو بذریعہ تار مشورہ بھیجا کہ پچیس تیس ڈویژن برطانوی فوج سوویٹ علاقوں میں اتاری جائے۔ کون کمیونسٹ ہے جسے اس سے زیادہ مکمل سیاسی زوال کا سامنا کرنا پڑا ہو! اس زمانے کا موڈ یہ تھا ۲۲؍اگست ۱۹۴۱ء کو ۴۳۶ ویں لائٹ ۶ پیدل رجمنٹ کے کمانڈنگ افسر میجر کونوتوف نے اپنی رجمنٹ کے منہ پر کہہ دیا کہ میں اسٹالن کا تختہ پلٹنے کے لیے: "نجات دہندہ فوج" میں شامل ہونے کو جرمن صفوں میں جا رہا ہوں اور جو اس کے ساتھ جانا چاہیں انھیں ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ نہ صرف یہ کہ اس کی کوئی مخالفت نہیں کی گئی بلکہ پوری رجمنٹ اس کے ہمراہ چلی گئی صرف تین ہفتوں کے بعد کونوتوف نے غنیم کے حفاظتی مورچے کے عقب میں کازک رضاکاروں کی ایک رجمنٹ تیار کر لی۔ (وہ خود بھی ڈان کازک تھا) جب وہ رضاکار بھرتی کرنے موگیلیف کے نزدیک اسیرانِ جنگ کے کیمپ میں پہنچا تو وہاں کے پانچ ہزار میں سے چار ہزار قیدیوں نے اس کی رجمنٹ میں بھرتی ہونے کی خواہش ظاہر کی لیکن وہ ان سب کو بھرتی نہیں کر سکا۔ اس برس ہلمسٹ کے نزدیک واقع کیمپ کے نصف قیدیوں نے — بارہ ہزار سپاہیوں نے — ایک اعلان پر دستخط کیے کہ جنگ کو خانہ جنگی میں تبدیل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ ہم کو یاد ہے کہ کس طرح لوکوٹ برانسکی کے تمام عوام نے جرمنوں کی آمد سے قبل اور ان کے اثر سے قطعی آزاد حیثیت رکھنے والے ایک وسیع اور خوش حال صوبے میں جس میں آٹھ اضلاع اور دس لاکھ سے زیادہ آبادی تھی، ایک خود مختار روسی مقامی حکومت کی تشکیل کی۔ لوکوٹ برانسکی کے باشندگان کے مطالبات بچے تلے تھے: ایک روسی قومی حکومت کا قیام، تمام جرمن مقبوضہ علاقوں میں روسی خود حکومت کریں، ۱۹۳۰ء کی سرحدوں کے اندر روس کو آزاد مشتہر کیا جائے، روسی کمان کے تحت ایک "نجات دہندہ" فوج تیار کی جائے یا پھر لینن گراڈ میں ایک ہزار سے زائد نوجوانوں کا ہجوم (جس کی قیادت ایک طالب علم، ژچیپکو کر رہا تھا) جرمنوں کو خوش آمدید کہنے اور اسٹالن کی حکومت کے خلاف جنگ کرنے کے لیے گیٹ چینا کے نزدیکی جنگلات میں چلا گیا تھا (لیکن جرمنوں نے انھیں

ڈرائیوروں اور خانساماؤں کا کام کرنے کے لیے مورچے کے عقب میں بھیج دیا تھا) دریائے ڈان کے قریبا دیہاتوں میں نان ونمک سے جرمنوں کا خیر مقدم کیا گیا۔ سوویٹ یونین کی ۱۹۴۱ء سے پیشتر کی آبادی فطرتی طور پر خیال کرتی تھی کہ کسی غیر ملکی فوج کی آمد کا مطلب ہے کمیونسٹ حکومت کا تختہ الٹنا۔ ورنہ ہمارے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ لوگ کسی ایسے سیاسی اقدام کے متوقع تھے جو انھیں بولشیوزم سے نجات دلا سکے۔

جہاں ہم تھے وہاں ہمیں اشتعال انگیز تشہیری رسائل کے بیابان نے اور ہٹلر کی فوج کی کثرت نے ان سے علیحدہ کر رکھا تھا اور اس جگہ یہ ہم کس طرح اس بات پر آسانی کے ساتھ یقین کر سکتے تھے کہ مغربی دوست ممالک اس جنگ میں وسیع پیمانے پر آزادی کے لیے شامل نہیں ہوئے تھے وہ سوویٹ افواج کا پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے اور بعد ازاں معاملہ وہیں چھوڑ دینا چاہتے تھے؟ کیا ہمارے لیے یہ باور کرنا زیادہ فطری نہ تھا کہ ہمارے دوست ممالک آزادی کے اصولوں کے تئیں وفادار ہیں اور وہ ہمیں شدید تر مظالم سے پریشان نہ کریں گے؟ یہ واقعہ ہے کہ یہ وہی دوست ممالک تھے جن کے لیے روسیوں نے پہلی عالمی جنگ میں جانیں نچھاور کی تھیں اور جو اس وقت بھی ہماری افواج کو شکست کے زمانے میں بے آسرا چھوڑ کر جلد از جلد اپنی خوشگوار زندگی کی طرف لوٹ گئے تھے۔ لیکن یہ سبق ایسا سنگدلانہ تھا کہ دل اسے ازبر کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔

ہم نے اچھی طرح سیکھ لیا تھا کہ سوویٹ تشہیری رسائل خواہ جو کہیں، اس کا یقین نہ کیا جائے قدرتی طور پہ ہم نازیوں کی بابت ان بیہودہ باتوں کو باور نہ کرتے تھے کہ نازی روس کو ایک نو آبادی اور ہمیں جرمنوں کا غلام بنانا چاہتے ہیں، بیسویں صدی میں ایسی احمقانہ باتوں کی توقع کون کر سکتا ہے جب تک کہ اس نے خود اس کے نتائج بھگت نہ لیے ہوں؟ ۱۹۴۲ء میں اوہنلوروف میں روسی رضاکار دستوں میں بھرتی ہونے کے لیے اتنے زیادہ رضاکاروں نے نام درج کرائے کہ تاحال مکمل طور پر تعینات نہ ہونے والے دستے کے لیے ان سب کو بھرتی کرنا ممکن نہ ہو سکا جب کہ اسمولینسک علاقے اور بائیلو روس میں ماسکو سے ہدایات حاصل کرنے والے گوریلا فوجیوں کے خلاف خود حفاظتی کے لیے ایک لاکھ فوجیوں کی "عوامی فوج" از خود تیار ہو گئی (جرمن اس سے خائف ہو گئے اور انھوں نے اس پہ پابندی عائد کر دی) ۱۹۴۳ء کے موسم بہار تک اسمولینسک اور سکوف علاقوں میں اپنی تشہیری مجلسوں میں بلاسوف جہاں بھی شریک ہوا وہاں اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اس وقت بھی عوام انتظار کر رہے تھے اور سوچتے تھے کہ ہماری اپنی فوج کب تیار ہو گی۔ میرے پاس اس امر کی شہادتیں دستیاب ہیں کہ سکوف صوبے کے پوزنے ریوتسکی ضلع کے کاشتکار عوام کا رویہ بلاسوف دستوں کے تئیں ہمدردانہ تھا جو لوٹ مار نہیں کرتے تھے، قدیم روسی وردی پہنتے تھے اور کولخوزوں کے مخالف روسی نژاد تصور کیے جاتے تھے۔ شہری آبادی میں سے رضاکار بھرتی ہونے کے لیے آتے تھے (جس طرح وہ لوکوٹ برانسکی میں وو سکوبوئی نکوف کے دستوں میں بھرتی ہونے کے لیے آیا کرتے تھے) اور ہمیں یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ وہ کیا سمجھ کر یہ عمل کرتے تھے؟ یہ بات نہیں تھی کہ

وہ اسیرانِ جنگ کے کسی کیمپ سے باہر آ رہے تھے۔ دراصل جرمنوں نے کئی بار بلاسوف پسندوں کی کمک میں اضافہ کرنے سے انکار کیا (وہ پولیس میں بھرتی ہو سکتے تھے) ۱۹۴۲ء مارچ تک خارکوف کے قریب ایک کیمپ میں اسیرانِ جنگ نے بلاسوف تحریک کے متعلق پوسٹر پڑھے اور ۲۰۷ افراد نے "روسی نجات دہندہ فوج" میں بھرتی ہونے کے لیے ایک عریضے پر دستخط کیے۔ انھیں دو سال کا جنگی تجربہ حاصل تھا، اسٹالن گراڈ کی جنگوں میں شریک ہونے والے بہت سے بہادر ان میں شامل تھے علاوہ ازیں اس کیمپ میں انھیں کافی خوراک ملتی تھی لہٰذا ظاہر ہے کہ یہ دستخط انھوں نے فاقہ کشی سے نجات پانے کے لیے نہیں کیے تھے (لیکن جرمنوں نے خالصتاً احمقانہ رویّہ اختیار کیا، جن ۲۰۷ افراد نے دستخط کیے ان میں سے ۲۲ کو خاتمۂ جنگ پر بھی رہائی نہیں دی گئی اور انکو کوئی کارروائی کرنے کا موقع نہیں دیا) ۱۹۴۲ء میں سوویٹ صوبوں کے لاکھوں مہاجر پسپا ہوتی ہوئی جرمن افواج کے پیچھے ہو لیے۔ انھیں کمیونزم کے تحت زندگی بسر کرنے کی جگہ دوسری ہر بات منظور تھی۔

میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ہمارے لوگ قطعی نکمے اور ایک غلام قوم ہوتے اگر وہ اسٹالن حکومت کے خلاف دور سے بھی رائفل نہ اٹھاتے اور وہ بابائے عوام پر گھونسہ تاننے اور گالیاں دینے میں چوک جاتے اور جنگ ختم ہو جاتی۔ جرمنوں کے سپہ سالار کی اپنی ایک اسکیم تھی لیکن ہمارے یہاں کیا تھا؟ ہمارے سپہ سالار کس گنتی میں تھے۔ (اور آج بھی یہی عالم ہے) انھیں پارٹی کے نظریات اور لالچ نے بددیانت بنا دیا تھا اور انھوں نے اپنے اپنے آدمیوں میں قومی شعور کو بیدار نہیں ہونے دیا، جیسا کہ دیگر ممالک میں ہوا کرتا ہے اس لیے جنھوں نے اپنے اسلحہ سنبھال لیے اور چوٹ لگائی وہ تقریباً سبھی معاشرے کے نچلے طبقے سے اٹھے تھے۔ پہلے کے شرفاء، مہاجرین، متمول لوگوں میں سے حصّہ لینے والوں کی تعداد ناقابلِ ذکر تھی۔ اگر اس عمل کو بے روک ٹوک بڑھنے دیا جاتا، اسی جوشیلے انداز میں جاری رکھا جاتا جیسا کہ جنگ کے ابتدائی ہفتوں میں ہوتا تھا تو یہ ایک دوسرے پگاچیف غدر* کی حیثیت اختیار کر لیتا۔ اس دھارے میں تیرنے والوں کی تعداد اور ان کے معاشرتی معیار کے لحاظ سے رائے عامہ کے اعتبار سے کارکنوں کے ادا کردہ کردار کے اعتبار سے، جذباتی لحاظ سے (بلند منصب پر فائز لوگوں کے سیاہ کارناموں کا حساب چکانے کے ارادے کے باعث) اس کی مادّی قوت اور اس کے قائدین کی کمزوری کے مابین بڑا فرق ہونے کے لحاظ سے یہ باتیں خواہ جیسی رہی ہوں۔ یہ زیادہ طاقتور عوامی تحریک تھی۔ بیسویں صدی سے شروع ہونے والی دانشوروں کی تمام تحریکات میں سے جو فروری ۱۹۱۷ء تک جاری رہیں، فروری کی تحریک کے مقاصد ظاہری طور پر عوامی مفادات سے متعلق تھے۔ لیکن اس کا انجام اکتوبر میں نظر آ گیا۔ کوئی اور تحریک اتنی عوامی نہ تھی لیکن وقت کو منظور نہ تھا کہ یہ اپنی منزل تک پہنچ سکے۔ اسے منظور تھا کہ "اپنی مقدس سرزمین سے غداری" کا الزام اس کے سر آئے اور یہ بدنامی کے ساتھ ختم ہو جائے۔

واقعات کے سماجی تجزیے سے ہماری دلچسپی ختم ہو گئی ہے کیونکہ کسی خاص زمانے کی ضروریات کی تکمیل کے لیے بڑی عجیب تفسیر میں گڑھ لی جاتی ہے لیکن ریبن ٹراپ اور ہٹلر کے ساتھ ہمارے دوستانہ

معاہدے کا کیا انجام ہوا؟ قبل از جنگ مولوٹوف اور بوروسلوف کی کھوکھلی لن ترانی کا کیا ہوا؟ اور پھر حیرتناک عدم صلاحیت، تنظیم کی کمی، ٹامک ٹوئیاں مارنے کی روش (اور حکومت کا ماسکو سے پیٹھ دکھلا کر فرار ہو جانا) بیک وقت پانچ لاکھ افواج کو اہم جنگی مورچوں پر چھوڑ کر پسپا ہو جانا — کیا یہ سب کچھ مادرِ وطن کے ساتھ غداری نہ تھی جس کے نتائج زیادہ دور رس نکلے؟ ان غداروں کو ہم گرنیوفسکی اسٹریٹ کے شاندار فلیٹوں میں اتنے لاڈ پیار کے ساتھ کیوں پال رہے ہیں۔

آہ، اس کی طوالت! جن لوگوں نے ہمارے عوام کو ایذائیں پہنچائیں ان کے ساتھ غداری کی، اگر ان سب کو — ایک ایک کو — کٹہرے تک لا سکیں تو ان مجرموں کے بیٹھنے کے لیے کتنی لمبی بنچ کی ضرورت ہوگی! — بے ڈھنگے سوالات کا ہمارے ملک میں کوئی جواب نہیں دیا جاتا۔ انھیں خاموش رہ کر ٹال دیا جاتا ہے۔ جواب دینے کے بجائے وہ ہم پر اس طرح غراتے ہیں: "اہمیت اصول کی ہے: معاملات میں پوشیدہ بنیادی اصول! کیا کسی روسی کو اپنے سیاسی مطمحِ نظر کے حصول کے لیے — خواہ وہ مطمحِ نظر اسے کتنا ہی جائز محسوس ہوتا ہو — جرمن سامراج کی طاقتور افواج کی معاونت حاصل کرنے کا حق ہے؟ اور وہ بھی زندگی اور موت کی تصفیہ کن جنگ کے دوران؟"

حقیقت یہ ہے کہ یہی سوال اہم ہے: کیا آپ کے لیے ان مقاصد کے حصول کی خاطر جو زیادہ ارفع نظر آتے ہیں، روس کے ساتھ جنگ آزمائی کرنے والے جرمن سامراج کا سہارا لینا جائز تھا؟

آج بلاشبہ ہر شخص، نہیں کی متفقہ چیخ میں شامل ہوگا۔ پھر سوئٹزرلینڈ سے سویڈن جانے والی اس ٹرین کے بند ڈبے کی کیا کیفیت ہے جو (ہمیں اب معلوم ہوا ہے کہ) برلن کے راستے سے گئی تھی؟ تمام روسی اخبارات نے منشویکوں سے لے کر کیڈٹوں تک نے بآوازِ بلند کہا تھا "نہیں!" لیکن بالشویکوں نے سمجھایا کہ یہ نامناسب عمل نہیں ہے۔ دراصل انھیں یہ یاد دلا کر شرمندہ کرنا مضحکہ خیز بات ہے۔ لیکن ریل کا قابلِ ذکر سفر محض یہی ایک نہیں ہے۔ بالشویکوں نے ۱۹۱۸ء کی گرمیوں میں کتنی ریلوں پر سامانِ رسد اور سونا لاد کر کے روانہ کیا تھا جو سب کی سب جرمن شہنشاہ ولہیم کے عظیم محلات میں داخل ہو گئیں جنگ کو خانہ جنگی میں تبدیل کر دو! بلاسوف کے دستوں سے قبل یہ تجویز لینن کی طرف سے پیش کی گئی تھی —

ہاں۔ لیکن ان کے مقاصد! یاد کیجیے کہ ان کے مقاصد کیا تھے؟ کیا تھے وہ مقاصد؟ اور ان کا کیا حشر ہوا؟

ہاں۔ لیکن دراصل۔ وہ — جرمن شہنشاہ ولہیم تھا۔ قیصرِ اعظم ہٹلر سے کچھ مختلف۔ اور پھر جو کچھ بھی ہوا کیا اس وقت روس میں واقعی کوئی حکومت تھی؟ عبوری سرکار کی کیا اہمیت....

واقعہ یہ ہے کہ ایک دور تھا جب جنگ کے جوش میں ہم قیصر کو "خوفناک" یا "تشنۂ خوں" جیسی خصوصیات کے بغیر نہیں چاہتے تھے اور بے احتیاطی کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے قیصر کے سپاہیوں پر الزام لگاتے تھے کہ انھوں نے بچوں کے سر پتھروں پر پٹک پٹک کر توڑے ہیں لیکن اس بات سے ہم اتفاق کریں گے کہ قیصر ہٹلر سے مختلف تھا۔ لیکن عبوری حکومت بھی تو مختلف تھی اس میں چیکا خفیہ

پولس) نہ تھی۔ اس نے کسی کے سر کے پیچھے گولی نہیں ماری، کسی کو کیمپوں میں نظر بند نہیں کیا، کسی کو جبراً اجتماعی فارموں میں نہیں ڈھکیلا، کسی کی زندگی میں زہر نہیں ملایا: عبوری حکومت اسٹالن کی حکومت نہیں تھی۔

ہمیں معاملات کو ان کے مناسب تقابلی تناسب میں رکھنا چاہیے۔

یہ بات نہ تھی کہ جب کوڑرگا نے یکے بعد دیگرے تمام حروفِ تہجی ہضم کر لیے تو کوئی ڈر گیا: بات صرف یہ تھی کہ جب جنگ خاتمے پر آ گئی تو اس قسم کے وحشیانہ خوف کے ذریعے قدغن لگانے کی ضرورت نہ تھی نئے پولیزئی دستے نہیں بنائے جا سکتے تھے، کام کرنے والوں کی ضرورت تھی اور کوڑرگا میں لوگ بے کار رہتے تھے۔ اس لیے ۱۹۴۵ء میں ہی کوڑرگا جھونپڑی نما زنداں، قید خانے کی کوٹھریاں نہ رہ گئے۔ دروازے دھوپ کے لیے وا کر دیے گئے، غلاظت کی بالٹیاں بیت الخلاؤں میں پہنچائی جانے لگیں، قیدیوں کو شفاخانے تک جانے کی چھوٹ مل گئی اور ان کی امنگ برقرار رکھنے کے لیے باورچی خانے تک انھیں ڈبل مارچ کرائی جانے لگی۔ وہ چور جو دیگر قیدیوں کی خوراک چرا لیا کرتے تھے، ہٹا دیے گئے اور خود سیاسی قیدیوں میں سے چند کو باورچی خانے کے خدمتگاروں کی حیثیت سے متعین کر دیا گیا۔ بعد ازاں قیدیوں کو سال میں دو خط وصول کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔

۱۹۴۷ء۔ ۱۹۴۶ء کے برسوں میں کوڑرگا اور آرام قیدخانوں کے کیمپ میں کوئی خاص فرق نہیں رہ گیا۔ نفاست پسند منتظم انجینئر سیاسی تبدیلی کے باعث منصوبے کی تکمیل میں رکاوٹ نہ آنے دینا چاہتے تھے اور انھوں نے (کم از کم وارکوتا میں) اچھی صلاحیت رکھنے والے سیاسی مجرمین کو عام کیمپ ڈویژنوں میں بھیجنا شروع کیا جہاں ان کی پشت پر مندرج نمبر ہی انھیں کوڑرگا کی یاد دلائی کرا سکتے تھے۔ اور اس طرح خالی ہونے والی جگہوں کو پُر کرنے کے لیے۔ مزدوروں کے اصلاحی کیمپوں سے معمولی، ہاتھ سے کام کرنے والے مزدور کوڑرگا میں بھیج دیے جاتے تھے۔

اس طرح ان ناعاقبت اندیش منتظمین نے کوڑرگا کے احیا سے متعلق اسٹالن کے عظیم خیال کو ناکام بنا دیا ہوتا، لیکن ۱۹۴۸ء میں اس کے ذہن میں بروقت ایک نیا خیال پیدا ہوا کہ گلاگ کے باشندے جن کو واضح طور پر الگ الگ گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ معاشرتی نقطۂ نظر سے قابلِ قبول چوروں اور مجرموں کو سماجی اعتبار سے ناقابلِ قبول دفعہ ۵۸ والوں سے الگ کیا جا سکے۔ یہ پورا منصوبہ ایک اور بڑے منصوبے کا حصہ تھا جس کا مقصد گھریلو مورچے کو زیادہ مستحکم کرنا تھا (لفظوں کے انتخاب سے واضح ہوتا تھا کہ اسٹالن مستقبل قریب میں ایک اور جنگ کی تیاری کر رہا تھا)۔ خصوصی کیمپ قائم کیے گئے جن میں مخصوص انتظامیہ تشکیل دیا گیا جو ہرچند کہ پہلے والے کوڑرگا کے مقابلے میں قدرے نرم تھا لیکن عام کیمپوں کے انتظامیہ سے زیادہ سخت تھا۔

دیگر کیمپوں سے ممتاز کرنے کے لیے انھیں عام جغرافیائی ناموں کے بجائے عجیب و غریب شاعرانہ نام دیے گئے۔ ان تازہ تخلیقات میں فارسلک کا گورلاگ (کوہستا کیمپ) کولیما کا برلاگ (ساحلی کیمپ) انتا کا

منلاگ (معدنی کیمپ) بیچورا کاریکملاگ (دریائی کیمپ) پوتما کا دوبروفلاگ (گلستانی کیمپ) ٹوئیتیٹ کا اوزرلاگ (جھیل والا کیمپ) قازقستان کے اسٹیپلاگ (اسٹیپی کیمپ) پیشچنلاگ (ریگستانی کیمپ) اور لگلاگ (لفظیاتی کیمپ) نیز کیمرو نو صوبے کا کیمش لاگ (سرکنڈہ کیمپ) شامل تھے۔

مزدوروں کے اصلاحی کیمپوں میں یہ ہولناک افواہیں گشت کرنے لگیں کہ ۵۸ والوں کو مخصوص اختتامی کیمپوں میں بھیجا جائے گا (یہ بات نہ تو احکامات کی تعمیل کرنے والوں کے ذہن میں آئی نہ شکار ہونے والوں کے کہ نئی رسمی سزائیں دینے کی کوئی ضرورت بھی ہو سکتی ہے)

رجسٹریشن اور تقسیم و تحفظ کا کام کرنے والے شعبوں نے زور شور سے کام شروع کیا، خفیہ فہرستیں بنائی گئیں اور منظوری کے لیے کہیں روانہ کی گئیں۔ قیدیوں کو منتقل کرنے والی لمبی سرخ ریل گاڑیاں آگئیں، چاق و چوبند سرخ فوجی ٹامی گن لیے اور ہتھوڑے لیے کر وہاں پہرے پر آگئے اور عوام کے دشمن اپنا نام پکارے جانے پر گردن خم کئے اپنی آرام دہ جھونپڑیاں چھوڑ کر تبادلے کے لمبے سفر پر روانہ ہونے کے ناقابلِ التواء احکام کی تعمیل کرنے لگے۔

لیکن سبھی ۵۸ والوں کو طلب نہیں کیا گیا۔ بعدازاں قیدیوں کو اپنے شناساؤں سے دریافت حال کرنے پر علم ہوا کہ ان میں سے کون کون لوگ معمولی جرائم کرنے والوں کے ساتھ رہنے کے لیے مزدوری کے اصلاحی کیمپوں میں چھوٹ گئے ہیں۔ ان لوگوں میں وہ بھی تھے جنھیں دفعہ ۵۸ پیرا دس کے تحت سزا دی گئی تھی۔ اور ان پر دیگر کوئی الزام نہ تھا۔ اس میں عام سوویٹ مخالف تحریک کا ذکر تھا جس کا مطلب تھا کہ یہ کام بغیر پیسہ لیے اور کسی ساتھی کی معاونت کے بغیر کیا گیا تھا اور اس کا نشانہ کوئی فردِ مخصوص نہ تھا (اگرچہ ایسے ملزموں کا تصور کرنا تقریباً ناممکن تھا لیکن لاکھوں لوگوں کے نام رجسٹروں میں درج تھے اور وہ گلاگ کے قدیم جزائر پر چھوڑ دیے گئے تھے) جن ملزمین نے دو یا تین کی ٹولیاں بنائی تھیں، ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کرنے، بات کرنے یا مشترکہ شکایت کرنے کا کوئی رجحان ظاہر کیا تھا۔ ان پر دفعہ ۵۸ پیرا ۱۱ (معاندانہ گروہ) کے تحت ایک اور الزام عائد کیا گیا تھا اور وہ سوویٹ مخالف تنظیموں کو فروغ دینے والوں کی حیثیت سے خصوصی کیمپوں میں بھر دیے گئے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسی قسم کا سلوک مادرِ وطن کے غداروں کے ساتھ کیا گیا (۵۸-۱، الف اور ا، ب) بورژوا قوم پرستوں اور تفریق پسندوں (۵۸-۲) بین الاقوامی بورژوا کے ایجنٹوں (۵۸-۴) جاسوسوں (۵۸-۶) تخریب کاروں (۵۸-۷) دہشت پسندوں (۵۸-۸) توڑ پھوڑ کرنے والوں (۵۸-۹) اور اقتصادی تخریب کاروں (۵۸-۱۴) کے ساتھ بھی یہی عمل روا رکھا گیا۔ یہ ان اسیرانِ جنگ جرمنوں (مینلاگ میں) یا جاپانیوں (اوزرلاگ میں) کو رکھنے کے لیے بھی سب سے سہولت بخش مقام تھے جنھیں ۱۹۴۸ء کے بعد بھی نظر بند رکھنا تھا۔

دوسری طرف اصلاحی مشقت کیمپوں میں، جو خبریں نہ دینے والے (۵۸-۱۲) اور دشمنوں کے معاونین (۵۸-۳) تھے اپنی جگہوں پر ہی رکھے گئے تھے۔ اس طرف کنٹر گاہیں نظر بند وہ قیدی جنھیں بطورِ خاص دشمن کی معاونت کرنے کے لیے سزا دی گئی تھی، بقیہ تمام لوگوں کے ساتھ کیمپوں میں چلے گئے تھے۔

ان علیحدگی پسندوں کی عاقبت اندیشی کا اندازہ لگانا الفاظ کے بس کی بات نہیں۔ مبہم معیاروں کی

بنا پر پچیس برسوں کی سزا پانے والے روسی غداروں کو اصلاحی مشقت کیمپوں (انجلاگ) میں ہی رکھا گیا اور ادھر اُدھر پھیلے ہوئے تمام کیمپوں میں دفعہ ۵۸ والوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ جن میں بلا سوف پرست اور سابق پولیس والے بھی شامل تھے۔ یہ خصوصی کیمپ نہیں تھے۔ قیدیوں پر نمبر درج نہیں کیے جاتے تھے لیکن انتظام سخت تھا (دریائے وولگا کے سامرا موڑ پر واقع کراستا یا گلنکا فاکسیا کے ضلع شیرپا میں قائم کردہ ڈیم کیمپ اور جنوبی سخالن کیمپ اس کی مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں) یہ کیمپ اتنے سخت تھے کہ قیدیوں کو خصوصی کیمپوں میں بھی ان سے زیادہ تکلیف نہیں ہوتی تھی۔

اس وسیع پیمانے پر تقسیم کے بعد کہیں یہ مجمع الجزائر پھر دھند میں نہ اوجھل ہو جائے۔ اس لیے ۱۹۴۹ء سے آئندہ کے لیے یہ انتظام کر دیا گیا کہ بیرونی دنیا سے آنے والے گلاگ کے ہر نئے شہری کے نام کے ساتھ جیل کی فائل میں اس کی سزا کے علاوہ (سرکاری حفاظتی افسران اور صوبوں میں وکیل سرکار کے دفتر کا) یہ فرمان بھی درج کیا جائے کہ یہ خاص پرندہ ہمیشہ کس قسم کے پنجرے میں مقید رکھا جائے گا۔

اس طرح اس بیج کی مانند جس کے اختتام پر پودا اُگتا ہے، اسٹالن کا کٹورگا خصوصی کیمپوں کی شکل میں منتقل ہو گیا۔

قیدیوں کو منتقل کرنے والی سرخ ریلیں مادرِ وطن کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرتی رہیں اور مجمع الجزائر نئے قیدیوں کو قبول کرتا رہا۔

انٹا میں ان دانشمند لوگوں نے ایک پھاٹک سے ریوڑ باہر نکالا اور دوسرے دروازے سے اندر کر لیا۔

چیخوف نے گلہ کیا تھا کہ ہمارے پاس کٹورگا اور اس کے قیام کا کوئی قانونی جواز نہیں ہے۔ لیکن یہ شکایت انیسویں صدی کے مہذب دور میں کی گئی تھی۔ بیسویں صدی کے وسط میں، جو غار میں قیام کرنے والے وحشیوں کی صدی ہے، ہم سمجھنے اور جواز پیش کرنے کی ضرورت تک محسوس نہیں کرتے تھے۔ بابا اسٹالن نے طے کر دیا کہ فلاں بات اس طرح ہو گی اور اس کے بعد کسی قانونی جواز کی ضرورت نہیں۔

ہم اپنے سر تائید میں ہلا کر ظاہر کرتے تھے کہ بات سمجھ میں آ گئی ہے۔

*

دوسرا باب

اِنقلاب کی اوّلیں سانس

اپنی سزا کی یاس انگیز عدالت سے پست ہمت، غلاموں کی دنیا سے اپنی اوّلیں شناسائی سے حیران و ششدر، میں وہاں اپنی میعادِ قید کے ابتدائی ایام میں یہ کبھی باور نہ کر سکتا تھا کہ میرا شعور اس مکمل مایوسی کی کیفیت سے نجات پا سکے گا، کہ دھیرے دھیرے میں غیر محسوس انداز میں مجمع الجزائر کی نادیدہ چوٹی تک پہنچ جاؤں گا جیسے وہ ہوائی مونا لوآ ہو، اور وہاں سے دُور افتادہ جزیروں کو اطمینان سے دیکھ سکوں گا اور درمیان میں جھلملاتے ہوئے پر فریب سمندر کی دل کشی سے بھی محفوظ ہو سکوں گا۔

اپنی سزا کی درمیانی مدّت میں نے ایک سنہرے جزیرے میں بسر کی جہاں قیدیوں کو کافی خوراک فراہم کی جاتی تھی اور انھیں گرم اور صاف رکھا جاتا تھا اس کے بدلے میں مجھ سے زیادہ کچھ کرنے کی توقع نہ کی جاتی تھی: بس روزانہ بارہ گھنٹے ایک میز کے کنارے بیٹھ کر اپنے آپ کو افسروں میں مقبول بنائے رکھنا۔

لیکن ان آرام دہ لوازمات سے منسلک رہنا اچانک غیر دلچسپ ہو گیا۔ میں جیل میں زندگی کو زیادہ با معنی بنانے کے لیے نیا راستہ تلاش کرنے لگا۔ اپنے چہار جانب نگاہ ڈالنے پر میں نے محسوس کیا کہ کراسنایا پریسنیا سے کارِ خاص کے لیے آنے والے قیدی کا یہ مشورہ کتنا قابلِ نفرت تھا: ہر حال میں عام ڈیوٹی سے گریز کرو۔ ہم جو قیمت ادا کر رہے تھے وہ تقابلی اعتبار سے بہت زیادہ معلوم ہوتی تھی۔

جیل نے میری تحریری صلاحیتوں پر پابندی ختم کر دی اور اب میں نے اپنا سارا وقت اسی شوق میں صرف کرنا شروع کر دیا اب میں پیداواری دفتری کام سے ڈھٹائی کے ساتھ جی چُرانے لگا وہ مجھے جو مکھن مصری عطا کرتے تھے۔ میں ایک دوسری چیز کو اس سے قیمتی سمجھنے لگا اور یہ دوسری چیز تھی پھر اپنے پیروں پر کھڑا ہونا۔

اصل میں انھوں نے ہم میں سے چند کو جھنجوڑ کر خود ہی اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ ایک خصوصی کیمپ میں منتقلی کے دوران۔

انھوں نے ہمیں وہاں تک پہنچانے میں بہت وقت صرف کیا، تین ماہ (انیسویں صدی میں یہ کام گھوڑوں کی مدد سے کم مدّت میں پورا ہو جاتا تھا) یہ سفر اتنا طویل ہو گیا کہ محسوس ہوا یہ میری زندگی

کی ایک مختلف قسم کی لذت ہے اور مجھے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اس کے دوران میری باطنی شخصیت اور خارجی نظریے میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ یہ سفر فرحت بخش، مسرور کن اور خوش انجام تھا۔ شمیم فرحت انگیز کے جھونکے ہمارے چہروں سے ٹکرا رہے تھے۔ کٹورگا کی اور آزادی کی ہوا۔ اشخاص اور واقعات چہار جانب سے آکر ہمیں یقین دلا رہے تھے کہ انصاف ہمارے ساتھ تھا! ہماری جانب تھا! ہمارے حق میں تھا! ہمیں سزا دینے والے لوگوں اور جیلروں کے ساتھ نہیں!

ہمارے پرانے گھر ٹوپتری کی نے ایک کھڑکی سے برآمد ہونے والی دلدوز زنانہ چیخ سے استقبال کیا۔ یہ آواز شاید تنہائی کی قید والی کوٹھری سے آرہی تھی "بچاؤ! بچاؤ۔ یہ میری جان لے رہے ہیں" بعدازاں یہ چیخیں کسی وارڈر کے ہاتھوں گھٹ کر رہ گئیں۔

ٹوپتری "اسٹیشن" پر ہمارے ساتھ ۱۹۴۹ء کے بھرتی شدہ کچھ نئے رنگروٹ شامل کردیے گئے۔ ان سب کی سزائیں عجیب و غریب تھیں۔ عام طور پر دی جانے والی دس سال کی سزا کے بدلے انھیں ربع صدی کی سزائیں دی گئی تھیں۔ جب وہاں لی جانے والی ان کی حاضریوں میں ان میں سے ہر ایک کو اپنی رہائی کی تاریخ بتانی پڑتی تھی تو یہ ایک سنگدلانہ مذاق سا معلوم ہوتا تھا ــ "اکتوبر ۱۹۷۴ء، فروری ۱۹۷۵ء"

ظاہر ہے کوئی آدمی اتنی طویل سزا بھگتنے کے لیے بیٹھا نہ رہے گا۔ انسان کو کہیں سے زنبور حاصل کرکے باڑھ کا تار کاٹ دینا چاہیے۔

یہ پچیس سالہ سزائیں قیدیوں کی دنیا کی طلب ماہیت کردینے کے لیے کافی تھیں۔ ارباب اقتدار نے اپنے تمام حربے ہم پر استعمال کرلیے تھے اب بولنے کی باری قیدیوں کی تھی۔ آزادانہ اور بے تکلفانہ، بے خوفی کے ساتھ زبان کھولنے کی باری۔ جو لفظ ہم نے زندگی میں کبھی نہ سُنے تھے، اور یہ ہمیں پُرجوش اور متحد بنا سکتے تھے۔

ہم اس وقت کا زان اسٹیشن پر اسٹولی پن کار* (قیدیوں کی مخصوص گاڑی) میں براجمان تھے جب اسٹیشن کے لاؤڈ اسپیکر نے اعلان کیا کہ کوریا میں جنگ کا آغاز ہوچکا ہے۔ پہلے ہی لمحے میں جنوبی کوریا کے حفاظتی دستے کو دس کلومیٹر تک پسپا کرکے شمالی کوریا والے اصرار کررہے تھے کہ ہم پر حملہ کیا گیا تھا۔ مورچے پر جانے والا ہر احمق بھی سمجھ سکتا تھا کہ پہلے حملہ آور وہ تھے جو پہلے ہی دن آگے بڑھ گئے تھے۔

کوریا میں چھڑنے والی اس جنگ نے ہمیں مزید مشتعل کیا اپنے باغیانہ موڈ میں ہم طوفان کی آرزو کررہے تھے۔ طوفان کو آنا ہی چاہیے، آنا ہی چاہیے، آنا ہی چاہیے۔ ورنہ ہمارا دم گھٹ جائے گا.....

راتھزان سے آگے کسی جگہ طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی سرخ کرنیں قیدی ریل گاڑی کے چھوٹے تنگ جھروکوں سے اندر آکر ہمارے چہروں سے اس زور سے ٹکرائیں کہ ہماری جالی کے نزدیک

کاریڈور میں ایستادہ نوجوان پہرے دار نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ ہمارے پہرے دار مزید پریشانی پیدا کر سکتے تھے۔ انھوں نے کم و بیش پندرہ پندرہ قیدی ڈبوں میں ٹھونس رکھے تھے، ہمیں ہر رنگ رکھیلی، کھلائی تھی لیکن از روئے انصاف یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ وہ ہمیں پانی پلاتے تھے، اور رفع حاجت کے لیے صبح و شام باہر جانے دیتے تھے اس لیے ہم ان سے جھگڑتے نہیں اگر وہ چھوکرا بے سوچے سمجھے ہمیں عوام دشمن ہونے کا طعنہ نہ دیتا۔

اس سے جھگڑا شروع ہو گیا۔ ہمارا ڈبہ اور اگلا ڈبہ اس پر چڑھ دوڑے "اچھی بات ہے۔ ہم عوام کے دشمن ہیں لیکن کولخوز میں رسد کیوں نہیں ہے؟" "تم چہرے ہی سے گنوار معلوم ہوتے ہو، میں شرط لگا سکتا ہوں کہ تم پھر یہاں آ ؤ گے۔ میں شرط لگا کر کہتا ہوں کہ تم ہل چلانے کے لیے واپس نہ جا سکو گے، یہیں زنجیرے بندھے بندھے کتے بن جاؤ گے!"

"اگر ہم عوام دشمن ہیں تو جیل کی ریل گاڑیوں کو مختلف رنگوں سے کیوں رنگتے ہو؟ تم ہمیں کس کی نگاہوں سے چھپا رہے ہو؟"

"سن بیٹا! میرے بھی تیرے جیسے دو تھے جو جنگ سے کبھی نہیں لوٹے اور تو مجھے عوام دشمن کہتا ہے؟"

بڑی دیر سے اس قسم کے الفاظ ہمارے پنجروں سے باہر آ رہے تھے۔ اس حقیقت کو ہم بالکل براہ راست اور ببانگِ دہل بتا رہے تھے جو خالصتاً سچ تھی اور جس کی تردید ممکن نہ تھی۔

فاضل وقت میں ڈیوٹی دینے والا ایک سارجنٹ گالیاں کھانے والے اس نوجوان کی کمک پر آ گیا۔ لیکن کسی کو سمجھانے کی جگہ یا نام لینے کی بجائے اس نے لڑائی میں اپنے ماتحت کی مدد کرنے کی کوشش کی۔

یہاں بھی ہم نے ہلکی سی جھلک دیکھی کہ زمانہ تبدیل ہو رہا ہے۔ نہیں۔ یہ ۱۹۵۰ء تھا ابھی بہتر وقت کا ذکر چھیڑنا جلد بازی ہے جو کچھ ہم نے دیکھا وہ قیدیوں اور جیلروں کے مابین نئی طویل سزاؤں کے باعث اور نئے سیاسی کیمپوں کے قیام کی وجہ سے پیدا شدہ رابطہ تھا۔

ہماری تکرار اب مباحثے کی صورت اختیار کرنے لگی۔ نوجوانوں نے ہمیں بغور دیکھا اور اب وہ ہمیں اور اگلے ڈبے والوں کو عوام دشمن کہنے کی جرائت نہ کر سکے۔ انھوں نے اخبارات سے اپنے ابتدائی سیاسی اسباق سے متفرق نکات پیش کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے کانوں نے دل سے پہلے ہی مطلع کر دیا کہ یہ گھسے پٹے اقوال جھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔

"لڑکو! تم خود دیکھو! کھڑکی سے باہر نگاہ کرو۔ تم نے روس کو کس تحت الثریٰ میں پہنچا دیا ہے:"

کھڑکی کے باہر بوسیدہ جھونپڑوں اور سڑے گلے چھپروں اور قلاش چیتھڑے لگائے ہوئے لوگوں کی دنیا آباد تھی۔ (ہم روزیف لائن پر تھے جس پر غیر ملکی کبھی سفر نہیں کرتے) اگر گولڈن ہورڈ (ایک ترکی النسل فرقہ کپچک جس کی شہنشاہیت تیرہویں صدی میں وسطی اور جنوبی روس

میں قائم ہوئی تھی) نے اسے اتنی پامال حالت میں دیکھا ہوتا تو اسے فتح کرنے کی کبھی خواہش نہ کرتے۔

توربئیوت کے پرسکون اسٹیشن پر ایک بوڑھا شخص باسٹ کے جوتے پہنے پلیٹ فارم پر چل رہا تھا۔ ایک معمر کسان عورت ہماری ٹرین کی بند کھڑکی کے سامنے رکی اور تادیر وہیں کھڑی رہی اور باہری اور اندرونی سلاخوں میں سے بالائی پٹے پر ٹھونس ٹھونس کر بھرے ہوئے ہم قیدیوں کو گھورتی رہی۔ ہمیں دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر وہ کیفیت تھی جو ہمارے ہم وطن ایک زمانے سے بدقسمت لوگوں کو دیکھ کر ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے رخساروں پر کچھ آنسو ٹپک پڑے۔ وہ وہیں ایستادہ تھی۔ مشقت سے کھردری اور گنوار، اور وہ ہماری طرف اس انداز میں دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس کا بیٹا ہمارے درمیان بیٹھا ہوا ہو۔ "اماں! ادھر اندر کی طرف مت جھانکو۔" سنتری نے اس سے کہا لیکن لہجہ سخت نہ تھا۔ عورت نے اتنا سر تک نہیں گھمایا۔ اس کے ساتھ دس سالہ ایک چھوٹی لڑکی بھی کھڑی تھی۔ جس کے بالوں میں سپید ربن بندھے ہوئے تھے۔ اس نے نہایت سنجیدہ انداز میں ہمیں دیکھا۔ اس کی آنکھیں اتنی اداس تھیں کہ اس عمر میں عجیب سی لگتی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور وہ پلکیں نہیں جھپک رہی تھی۔ اس نے ہمیں اتنی گہری نگاہوں سے دیکھا کہ یقیناً اس نے ہماری صورتیں ہمیشہ کے لیے اپنے حافظے میں محفوظ کر لی ہوں گی۔ جیسے ہی ٹرین نے آگے جنبش کی، معمر عورت نے اپنی کالی پڑی ہوئی انگلیاں اوپر اٹھائیں اور عقیدت مندانہ انداز میں ہمارے لیے آہستگی کے ساتھ صلیب کا نشان بنایا۔

ایک اگلے اسٹیشن پر چھینٹ کی فراک میں ملبوس ایک لڑکی جو بے جا شرم یا خوف کی ماری ہوئی نہ تھی۔ بالکل ہماری کھڑکی تک آگئی اور جرأت کر کے ہم سے استفسار کرنے لگی کہ ہم کس جرم میں اور کتنے عرصے سے قید بھگت رہے ہیں۔ "دور ہٹو!" پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرتا ہوا پہرے دار غرایا۔ "کیوں دور ہٹوں؟ تو میرا کیا کرے گا! میں انھیں لوگوں میں سے ہوں نے یہ سگریٹ کی ڈبیہ ان لڑکوں کو دے دے" اور اس نے اپنے بیگ میں سے سگریٹ کے پیکٹ نکال کر آگے بڑھائے (ہم پہلے ہی یہ محسوس کر چکے تھے کہ لڑکی قید بھگت چکی ہے ہزاروں افراد، جو آزاد گھوم رہے ہیں، مجمع الجزائر میں تربیت حاصل کر چکے ہیں) پہریداروں کا ڈپٹی کمانڈر کود کر ٹرین سے باہر آگیا، "دور ہٹ ورنہ میں تجھے اندر بند کر دوں گا۔" لڑکی نے نفرت کے ساتھ بوڑھے بدصورت کمانڈر پر نگاہ ڈالی: "تو خود ہٹ جا...... کہیں کے —— لڑکو! یہ سگریٹیں انھیں دے دو۔" اس نے ہمارا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا اور شان کے ساتھ چلی گئی۔

اس طرح ہماری گاڑی بڑھتی گئی اور میں نہیں سمجھتا کہ پہرے دار یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ عوام کو ان کے دشمنوں سے بچا رہے تھے۔ آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہمارا یہ یقین پختہ تر ہوتا گیا کہ ہم سچی راہ پر ہیں، کہ سارا روس ہمارے ساتھ ہے؛ کہ اس نظام کو اکھاڑ پھینکنے کا وقت نزدیک آگیا ہے۔

کچھ خصوصی سفری کیمپوں کی طرف جہاں ہم نے ایک ماہ سے زائد عرصے تک غسلِ آفتاب کیا (یعنی آوارہ گردی کی) اور بھی محنت کش ملے۔ رات کو چوروں کی مکروہ چیخیں ہوا کو چیر کر ہمارے کانوں تک آئیں (ان کی توگڑگڑانے کی آواز بھی نفرت آگیں اور ناگوارِ گوش ہوتی ہے)" بچاؤ! ہمیں یہاں سے باہر نکالو۔ یہ فاسشسٹ ہمیں مارے ڈالتے ہیں، فاسشسٹ!"

یہ ایک نئی چیز تھی "فاسشسٹ" چوروں کو پیٹ رہے ہیں؟ یہ واقعہ تو ہمیں معکوس شکل میں نظر آیا کرتا تھا۔ —

لیکن تھوڑی دیر بعد ہی قیدیوں کے کچھ تبادلے ہوئے اور ہم نے دیکھا کہ ابھی کوئی معجزہ رونما نہیں ہوا ہے۔ یہ صرف پہلا پرندہ تھا۔ پاول بوردنیک۔ اُس کا سینہ چکی کے پاٹ سا چوڑا تھا اور گٹھیلے ہاتھ۔ دوستی کا مصافحہ کرنے یا گھونسہ مارنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ اس کا رنگ پختہ اور ناک عقابی تھی۔ وہ جارجین زیادہ لگتا تھا یوکرینی کم۔ وہ مورچے پر افسر تھا۔ تین میسرشیوں (جنگ باز جرمن طیارے) کے ساتھ تن تنہا مشین گن سے مورچہ لے چکا تھا۔ اسے سوویت یونین کے شجاع، کا تمغہ عطا کرنے کی سفارش کی جا چکی تھی لیکن کارخاص کے شعبے نے اسے رد کر دیا تھا۔ پھر اسے ایک تعزیری بٹالین میں بھیج دیا گیا۔ اور وہاں سے وہ اعزازات لے کر لوٹا تھا اور اب اسے دس سال کی سزا دی گئی تھی۔ جو زمانے کے لحاظ سے کسی مرد کے لائق سزا نہیں تھی۔

اس نے تو خدگراڈ بولینسک کی جیل سے پلٹتے ہی چوروں کا جائزہ لے لیا تھا اور ان سے دو دو ہاتھ کر چکا تھا۔ اب وہ بالائی تختے پر پرسکون انداز میں شطرنج کھیلتا ہوا اگلے سیل (کوٹھری) میں بیٹھا تھا۔ پوری کوٹھری دفعہ ۵۸ والوں کی تھی۔ انتظامیہ نے اس میں دو چور بھی سرکا دیے تھے۔ وہ کھڑکی کے نزدیک اپنی قانوناً جائز سونے کی سیٹ صاف کر رہا تھا اور ایک بلومیر سگریٹ لاابالیانہ انداز میں اس کے ہونٹوں سے لگی ہوئی تھی۔ فلسیٹی نے مذاقاً کہا: "تمہیں معلوم ہے، انھوں نے پھر مجھے چور ڈاکوؤں کے ساتھ رکھ دیا ہے!" سادہ لوح بلیعف نے جیسے چوروں کے بارے میں زیادہ معلوم نہ تھا، جلدی سے اُسے تسکین دینی چاہی "نہیں" یہاں ہم سب دفعہ ۵۸ کے قیدی ہیں، تم کس جرم میں آئے ہو؟" میں نے غبن کیا تھا، میں تعلیم یافتہ آدمی ہوں۔" چوروں نے دو آدمیوں کا پیچھا کر کے انھیں بھگا دیا اور ان کے مقام پر اپنے تھیلے رکھ کر دوسروں کے تھیلوں کا جائزہ لیتے ہوئے لڑائی کے موڈ میں پورے سیل میں چکر لگانے لگے۔ دفعہ ۵۸ والے، نہیں وہ ابھی تبدیل نہیں ہوئے تھے۔ اس بار بھی انھوں نے کوئی مدافعت نہیں کی۔ پوری عمر والے ساٹھ ساٹھ سال کے لوگ سر جھکائے لٹنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرنے لگے چوروں کی بے حیائی میں کچھ ایسی مسحور کن تاثیر ہوتی ہے کہ وہ کبھی کسی قسم کی مدافعت کی توقع ہی نہیں کرتے (علاوہ ازیں وہ اربابِ اقتدار کی حمایت پر ہمیشہ یقین کرتے ہیں) بوردنیک ظاہر کرتا رہا کہ وہ اپنی شطرنج میں محو ہے لیکن اب تک وہ غصے میں ابلنے لگا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کس طرح ان کے دماغ درست کرنا زیادہ مناسب ہوگا جیسے ہی ایک چور اس کے سامنے آکر رکا اس نے اپنا پھر تیلا پیر پھیلا کر اس کے منہ پر زوردار لات جمائی پھر نیچے کود کر کچرے کی بالٹی کا موٹا چوبی ڈھکن اٹھایا اور دوسرے چور کے سر پر

دے مارا۔ بعد ازاں اس نے ڈھکن سے باری باری دونوں کو مارنا اس وقت تک جاری رکھا جب تک ڈھکن چور چور نہ ہو گیا ہوا اور اس کے ہاتھوں میں کراس جیسے دو ٹھوس ڈنڈے باقی رہ گئے۔ اب چوروں نے گھگھیانا شروع کر دیا لیکن یہ حقیقت تسلیم کرنی ہو گی کہ ان کے کراہنے میں قدرے تمسخرانہ انداز تھا جیسے وہ محض تفریح کے طور پر پٹ رہے ہوں: "تم یہ کیا ستم کر رہے ہو! لوگوں کو اس سے پیٹتے ہو؟" اپنی طاقت کے زعم میں دوسروں کو خائف کرنے کی کوشش مت کرو" بورونیک انھیں مارتا رہا۔ پھر ایک چور بھاگ کر کھڑکی کے پاس پہنچ گیا اور چیخا ــ "بچاؤ! یہ فاشسٹ ہمیں مارے ڈالتے ہیں۔"

چوروں نے اس حادثے کو کبھی فراموش نہیں کیا اور بعد ازاں انھوں نے کئی بار بورونیک کو دھمکیاں دیں" تم سے پہلے ہی لاش جیسی بدبو آتی ہے، ہم تمھیں اپنے ساتھ لے جائیں گے!" لیکن اس پر حملہ آور ہونے کی ہمت انھوں نے کبھی نہیں کی۔

کچھ ہی عرصے بعد ہمارے سیل کا کبھی بدمعاش مجرموں* کے ساتھ جھگڑا ہو گیا ہم یارڈ میں ذرا ٹانگیں سیدھی کرنے اور رفع حاجت کی غرض سے آئے تھے کہ ایک خاتون جیلر نے ہمارا تعاقب کرنے کے لیے اپنا معتمد ٹرسٹی (نمبردار) ہمارے ساتھ لگا دیا (سیاسی قیدیوں پر) اس کے رعب دکھانے کا اثر ایک تیز طرار نوجوان قیدی دولودیا پر، جسے حال ہی میں سزا ہوئی تھی، بڑا منفی ہوا اور اس نے اسے اپنی توہین محسوس کی چنانچہ دولودیا نے اس نمبردار کو درمیان میں روک لیا اور ایک گھونسے میں اسے زمیں بوس کر دیا۔ پہلے ۵۸ والے قیدی اس قسم کے حادثے پر خاموش رہ گئے ہوتے لیکن اب آذربائیجان کے میکسم نے (جس نے اپنے اجتماعی کاشت یونین یا کولخوز کے صدر کو قتل کر دیا تھا) نمبردار پر ایک پتھر پھینکا اور بورونیک نے اس کے جبڑے پر ایک گھونسہ جمایا اس نے بورونیک کو چھرا مارا (وارڈروں کے معاونین اپنے پاس چھرے رکھتے تھے چنانچہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی) اور اپنی حفاظت کے خیال سے وارڈروں کی طرف بھاگا۔ کیوں کہ بورونیک اس کے تعاقب میں تھا انھوں نے جلدی جلدی ہمیں سیل سے باہر نکال دیا اور جیل کے اعلیٰ افسران یہ دیکھنے کے لیے آ پہنچے کہ غلطی کس کی تھی اور انھوں نے ہمیں گروہ بنا کر جھگڑا کرنے کے جرم میں سزا بڑھا دینے کی دھمکی دی۔ (ایم۔ وی۔ ڈی یعنی حفاظتی پولس کے کارکن کا دل اپنے محبوب اور نزدیکی آدمی یعنی نمبردار کے لیے ہمیشہ ہمدردی محسوس کرتا ہے) بورونیک کا خون کھول ہی رہا تھا۔ وہ از خود آگے بڑھ گیا " ان حرام زادوں کی خبر میں نے لی ہے۔ اور جب تک زندہ رہوں گا انھیں ماروں گا!" سرپرست* (حفاظتی پولس کے افسر اعلیٰ) نے ہمیں متنبہ کیا کہ ہم انقلاب دشمن اکڑ کر نہیں رہ سکتے اور ہمارے لیے مناسب ہوگا کہ اپنی زبانوں پر قابو رکھیں۔ اس پر دولودیا گیرشنی اچھل کر سامنے آیا، وہ ابھی نوعمر ہی تھا اور اپنی گرفتاری کے وقت یونیورسٹی میں سال اوّل کا طالب علم تھا اور اس گیرشنی کا صرف نام ہی نہ رکھتا تھا بلکہ بھتیجا بھی تھا جو کبھی کمیونسٹ انقلابی (ایس۔ آر) دہشت پسند دستے کا کمانڈر تھا۔ وہ لڑاکو مرغ کی طرح تیز آواز میں "سرپرست" پر برس پڑا " خبردار جو ہمیں انقلاب دشمن کہا یہ سب باتیں پرانی ہو گئیں۔ ہم نئے انقلابی ہیں، اس بار سوویٹ سرکار کے خلاف!

ہمیں کتنا لطف آیا، ہم آج ہی کے انتظار میں تو زندہ تھے! اسریہ ست نے ذرا گھور کر دیکھا، غرایا اور خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ کسی کو بھی حوالات میں بند نہیں کیا گیا اور جیل کے افسران دم دبا کر پیچھے ہٹ گئے۔ کیا اب آیندہ جیلوں کی زندگی ایسی ہی ہوگی؟ تو کیا ہم لڑ سکتے ہیں؟ اپنے اخبار سازوں پر چوٹ کر سکتے ہیں؟ اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کر سکتے ہیں؟ اس تمام عرصے میں ہم احمقوں کی طرح منہ کھولے وہ سب کچھ برداشت کرتے رہے۔ آسانی سے رد دینے والوں میں زدو کوب کرنے میں مزہ آتا ہے۔ ہم آہ و زاری کرتے تھے اس لیے وہ ہمیں پیٹتے تھے۔

اب ان مشہور کیمپوں میں، جہاں وہ ہمیں لے جا رہے تھے۔ جہاں لوگوں پر اسی طرح نمبر پڑے رہتے ہیں جہاں نازی کیمپوں میں، جہاں بالآخر صرف سیاسی قیدی ہوں گے۔ گندے اخلاقی جرائم کرنے والے نہ ہوں گے۔ وہاں شاید نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔ سیاہ آنکھوں اور بہت سفید ابھرے ہوئے چہرے والے ولودیا گیرشنی نے پُرامید لہجے میں کہا "ایک بار ہم کیمپ پہنچ جائیں تو ہم کو جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ ہم کن لوگوں کے درمیان ہیں"۔ بے وقوف لڑکا! کیا وہ واقعی وہاں گرما گرم سیاسی ماحول ملنے کی توقع رکھتا تھا جہاں بہت سی مختلف سیاسی نظریات رکھنے والی پارٹیاں، بحث مباحثے، پروگرام اور خفیہ نشستیں منعقد کرنے میں گرم جوشی کے ساتھ منہمک ہوں گی۔ "ہمیں کن لوگوں میں ہیں!" معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس انتخاب کا حق ہم کو مل گیا ہو۔ جیسے ہمارے لیے ان لوگوں نے یہ بات طے نہ کر دی ہو۔ جنھوں نے ہر جمہوریہ سے گرفتاریوں کی تعداد مقرر کر دی ہے اور کیمپوں میں منتقل کرنے والی ٹرینوں کی باربرداری کے بل تیار کیے ہیں۔

ہمارے بے حد طویل سیل میں، جو کبھی اصطبل ہوا کرتا تھا، سونے کے لیے دو منزلہ چبوتروں کی دو قطاریں بنی ہوئی تھیں اور ساتھ ہی ناندوں کی دو لائنیں تھیں۔ درختوں کے ٹیڑھے میڑھے تنوں کے ستون ایک خستہ و بوسیدہ چھت کو سہارا دیے ہوئے تھے اور لمبی دیواریں اصطبل کی مخصوص کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں، جن سے گھاس براہِ راست ناندوں میں پہنچائی جا سکے (مترل یا چوکھٹ کے ذریعے انھیں تنگ تر کر دیا گیا تھا) ہمارے سیل میں ۱۲۰ افراد تھے جو ہر قسم کے اور مختلف العمر تھے۔ ان میں بالٹک ریاستوں کے ناخواندہ، سادہ لوح دہقان تھے، اس علاقے میں پارٹی کی تطہیر کا عمل دوسری بار چل رہا تھا اور جو لوگ اپنی مرضی سے اجتماعی کاشت پر آمادہ نہیں ہوتے تھے یا جو پہلے ہی سے مشکوک تھے کہ یہ اس پروگرام میں شامل ہونے پر رضامند نہ ہوں گے، انھیں حراست میں لیا جا رہا تھا یا جلاوطن کیا جا رہا تھا ـــــ پھر بہت سے یوکرینی ـــ یوکرین قوم پرست تنظیم (او۔ یو۔ این) کے اراکین تھے۔ ان کے ہمراہ ایسے لوگ بھی تھے جن میں سے کسی کو انھوں نے ایک رات کے لیے اپنے یہاں قیام کرنے کی اجازت دی تھی یا کھانا کھلا دیا تھا۔ پھر روسی سوویٹ یونین کے اراکین.... تھے ان میں نئے لڑکے کم تھے زیادہ تر دوبارہ سہ بارہ گرفتار ہونے والے تھے اور چند غیر ملکی تو تھے ہی۔

ہم سب کو ایک ہی کیمپ کمپلکس میں منتقل کیا جا رہا تھا (ہم نے ریکارڈ کلرک سے معلوم کیا کہ یہ اسٹیپلاگ گروپ تھا) میں نے ان لوگوں کو بغور دیکھا جنھیں تقدیر نے میرے ساتھ ایک جگہ پہنچا دیا تھا

اور ان کے دلوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

مجھے اسٹونین اور لتھوانی خاص طور پر خوش مزاج معلوم ہوئے ہر چند کہ میری حالت ان سے بہتر نہ تھی لیکن انھوں نے مجھے شرمندہ کر دیا جیسے ان کی حراست کا ذمہ دار میں ہی ہوں۔ اچھے بھلے محنتی، قول کے سچے، سادہ لوح ان لوگوں کا کیا قصور تھا کہ انھیں ایک ہی چکی میں ہمارے ساتھ پیسا جا رہا تھا؟ انھوں نے کسی کو ضرر نہیں پہنچایا تھا۔ وہ پرسکون اور باقاعدہ زندگی بسر کرتے تھے جو ہماری طرزِ زندگی سے زیادہ اخلاقی تھا۔ اور اب انھیں خطاکار کہا جا رہا تھا کیونکہ ہم گرسنہ تھے، کیوں کہ وہ ہم سے چپکے رہتے تھے اور سمندر تک ہمیں پہنچانے والی راہ کی رکاوٹ تھے۔

"مجھے روسی ہونے پر خفت ہے۔" ہرزن نے اس وقت کہا جب ہم پولینڈ کا دم گھونٹ رہے تھے۔ ان صاف دل اور سادہ مزاج لوگوں کے سامنے مجھے دوسری شرمندگی محسوس ہوئی۔

لٹوانی لوگوں کے بارے میں میرا رویّہ زیادہ پیچیدہ تھا۔ ان کی بدقسمتی تو مقسوم ہو چکی تھی۔ انھوں نے خود ایسے بیج بوئے تھے*

اور یوکرینی؟ ہم نے بہت مدت سے "یوکرینی قوم پرست" الفاظ کا استعمال ترک کر دیا ہے، ہم صرف "بینڈرسٹ" کہتے ہیں اور یہ لفظ اتنا کثیف ہو چکا ہے کہ کوئی بھی اصلیت کو معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتا (ہم انھیں "ڈاکو" کہتے ہیں — ہم اپنے اس مروّجہ اصول پر کاربند ہیں کہ جو ہماری خاطر لوگوں کو مار ڈالتا ہے وہ تو پارٹیزن (دشمنوں کی حملہ آور قطاروں میں چھپ کر وار کرنے والے بے قاعدہ فوجی) ہے اور جو لوگ ہمیں مارتے ہیں وہ "ڈاکو" ہیں — ۱۹۲۱ء کے تانبوف کساون* کے واقعات کے بعد سے یہی طریقہ رائج ہو گیا ہے)

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ بہت پہلے کیف کے عہد میں ہم اور یوکرینی ایک ہی قوم تھے لیکن بعد ازاں ہمیں منقطع کر کے الگ الگ کر دیا گیا اور گزشتہ کئی صدیوں سے ہماری زندگی، ہماری رسوم اور ہمارے تجربے بالکل علیحدہ راستہ پر گامزن ہیں اور مبیّنہ "اتحادِ نو" بڑا بے ڈھنگا تھا حالانکہ کچھ لوگوں میں خیال میں یہ ہماری قدیم برادری کو متحد کرنے کے لیے خلوصِ قلب سے شروع کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد گزرنے والے تین صدیوں کا ہم نے مناسب استعمال نہیں کیا۔ روس کے کسی قومی رہنما نے یوکرینی اور روسی اور عوام کو ہم رشتہ کرنے اور خلیج کو پُر کرنے کے مسئلے پر زیادہ توجہ صرف نہیں کی (اگر یہ اتحاد پر خلوص ہوتا تو پہلی یوکرینی کمیٹی کا ۱۹۱۷ء کے موسم بہار میں تشکیل نہ ہوئی ہوتی اور نہ بعد ازاں راڈا کا قیام عمل میں آتا)

حصولِ اقتدار سے قبل بالشکوں کو یہ مسئلہ پیچیدہ محسوس نہیں ہوا۔ ۷ جون ۱۹۱۷ء کے پراودا میں لینن رقم طراز ہے: "ہم یوکرین اور دیگر علاقوں کو جن میں عظیم روس کے باشندے نہیں رہتے، زار اور سرمایہ داروں کے مقبوضہ علاقے تصور کرتے ہیں۔" یہ بات لینن نے اس وقت لکھی تھی

جب ابھی مرکزی راداد جود میں تھا بعد ازاں ۲۰ نومبر ۱۹۱۷ء کو " روسی عوام کے حقوق کا اعلان نامہ" منظور کیا گیا۔ کیا اس مذاق کو غور و فکر کے بعد روا رکھا گیا تھا؟ کیا یہ محض فریب تھا جب یہ اعلان کیا گیا کہ روس کے عوام کو خود فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے اور وہ چاہیں تو یونین سے علیحدہ بھی ہو سکتے ہیں؟ چھ ماہ بعد روسی عوام نے قیصر کے جرمنی سے التماس کی کہ وہ یوکرین کے ساتھ صلح کرے اور سرحدوں کے تعین کے لیے ثالث بنے اور لینن نے ۱۴ر جون ۱۹۱۸ء کو ہٹمین اس کا روپدسکی کے ساتھ اس مقصد کے تحت ایک صلح نامے پر دستخط کیے۔ اپنے اس عمل سے اس نے ظاہر کیا کہ وہ یوکرین کے علیحدہ ہونے کی بات مکمل عوام تسلیم کر چکا ہے۔

لیکن یہ بات عجیب دیکھیے کہ جیسے ہی انٹنٹ (کچھ اقوام کی تنظیم) نے جرمنوں کو شکست دی (جس کا یوکرین کے ساتھ ہمارے تعلقات کی بنیادی پالیسی پر کوئی اثر نہ پڑ سکتا تھا) جیسے ہی ہٹمین کا اپنے حامیوں سمیت زوال شروع ہوا۔ جیسے ہی ہم پٹلیورا سے زیادہ قوی ثابت ہوئے (ایک گالی ہے" پلیرد وائٹ" لیکن یوکرین کے شہری لوگ اور کسان ہی اپنی زندگی ہماری دخل اندازی کے بغیر گزارنا چاہتے تھے) ہم نے فوراً وہ حد پار کرلی۔ جسے ہم نے تسلیم کیا تھا اور اپنے سگے بھائیوں پر اپنی حکومت ٹھونپ دی۔ یہ واقعہ ہے کہ پندرہ بیس سال بعد تک ہم نے یوکرینی زبان کے ساتھ بڑا کھلواڑ کیا۔ شاید اسے زور شور کے ساتھ فروغ دیا اور اپنے بھائیوں کو یہ تاثر دیا کہ وہ ہر طرح خود مختار ہیں اور وہ حسب مرضی یونین سے منقطع ہو سکتے ہیں۔ لیکن جنگ کے بعد جب انھوں نے علیحدہ ہونے کی کوشش کی تو ہم نے" بینڈرسٹ" کہہ کر انھیں لعنت ملامت کی۔ انھیں گھیرنا، اذیت دینا، پھانسی پر چڑھانا یا کیمپوں میں مقید کرنا شروع کر دیا (لیکن بینڈرسٹ پلیورائٹوں، کی طرح محض وہ یوکرینی ہیں جو دوسروں کی حکومت میں نہیں رہنا چاہتے؛ جب انھیں ایک بار علم ہو گیا کہ ہٹلر انھیں وہ آزادی حاصل نہ کرنے دے گا جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ تو وہ جنگ کی پوری مدت میں ہمارے علاوہ جرمنوں کے ساتھ بھی نبرد آزمائی کرتے رہے لیکن ہم خاموش رہے کیوں کہ ۱۹۴۴ء کی وارسا بغاوت کی مانند اس سے ہماری کمزوریوں پر روشنی پڑتی تھی)

یوکرینی قوم پرستی سے، اپنے بھائیوں کی اس خواہش سے کہ وہ اپنی زبان استعمال کریں اپنے بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دیں اور اسی زبان میں اپنی دکانوں کے سائن بورڈ لکھیں ہم پریشان کیوں ہوتے ہیں؟ اس موضوع پر (دی وہائٹ گارڈ میں) میخائل بلگاکوف بھی بہک گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم پوری طرح گھل مل کر متحد ہونے میں ناکام ہوئے ہیں کہ ہم کچھ اعتبار سے اب بھی مختلف ہیں (اور یہ کافی ہے کہ وہ، جو اقلیتی اقوام یا فرقوں سے ہیں، یہ فرق محسوس کرتے ہیں) کہ یہ بات خواہ کتنی ہی ناخوشگوار ہو۔ لیکن ہم بطور خاص چوستی اور پانچویں ہائیوں میں کیے بعد دیگرے کئی مواقع پر چوک گئے۔ کہ مسائل نے عہد زار میں شدت اختیار نہیں کی۔ ملکہ زار کے بعد حالات زیادہ خراب ہوئے۔ ان کی علیحدگی پسندی سے ہم اتنے پریشان کیوں

ہوتے ہیں؟ کیا ہم نے اوڈیسا کے ساحل کے علاقوں نے دست برداری کا اعلان نہیں کیا؟ یا سرکاشیا کے پہاڑ نہیں چھوڑ دیے؟

میرے لیے یہ ایک تکلیف دہ موضوع ہے، میرے لہو میں، میرے قلب میں، میرے تصورات میں، روس اور یوکرین جز ولاینفک کے طور پر موجود ہیں لیکن کیمپوں میں عرصے تک یوکرینی لوگوں کے نزدیک رہ کر مجھے محسوس ہوا کہ وہ اس سوال پر کس اذیت کا احساس کرتے ہیں۔ ہماری نسل پچھلی نسل کی غلطیوں کا خمیازہ بھگتنے سے نہیں بچ سکتی۔

پیر پٹختے ہوئے چیخ چیخ کر یہ کہنا بے حد آسان ہے کہ فلاں چیز میری ہے! اور یہ اعلان کرنا بے حد دشوار کہ "آپ حسبِ مرضی زندگی بسر کریں۔" بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہم اس تخیلی دنیا میں نہیں رہ سکتے جس میں ہمارا آخری اور معمولی شخصیت رکھنے والا شہنشاہ گرفتار تھا۔ خواہ یہ امر تعجب خیز محسوس ہو لیکن ہمارے ترقیاتی اعلیٰ اصول (یعنی مارکس ازم جو دنیا بھر میں سب سے ترقی یافتہ نظریہ* ہونے کا دعویٰ دار ہے) کی یہ پیشین گوئی سچی ثابت نہیں ہوئی کہ قوم پرستی رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی۔ ایٹم اور سائیبرنیٹکس کے اس عہد میں اسے از سرِ نو تقویت ملی ہے۔ آپ خوش ہوں یا ناخوش، لیکن وہ وقت دور نہیں جب ہمیں خود فیصلہ کرنے اور آزادی کے بارے میں کیے ہوئے اپنے تمام وعدے ایفا کرنے ہوں گے۔ ہمیں یہ وعدے اپنی مرضی سے پورے کر دینے چاہئیں اور انتظار نہ کرنا چاہیے کہ اس کے لیے ہمیں بھٹی میں تپایا جائے، غرقِ دریا کیا جائے یا ہماری گردنیں اڑائی جائیں۔ ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے اپنی بزرگی، اپنے علاقوں کی وسعت یا اپنے اقتدار میں رہنے والی اقوام کی تعداد سے ثابت کرنے کی جگہ اپنے اعمال کی عظمت سے ثابت کرنی چاہیے۔ اپنی بزرگی ہمیں ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد جو ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتے، باقی ماندہ زمینوں میں ہونے والی جتائی کے عمق سے ثابت کرنی چاہیے۔

یوکرین ایک انتہائی تکلیف دہ مسئلہ بن جائے گا لیکن ہمیں محسوس کرنا چاہیے کہ اس وقت سارے عوام کے جذبات مشتعل ہیں۔ چونکہ دونوں قومیں صدیوں تک ساتھ رہنے کے باوجود ہل مل کر زندگی نہیں گزار سکیں اس لیے دانش مندی کا اظہار کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہمیں فیصلہ خود یوکرینیوں پر چھوڑ دینا چاہیے فیڈرلسٹوں اور علیحدگی پسندوں کو اپنے طور پر ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کرنے دیجیے۔ ان کی بات نہ ماننا خود دماغی اور سنگدلی ہوگی اور اب ہم جتنی ملائمت، تحمل اور اپنی بات کو واضح کرنے میں جتنی احتیاط برتیں گے اتنا ہی مستقبل میں دوبارہ اتحاد قائم ہونے کی گنجائش پیدا ہوگی۔

انھیں اپنی زندگی اپنے طور پر بسر کرنے دو اور تجربہ کرنے دو کہ یہ کس طرح گزرے گی۔ وہ جلد ہی محسوس کر لیں گے کہ حکومت الگ بن جانے سے سارے مسائل حل نہیں ہو جاتے۔[۵]

نہ معلوم وجوہ سے اصطبل کو تبدیل کر کے بنائے ہوئے سیل میں ہمارا قیام خاصہ طویل رہا اور ایسا نظر آتا تھا کہ ہمیں اسٹیپلاگ کی جانب آگے کبھی نہ روانہ کیا جائے گا۔ ایسا بھی نہیں کہ ہمیں

کوئی عجلت تھی، ہم اپنی جگہ زندگی مزے کے ساتھ بسر کر رہے تھے اور اگلی جگہ اس سے خراب ثابت ہو سکتی تھی۔

ہمیں اخبارات سے محروم نہیں گیا تھا۔ وہ روزانہ ایک طرح کا نصف سائز کا اخبار فراہم کرتے تھے۔ کبھی کبھی اُسے پڑھ کر سارے سیل کو سنانے کی ذمہ داری مجھے دی جاتی اور میں اسے جذباتی انداز میں سنایا کرتا تھا کیونکہ وہاں کچھ باتیں تھیں جن کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسا کرنا ضروری تھا۔

اسٹونیا، لٹونیا اور لتھوانیا کی 'آزادی' کی دسویں سالگرہ عین اسی زمانے میں ہوئی۔ جو لوگ روسی زبان سے واقف تھے وہ ترجمہ کر کے دوسروں کو سناتے تھے (میں انہیں اس کے لیے موقع فراہم کرنے کی غرض سے پڑھتے ہوئے وقفہ دیا کرتا تھا) اور جب وہ سُنتے تھے کہ ان کے ممالک میں تاریخ میں پہلی مرتبہ آزادی اور خوشی کا دور دورہ ہے' اس وقت سونے کے تختوں سے جو آوازیں بلند ہوتی تھیں اُنہیں غرّاہٹ کا ہی نام دیا جا سکتا ہے۔ بالٹک ممالک کے ان باشندوں کے (جن کی تعداد اس عبوری جیل میں ایک ثلث سے زائد تھی) گھر اُن کی عدم موجودگی میں تباہ ہو گئے تھے اور ان میں سے شاید کوئی ایسا خوش نصیب ہو گا جس کا خاندان اب بھی وہاں مقیم ہو اور قیدیوں کے جتھے کے ساتھ سائبیریا جانے سے بچ گیا ہو۔

لیکن اس عبوری قید خانے میں سب سے زیادہ اشتعال کوریا کی خبریں پیدا کرتی تھیں اسٹالن کا برق رفتار حملہ ناکام ہو گیا تھا۔ اب تک اقوام متحدہ کے رضا کار جمع کر لیے گئے تھے ہم کوریا کو تیسری عالمی جنگ کا پیش خیمہ اور اگلا اسپین سمجھنے لگے تھے (اور اسٹالن کا عندیہ غالباً اسے اس کا ریہرسل قرار دینے کا تھا) وہ اقوام متحدہ کے فوجی ہمارے لیے خصوصی محرک تھے۔ کتنے اچھے پرچم کے تلے جنگ آزما تھے! یہ وقت کیسے متحد نہ کر دے گا! یہ مستقبل کے متحد عالم انسانیت کی ابتدائی شکل تھی۔

ہم مغموم تھے اور اپنے دکھ سے اُوپر نہ اٹھ سکتے تھے۔ اگر ہم نے یہ خواب دیکھا ہوتا کہ ہم جان دے دیں تاکہ وہ لوگ زندہ رہ سکیں جو ہماری تباہی کے بعد بے عمل سے نظر آتے تھے؛ ہمیں یہ منظور نہ تھا۔ ہم طوفان کے آرزومند تھے۔

کچھ لوگ یہ سن کر حیران ہوں گے۔ کیسی بدحواسی اور فرطِ غضب میں اندھا کرنے والی کیفیت تھی۔ کیا تمہیں اس امر کی ذراسی بھی فکر نہیں کہ جنگ کے حلقۂ اثر سے باہر کے لوگ کتنی مصیبت میں مبتلا ہو جائیں گے؟ ارے بھئی ـــــ آزاد لوگوں نے ہمارے بارے میں فکر مند ہونے کی زحمت گوارا نہیں کی تو تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہیں جنگ عظیم کی آرزو کرنی چاہیئے؟ جب ان تمام لوگوں کو ۱۹۵۰ء میں ۱۹۷۵ء تک جاری رہنے والی سزائیں دی گئی تھیں تو اُن کے پاس جنگِ عظیم سے توقع وابستہ کرنے کے سوا اور رہ ہی کیا گیا تھا؟

اس وقت ہم نے جو غلط اور مضرت رساں توقعات وابستہ کر رکھی تھیں انہیں یاد کر کے

خود میرا دل لرز جاتا ہے۔ وسیع پیمانے پر ایٹمی غارت گری کسی کے لیے بھی باعثِ نجات نہیں ہو سکتی اور ایٹمی جنگ کے خطرے کو چھوڑ دیں تو جنگ کی صورتحال داخلی مظالم کے لیے محض ایک حیلہ بن کر رہ جاتی ہے اور اسے بڑھاوا دیتی ہے۔ لیکن اگر میں ان گرمیوں کے دنوں کے اپنے جذبات سے متعلق حق بیانی نہ کروں گا تو میری داستان کی خوش نمائی میں فرق آ جائے گا۔

رومین رولاں کی نسل اپنے ایام شباب میں جنگ کے مسلسل خطرے سے غمگین رہتی تھی لیکن ہم قیدیوں کی نسل اس کے فراق میں غمزدہ تھی اور اس بات کو چھپانا خصوصی سیاسی کیمپوں کے جذبات کو مسخ کر کے پیش کرنے کے مترادف ہو گا۔ انہوں نے ہمیں اس عالم میں پہنچا دیا تھا۔ عالمگیر جنگ سے یا تو ہماری موت واقع ہو جائے گی (وہ پہرے کی برجیوں سے گولیاں برسائیں ہماری خوراک کو مسموم کر دیں، ہم پر بیماری کے جراثیم چھوڑ دیں، جرمنوں کے طرز پر) ورنہ پھر ہم آزاد ہو جائیں گے۔ دونوں صورتوں میں پچیس سال کی سزا کے مکمل ہونے سے قبل نجات مل جاتی ہے۔

پیٹنیا، پ۔ وہ اسی توقع پر بیٹھا تھا۔ ہمارے سیل میں پیٹنیا، پ۔ وہ یورپ سے پہنچنے والا آخری زندہ آدمی تھا۔ جنگ کے فوراً بعد ہر جگہ کے سیل یورپ سے پلٹنے والے ان روسیوں سے کھچا کھچ بھر گئے تھے۔ لیکن عرصہ پہلے سب سے پہلے آنے والے یا تو کیمپوں میں مقید تھے یا پیوند زمین ہو چکے تھے اور بقیہ لوگوں نے روس سے دور ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو پھر یہ پیٹنیا کہاں سے آ ٹپکا۔ وہ اپنی مرضی سے ۱۹۴۷ء میں اس وقت یہاں آیا تھا جب عام لوگ واپس نہیں آ رہے تھے۔

خارکوف کے نزدیک، دورانِ تعلیم ہی جنگ نے اُسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ خارکوف میں وہ ایک صنعتی اسکول میں زیرِ تربیت تھا جہاں اُسے بالجبر داخل کیا گیا تھا۔ یوں ہی، بغیر کسی خاص وجہ کے جرمن لوگ ان لڑکوں کو جرمنی لے گئے جہاں وہ خاتمۂ جنگ تک "اوسٹار بیٹر" کی حیثیت سے مقیم رہا لیکن وہاں اُس کی زندگی کا فلسفہ بن گیا کہ انسان کو جینے کا آسان طریقہ تلاش کرنا چاہیئے۔ ایسے فضول کام نہیں کرتے رہنا چاہیئے جیسے کام کرنے کے لیے اُسے بچپن سے تیار کیا گیا ہے۔ مغربی ممالک میں شدید مصائب سے متعلق آسانی باور کر لیے جانے والی فطرت اور سرحدی پابندیوں میں تعطل کی وجہ سے اُس نے فرنچ گاڑیاں چوری سے اٹلی روانہ کیں اور اٹالین گاڑیوں کو فرانس بھیجا اور انہیں سستے داموں فروخت کر دیا لیکن فرانسیسیوں کو سُراغ مل گیا اور اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ اب اُس نے روسی سفارت خانے کو مراسلہ بھیجا کہ وہ اپنی مادرِ وطن میں لوٹنا چاہتا ہے۔ پ، وہ کی دلیل یہ تھی کہ فرانس میں اُسے دس سال کی سزا ہو سکتی تھی جو اُسے پوری مدت کے لیے بھگتنا ہو گی جب کہ سوویٹ یونین میں اُسے غداری کے جُرم میں پچیس سال کی سزا ملے گی لیکن آنے والے طوفان ـــــ تیسری عالمی جنگ کے اوّلین شرنکے شروع

ہو گئے تھے؛ اس کا خیال تھا کہ سوویٹ یونین تین سال بھی قائم نہ رہ سکے گی اس لیے روسی جیل میں جانا زیادہ مفید ہوگا۔ فی الفور بن جانے والے دوست سفارت خانے سے آئے اور انہوں نے پ۔ و۔ کو سینے سے لگا لیا۔ فرانسیسی عہدیداران ایک چور سے نجات پاکر خوش ہوئے بچے پیٹیا جیسے تقریباً تیس افراد سفارت خانے میں جمع تھے انہیں فرانسسک تک بحری راستے سے آرام کا سفر کرایا گیا شہر میں آزادانہ گھومنے کی اجازت ملی اور آئندہ چوبیس ۲۴ گھنٹوں میں یکے بعد دیگرے دوبارہ حراست میں لے لیا گیا۔

اب سیل میں اپنے ساتھیوں کے لیے پیٹیا نے مغربی اخبارات (اُسی نے کرانچکو کا مقدمہ بغور دیکھا سنا تھا) مغربی ڈرامے (وہ اپنے گالوں اور ہونٹوں سے کام لے کر مغربی دھنیں بڑی خوش اسلوبی سے نقل کر لیتا تھا) اور مغربی فلموں کا (وہ ہمیں قصے سناتا اور اداکاری کرکے دکھاتا) کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔

کو بیشیف عبوری جیل میں یہ سلسلہ کتنا آزادانہ اور سہل تھا۔ متفرق سیلوں کے رہنے والے مشترکہ یارڈ میں کبھی کبھار ملتے تھے۔ نیم وا جھروکوں سے ہم گزرتی ہوئی گاڑیوں کے مسافروں سے مختصراً گفتگو کر لیتے تھے۔ بیت الخلاء جاتے ہوئے ہم خاندانوں والی بیرک کی کھلی کھڑکیوں تک پہنچ جاتے تھے (جن پر سلاخیں تو تھیں پردے نہیں تھے) ان بیرکوں میں کئی کئی بچوں کے ساتھ عورتیں قید تھیں۔ (وہ بھی بالٹک ریاستوں اور یوکرین کے نوآبادکار ملاتے میں روانہ کی جا رہی تھیں اور دو منقلب شدہ اصطبلوں کے درمیان ایک دراڑ تھی جسے "ٹیلی فون" کا نام دیا گیا تھا) جہاں دیوار کے دونوں جانب بیٹھ کر لوگ صبح تا شام خبروں پر بحث مباحثے کرتے رہتے تھے۔

ان تمام آزادیوں سے ہمیں اور بھی تحریک ملتی تھی' ہمیں اپنے پیروں کے نیچے زمین زیادہ ٹھوس محسوس ہونے لگی اور ہم یہ تصور کر سکتے تھے کہ ہمیں قید کرنے والوں کے پیروں تلے زمین بے حد گرم ہو رہی ہے۔ جب ہم یارڈ میں ادھر ادھر چلتے پھرتے تھے تو جولائی کی دھوپ سے منور آسمان کی طرف منہ اٹھا لیتے تھے اگر دفعتاً غیر ملکی بمباروں کا نشان بناتے ہوئے کہیں سے برآمد ہوتے تو ہمیں قطعی تعجب یا خوف کا احساس نہ ہوتا۔ زندگی جیسی کچھ تھی ہماری نظروں میں اُس کی کوئی قیمت نہ تھی۔

جن قیدیوں کو کاراباسفری جیل سے دوسری سمتوں میں لے جایا جا رہا تھا وہ دیواروں پر چسپاں پوسٹروں کی خبریں لے کر آتے تھے: "ہم اور زیادہ برداشت نہیں کریں گے"! ہمارے دماغ جوش سے اُبل پڑتے تھے اور ایک گھٹن والی رات کو جب اومسک میں ہمیں جیل کی گاڑیوں میں اس طرح بھرا اور بند کیا جا رہا تھا جیسے خون نکلتے ہوئے گوشت کے لوتھڑے قیمے کی مشین میں ٹھونسے جاتے ہیں' تو ہم وارڈروں پر برس پڑے "ذرا ٹھہر جاؤ لٹیرو! ٹرومین تمہارے دماغ درست کرے گا' وہ تمہارے سروں پر بموں کی بارش کریں گے!" اور وہ بزدل چپ سادھ لیتے تھے وہ مضطرب تھے اور جانتے تھے کہ ہماری مدافعت بتدریج زیادہ طاقتور ہوتی جا

رہی ہے اور ہمیں محسوس ہوتا تھا کہ انصاف زیادہ سے زیادہ واضح طور پر ہمارے قریب آیا ہے ہم انصاف حاصل کرنے کی آرزو سے اتنے بیزار ہو چکے تھے کہ اگر ہم اور ہمارے ایذا دہندگان کو ایک ہی بم سے بھون دیا جاتا تب بھی ہمیں کوئی پروا نہ ہوتی۔ ہم اس انتہائی کیفیت میں داخل ہو چکے تھے جس میں آپ کے پاس کھونے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

اگر اس بات کا وضاحت سے ذکر نہ کیا گیا تو مجمع الجزائر کی چھوٹی دہائی کی مکمل داستان سامنے نہیں آسکے گی۔

اوسک کی جیل، جس میں دستووسکی بھی نظر بند رہا تھا، کسی قدیم گلاگ عارضی کیمپ کی طرح نہ تھی۔ یہ کیتھرین دوم کے زمانے سے چلی آنے والی ایک بہت بڑی جیل تھی اور اس کی کال کوٹھریاں بطور خاص بڑی بھیانک تھیں۔ اس کے کسی زیر زمین سیل سے بہتر فلمی سیٹ کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ چھوٹی سی چوکور کھڑکی ایک ترچھے شیفٹ کے اوپر ہے جو زمین کی سطح تک چلی گئی ہے۔ اس کھڑکی کی گہرائی تین میٹر تھی جس سے پتہ چلتا ہے کہ دیواریں کس قسم کی تھیں۔ سیل پر چھت نہیں ہے بلکہ بھاری بھرکم خوفناک محرابیں اوپر جا کر مل جاتی ہیں۔ ایک دیوار گیلی ہے، پانی سطح میں سے رس کر آتا ہے اور فرش تک پہنچتا ہے۔ صبح وشام یہاں اندھیرا ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ روشنی کا وقفہ سہ پہر کو آتا ہے جس میں نیم تاریکی ہوتی ہے۔ اس میں چوہے نہیں ہیں لیکن قوتِ شامہ محسوس کرتی ہے کہ ان کی بدبو آرہی ہے۔ اگرچہ گنبد والی چھت اتنی نیچی ہے کہ کئی مقامات پر آپ اسے چھو سکتے ہیں لیکن یہاں بھی جیل والوں نے سونے کے تختوں کی دو منزلیں تعمیر کر دی ہیں جن میں سے نچلا تختہ زمین سے بمشکل دو انچ کی بلندی پر ہے۔

آپ شاید خیال کریں کہ اس جیل میں ہماری وہ دھندلی اور باغیانہ خواہشات مٹ گئی ہوں گی جو ہم میں ڈھیلے بندھنوں والی کوبشیف عارضی جیل میں پیدا ہوئی تھیں۔ لیکن نہیں! شام کو پندرہ واٹ کے ایک بلب کے پاس، جس کی روشنی موم بتی سے زیادہ نہیں ہوتی تھی، اوڈلید کے بڑے چرچ کا گنجا، تیکھے نقش ونگار والا وارڈن دروزدوف کھڑکی والے شیفٹ کے قریب آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور کمزور لیکن جذباتی آوازمیں، ایک ایسے لہجے میں جیسے یہ آدمی قریب المرگ ہو، ایک قدیم انقلابی نغمہ چھیڑ دیتا ہے:

ظالم یا غدار کے انجام کی طرح تاریک
موسم سرما کی راتوں کے سائے
رات کے سیاہ تر،
اندھیرے سے جھانکتی ہوئی
آسیب کی مانند ہولناک جیل کی دیواریں۔

وہ صرف ہمارے لیے نغمہ سرائی کرتا ہے لیکن اسی مقام پر اگر آپ زور سے چیخیں تب بھی کوئی سن نہیں سکتا جب وہ باآواز بلند گاتا ہے تو اس کا ابھرا ہوا نرخرہ اس کی جھریوں دار گردن کی

جلد کے نیچے جنبش کرتا ہے۔ وہ گاتا ہے اور تھرتھراتا ہے، یادیں اُسے گھیر لیتی ہیں اور روسی زندگی کی بے شمار صدیاں اُس میں رواں ہو جاتی ہیں اور ہم ہمدردی کے جذبے سے لرزنے لگتے ہیں :

اگرچہ اندر مکمل خاموشی ہے۔
پھر بھی یہ زنداں ہے گورستاں نہیں
سنتری، اے سنتری!
خبردار

اس قسم کی جیل میں ایسا نثر پارہ، نہ کوئی پُرتصنع دھن نہ کوئی آرائشی لفظ۔ ہر دھن اور ہر لفظ اُسی طرز پر تھا جس پر قیدیوں کی موجودہ نسل کی زندگی بسر ہو رہی تھی۔

پھر ہم اُس زرد تاریک، نم، سیلی ہوئی جگہ میں سونے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ ٹھیک ہے اب ہمیں کہانی کون سنائے گا؟

ایک آواز اُبھرتی ہے — آئیوان الیکسی وچ اسپاسکی کی آواز، ایک نوع کی دستوفسکی کے تمام ڈراموں کی مجموعی آواز۔ ایک آواز جو بھراتی ہے، جو لکنت کرتی ہے، کبھی پُرسکون نہیں ہوتی، کسی بھی لمحے میں گریہ وزاری یا کراہ میں منتقل ہو جانے والی آواز معلوم ہوتی ہے۔ بریٹکو کی تخلیق کردہ قدیم ترین کہانی، مثال کے طور پر 'دی ریڈ میڈونا' (سُرخ مریم) ایسی آواز میں دوبارہ بیان کی گئی جو عقیدت سوز اور نفرت سے مملو ہے، 'جاں سوں دی رولاں' (ایک فرانسیسی حکایت کا کردار، قاضی) جیسی محسوس ہوتی ہے۔ وہ سچ ہو یا قطعاً تخیئلی، لیکن وکٹر وورون کی حکایت، اس کا ایک پچاس کلومیٹر پیدل، دوڑتے ہوئے ڈیڈو پہنچنے کا واقعہ اور الکازار کا گھیرا اٹھانے کی داستان کسی رزمیے کی مانند ہماری یادداشت پر کندہ ہو جاتی ہے۔

اسپاسکی کی سوانحعمری، اس کے متعدد ناولوں سے زیادہ دلچسپ ہے۔ اپنے ایام شباب میں اس نے 'برف پر یلغار' (کوہانی مہم) میں حصہ لیا تھا۔ خانہ جنگی کی تمام مدت میں وہ لڑتا رہا، پھر وطن ترک کر کے وہ اٹلی چلا گیا۔ پردیس میں اس نے روسی بیلے (رقص) اسکول (میرا خیال ہے کارساوینا کے اسکول) میں سیکھا اور کسی روسی نوابزادی کے گھر میں الماریاں تیار کرنے کا کام بھی سیکھا۔ بعد ازاں اُس نے کیمپوں میں چھوٹے چھوٹے اوزار اور افسروں کے لیے بہت عمدہ دستکاری کا فرنیچر تیار کر کے ہمیں متحیر کر دیا۔ فرنیچر پر ایسے شاندار نقوش اُبھارے گئے کہ وہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ یہ واقعہ بیشک صحیح ہے کہ اُسے ایک چھوٹی سی میز بنانے میں ایک مہینہ لگا) بیلے گروپ کے ساتھ اس نے یورپ کا دورہ کیا۔ اسپینی خانہ جنگی میں وہ اٹلی کی ایک کمپنی کے لیے اخباری فوٹوگرافر کا کام کرتا رہا۔ قدرے تبدیل شدہ نام گیووانی باسکی رکھ کر وہ اٹلی کی فوج میں میجر بن گیا اور ایک بٹالین کا کمانڈر ہو گیا۔ ۱۹۴۲ء کے موسم گرما میں وہ واپس ساحل ڈان پر آ گیا۔ اس کی بٹالین کا فوراً محاصرہ کر لیا گیا حالانکہ روسی اس وقت تک ہر محاذ پر پسپا ہو رہے تھے۔ اُس کے بس میں ہوتا تو باسکی دمِ آخر تک جنگ کرتا لیکن اٹلی والوں نے

جو بالکل ناتجربہ کار لڑکے تھے، گریہ وزاری شروع کر دی کہ انہیں زندگی عزیز ہے! قدرے تذبذب کے بعد میجر پاسکی نے سفید جھنڈا لہرا دیا۔ وہ خودکشی کر سکتا تھا لیکن اب وہ سوویٹ روس کو دیکھنے کیلئے بیقرار تھا۔ وہ کسی معمولی جنگ بندی کیمپ کے راستے سے چار سال کے اندر واپس اٹلی پہنچ سکتا تھا لیکن اُس کی روسی فطرت کو اعتدال پسند نہ تھا اور وہ اُن افسران سے گفتگو کرنے لگا جنہوں نے اُسے حراست میں لیا تھا۔ یہ ایک ہولناک غلطی تھی! آپ اگر بدقسمتی سے روسی ہیں تو اس حقیقت کو کسی شرمناک مرض کی طرح پوشیدہ رکھنا چاہیے ورنہ آپ بہت پریشانی میں مبتلا ہو جائیں گے! پہلے انہوں نے اُسے ایک سال تک لوبیانکا میں رکھا (ایسی ایک جگہ بھی تھی۔ اس میں اسپیٹ یارڈ، اٹلی والے جاپانی بھرے پڑے تھے) بعد ازاں جو چار سال وہ پہلے بھگت چکا تھا، انہیں شمار نہ کرتے ہوئے انہوں نے اُسے مزید پچیس سال کی سزا سنا دی ــــ پچیس ــــ کیا اُمید باقی رہی! کٹورگا میں عنقریب اُس کا خاتمہ یقینی تھا۔

اُسے اوسک اور پھر پالفلورر کی جیلوں میں اس وجہ سے رکھا گیا ــــ اور یہ ایک بڑی غلطی ہو گئی تھی ــــ کہ ان میں سے کسی بھی شہر میں خصوصی سفری جیل نہ تھی۔ اصل میں پالفلورر میں تو کیسی شرمندگی کی بات ہے، کوئی جیل گاڑی بھی نہیں تھی اور انہوں نے ہمیں اشٹیشن سے جیل تک، جو کئی بلاک پرے تھی، تیز رفتار سے پاپیادہ چلایا اور مقامی پبلک کی بھی پروا نہیں کی گئی جیسے کہ قبل از انقلاب یا اس سے پہلے کی صدی میں کیا جاتا تھا۔ شہر کے جن حصوں سے ہم گزرے ان میں اب بھی نہ پٹریاں تھیں نہ پانی کے نل تھے اور چھوٹے چھوٹے ایک منزلہ مکانات سرمئی ریت میں دھنسے ہوئے تھے خاص شہر کا حصہ سفید پتھروں سے تعمیر کردہ دو منزلہ جیل سے شروع ہوتا تھا۔

لیکن بیسویں صدی کے معیار سے دیکھا جائے تو یہ جیل خوفزدہ کرنے کی بجائے سکون پہنچانے والی، وحشت زدگی کی جگہ فرحت کا احساس پیدا کرنے والی تھی ایک طویل و عریض پرسکون احاطہ تھا جس میں ادھر ادھر بے ترتیب گھاس اُگی ہوئی تھی یہ احاطہ نیچی باڑھ لگا کر ورزش کے لیے چھوٹے چھوٹے قطعات میں منقسم کر دیا گیا تھا تیسری منزل پر سیل کی کھڑکیوں میں دُور دور پر سلاخیں لگی ہوئی تھی اور آڑ نہیں تھی جس کی وجہ سے کھڑکی کی دہلیز پر ایستادہ ہو کر آس پاس کا منظر دیکھا جا سکتا تھا ــــ ٹھیک نیچے، آپ کے پیروں تلے عمارت کی دیوار اور جیل کے احاطے کی دیوار کے درمیان ایک عظیم الجثہ کتا کسی باعث پریشان ہو کر زنجیر گھسیٹتا ہوا سارے آنگن میں دوڑتے پھر رہا تھا اور ایک آدھ بار بھونک بھی دیتا تھا لیکن یہ بھی جیلوں کے عام کتوں کی مانند نہ تھا، خطرناک جرمن شیپرڈ (بھیڑیں چرانے والا) کتا نہ تھا جسے لوگوں پر حملہ کرنے کی تربیت دی جاتی ہے بلکہ ایک اچھی نسل والا پپلا سفید عام کتا تھا (وہ کتوں کی نسل تارزنستان والوں کی طرح تیار کرتے ہیں) اور دیکھنے میں بوڑھا بوڑھا سا

معلوم ہوتا تھا وہ اُس خوش مزاج بزرگ وارڈن جیسا تھا جسے دوسروں کی طرح فوج سے کیمپوں میں منتقل کر دیا گیا تھا اور جو جیل کی ملازمت کو کتے کی زندگی سے بدتر سمجھتا تھا۔ اور پروا بھی نہ کرتا تھا کہ اس کی بات کا اثر کیا ہوگا۔

جیل کی دیوار سے پرے ہمیں ایک سڑک، ایک بیئر کی دوکان اور وہاں چلتے پھرتے یا کھڑے ہوئے لوگ نظر آتے تھے ــــ وہ لوگ جو قیدیوں کے لیے پارسل لے کر آئے تھے اور اپنے صندوق اور لپٹے ہوئے کپڑے وغیرہ واپس حاصل کرنے کے انتظار میں تھے۔ کچھ دور ہٹ کر یک منزلہ مکانوں کی قطاریں تھیں۔ اِرتش ندی کا بڑا سا موڑ تھا اور ندی کے اُس پار دور تک کشادہ زمین تھی۔

ایک پھرتیلی لڑکی نے، جو اپنی خالی ٹوکری لے کر ابھی نگرانی کی چوکی سے لوٹی تھی، منہ اوپر اٹھایا اور ہمیں کھڑکی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے دیکھ کر ظاہر کیا کہ اُس کی نگاہ ہم پر نہیں پڑی ہے وہ معمولی چال سے آگے بڑھتی رہی، چپ چاپ بیئر کی دوکان پر گئی اور ایسے مقام پر پہنچ گئی جہاں سے نگراں چوکی والوں کی نگاہ اس پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ یہاں پہنچتے ہی اس کا انداز بالکل مختلف ہو گیا ــــ اُس نے ٹوکری زمین پر ڈال دی اور دونوں ہاتھوں کو پرجوش انداز میں ہوا میں لہرانے لگی اور ہماری طرف دیکھ کر مسکرائی پھر اس نے اپنی پھرتیلی انگلیوں سے اشارہ کیا؛ "قلم بند کرو! پھر (بازو ہوا میں گھماتے ہوئے)" اور اسے میرے پاس پھینک دو میں تمہاری طرف سے (شہر کی جانب اشارہ کرکے) اُسے آگے پہنچا دوں گی"۔ بعد ازاں اس نے اپنی دونوں باہیں پھیلا دیں" تمہیں اور کس چیز کی ضرورت ہے؟ میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟ مجھے اپنا دوست سمجھو!"

اس کا رویّہ اتنا سیدھا اور فطری تھا، پریشانی اور تشویش سے گھری ہوئی ہماری "آزاد آبادی" ہمارے دہشت زدہ اور بدحواس شہریوں سے اتنا مختلف تھا، اس کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟ کیا زمانہ تبدیل ہو رہا ہے؟ یا یہ صرف قازقستان میں ہے؟ جہاں کی نصف آبادی، یاد رکھیے، مہاجرین پر مشتمل ہے.....

عزیز، دلیر لڑکی! کس تیزی سے اور صحیح طور پر تو نے جیل کے پھاٹک کی تمام تدبیریں سیکھ لی ہیں۔ یہ معلوم کر کے مجھے کتنا سکون ملا، میری آنکھ نم ہو گئی کہ تجھ جیسے لوگ ابھی موجود ہیں۔ تو جو کوئی بھی ہو، میری عقیدت قبول کر، اگر ہمارے سارے ہم وطن تجھ جیسے ہوتے تو انہیں مقید کرنے کی جرات کوئی نہ کر سکتا۔

بدنام سرکار مشین ٹھپ ہو کر رہ جاتی۔

ہماری جیکٹوں میں سیسے کی پنسلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تو تھے اور کاغذ کے پرزے بھی تھے اور تھوڑا سا پلاسٹر اکھاڑ کر اُس کے ساتھ پرچہ باندھ کر دور پھینک دینا بھی مشکل کام نہ تھا لیکن بالفعل ہمیں ایسی کوئی ضرورتِ نہ تھی جس کے لیے ہم اُس کی معاونت حاصل

کرتے اس لیے ہم نے صرف اسی کے آگے سر خم کیے اور ہاتھ ہلا کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

ہمیں ریگستان میں پہنچا دیا گیا۔ پا فلودا کے پہلے سے دُور تک پھیلے ہوئے نامانوس گاؤں کو بھی ہم کچھ عرصے بعد بارونق شہروں کی مانند یاد کریں گے۔

اب اسٹیپلاگ میں ہمیں ایک حفاظتی دستے نے سنبھال لیا (ہماری خوش نصیبی تھی کہ وزیر کازگان کیمپ ڈویژن نے ہمارا چارج نہیں لیا۔ سفر کے تمام عرصے میں ہمیں دھڑکا لگا رہا کہ کہیں ہمیں تانبے کی کانوں میں نہ منتقل کر دیا جائے) جو ٹرک ہمیں لینے کے لیے بھیجے گئے تھے ان میں آزوبازو تختے بندھے ہوئے تھے اور بیٹھنے کی سیٹوں کے عقبی حصّے میں جالی لگی ہوئی تھی تاکہ ٹامی گن والے ہماری دستبرد سے محفوظ رہ سکیں جیسے ہم وحشی جانور ہوں۔ انہوں نے ہمیں ٹھونس کر بھرا۔ ہمارے مُنہ پیچھے کی طرف تھے اور ٹانگیں نیچے پڑی ہوئی تھیں۔ ایسی حالت میں انہوں نے مکمل آٹھ گھنٹوں تک ہمیں ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر دھکے اور جھکولے کھلائے۔ ٹامی گن والے چھت کے اوپر بیٹھے تھے اور اُن کی بندوقوں کی نالیں دورانِ سفر ہماری پشتوں کی جانب تنی رہیں۔

اگلے حصّے میں لیفٹیننٹ اور سارجنٹ تھے اور ہمارے ٹرک کے کیب (ڈرائیور کی نشست اور ساتھ کا اگلا حِصّہ) میں ایک افسر کی بیوی براجمان تھی جس کے ساتھ چھ سات برس کی ایک بچی بھی تھی ٹرک رُکتا تو وہ چھوٹی سی بچی نیچے کود پڑتی، گھاس میں دوڑ دوڑ کر پھول توڑتی اور سُریلی آواز میں اپنی ماں کو پکارتی وہ ٹامی گنوں، کتّوں، لاریوں کے سائڈ پر نکلے ہوئے قیدیوں کے مُنڈے ہوئے بھدّے سروں سے ذرا بھی پریشان نہیں تھی ہماری عجیب دنیا کی ہلکی سی پرچھائیں بھی اس گھاس کے میدان یا پھولوں پر نہیں پڑ رہی تھی اور ہم پر اُس نے کوئی متجسانہ نظر بھی نہیں ڈالی۔ مجھے زسورسک کی مخصوص جیل میں ایک سارجنٹ میجر کے لڑکے کا واقعہ یاد آیا....
اس کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ وہ دیگر دو چھوٹے لڑکوں کو جو اُس کے پڑوسی تھے، کھڑا کر دیتا تھا ان کے ہاتھ ان کی پشتوں پر رکھوا تا (بعض اوقات ان کے ہاتھ باندھ بھی دیتا تھا) اور انہیں سڑک پر چلاتا تھا اور خود پہرے دار کی حیثیت سے چھڑی لے کر اُن کے ساتھ چلتا تھا۔

والدین جیسی زندگی بسر کرتے ہیں بچے کھیلوں میں اُسی کی نقل کرتے ہیں۔

ہم نے دریائے ارتش عبور کیا اور بہت دُور تک پانی سے بھرے ہوئے میدانوں کو طے کرتے رہے بعد ازاں بالکل سپاٹ اسٹیپی علاقے میں ہم جہاں بھی رُکتے وہاں ارتش کی ہوا، اسٹیپی کی شام کی فرحت، وارم وُڈ کی خوشبو ہمیں گھیر لیتی اور پہیّوں سے اُٹھنے والی مٹیالی دھول کے ہراتے ہوئے بادل زمین پر بیٹھ جاتے۔ اس غبار کے دبیز پردے سے ڈھکے ہوئے ہم لوگ اپنی پشت کی سڑک پر نظر دوڑاتے (ہمیں اپنے مُنہ گھمانے کی اجازت نہ تھی) خاموش رہتے (ہمیں گفتگو کی اجازت نہ تھی) اور اپنی منزلِ مقصود کے بارے میں سوچتے

اس کیمپ کے متعلق، جس کا نام عجیب سا، مشکل اور غیر روسی تھا، یہ نام ہم نے اپنی کیس فائلوں پر پڑھا تھا جو اسٹولی پن لاری میں سب سے بالائی خانے میں اُلٹی لٹکی رہتی تھیں۔۔۔ یہ نام تھا۔ ایکی بستر۔۔۔ لیکن کوئی بھی قیاس تک نہ کر سکتا تھا کہ نقشے پر یہ کہاں واقع تھا اور صرف لیفٹیننٹ کرنل اولیگ آئیوانوف کو ہی معلوم تھا کہ یہ کو ٹلے کی کانوں کا علاقہ ہے۔ ہم یہ بھی سوچتے تھے کہ شاید یہ چین کی سرحد کے بہت نزدیک کوئی مقام ہو (اور اس خیال سے ہم کچھ مسرور ہوتے تھے کیونکہ انہیں تا حال یہ معلوم نہ تھا کہ چین کا حال ہمارے ملک سے بھی بدتر ہے۔ سیکنڈ کیپٹن بورکونسکی (ایک نو عمر لڑکا جسے پچیس سال کی سزا ہوئی تھی، تا حال ہمیں مشتبہ نگاہ سے دیکھتا تھا کیونکہ اُسے خوش گمانی تھی کہ وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر جیل میں ڈال دیا گیا ہے وہ کیمونسٹ ہے اور باقیماندہ لوگ عوام دشمن ہیں؛ وہ صرف مجھے اچھا سمجھتا تھا کیونکہ میں سابق سوویٹ افسر تھا اور جنگی قیدی نہ تھا) اسے دیکھ کر مجھے وہ بات یاد آجاتی تھی جو میں نے یونیورسٹی میں پڑھی تھی اور فراموش کر دی تھی: اگر ہم آغاز سرما کے دن زمین پر ایک خط مستقیم کھینچیں اور ۲۳ ستمبر کو آفتاب کے زاویۂ حادہ ۹۰ میں سے منہٰی کر دیں تو ہمارا ارض البلد نکل آئے گا۔ یہ بات بڑی تسلی بخش تھی حالانکہ ہمارے پاس یہ حساب لگانے کے وسائل نہ تھے۔

گاڑیاں آگے بڑھتی گئیں، اندھیرا چھا گیا۔ سیاہ آسمان پر تارے بڑے بڑے محسوس ہو رہے تھے اور اب ہم کو یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ ہمیں جنوبی جنوب مغرب کی سمت لے جایا جا رہا تھا۔

ہمارے عقب میں ہیڈ لائٹوں کی روشن قطاروں میں دھول ناچ رہی تھی۔ غبار کے بادل ساری سڑک پر چھائے ہوئے تھے لیکن نظر نہ آتے تھے صرف وہیں دکھائی پڑتے تھے جہاں ہیڈ لائٹ کی روشنی اُن کو قطع کرتی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک عجیب طلسمی سی روشنی پیدا ہو گئی: یہ کائنات تاریکی کا ایک سائیں سائیں کرتا ہوا سمندر تھی سوائے اُن رقص کرتے ہوئے منور ذرات کے جن سے مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی ہولناک تصویریں بن جاتی تھیں۔

وہ ہمیں زمین کے کس گوشے، دنیا کے کس انوکھے خفیہ مقام پر لے جا رہے تھے؟ قسمت نے ہمارے حق میں کہاں کا انقلاب لکھ رکھا ہے؟

ہماری نیچے کو مڑی ہوئی ٹانگیں اتنی شل ہو گئی تھیں جیسے وہ ہماری نہ ہوں۔ تقریباً نصف شب گزر چکی تھی جب ہم ایک کیمپ پر پہنچے جو چہار جانب سے اونچی چوبی باڑھ سے گھرا ہوا تھا اور اندھیرے بیابان اسٹیپی میں ایک سیاہ خواب میں ڈوبی ہوئی بستی کے کنارے۔۔۔ جہاں بجلی کی روشنی میں گارڈ ہاؤس اور سرحد باڑ جگمگا رہی تھی۔

مکمل تفصیلات کے ساتھ۔۔۔ "مارچ ۱۹۷۵ء۔۔۔ ایک اور حاضری کے بعد وہ ہمیں

اونچے اونچے دوہرے پھاٹکوں میں سے لے گئے تاکہ ہم وہاں اپنی مربع صدی میں سے باقی ماندہ مدت بسر کر سکیں۔

کیمپ محوِ خواب تھا لیکن تمام جھونپڑوں کی ساری کھڑکیاں روشن تھیں جیسے زندگی کی امنگیں بلند ہو رہی ہوں۔ رات کو بجلی روشن ہونے کا مطلب تھا جیل کا اصول ــــ جھونپڑوں کے دروازے باہر سے بھاری تالوں سے مقفل تھے۔ کھڑکیوں کے روشن چوکھٹوں کے مقابلے میں سلاخیں بے حد سیاہ نظر آتی تھیں۔

جوار دلی (نمبردار) ہمیں لینے کے لیے آیا اُس کے تمام جسم پر نمبروں کی پٹیاں چسپاں تھیں۔

آپ نے اخباروں میں پڑھا ہی ہوگا کہ نازی کیمپوں پر لوگوں کے کپڑوں پر ہندسے چپکا دیے جاتے ہیں!

تیسرا باب

سلاسل، سلاسل....

ہماری پُرجوش توقعات اور بے قرار امیدیں جلد ہی خاک میں مل گئیں۔ تبدیلی کی ہوا صرف کھلے ہوئے.. برآمدوں اور سفری کیمپوں میں چل رہی تھی۔ یہاں خصوصی جیلوں کی اونچی چہار دیواروں کی پیچھے ہمیں اس کا ایک جھونکا تک نصیب نہ ہوتا تھا اور ہرچند کہ ان کیمپوں میں محض سیاسی قیدی تھے۔ لیکن کسی ستون پر کوئی بغاوت آثار پوسٹر نظر نہ آتا تھا۔

سنا جاتا ہے کہ منلاگ میں لوہاروں نے جھونپڑوں کی کھڑکیوں کے لیے سلاخیں تیار کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ان نامعلوم بہادروں پر آفرین! وہ سچے مرد تھے۔ انھیں کیمپ جیل میں ڈال دیا گیا اور منلاگ کے لیے سلاخیں کوٹلاس سے فراہم کرائی گئیں۔ کسی نے کبھی ان لوہاروں کی حمایت نہیں کی تھی۔

خصوصی کیمپوں کی ابتدا اس بے شکوہ بلکہ پُرجوش غلامانہ رضامندی سے ہوئی جس کے لیے اصلاحی مشقت کیمپ تین پشتوں سے قیدیوں کی تربیت کر رہے تھے۔

قطبی شمال سے منتقل کردہ قیدیوں کے لیے قازقستان کی دھوپ اور کچھ زیادہ مسرت آگیں نہ تھی نو نوروفسئے اسٹیشن پر وہ لوگ سرخ ڈبا نما، گاڑیوں سے چھلانگیں لگا لگا کر زمین پر آگئے جو بذاتِ خود گاڑیوں کی طرح سرخ تھے.. یہ بدنام زمانہ دوریز کازگان کی سرزمین تھی اور جو لوگ وہاں کان کنی کرتے تھے ان کے پھیپھڑے چار ماہ سے زائد سلامت رہ ہی نہ سکتے تھے۔ وہاں فی الفور وارڈروں نے قطار سے پہلے نکلنے والے قیدیوں کے سامنے اپنے نئے ہتھیار، ہتھکڑیوں کا مظاہرہ مسرت کے ساتھ کیا۔ اصلاحی مشقت کیمپوں میں چونکہ ازکل کی ہتھکڑیاں پہلے مستعمل نہ تھیں۔ یہ سوویت یونین میں انقلاب اکتوبر کی تیسویں سالگرہ منانے کے لیے بڑے پیمانے پر تیار کی گئیں تھیں (کسی مقام پر ایک فیکٹری تھی جس میں سفید مونچھوں والے مزدور جو سوویٹ ادب کے مثالی پرولتاری تھے، اور انھیں تیار کر رہے تھے۔ بشرطیکہ ہم یہ قیاس نہ کرلیں کہ انھیں اشالن اور بیریا خود تیار کرتے تھے!) ان ہتھکڑیوں کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ کلائیوں میں تنگ ہوتی تھیں۔ ان میں دندانے دار دھات کی پٹیاں ڈالی گئی تھیں۔ جس کا فائدہ یہ تھا کہ جب کوئی کیمپ گارڈ کسی شخص کی ہتھکڑی میں جکڑی ہوئی کلائیاں اس کے گھٹنے سے ٹکرایا تھا تو ہلاک میں اور بھی دندانے داخل ہو جاتے تھے اور قیدی کو شدید ترین اذیت ہوتی تھی۔ اس طرح ہتھکڑیاں ہاتھوں کو بے عمل کرنے کی بجائے ایذارسانی کا وسیلہ بن گئیں۔ یہ کلائیوں کو چور چور کر دیتی تھیں۔ مسلسل ٹیس مارنے والا درد پیدا کرتی تھیں اور قیدیوں کو گھنٹوں

اس عالم میں رکھا جاتا تھا۔ ان کے ہاتھ پشت کی جانب ہوتے تھے اور ہتھیلیاں باہر کی جانب۔ وارڈر ہتھکڑیوں میں چار انگلیاں پھنسا دینے کی ترکیب میں بھی مہارت رکھتے تھے اس طرح انگلیوں کے جوڑوں میں ناقابلِ برداشت تکلیف ہوتی تھی۔

برلاگ میں ذرا ذرا سی بات پر ہتھکڑیاں لگا دی جاتی تھیں: معمولی کھولی بلت پر، وارڈر کے سامنے ٹوپی نہ اتارنے کے جرم میں بھی وہ (ہاتھ پشت کی جانب کر کے) ہتھکڑیاں پہنا دیتے تھے اور قیدی کو گارڈ ہاؤس کے سامنے ایستادہ کر دیتے تھے۔ ہاتھ سوج کر بے حس ہو جاتے تھے اور معمر قیدی تو رونے لگتے تھے "جناب میں دوبارہ یہ غلطی ہرگز نہ کروں گا۔ ازراہِ کرم مجھے ہتھکڑیوں سے نجات دیجیے!" (برلاگ کے طور طریقے حیرتناک تھے، صرف یہی نہیں کہ قیدی حکم ملنے کے بعد ہی کھانے کے ہال میں داخل ہوتے تھے بلکہ میز کے سرے سے بھی اجازت حاصل کرنے کے بعد ہی جا سکتے تھے، اجازت ملنے پر بیٹھتے، اجازت ملنے کے بعد اپنے چمچے کھچڑی میں ڈالتے اور اجازت ملنے پر ہی اٹھتے اور کمرے سے باہر جاتے تھے)

ایسا فرمان جاری کر دینا تو بہت سہل تھا کہ "اسپیشل کیمپ قائم کیے جائیں۔ فلاں فلاں تاریخ تک قواعد و ضوابط کے مسودے پیش کیے جائیں" لیکن کسی جگہ تعزیری علوم کے ماہرین (ماہرینِ نفسیات اور کیمپوں کے نکتہ دانوں) کو تفصیلات پر غور کرنا پڑا ہوگا، جو پیچ ابھی ڈھیلے ہیں انہیں مزید کس طرح کسا جائے پہلے ہی سے کمر توڑ دینے والے بار کو مزید وزنی کس طرح بنایا جائے گا؟ گلاگ کے باشندگان کی زندگی جو پہلے ہی کچھ سہل نہیں ہے، مزید دشوار کیسے بنائی جائے؟ اصلاحی مشقت کیمپوں سے منتقل شدہ خصوصی کیمپوں میں آنے والے مویشیوں کو جلد ہی ان کی سختی اور سنگدلی کا علم ہو جانا چاہیے۔ لیکن ظاہر ہے کہ پہلے سے کسی کو مفصل لائحہ عمل تیار کرنا پڑا ہوگا۔

قدرتی امر ہے کہ حفاظتی انتظامات مزید بڑھائے جائیں تمام خصوصی کیمپوں میں حصار بندی کے انتظامات بہتر بنائے گئے، کانٹے دار تاروں کے ساتھ خیمے لگائے گئے اور کیمپ کے تھوڑے خالی علاقے کے چہار جانب کانٹے دار تاروں کے پلے پھیلائے گئے۔ جس راہ سے قیدی کام کے لیے جاتے تھے اس میں تمام اہم سڑکوں پر اور چوراہوں پر مشین گنیں نصب کر دی گئیں جہاں توپچی چھپے بیٹھے رہتے تھے۔

ہر کیمپ کے ڈویژن کا اپنا ایک پتھروں کا بنا ہوا، زنداں ہوتا تھا جنہیں اس کا تنظیمی بیرک (بی یو۔ آر) کہتے تھے[۱۸] جو قیدی بھی تنظیمی بیرک میں رکھا جاتا تھا اس کی روئی بھری ہوئی جیکٹ اس سے چھین لی جاتی تھی؛ سردی کے توسط سے ایذا رسانی بی۔ یو۔ آر کی اہم خصوصیت تھی۔ لیکن ہر جھونپڑا بذاتِ خود بھی ایک جیل تھا کیوں کہ تمام کھڑکیوں میں سلاخیں جڑی ہوئی تھیں اور پاخانے کی بالٹیاں رات کو لائی جاتی تھیں تاکہ تمام دروازے مقفل کیے جا سکیں علاوہ ازیں ہر کیمپ کے علاقے میں دو ایک تنظیمی بیرکیں تھیں ہی، جن میں تحفظاتی بند و بست بڑا سخت تھا اس طرح ہر کیمپ کے اندر ایک چھوٹا کیمپ اور بن گیا تھا۔ قیدیوں کے کام سے واپس پلٹتے ہی انہیں پہلے والے کنڑوگا کے طرز پر تالے میں بند کر دیا جاتا تھا (وہ واقعی تنظیمی بیرکیں تھیں لیکن ہم انہیں "زینز تکی" کہتے تھے)

پھر انھوں نے بڑی بے حیائی کے ساتھ نازیوں سے وہ طریقہ سیکھا جو ان کے حق میں بہت قیمتی

ثابت ہوا تھا ــــ قیدی کے نام کی جگہ کوئی عدد طے کر دیا جائے، اس کی انا اس کی انسانی حیثیت ختم کر دی جائے۔ اس طرح ایک آدمی اور دوسرے آدمی میں صرف اعداد کا فرق رہ گیا۔ اور وہ ہر اعتبار سے یکساں تھے۔ جس طرح ایک عدد دوسرے عدد کے مماثل ہوتا ہے۔ یہ تدبیر بھی بے حد تکلیف دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ بشرطیکہ اس پر ہمیشہ اور مکمل طور سے عمل کیا جاتا۔ اس بات کی انھوں نے سعی کی۔ ہر نیا زنگروٹ اسپیشل سکشن' میں پیانو بجاتا تھا (یعنی اپنی انگلیوں کے نشانات محفوظ کراتا تھا۔ جیسا کہ عام جیلوں کا دستور ہے لیکن اصلاحی مشقت کیمپوں میں یہ عمل نہیں ہوتا) گردن میں ایک ڈوری سے تختی معلق کرنی پڑتی تھی، قیدی کا نمبر ــــ مثلاً ایس۔ ایچ۔ سی۔ ایچ ۲۶۲، اس کی مثال ہو سکتی تھی۔ تختی پر درج ہوتا تھا (اوزرلاگ میں اب وائی۔ ای۔ آر۔ وائی * سے شروع ہونے والے حروف بھی تھے: حروف تہجی بے حد مختصر تھے!) اور اس لباس میں اس کی ایک تصویر اسپیشل سکشن کا فوٹوگرافر کھینچتا تھا۔ یہ فوٹو اب بھی کسی مقام پر محفوظ ہیں! آج کل میں کسی دن ہم انھیں دیکھیں گے۔)

یہ تختی قیدی کی گردن سے نکالی لی جاتی تھی (آخر شس وہ کوئی کُتا تو نہیں) اور اس کی جگہ اسے چار (یا کچھ کیمپوں میں تین) سفید پٹیاں دی جاتی تھیں جو آٹھ سینٹی میٹر چوڑی اور پندرہ سینٹی میٹر لمبی ہوتی تھی)۔ قیدی اسے اپنے کپڑوں پر، بالعموم پیٹھ پر، سینے پر، ٹوپی کے بالائی حصے میں ایک ٹانگ پر یا بانہہ پر ٹانگ لیتے تھے (تصویر نمبر ۲) لیکن الگ الگ کیمپوں میں قوانین قدرے مختلف تھے۔ روئی بھرے ہوئے کپڑوں کو یہ پٹیاں ٹانکنے سے قبل مقررہ مقامات پر دانستہ خراب کر دیا جاتا تھا، کیمپ کے ورکشاپوں میں نئے کپڑوں کو خراب کرنے کے لیے درزیوں کا ایک خصوصی دستہ ہوتا تھا، کپڑے کے چوکور ٹکڑے تراش کر اندر کی بھرائی کو برہنہ کر دیا جاتا تھا تاکہ فرار ہونے کی سعی کرنے والے قیدی اپنے نمبر والے ٹکڑے نہ ہٹا سکیں اور آزاد مزدور کی حیثیت سے باہر نہ نکل سکیں۔ کچھ دیر کیمپوں میں یہ کام زیادہ آسان طریقے سے کیا جاتا تھا کسی پختہ رنگ سیال سے نمبر کپڑوں پر درج کر دیئے جاتے تھے۔

وارڈروں کو ہدایت تھی کہ قیدیوں کو ان کے ضروری نمبروں ہی سے مخاطب کیا جائے اور ان کے نام فراموش کر دیئے جائیں۔ اگر وہ اس پر عمل کرتے تو افسوسناک بات ہوتی۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکے روسی جرمن نہیں ہے۔ پہلے سال ہی وارڈر چوک جاتے اور قیدی کو اس کے نام سے پکار لیتے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس طریق کار میں اضافہ ہوتا رہتا۔ وارڈروں کی سہولت کی غرض سے پلائی وڈ کی ایک پٹی، جس پر قیدی کا نمبر درج ہوتا تھا اس کے سونے کی جگہ نصب کر دی جاتی تھی۔ اس طرح وارڈر سوتے ہوئے قیدی کو جس کا لباس نگاہ سے اوجھل ہوتا ہے، نمبر سے مخاطب کر سکتا تھا اور اگر کوئی قیدی غائب ہو جائے تو وارڈر فوراً معلوم کر سکتا تھا کہ کون ضابطے کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ وارڈروں کے لیے ایک اور کارآمد طریقہ کار نکل آیا تھا۔ وہ خاموشی سے تالا کھول سکتے تھے اور اٹھنے سے قبل ہی دبے پاؤں جھونپڑے میں داخل ہو کر ان کے نمبر دیکھ سکتے تھے جو قبل از وقت بیدار ہو گئے ہوں۔ یا وہ عین مقررہ وقت پر جھونپڑے میں داخل ہو کر ان قیدیوں کے نمبر نوٹ کر سکتے تھے جو بروقت بیدار نہ ہوئے ہوں۔ دونوں صورتوں میں آپ کو قید تنہائی کی سزا فی الفور دی جا سکتی تھی۔ لیکن خصوصی کیمپ میں تحریری

صفائی طلب کرنا عام طور پر بہتر سمجھا جاتا تھا۔ ہرچند کہ قلم اور سیاہی رکھنے کی ممانعت تھی اور کاغذ فراہم نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ طویل بیزار کن اور تضحیک آمیز طریق کار بڑی چالاکی کے ساتھ ایجاد کیا گیا تھا۔ بطورِ خاص اس لیے کہ کیمپ کی تنظیم میں صفائی کے بیانات کی تحقیق کرنے والے بہت سے تنخواہ دار لوگ مزے اڑانے کے لیے موجود تھے۔ براہِ راست سزا دینے کی جگہ آپ سے وہ اس بات کی صفائی طلب کرتے تھے۔ کہ تمہارا بستر بے ترتیب کیوں تھا، تمہارے سونے کی جگہ نمبر کی تختی ٹیڑھی کیوں تھی، تم نے اسے درست کیوں نہیں کیا، تمہاری جیکٹ کی نمبروں والی پٹی میلی کیوں ہے، تم نے اسے صاف کیوں نہیں کیا تمہارے پاس جھونپڑے میں سگریٹ کیوں برآمد ہوئی، تم نے فلاں وارڈر کی آمد پر تعظیماً ٹوپی کیوں نہیں اُتاری ؟[۵۲] یہ ایسے گہرے سوالات تھے جن کا جواب دینا ناخواندہ قیدی کی بہ نسبت تعلیم یافتہ قیدی کے لیے زیادہ اذیت ناک تھا لیکن جواب لکھنے سے انکار کرنے کا مطلب تھا کہ آپ کی سزا اور بھی زیادہ سخت ہوگی ! یہ جواب صفائی قلم بند کیا جاتا تھا اور ایسی نفاست اور شائستگی کے ساتھ لکھا جاتا تھا جس سے انتظامیہ کے افسران کے تئیں احترام ظاہر ہوا اور لکھ کر جھونپڑے کے انچارج وارڈر کے سپرد کر دیا جاتا تھا پھر انتظامیہ کا افسر یا اس کا نائب تفتیش کرتا تھا اور سزا کی بابت اپنا فیصلہ درج کرتا تھا۔

کام کی حاضری کے رجسٹروں میں بھی نام سے بھی قبل نمبر درج کرنے کا دستور تھا۔ پہلے کیوں، اور ناموں کی جگہ کیوں نہیں ؟ وہ ناموں سے قطعاً ترکِ تعلق کر لینے سے بھی خوف کھاتے تھے، آپ خواہ کسی انداز میں سوچیں، نام ایک لائقِ اعتماد سہارا ہے، انسان ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ جڑا رہتا ہے جب کہ نمبر ہوا کے ایک جھونکے سے اڑ جاتا ہے۔ اگر بذاتِ خود آدمی کے اوپر ہی نمبر داغ دیے جاتے یا کندہ کر دیے جاتے تب بھی کوئی بات تھی لیکن وہ اس حد تک کبھی نہیں گئے اگرچہ بآسانی ایسا کر سکتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس عمل کے بہت نزدیک پہنچ ہی گئے تھے۔

اس تشدد آمیز کارروائی کے چلن میں ایک دشواری اور بھی تھی چونکہ ہم تنہائی کی کوٹھریوں میں مقید نہیں تھے، چونکہ ہم وارڈروں کے علاوہ ایک دوسرے کی آوازیں بھی سن سکتے تھے۔ اس لیے قیدی ایک دوسرے کے لیے نمبروں کا استعمال قطعی نہیں کرتے تھے، نہ ان پر کوئی توجہ دیتا تھا (آپ خیال کریں گے کہ ایسا کس طرح ممکن ہے کہ سیاہ زمین پر ٹنکے ہوئے ان چمکدار سفید کپڑوں پر کوئی توجہ نہ دے ! جب ہم بہت سے لوگ یکجا ہوتے تھے، کام پر روانہ ہونے کے وقت یا معائنے کے موقع پر، تو نمبروں کی اس طویل قطار کو دیکھ کر آنکھوں کے سامنے دھبے سے نظر آنے لگتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی ذو اضعافِ اقل (لوگارتھم) کی ٹیبل یک سامنے ہو بشرطیکہ یہ کام آپ کے لیے غیر مانوس ہو) آپ ان پر اتنی کم توجہ صرف کریں گے کہ قریب ترین دوست یا ساتھ کام کرنے والے کا نمبر تک معلوم نہ ہوگا۔ (کچھ اپنے آپ کو تیز طرار ظاہر کرنے والے نمبردار، اس بات کی احتیاط برتتے تھے کہ ان کے نمبر صاف ستھرے اور نفیس طریقے سے ٹنکے ہوئے ہوں، ان کے سرے نفاست سے موڑے جائیں، باریک ٹانکوں سے اس طرح سلائی کی جائے کہ وہ سچ مچ خوبصورت نظر آئیں۔ یہ وہ تھے جو غلام ہی پیدا ہوئے اور غلامی میں ہی زندگی بسر کی۔ اس کے برخلاف میں اور میرے دوست پوری کوشش کرتے تھے کہ ہمارے نمبر زیادہ سے زیادہ بھونڈے نظر آئیں)

خصوصی کیمپ کی انتظامیہ نے فرض کر رکھا تھا کہ تشہیر کے وسائل نایاب ہیں، اس کا خیال تھا کہ کوئی کبھی شکایت نہ کرے گا، کوئی کبھی رہا نہ ہوگا، کوئی کبھی فرار نہ ہو سکے گا (آسکر ملڈ اور کاٹین سے کبھی ہمارے آقاؤں نے کوئی سبق نہیں لیا تھا) اس لیے اولیں اسپیشل کیمپوں میں بیدوں کا بند و بست تھا۔ یہ بید عام طور پہ وارڈروں کے ہاتھوں میں نہیں ہوتے تھے (ہاتھوں میں وہ ہتھکڑیاں لیے ہوتے تھے) بلکہ معتمد قیدی جھونپڑیوں کے اردلیوں اور فورمینوں کے پاس رہا کرتے تھے، لیکن انھیں افسران کی منظوری حاصل تھی اور جی بھر کر انہیں زد و کوب کر سکتے تھے۔ دزیز کازگان میں کام پر تعیناتی سے قبل کام تقسیم کرنے والے جھونپڑوں کے دروازے پر ڈنڈے لے کر کھڑے ہو جاتے اور چیخ کر کہتے: "فوراً باہر نکل آؤ۔ کوئی پیچھے نہ رہنے پائے!!"۔ قارئین سمجھ سکتے ہیں کہ اگر کوئی بالکل پیچھے ہوگا تو لمحہ بھر کے لیے ہوگا۔ جیسے کبھی پیچھے رہا ہی نہ ہو! اسی سبب سے، مثال کے طور پر اگر کرباس سے اسپاسک جانے والی کسی گاڑی میں راستے کی سردی میں جم کر رہ جاتے۔ اگر اسپتال کے گلیارے میں باقی ماندہ تمام لوگ مر جاتے یا زندہ ہی سڑ گل کر تعفن پیدا کرتے اور ڈاکٹر کوسنکوف درجنوں ہاتھ، ٹانگیں اور ناکیں کاٹ کر پھینک دیتا تب بھی عہدیداران کے لیے تشویش کی کوئی بات نہ تھی۔ دیوار خاموشی اتنے اعتماد کے قابل تھی اور اسپاسک میں واقع مشہور ڈسپلن افسر کیپٹن بوروبیوف اور اس کے ماتحت کارکنوں نے پہلے تو ایک ہنگرین قیدی رقاصہ کو قید تنہائی میں ڈال کر "سزا دی" پھر اسے ہتھکڑیاں لگائیں بعد ازاں اس کے ساتھ زنا کیا۔

انتظامیہ سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ تمام نزاکتوں پر کافی غور و خوض کرے گا۔ اس طرح قیدیوں کے لیے تصویریں رکھنا ممنوع تھا خواہ وہ ان کی اپنی ہوں (جن سے مغرورین کو مدد مل سکے:) یا ان کی اعزا کی ہوں۔ اگر کسی کے پاس سے کوئی تصویر برآمد ہو تو اسے چھین کر ضائع کر دیا جاتا تھا۔ اسپاسک میں شعبۂ خواتین میں بیرکوں کی نمائندگی ایک سن رسیدہ استانی کرتی تھی جس نے تیچائیکوفسکی کی ایک چھوٹی سی تصویر میز پر رکھ دی۔ وارڈر نے اسے وہاں سے ہٹا دیا اور استانی کو تین دن قید تنہائی کی سزا دی گئی، لیکن یہ تیچائیکوفسکی کا فوٹو ہے!" خواہ کسی کا ہو۔ اس کیمپ میں عورتوں کو مردوں کی تصویریں رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔" کینگر میں قیدیوں کو اپنے کھانے کے پارسل منگانے کی چھوٹ تھی (کیوں نہ ہو؟) لیکن اسے گرم کرنے کی سخت ممانعت تھی اور اگر کوئی قیدی کسی طرح دو اینٹیں لے کر کسی ترکیب سے آگ روشن کر لیتا تھا تو وارڈر ٹھوکر مار کر برتن پرے پھینک دیتا اور ملزم کو آگ خود اپنے ہاتھوں سے بجھانی پڑتی تھی (یہ سچ ہے کہ آگے چل کر انھوں نے پکانے کے لیے ایک چھوٹا سا سائبان بنا دیا تھا لیکن دو ماہ بعد بھی اکھاڑ پھینکی گئی اور اس کی جگہ افسران کے سور اور حفاظتی افسر بیلیائیف کا گھوڑا رکھے جانے لگے)

ڈسپلن سے متعلق مختلف نئی پابندیاں عائد کرتے ہوئے ہمارے آقاؤں نے یہ کبھی فراموش نہیں کیا کہ اصلاحی مشقت کیمپوں کے کام میں بہترین کون سا ہے۔ اوزر لاگ میں کیمپ ڈویژن کے افسر اعلیٰ کیپٹن مین نے ناکارہ قیدیوں کو ایک گھوڑا گاڑی کے پیچھے بندھوا دیا اور کارگاہ تک گھسیٹتا ہوا لے گیا۔

بحیثیت مجموعی یہ بند و بست اتنا تشفی بخش ثابت ہوا کہ پہلے والے سیاسی کیمپوں (کوڑگا) سے آنے

والے قیدیوں کو اسپیشل کیمپوں میں باقی ماندہ قیدیوں کے ہی انداز پر رکھا جانے لگا اور انھیں کوارٹروں میں ٹھہرایا جاتا تھا فرق محض ان کے نمبروں کی پٹیوں پر مندرج اعدادی حروف سے واضح ہوتا تھا (اگرچہ جھونپڑوں کی قلت ہونے پر، جیسا کہ اسپاسک میں اکثر ہوا کرتا تھا، انھیں اناج کے گوداموں اور اصطبلوں میں بھی رکھتے تھے)

—اسی طرح اسپیشل کیمپ، ہرچند سرکاری طور پہ کٹورگا نہیں کہلاتا تھا، لیکن وہ اس کا قانونی وارث اور قائم مقام تھا۔

جیل کے کسی بھی بندوبست کا قیدیوں پر اطمینان بخش اثر اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ کام اور خوراک کے بارے میں مناسب اصولوں پہ قائم کیا گیا ہو۔

اسپیشل کیمپوں کے لیے منتخب کردہ کام ہمیشہ کے لیے اس جگہ کا سب سے دشوار کام ہوا کرتا تھا۔ چیخوف نے درست کہا تھا، سماج کا اور قدرے ردوبدل کے ساتھ ادب کا بھی یہ پختہ عقیدہ ہے کہ سخت محنت کی کانوں میں ہونے والے کام سے زیادہ کٹھن ذلیل کام کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اگر تیکرانسو کی تخلیق "رشین وومن" (روسی عورتیں) میں ہیرو کا کام جیل کے لیے مچھلیاں پکڑنا یا درخت کاٹنا ہوتا ہے تو بہت سے مادی ناآسودگی کا احساس کرتے۔ (درخت کاٹنے کے کام کو اتنا چھوٹا کیوں ظاہر کر رہے ہو اینلن یا دوچ! لکڑیاں چیرنا بھی اتنا ہی بُرا کام نہیں ہے؟ اس سے بھی وہی تاثر پیدا ہوتا) اسٹیپلاگ کے پہلے ڈویژن میں جہاں کام کی ابتدا کی گئی تھی۔ تانبے کی کانوں میں کھدائی ہوتی تھی (اور رودارنگ میں پہلا اور دوسرا ڈویژن، کینگر میں تیسرا اور دوریز کازگان میں چوتھا ڈویژن) سوکھی ڈرلنگ کرتے تھے اور بے کار پتھروں کی دھول سے بہت جلد سلکوسس اور تپ دق کے امراض پیدا ہو جاتے تھے۔ مریض قیدیوں کو مشہور اسپاسک کیمپ (کاراگنڈہ کے قریب) میں مرنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ یہ اسپیشل کیمپوں کی "آل یونین صحت بخش قیام گاہ تھی۔

یہاں اسپاسک کے تفصیلی ذکر کی ضرورت ہے۔

وہ قریب المرگ کیس، جن کا دوسرے کیمپوں میں اب کوئی استعمال نہیں ہو سکتا تھا اسپاسک کو منتقل کر دیے جاتے تھے لیکن کتنی حیرت ناک بات ہے کہ مریض جیسے ہی اسپاسک کی صحت بخش سرحد کو عبور کرتے تھے وہ صحت یاب ہو جاتے تھے۔ کرنل چیچیف کے لیے جو ہمارے اسٹیپلاگ گروپ کا کمانڈنٹ تھا—اسپاسک کیمپ ڈویژن خصوصی توجہ کا مستحق تھا۔ یہ گٹھیلا جسم رکھنے والا قاتل نما کاراگنڈہ سے بذریعہ ہوائی جہاز آتا، گارڈ ہاؤس میں اپنے بوٹ صاف کراتا تھا اور کیمپ میں سے یہ دیکھتا ہوا گزرتا کہ کون قیدی کام نہیں کر رہا ہے۔ اسے یہ کہنے کا بڑا شوق تھا! "تمام اسپاسک کیمپ میں مجھے ایک اپاہج ملا ہے، اس کی دونوں ٹانگیں ضائع ہو گئی ہیں اور وہ بھی ہلکا پھلکا کام کر لیتا ہے۔ وہ پیغام رسانی کا کام کرتا ہے۔" تمام ایک ٹانگ والے آدمی بیٹھ کر کیے جانے والے کاموں پہ لگائے گئے تھے، وہ سڑکوں کی تعمیر کے لیے روڑیاں کوٹتے تھے یا جلانے کے لیے لکڑیاں چھانٹتے تھے۔ اسپاسک میں بیساکھی یا بازو کی عدم موجودگی کام میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا کرتی تھی۔ چیچیف کا قول: ایک ہاتھ والے چار آدمی اسٹریچر اٹھانے پہ مامور کیے جائیں

ران میں دو کے بائیں بازو سلامت ہوں اور دو کے دائیں بازو) چیف کی خاطر سوچا ہوا نکتہ: جب بجلی نہ ہو تو انجینئری کارخانوں میں مشینیں ہاتھ سے چلانے کا بندوبست کرو۔ ایک بات جو چیف کو پسند تھی: پروفیسر اپنا رکھا جائے۔ اس طرح اس نے علم الحیاتیات کے ماہر چیز لیفنکی کو اسپاسک میں ایک تجربگاہ کھولنے کی اجازت دے دی (جس میں صرف چھپکلیاں تھیں) لیکن جب چیز لیفنکی نے بے کار ملبے سے زیرکازن میں مزدوروں کے لیے سلکوسس سے محفوظ رکھنے والا نقاب تیار کر دیا تو چیف اس کی پیداوار کے لیے رضامند نہ ہو سکا۔ انھوں نے ہمیشہ نقاب کے بغیر کام کیا ہے، بے کار کا جھنجھٹ کیوں مول لیا جائے—؟ بالآخر نوواردوں کے لیے نئی جگہیں باقاعدگی سے خالی بھی تو ہونی چاہئیں۔

اواخر ۱۹۴۸ء میں اسپاسک میں مرد عورت کل ملا کر قیدیوں کی تعداد پندرہ ہزار تھی۔ خاصا لمبا چوڑا کیمپ گروپ تھا۔ سرحدی باڑ کے کھمبے کئی جگہ پہاڑیوں تک جا پہنچے تھے اور گوشوں میں بنی ہوئی، نگرانی کی برجیاں ایک دوسرے کی حد نگاہ سے باہر تھیں۔ از خود علیحدہ ہونے کا عمل بتدریج آگے بڑھا قیدیوں نے عورتوں، کارکنوں، قطعی اپاہج لوگوں کو الگ الگ رکھنے کے لیے دیواریں تعمیر کیں۔ (اس طرح کیمپ کے اندر ایک دوسرے کے رابطے محدود ہوں گے اور افسروں کے لیے سہولت ہو گی) ایک ڈاکیک بنانے والے چھ ہزار آدمیوں کو کام کرنے کے لیے بارہ کلومیٹر پیدل چل کر آنا پڑتا تھا۔ چونکہ وہ مریض قیدی تھے اس لیے انھیں آنے اور جانے میں دو دو گھنٹے لگتے تھے۔ اسی میں کام کے گیارہ گھنٹوں کا اضافہ اور کر لیجیے (اس کام میں کوئی دو ماہ سے زائد زندہ نہیں رہ پاتا تھا) اہمیت کے اعتبار سے اگلا کام پتھر کی کانوں میں تھا جو کیمپ کے اندر تھیں، مردوں کے علاقے میں بھی اور عورتوں کے علاقے میں بھی (جزیرے کی اپنی معدنیات موجود تھیں) مردوں والے حصے میں کان ایک پہاڑی پر واقع تھی۔ دن کا کام ختم کرنے کے بعد پتھر میں امونیل سے دھماکہ کر کے اس کو نرم کیا جاتا تھا اور اگلے دن وہ مریض قیدی ہتھوڑے سے پتھر توڑتے تھے۔ عورتوں کے حصے میں امونیل استعمال نہ ہوتا تھا، اس کی جگہ عورتیں کدالوں سے چٹانوں کی پرتوں کو گہرائی تک کھودتی تھیں اور سلیج ہتھوڑوں سے پتھر توڑتی تھیں۔ ہتھوڑے بے شک دستوں سے الگ ہو جاتے تھے اور نئے ہتھوڑے بعض اوقات ٹوٹے بھی جاتے تھے۔ نیا ہتھوڑا دستہ ڈالنے کے لیے کیمپ کے دوسرے علاقے میں لے جانا پڑتا۔ پھر بھی ہر عورت قیدی کا ایک دن کی قلیل ترین متعینہ پیداوار ۰٫۹ مکعب میٹر ہوتی تھی اور چونکہ وہ ایسی پورا نہ کر پاتی تھیں اس لیے انھیں اکثر دنوں میں کم خوراک دی جاتی تھی (چار سو گرام) آخر شش مردوں نے انھیں تربیت دی کہ روزانہ کی ناپ سے پہلے پرانے ڈھیروں سے پتھر نکال لیا کرو۔ ملحوظ رہے کہ یہ کام مریض قیدی، کسی مشینی امداد کے بغیر کرتے تھے اور یہ اسٹیپز کی شدید ترین سردی (درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے ۳۰-۳۵ ڈگری نیچے ہوتا تھا اور تیز ہوا چلا کرتی تھی) میں کرتے تھے اور اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ انھیں گرمیوں کے کپڑے پہنائے جاتے تھے کیونکہ کام نہ کرنے والے یعنی مریض قیدیوں کو گرم کپڑے فراہم کرنے کا قانون نہ تھا ب۔ ر نے مطلع کیا کہ وہ کس طرح تقریباً برہنہ رہ کر اس طرح کے تیز پالے میں بہت بھاری ہتھوڑا

چلایا کرتی تھی۔ مادرِ وطن کے لیے ان خدمات کی اہمیت اس وقت بہت واضح ہو جاتی ہے جب ہم یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کسی سبب سے عورتوں کا کانوں میں تعمیری کام کرنا نامناسب ثابت ہوا ہے اور کسی خاص موقع پر کسی اعلیٰ افسر خاص نے فرمان جاری کیا کہ عورتیں وہ تمام پتھر دوبارہ وہیں ڈال دیں، جہاں سے انھیں گزشتہ ایک سال کے دوران توڑ کر نکالا گیا تھا۔ انھیں مٹی سے ڈھانپ دیا جائے اور ایک پارک تعمیر کیا جائے (بے شک وہ اتنی دور تک کبھی نہیں پہنچ سکیں) مردوں کے علاقے میں پتھر اچھا تھا۔ اسے جائے تعمیر تک پہنچانے کی صورت یہ تھی کہ معائنے کے بعد تمام کارکن (تقریباً آٹھ ہزار افراد ـــ وہ سب جو اس وقت تک بقیدِ حیات تھے) مارچ کرتے ہوئے پہاڑی تک پہنچتے تھے اور کسی کو بھی، اگر وہ پتھر نہ ڈھو رہا ہو، پیچھے رہنے کی اجازت نہ تھی۔ تعطیل میں مریض یہ شفا قدمی دن میں دو بار، صبح و شام کرتے تھے۔

بعد ازاں ایسے کاموں کا سلسلہ شروع ہوا: اپنے باڑے بنانا یا کیمپ کی انتظامیہ اور پہریداروں کے لیے کوارٹر تعمیر کرنا (رہائشی مکان، ایک کلب، غسل خانہ، اسکول) کھیتوں اور باغوں میں کام کرنا۔

ان باغات کی پیداوار بھی آزاد ملازمین کو پہنچتی تھی اور قیدیوں کے حصے میں صرف چقندر کے پتے آتے تھے۔ یہ چیز ٹرکوں میں بار کر کے لائی جاتی تھی اور باورچی خانے کے قریب پھینک دی جاتی تھی جہاں وہ سڑتی رہتی تھی۔ پھر کسی دن خانساماں انھیں کچھوں سے بھر بھر کر دیگوں میں ڈال دیتے تھے (کم و بیش ویسی ہی چیز جیسے مویشیوں کا چارا!) ان چقندر کے پتوں سے ترکاری تیار کی جاتی تھی۔ اس میں ایک کلچی آٹا ڈال دیا جاتا تھا۔ اسپاسک کے ایک باغیچے کی داستان سنیے: تقریباً ڈیڑھ سو قیدی مل کر بھاگتے ہوئے باغیچے کے ایک حصے میں پہنچے، زمین پر لیٹ گئے اور انھوں نے کیاریوں سے توڑی ہوئی سبزی پر منہ مارنے شروع کیے۔ پہرے داروں کے ہجوم نے انھیں گھیر لیا اور انھیں ڈنڈوں سے پیٹنے لگے لیکن قیدی بدستور سبزی چباتے رہے۔ ـــ

ناکارہ اپاہجوں کو ساڑھے پانچ سو گرام روٹی دی جاتی تھی اور کام کرنے والے اپاہجوں کو ساڑھے چھ سو گرام۔ اسپاسک میں دواؤں کا نام و نشان تک نہ تھا (اتنی بڑی بھیڑ کے لیے دوائیں کہاں سے آتیں گی اور وہ بہر طور وہاں لقمۂ اجل بننے کے لیے ہی آئے تھے) اسی طرح وہاں بستروں کا بھی پتہ نہ تھا۔ کچھ جھونپڑوں میں بنک (سونے کے تختے) بیک وقت اوپر سرکائے جاتے تھے اور ڈبل بنچ پہ دو جگہ چار آدمی سکڑ کر لیٹ جاتے تھے۔ اور ہاں ـــ ایک بات کا تو میں نے ذکر ہی نہیں کیا۔ روزانہ ۱۱۰ تا ۱۲۰ آدمی گور کنی کے لیے جاتے تھے۔ دو اسٹوڈ بیکر گاڑیاں تابوتوں میں لاشیں لاتی تھیں جن میں سے ان کی ٹانگیں اور بانہیں باہر نکلی رہتی تھیں۔ ۱۹۴۹ء کی پُرامن گرمیوں کے زمانے میں بھی روزانہ ساٹھ تا ستر آدمی موت کو لبیک کہتے تھے اور سردیوں میں سو۔ (اسٹونیا کے لوگ جو گورکنی کے فرائض انجام دیتے تھے اس کا حساب رکھا کرتے تھے)

(دیگر خصوصی کیمپوں میں شرح اموات اتنی بلند نہ تھی۔ قیدیوں کو قدرے بہتر خوراک ملتی تھی

لیکن ان کا کام بھی یہاں سے زیادہ محنت طلب تھا کیوں کہ وہ مریض نہیں تھے۔ ضروری ردّ و بدل قارئین خود کریں)

یہ صورت حال تھی ۱۹۴۹ء میں (ایک ہزار نو سو انچاسویں سال میں) انقلاب اکتوبر کے بتیس برس بعد، جنگ کے اختتام اور اس کے لازمی شدائد کے چار سال بعد گزرنے پر، نورنبرگ کے مقدمات کے خاتمے کے تین سال بعد (جن میں عام آدمی کو نازی کیمپوں کی) صعوبتوں کا علم ہوا تھا اور اس نے راحت کا سانس لے کر کہا تھا: "ایسا پھر کبھی نہیں ہو سکتا۔"[۶]

اس میں اس بات کا اضافہ اور کر لیجیے کہ اسپیشل کیمپ میں منتقل ہو جانے پر بیرونی دنیا سے، اپنی بیوی سے جو آپ کی اور آپ کے مکاتیب کی منتظر رہتی تھی، اپنے بچوں سے جن کے لیے آپ ایک تمثیلی شے ہوتے جا رہے تھے۔ آپ کا رابطہ بالکل منقطع ہو جاتا ہے (سال میں دو خط ——— لیکن یہ بھی سپرد ڈاک نہیں کیے جاتے جب کہ آپ نے ان میں کئی ماہ سے محفوظ کردہ خیالات کا اظہار کیا ہے، ایم۔جی۔بی کی خاتون کارکنوں کے سنسر کے کام کی تنقیح کون کر سکتا تھا! جو خطوط ان کے پاس سنسر کے لیے پہنچتے تھے ان میں سے کچھ کو نذرِ آتش کر کے وہ اپنا کام ہلکا کر لیتی تھیں۔ اگر آپ کا خط منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا تو محکمۂ ڈاک پر بآسانی الزام لگایا جا سکتا ہے۔ اسپاسک میں کچھ قیدیوں کو ایک بار سنسر کے دفتر میں ایک اسٹو کی مرمت کے لیے طلب کیا گیا اور انھوں نے دیکھا کہ وہاں سیکڑوں خط پڑے تھے جو سپرد ڈاک نہیں کیے گئے تھے اور جنھیں سنسر والے جلانا بھی بھول گئے تھے۔ اسپیشل کیمپوں کا انتظام ایسا تھا کہ مرمت کرنے والے یہ بات اپنے دوستوں کو بتانے سے ڈرتے تھے کہ کہیں ریاستی محکمہ انتظامات ان کی صفائی نہ کر دے۔ یہ تھا وزارتِ تحفظِ ریاست کا روسی سنسر، جو اپنی ذرا سی محنت کو بچانے کے لیے قیدیوں کی روحانی کوفت کا سامان فراہم کرتا تھا ——— کیا یہ عورتیں ان عورتوں سے زیادہ رحم دل تھیں جو وزارتِ تحفظِ ریاست میں رہتے ہوئے ان لوگوں کی کھال اور بال جمع کرتی تھیں جنھیں قتل کر دیا جاتا تھا۔

خاندان والوں کا قیدی سے ملاقات کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ہر اسپیشل کیمپ کا پتہ پوشیدہ رکھا جاتا تھا اور کسی باہری شخص کو وہاں پر مارنے کی اجازت نہیں تھی۔

یہاں یہ بھی کہہ دیا جائے کہ اسپیشل کیمپوں میں ہینگو سے والے سوالات ——— رکھیں یا نہ رکھیں پیدا ہی نہ ہوتے تھے کیوں کہ ان کے قیام کے دوران ہی یہ تصفیہ کر لیا گیا تھا کہ نہ رکھیں۔ نہ قیدی روپیہ رکھ سکتے تھے نہ کوئی مزدوری دی جاتی تھی (اصلاحی مشقت کیمپوں میں دو چار پیسے کما لینا پھر بھی ممکن تھا لیکن یہاں ایک پائی بھی نہیں کمائی جا سکتی تھی) وہ فاضل جوتا یا کپڑا نہیں رکھ سکتے تھے، زیر جاموں کی اجازت نہ تھی۔ جسم کو گرم و خشک رکھنے کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ انڈرویئر اور بنیان (اور کیسی انڈرویئر! ہینگو سے کا دیوالیہ کردار اسے پہننے کے لیے بمشکل رضامند ہوتا) مہینے میں دو بار تبدیل کیے جاتے تھے، دیگر کپڑے، جوتے، سال میں دو مرتبہ، یہ سب کچھ بڑی وضاحت کے ساتھ ضابطے میں مندرج تھا۔

(کیمپ کے ابتدائی ایام میں نہیں، بعد میں [?] انھوں نے ایک مستقل اسٹور روم تیار کر دیا تھا۔

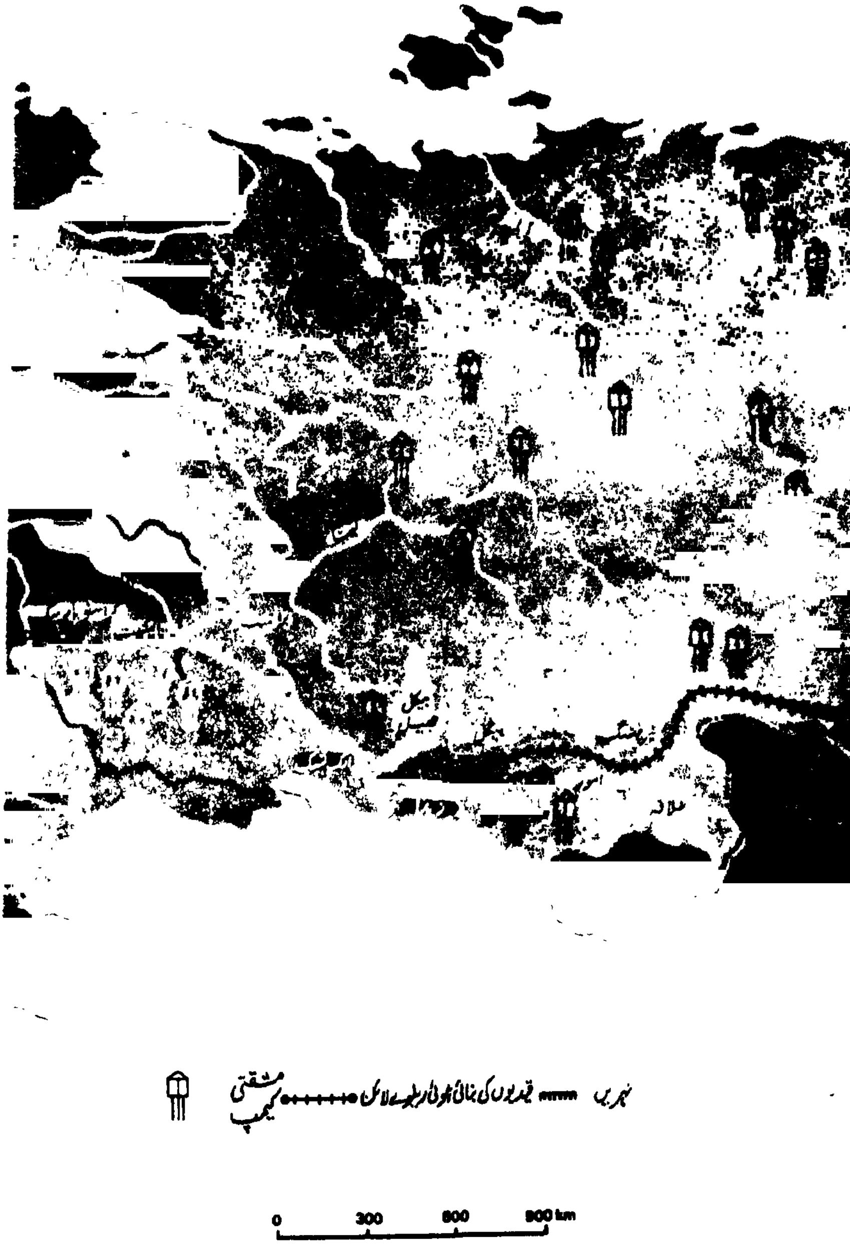


بحر ارال

تباہ کار مشقی کیمپ






نہریں
قیدیوں کی بنائی ہوئی ریلوے لائن
مشقتی کیمپ
0
300
600
900 km

جس میں کپڑے "رہائی" کے دن تک رکھے جاتے تھے اور پہننے کا کوئی کپڑا وغیرہ اپنی نجی چیزیں تحویل میں دینے کے وقت سپرد نہ کرنے کا عمل سنگین جرم قرار دیا جاتا تھا اور اسے فرار ہونے کی تیاری تسلیم کیا جاتا تھا جس کی سزا تھی قیدِ تنہائی اور تفتیش) کھانا اپنے لاکر میں نہ رکھنا (شام کو قطار لگا کر اسے اسٹور میں جمع کرانا ہوتا تھا اور صبح پھر واپس لیا جاتا تھا — اس طرح صبح و شام کے دو آدھ آدھ گھنٹے یقینی طور پر ضائع ہو جاتے تھے جن میں آپ سوچ سکتے تھے) کوئی تحریر نہ رکھنا، سیاہی، پختہ پنسل یا رنگین پنسل نہ رکھنا، اسکول نوٹ بک سائز کے سادہ کاغذ سے زائد نہ رکھنا — اور آخری بات یہ تھی کہ کتابیں نہ رکھنا۔ (اسپاسک میں داخلے کے وقت قیدی کی کتابیں ضبط کر لی جاتی تھیں۔ ہمارے کیمپ میں پہلے ہمیں ایک یا دو کتابیں رکھنے کی چھوٹ تھی لیکن ایک دن ایک دانشمندانہ فرمان جاری کیا گیا۔ قیدیوں کو تمام کتابوں کے نام شعبۂ تعلیم و ثقافت کے رجسٹر میں درج کرانے ہوں گے۔ جہاں اس کے سرورق پر "اسٹیپلاگ کیمپ ڈویژن نمبر ....." کی مہر ثبت کی جائے گی اور بغیر مہر والی تمام کتابیں غیر قانونی تصور کی جائیں گی نیز مہر لگی ہوئی کتب کو کتب خانے کی ملکیت مانا جائے گا اس کے سابق مالک کی نہیں)

یہ بھی ملحوظ رکھیے کہ اسپیشل کیمپوں میں اصلاحی مشقت کیمپوں کے مقابلے میں جامہ تلاشیاں زیادہ ہوتی تھیں (روزانہ کام کے لیے روانہ ہونے کے وقت اور واپس لوٹنے پر قیدیوں کی تلاشی پوری توجہ سے لی جاتی تھی (تصویر نمبر ۲) جھونپڑوں کی تلاشی باقاعدگی سے ہوا کرتی تھی۔ فرش اور بستر اٹھائے جاتے تھے، بھٹیوں سے آگ کریدنے کی سلاخیں نکالی جاتی تھیں۔ پورچوں میں تختے جھٹکے جاتے تھے اور پھر جیل کی طرح جامہ تلاشی ہوتی تھی جس میں قیدیوں کو برہنہ کر کے انھیں ٹٹولا جاتا تھا کپڑوں کے استر پھاڑ کر اور جوتوں کے تلے اکھاڑ کر دیکھے جاتے تھے) کچھ عرصے کے بعد انھوں نے کیمپ کے علاقے سے گھاس کا ایک ایک تنکا اکھاڑ کر پھینکنا شروع کیا" مبادا وہاں کوئی اسلحہ چھپا کر رکھ دے۔ تعطیل کے ایام کیمپ کے چار جانب اس نوع کے کاموں میں صرف ہو جاتے تھے۔

اگر آپ یہ سب کچھ یاد رکھیں تو یہ جان کر متعجب نہ ہوں گے کہ قیدی کی عزتِ نفس کو تباہ کرنے کا سب سے زیادہ کارگر اور خطرناک طریقہ کپڑوں پر نمبروں کی پٹیاں ٹانک دینا نہیں تھا۔ جب آشوان ڈینیسووچ کہتا ہے "ان نمبروں میں کوئی وزن نہیں ہے" تو اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہ اپنی عزتِ نفس سے دست بردار ہو چکا ہے۔ جیسا کہ چند مغرور ناقدین نے، جو کبھی بھوکے نہیں رہے اور جنھوں نے کبھی نمبر اپنے کپڑوں پر نہیں ٹانکے، اظہارِ ناپسندیدگی کے طور پر کہا ہے — یہ محض کامن سنس (معمولی فراست) کی بات ہے۔ نمبر اپنے نفسیاتی یا اخلاقی نتائج کے باعث، جیسا کہ افسرانِ بالا کا مطالبہ تھا، پریشان کن نہیں تھے بلکہ ایک عملی وجہ سے پریشان کن تھے — اس خوف کے باعث کہ ہمیں قیدِ تنہائی میں ڈال دیا جائے گا، ہم اپنے فاضل اوقات کو ان کپڑوں کے دوبارہ سینے میں صرف کرتے تھے، جو اُدھیڑ دیے جاتے تھے اور انھیں "فنکاروں" سے "چمکدار" کرلتے تھے یا کام کے دوبارہ پھٹ جانے والے چیتھڑوں کی جگہ پیوند لگانے کے لیے نئے چیتھڑے تلاش کرتے تھے۔

جن لوگوں کے تئیں، کیمپ کے دیگر طریقوں میں سے نمبر سب سے زیادہ غیر انسانی چیز تھے

وہ مذہبی فرقوں سے تعلق رکھنے والی عورتیں تھیں۔ ان میں سے کچھ سسلو فو اسٹیشن (کا منتلاگ) کے نزدیک واقع عورتوں کے کیمپ ڈویژن میں مقیم تھیں۔ وہاں کی تقریباً ایک ثلث عورتیں اپنے مذہبی عقائد کی بنا پر حراست میں لی گئی تھیں۔ اب الہامی کتاب (بک آف ریویلیشن، باب ۱۳، سطر ۱۶) میں پہلے ہی واضح طور پر لکھا ہے کہ "وہ* سب کے داہنے ہاتھ یا پیشانی پر داغ لگواتا ہے"۔

چنانچہ ان خواتین نے اپنے کپڑوں پر نمبر لگوانے سے انکار کر دیا یہ شیطان کا نشان ہے! نہ وہ قانون کے مطابق پوشاک وصول کرنے کی دستخطی رسیدیں (یقیناً شیطان کو) دینے پر رضا مند ہوئیں۔ کیمپ کے افسران نے (انتظامیہ کا سربراہ جنرل گرگیو ریٹ تھا اور علیحدہ کیمپ کا مقامی افسر اعلیٰ میجر بوگش تھا) انتظامیہ کی جانب سے سختی کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے حکم دیا کہ عورتیں اپنی قمیصوں کے سوا بقیہ تمام کپڑے اتار دیں اور ان کے جوتے بھی ضبط کر لیے جائیں (یہ کام خاتون وارڈنوں کے ذمہ ڈالا گیا جو کومسومول یا نوجوان تنظیم کی اراکین تھیں) اور اس طرح ان ناسمجھ توہم پرست مذہبی عورتوں کو قانون کے مطابق کپڑے وصول کرنے اور ان پر نمبر ٹانکنے کے لیے موسم سرما کی معاونت حاصل کی گئی لیکن درجۂ حرارت انجماد کی ڈگری سے نیچے ہونے کے باوجود وہ عورتیں صرف اپنی قمیصوں میں برہنہ پا کیمپوں میں چلتی رہیں اور انھوں نے شیطان کے سامنے اپنے ضمیر کو جھکنے نہیں دیا۔

اس جذبے (کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ ردِ عمل تھا! ہم جیسے دانشمند لوگ اس بات پر اتنا شدید ردِ عمل ہرگز ظاہر نہ کرتے!) کے سامنے انتظامیہ کو گھٹنے ٹیکنے پڑے، ان مذہب پرستوں کو ان کے کپڑے واپس کر دیے گئے اور انھوں نے بغیر نمبر ٹانکے ہوئے انھیں زیب تن کیا (زیلینا آیوانو فینا ارسونانے اپنے یہ کپڑے مکمل دس سال پہنے، اس کے بالائی کپڑے اور زیر جامے اس کے جسم پر ہی سڑ گئے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر گئے، لیکن محاسب دفتر رسید وصول کیے بغیر کوئی سرکاری املاک اس کے سپرد کرنے پر آمادہ نہ ہوا)!

نمبروں کے بارے میں ایک اور جھنجھلاہٹ پیدا کرنے والی بات تھی ان کا سائز، جس سے پہرے دار انھیں بہت دور سے ہی پڑھ سکیں۔ وہ ہمیں ہمیشہ اتنے فاصلے سے دیکھتے تھے جہاں سے وہ بحفاظت اپنی بندوقیں لا کر تیار ہو سکیں اور فائر کر سکیں۔ وہ ہم میں سے کسی کو بے شک نام سے نہیں جانتے تھے۔ اور چونکہ ہماری پوشاکیں یکساں ہوتی تھیں۔ اس لیے نمبروں کی عدم موجودگی میں وہ ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر کے امتیاز نہ کر سکتے تھے لیکن اب اگر مارچ کے دوران پہرے دار ہمیں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے، جگہ تبدیل کرتے ہوئے اپنے ہاتھ پشت پر نہ رکھتے ہوئے یا زمین سے کچھ اٹھاتے ہوئے دیکھ لیتے تھے تو پہرے داروں کے کمانڈر کی کیمپ میں رپورٹ موصول ہونے پر مجرم کو قید تنہائی بھگتنے کا خدشہ لاحق ہوتا تھا۔

پہرے دار خود ایک ایسا حربہ تھے جو کسی قیدی کو مشین میں پھنسی ہوئی چڑیا کی طرح کچل کر قیمہ بنا سکتے تھے۔ یہ "سرخ فیتے" یعنی باقاعدہ سپاہی یہ ٹامی گن تانے ہوئے لڑکے ایک سیاہ اندھی قوت تھے جو ہمارے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے اور کبھی کوئی عذر نہیں سنتے تھے ہماری کوئی بھی

بات ان کے کانوں سے نہیں اترتی تھیں اور ان کے پاس سے ہم تک صرف غضبناک چیخیں، کتوں کی غراہٹ بندوق، کھولنے اور بند کرنے کی آوازیں اور صلواتیں ہی پہنچتی تھیں۔ اور ہمیشہ ہماری نہیں، انھیں کی بات سچ ہوتی تھی۔

ایکی بسیٹز، جہاں وہ ریلوے لائن کے کنارے روڑیاں ڈال رہے تھے، سرحدی باڑ کے بغیر پہرے داروں کے حصار میں کام کر رہے تھے، ایک قیدی نے اپنے نیچے گرے ہوئے کوٹ میں سے کچھ روئی نکالنے کے لیے متعینہ علاقے کے اندر ہی چند قدم بڑھائے — ایک پہریدار اس کے قریب پہنچا اور اس نے قیدی کو مار ڈالا۔ بے شک سنتری کا اقدام صحیح تھا۔ اسے مبارکبادیاں ہی دی گئیں بیشک اسے آج تک کوئی تاسف نہیں ہے نہ ہم نے ہی اظہارِ غیض کیا۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ ہم نے اس کے بارے میں کوئی شکایت نامے بھی نہیں لکھے (اور اگر ہم شکایت نامے بھیجتے بھی تو وہ کیمپ سے آگے نہ بڑھتے)

۱۹ر جنوری ۱۹۵۱ء کو ہمارے پانچ سو افراد کا کالم جائے کار "اے۔ آر۔ ایم" پر پہنچ گیا تھا۔ ہمارے ایک جانب سرحدی باڑ تھی اور ہمارے نیز باڑ کے درمیان کوئی پہرے دار نہ تھا۔ وہ ہمیں پھاٹکوں کے راستے اندر لے جانے والے تھے اچانک ایک قیدی نے، جسے میلوے (چھوٹو) کہتے تھے حالانکہ وہ ایک اچھے خاصے ڈیل ڈول کا نوجوان تھا) کسی خاص وجہ کے بغیر قطار توڑ دی اور بے توجہی، کی کیفیت میں گارڈ کمانڈر کے قریب چلا گیا۔ ہمیں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ ہو اور یہ نہ جانتا ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ انچارج افسر، جو ایک شریر النفس، مغرور سا پستہ قامت آدمی تھا خوفزدہ ہو کر میلوے سے پرے ہٹنے لگا۔ وہ تیکھی آواز میں چیخ رہا تھا اور کوشش کے باوجود اپنا پستول نکالنے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ ایک ٹامی گن والا سارجنٹ تیزی سے لپک کر میلوے کے قریب آیا اور کچھ قدم کے فاصلے سے اس کے پیٹ اور سینے میں گولیاں اتار دیں اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ گیا میلوے گرنے سے پیشتر مزید دو قدم آگے بڑھا۔ اس کی جیکٹ کی پشت پر بھری ہوئی روئی کے گالے نظر آرہے تھے جو نادیدہ گولیوں کے راستے کی نشان دہی کرتے تھے۔ میلوے گر پڑا لیکن باقی ماندہ کالم میں سے کسی نے جنبش تک نہیں کی لیکن گارڈ کی کمانڈر اس حد تک خائف تھا کہ اس نے چلا کر فوجیوں کو حکم صادر کیا اور چہار جانب ٹامی گن کے قہقہے سنائی دینے لگے اور ہمارے عین سروں کے اوپر فضا میں لرزش پیدا ہو گئی ایک مشین گن، جو پہلے سے نصب تھی، تڑا تڑ چلنے لگی اور بے شمار آوازیں ایک دوسرے سے متصادم ہو کر ہسٹریائی انداز میں "لیٹ جاؤ — لیٹ جاؤ" چیخنے لگیں۔ ادھر گولیاں زیادہ سے زیادہ نیچی سطح حتیٰ کہ سرحدی باڑ کے اونچائی تک آگئیں۔ ہم نصف ہزار آدمی تھے لیکن ہم نے بندوق برداروں پر حملہ نہیں کیا اور انھیں پیروں تلے نہیں کچل ڈالا۔ ہم زمین پر دراز ہو گئے اور اپنے چہرے مذموم انداز اور بیچارگی کے عالم میں برف میں دبا لیے۔ اس برفیلے تیرہ ہار کی صبح پندرہ منٹ سے زیادہ عرصے تک ہم بھیڑوں کی طرح پڑے رہے۔ وہ ہم میں سے ایک ایک آدمی کو اڑا سکتے تھے جس کے لیے انھیں کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہونا پڑتا؛ وجہ یہ کہ یہ بغاوت کی کوشش تھی۔

یہ عالم تھا ہمارے اسپیشل کیمپوں کے پہلے اور دوسرے برسوں میں۔ قابلِ رحم، پسماندہ و پامال غلام کے بارے میں، اس عہد کے بارے میں آئیڈان ڈنیسووچ میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔

یہ سب ہوا کیسے؟ ان ہزاروں بے جا سلوک کے شکار انسانوں، دفعہ ۵۸ کے قیدیوں نے چھوڑیے یہ سب باتیں، وہ سیاسی مجرم تھے اور اب، جب وہ علیحدہ علیحدہ دیگر شہریوں سے دور، ایک جگہ جمع کیے گئے تھے تو یقیناً ان کا طرزِ عمل سیاسی لوگوں جیسا ہوگا۔ تو پھر انھوں نے ایسا نفرت آمیز ایسا بزدلانہ رویہ کیوں اختیار کیا؟

یہ کیمپ کسی دوسری شکل میں شروع نہیں ہو سکتے تھے۔ ظالم و مظلوم دونوں ہی اصلاحی مشقتی کیمپوں سے آئے تھے اور دونوں کی پشت پر کئی دہائیوں کی آقا و غلام کی روایت موجود تھی ان کی قدیم روایت زلیست ان کے ہمراہ چلی آئی تھی۔ انھوں نے قدیم تصورات کو ایک دوسرے کے ذہنوں میں تازہ رکھا کیوں کہ ایک ہی بار میں تقریباً سوا سو آدمی اسی کیمپ ڈویژن سے آئے تھے وہ اپنے ساتھ پختہ عقیدہ لے کر آئے تھے جو ان میں بخوبی پیدا کیا گیا تھا کہ آدمی جو چاہا ہوتا ہے کہ آدمی آدم خور ہوتا ہے اور یہ فطرت کبھی بدل نہیں سکتی۔ ان میں سے ہر شخص صرف اپنے بارے میں تشویش اور دوسرے کی قسمت کے بارے میں بے توجہی کا رویہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ وہ گرم باورچی خانے میں روٹی تراشنے کے کمرے میں، اسٹوروں میں، محاسب دفتر میں یا تعلیم و ثقافت کے شعبے میں فورمین کا کام یا نمبرداری کا آرام دہ کام حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کے دوران کسی قسم کی رورعایت نہ کرنے کے لیے تیار ہو کر آیا تھا۔

جب کسی شخص کو تنہا کسی نئی جگہ لے جاتے ہیں تو وہ وہاں اچھی طرح جم جانے کی توقع اپنی قسمت یا اپنی بے حیائی کے بھروسے پر ہی کر سکتا ہے۔ لیکن جب لوگوں کو اسی بند گاڑی میں دو، تین یا چار ہفتوں تک ایک ساتھ ایک طویل فاصلہ طے کرایا جاتا ہے تو وہ ایک ہی سفری جیل میں گڈمڈ ہوتے ہیں، ایک ہی کام میں چلائے جاتے ہیں پھر ان کے پاس تبادلۂ خیال کرنے کے لیے کافی وقت ہوتا ہے اور وہ یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان میں سے کس کا گھونسہ فورمین بننے کے لائق ہے، کون افسروں کے تلوے چاٹنے کا فن جانتا ہے، کون بھونڈی حرکتیں اور چالاکیاں کر سکتا ہے۔ کام کرنے والے قیدیوں کو ضرر پہنچا کر اپنے لیے فائدے کی صورت نکال سکتا ہے اور نمبرداروں کا خاندان فطرتاً رہائی کے خواب دیکھنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا بلکہ غلامی کی صف کو مضبوط کرنے والی قوتوں سے ہاتھ ملالیتا ہے، نئے کیمپ میں اہم منصبوں پر قابض ہونے اور دیگر مقامات سے آنے والے نمبرداروں کو ان سے محروم رکھنے کے لیے آپس میں متحد ہوتا ہے۔ دوسری جانب سادہ لوح محنت کش جو اپنے سیاہ اور بے مراد نصیب کے ساتھ سمجھوتا کر لیتا ہیں، اچھی طرح کام کرنے والے دستے تیار کرنے کے لیے اور نئی جگہ پر کسی اچھے فورمین یا پہلے ٹکھیا کی جستجو میں متحد ہو جاتے ہیں۔

یہ لوگ اس بات کو قطعی فراموش کر چکے تھے کہ ان میں ہر فرد انسان ہے، کہ اس کا ایک ضمیر بھی ہے، کہ وہ اعلیٰ ترین مقاصد کی تکمیل پر قدرت رکھتا ہے۔ وہ یہ بھی فراموش کر چکے تھے۔

کہ انھیں ہمیشہ سربسجود رہنے کی ضرورت نہیں، کہ آزادی ہر انسان کا اتنا ہی حق ہے جتنا ہوا پر، کہ وہ سب بیشتر سیاسی قیدی تھے اور کہ اب ان میں سے کوئی اجنبی نہ تھا۔

یہ سچ ہے کہ اب بھی ان میں معدودے چند اخلاقی مجرمین بھی شامل تھے افسران اپنے ژرگون کو بار بار فرار ہونے کی کوشش سے باز رکھنے میں ناکام ہو چکے تھے (تعزیرات کی دفعہ ۱۹۲ کے تحت اس کی سزا دو سال سے زائد نہ تھی اور اخلاقی مجرم پہلے ہی کئی دہائیوں بلکہ صدیوں کا فاضل وقت جمع کر چکے تھے اس لیے جب انھیں فرار ہونے سے باز رکھنے والا کوئی نہ ہو تو وہ فرار کی کوشش کیوں نہ کریں؟) اور انھوں نے متوقع مفرورین پہ دفعہ ۵۸ پیرا ۱۴ (اقتصادی تخریب کاری) کے تحت الزام عائد کرنے کا فیصلہ کیا۔

بحیثیت مجموعی چور کچھ زیادہ تعداد میں خصوصی کیمپوں میں نہیں لائے گئے تھے، ہر گاڑی میں ان کی تعداد چار پانچ ہی ہوتی تھی لیکن لوگوں کو دھمکانے اور ذلیل کرنے کے لیے۔ جھونپڑوں کے وارڈنوں یا مکھیاؤں کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے اور لاٹھیاں لے کر چہار سمت گشت لگانے کے لیے (جسے اسپاسک میں آذربائیجانی تھے جنھیں بعد میں کلہاڑیوں سے کاٹ ڈالا گیا تھا) اور نمبرداروں کو مجمع الجزائر کے ان نئے جزیروں پر گندے اور علامات تخریب کار مشقت کیمپوں کا پرچم (گندہ، بدنما جسے سیاہ رنگ سے آراستہ کیا گیا تھا) نصب کرنے میں معاونت کے لیے وہ کافی تھے۔

اکی بسٹز کا کیمپ ہماری وہاں آمد کے وقت یعنی ۱۹۴۹ء سے ایک سال قبل قائم کیا گیا تھا، اور قیدیوں نیز مالکوں کے دماغوں میں پیوست قدیم ڈھرّے کی تمام باتیں پختہ ہو چکی تھیں، ہر جھونپڑے میں ایک وارڈن، ایک ڈپٹی وارڈن اور سینیئر قیدی رہتے تھے جو اپنے شکاروں کو دبوچنے کے لیے اپنے گھونسوں اور چغل خوری پر بھروسہ کرتے تھے۔ ایک جھونپڑا نمبرداروں کے لیے مخصوص تھا جہاں وہ اپنے بنکوں (سونے کے لیے نصب کردہ تختوں) پر دراز ہو کر جمائی نوش فرماتے تھے اور کام کے تمام متعلقات کا اور وہاں کام کرنے والوں کی قسمت کا فیصلہ باہمی مشورے سے کرتے تھے۔ فنش طرز کے جھونپڑوں[*] کے مخصوص ڈیزائن کی بدولت، ان میں سے ہر ایک میں علیحدہ علیحدہ کیبن تھے جن میں سے ایک آدھ خصوصی مراعات حاصل کرنے والے قیدی اپنے عہدے کے مطابق رہتے تھے۔ کام سونپنے کے فرائض پر بدمعاش چوروں کی ایک ٹولی نے حق جما رکھا تھا اور یہ سب انجینئر تصور کیے جاتے تھے۔ مخبر شعبۂ تحفظات میں بے خوف و خطر باقاعدگی کے ساتھ چغل خوریاں کرتے رہتے تھے۔ اس کیمپ میں جو ایک سال پیشتر خیموں میں شروع کیا گیا تھا، اب ایک پتھر کا بنا ہوا قید خانہ بھی تھا لیکن یہ ابھی نامکمل تھا اس لیے اس میں ہمیشہ بھیڑ رہا کرتی تھی۔ قیدِ تنہائی پانے والے قیدیوں کو ایک دو ماہ تک انتظار کرنا پڑتا تھا۔ نظم و نسق کی حالت خستہ تھی اس میں کوئی شبہ نہیں! قیدِ تنہائی کے لیے بھی قطار بندی (مجھے قیدِ تنہائی کی سزا دی گئی تھی لیکن میری باری کبھی نہیں آ سکی!)

یہ حقیقت ہے کہ چور (زیادہ مناسب الفاظ میں کتے، کیوں کہ وہ کبھی آتنے عظیم نہیں ہوتے کہ کیمپ کے عہدے نہ حاصل کر سکیں) ایک سال میں اپنی کچھ چمک دمک کھو چکے تھے وہ اپنے آپ کو کچھ

پسماندہ محسوس کرتے تھے، ان کی پشت پر کوئی نئی نسل ابھرتی ہوئی نظر نہیں آتی تھی، کوئی امنگ کے ساتھ ان کی تقلید نہیں کر رہا تھا۔ سارا سلسلہ ان کے لیے بے لطف نہیں آ رہا تھا۔ جھونپڑوں کے وارڈن میگران نے، جب ڈسپلن افسر کا قطار بند قیدیوں سے تعارف کرایا، تو اس نے ان پر رعب ڈالنے کی حتی الوسع کوشش کی لیکن جلد ہی اس میں خود اعتمادی کی کمی پیدا ہو گئی اور اس کا ستارہ بے نور ہو کر غروب ہو گیا۔

ہر نووارد گروہ کی طرح ہم پر بھی داخلے کے بعد غسل کرنے کے دوران دباؤ ڈالا گیا۔ غسل خانے کے ملازم، حجام اور اسٹور کے کارکن تیار تھے اور جو قیدی کبھی کبھی ہوئی انڈر دیر، سرد پانی یا حرارت برقرار رکھنے کے ناکافی وسائل کی شکایت کرتا اس پر اجتماعی یلغار کر دی جاتی۔ وہ تو اس نوع کی شکایات کے منتظر ہی رہتے تھے۔ ان میں سے کئی مجرم پرکتوں کے غول کی طرح حملہ آور ہوتے اور غیر انسانی آوازوں کے ساتھ بیک وقت چیختے ــــ "اب تو کسی خصوصی سفری جیل میں نہیں ہے۔" اور اپنے بدہیئت گھونسے اس کے منہ کے سامنے لہراتے (یہ نفسیاتی مہارت تھی۔ برہنہ تن آدمی کو کپڑے پہنے انسان کے مقابلے میں دس گنا آسانی کے ساتھ مجبور کیا جا سکتا ہے اور اگر نوواردین کو اپنے ابتدائی غسل سے پہلے ہی خائف کر دیا جائے تو کیمپ کی زندگی کے آغاز میں ہی اس کے پر کٹ جائیں گے)

اسی دلو دیاگرشنی کو، جو طالب علم تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیمپ میں چاروں طرف بغور دیکھ کر یہ فیصلہ کروں کہ مجھے کس کے ساتھ چلنا ہے، پہلے ہی دن کیمپ کے تحفظاتی کام پر لگایا گیا اسے حکم ملا کہ جس کھمبے پر قندیل لگائی جائے گی اس کے لیے گڑھا تیار کرو۔ وہ اتنا نحیف تھا کہ اپنا کام مکمل نہ کر سکا۔ ایک مخبر بطورسن نے، جو اردلی تھا اور اب کچھ سنبھل کر چلنے لگا تھا لیکن پھر بھی کچھ اینٹھ باقی تھی، اسے چور کہہ دیا اور اس کے منہ پر مارا۔ گرشنی نے اپنی کدالی پھینک دی اور گڑھے سے نکل کر چلا گیا۔ وہ کمانڈنٹ کے دفتر میں پہنچا اور بولا ــــ "خواہ آپ مجھے قید تنہائی میں ڈال دیں لیکن جب تک آپ کے چور لوگوں کو زدوکوب کریں گے، میں کام کرنے نہیں جاؤں گا۔" (لفظ "چور" اسے بطور خاص بُرا لگا تھا کیوں کہ یہ اس کے لیے ایک نئی چیز تھی) اس کی درخواست نامنظور نہیں کی گئی اور اس نے متواتر دو مدتیں، یعنی اٹھارہ دن کال کوٹھری میں بسر کیے (اس کا طریقہ یہ تھا: ابتدا میں قیدی کو پانچ یا دس دن کے لیے کال کوٹھری میں رکھا جاتا تھا پھر اس کی میعاد ختم ہو جانے پر بجائے رہا کرنے کے وہ منتظر رہتے تھے کہ قیدی اختلاف ظاہر کرے اور بُرا بھلا بکنا شروع کرے ــ تاکہ اسے قاعدے کے مطابق مزید قید تنہائی کی سزا دی جا سکے) قید تنہائی کے بعد انھوں نے اسے دو ماہ تک ڈسپلن بیرکوں میں رہنے کی سزا دی جس کا مطلب تھا کہ وہ جیل میں رہے گا اور کام کرنے کے لیے چونے کی بھٹیوں پر حاضری دے گا اور کام کی مقدار کی مناسبت سے گرم کھانا اور راشن وصول کرے گا۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ وہ دلدل میں مسلسل اترتا جا رہا ہے، گرشنی نے شعبۂ صحت کے وسیلے سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ ابھی "میڈم" دوبینکایا کو، جو شعبے کی سربراہ تھی، سمجھ نہیں سکا تھا۔ اس نے تصور کر رکھا تھا کہ بس میں اپنے سپاٹ پیر صاف کے لیے پیش کروں گا اور مجھے چونے کی بھٹیوں تک طویل فاصلہ طے

کرنے سے نجات مل جائے گی لیکن وہ اسے شفاخانے تک لے جانے کو ہی آمادہ نہ تھے۔ ایکی بسرٹی کی ڈسپلن بیرکوں میں باہری مریضوں کے لیے کوئی کلینک نہیں تھا۔ گرشنی نے وہاں پہنچنے کا تہیہ کر رکھا تھا اور اس نے اختلاف ظاہر کرنے کے بہت سے طریقوں کی بابت سن رکھا تھا اس لیے ایک دن صبح جب قیدیوں کو کام کے لیے قطار میں کھڑا کیا جا رہا تھا، وہ سونے کے تختے پر صرف انڈرویئر پہنے کھڑا رہ گیا دو وارڈروں پولنڈرا" (ایک خردماغ سابق بحری سپاہی) اور کونٹسوف نے اسے سونے کے تختے سے ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹ لیا اور اسی عالم میں انڈرویئر پہنے ہوئے، کھینچتے ہوئے لے جا کر قطار میں کھڑا کر دیا۔ جب وہ اسے گھسیٹ کر رہے تھے تو تعمیر کے لیے زمین پر پڑے ہوئے پتھر پکڑ کر گرشنی نے رکنے کی کوشش کی۔ اب وہ چونے کی بھٹیوں تک جانے کے لیے رضامند تھا۔ "بس مجھے پتلون پہن لینے دو۔" وہ چیخ رہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اسے گھسیٹتے رہے اُدھر گارڈ ہاؤس پر چار ہزار آدمی اپنے اپنے کاموں پر تعیناتی کے منتظر تھے اور ادھر یہ پستہ قامت سارڈ کا مزاحمت کر رہا تھا وہ اسے ہتھکڑیاں لگانے کے لیے کوشاں تھے اور وہ چیخ رہا تھا: "گسٹاپو فاشسٹ" لیکن پولانڈرا اور کونٹسوف نے اس کا سر زمین پر رگڑ دیا اور ہتھکڑیاں لگا کر ہانکنے لگے۔ نہ جانے کیوں وہ یا ڈسپلن افسر لیفٹیننٹ میچونکی پریشان نہیں ہوئے بلکہ گرشنی خود ہی پریشان ہوا۔ وہ محض انڈرویئر پہنے ہوئے پوری بستی سے کس طرح گزرتا! اس نے تعمیل حکم سے انکار کر دیا۔ ایک چپٹی ناک والا کتا سنبھالے ہوئے قریب ہی کھڑا تھا۔ وولودیا کو یاد تھا کہ اس نے غنغنا کر کہا تھا "یہ سب بکھیڑا مت کھڑا کر، دوسروں کی طرح چلا چل۔ آگ کے پاس بیٹھ جانا، کام مت کرنا۔" اور اس نے اپنے کتے کو سختی سے تھام لیا جو زنجیر تڑا کر وولودیا کا گلا دبوچنے کے لیے بےقرار تھا۔ کیوں کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ لڑکا شانے پر نیلی پٹیاں لگانے والوں کا مقابلہ کر رہا تھا! وولودیا کو کام دینے کی جگہ سے ہٹا دیا گیا اور ڈسپلن بیرکوں میں پہنچایا گیا۔ اس کی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں میں پڑی ہوئی ہتھکڑیاں بیش از بیش درد پیدا کرتی ہوئی انھیں کاٹ رہی تھیں اور ایک دوسرے وارڈر نے، جو قازق تھا اسے گلے سے پکڑ لیا اور اپنے گھٹنے سے لے مارا پھر انھوں نے اسے فرش پر دھکیل دیا۔ کسی نے کاروباری پیشہ ورانہ لہجے میں کہا: "اس کو اس وقت تک پیٹو جب تک یہ اپنے آپ کو....." اور انھوں نے اس کی کنپٹیوں اور دوسری جگہوں پر بوٹوں کی ٹھوکریں مارنی شروع کیں جن سے وہ بے ہوش ہو گیا۔ اگلے دن اسے اعلیٰ حفاظتی افسر کے سامنے پیش کیا گیا اور انھوں نے اس پر دہشت پسندانہ عزائم کا الزام عائد کرنے کی کوشش کی۔ جب اسے گھسیٹا جا رہا تھا تو اس نے پتھر تھام لیے تھے، آخر کیوں؟

ایک دوسرے موقع پر سوید ونخوف نے کام پر جانے سے انکار کی کوشش کی۔ اس نے بھوک ہڑتال بھی کر دی۔ وہ شیطان کے لیے کام نہیں کرے گا! اس کے احتجاج کی کوئی پروا نہ کرتے ہوئے انھوں نے اسے جبراً پکڑ کر گھسیٹا۔ یہ معاملہ ایک عام جھڑپ میں ہوا۔ وہ کھڑکیوں کے شیشوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور انھیں توڑ دیا۔ کانچ ٹوٹنے کی چھن چھن قیدیوں کی ساری قطار سن سکتی تھی۔ سب غل غپاڑہ کرتے اور قیدی کوشش کرتے ہوئے وارڈروں کی آوازوں کے ساتھ یہ سب بے تکی

آواز علیحدہ سنائی دے رہی تھی۔

ہمارے دنوں، ہفتوں، مہینوں، برسوں میں ایک طویل یکسانیت کی بے تکی سنگت تھی اور امید کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی۔ جب یہ کیمپ قائم کیے گئے تھے تب ایم۔ وی۔ ڈی کے منصوبے میں امید کی کرنوں کی کوئی گنجائش رکھی ہی نہیں گئی تھی۔

ہم نو واردوں میں سے پچیس نے، جو بیشتر یوکرین کے تھے، ایک کارکن دستے میں یکجا ہو کر کام دینے والے سے کہا کہ ہمیں اپنی ٹولیوں میں سے ایک ایک مکھیا (فورمین) منتخب کر لینے دو۔ پاویل بورذنگ کر، جس کا تذکرہ میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔ ہم نے اچھا برتاؤ اور سخت محنت کرنے والوں کا ایک دستہ تیار کیا (مغربی یوکرینیوں کو، جو کل تک فارم مزدور تھے اور اجتماعی کاشت کی تنظیموں میں شامل نہ رہے تھے، کسی اصرار کی ضرورت نہ تھی۔ بعض اوقات انھیں روکنا پڑتا تھا!) کچھ دنوں تک ہمیں عام مزدور تصور کیا گیا لیکن پھر معلوم ہوا کہ ہم میں سے کچھ اینٹیں بنانے والے کاریگر تھے۔ دیگر لوگوں نے ان کاریگروں سے تربیت حاصل کرنی شروع کی اور اس طرح ہم تعمیری بریگیڈ کی حیثیت اختیار کر گئے۔ اینٹیں بنانے کا کام بخوبی چلتا رہا۔ یہ بات عہدیداران کے علم میں آئی اور انھوں نے ہمیں بحالی کے منصوبے سے ہٹا لیا (اس کے تحت آزاد ملازمین کے مکان تعمیر کیے جاتے تھے) اور ہمیں کیمپ کے علاقے میں محدود کر دیا گیا۔ انھوں نے ہمارے فورمین کو ڈسپلن بیرکوں کے پاس پتھروں کا انبار دکھایا۔ وہی پتھر جن سے لپٹنے کی گرشنی نے کوشش کی تھی اور کانوں سے بلاناغہ مال بھیجنے کا وعدہ کیا، انھوں نے کہا کہ ڈسپلن بیرکیں جس عالم میں ہیں اس کے پیش نظر انھیں صرف نصف ڈسپلن بیرکیں ہی کہا جا سکتا ہے اور نصف حصے کی تشکیل اب کرنی ہوگی اور یہ کہ ہمارا کام اب دوسرا دستہ کرے گا۔

اس طرح ہم نے یہ شرمناک کام کیا کہ اپنے لیے خود جیل کی تعمیر شروع کر دی۔ یہ طویل قحط سالی والا موسم سرما تھا پورا ستمبر اور نصف اکتوبر تک بارش کا ایک قطرہ بھی نہیں برسا۔ صبح ہوا ساکن ہوتی تھی پھر چلنا شروع ہوتی اور دوپہر تک تیز ہو جاتی اور شام کو پھر ساکن ہو جاتی۔ بعض اوقات یہ ہوا متواتر چلتی رہتی۔ ہلکی پریشان کن ہوا، جس سے آپ کو اسٹیپی کے دلدوز سپاٹ پن کا حوصلہ شکن احساس ہمیشہ کے مقابلے میں زیادہ ستانے لگتا تھا اور اسٹیپی ہمیں ڈسپلن بیرکوں کے چہار جانب کھنچی ہوئی فصیل سے صاف نظر آتی تھی۔ پہلے والی فیکٹری کی عمارت کے ساتھ کی بستی، پہرے داروں کے جھونپڑے یا کیمپ کے چاروں طرف کھنچی ہوئی تار کی باڑ اس اسٹیپی کی بیکراں لامحدودیت اور بیزار کن سپاٹ پن کو ہماری نگاہ سے اوجھل رکھنے میں ناکام تھیں۔ یہ لامحدودیت کچھ ٹوٹتی تھی ــــــ بیڈول تار کے کھمبوں کی پہلی قطار سے جو شمال مشرق میں بالخورر کی طرف جاتی تھی۔ کبھی کبھی ہوا سرد ہو جاتی اور ایک گھنٹے کے اندر یہ سائبیریا کے سرد موسم کو دعوت دیتی جس سے ہمیں اپنی روئی کی جیکٹیں پہننی پڑتی تھیں اور ہمارے چہروں پر موٹی ریت اور سنگریزوں سے، جو ہوا کے ساتھ اسٹیپی سے اڑ کر آتے تھے بے رحمی کے ساتھ وار کرتی۔ اس کی تفصیل کیا عرض کروں۔ اس دور میں وہاں ڈسپلن بیرکیں تعمیر کرنے میں معاونت کرتے ہوئے میں نے جو نظم کہی تھی، اس کو پیش کر دینا زیادہ مناسب ہوگا:

شاعر جس کی ثنا خوانی کرتا ہے اسی معمار کی طرح
میں بیڈول پتھروں کو جیل کی تعمیر پر رضامند کرتا؛
شہری جیل نہیں،
یہاں صرف باڑیں جھونپڑے اور نگرانی کی برجیاں ہیں
اور صاف آسمان پر پھرتیلے عقاب تیر رہے ہیں۔
صرف ہوا چلتی ہے اسٹیپی پر۔
کیوں نہیں پوچھتا کہ میں یہ دیواریں کس کے لیے کھڑی کر رہا ہوں.....
کیوں کتے، مشین گنیں، تار بھی جیل کے لیے ناکافی ہیں
کرنی ہاتھ میں تھامے میں بھی مصروفِ کار ہوں۔
کسی غور و فکر کے بغیر" تاکہ دیوار واقعی مکمل ہو جائے!
"سب سے پہلے تمہیں اس میں قیام کرو گے": میجر کے اس سرسری مذاق سے،
میرا خوف بڑھتا نہیں۔ مخبر اپنا کام کر چکے ہیں؛
میرا ریکارڈ داغ دار ہے جیسے چیچک کے داغوں سے چہرہ بدنما ہو جاتا ہے
کال کوٹھڑی کے دیگر مستحقین کے ساتھ میں واضح طور پر منسلک ہوں پابندیوں سے،
ہتھوڑوں کی توڑنے پھوڑنے والی آوازیں ہم آہنگ ہیں،
یکے بعد دیگرے دیواریں سر اٹھا رہی ہیں،
دیواروں کے اندر دیواریں۔
گارا ملاتے ہوئے ہم دھواں چھوڑتے ہیں اور خوشی کے ساتھ منتظر ہیں،
زیادہ روٹیوں کے، رات کو بستر پر زیادہ کپڑوں کے۔
واپسی پر اپنی جگہوں پر بیٹھ کر ہم جھانکتے ہیں پتھروں سے گھری ہوئی کوٹھڑیوں میں۔
اندھے کنویں، جن کی گہرائی سے اذیت رسیدہ ساتھیوں کی کراہیں ابھرتی ہیں۔
ہماری طرح ہمارے جیلروں کا ربط بھی انسانی دنیا سے قطع ہو گیا ہے
لیکن لامحدود سڑک اور اور سنساتے ہوئے تار۔
یاالٰہی، ہم کتنے لاچار، کتنے بزدل ہیں!
کیا غلام ہم لوگوں سے بھی زیادہ مایوس ہوتے ہیں،
کیا امیدیں کبھی اس سے زیادہ مردہ بھی ہوئی ہوں گی؟

غلام! اس وجہ سے نہیں کہ میجر میکسیمنکو کی دھمکیوں سے خائف ہو کر ہم ناتراشیدہ پتھروں کو احتیاط سے جاتے تھے اور ایمانداری کے ساتھ ان کے درمیان مصالحے کی تہہ لگاتے تھے تاکہ مستقبل کے قیدی اس دیوار کو آسانی کے ساتھ نہ توڑ سکیں بلکہ اس وجہ سے کہ ہر چند ہم اپنے مقصد کو کم ہی پورا کر پاتے تھے۔ لیکن جیل تعمیر کرنے والی ہماری ٹولی کو عام لوگوں سے زیادہ راشن فراہم کیا جاتا تھا، اور

میجر کے منہ پر پھینک دینے کی جگہ ہم زہر مار کر لیتے تھے۔ ہمارا ساتھی وولودیا اس وقت ڈسپلن بیرک کے نو تعمیر شدہ حصے میں بیٹھا تھا اور آئیوان اسپاسکی، کسی واضح الزام میں نہیں بلکہ ریکارڈ پر کوئی پراسرار سیاہ نشان ہونے کے باعث پہلے ہی سزا بھگتنے کے لیے تعمیر کردہ بیرکوں میں منتقل ہو چکا تھا اور ہم سے بہتوں کو انھیں ڈسپلن بیرکوں میں، انھیں کوٹھڑیوں میں، جو اتنی جانچ پڑتال کے بعد اور مہارت کے ساتھ ہم ہی تعمیر کر رہے تھے، مستقبل میں کچھ مدت گزارنی ہوگی۔ کام کے اوقات میں جب ہم مستعدی کے ساتھ اینٹیں اور مسالہ لگاتے تھے۔ اسٹیپی پر دفعتاً گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں، کچھ دیر بعد جیل کی ایک گارڈ ہاؤس پر پہنچی جہاں ہم تھے (یہ گارڈ یونٹ سے ملحق تھی، اصل جیل گاڑی جیسا کہ آپ شہروں میں مشاہدہ کرتے ہیں، لیکن اس کے دونوں جانب خرابیوں کے فائدے کے لیے • سوویٹ شیمپین نوش فرمائیے" کا اشتہار نہیں ہوتا تھا)*۔ گاڑی میں سے چار آدمی برآمد کیے گئے جو شکستہ حال اور لہولہان تھے۔ ان میں سے دو لڑکھڑاتے، ایک کو کھینچ کر باہر نکالا گیا۔ صرف پہلا از خود باہر نکلا۔ آئیوان بورودیوف غرور اور غضبناکی کا مظاہرہ کرتا ہوا ساتھ تھا۔

وہ ان مفرورین کو ہمارے قریب سے، بالکل ہمارے پیروں کے نیچے سے، جن پاڑھوں پر ہم کھڑے تھے۔ ان کے تلے سے نکال کر لے گئے اور ان کے ساتھ ڈسپلن بیرکوں میں تا حال تعمیر کردہ داہنے حصے میں داخل ہو گئے۔

اور ہم اپنے پتھروں کی چنائی کرتے رہے۔

فرار ہو جانا! اس کے لیے کیسے اندھے حوصلے کی ضرورت ہوتی تھی! عام کپڑے ندارد، غذا غائب، خالی ہاتھ، گولیوں کی بوچھار میں باڑ پھلانگنا اور روشیدگی سے عاری، بے آب و گیاہ لامحدود کھلے اسٹیپی میں زقندیں بھرنا۔ یہ کوئی دانشمندانہ فعل نہیں تھا۔ یہ لاشعوری عمل تھا۔ خودکشی کا ایک پروقار انداز تھا۔ مدافعت کا ایک ایسا طریقہ جس کا حوصلہ ہم میں سے سب سے زیادہ توانا اور دلیر لوگوں میں ہی پایا جاتا تھا۔

لیکن ہم اپنے پتھروں کی چنائی کرتے رہے۔

اور بر سبیل تذکرہ یہ بھی واضح کردوں کہ فرار ہونے کا ایک ماہ کے اندر یہ دوسرا واقعہ تھا۔ پہلی کوشش بھی ناکام رہی تھی لیکن وہ کچھ احمقانہ تھی بھی۔ واسیلی بروکن (عرف بلوکر) انجینئر ریٹا نوف اور ایک دوسرے سابق پولیس افسر نے اس کمرے کے نیچے جس میں واقع انجینئرنگ کارخانے میں وہ کام کرتے تھے، ایک گڑھا بنا لیا تھا جس میں ایک مکعب میٹر خلا تھا۔ وہ کچھ اشیائے خوردنی لے کر اس میں چھپ گئے اور اوپر سے اپنے آپ کو ڈھانک لیا۔ انھوں نے سادہ لوحی کے تحت توقع کی تھی کہ شام کو حسب معمول پہرے دار اس جگہ سے ہٹ جائے گا اور پھر وہ اوپر چڑھ کر باہر نکل جائیں گے لیکن جب کام کے اختتام پر تین افراد کم پائے گئے اور ان کے فرار کا شبہ پیدا کرنے والے باڑ کے ٹوٹے ہوئے تار بھی نہیں پائے گئے تو وہاں تک دن تک چوبیس گھنٹے کا پہرہ مقرر کر دیا گیا۔ اس مدت میں لوگ ان کے سروں کے اوپر سے گزرتے رہے۔ کتے لائے گئے۔ لیکن زیر زمین لوگوں نے کتوں کو

دھوکا دینے کے لیے فرش کی ایک دراڑ کے پاس پڑول میں بھیگا ہوا کپڑا لگا دیا۔ تین دن اور تین رات وہ وہاں بے حس و حرکت اور خاموش بیٹھے رہے، اپنی ٹانگیں اور بازو سکوڑے رہے۔ ایک مکعب میٹر میں تین آدمی تھے لیکن آخرش وہ اس عالم میں زیادہ دن تک نہ رہ سکے اور باہر نکل آئے۔

کیمپ کے علاقے میں دیگر ٹیمیں بھی آگئیں اور انھوں نے ہمیں مطلع کیا کہ یورو بیوف اور اس کے ساتھیوں نے کس طرح فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ وہ ایک لاری میں بیٹھ کر باڑ توڑتے ہوئے نکل بھاگے تھے۔

ایک ہفتہ اور گزرا۔ ہم اب بھی پتھر جوڑ رہے تھے۔ ڈسپلن بیرکوں کے دوسرے حصے کا نقشہ اب صاف نظر آنے لگا تھا، یہاں چھوٹی چھوٹی آرام دہ کوٹھریاں ہوں گی۔ یہاں قید تنہائی کی کوٹھریاں ہوں گی، یہاں گودام ہوں گے۔ اب تک ہم تنگ سی جگہ میں پتھروں کی بہت بڑی مقدار صرف کر چکے تھے اور وہ کانوں سے مزید پتھر فراہم کر رہے تھے۔ پتھر پر کچھ صرف نہ آتا تھا، کانوں میں یا جائے تعمیر پر مزدوری تو ادا کی ہی نہیں جاتی تھی۔ حکومت کو صرف سیمنٹ پر خرچ کرنا پڑتا تھا۔

وہ ہفتہ گزر گیا یہ ایکی لبسٹز کے چار ہزار قیدیوں کو غور و فکر کے لیے کافی مدت تھی کہ فرار ہونے کی سعی کرنا پاگل پن ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے — اور — ایک ویسے ہی دوسرے دھوپ والے دن — اسٹیپی پر پھر گولیوں کی گونج سنائی دی۔ کوئی بھاگ نکلا!!! یہ کسی وبا جیسی صورت حال تھی۔ پھر پہرے داروں کی گاڑی تیزی سے کیمپ میں آئی اور دو آدمیوں کو ہمراہ لائی (تیسرا دہیں مر گیا تھا)۔ ان دونوں — بٹانوف اور دوسرے چھوٹے سے کمسن نوجوان بگو، جو خون میں لت پت تھے، ہمارے قریب سے نئے حصے میں منتقل کیا گیا، جہاں انھیں مارا پیٹا جائے گا، برہنہ کیا جائے گا، ننگے فرش پر لڑھکایا جائے گا اور بھوکا پیاسا رکھا جائے گا۔ اے غلام! تیرے دل میں کیا جذبات ابھر رہے ہیں۔ انھیں دیکھ کر، جو ٹوٹ گئے لیکن خمیدہ نہیں ہوئے؟ یقیناً یہ کوئی معمولی اطمینان کی بات نہیں ہے کہ جو پکڑا گیا ہے وہ تو نہیں ہے جو مارے پیٹے گئے ہیں ان میں تو نہیں ہے، جو اذیتیں برداشت کر رہے ہیں ان میں تو شامل نہیں ہیں۔

"جلدی کرو — ہمیں بایاں حصہ جلد مکمل کرنا ہے"۔ ہمارا تو نذیں میکسیمنکو چلایا۔

اور ہم اپنے پتھر چنتے رہے۔ شام میں ہمیں وافر خوراک ملے گی۔

سیکنڈ کلاس کیپٹن برکوفسکی مصالحہ ڈھو رہا ہے وہ سوچتا ہے کہ جو کچھ بھی بن رہا ہے وہ مادر وطن کے مفاد میں ہے۔

شام کو ہمیں مطلع کیا گیا کہ بٹانوف نے بھی ایک لاری میں فرار ہونے کی سعی کی تھی اور اسے گولیاں چلا کر روک لیا گیا تھا۔

ارے غلامو! اب تک تم صریحی طور پر سمجھ گئے ہو گے کہ فرار ہونے کا مفہوم خودکشی ہے ایک کلو میٹر سے زیادہ دور بھاگنے میں کوئی کامیاب نہ ہوگا کہ تمہاری قسمت میں مزدوری کرتے کرتے مر جانا ہی لکھا ہے۔

ابھی پانچ دن بھی نہ بیتے تھے، گولیاں چلنے کی کوئی آواز سنائی نہ پڑتی تھی۔ لیکن جب اطلاع ملی تو ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان دھات کا بنا ہوا ہے اور کوئی اسے بہت بڑی آہنی سلاخ سے پیٹ رہا ہو۔

کوئی بھاگا! ایک بار پھر بھاگا! اور اس بار فرار ہونے کی کوشش کامیاب ہوئی۔

اتوار ستمبر، ار کو فرار کی کوشش اتنی صفائی کے ساتھ کی گئی کہ شام کے معائنے میں کوئی بکھیڑا نہیں کھڑا ہوا، جہاں تک جیل کے افسران دیکھ سکتے تھے، گنتی پوری تھی۔ ۱۸ ار کی صبح ان کے حسابات ٹھیک نہیں پائے گئے اور دوبارہ سب کی گنتی کرنے کے لیے کام پر جانے سے قبل قطاربندی کا عمل روک دیا گیا۔ وسطی میدان میں کئی معائنے کیے گئے، پھر جھونپڑیوں کا کئی بار معائنہ ہوا، پھر کام کے دستوں کے معائنے کیے گئے، پھر فائل کارڈوں سے حاضری لی گئی۔ وہ کتنے توقعات کے علاوہ کچھ بھی نہیں شمار کر سکتے تھے۔ ہر بار ان کے نتائج مختلف نکلتے تھے! انھیں اب تک یہ معلوم نہیں تھا کہ کتنے قیدی فرار ہوئے تھے، وہ کون کون تھے، کب فرار ہوئے اور پیدل گئے یا کسی سواری میں؟

اب تک دوشنبہ کی شام آ گئی تھی لیکن انھوں نے قیدیوں کو کھانا نہیں دیا (شمار کرنے میں معاونت کے لیے باورچیوں کو وسطی میدان میں بھیج دیا گیا تھا!) لیکن ہم نے کچھ برا نہیں مانا ہم تو بے حد مسرور رہتے ہر کامیاب فرار پر دوسرے قیدی خوش ہوتے تھے۔ بعد میں پہرے دار خواہ کتنی ہی سختی برتیں، نظم و نسق خواہ کتنا ہی سخت کر دیا جائے ہم قطعی برا نہ مانتے، ہم تو بے حد خوش ہوتے! تم سمجھتے کیا ہو کتو! ہم میں سے کچھ لوگ بھاگ گئے ہیں (ہم اپنے آقاؤں سے آنکھ ملا کر بات کرتے ہیں اور تمام وقت دل ہی دل میں سوچتے رہتے ہیں کہیں وہ گرفتار نہ ہو جائیں! کہیں وہ پکڑے نہ جائیں!)

اس سے بھی بڑی بات یہ ہوئی کہ وہ ہمیں کام پر نہیں لے گئے اور دوشنبہ کا دوسرا دن تعطیل کی طرح گزر گیا (یہ ایک عمدہ بات تھی کہ لڑکوں نے یہ کام سنیچر کی شام کو نہیں کیا! انھوں نے یہ ملحوظ رکھا کہ ہمارا اتوار نہ خراب ہوا!)

لیکن وہ تھے! آخر کون تھے وہ؟

دوشنبہ کی شام کو اطلاع ملی: جارجی ٹینو زداوک۔

ہم نے جیل کی دیواریں اور بلندکیں، دروازوں پر سیدھی محرابیں ہم پہلے ہی تعمیر کر چکے تھے۔ جھرکوں کی جگہیں اوپر بنا چکے تھے اور اب ہم بیم رکھنے کے لیے ساکٹ چھوڑ رہے تھے۔

ان کے فرار کو تین دن گزر گئے۔ سات، دس، پندرہ دن ہو گئے۔

اب بھی کوئی پتہ نہیں!

وہ فرار ہو چکے تھے!!

چوتھا باب

ہم اس صف میں کیوں شامل ہوئے؟

میرے قارئین میں کوئی مارکسی مورخ ہے۔ اپنی آرام دہ گدّے دار کرسی پر دراز ہو کر اس کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے ہمارے ڈسپلن بیرکوں کی تعمیر سے متعلق باب تک پہنچ کر اُس نے اپنا چشمہ اُتار لیا، کسی چپٹی چیز، شاید رولر سے صفحہ کو تھپتھپایا اور سر کو کئی بار اوپر سے نیچے کی طرف جنبش دی۔

"ہاں بے شک، اس جزو پر میں یقین کر سکتا ہوں لیکن انقلابی جوش و خروش کے بارے میں وہ سارا مواد، میں اس پر کبھی اعتبار نہیں کر سکتا۔ انقلاب کبھی نہیں آسکتا کیونکہ انقلاب تو تاریخی اصولوں کے مطابق ہی آتا ہے۔ تمہارے معاملے میں اتنا ہی ہوا تھا کہ چند ہزار "سیاسی افراد" زیرِ حراست لیے گئے ـــــ اور انہوں نے کیا کیا؟ انسانی وقار، سنجیدگی، خاندانی آزادی، کپڑے اور خوراک سے انہیں محروم کر دیا ـــــ اور تم نے کیا کیا؟ تم نے بغاوت کیوں نہیں کی؟"

"ہم اپنی خوراک حاصل کر رہے تھے ـــــ میں نے تمہیں بتایا ہے ـــــ ہم ایک جیل تعمیر کر رہے تھے۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ تمہیں بالکل یہی کرنا چاہیئے تھا۔ یہ عوامی مفاد کی بات تھی۔ یہی واحد مناسب عمل تھا۔ لیکن عزیزو! تم اپنے آپ کو انقلابی نہ کہو۔ انقلاب لانے کے لیے تمہیں ترقی پسند عناصر سے رابطہ قائم کرنا ہوگا۔"

"سچ ہے، لیکن کیا اس وقت تک ہم سب محنت کش نہیں تھے؟"

"فضول بات ہے۔ یہ تو محض خوش فہمی ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تاریخی جبر کا کیا مفہوم ہوتا ہے؟"

"میرا خیال ہے میں جانتا ہوں۔ میں دیانتداری کے ساتھ جانتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ جب لاکھوں افراد کے لیے چالیس سال سے کیمپ قائم ہوں ـــــ اس مقام پر ہم تاریخی جبر کے دیدار کر سکتے ہیں ـــــ اتنے لاکھ افراد، اتنے برسوں تک جیل میں مقید رکھے جائیں، اس کی تعریف اسٹالن کی مرضی یا بیریا کی دغابازی پر محمول کر کے یا حکمراں طبقے کی سہل اعتمادی کا نام لے کر نہیں ٹالی جا سکتی جس پر پیش قدمی کے اصولوں کی روشنی پڑنا کبھی بند نہیں ہوئی لیکن میں

تاریخی تقاضوں کی یہ مثال اپنے نظریے کے جواز میں پیش نہیں کرنا چاہتا ۔ وہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے کہے گا کہ موضوعِ گفتگو یہ نہ تھا کہ میں بنیادی مسئلے سے دُور جا رہا ہوں۔

وہ دیکھتا ہے کہ میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں، کہ میرے ذہن میں تاریخی تقاضوں کا تصور واضح نہیں ہے اور وہ سمجھاتا ہے :

"وہ لوگ انقلابی تھے جنہوں نے اُٹھ کر زار شاہی کو اپنی جھاڑو سے جھاڑ پھینکا۔ بالکل سیدھی سی بات ہے ۔ اگر زار نکی نے اپنے انقلابیوں کو اتنی سختی سے دبانے کی کوشش کی ہوتی، اگر اُس نے اُن پر ہنڈ سے ٹانک دینے کی ذرا سی سعی کی ہوتی ... اگر اُس نے ... ."

"تمہاری بات درست ہے" اُس نے کوشش نہیں کی اور اسی لیے اس کے زوال کے بعد کوشش کرنے والے زندہ بچ گئے ۔"

"لیکن وہ اس کی کوشش کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ہرگز نہیں کر سکتا تھا!"

شاید یہ بات بھی درست ہے ۔ ایسا نہیں کہ اُسے یہ عمل ناپسند تھا بلکہ وہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔

(اشتراکی کیا) روایتی تدریس کی تعریف کے مطابق روس کی مکمل تاریخ مظالم کا ایک سلسلہ ہے۔ تاتاری مظالم! ماسکو کے بادشاہوں کے مظالم۔ مشرقی ممالک کے طرز پر دیسی مظالم، غلامی کے تحت پختہ اور علی الاعلان جڑیں مضبوط کر کے بیٹھے ہوئے اقتصادی نظام کے مظالم (وطن کے اجلاسوں*، گاؤں پنچایتوں، آزاد قازقوں، شمال کے آزاد کسانوں کی بات بھول جایئے) خواہ خطرناک آئیوان ہو یا شریف النفس الکسیس ہو، سخت مزاج پیٹر ہو یا مخلص کیتھرین ہو، جنگِ کریمیا تک تمام زار صرف ایک بات جانتے تھے — کس طرح کچلا جائے۔ اپنی رعایا کو جھینگروں یا ٹڈیوں کی طرح کیسے مسل دیا جائے۔ اگر کسی شخص کو مشقت یا جلاوطنی کی سزا دی جاتی تھی تو وہ اس کے جسم پر "ایس۔ کے" کا نشان داغ دیتے تھے اور اُسے شکنجے سے باندھ دیتے تھے۔ حکومت اپنی رعایا سے سختی کے ساتھ پیش آتی تھی، وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر سختی کا برتاؤ کرتے تھے۔ غدر اور بغاوت ہمیشہ کچل دی جاتی تھی۔

صرف ..... صرف ... روندے گئے تھے۔ ہاں، لیکن اس لفظ کے ساتھ کچھ صنعتیں جوڑنے کی ضرورت ہے۔ انہیں ہمارے موجودہ تکنیکی مفہوم میں نہیں کچلا گیا تھا۔ نپولین کے ساتھ ہونے والی جنگ کے بعد جب ہماری افواج یورپ سے واپس آئیں تو روسی زندگی میں آزادی کا پہلا جھونکا آیا جو تھا تو ہلکا سا لیکن زار کو اس سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ مثال کے طور پر عام فوجی، جنہوں نے دسمبر کے غدر* میں حصہ لیا تھا، کیا ان میں سے کسی ایک کو بھی سُولی پر چڑھا دیا گیا؟ کیا کسی کو گولی سے اُڑایا گیا؟ اور کیا ہمارے عہد میں اُن میں سے کسی فرد کو بھی زندہ رہنے

کی اجازت دی جاتی؛ شیکن کو لارما ٹوٹ کو بغیر کسی پس و پیش کے دس دس سال کے لیے قید خانے میں ڈال دیا جاتا۔ اُن سے نمٹنے کے لیے پیچیدہ طریقے سوچنے پڑتے: "پیٹرسبرگ میں ۱۴ر دسمبر کو تم کہاں ہوتے؟" نکولس اوّل نے شپکن سے دریافت کیا۔ شپکن نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا: "سینٹ اسکوائر پر"* اور بطور سزا اُس سے کہا گیا کہ اپنے گھر جاؤ۔ جب کہ ہم سب لوگ جنہوں نے ایک منظم نظام عدل کے اعمال کو اپنی جلدوں پر جھیلا ہے اور بلاشبہ وکیل سرکار کے دفتر میں کام کرنے والے ہمارے تمام دوستوں کو شپکن کے جواب کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہے: دفعہ ۵۸ پیرا دو (مسلح بغاوت) یا نرم سے نرم سلوک — دفعہ ۱۹ — (مجرمانہ عزائم) اور اگر گولی مار دینے کی سزا نہ بھی ملتی تو بھی دس سال سے کم کی سزا کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہمارے پشکنوں پر وزنی سزائیں لادی جاتی تھیں، وہ کیمپوں میں رہتے تھے اور وہیں لقمۂ اجل بن گئے (گوملیئف کیمپ تک بھی نہیں پہنچ پایا، انہوں نے ایک تہہ خانے میں اس کے ساتھ حساب بیباق کر لیا)

جنگ کریمیا، روس کی جنگوں میں سب سے زیادہ مبارک تھی۔ اس نے کسانوں کو غلامی سے نجات دلائی اور الگزینڈر کی اصلاحات نافذ کی گئیں اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ سب سے بڑی سماجی قوت — رائے عامہ کا روس میں اسی جنگ کے ساتھ آغاز ہوا۔

اوپر سے سائبیریا والا کٹورگا بڑھتا رہا اور اس نے مزید وسعت اختیار کی: مزید سفری قید خانے بنائے گئے، قیدیوں کو اب بھی ریوڑوں کی شکل میں منتقل کیا جاتا تھا، عدالتیں ہمیشہ مصروف رہتی تھیں۔ لیکن یہ کیا ہے؟ عدالتیں مصروف کار تھیں لیکن ویرا زسولیچ کو، جس نے دارالسلطنت میں پولس کے افسرِ اعلیٰ پر گولی چلائی تھی (!)، بری کر دیا گیا؟

خود الگزینڈر دوم کو قتل کرنے کی کوششیں سات مرتبہ کی گئیں (کاراکوزوف کی —؛ سولوویف کی؛ الگزینڈروسک کے نزدیک؛ ایک مورسک کے باہر؛ خلتورین کا دھماکہ؛ ٹیمیرکا کی کان؛ گرلینیوتسکی) الگزینڈر دوم پیٹرسبرگ میں خوفزدہ نگاہوں سے (لیکن برسبیلِ تذکرہ کسی باڈی گارڈ کے بغیر) دیکھتا ہوا گھومتا تھا۔ (ٹالسٹائی کے قول کے مطابق "شکاری سے لرزاں جانور کی طرح"؛ زار سے ٹالسٹائی کی ملاقات ایک نجی مکان کے زینوں پر ہوئی تھی) اس نے کیا کیا؟ کیا نصف پیٹرسبرگ کو تباہ کر کے لوگوں کو جلاوطن کر دیا جیسا کہ کیروف کے قتل کے بعد ہوا تھا؟ ہمیں بخوبی علم ہے کہ ایسی کوئی بات اُس کے ذہن میں نہیں آسکتی تھی۔ کیا اُس نے اس قسم کے واقعات کے سدِباب کے لیے عوام کو دہشت زدہ کرنے کے طریقے اختیار کیے؟ عمومی دہشت، جیسا کہ ۱۹۱۸ء میں تھی؟ حراست میں رکھیں؟ اس وقت تو ایسے تصور کا وجود تک نہ تھا۔ مشتبہ افراد کو جیل میں ڈال دیا گیا؟ ایسا کرنا ممکن ہی نہ تھا . . . ہزاروں کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا؟ انہوں نے پھانسی دی . . . . پانچ افراد کو — اس پوری مدت میں تین سو سے بھی کچھ کم اشخاص کو سزا دی گئی تھی (اگر اسٹالن کو قتل کرنے کی ایسی صرف ایک — ہی

کوشش کی گئی ہوتی تو اس کی قیمت ہمیں کتنی لاکھ جانیں دے کر ادا کرنی ہوتی)؟

بولشویک اوینسکی رقمطراز ہے کہ ۱۸۹۱ء میں پوری کرسٹی جیل میں وہ واحد سیاسی قیدی تھا۔ اسکو تبادلہ ہو جانے پر ٹگانسکا جیل میں وہ تنہا ہی تھا صرف بورٹیکی میں جہاں سے جلا وطن کیا جانا تھا، تھوڑے سے قیدی یکجا تھے۔

ہر سال تعلیمی اور ادبی آزادی کے فروغ کے ساتھ رائے عامہ کی نادیدہ لیکن پُر جوش بے چینی بڑھتی گئی اور آخر کار لگام اور رکاب دونوں پر زاروں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور نکولس دوم صرف ساز کے ٹکڑے اور ڈوم کے بھروسے پر رہ گیا۔ یہ سچ ہے کہ نسلی روایات کی جامد زریں لہروں نے اُسے اس دور کے مطالبات کو سمجھنے سے باز رکھا اور کہ اس میں عملی جرارت کا فقدان تھا۔ طیاروں اور بجلی کے عہد میں بھی اس کے اندر سماجی شعور کا نام و نشان تک نہ تھا اور وہ روس کو اپنی جائز اور حقیقی املاک تصوّر کرتا تھا جس میں اس کا کام صرف اتنا ہی تھا کہ ٹیکس لگاتا رہے، اچھی نسل کے گھوڑے پیدا کرے اور سپاہ تیار کی جائے تاکہ ہوہنزولرن خاندان کے اپنے شاہی برادری کے لوگوں سے چھوٹی موٹی جنگیں کبھی کبھار لڑی جا سکیں لیکن نہ تو اس میں نہ ہی اس کی طرف سے حکمرانی کرنے والوں میں اپنی طاقت کو برقرار رکھنے کی صلاحیت باقی رہ گئی تھی وہ اپنے دشمنوں کو کچلتے نہیں تھے ان پر صرف ہلکا سا دباؤ ڈالتے تھے اور اُنہیں بخش دیتے تھے وہ ہمیشہ آگے کی جانب دیکھتے تھے اور اپنے کان کھلے رکھتے تھے رائے عامہ کیا خیال کرے گی؟ انہوں نے انقلابیوں کو صرف اتنا پریشان کیا کہ جیلوں میں اُن کے شناساؤں کا دائرہ وسیع ہو گیا، وہ مستقل مزاج ہو گئے اُن کے چہروں پر تمتماہٹ آگئی اب ہمارے پاس ان واقعات کا تقابلی موازنہ کرنے کا ایک سچا پیمانہ ہے ـــــ اور ہم بے خوف ہو کر کہہ سکتے ہیں کہ زار شاہی حکومت نے انقلابیوں پر مظالم نہیں ڈھائے بلکہ اُنہیں محبت کے ساتھ پروان چڑھایا اور اُن کے ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان پیدا کیا۔ زار شاہی حکومت کا تذبذب اور غیر مستقل مزاجی نیز خامیاں ان سب کو صاف نظر آتی ہیں جنہوں نے ایک مصنوعی عدلیہ نظام کے تجربے کیے ہیں۔

مثال کے طور پر آئیے۔ لینن کے کچھ کھلے ہوئے واقعات کا جائزہ لیں۔ ۱۸۸۷ء کے موسم بہار میں اس کے بھائی کو الگزینڈر سوم کے قتل کی کوشش کے جرم میں پھانسی دی گئی تھی کاراکوزوف کے بھائی کی طرح لینن بھی ایک ممکنہ شاہی قاتل کا بھائی تھا۔ اور اُس کے ساتھ کیا رویّہ اختیار کیا گیا؟ اُسی سال موسم بہار میں ولاڈیمیر اولیانوف کو کازان کی شاہی دانشگاہ میں داخلہ ملا اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ لا فیکلٹی میں داخلہ ملا ـــــ ہے نا مقام حیرت؟

یہ حقیقت ہے کہ ولاڈیمیر اولیانوف کو اُسی تعلیمی سال میں یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا لیکن یہ کارروائی حکومت کے خلاف طلبہ کے مظاہرے کو منظم کرنے کے جرم میں

کی گئی تھی۔ ایک ممکنہ شاہی قاتل کا چھوٹا بھائی طلبہ کو سرکشی کی ترغیب دے؟ ہمارے زمانے میں اس کی سزا کیا ہوتی؟ یقیناً اُسے گولی کا نشانہ بنا دیا جاتا! (اور بقیہ ساتھیوں میں سے کچھ کو پچیس سال کی اور کچھ کو دس سال کی سزا دی جاتی) جب کہ اُسے صرف دانشگاہ سے خارج کر دیا گیا! اتنا ظلم! ہاں لیکن اُسے جلاوطن بھی کر دیا گیا تھا..... سرلاں بھیج دیا گیا تھا؟ نہیں اُسے اُس کی جاگیر کوکشکنو میں منتقل کر دیا گیا تھا جہاں اُسے موسم گرما یوں بھی بسر کرنا تھا۔ اس طرح انہوں نے اُسے ایک تھپیڑا دیا، سردی سے جمے ہوئے شمالی خطے میں درخت کاٹنے کا؟ نہیں، سمارا میں قانون کی پریکٹس کرنے کا۔ جہاں وہ ساتھ ساتھ غیر قانونی سیاسی سرگرمیوں میں بھی مصروف رہا بعد ازاں اسے بیرونی طالب علم کی حیثیت سے پیٹرسبرگ یونیورسٹی سے امتحان میں شریک ہونے کی اجازت دی گئی۔ (اُس کی زندگی کے سابقہ واقعات کا علم ہونے کے باوجود اسپیشل سکشن نے کیا سوچ کر ایسا کیا ہوگا)؟

پھر چند سال بعد اسی نوجوان انقلابی کو دارالسلطنت میں "محنت کش طبقے کی نجات کے لیے جدوجہد کرنے والی تنظیم" قائم کرنے کے جرم میں زیرِ حراست لے لیا گیا، کسی معمولی الزام میں نہیں۔ اس نے بار بار مزدوروں کے سامنے حکومت کے خلاف جوشیلی تقریریں کیں اور سیاسی قطعات تحریر کیے۔ کیا اُسے ایذائیں دی گئیں، بھوکا رکھا گیا؟ نہیں، انہوں نے اس کے لیے دماغی کام کرنے کا ماحول فراہم کیا پیٹرسبرگ کی تجرباتی جیل میں، جہاں اُسے ایک برس تک مقید رکھا گیا اور اُسے جہاں وہ درجنوں کتابیں منگوانے کی اجازت دی گئی جن کی اُسے ضرورت تھی ــــ اُس نے "دی ڈیولپمنٹ آف کیپٹلزم اِن رشیا" (روس میں سرمایہ داری کا ارتقاء) کا بیشتر حصہ وہیں قلمبند کیا اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ قانونی طور پر، وکیل سرکار کے ذریعے اُس نے اپنے "اکنامک اسیز" (اقتصادی مضامین) مارکسی اخبار "نوئے سلوف" کو ارسال کیے۔ جیل میں مقیم رہ کر وہ ایک متعینہ غذا لیتا تھا، اپنے خرچ پر منگوائی ہوئی چیزیں کھا سکتا تھا، دودھ خرید سکتا تھا، ایک کیسٹ کی دوکان سے معدنی پانی خرید سکتا تھا اور ہفتے میں تین بار گھر سے بھیجا جانے والا سامان حاصل کر سکتا تھا (کرانسکی بھی پیٹر اور پال کے قلعے میں اپنے مستحکم انقلابی مقاصد کے ابتدائی مسودے کو تحریری شکل دے سکا تھا)

لیکن تب بلاشبہ اُسے اراکین پر مشتمل ایک عدالت نے سزا سنائی ہوگی اور اُسے گولی مار دی گئی ہوگی؟ نہیں، اُسے جیل تک میں نہیں رکھا گیا صرف شہر بدر کر دیا گیا۔ تو پھر یا تو تیا بھیج دیا گیا ہوگا عمر بھر کے لیے؟ نہیں ایک خوشحال علاقے مینوسنک میں منتقل کر دیا گیا صرف تین سال کے لیے ــــ کیا اُسے وہاں ہتھکڑیاں ڈال کر لے جایا گیا تھا؟ کسی قیدیوں کی گاڑی میں؟ قطعی نہیں! اس نے آزاد آدمی کی طرح سفر کیا بغیر کسی دخل اندازی کے تین دن تک پیٹرسبرگ میں گھومتا رہا، پھر اسی طرح ماسکو کی سیر کی۔ اسے خفیہ مراسلت

کے لیے ہدایات جاری کرنی تھیں، روابط استوار کرنے تھے، تاحال گرفتار نہ ہونے والے انقلابیوں کا اجلاس طلب کرنا تھا۔ اُسے اپنے خرچ پر غیر ملک کو جانے کی اجازت بھی عطا کی گئی یعنی آزاد مسافروں کے ساتھ سفر کرنے کی سہولت فراہم کی گئی۔ لینن کو سائبیریا کے راستے میں ایک بھی ریل گاڑی یا سفری جیل ایسی نہیں ملی تھی جس میں قیدی ہوں نہ ہی ایسی کوئی چیز وہاں سے پلٹتے ہوئے نظر آئی تھی۔ پھر کراسنویارسک میں، اور دو ماہ کتب خانے میں گزارنے کے دوران "دی ڈیولپمنٹ آف کیپٹل ازم" مکمل ہو گئی اور یہ تصنیف جو سیاسی جلاوطن کے قلم سے نکلی تھی، سنسر شپ جیسی کسی رکاوٹ کے بغیر شائع ہوئی (اس کا موازنہ ہمارے پیمانے سے کیجیے!) لیکن وہ اس دور افتادہ قصبے میں کیسے زندگی بسر کرے گا جہاں ظاہر ہے کہ اس کا کوئی ذریعۂ معاش نہ ہوگا؟ اُس نے حکومت سے وظیفہ طلب کیا اور اُسے ضرورت سے زیادہ وظیفہ ودیعت کیا گیا۔ لینن اپنی واحد جلاوطنی کی مدت میں جتنی آرام دہ زندگی بسر کرتا رہا اس سے بہتر صورتحال پیدا کرنا ممکن نہ تھا۔ صحت بخش غذا بہت کم قیمت پر ڈھیروں گوشت (ہفتے میں ایک بھیڑ) دودھ، سبزیاں؛ وہ حسب مرضی شکار کھیل سکتا تھا (جب وہ اپنے کتے سے بدظن ہوا تو اس کے دوستوں نے سنجیدگی کے ساتھ سوچا کہ پیٹر سبرگ سے ایک کتا اُس کے پاس روانہ کیا جائے؛ شکار کے دوران باہر جب اُسے مچھروں نے پریشان کیا تو اُس نے دستانے طلب کیے) اُس کے پیٹ کی شکایتیں اور جوانی کے دوسرے امراض دور ہو گئے اور بہت جلد اس کا وزن بڑھ گیا۔ اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں کی گئی، کوئی کام نہیں لیا گیا کوئی فرض نہیں سونپا گیا اور نہ ہی اُس کی عورتوں کو ہاتھ پاؤں ہلانے پڑتے تھے، کیونکہ ماہانہ ڈھائی روبل کی اُجرت پر ایک کسان لڑکی گھر کا سارا موٹا کام کر جاتی تھی۔ لینن کو پیسے کے لیے درخواست نہیں لکھنی پڑتی تھی اُس نے پیٹرسبرگ سے اُجرت پر ملنے والا کام لینے سے انکار کر دیا تھا اور صرف وہ چیزیں لکھتا تھا جن سے اُسے ادبی اہمیت حاصل ہو سکتی تھی۔

اُس نے اپنی جلاوطنی کی میعاد مکمل کی (وہ کسی دشواری کے بغیر فرار ہو سکتا تھا لیکن وہ اتنا دانشمند تھا کہ یہ حماقت نہ کرے) کیا اُس کی سزا میں از خود اضافہ کر دیا گیا؟ تا عمر جلاوطنی میں بدل دی گئی؟ یہ کس طرح ہو سکتا تھا ــــ یہ کارروائی غیر قانونی ہوتی ــــ اُسے اس شرط کے ساتھ پسیکوف میں قیام کی اجازت دی گئی کہ وہ دارالسلطنت سے دُور رہے وہ ریگا اور اسمولنسک گیا۔ اُس پر کوئی نگرانی نہیں تھی۔ پھر وہ اور اس کا رفیق کار (یا رفیق) ایک ٹوکری بھر کر ممنوعہ لٹریچر دارالسلطنت میں لے گئے، وہ زارکوئے سیلو ہوتے ہوئے گئے جہاں بطور خاص نظم و نسق میں سختی ہے (اُن کی چالاکی ادھوری ثابت ہوئی) پیٹرسبرگ میں اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس وقت ٹوکری اس کے قبضے میں نہ تھی لیکن اس کے پاس نظر نہ آنے والی روشنائی سے پلیخانوف کے نام لکھا ہوا ایک مراسلہ تھا

جس میں اسکرا* چھیڑنے کا پورا منصوبہ درج تھا لیکن اس کے باوجود حکومت زیادہ بکھیڑے میں نہیں پڑی اُسے حراست میں لے کر تین ہفتے تک حوالات میں رکھا گیا۔ خط اُن کے قبضے میں تھا لیکن کسی نے اُسے پڑھا بھی نہیں۔

پیسکوف سے اُس کی غیر قانونی عدم موجودگی کا انجام کیا رہا؟ بیس سال کی سزا، جو ہمارے دور میں طے شدہ ہے؟ نہیں، بس وہی تین ہفتوں کی حراست! جس کے بعد اُسے مکمل طور پر آزاد کر دیا گیا اور وہ تمام روس میں گھوم کر اسکرا کے لیے اجرائی مراکز قائم کرتا رہا اور پھر اس کی اشاعت کا بندوبست کرنے کے لیے بیرونی ممالک کو روانہ ہو گیا (بیرونی ملک کی سیاحت کے لیے اُسے پاسپورٹ دینے میں "پولس کی کوئی لائق اعتراض بات نہیں نظر آئی تھی!")

لیکن یہ تو معمولی سی بات تھی۔ ایک مہاجر کی حیثیت سے اس نے "گرینیٹ انسائیکلوپیڈیا" کے لیے مارکس سے متعلق ایک مقالہ رُوس روانہ کیا۔ اور یہ شائع ہو گیا* اور صرف یہی واحد مقالہ نہیں!

آخر کار روسی سرحد کے نزدیک "آسٹریائی پولینڈ کے ایک چھوٹے سے قصبے سے وہ تخریبی کارروائیوں کے منصوبے بناتا رہا لیکن کسی نے بھی اُسے اغوا کر کے زندہ واپس لے آنے کے لیے بدمعاشوں کو اس کے پیچھے نہیں لگایا۔ حالانکہ یہ سب سے آسان کام ہوتا۔

زارشاہی اپنے دشمنوں کا پیچھا کرنے میں ہمیشہ کمزور اور ناکام رہی۔ کسی بھی اہم سوشل جمہوریت پسند کی داستان میں یہی اسلوب نظر آئے گا (بطور خاص اسٹالن کی داستان ـــ ہرچند کہ یہاں دیگر متعلقہ اسباب اسے ہی قصوروار ثابت کر دیتے ہیں) اس طرح ۱۹۰۴ء میں ماسکو میں کامینیڈ کے کمرے کی تلاشی لی گئی اور "مشتبہ مراسلت" ضبط کی گئی۔ تفتیش کے دوران اس نے کچھ بھی بتانے سے انکار کر دیا اور بات وہیں ختم ہو گئی۔ اُسے شہر بدر کر دیا گیا "اپنے والدین کی جائے قیام میں منتقل کر دیا گیا!

یہ صحیح ہے کہ ایس۔ آر والوں پر شدید مظالم کیے گئے۔ لیکن کتنے شدید؟ کیا آپ کہیں گے کہ گرشنی نے (جو ۱۹۰۳ء میں حراست میں لیا گیا تھا) کوئی بھی سنجیدہ جرم نہیں کیا تھا؛ یا سیونکوف (جو ۱۹۰۶ء میں گرفتار ہوا تھا) نے؟ انہوں نے شہنشاہیت کے کچھ اہم ترین لوگوں کے قتل کا بندوبست کیا تھا پھر بھی اُنہیں پھانسی نہیں دی گئی بعد ازاں میریا اسپریڈونا کو فرار کا موقع دیا گیا اس نے جنرل لوزینوفسکی کو گولی ماردی جس نے تامبوف کی کسان بغاوت کو کچلا تھا۔ بالکل سامنے آ کر نزدیک سے گولی ماری پھر بھی انہوں نے ایک دہشت پسند کی جان نہیں لی اور اُسے بالجبر مشقت کے لیے بھیج دیا گیا* ذرا قیاس کیجیے کہ اگر کسی طالبہ نے ۱۹۲۱ء کے (تامبوف میں ہی ہونے والے) کسانوں کے غدر کو فرو کرنے والے شخص کو گولی ماردی ہوتی تو انتقامی سُرخ دہشت کی لہر میں کتنے ہزار ثانوی اسکولوں کے

طالب علم اور دانشور مقدمے کے بغیر گولیوں کا نشانہ بن جاتے؟

کیا سویبورگ کی بحری بغاوت کے سلسلے میں لوگوں کو گولیوں سے بھون دیا گیا؟ نہیں انہیں صرف جلا وطن کر دیا گیا۔

آئیوانوف روزمنک رقمطراز ہے کہ (۱۹۰۱ء میں پیٹرسبرگ کے عظیم الشان احتجاجی مظاہرے کے بعد) طلبہ کو کس قسم کی سزائیں دی گئیں۔ پیٹرسبرگ جیل کا منظر طالب علموں کی کسی پکنک کی مانند تھا۔ قہقہے، مل جل کر گانا، طلبہ کا کسی مزاحمت کے بغیر ایک دوسرے کی کوٹھڑیوں میں آنا جانا ـــ آئیوانوف رزومنک نے بے حیائی کے ساتھ مہتمم جیل سے یہ بھی کہا کہ وہ اُسے ماسکو کے فنکاروں کی سیاح کمپنی کے تماشے دیکھنے کی اجازت دے تاکہ اس کا ٹکٹ ضائع نہ ہو! بعد ازاں اُسے شہر بدری کی سزا ملی اور سمفروپول منتقل ہونے کا حکم دیا گیا جو اس کا اپنا انتخاب تھا اور وہ ایک سفری تھیلا لٹکا کر پا پیادہ سارے کریمیا کا سفر طے کرے گا۔

آریادنا ٹیرکووا نے اسی دور کے بارے میں لکھا ہے: "ہم اپنے نظریات پر برقرار رہے اور جیل کا نظم و نسق سخت نہیں تھا: مسلح پولس کے عہدیداران' بہترین ہوٹل 'ڈوڈون' کے لذائذ انہیں پیش کرتے رہے انتہائی سیماب صفت برشیف کے مطابق "پیٹرسبرگ کے قید خانے مغربی یوروپ کی جیلوں کے مقابلے میں بدرجہا انسانی تھے۔"

ماسکو کے محنت کشوں کو مسلح بغاوت (!) اور خود مختار حکومت کا تختہ پلٹنے کی ترغیب دینے کے جرم میں لیونڈ آندرئیف کو مکمل پندرہ دنوں تک حوالات میں رکھا گیا تھا۔۔ (اس کا ذاتی خیال تھا کہ یہ مدت بہت کم تھی اور اپنے نجی حساب میں اس نے تین ہفتوں کا خود اضافہ کر لیا تھا) اُس کی اس زمانے کی ڈائری کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں؛ "قیدِ تنہائی! - کوئی پروا نہیں۔ یہ اتنی بُری نہیں ہے۔ میں اپنا بستر لگاتا ہوں، اپنا اسٹول اور لیمپ کھینچ لیتا ہوں، کچھ سگریٹیں اور ایک ناشپاتی قریب رکھ لیتا ہوں ۔۔۔۔ میں پڑھتا ہوں' ناشپاتی کھاتا ہوں ۔۔۔۔ بعینہٖ گھر کی طرح ـــ میں مسرت کا احساس کرتا ہوں ۔۔۔۔ ہاں خوش ـــ "جناب، معاف کیجیے' جناب"! وارڈر اُسے کھانا دینے کی کھڑکی سے مخاطب کرتا ہے۔ کئی کتابیں آ چکی ہیں اور پاس کی کوٹھڑیوں سے نوٹس موصول ہو گئے ہیں۔

گفتگو کو اختتام تک پہنچاتے ہوئے آندرئیف نے تسلیم کیا ہے کہ جہاں تک قیام و غذا کا تعلق ہے وہ اپنی طالب علمانہ زندگی کے مقابلے میں جیل میں زیادہ آرام سے تھا۔

اسی زمانے میں گورکی، ٹروبیٹسکوئی قلعے میں 'چلڈرن آف دی سن' (پسرانِ آفتاب) لکھ رہا تھا۔

بولشویک طبقۂ اشراف نے گریٹ انسائیکلوپیڈیا کی اکتالیسویں جلد کی صورت میں خود اشتہاری ایک بے شرمی سے لبریز تصنیف شائع کی "سوویٹ یونین اور انقلابِ اکتوبر

کے اہم افراد ــــ سوانح اور کردار"۔ ان میں سے کسی کا بھی مطالعہ کریجیے، آپ یہ دیکھ کر حیران وششدر رہ جائیں گے کہ ہمارے پیمانے کے مطابق وہ اپنے انقلابی کارناموں کی سزا کے ضمن میں کتنے سستے چھوٹ گئے اور خاص طور پر جیلوں میں کتنے موافق حالات میں قیام کرتے تھے مثال کے طور پر کراسن کو لیجیے: "وہ ٹگانکا جیل میں حراست کے ایام کو بڑے مزے لے لے کر یاد کرتا تھا۔ ابتدائی تحقیقات کے بعد فوجی پولس نے سکون سے رہنے کا موقع دیا" (کیوں؟) اور اُس نے "اپنے جبراً ملنے والے فاضل اوقات کو مسلسل محنت میں صرف کیا اُس نے جرمن زبان سیکھی، شلر اور گوئٹے کی تقریباً سبھی تصانیف اصل زبان میں پڑھیں۔ شوپنہار اور کانٹ سے متعارف ہوا۔ مِل کا فلسفہ اور ہونٹ کی نفسیات کا از اوّل تا آخر بخوبی مطالعہ کیا" وغیرہ۔ اپنی شہر بدری کے لیے کراسن نے سائبیریا کی راجدھانی اور اُس سے بہترین شہر اور کوٹسک کا انتخاب کیا۔

راڈیک ۱۹۰۶ء میں وارسا جیل میں مقیم تھا۔ وہ نصف سال حراست میں رہا جسے "اُس نے رُوسی زبان کی تعلیم نیز لینن، پلیخانوف اور مارکس کی تصانیف کے مطالعے میں شاندار طور پر صرف کیا۔ جیل کے دورانِ قیام اُس نے (ٹریڈ یونین یا مزدوروں کی تنظیم کی تحریک پر) اپنا پہلا مضمون قلمبند کیا . . . اور جب (قید خانے میں) اُسے کوٹسکی کے جریدے کا وہ شمارہ ملا جس میں اس کا مضمون شامل تھا تو اس نے انتہائی فخر کا احساس کیا۔

دوسری سمت سیاشکوکی" جیل (ماسکو ۱۸۹۵ء) غیر معمولی طور پر سخت تھی"؛ تین ماہ بعد اُسے تین سال کے لیے شہر بدر کر دیا گیا . . . . . اپنی جائے پیدائش پیلٹیس میں!

"ہولناک روسی جیل" کا نقشہ مغربی ممالک میں پاروس جیسے جیل خانے میں بے حوصلہ ہو جانے والے لوگوں نے پیش کیا۔ پاروس نے زار شاہی سے اپنا انتقام لینے کے لیے بہت سی خود ساختہ مبالغہ آمیز جذباتی یادداشتیں رقم کیں۔ اسی انداز کا مشاہدہ چھوٹے افراد کے تجربات میں، ہزاروں اشخاص کی داستانِ حیات میں کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت میرے پاس ایک انسائیکلوپیڈیا ہے جو براہِ راست اور سیاق وسباق سے مطابقت رکھنے والی معلوم نہیں ہوتی کیونکہ ادبی انسائیکلوپیڈیا ہے پھر یہ قدیم (۱۹۳۲ء کا) ایڈیشن ہے جو خامیوں سے پُر ہے۔ کوئی ان خامیوں کو درست کر دے، اس سے پیشتر ہی میں آنکھیں بند کر کے "کے" سے اقتباسات پیش کرتا ہوں:

کارپیکو۔ کیری۔ پیلیزا ویگراڈ میں شہری پولس کا سکریٹری (!) تھا اور انقلابیوں کے لیے پاسپورٹ فراہم کرتا تھا (ہم اپنی زبان میں کہیں گے: پاسپورٹ محکمے کا افسر جو روپوش تنظیموں کو پاسپورٹ مہیا کرتا تھا!) کیا اس جرم میں اسے سولی دے دی گئی؟ نہیں، پانچ برس کے لیے شہر بدر کر دیا گیا ـــ اس کے اپنے فارم پر! بالفاظ دیگر اُس کے دیہی

مکان پر منتقل کر دیا گیا۔ وہ مصنف بن گیا۔

کریلوف وی۔ ٹی۔ بحر اسود کے بحری فوجیوں کی انقلابی تحریک میں شریک رہا۔ کیا گولی کا نشانہ بن گیا؟ کیا اُسے تا عمر قید با مشقت کی سزا دی گئی؟ نہیں۔ تین سال کے لیے شہر بدر کر دیا گیا۔ اوسٹ سلوسک میں۔ مصنف ہو گیا۔

کساٹکن، آئی۔ ایم۔ جیل کے دوران قیام میں افسانے تخلیق کیے جو رسائل میں شائع ہوئے (ہمارے دور میں سابق قیدیوں کی تخلیقات بھی شائع نہیں ہو سکتیں)

کاپون سیرگئی ــــ شہر بدری کی دور (!) میعادیں پوری کرنے کے بعد شاہی الگزینڈرنسکی تھیٹر اور صفورین تھیٹر کا سربراہ متعین کر دیا گیا (ہمارے عہد میں اُسے دارالسلطنت میں قیام کی اجازت تک نہ دی جاتی اور اجازت ملتی بھی تو شعبۂ خصوصی اُسے پراپٹر ڈرامے کے مکالمے حفظ کرانے والا ہرگز نہ بننے دیتا)

کریز نیوفسکی شہر بدری سے اُس وقت پلٹ آیا جب اسٹولی پن کی سرگرمیاں[1] اپنے عروج پر تھیں اور (روپوش بولشویک مرکزی کمیٹی کا رکن رہتے ہوئے) اُس نے کسی دخل اندازی کے بغیر انجینئری کا پیشہ اختیار کیا (ہمارے عصر میں اُسے مشین ٹریکٹر اسٹیشن میں معمولی مکینک کی ملازمت ملنا بھی خوش قسمتی کی بات تصور کی جاتی)

ہر چند کہ کرائیلنکو کا نام ادبی انسائیکلوپیڈیا میں درج نہیں ہے لیکن "کے" والوں میں اس کے نام کی شمولیت بھی نہایت مناسب ہوگی۔ اپنی انقلابی گرم دماغی کے زمانے میں وہ تین بار کامیابی کے ساتھ زیر حراست آنے سے بچ گیا[2] اور چھ مرتبہ گرفتار ہوا لیکن اُس نے کل ملا کر جیل میں چودہ مہینے ہی صرف کیے۔ ۱۹۰۷ء میں (یہ بھی ردِ عمل کا دور تھا) اُس پر فوجیوں کو بغاوت کے لیے ورغلانے اور ایک فوجی تنظیم میں حصہ لینے کا الزام عائد کیا گیا ــــ اور وہ ضلعی فوجی عدالت سے بری کر دیا گیا (!) ۱۹۱۵ء میں فوجی خدمت سے بچنے کے لیے "(وہ افسر تھا اور جنگ چل رہی تھی) مستقبل کے اس سپہ سالار اعظم (اور اس عہدے پر فائز پہلے سپہ سالار کے قاتل) کو سزا دی گئی۔۔۔۔ اُسے ایک اگلے مورچے پر (بطور سزا نہیں) یونٹ میں بھیج دیا گیا (اس طریقے سے زار کی حکومت بغاوت کی آگ فرو کرنے اور ساتھ ہی ساتھ جرمنوں کو شکست دینے) کی بات سوچتی تھی اور پندرہ برس تک اُسی کے پروکیوریٹر کے اختیارات بدستور قائم رکھتے ہوئے متعدد مقدمات میں سزا یافتہ لوگوں کی قطاریں سر کے عقبی حصے میں گولی کھانے کے لیے عدالتوں میں چکر لگاتی پھرتی تھیں۔

پھر اسٹولی پن ردعمل کے ایام میں کیمسی کے گورنر اسٹاروسیلسکی کو، جس نے انقلابیوں کو پاسپورٹ اور اسلحہ بے دریغ مہیا کیے تھے اور پولس نیز سپاہ کے سرکاری راز افشا کیے تھے، محض دو ہفتوں کی سزا دی گئی تھی۔[3]

اگر آپ کافی قوت متخیلہ کے حامل ہیں تو اسے اپنی زبان میں بیان فرمائیں۔ اسی انتقامی

دور میں، بوشویک فلسفیانہ اور سیاسی جریدے 'رلس' کی اشاعت قانونی طور پر باقاعدگی کے ساتھ ہوتی تھی اور ری ایکشنری 'ویچی' قدیم خود مختاریت اور بے لگام عناصر نیز غلامی کے بارے میں علی الاعلان لکھا کرتا تھا۔ بہت اچھا۔ لکھتے رہو ہمیں اس کی ذرّہ برابر بھی پروا نہیں ہے۔

اس دور کی سختی انسانی حدود سے باہر تھی۔ یالٹا کے ایک مصوّر نے ایک اسکیچ تیار کیا تھا جس میں اوچاکوف ملاّحوں کو گولی مارنے کا منظر پیش کیا گیا تھا اور یہ اسکیچ اس نے اپنی دوکان کے شوکیس میں نمائش کے لیے لگا دیا گیا تھا (تقریباً اُسی طرح جیسے آج کل کسی نے کوزنیٹکی موسٹ پر کسی شوکیس میں نوفوچیرکسک* میں روا رکھی جانے والی تعزیری کارروائی کے چند مناظر پیش کر دیے ہوں) اور یالٹا کی پولس کے سربراہ نے کیا کیا؟ کیونکہ لیویڈیا* اتنا قریب تھا اس لیے اُس نے سخت بیرحمانہ سلوک کیا۔ اس نے یینوفسکی پر کوڑا لگانا شروع کیا۔ اور پھر کیا اُسے غارت کر دیا گیا؟ یینوفسکی کا اسٹوڈیو — نہیں — نہیں — گولی مارنے کا اسکیچ نہیں ... بلکہ اسکیچ کی ایک نقل (کچھ لوگ اس کی وضاحت کرتے ہوئے اسے یینوفسکی کے ہاتھ کی صفائی قرار دیتے ہیں لیکن یہ نہ بھولیے کہ گورنر نے اپنے سامنے شوکیس کو توڑنے کا حکم نہیں دیا تھا) تیسرے یہ کہ خود یینوفسکی پر بھاری جُرمانہ کیا گیا تھا: جب تک وہ یالٹا میں قیام کرے اُسے شارعِ عام پر نہیں دکھائی دینا چاہیئے' اس وقت جب شاہی خاندان وہاں سے گزر رہا ہو!

برٹسیف نے ایک مہاجر جریدے میں زار کی ذاتی زندگی پر بھی کیچڑ اچھالی (جب ۱۹۱۴ء میں حب الوطنی کی طغیانی کے دور میں) وہ مادرِ وطن کو پلٹا — تو کیا اُسے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا؟ اُسے ایک سال سے بھی کم مدّت کے لیے قید رکھا گیا جہاں اُسے کتابیں طلب کرنے اور تخلیقی کام کرنے کی اجازت دی گئی۔

لکڑہارے کا ہاتھ کسی نے نہیں پکڑا۔ اور آخرش درخت گر جائے گا۔

جب ٹخاچیفسکی کا زوال ہوا، جیسا کہ کہا جاتا ہے نہ صرف اُس کا کنبہ تتر بتر کر دیا گیا اور اُسے قید کر لیا گیا (کہنے کی حاجت نہیں کہ اُس کی دختر کو تنظیم سے خارج کر دیا گیا) بلکہ اُس کے دو بھائیوں اور اُن کی بیویوں' اُس کی چار بہنوں اور اُن کے شوہروں' سب کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کے بھانجے' بھانجیوں' بھتیجے بھتیجیوں کو یتیم خانوں میں بکھیر دیا گیا اور اُن کے سرنیم (خاندانی نام) تبدیل کر کے ٹوماییوویچ' روسٹوف وغیرہ رکھ دیے گئے' اُس کی اہلیہ کو قازقستان کے ایک کیمپ میں گولی مار دی گئی' اس کی ماں سڑکوں پر بھیک مانگتے ہوئے مر گئی۔[۵] اس قسم کی داستانیں سیکڑوں اہم سزا یافتگان کے رشتہ داروں کے بارے میں بتائی جا سکتی ہیں۔ یہ اصلی مظالم ہیں!

• (اگر آپ ان کارناموں کو مظالم ہی کا نام دیں تو) زار شاہی عہد میں ظلم کی سب سے

نہیں کرنی پڑی۔
اہم صفت غالباً یہ تھی کہ انقلابیوں کے اقربا کو کبھی کسی قسم کی تکلیف برداشت نہیں کرنی پڑی۔
نتالیہ سیدووا (ٹراٹسکی کی اہلیہ) ۱۹۰۷ء میں کسی دخل اندازی کے بغیر روس پلٹ آئی جب کہ ٹراٹسکی سزایافتہ مجرم تھا۔ ادلیانوف خاندان کا کوئی رُکن (اگرچہ ان میں سے تقریباً ہر ایک کسی نہ کسی وقت گرفتار ہوا تھا) کسی بھی وقت غیر ممالک جانے کی اجازت بآسانی حاصل کر سکتا تھا۔ جب لینن کا نام مسلح بغاوت کے لیے چلائی جانے والی مہمات کے سلسلے میں "مطلوبہ" اشخاص کی فہرست میں تھا اس وقت اُس کی بہن انّا قانوناً اور باضابطہ طور پر پیرس میں واقع لیونس بینک کے ذریعے اُس کے کھاتے میں رقومات بھیجا کرتی تھی۔ لینن کی ماں اور کروپسکایا کی ماں دونوں جب تک بقید حیات رہیں، انہیں اپنے مرحوم شوہروں کے معاوضے کی سرکاری پنشن ملتی رہی ایک کا شوہر اعلیٰ غیر فوجی افسر تھا اور دوسری کا فوجی عہدے دار ـــ اور ان کی زندگیاں تلخ کرنے کی بابت سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔
یہ تھے وہ حالات جن میں ٹالسٹائی تسلیم کرنے لگا تھا کہ صرف اخلاقی تزکیۂ نفس کی ضرورت ہے، سیاسی آزادی کی نہیں۔
اگر سیاسی آزادی پہلے ہی حاصل ہے تو یقیناً کسی کو اُس کی ضرورت نہیں۔ ہم اُس کی اس بات سے اتفاق کر سکتے ہیں کہ آخرش سیاسی آزادی ہی سب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی نہ ہی کوئی مثالی نظامِ حکومت کا قیام اس کا مطمحِ نظر ہے بلاشبہ اہم چیز ہے معاشرے کی اخلاقی اصلاح۔ لیکن یہ تو دور از کار مقصد ہے، نقطۂ آغاز میں اس کی صورت کیا ہے؟
ان ایام میں یاسنایا پولیانا اربابِ فکر کے لیے ایک کشادہ قلب تھا لیکن اگر اُسے اس طرح بند کر دیا گیا ہوتا جیسے اخاٹونا کا فلیٹ چہار سمت سے گھیر لیا گیا تھا اور تمام موجود افراد سے اپنے پاسپورٹ دکھلانے کا تقاضا کیا گیا تھا، اگر ٹالسٹائی پر اتنا دباؤ ڈالا گیا ہوتا جتنا کہ اسٹالن کے عہد میں ہم سب پر ڈالا گیا، جب تین آدمی کسی جگہ یکجا ہونے سے ڈرتے تھے، تو اُس نے بھی سیاسی آزادی کا مطالبہ کیا ہوتا۔
اسٹولی پن دہشت کے ہولناک ترین لمحات میں، آزاد خیال اخبار "رُوس" کو پہلے صفحے پر شاہ سرخیوں میں یہ خبر چھاپنے کا حکم ملا ـــ "پانچ کو پھانسی"! "خیرسن میں بیس افراد کو سولی!" ٹالسٹائی یہ خبریں پڑھ کر گریہ کناں ہوا اور بولا کہ اب مجھے زندہ رہنے کی خواہش نہیں رہی کہ اس سے زیادہ ہولناک واقعات کا تصوّر کرنا بھی ناممکن ہے [۱۱]۔
پھر ہالٹوئے میں مذکورہ بالا فہرست ہے: چھ ماہ میں ۹۵۰ کو پھانسی [۱۲] آئیے "ہالٹوئے کے اس شمارے پر غور و فکر کریں۔ ملحوظ رہے کہ اسٹولی پن کے "فوجی انصاف" کے بعد کی آٹھ ماہ کی مدت (اگست ۱۹۰۶ء ـــ اپریل ۱۹۰۷ء) کے دوران ہی یہ جریدہ شائع ہوا تھا اور مواد روسی خبر رساں تنظیموں کی شائع کردہ مطبوعات سے اخذ کیا گیا تھا۔ تقریباً اُس طرح جیسے فرض کیجیے ۱۹۳۷ء میں ماسکو کے اخبارات گولی سے اُڑائے

جانے والوں کی فہرست شائع کرتے اور اس میں سے مواد اخذ کر کے ترتیب وار چھاپ دیا جاتا اور این۔ کے۔ وی۔ ڈی (سوویٹ خفیہ پولس) اس سے چشم پوشی کر لیتی۔

دوسرے یہ کہ فوجی عدلیہ کے، جس کی پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی، یہ آٹھ ماہ پھر زارشاہی روس میں کبھی نہیں آئے اور اس کی مدت اس وجہ سے بڑھائی نہیں جا سکی کہ نامرد "اوڈ" جی حضوری "مجلس شوریٰ" نے ایسے اقدام کی تائید کرنے سے انکار کر دیا تھا (دراصل استولی پن کو اس تجویز کو مجلس شوریٰ کے روبرو پیش کرنے کی ہمت ہی نہیں پڑی)

تیسری بات یہ کہ "فوجی قانون" کا جواز ثابت کرنے کے لیے پیش کردہ سابقہ چھ ماہ کے واقعات کا جو ذکر کیا گیا اس میں یہ واقعات شامل تھے۔ سیاسی سطح نظر کے تحت لاتعداد پولس افسران کا قتل، "عہدیداران پر متعدد حملے" اور اوچیکرسکی جزیرے کا آتشگیر دھاکہ اس کی موافقت میں کہا گیا کہ اگر حکومت ان دہشت پسندانہ اقدامات کو نہ روکتی تو اس کے قائم رہنے کا حق ختم ہو جاتا۔ اس لیے استولی پن کی مجلس وزارت نے۔ جو جیوری عدالتوں اور ان کے سست بے نتیجہ عمل سے، اُن کی طاقتور اور ناقابل تسخیر تنظیم وکلا سے (جو ہماری علاقائی عدالتوں یا ضلعی ٹربیونلوں سے قطعی مماثلت نہ رکھتی تھیں — یہ تو ٹیلیفون پر حاصل کردہ احکامات کی تعمیل کرتی ہیں) نا مطمئن اور ناراض تھی، انقلابیوں (اور مرتجا ڈاکوؤں کو بھی، جو مسافر گاڑیوں کی کھڑکیوں پر گولیاں چلاتے تھے اور دس پانچ روبلوں کی خاطر معمولی مسافروں کی بھی جان لے لیتے تھے) مختصر فوجی عدالتوں کے وسیلے سے دبانے کے موقع کا فائدہ اٹھایا (اس کے باوجود اس کے ضابطے تھے: فوجی عدالت وہیں قائم کی جا سکتی تھی جہاں فوجی قانون [مارشل لار] یا ایمرجنسی کا نفاذ کیا گیا ہو: یہ عدالتیں اُسی وقت سرگرم عمل ہو سکتی تھیں جب جرم کی شہادت تازہ ہو، جب واقع کو رونما ہوئے چوبیس گھنٹوں سے زائد عرصہ نہ گزرا ہو اور جب ظاہراً کوئی جرم واقع ہوا ہو)

اگر اس عہد کے عوام اس صورتحال سے حیران و پریشان ہوئے تو اس کا سبب یہ تھا کہ یہ چیز روس کے مزاج سے ہم آہنگ نہ تھی۔

۱۹۰۶ — ۱۹۰۷ کی صورتحال میں ہم دیکھتے ہیں کہ "استولی پن" دہشت کی تخلیق میں حکومت کے دوش بدوش انقلابیوں کا ہاتھ بھی تھا۔ انقلابی دہشت کی پیدائش کے سو سال بعد، ہم بے تکلف کہہ سکتے ہیں کہ دہشت پسندانہ خیالات اور دہشت پسند اقدامات انقلابیوں کی ایک نفرت آمیز غلطی تھے اور روس کے لیے تباہ کن ثابت ہوئے جس سے اُسے انتشار، تکلیف اور غیر معمولی جانی نقصانات کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔

آئیے، باغیلوئے کے اُسی شمارے کے چند مزید اوراق پلٹیں۔ سب سے پہلے اعلانات میں سے، جن کا سلسلہ ۱۸۶۲ء سے شروع ہوا، اور جن کو نقطۂ آغاز کہا جا سکتا ہے ایک اعلان یہ ہے:

"ہم چاہتے کیا ہیں؟ روس کی نجات اور خوش حالی! ایک نئی اور خوشگوار زندگی کی

ابتدا مو ایثار کے بغیر ممکن نہیں ہے کیونکہ دیر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم فی الفور اصلاح کے خواہش مند ہیں"

کیسا غلط راستہ تھا! اُن انتہائی جوشیلے لوگوں میں صبر کی گنجائش نہیں تھی چنانچہ انہوں نے انسانی قربانی (اپنی نہیں؛ دوسروں کی) کو جائز قرار دیا تاکہ عوام الناس کے لیے خوشحالی کو قریب لایا جا سکے! انہیں انتظار کرنے کی عادت نہیں تھی اس لیے ہم اُن کے پڑ پوتے اس مقام پر نہیں ہیں جہاں وہ تھے (جب کسانوں کو آزاد کیا گیا تھا) بلکہ اُن سے بہت کچھ پیچھے ہیں!

ہمیں تسلیم کرنا ہو گا کہ دہشت پسند لوگ اسٹولی پن کی فوجی عدالتوں کے برابر کے شریک تھے۔

اسٹولی پن دور اور عہد اسٹالن کا تقابل اس اعتبار سے ناممکن ہو جاتا ہے کہ ہمارے عہد میں تمام بربریت کا رُخ ایک ہی سمت تھا: آہ بھرنے پر یا اس سے بھی کمتر کسی جُرم پر گردنیں تراش دی جاتی تھیں ؂

"اس سے زیادہ ہولناک صورتحال کوئی اور نہیں ہو سکتی" تالسٹائی نے کہا تھا لیکن اس سے زیادہ ہولناک باتوں کا تصور کرنا بے حد آسان ہے۔ اس وقت کی صورت حال زیادہ بھیانک ہے جب شولی وقتاً فوقتاً کسی ایسے شہر میں ہی نہیں دی جاتی تھی جسے ہر شخص جانتا ہو بلکہ سب مقامات پر اور تمام اوقات میں دی جاتی ہے اور بیک وقت بیس کو نہیں دو سو کو دی جاتی ہے اور اخبار ان کی بابت چھوٹی یا بڑی کسی بھی قسم کی سرخیوں میں ایک لفظ بھی شائع نہیں کرتے بلکہ اس کے بدلے کہتے ہیں" زندگی پہلے سے خوشگوار ہو گئی ہے، زندگی پہلے سے پُر لطف ہو گئی ہے"

وہ تمہارے منہ پر مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مُنہ ہمیشہ سے بدصورت رہا ہے نہیں حالانکہ یکساں نہیں تھے، قطعاً یکساں نہیں تھے ہرچند کہ روسی حکومت اس وقت بھی یورپ کی ظالم ترین حکومت تصور کی جاتی تھی۔

اس صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں کمپریشن کے ارتقاء کے بارے میں انسانی علم میں خاصی وسعت پیدا ہوئی ہے۔ جس زمین کی خاک، جو سرزمین ہمارے آباؤ اجداد کو پائیدار اور ٹھوس محسوس ہوتی تھی وہ اب سائنسدانوں کے مطابق سوراخ دار غربال کی مانند ہے سو میٹر خلاء میں ایک دھبّہ ہے۔ یہ ہے ایٹم کی ہیئت۔ انہوں نے اس بھیانک امکان کا انکشاف کیا ہے جسے " ایٹمی پیکنگ " کہا جاتا ہے اس میں تمام ایٹمی دھبّوں کو سو میٹر خلاؤں سے علیحدہ کر کے یکجا کر دیا جائے گا۔ اس قسم کے پیکنگ کے ایک انگشتانے بھر کا وزن ایک عام انجن کے مساوی ہو گا لیکن یہ پیکنگ بھی بہت کچھ ڈھیلی ڈھالی ہو گی۔ پروٹون ذرات کو اتنی سختی کے ساتھ منجمد نہیں ہونے دیتا جتنی سختی سے آپ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ صرف نیوٹرونوں کو منجمد کر سکیں اس قسم کے " نیوٹرون پیکنگ " سے

بنے ہوئے ڈاک ٹکٹ کا وزن پچاس لاکھ ٹن ہوگا!

اور انہوں نے ہمیں پیش رو سائنسدانوں سے کوئی مدد حاصل کیے بغیر اتنی ہی سختی کے ساتھ دبایا تھا!

اسٹالن کے ہونٹوں کے وسیلے سے ہمارے وطن کو مستقبل میں انکسار سے دستبردار ہونے کا حکم ملا لیکن انکسار کے لیے مستعمل لفظ کے معنی ڈیل* نے یہ بیان کیے ہیں" رحمدلی، باطن کی ایک شفقت آمیز کیفیت، کشادہ قلبی، عوامی مفاد کا لحاظ" ہمیں اس جذبے سے دستبردار ہونے کا مشورہ دیا گیا اور عجلت میں ہم نے اُس سے علیحدگی اختیار کرلی ــــ مفادِ عامہ کی تشویش سے نجات حاصل کرلی۔ آئندہ کے لیے اپنے کھانے کی رکابی ہی ہمارے لیے کافی تھی!

اس صدی کی ابتدا تک روسی رائے عامہ ایک عجیب وغریب قوت رہی ہے جس نے آزادی کا ماحول بنا رکھا تھا۔ زارشاہی کی شکست ٹوکیو کی ہار سے نہیں ہوئی نہ ہی اس وقت ہوئی جب انقلاب فروری کا طوفان آیا تھا بلکہ اس سے بہت پہلے زارشاہی کی شکست ہوچکی تھی! یہ اُسی وقت ہمیشہ کے لیے ہار گئی تھی جب روسی ادب میں یہ روایت استوار ہوئی کہ جو شخص کسی فوجی پولس یا پولس کا ذکر رتی بھر ہمدردی کے ساتھ بھی کرتا ہے وہ روڑی (غدار) ہے اور رجعت پسند ٹھیرا ہے اس طرح آپ پولس تنظیم سے مصافحہ نہیں کرتے، اس سے تعلقات نہیں بڑھاتے، اُسے سڑک پر دیکھ کر سرِتسلیم خم نہیں کرتے بلکہ اُس کے لمس سے اپنے آپ کو ناپاک محسوس کرنے لگتے ہیں۔

ادھر ہمارے قصاب ہیں جو ــــ چونکہ اب وہ بیکار ہیں اور چونکہ ان کے پاس واجب صلاحیت ہے ــــ ادب اور تہذیب کے ٹھیکیدار ہیں۔ وہ ہمیں انہیں ہیرو کی طرح مقدس سمجھنے پر مجبور کرتے ہیں اور یہ عمل نامعلوم وجوہ کی بنا پر حب الوطنی سمجھا جاتا ہے۔

رائے عامہ! میں نہیں جانتا کہ سوشیالوجی کے ماہرین اس کی کیا تعریف کرتے ہیں لیکن مجھے یہ بات قرینِ عقل نظر آتی ہے کہ ذاتی نظریات کے، جو آزادانہ ظاہر کیے جائیں اور حکومت یا پارٹی کے دباؤ سے آزاد ہوں، عمل کو ہی رائے عامہ کا نام دیا جاسکتا ہے۔

جب تک ہمارے ملک میں رائے عامہ پر پابندی ہے اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ کسی معقول وجہ کے بغیر لاکھوں کروڑوں لوگوں کی تباہی نہیں ہوگی کہ یہ تباہی کسی بھی رات، شاید آج ہی رات سے شروع نہ ہوجائے گی۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں پیش گام (ون گارڈ) اصول، اس وبا سے ہمیں محفوظ نہیں رکھ سکے۔

لیکن میں دیکھتا ہوں کہ فریقِ مخالف منہ بنا رہا ہے، مجھے دیکھ کر آنکھیں بھینچتا ہے اور

سر کو جنبش دیتا ہے۔ اوّل تو شاید دشمن میری بات چپُ چپ کر سن لے۔ اور پھر میں اس موضوع پر اتنی تفصیل میں کیوں جا تا ہوں؟ یہ سوال زیادہ اجمال کے ساتھ پیش کیا گیا تھا، سوال یہ نہیں تھا کہ ہمیں حراست میں کیوں لیا گیا؟ نہ یہ کہ جو آزاد بچ گئے انہوں نے اس لاقانونیت کے خلاف آواز کیوں نہیں بلند کی؟ سب پر روشن ہے کہ انہیں صحیح طور پر معلوم ہی نہ تھا کہ ہو کیا رہا ہے، انہوں نے بس اعتماد (پارٹی پر اعتماد) کر لیا تھا کہ اگر پورے کے پورے فرقوں کو چوبیس گھنٹے کے اندر شہر بدر کیا جا رہا ہے تو وہ فرقے یقیناً خطاوار ہوں گے۔ سوال کچھ اور ہی ہے: کیا سبب ہے کہ ہم لوگوں نے، جو کیمپوں میں تھے، جہاں ہمیں احساس تھا کہ کیا ہو رہا ہے: بھوک کی صعوبت سہی، ہم نے سر خم کیے، توہین برداشت کی لیکن پلٹ کر مدافعت نہیں کی؟ دیگر لوگوں کو، جنہوں نے کبھی سنتریوں کی نگرانی میں مارچ نہیں کیا، جو اپنے دست و پا کا آزادانہ استعمال کر سکتے تھے، جنگ آزمانہ ہونے کے لیے معذور سمجھا جا سکتا ہے: وہ بہر طور اپنے خاندانوں کا، اپنے منصبوں کا، اپنی تنخواہوں کا، اپنی تصانیف کی رائلٹی کا ایثار نہیں کر سکتے تھے وہ ناقدانہ خیالات کا اظہار کر کے اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر رہے ہیں وہ جب یہ کہہ کر ہماری مذمت کرتے ہیں کہ ہم نبرد آزما ہونے کی بجائے اپنے راشن سے چپکے رہے حالانکہ ہمارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں رہ گئی تھی جسے چھینا جا سکتا۔

لیکن میں اس سوال کا ہمیشہ جواب دیتا رہا ہوں۔ ہم نے کیمپوں میں یہ تمام آزار سہے اس کی وجہ یہ تھی کہ باہر کوئی رائے عامہ نہیں تھی۔

ایک قیدی کے پاس اس حکومت کی مخالفت کرنے کے کون کون سے وسیلے ہو سکتے ہیں جس کا وہ اسیر ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ اظہار اختلافات
۲۔ بھوک ہڑتال
۳۔ فرار
۴۔ بغاوت یا سرکشی

اس طرح یہ امر سب پر روشن ہے جیسا کہ عظیم مرحوم کا قول تھا (اور اگر ایسا نہ بھی ہو تو ہم یہ قول اس سے جبراً منسوب کر دیں گے کہ اگر اولیں دو باتوں میں کوئی دم ہے (اور اگر جیلران سے متاثر ہوتے ہیں) تو صرف اس وجہ سے کہ رائے عامہ کا وجود رہے! اس کی عدم موجودگی میں ہم خواہ کتنا ہی شدید اظہارِ اختلاف کریں یا بھوک ہڑتال کریں، وہ ہمارے مُنہ پر ہمارا مذاق اڑائیں گے۔

اپنے مطالبات تسلیم کرانے کا یہ بڑا ڈرامائی طریقہ ہے ــــ جیل کے عہدیداران کے روبرو ایستادہ ہو کر اپنا جامہ چاک کر لینا جیسا کہ وزیرز فسکی نے کیا تھا، لیکن صرف اس جگہ جہاں رائے عامہ موجود ہو۔ اس کی عدم موجودگی میں آپ کا مُنہ چھٹے ہوئے کپڑوں سے

باندھ دیا جائے گا اور ایک سرکاری جلسے کی قیمت آپ کو مزید ادا کرنی ہوگی۔

وہ مشہور واقعہ یاد کیجیے جو گذشتہ صدی کے اواخر میں کارا کی مشقتی جیل میں رونما ہوا تھا۔ سیاسی قیدیوں کو مطلع کیا گیا کہ مستقبل میں انہیں جسمانی سزا دی جا سکے گی۔ پہلے نادیزدا سگیڈا کو زدوکوب کرنا طے کیا گیا تھا (اس نے کمانڈنٹ کو استعفار دینے کے لیے مجبور کرنے کی غرض سے اُس کے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا!) اس نے زہر کھا لیا اور بید سے پٹنے کی جگہ آغوشِ اجل میں چلی گئی بعدازاں تین اور عورتوں نے بھی زہر کھا لیا ـــ اور وہ بھی مر گئیں۔ مردوں کی بیرکوں میں چودہ قیدیوں نے خودکشی کی کوششیں کیں حالانکہ یہ سب کامیاب نہ ہو سکیں۔ نتیجے کے طور پر جسمانی سزا کا فرمان فوراً منسوخ کر دیا گیا۔ قیدیوں کو یقین تھا کہ جیل کے عہدیداران خائف ہو جائیں گے اس کا سبب یہ تھا کہ کارا کے المناک واقعات کی خبر روس اور ساری دنیا تک پھیلنے والی تھی۔

لیکن اگر ہم اس معاملے کو اپنے حالات کے مقابل رکھ کر تجزیہ کریں گے تو اشکِ ندامت بہانے پر مجبور ہوں گے۔ کمانڈنٹ کے منہ پر طمانچہ؟ کسی دوسرے کو لگنے والی ضرب پر؟ اگر پیٹھ پر دو ایک ہاتھ پڑ بھی گئے تو کیا مضائقہ ہے؟ آپ کی زندگی تو محفوظ رہے گی! اور دوسری عورتوں نے بھی کیوں زہر کھا لیا؟ پھر دیگر چودہ مرد قیدیوں نے ایسا کیوں کیا؟ ہمیں چیزوں کا بہتر سے بہتر استعمال کرنا چاہیئے۔ جب تک آپ کو دوا نہ دستیاب ہو اس وقت تک زندگی سے ہاتھ کیوں دھوئے جائیں؟ علاوہ ازیں یہ ممکن ہے، عام رہائی کا حکم آجائے، ہو سکتا ہے وہ ہمیں اچھے اخلاق کے مظاہرے پہ سہولتیں دینے لگیں۔

دیکھیے کہ جیل کا طریقِ کار کتنے بلند معیار سے نیچے آ گیا ہے اور ہم کس قدر پستی میں اُتر چکے ہیں اور اسی اعتبار سے ہمارے جیلر دنیا میں سربلند ہو گئے ہیں! نہیں! یہ کارا کے جوکر نہیں ہیں! اگر ہم میں بھی جرات ہوتی اور اپنی بے بضاعتی کو فراموش کر کے ہم نے اس کا مظاہرہ کیا ہوتا ـــ ہم میں چار خواتین اور چودہ مرد تھے ـــ تو ہمیں زہر دستیاب ہونے سے پہلے ہی گولیاں مار دی جاتیں (اور سوویٹ جیل میں زہر ملتا بھی کہاں ہے)؟ بالفرض آپ کسی طرح زہر کھا بھی لیتیں تو اس طرح عہدیداران کا کام آسان ہی کریں گے اور بقیہ افراد کو آپ کی مذمت نہ کرنے پر ڈنڈے لگائے جائیں گے کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس واقعے کی کوئی بھی خبر سرحدی تاروں سے باہر نہیں نکل سکے گی۔

بنیادی نکتہ یہ ہے اور یہی اُن کی مرکزی طاقت ہے۔ کوئی خبر باہر نہیں نکل سکتی۔ اگر کوئی دبی دبائی افواہ پھوٹ نکلے، جس کی اخبارات سے تصدیق نہیں ہو سکتی، مخبر اس پر قابو پانے میں مصروفِ کار ہوں گے اور وہ اتنی دور تک نہ جا پائے گی کہ اس کا کوئی اثر مرتب ہو سکے۔ عوامی غضبناکی کا کوئی سیلاب نہیں آئے گا۔ اس لیے خوفزدہ ہونے کی کیا بات ہے؟

ان حالات میں وہ ہمارے احتجاج کی پرواکیوں کریں؟ اگر تم نے زہر کھانے پر آمادہ ہو تو شوق کے ساتھ کھاؤ۔

تو پھر فرار ہو جائیں؟ زارِ شاہی زندانوں سے فرار کے کچھ اہم واقعات کی تفصیل تاریخ نے ہمارے لیے محفوظ کر رکھی ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ وہ تمام واقعات باہر سوچے اور مرتب کیے گئے پلان کے مطابق رونما ہوئے تھے ـــــ دیگر انقلابیوں کے ذریعے مفرورین کی پارٹی کے آزاد اراکین کے ذریعے ـــــ اور ان میں ضمنی امداد بہت سے ہمدردوں نے فراہم کی تھی، خود فرار کے عمل میں بھی اور بعد ازاں مفرور کو روپوش رکھنے میں بھی ـــــ اور انہیں سرحد پار کرانے میں بہت سے لوگوں کا ہاتھ تھا۔ (آہا ـــــ میرے مارکسی مورخ نے یہاں میری گرفت کرلی ہے: "اس کا سبب یہ تھا کہ عوام انقلابیوں کے ساتھ تھے اور وہی مستقبل کے مالک بننے والے تھے۔" "ممکن ہے یہ وجہ بھی ہو" میں ملائمت کے ساتھ جواب دیتا ہوں" کیونکہ یہ ایک پرلطف کھیل تھا اور رقانونی تھا؟) اپنا رومال کھڑکی سے لہرانا، مفرورین کو اپنی خوابگاہ میں پناہ دینا، اُسے بھیس بدلنے میں مدد دینا؟ یہ لائقِ تعزیر جرائم نہ تھے۔ جب پیوٹرلا فروف اپنی جلا وطنی کے مقام سے فرار ہوا تو وہ لوگدا (خومنسکی) کے گورنر نے اس کی قانونی اہلیہ کو اس کے ساتھ جا کر قیام کرنے کی اجازت تفویض کی تھی۔ جعلی پاسپورٹ تیار کرنے پر بھی آپ کو صرف شہر بدر کر کے آپ ہی کے فارم میں منتقل کر دیا جاتا تھا جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ لوگ خوفزدہ نہیں تھے۔ کیا آپ اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ جب میں اس کے بارے میں غور کرتا ہوں، تو کیا سبب ہے کہ آپ کبھی جیل کے اندر نہیں رہے؟ "بھئی تم جانتے ہو کہ یہ سب تقدیر پر منحصر تھا...")

لیکن دوسرے قسم کی شہادت بھی موجود ہے۔ ہم سب کو اسکول میں گورکی کی تصنیف "ماں" پڑھائی گئی تھی؛ اور آپ میں سے کچھ کو نیزنی نوفگورود جیل کی انتظامات کی تفصیلات کا علم ہوگا؛ وارڈروں کے پاس زنگ خوردہ پستولیں تھیں جن سے وہ دیواروں میں کیلیں ٹھونکا کرتے تھے اور جیل کی دیواروں سے سیڑھی لگا کر وہاں سے فرار ہو جانا بہت آسان عمل تھا۔ اعلیٰ افسر پولیس اٹائیٹ نے لکھا ہے: "شہر بدری محض کاغذ پر ہوتی تھی، جیل کا تو کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اس زمانے میں جیلوں کی حالت ایسی تھی کہ جو انقلابی جیل پہنچ جائے وہ اپنی سابقہ سرگرمیوں کو بغیر خلل اندازی کے جاری رکھ سکتا تھا..... کیف کی انقلابی تنظیم ساری کی ساری ایک جگہ جمع تھی اور وہاں رہتے ہوئے وہ شہر میں ہڑتال کی سربراہی کرتی تھی اور اپیلیں جاری کرتی تھی۔"[۵۱]

اس وقت عہد زار کے کشورگا کے مرکزی مقام پر حفاظتی انتظامات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے ذرائع میرے پاس نہیں ہیں لیکن اگر وہاں سے فرار ہونا آسنا ہی

دشوار تھا جتنا کہ سوویٹ جیل سے، جس میں کامیابی کا موقع ایک لاکھ میں ایک ہوتا تھا، تو میں نے یہ بات کبھی سنی نہیں۔ ظاہر ہے کہ قیدیوں کو فرار ہونے کے لیے زیادہ خطرہ مول نہیں لینا پڑتا تھا؛ انہیں سخت محنت کی بھاری تکان کی وجہ سے قبل از وقت مرجانے کا خطرہ درپیش نہ ہوتا تھا، نہ سزا کے نامناسب طور پر بڑھائے جانے کا خدشہ ہوتا تھا: اپنی سزا کی نصف آخر مدت وہ جیل کی بجائے اپنی جلا وطنی کے مقامات پر گزارتے تھے اور وہ عام طور پر اس وقت تک اپنے فرار کی اسکیم کو ملتوی رکھتے تھے۔

عہدِ زار کے جلا وطنی کے مقامات سے فرار نہ ہونے کا واحد سبب کاہلی ہی نظر آتا تھا۔ شہادتوں سے ثابت ہے کہ جلا وطن پولس میں حاضری دینے بہت کم آتے تھے، نگرانی بہت معمولی تھی، سڑکوں کے کنارے خفیہ پولس کی چوکیاں قائم کی نہیں کی گئی تھیں۔ آپ دن رات کام کرتے ہوئے پولس کی نگاہ میں نہیں ہوتے تھے۔ آپ کو روپیہ رکھنے کی اجازت تھی (آپ کو روپیہ ارسال کیا جاسکتا تھا) اور جلا وطنوں کی قیام گاہیں دریاؤں نیز شاہراہوں سے زیادہ دُور نہ ہوتی تھیں۔ پھر مفروروں کی معاونت کرنے والوں کو کسی قسم کا خطرہ لاحق نہیں ہوتا تھا نہ ہی اس بات کا خدشہ ہوتا تھا کہ بھاگنے والوں کا تعاقب کرنے والے انہیں گولی مار دیں گے یا انہیں بے رحمی کے ساتھ زد وکوب کریں گے یا اُسے پچیس سال کی قید با مشقت کی سزا ملے گی جیسا کہ ہمارے زمانے میں رائج تھا۔ عام طور پر مفرور قیدی کے پکڑے جانے پر اُسے اپنی سابقہ جیل میں بھیج دیا جاتا تھا کہ اپنی سزا کی باقیماندہ میعاد مکمل کرے۔ اور بس صرف اتنا ہی ہوتا تھا۔ آپ کو ضرر نہیں پہنچتا تھا۔ ناسٹینکو کی غیر ملک کو روانگی (حصّہ اوّل، باب پنجم) ایسے کارناموں کی روشن مثال ہے۔ لیکن شاید لاقانونیت پسند اے۔ پی۔ اولانوفسکی کا ترخان علاقے سے فرار روشن تر مثال ہے۔ اپنے فرار کے دوران اتنا کافی تھا کہ وہ طلبہ کے کسی دارالمطالعہ میں پہنچ جائے اور سخائیلوفسکی کی تصنیف "وہاٹ از پروگریس" (ترقی کیا ہے؟) طلب کرے اور طلبہ اُسے غذا، بستر اور کرایہ مہیا کرتے تھے۔ وہ سیدھے سادے انداز میں ایک غیر ملکی جہاز کی سیڑھیاں چڑھ کر دوسرے ملک کو فرار ہو گیا۔ وہاں سوویٹ خفیہ پولس (ایم۔ وی۔ ڈی) کا کوئی دستہ تھا ہی نہیں! اور اس نے کوئلہ گھر میں ایک گرم جگہ تلاش کر لی۔ ایک مزید حیران کن بات، ۱۹۱۴ء کی جنگ میں وہ اپنی مرضی سے روس پلٹ آیا اور ترخان میں اپنی جلا وطنی کی قیام گاہ تک جا پہنچا۔ بآسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ غیر ملکی جاسوس تھا! اسے گولی مار دو! ادھر آ حقیر کیڑے! اور بتا کہ تو کس کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے لیکن نہیں، غیر ممالک میں بسر کردہ اُس کی تین سالہ غیر حاضری کے لیے مجسٹریٹ نے اُسے تین روبل کا جرمانہ اور عدم ادائیگی کی صورت میں ایک دن کی سزائے قید دی تھی۔ تین روبل ایک بڑی رقم تھی اور اولانوفسکی نے ایک دن قید میں رہنا پسند کیا!

سولونسکی سے کسی معمولی چھوٹی کشتی میں سوار ہوکر یا ہولڈ (سامان لادنے کی جگہ) میں عمارتی لکڑی کے درمیان بیٹھ کر بحری راستے سے فرار کی کوششوں سے لے کر گذشتہ عہد اشالن میں کیمپوں سے مجنونانہ، یاسیت آمیز، خودکشی کے مترادف فرار کی کوششوں تک (بعد کے چند ابواب میں انکا تذکرہ آئے گا) ہمارے دور میں بھاگ نکلنا ہمیشہ عظیم انسانوں کے کارنامے جیسی مہم سمجھا گیا ہے لیکن وہ بدقسمت عظیم لوگ تھے۔ ایسی جرأت ایسی فہم وفراست، ایسی قوتِ ارادی کا استعمال دورِ انقلاب سے قبل فرار کی کسی کوشش میں نہیں کیا گیا — پھر بھی وہ فرار میں کامیاب ہوجاتے تھے اور ہمارے زمانے کے بھاگنے والے شاذونادر ہی کامیاب ہوئے۔

"اس لیے کہ تمہاری فرار کی کوششوں کی حیثیت سرتاسر رجعت پسندانہ تھی! ...." کیا انسان کو غلام اور حیوان بننے سے روکنے کی کوشش کبھی رجعت پسندانہ ہو سکتی ہے؟

اُن کی ناکامی کا سبب یہ تھا کہ ایسی کوششوں کے بعد پیش آنے والے حالات میں کامیابی عوام کے رویے پر منحصر ہوتی ہے اور ہمارے عوام انعام کی ہوس میں یا نظریاتی اختلافات کی بنا پر مفروروں کی معاونت کرنے سے ڈرتے تھے اور انکی سراغ رسانی کر دیتے تھے۔

"یہاں تک تو رائے عامہ کے بارے میں ہوا .... !"

جہاں تک ان جیلوں میں ہونے والے ہنگاموں کا تعلق ہے جن میں تین، پانچ یا آٹھ ہزار آدمی ہوں — ہمارے تین انقلابات کی تاریخ میں اُن کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

پھر بھی ہم نے جیلوں میں ہنگامے بپا کیے تھے۔

لیکن وہی عتاب وہاں بھی نازل ہوا تھا اور بڑی کاوشوں کے، بلند پایہ قربانیوں کے نتائج اسی وجہ سے معمولی تھے۔

کیوں کہ معاشرہ تیار نہیں تھا کیونکہ رائے عامہ کی حمایت کے بغیر کسی بڑے کیمپ کے غدر کو سر اُٹھانے کی گنجائش نہیں نکلتی۔

اس لیے اگر ہم سے استفسار کیا جاتا ہے: تم نے اسے کیوں برداشت کیا؟ تو اسکا جواب دینے کا وقت آگیا ہے: "ہم نے برداشت نہیں کیا!" آگے پڑھیے اور دیکھیے کہ ہم نے اسے ذرا بھی برداشت نہیں کیا۔

خصوصی کیمپوں میں ہم نے سیاسی تبدیلیوں کا پرچم بلند کیا اور ہم سیاسی ہی بن گئے۔

پانچواں باب

شعر در گور، صداقت تہہ سنگ

اپنی کیمپ کی زندگی کی ابتدا میں، میں معمولی کام سے محفوظ رہنے کے لیے بے حد فکر مند تھا لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ اس سے کس طرح بچا جائے، جب اپنی گرفتاری کے سال ششم میں ایکی بسٹز پہنچا اس وقت تک میں پوری طرح تبدیل ہو چکا تھا اور میں نے فوراً اپنی طبیعت کو پیش بندیوں، سازشوں اور منافقتوں سے پاک کرنا شروع کر دیا جن کے باعث انسان کے پاس گہری فکر اور اخذِ نتائج کے لیے وقت نہیں بچتا۔ اس طرح جب تک میں نمبردار نہ بن جاؤں جیسا کہ تعلیم یافتہ لوگوں کو عام طور پر بننا پڑتا ہے۔ اس وقت تک عام مزدور کی پر مشقت زندگی کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کر لینے کی بجائے میں نے کنڑرگاہ میں فوراً کوئی ہنر سیکھنے کا تہیہ کر لیا۔ جب ہم (اولیگ آئیوانوف اور میں) بوردنیک کی ٹولی میں شریک ہوئے۔ اس وقت ایک مناسب کام (اینٹ بنانے کا) ہمارے ہاتھ آ گیا۔ بعد ازاں میری قسمت دوسری طرف پلٹ گئی اور میں نے کچھ مدت دھات پگھلانے والے کا (اسمیلٹر) کام بھی کیا۔

اوّل اوّل میں متفکر اور غیر مستقل مزاج رہا۔ کیا میں اس کام کو جاری رکھ سکوں گا؟ ہم لوگ بیڈھنگے مزاج کے آدمی تھے اور ہمارے لیے اتنا ہی کام اپنے گروہ کے لوگوں سے زیادہ تھا لیکن جس دن میں نے شعوری طور پر اپنے آپ کو نیچے اتر جانے دیا اور اپنے پیروں تلے — ٹھوس جگہ، سخت پتھریلی زمین، جو سب کے لیے یکساں تھی، محسوس کی، وہ میری زندگی کے اہم ترین برسوں کا آغاز تھا۔ ان برسوں نے میرے کردار کی تکمیل کی اور اسے روشن بنایا۔ اس کے بعد میں نے اپنی زندگی میں کوئی انتشار محسوس نہیں کیا اور اس وقت تک حاصل کردہ خیالات اور عادات پر تا حال کاربند ہوں۔

مجھے پرسکون اور بے لوث طبیعت کی ضرورت تھی کیونکہ میں گزشتہ دو سال سے ایک نظم لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بڑا تسلی بخش کام تھا کیوں کہ اس نے مجھے یہ سکھایا کہ میں اپنے جسم کے ساتھ روا رکھے جانے والے عمل پر توجہ نہ دوں۔ بعض اوقات مزدوروں کی غضبناک ٹولی میں جس کے چہار سمت مشین گن لیے ہوئے پہرے دار غرایا کرتے تھے، خطوط اور نقطے اتنی تیزی سے ہجوم بنا کر آ جاتے تھے کہ میں اپنے آپ کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کرتا تھا اور جائے کار تک پہنچنے کے لیے عجلت میں اچھلتا کودتا اپنے دستے سے آگے نکل جاتا تھا اور کسی کونے میں لکھنے کی جگہ تلاش کر لیتا۔ ایسے لمحات میں، میں آزاد بھی ہوتا تھا اور مسرور بھی۔

لیکن کسی اسپیشل کیمپ میں، میں لکھ کیسے سکتا تھا۔ کارلینکو ہمیں بتاتا ہے کہ اس نے دوران اسیری لکھنے کا کام کیا تھا لیکن اس کے حالات کتنے مختلف تھے۔ وہ پنسل سے لکھتا تھا (وہ اس کے کپڑوں کی

سلائی کے درمیان تلاشی کیوں نہیں لیتے تھے اور اس کے کاغذات کیوں ضبط نہیں کرتے تھے) جبے وہ اپنے گھنگھریالے بالوں کے درمیان رکھا کرتا تھا (اس کے بال تراش کیوں نہیں دیے گئے) اپنے سارے جسم پر کھتا تھا (اسے شکرگزار ہونا چاہیے کہ وہاں بیٹھنے اور ٹانگیں پھیلانے کے لیے جگہ تھی!) سچ پوچھیے تو اسے اتنی سہولیات حاصل تھیں کہ اگر وہ چاہتا تو مسودات اپنے پاس رکھ سکتا تھا یا انھیں باہر بھیج سکتا تھا (اور اس بات کو سمجھنا ہمارے ہم عصر دوستوں کے لیے سب سے زیادہ مشکل ہے)!

اس طرح تو آپ آج کل کیمپوں میں کبھی نہیں لکھ سکتے! مستقبل کے کسی ناول کے لیے نام محفوظ رکھنا بھی خطرناک تھا اسے کسی تنظیم کے اراکین کی فہرست سمجھا جا سکتا تھا (میں تو کسی اسم رجال یا اسم صفت کی شکل میں بنیادی نقطہ نوٹ کر لیتا تھا) محض حافظہ ہی محفوظ مقام تھا جہاں آپ اپنی تحریر کا مواد چھپا سکتے تھے اور تمام جامہ تلاشیوں کے دوران نیز سنتریوں کے پہرے میں کی جانے والی سیاقوں میں اپنے ہمراہ رکھ سکتے تھے۔ ابتدائی ایام میں مجھے اپنی یادداشت پر قطعی اعتماد نہ تھا اس لیے میں نے نظمیں لکھنے کا آغاز کیا۔ بلاشبہ یہ اس فن کی توہین ہے لیکن بعد میں مجھے علم ہوا کہ نثر کو بھی اطمینان بخش طریقے سے ذہن کی زیریں سطح تک منتقل کیا جا سکتا ہے۔ قیدی کی قوتِ حافظہ پر حقیر اور فضول معلومات کا بار نہ ہو تو اس کی یادداشت حیرتناک حد تک قوی اور لامحدود ہو جاتی ہے۔ ہم حافظے پر بہت کم بھروسہ کرتے ہیں۔

لیکن آپ جس چیز کو یاد رکھنا چاہیں اسے پہلے قلم بند کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور کاغذ پر اس کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ کیمپ میں آپ پنسل اور سادہ کاغذ رکھ سکتے ہیں لیکن کوئی تحریری چیز نہیں رکھی جا سکتی (البتہ اگر اسٹالن سے متعلق کوئی نظم ہو تو دوسری بات ہے[۲]۔ اور اگر آپ شعبۂ علاج میں نمبردار کا منصب نہ حاصل کر لیں یا شعبۂ تعلیم و ثقافت میں مزے نہ اڑا سکیں تو آپ کو صبح و شام گارڈ ہاؤس پر تلاشی دینے جانا پڑے گا۔ میں نے ایک نشست میں بارہ سے بیس مصرعوں تک ٹکڑے لکھنے ان کی تصحیح کرنے انھیں ازبر کرنے اور پھر انھیں نذرِ آتش کر دینے کا ارادہ کیا، میں نے اپنا مستقل اصول قرار دیا کہ محض کاغذ کو ہاتھ میں لینے کے بعد ہی مطمئن نہیں ہونا چاہیے۔

جیلوں میں شعروں کی تخلیق اور پھر انھیں جلا دینے کا عمل اپنے ذہن میں ہی کرنا پڑتا تھا۔ پھر میں نے دیا سلائیوں کے چھوٹے ٹکڑے کر کے اپنے سگریٹ کیس پر دو قطاروں (جن میں سے ہر ایک میں دس ٹکڑے ہوتے تھے، ایک اکائی کے لیے دوسرا دہائی کے لیے) میں آراستہ کرنا شروع کیا۔ مصرعوں کو دہراتے ہوئے میں ہر سطر کے لیے اکائیوں والی صف سے دیا سلائی کا ایک ٹکڑا ہٹا دیتا تھا اور جب دس اکائیاں نکال چکتا تو ایک دہائی الگ کر لیتا تھا۔ یہ کام بھی بڑی احتیاط کے ساتھ کرنا پڑتا تھا۔ دیا سلائیوں کا ایسا معصومانہ تماشا جس میں ہونٹ بھی جنبش کر رہے ہیں یا چہرے پر غیر معمولی جذبات کا پرتو ہو، مخبروں کے شبہات بیدار کر سکتا تھا۔ میں ایسا ظاہر کرنے کی کوشش کرتا جیسے بے توجہی میں دیا سلائیوں کو ادھر ادھر کر رہا ہوں۔ ہر پچاسویں اور سوویں سطر کو میں خصوصی توجہ کے ساتھ حفظ کرتا تھا تاکہ حساب رکھنے میں آسانی ہو۔ مہینے میں ایک بار میں ان تمام چیزوں کا آموختہ کیا کرتا تھا اگر سوویں یا پچاسویں سطر کی جگہ کوئی غلط سطر آجاتی تو میں تمام سطروں کو اس وقت تک دہراتا رہتا تھا جب تک کہ فراموش کردہ سطر یاد نہ آجاتی۔

کچھ مخصوص سفری جیلوں میں، میں نے (لتھوانیہ کے) کیتھولکوں کو جیل میں اپنے استعمال کے لیے تسبیحیں تیار کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ڈبل روٹی نم کر کے اسے مسل لیتے اس سے دانے بناتے۔ پھر انھیں رنگ لیتے تھے (جلے ہوئے سیاہ ربڑ سے، سفید منجن سے، سرخ جراثیم کش مرہم سے) کئی دھاگوں کی ڈوری بٹ کر اس پر اچھی طرح صابن چپڑ لیتے اور دانے اس میں پرو کر خشک ہونے کے لیے کھڑکی پر پھیلا دیتے تھے۔ میں ان میں شامل ہو گیا اور ظاہر کیا کہ میں بھی تسبیح کے ذریعے عبادت کرنا چاہتا ہوں لیکن میرے عقیدے کے مطابق ایک تسبیح میں سو دانے ہونے چاہئیں (بعد ازاں جب میں نے محسوس کیا کہ بیس دانے کافی ہوں گے اور زیادہ سہولت بخش بھی، تو میں نے اپنے لیے کارک کے دانے تیار کر لیے) کہ ہر دسواں دانہ مکعبی ہونا چاہیے گول نہیں اور پچاسویں نیز سوویں ایسی شکل کے ہوں کہ محض لمس سے شناخت کیے جا سکیں لتھوانیا والے میرے مذہبی جوش پر حیران رہ گئے (ان میں انتہائی عبادت گزار شخص کے پاس بھی چالیس سے زائد منکوں کی تسبیح نہیں تھی) لیکن انھوں نے پرخلوص اور مشفقانہ انداز میں مجھے مطلوبہ تسبیح تیار کرنے میں مدد دی اور سوواں دانہ گہرے سرخ دل جیسا بنایا گیا، آئندہ میں نے کبھی ان کا یہ انوکھا تحفہ اپنے سے جدا نہیں کیا، میں اپنے بڑے اور چوڑے دستانوں کے اندر انگلیوں سے تسبیح پھیرتا رہتا تھا۔ کام کے لیے قطار بناتے وقت، کام پر جاتے ہوئے اور پلٹتے ہوئے، تمام انتظار یہ لمحات میں، میں کھڑے کھڑے یہ عمل جاری رکھتا اور جامد کر دینے والی سردی اس کے مانع نہ تھی۔ میں جامہ تلاشی کے وقت اس تسبیح کو اپنے محفوظ چوڑے دستانوں کے استر میں چھپا لیتا تھا جہاں ٹٹول کر اس کے وجود کا علم نہیں ہو سکتا وارڈروں نے کئی مواقع پر اسے دیکھا لیکن سمجھے کہ یہ عبادت کرنے کی چیز ہے اور اسے میرے پاس ہی چھوڑ دیا۔ اپنی سزا کے اختتام تک (اس وقت تک میں نے بارہ ہزار سطریں اکٹھا کر لی تھیں) اور بعد ازاں اپنی شہر بدری کے دوران اس تسبیح نے مجھے تخلیقی عمل اور اسے یاد رکھنے میں بڑی سہولت فراہم کی۔

پھر مواد آسان نہیں تھا۔ آپ نے جتنا وافر لکھا ہو ہر ماہ اتنا ہی زیادہ آموختہ کرنا ہوتا تھا۔ اور اس عمل میں خاص مضرت رساں بات یہ تھی کہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے اسے واضح طور پر دیکھ نہیں سکتے اس کے حسن و قبح پر زیادہ غور نہیں کر سکتے۔ اوّلیں مسودہ ہی آخری مسودہ ہوتا ہے جسے جلد از جلد قبول کر لیا جاتا ہے تاکہ اسے نذرِ آتش کیا جا سکے آپ کے پاس اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ اسے برسوں تک ایک طرف ڈال دیں، فراموش کر دیں اور پھر از سرِ نو اس پر ناقدانہ نظر ڈال سکیں۔ اس طرح کبھی بھی اعلیٰ تخلیق نہیں پیش کی جا سکتی۔

اور نہ ان غیر آتش دیدہ کاغذ کے پرزوں کو آپ زیادہ دیر تک اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ میں تین مرتبہ پکڑا گیا اور صرف اس لیے بچ گیا کہ میں سب سے زیادہ خطرناک نام کبھی مکمل نہیں لکھتا تھا بلکہ ان کی جگہ ڈیش لگا دیتا تھا۔ ایک بار میں سب سے علیحدہ گھاس پر لیٹا تھا ــــ یہ جگہ سرحدی تاروں کے بعید نزدیک تھی (کیونکہ وہاں نسبتاً زیادہ سکون تھا) اور اپنے کاغذ کے پرزے ایک کتاب میں چھپا کر لکھ رہا تھا۔ سینئر وارڈر۔ تتارین آہستگی کے ساتھ رینگتا ہوا میرے عقب تک آ پہنچا اور اس نے دیکھا کہ میں پڑھنے کے بجائے

لکھ رہا ہوں۔

"ٹھیک ہے۔ ادھر لاؤ اسے!" میں سر د پسینے میں شرابور اٹھا اور کاغذ اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔
اس پر یہ مصرعے درج تھے:

ہم نے جو کچھ کھویا ہے اس کی تلافی کر دی جائے گی۔
ہمارا کوئی دعویٰ ٹھکرایا نہ جائے گا۔
اوسٹرووڈ برودنیسکی روٹ۔
پاپیادہ واماندگی کے پانچ شب و روز کے فاصلے پر تھا۔
ہمارے ہمراہ تھے (پہرے دار) ق (رازاق) اور ت (اتار) اگر پہرے دار قازق اور تاتار مکمل لکھے ہوئے ہوتے تو تاتارین کھینچ کر مجھے افسرِ تحفظ کے پاس لے گیا ہوتا اور انھیں میرے تخلیقی عمل کا علم ہو جاتا لیکن خالی جگہوں کی وجہ سے اسے حقیقت معلوم نہ ہو سکی۔

ہمارے ہمراہ تھے.... ق ..... اور ت.....

ہمارے ذہن الگ الگ راستوں پر کام کر رہے تھے میں نظم کے لیے خائف تھا اور اس نے خیال کیا کہ میں کیمپ کے علاقے کا خاکہ تیار کر رہا ہوں اور فرار کا منصوبہ بنا رہا ہوں۔ پھر اس نے جو کچھ پڑھا اس پر تیوریاں چڑھائیں۔ کچھ الفاظ اسے بامفہوم سے لگے لیکن جس چیز سے اس کا ماتھا ٹھنکا وہ تھا مصرع ــــ پاپیادہ واماندگی کے پانچ شب و روز ــــ میں نے اس کے ممکنہ مفاہیم پر غور نہیں کیا تھا۔ "پانچ شب و روز" کیمپ کی ایک مستعمل اصطلاح تھی جو قیدیوں کی قیدِ تنہائی کے لیے استعمال میں آتی تھی۔

"پانچ شب و روز ــــ یہ سب کس کے بارے میں ہے؟" اس نے غرّا کر پوچھا۔ میں (اوسٹرووڈ اور برودنیسکی کے نام دکھلا کر) بمشکل تمام اسے باور کرا سکا کہ میں کسی دوسرے کا لکھا ہوا۔ ایک فوجی نغمہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اس کے تمام لفظ مجھے یاد نہیں آ رہے ہیں۔

"تم اسے کیوں یاد کرنا چاہتے ہو؟ تم یہاں گیت رٹنے کے لیے نہیں لائے گئے!" اس نے غیض آلود تنبیہ کی" اگر میں نے تمہیں پھر یہاں دراز پایا تو تمہیں کال کوٹھڑی میں ڈال دیا جائے گا!"

آج اس حادثے کا ذکر کرتے ہوئے واقعہ بہت حقیر سا لگتا ہے لیکن اس وقت مجھ جیسے گھٹیا غلام کے لیے یہ ایک بے حد اہم بات تھی۔ میں پھر کبھی ہجوم سے الگ ہو کر اس گھاس پر نہیں لیٹا۔ اگر تاملارین مجھے کوئی اور نظم لکھتے ہوئے پکڑ پاتا تو وہ مجھ پر ایک نئی فائل کھول دیتے اور میں سخت نگرانی میں رکھا جاتا۔ لیکن اب میں لکھنا بند نہیں کر سکتا تھا۔

ایک موقع پر میں نے اپنا عام اصول توڑ دیا۔ کام کی جگہ میں نے ایک ہی نشست میں ایک ڈرامے کی ساٹھ سطور قلم بند کیں اور کیمپ کے باب داخلہ پر انھیں چھپا نہ سکا۔ یہ درست ہے کہ میں نے اس میں ذہانت کے ساتھ کچھ خالی جگہیں چھوڑ دی تھیں۔ وارڈر نے، جو ایک سادہ لوح، چپٹی ناک والا نوجوان تھا، اپنی حاصل کردہ اس چیز کی تفتیش قدرے حیرت کے ساتھ یوں شروع کی:

"خط ہے؟" اس نے دریافت کیا۔

(کام کی جگہ پر خط لے جانے کی سزا قید تنہائی تھی لیکن اگر وہ اسے افسر تحفظ کے پاس پہنچا دیتے تو یہ عجیب و غریب خط ثابت ہوتا!)

"یہ ایک ڈرامے کے لیے ہے۔" میں نے کاغذ دکھاتے ہوئے کہا "میں یادداشت کے سہارے ایک اسکیچ مکمل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، جب یہ اسکیچ پیش کیا جائے تو اسے دیکھنے آئیے گا۔"

نوجوان نے کاغذ کو اور پھر مجھے گھور کر دیکھا اور بولا:

"تم جتنے نظر آتے ہو اس سے بھی زیادہ احمق ہو۔"!

اور اس نے میرے کاغذ کے دو، چار، آٹھ ٹکڑے کر دیے۔ میں خائف تھا کہ وہ پرزے جواب بھی خاصے بڑے تھے، وہیں گارڈ ہاؤس کے سامنے پھینک دے گا جہاں وہ کسی زیادہ چاق و چوبند کارکن کی نظر میں آسکتے تھے۔ اعلیٰ افسر ڈسپلن سپچیو فسکی بذات خود چند قدم کی دوری پر ہی تھا اور ہماری جامہ تلاشی کا منظر دیکھ رہا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انھیں گارڈ ہاؤس کے پاس کوڑا کرکٹ پھینکنے کی ممانعت تھی ورنہ انھیں خود صاف کرنا پڑتا۔ چنانچہ وارڈر نے وہ پرزے میرے ہاتھ میں تھما دیے جیسے وہ غلاظت کی لوٹ کری ہو۔ میں دروازے کے اندر گھسا اور انھیں بعجلت بھٹی میں جھونکنے کے لیے چلا گیا۔

ایک تیسرے موقع پر جب ایک نظم کا بڑا حصہ بغیر جلا ہوا میرے پاس موجود تھا، میں ڈسپلن بیرکوں میں کام پر تھا اور "معمار" کو کاغذ پر منتقل کرنے کی خواہش پہ قابو نہ پا سکا۔ اس وقت ہم کبھی کبھی کیمپ کی حدود سے باہر نہیں جاتے تھے اس لیے ہماری جامہ تلاشی روز نہیں لی جاتی تھی۔ "معمار" قلم بند کیے۔ جب تین یوم گزر گئے تو شام کو معائنے سے قبل میں آخری بار اس کی نوک پلک درست کرنے اور پھر فی الفور نذر آتش کر دینے کے ارادے سے باہر تاریکی میں آ گیا۔ میں کسی پرسکون خالی جگہ کی تلاش میں تھا جس کا مطلب تھا کہیں سرحدی باڑ کی سمت اور میں یہ بالکل فراموش کر بیٹھا کہ میں اس مقام کے نزدیک تھا جہاں سے حال ہی میں دس سال کی سزا یافتہ ایک قیدی نکل بھاگا تھا۔ ایک وارڈر نے، جو ظاہر ہے کہ موقع کی تلاش میں تھا فوراً آ کر میری گدی دبوچ لی اور اندھیرے میں گھسیٹتا ہوا مجھے کال کوٹھری پر لایا۔ میں نے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کاغذ کو مسل کر اپنے پیچھے اچھال دیا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے وارڈر کو کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ اور چرمراہٹ سنائی نہیں دی۔

میں بالکل بھول گیا تھا کہ میرے پاس نظم کا ایک اور حصہ بھی ہے۔ ڈسپلن بیرکوں میں جب میری جامہ تلاشی لی گئی تو یہ ان کے ہاتھ پڑ گیا۔ خوش قسمتی سے اس میں ایسی کوئی بات نہ تھی جس کے سبب میں قصوروار گردانا جاتا (یہ "پرشین نائٹس" کا ایک بیانیہ جزو تھا)

ڈیوٹی افسر نے جو خاصا تعلیم یافتہ سینئر سارجنٹ تھا، اسے از اول تا آخر پڑھا:

"یہ کیا ہے؟"

"تواردڈوفسکی!" میں نے بے تامل جواب دیا۔ (واسیلی تیورکن* اس مقام پر تواردڈوفسکی کا

راستہ میرے راستے سے ملا تھا)

"لوٹارڈ و فسکی!" سارجنٹ نے تکریم کے طور پر اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور تمہیں کس کام کے لیے اس کی ضرورت پڑ گئی؟"

"بات یہ ہے کہ یہاں کتابیں تو ہیں نہیں۔ جو کچھ مجھے یاد ہے اسے میں لکھ لیتا ہوں اور کبھی کبھی پڑھتا رہتا ہوں۔"

انھوں نے میرا ہتھیار، بلیڈ کا نصف حصہ، مجھ سے چھین لیا لیکن نظم مجھے لوٹا دی گئی، اور انھوں نے مجھے چھوڑ دیا (میں دوڑ کر جانے اور نظم "معاذ" کو تلاش کرنے کی فکر میں تھا) لیکن اس وقت تک شام کا معائنہ ختم ہو چکا تھا اور اس کے بعد کسی فرد کو کیمپ میں اِدھر اُدھر گھومنے کی اجازت نہ تھی وارڈر مجھے واپس جھونپڑے تک لے گیا اور اس نے مجھے اندر بند کر دیا۔

اس رات میں اچھی طرح سو نہیں سکا باہر آندھی چل رہی تھی جس کاغذ پر "معاذ" تحریر تھی اسے ہوا کہاں لے جائے گی؟ تمام خالی مقامات کے باوجود نظم کا مقصد واضح تھا اور اس سے یہ بھی پتہ چلتا تھا کہ نظم کا خالق ڈسپلن بیرک تعمیر کرنے والوں میں سے کوئی ہے۔ ان تمام مغربی یوکرینیوں میں سے مجھے تلاش کر لینا دشوار نہیں تھا۔

اس طرح سالہاسال کا کام جو پہلے کیا جا چکا تھا اور جسے مکمل کرنے کا میں نے منصوبہ تیار کیا تھا، ایک شکن آلود کاغذ کا ٹکڑا تھا اور کیمپ میں اِدھر اُدھر یا اسٹیپی پر بے بسی کے ساتھ اڑتا پھرتا ہوگا۔ میں صرف دعا مانگ سکتا تھا۔ مصیبت کے وقت ہمیں خدا کا نام لیتے ہوئے شرم کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کا نام لیتے ہوئے شرم اُسی وقت آتی ہے جب معاملات ٹھیک ہوں۔

جیسے ہی ہم صبح پانچ بجے اٹھے، میں تیز ہوا میں ہانپتا ہوا اس مقام تک پہنچا ہوا اتنی تیز تھی کہ سنگریزے اڑ اڑ کر منہ پر لگتے تھے۔ کاغذ کے اس پرزے کو تلاش کرنا، تضیع اوقات ہی تھا! جہاں میں تھا وہاں سے ہوا کارکنوں کی بیرکوں کی جانب، پھر تعزیری کوٹھڑیوں کی طرف (یہ جگہ بھی وارڈروں سے پُر تھی اور وہاں بہت سا الجھا ہوا کانٹے دار تار پڑا تھا) پھر کیمپ کی حدود سے پرے سڑک پر بہہ رہی تھی۔ میں نے چاروں جانب دیکھا اور اولیں پہر کے ایک گھنٹے کی تلاش کے باوجود کچھ ہاتھ نہ لگا۔ اب میں تقریباً مایوس ہو چکا تھا۔ پھر جب روشنی ہوئی، تو میں نے جہاں پھینکا تھا اس سے تقریباً تین قدم آگے مجھے کوئی سفید چیز نظر آئی۔ ہوا نے کاغذ کی گولی کو ایک طرف لڑھکا دیا تھا اور وہ تختوں کے ایک ڈھیر میں پھنس گئی تھی۔

میں اب بھی اسے ایک معجزہ ہی تسلیم کرتا ہوں۔

اب میں آگے لکھتا گیا۔ سردیوں میں گرم رہنے کے لیے بنی ہوئی جھونپڑی میں، موسم بہار اور گرمیوں میں کام کی جگہ پر فصیل کے پاس سمنٹ کے مصالحے کا ٹھیلہ آنے کا انتظار کرتے ہوئے میں اینٹوں پر اپنا کاغذ کا پرزہ پھیلا لیتا اور (اپنے ساتھیوں کی نظر بچا کر) پنسل کے ٹکڑے سے وہ مصرعے قلم بند کر لیتا جو اس وقت تک میرے ذہن میں مکمل ہو جاتے تھے۔ جب میں پچھلے ٹھیلے کا مسالہ پھیلا تا تھا۔ میں

عالم خواب میں ہوتا تھا۔ کرۂ طعام میں روزانہ کا دلیہ لے کر بیٹھتا تو بعض اوقات اس کا ذائقہ تک سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اپنے چاروں طرف لوگوں کا شور بھی مجھے سنائی نہ دیتا تھا۔ میں اپنی نظم کے چہار جانب اپنا راستہ ٹٹولتا رہتا تھا اور دیواروں میں اچھی طرح بٹھانے کے لیے اینٹوں کی مانند مصرعوں کو کاٹتا چھانٹتا رہتا تھا میری جامہ تلاشی لی جاتی، حاضری ہوتی اور مویشی کے ریوڑ کی مانند ہانک کر مجھے اسٹیپی پہلے جایا جاتا تھا اور اس تمام عرصے میں میں اپنے ڈرامے کے لیے سیٹ، پردوں کے لیے رنگ، فرنیچر کی نشست، اسپاٹ لائٹ اسٹیج پر کام کرنے والے اداکاروں کی حرکات و سکنات پر غور کرتا رہتا تھا۔

کچھ لڑکے لاری میں سوار ہو کر تار توڑتے ہوئے نکل بھاگتے، کچھ تار کے نیچے سے رینگ کر سرحد پار کر لیتے، دیگر برف کے جھونکوں کی سمت جاتے اور برف پر بڑھتے رہتے۔ لیکن میرے لئے تیار ہوتا یا نہ ہوتا تمام وقت اپنے تخلیقی سفر کی مہم درپیش رہتی اور یہ ایسی چیز تھی جس کا علم قیدیوں کو شمار کرتے پہریداروں کو نہ ہو سکتا تھا۔

مجھے احساس تھا کہ میں واحد ایسا شخص نہیں ہوں۔ میں ایک عظیم راز کا امین ہوں۔ ایسا راز جو اس مجمع الجزائر کے منتشر جزیروں پر مجھ جیسے دیگر تنہائی زدہ قلوب میں بھی نمو پا رہا ہے جو آنے والے برسوں میں افشا ہو گا۔ شاید اس وقت جب ہم مر چکے ہوں گے اور مستقبل کے روسی ادب میں تحلیل ہو جائے گا۔

۱۹۵۶ء میں، میں نے ورلم شالاموف کی نظموں کا اولین مختصر سا مجموعہ 'سمزدات' میں پڑھا تھا جو اس وقت بھی وجود میں تھیں اور اس احساس سے لرز گیا تھا کہ مجھے بہت پہلے گمشدہ بھائی دوبارہ مل گیا ہے۔ اس میں اس نے سائریکیوس کی حصار بندی کے زمانے میں آرشیڈین کی مانند مرنے کی آرزو کا اظہار کیا تھا۔

سب سے زیادہ جاننے والا میں ہوں کہ یہ کھیل نہیں
اور کھیل ہے تو خطرناک! لیکن مجاہدوں کی مانند
جان دے دوں گا۔ قلم نہیں دوں گا...
اپنا نیم نوشتہ ورق چاک نہیں کروں گا۔

اس نے بھی ایک کیمپ میں لکھا تھا، اردگرد کے تمام لوگوں سے اپنا راز چھپا کر، میری طرح تاریکی میں اپنے گوشۂ عزلت میں نامرادانہ گریہ وزاری کرتے ہوئے:

ویران مزاروں کی قطاریں ہی،
اب مجھے یاد آ رہی ہیں۔
اور مجھے وہیں لیٹ جانا تھا،
اپنے عریاں جسم کو وہیں پھیلا دینا چاہتے ہیں۔
اگر میں نے عہد نہ کر لیا ہوتا۔
آخری دم تک نغمہ سنجی اور گریہ وزاری کرنے کا،

غم کی کبھی پروا نہ کرنے کا،
جیسے کہ مردہ شخص کے دل میں بھی،
زندگی عود کر سکتی ہو۔

ہم میں سے کتنے لوگ وہاں تھے! درمیانی برسوں میں جتنے لوگ سامنے آئے ہیں ان سے بہت زیادہ۔ وہ سب کے سب زندہ نہیں رہے۔ کچھ نے مسودات بوتلوں میں رکھ کر دفن کر دیے اور کسی کو نہ بتایا کہ وہ کہاں دفن ہیں۔ کچھ نے اپنی تخلیقات غیر محتاط یا اس کے برعکس حد درجہ محتاط لوگوں کے پاس محفوظ رکھوا دیں۔ کچھ لوگ اپنی تخلیقات بر وقت کاغذ پر منتقل نہیں کر سکے۔

ایکی لبسٹز جزیرے پر بھی کیا ہم ایک دوسرے کو بخوبی شناخت کرنے کی منزل میں پہنچ سکے! ایک دوسرے کی تائید کر سکے؟ بھیڑیوں کی طرح ہم سب سے چھپتے تھے اور اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک دوسرے کی نگاہ سے بھی بچتے تھے لیکن اس کے باوجود میں نے ایکی لبسٹز میں چند لوگ تلاش کر لیے تھے۔

مذہبی شاعر اناطوٹ واسلیسوچ سیلن سے ملاقات اچانک ہو گئی جس کا سہرا بیپٹسٹوں کے سر جاتا ہے۔ اس وقت وہ چالیس سے اوپر تھا اس کے چہرے میں کوئی خاص بات نہ تھی اس کے کٹے ہوئے بالوں اور ریش و بروت کی جگہ ایک سرخی مائل ہلکے روئیں کا جالا سا اُگ آیا تھا اور اس کے ابرو بھی لال ہو گئے تھے۔ وہ دن اور رات کے لمحے میں سب کے ساتھ ملائمت اور کھلنداہٹ کے ساتھ پیش آتا تھا لیکن کم گو تھا۔ جب ہم ایک دوسرے سے کچھ کھلے تو اپنے اتوار کی تعطیلات میں کئی کئی گھنٹے کیمپ کے ارد گرد چہل قدمی کرتے ہوئے وہ اپنی طویل مذہبی نظمیں مجھے سنانے لگا (میری ان نظموں کی تخلیق بھی کیمپ میں ہی کی گئی تھی) میں اکثر یہ محسوس کر کے چونک پڑا کہ بظاہر معمولی نظر آنے والے افراد میں کتنی غیر معمولی روح پوشیدہ ہوتی ہے۔

وہ لاوارث بچہ تھا اور ایک یتیم خانے میں لامذہب کی حیثیت سے پروان چڑھا تھا! ایک جرمن کیمپ میں اسیرِ جنگ کے طور پر قیام کے دوران اس کے ہاتھ کچھ مذہبی کتب لگ گئیں اور وہ ان کے اثر میں آ گیا اس کے بعد وہ نہ صرف خدا پرست ہو گیا بلکہ ایک مفکر اور دانشور مذہبی بھی بن گیا۔ اس کے بعد سے ہی وہ کسی وقفے کے بغیر کیمپوں اور جیلوں میں زندگی بسر کر رہا تھا اور اس طرح اس نے اپنی مذہبی تربیت زندگی کے دھارے سے الگ رہ کر حاصل کی تھی۔ اس نے وہ باتیں از سرِ نو تلاش کی تھیں۔ جنھیں دوسرے پہلے معلوم کر چکے تھے، شاید وہ تشکیک کا شکار بھی ہوا کیوں کہ اس کے پاس نہ کتابیں تھیں نہ مشیرانِ کار۔ اب وہ خندق کھودنے والے مزدور کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ ایک ناممکن مقصد حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خمیدہ گھٹنوں اور لرزیدہ ہاتھوں کے ساتھ وہ کام پر سے لوٹتا تھا لیکن شب و روز، جو نظمیں وہ کاغذ پر لکھے بغیر تخلیق کرتا تھا، وہ آٹھ فٹ ٹیٹرا میٹر بحر میں آزاد نظمیں ہوتی تھیں اور یہ ہر لمحہ اس کے دل و دماغ میں گردش کرتی رہتی تھیں۔ اس وقت تک اسے کم بیش بیس ہزار مصرعے حفظ تھے ان کا بھی اس کے نزدیک ایک بامقصد استعمال تھا: انھیں وہ خیالات کو محفوظ رکھنے اور ظاہر کرنے کا ایک اسلوب سمجھتا تھا۔

قدرت کے خزینوں کے بارے میں اس کے حساس ردِ عمل اور دنیا کے بارے میں اس کے نقطۂ نظر میں حسن و حوصلہ پیدا ہو جاتا تھا۔ گھاس کے کیاب تنکے پر جھکتے ہوئے۔ جو ہمارے بنجر کیمپ میں غیر قانونی طریقے سے اُگ آئی تھی، اس نے کہا تھا:

"کتنا حسن ہے ان زمین کی گھاسوں میں، جنھیں قادرِ مطلق نے انسان کے پیروں تلے قالین کی شکل میں بچھا رکھا ہے چنانچہ خود ہمیں ان کی بہ نسبت کتنا زیادہ حسین ہونا چاہیے!"

"لیکن یہ کیوں کہا گیا ہے کہ اس دنیا سے اور اس کی فانی اشیا سے محبت مت کرو؟"

(رہبانیت کے پیروکار اکثر یہ مقولہ دہراتے ہیں)

وہ معذرت خواہی کے انداز میں مسکرانے لگتا تھا۔ اس مسکراہٹ سے وہ کسی کو بھی لاجواب کر سکتا تھا:

"دنیاوی جسمانی، محبت بھی تو دوئی کو مٹانے کی آرزو کا اظہار ہے!" خدائی انصاف، بالفاظِ دیگر دنیا میں موجود برائیوں کے جواز اس کے پاس کچھ اس قسم کے تھے:

"کیا ذاتِ باری، جو سرتاسر عشق ہے،
ہماری زندگی میں عدم تکمیل پیدا کرتی ہے،
پہلے روح کو اذیت اٹھانی ہوگی،
اس کے بعد ہی وہ لذتِ خلد سے بہرہ ور ہو سکے گی،
اصول سخت ہے لیکن اس پر عمل پیرا ہونا ہی،
بے سہاروں کے لیے واحد راہِ نجات ہے
ابدی تسکین کے حصول کی۔

عیسیٰ مسیح کے جسمانی مصائب کے بارے میں اس کے خیالات جراُت مندانہ تھے — وہ کہتا تھا کہ وہ انسانی گناہوں کے کفارے کی وجہ سے بھی نہیں بلکہ اس وجہ سے بھی ان سوتوں سے دوچار ہوئے کہ خدا دنیاوی تکالیف کو پوری طرح محسوس کرنا چاہتا تھا۔

"روزِ ازل سے ان تکلیفوں سے واقف تھا لیکن اس نے انھیں کبھی محسوس نہیں کیا تھا" سیلن دلیری کے ساتھ کہتا ہے، مخالفین مسیح کی بابت بھی، جنھوں نے.....

ناپاک کیا انسان کی آزاد خواہش کو
اور مسخ کیا اس کی صادق نزدیک پہنچنے کی آرزوؤں کو

کہنے کے لیے سیلن کے پاس کچھ نئی اور غم انگیز باتیں تھیں:

قدرت نے اسے جو لطف جاودانی ودیعت کیا تھا
اسے فرشتے نے اسے زعم خودی میں ٹھکرا دیا۔
اسے انسانی مصائب کا کوئی علم نہ تھا۔
وہ انسانوں کی محبت سے محبت کرتا تھا

محبت کی تکمیل دکھ جھیل کر ہی ہوتی ہے۔

خود اس آزادانہ انداز میں سوچنے والے سیلن نے ہر طرح کے عیسائی فرقوں کے کشادہ قلبوں میں اپنے لیے محبت آمیز جگہ بنائی؛

یہ کرامت ہی ہے
کہ ہر چند مسیح کی تعلیمات اس کا موضوع ہیں
لیکن سچا فنکار ہمیشہ اپنی آواز میں انفرادیت پیدا کرے گا۔

جو لمحہ جلد بازی کے ساتھ اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے کہ وہ روح سے مادہ پیدا ہو سکتا ہے اس پر سیلن صرف مسکرا دیتا تھا!

"وہ اپنے آپ سے یہ سوال کیوں نہیں کرتا کہ بے جان مادّے سے روح کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ اس صورت میں تو یہ ایک معجزہ ہی ہوگا۔ ہاں اور بھی بڑا معجزہ!"

میرا ذہن میرے اپنے اشعار سے لبریز تھا اور میں سیلن کی چند نظموں کے اقتباسات ہی یاد رکھ سکا ہوں شاید اس خوف کے تحت کہ وہ خود کچھ بھی محفوظ نہ رکھ سکے گا۔ اس کی ایک نظم میں اس کے محبوب کردار نے جس کا قدیم یونانی نام مجھے یاد نہیں رہا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک تقریر کی ہے — جو تمام بنی نوع انسانی کے لیے ایک باطنی لائحہ عمل ہے۔ اس بدنصیب لاچار شاعر زنداں کی جانب سے، جس کے کپڑوں پر چار ہندسے ٹنکے ہوئے تھے، ذی روح انسانوں سے وہ اس ضمن میں اس سب کچھ سے زیادہ کہنا چاہتا تھا جو اخبارات و رسائل، اشاعتی اداروں، نشرگاہوں پر براجمان کرائے کے ٹٹوؤں کی پوری جماعت کہنا چاہتی ہے اور جن کا کہا ان کے علاوہ کسی دوسرے کے کام کا نہیں ہوتا۔

جنگ سے پہلے اناطولی واسیلیوچ نے ایک تدریسی یونیورسٹی سے۔ بی۔ اے کی ڈگری لی تھی جس میں اس کے خصوصی مطالعے کا موضوع ادب تھا۔ میری طرح اس کی شہر بدری کی میعاد کے تین سال باقی رہ گئے تھے۔ اسے محض اسکولوں میں درس و تدریس کی تربیت دی گئی تھی کوئی خاص امکان نہ تھا کہ ہم جیسے سابق قیدیوں کو اسکولوں میں کام کرنے کی اجازت ملے گی۔ لیکن اگر مل جائے ــــ تو پھر؟

"میں طلبہ کے ذہنوں میں کذب کی تخم ریزی نہیں کروں گا! میں طلبہ کو ذاتِ باری اور روحانی زندگی کی صداقت سے روشناس کراؤں گا۔"

"لیکن وہ تمہیں پہلے سبق کے بعد ہی نکال باہر کریں گے۔"

سیلن نے اپنا سر خم کر لیا اور پرسکون لہجے میں بولا: "کر دینے دو۔"

اور یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ خائف نہ ہوگا۔ وہ محض اس وجہ سے مکاری نہیں کرے گا کہ پھاوڑے کی جگہ اپنے ہاتھوں میں کلاس کا رجسٹر سنبھال سکے۔

میں نے گھنگھریالے بالوں والے اس بے پروا آدمی پر ہمدردانہ اور توصیفانہ نگاہ کی جسے نہ اپنے والدین کا علم تھا نہ باطنی رہنما نصیب ہوئے تھے، جس کے لیے زندگی ایک بستر میں پھاوڑے سے بہتر یا ملتی جلتے ہوئے اس زندگی سے سخت تر نہیں تھی جو اسے دیگر جگہوں پر نصیب ہوئی تھی۔

سیلن اُسی برتن میں کھاتا تھا جس میں پنٹسٹ کھاتے تھے اور اپنی روٹی اور گرم سالن ان کے ساتھ بانٹ کر کھاتا تھا۔ یہ درست ہے کہ اُسے داد دینے والے سامعین کی ضرورت تھی۔ ایسے لوگ جن کے ساتھ مل کر وہ انجیلِ مقدس کے احکامات پڑھ سکے اور ان کا مفہوم سمجھ سکے اور جو اس چھوٹی سی کتاب کو چھپانے میں اس کے معاون ہوں۔

لیکن آرتھوڈاکس مسیحیوں کی یا تو اس نے جستجو ہی نہیں کی (اس خیال سے کہ وہ اسے ملحد سمجھ کر ٹھکرا دیں گے) یا انھیں تلاش کرنے میں ناکام رہا۔ ان کی تعداد ہمارے کیمپ میں دو ایک ہی تھی یا پھر مغربی یوکرینی تھے۔ یا پھر ان کا رویّہ دوسروں سے مختلف نہیں ہوتا تھا جس کی وجہ سے وہ ممتاز نہیں نظر آتے تھے۔ لیکن پنٹسٹ سیلن کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس کی گفتگو توجہ سے سنتے تھے اور اسے اپنی ہی جماعت کا آدمی تصور کرتے تھے: لیکن وہ بھی اس کی نظموں کے ملحدانہ اجزاء کو ناپسند کرتے تھے اور توقع رکھتے تھے کہ وقت آنے پر وہ اسے اپنا ہمنوا بنا لیں گے۔ سیلن جب ان کے روبرو مجھ سے گفتگو کرتا تھا تو کچھ دبا دبا سا رہتا تھا اور ان کی عدم موجودگی میں کھل جاتا تھا۔ اس کے لیے اپنے آپ کو ان کے سانچے میں ڈھالنا دشوار تھا حالانکہ ان کی عقیدت مستحکم خالص اور پُرجوش تھی جو انھیں کٹرعنا کو مستقل مزاجی کے ساتھ کسی قسم کے اخلاقی انحطاط کے بغیر سہنے میں معاون ہوتی تھی۔ وہ سب دیانتدار، نرم مزاج، محنتی! دوسروں کی امداد کے لیے مستعد اور مسیح کے سچے پیروکار تھے۔

یہی سبب تھا کہ انھیں بیخ و بنیاد سے اکھاڑنے کی اتنی سخت کوشش کی جا رہی تھی۔ ۱۹۴۸ء
تا ۱۹۵۰ کے برسوں میں ان کے صدہا لوگوں کو ۲۵ سال قیدِ بامشقت کی سزا دی گئی تھی اور محض اس بنا پر اسپیشل کیمپ میں بھیج دیا کہ وہ پنٹسٹ کمیون (تنظیم) کے اراکین تھے۔

کیمپ باہر کی دنیا سے مختلف جگہ ہے۔ بیرونی دنیا میں ہر شخص اپنے ظاہری طرزِ عمل سے اپنی شخصیت کا اظہار کرنے اور اس پر اصرار کرنے کی بے تکلف کوشش کرتا ہے۔ اس کے برعکس جیل میں سب شخصیت سے محروم ہو جاتے ہیں یکساں طور پر کاٹے گئے بال، گالوں پر ایک جیسا خط، مماثل ٹوپیاں، ایک ہی طرح کی روئی دار جیکٹوں میں ملبوس۔ چہرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تیز ہوا، دھوپ اور غبار میں شدید مشقت کی وجہ سے روح مسخ ہو گئی ہے۔ اس شخصیت سے عاری اور حقیر ظاہری ہیئت کے پیچھے چھپی ہوئی روح کا نور دیکھنے کے لیے بصیرت درکار ہوتی ہے۔

لیکن باطنی نور کو پھیلنے سے ایک سے دوسرے تک منتقل ہونے سے باز نہیں رکھا جا سکتا روح سے روح کس طرح مانوس ہو جاتی ہے۔ اس کی وضاحت ممکن نہیں۔

اگر آپ کو کسی آدمی کے سوانحِ حیات کے چند اجزاء کا بھی علم ہو تو آپ اسے زیادہ بہتر طور پر اور جلد سمجھ لیتے ہیں۔ یہ کچھ خندقیں کھودنے والے ساتھ ساتھ کام کر رہے ہیں، نرم و دبیز برف گرنے کا آغاز ہو چکا ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ اب ستانے کا وقت آ لگا ہے، تمام ٹولی برف سے محفوظ رہنے کی غرض سے کھدی ہوئی خندق میں چلی گئی ہے لیکن ایک شخص وہیں باہر کھڑا رہ جاتا ہے۔ خندق کے

کنارے وہ اپنے پھاوڑے پر جھکتا ہے اور بالکل ساکت ہو جاتا ہے۔ جیسے اسے اسی طرح راحت مل رہی ہو یا جیسے وہ کوئی مجسمہ ہو۔

اُس کے سر، شانوں اور بازوؤں پر گرنے والی برف کی تہیں اسے مجسمے سے زیادہ مماثل کر دیتی ہیں۔ کیا اسے پروا نہیں ہے؟ کیا وہ اس عمل کو پسند کرتا ہے؟ وہ برف کے تھوڑوں کے بڑھتے ہوئے انبار کو ٹکٹکی لگا کر دیکھتا ہے۔ کیپ پر سفید اسٹیپی پر، اس کے شانے چوڑے ہیں، ہڈیاں چوڑی ہیں، چہرہ چوڑا ہے۔ سخت، ہلکے زرد بال اُگ آئے ہیں۔ وہ ہمیشہ متفکرانہ انداز میں آہستگی کے ساتھ چلتا ہے، بے حد پرسکون نظر آتا ہے۔ وہ دہاں ایستادہ ہے، دنیا کا جائزہ لیتا ہوا، سوچتا ہوا وہ کہیں اور پہنچ گیا ہے۔

میں اس سے ناواقف ہوں لیکن اس کا دوست ریڈکن مجھے اس کی روداد سناتا ہے۔ یہ شخص ٹالسٹائی کے نظریات کا پیروکار ہے وہ اس دقیانوسی اصول کے ماحول میں پروان چڑھا کہ انسان کو تشدد نہیں کرنا چاہیے (وان گارڈ یا پیش رفتی کے ترقی پسندانہ نظریے کے تحت کبھی نہیں!) اور اس لیے کبھی تلوار بلند نہیں کرنی چاہیے ا؛ ۱۹۱۲ء میں اسے فوج میں بھرتی ہونے کا حکم دیا گیا۔ کشکا کے نزدیک، جہاں اسے تعینات کیا گیا تھا۔ اس نے اپنی بندوق پھینک دی اور افغان سرحد پار کر گیا۔ کشکا کے آس پاس کوئی جرمن نہیں تھا یا ہونے کا امکان بھی نہ تھا اس لیے وہ ہکوں کے ساتھ زمانۂ جنگ گزار سکتا تھا۔ جس میں اسے کوئی کسی فرد کا خون نہ بہانا پڑتا لیکن اونٹ کے اس ٹکڑے کو پیٹھ پر لادے پھرنا بھی کبھی اسے مذہبی عقائد کے خلاف محسوس ہوا۔ وہ سوچتا تھا کہ افغانی اس کے عدم تشدد کے حق کا احترام کریں گے اور اسے اپنے ملک سے گزر کر ہندوستان جانے کی اجازت دے دیں گے جہاں مذہبی رواداری ہے لیکن حکومت افغانستان ویسی ہی خود غرض نکلی جیسی کہ حکومت ہوا کرتی ہیں۔ اپنے طاقتور عظیم ہمسائے کے غیض و غضب سے خوفزدہ ہو کر اس مفرور کو بعد میں فیصلہ کرنے کے لیے روک لیا اور اسے تین سال مقید رکھا۔ ایام اسیری میں ٹانگیں اکڑ جانے کے باعث وہ چل نہ سکتا تھا۔ افغانوں نے تین سال انتظار کر کے یہ دیکھا کہ کون فتحیاب ہوتا ہے روس کی فتح ہوئی اور حکومت افغانستان نے مفرور شخص کو باصرار روس کے سپرد کر دیا۔ اس کی موجودہ سزا روس کو واپسی کی تاریخ سے ہی شروع ہوتی ہے۔

اب وہ باہر برف میں ساکت کھڑا تھا جیسے لاموجود کا ہی ایک جزو ہو۔ کیا اسے اس دنیا میں لانے کی ذمہ داری حکومت کی تھی؟ تو پھر حکمران نے اس بات کا فیصلہ کرنے کا حق کیسے حاصل کر لیا کہ یہ آدمی کس قسم کی زندگی گزارے گا؟

ہمیں لیو ٹالسٹائی کو اپنا ہموطن کہنے میں عار نہیں یہ ایک اچھا ٹریڈ مارک ہے (اس کی بدولت ایک اچھا ڈاک ٹکٹ بھی بن جاتا ہے / غیر ملکیوں کو یاسنایا پولیانا کی سیر کے لیے جا سکتے ہیں) ہم ہمیشہ زارشاہی سے اس کی مخاصمت اور فرقہ پرستی سے اس کی بیزاری کا بیان کرتے ہوئے معلن کی آواز میں لرزش پیدا ہو جاتی ہے ایسی باتیں جوش و خروش کے ساتھ کرتے ہیں۔ لیکن میرے عزیز ہم وطنو! اگر کوئی شخص نہایت سنجیدگی کے ساتھ ٹالسٹائی کی ہدایت پر عمل کرتا ہے، اگر کوئی اصلی جیتا جاگتا ٹالسٹائی کا پیروکار ہم تک پہنچ جاتا ہے ـــ اے! ادھر دیکھو ہوشیار! کہیں ہمارے ٹرکیگرڈ کے راستے میں نہ گر پڑنا!

شاید آپ دوڑ کر جائے تعمیر تک جائیں اور فورمین سے، جو قیدی ہی ہے اپنی تعمیر کردہ دیوار کی پیمائش کے لیے اس کا فولڈنگ پیمانہ طلب کریں وہ اسے فیتے کو بہت سنبھال کر رکھتا ہے اور آپ کو صورت سے نہیں پہچانتا اتنے بہت سے لوگ اور ٹولیاں کام پر ہیں۔ لیکن کسی وجہ سے وہ اپنا خزانہ بے تکلف آپ کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ کیمپ کے تربیت یافتہ آدمی کے لیے یہ صریحاً حماقت ہے) اور جب آپ فیتہ اسے واپس دیتے ہیں تو وہ بڑے تپاک سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ ایسا عجیب و غریب شخص کیسے کسی کیمپ میں فورمین بن سکتا ہے۔ اس کے بولنے کا انداز قدرے مختلف ہے۔ ہاں ہاں۔ وہ پولینڈ کا نکلا اس کا نام جیرزی دیجیرسکی ہے اس کا ذکر ابھی آپ اور سنیں گے......

آپ شاید کالم میں سب کے ساتھ مارچ کرتے ہوئے جاری ہیں اور اپنے چرڑے دستانے کے اندر شاید تسبیح گھما رہے ہیں۔ یا اپنی نظم کے اگلے مصرعے سوچ رہے ہیں۔ لیکن قطار میں اپنے ہمراہی، ایک نئے چہرے میں آپ کی بہت دلچسپی ہو جاتی ہے (انھوں نے جائے تعمیر پر ایک تازہ دستہ بھیجا ہے) ایک بزرگ پاکیزہ اطوار کا یہودی دانشور ہے جس کے چہرے پر شوخ ذہانت کا پرتو ہے اس کا نام مسا میڈ ہے اور اس نے یونیورسٹی سے گریجویشن کیا ہے۔ کن مضامین سے! انجارسٹ کی حیاتیات و نفسیات کی فیکلٹی نے دیگر باتوں کے علاوہ وہ سائنگو نامی اور ریفولا جی کا ماہر ہے۔ علاوہ ازیں وہ یوگی بھی ہے اور کل سے وہ آپ کو ہاتھ یوگ کا کورس شروع کرائے گا (مقام افسوس ہے کہ اس دانشگاہ میں ہمارا تعلیمی سال اتنا مختصر ہوتا ہے! میں پوری سانس تک نہیں لے سکتا۔ ہمیں پوری طرح سانس لینے کا وقت بھی نصیب نہیں ہوتا)

بعد ازاں میں نے اسے جائے کار اور جائے قیام پر اچھی طرح دیکھا اس کے ہم وطنوں نے اسے دفتر کے ایک کام پر مامور کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اس کے لیے آمادہ نہ ہوا وہ یہ ثابت کرنا زیادہ اہم سمجھتا تھا کہ یہودی بھی عام مزدوری کا کام عمدگی کے ساتھ سرانجام دے سکتے ہیں اس لیے پچاس سال کی عمر میں وہ بے خوفی کے ساتھ اپنا بھاوڑا چلاتا ہے۔ سچے یوگی کی طرح وہ واقعی اپنے جسم کا مالک ہے نفی دس ڈگری سینٹی گریڈ پر وہ کپڑے اتار دیتا ہے اور اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ آگ بجھانے کے نل سے مجھے نہلا دو ہم دوسرے لوگ جو بدذائقہ دلیے کو جلدی جلدی حلق سے نیچے اتارتے ہیں ان کے برعکس وہ یکسوئی کے عالم میں آہستہ آہستہ اپنی پلیٹ سے دور دیکھتے ہوئے چھوٹے سے چمچ سے ایک بار میں تھوڑا تھوڑا دلیہ کھاتا ہے۔

ایسا ہوتا ہے اور اکثر ہوتا ہے کہ کام پر جاتے یا واپس آتے ہوئے آپ کسی دوسرے دلچسپ آدمی سے متعارف ہو جاتے ہیں۔ لیکن آپ قطار میں چلتے ہوئے ہمیشہ باتیں نہیں کر پاتے۔ پہرے دار چیختے ہیں اور آپ کا پڑوسی سرگوشی کرتا ہے (آپ کی وجہ سے نہیں.... اور....) کام پر روانگی کے وقت آپ بہت مضمحل ہوتے ہیں اور واپسی پر بے حد عجلت میں اور ممکن ہے ہوا تیز چل رہی ہو جس کی وجہ سے آپ کی گفتگو رک جائے۔ پھر یکایک.... لیکن یہ معمولی مثال ہے جیسا کہ مارکسی حقیقت پسند کہتے ہیں۔ بالکل استثنائی مثال، سب سے باہر کی قطار میں ایک چھوٹا سا آدمی چل رہا ہے جس کی داڑھی گھنی اور سیاہ ہے (کیونکہ گرفتاری کے وقت اس کے چہرے پر داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور اس کی تصویر اسی کے ساتھ لی گئی تھی۔

اس لیے کیمپ میں اسے صاف نہیں کیا جا سکتا) وہ تیز چلتا ہے بڑی حد تک پروقار انداز میں اور اس کے بازو کے نیچے احتیاط سے بندھا ہوا نقشہ نویس کا کاغذ ہے۔ یہ "مصروفیت کی پیش کش" یا اس کی اپنی ایجاد ہے۔ نئی چیز جس پر اسے فخر ہے اس نے اسے کام کے دوران تیار کیا تھا اور کسی کو کیمپ میں دکھانے کے لیے لایا تھا۔ اور اب اسے اپنے ساتھ کام پر لے جا رہا ہے۔ ایکا یک شدید آندھی اسے اس کی بانہہ کے نیچے سے اڑا کر راستے میں قطار سے دور پھینک دیتی ہے۔ آرنلڈ ریپوپورٹ (قارئین اس سے پہلے ہی متعارف ہیں) اسے پکڑنے کے لیے بے اختیارانہ قدم بڑھاتا ہے' پہلا'... دوسرا... تیسرا... لیکن کاغذ اور آگے اڑ جاتا ہے دو پہرے داروں کے درمیان لیکن ان کی گرفت سے پرے۔ یہاں پہنچ کر ریپوپورٹ کو ختم ہو جانا چاہیے تھا— "ایک قدم دائیں یا بائیں" یا "رکو پھر" اور تمہیں بغیر تنبیہ کے گولی مار دی جائے گی" لیکن وہ میرا نقشہ ہے۔ یہ وہاں ہے اور آرنلڈ اس کے تعاقب میں آہستگی کے ساتھ بڑھتا ہے 'آگے جھکے ہوئے' بازو پھیلا کر۔ بد قسمتی اس کی ایجاد کو اڑائے لیے جا رہی تھی! آرنلڈ بے تابی کے ساتھ ہاتھ بڑھاتا ہے' اس کے ہاتھ ہوا کو چیرتے ہیں۔ ظالمو! میرے بلیو پرنٹ (نقشے) کو ہاتھ نہ لگانا! کالم اسے دیکھتا ہے اور از خود رک جاتا ہے بندوقیں تان لی جاتی ہیں۔ بولٹ کھڑکھڑ کرتے ہیں! تا حال ہر چیز معمول پر تھی۔ لیکن اب غیر معمولی بات ہوئی... کسی نے بھی احمقانہ رویہ اختیار نہیں کیا؟ کسی نے گولی نہیں چلائی! ظالموں نے محسوس کر لیا کہ یہ فرار کی کوشش نہیں ہے! ان کے بھس بھرے دماغوں میں بھی یہ بات فوراً آ گئی! تخلیق کار اپنی اڑتی ہوئی تخلیق کو پکڑنے کے لیے بھاگ رہا ہے۔ ریپوپورٹ مزید پندرہ قدم دوڑ کر پہرے داروں سے آگے نکل گیا۔ اس نے کاغذ کو اپنی گرفت میں لیا، کمر سیدھی کی اور بہت خوش خوش قطار میں لوٹ آیا۔

دوسری دنیا سے.... لوٹ آیا!

اگرچہ کہ ریپوپورٹ کیمپ میں اوسط مدت سے زیادہ رہ چکا تھا۔ تاریخ کی سزا' دس سال' کے بعد شہر بدر کیا گیا تھا اور اب دوسری بار دس سال کی سزا کاٹ رہا تھا۔ لیکن وہ زندگی سے معمور چست، چمکتی ہوئی آنکھوں والا آدمی تھا اور اس کی وہ آنکھیں، حالانکہ وہ ہمیشہ مسرور رہتی تھیں جو تپش برداشت کرنے کے لیے ہی بنی تھیں، نہایت جذباتی آنکھیں تھیں۔ اسے فخر تھا کہ سالہا سال کی مدت اسیری اسے بوڑھا اور بدحواس نہیں بنا سکی تھی۔ لیکن بحیثیت انجینئر اس نے ہمیشہ کسی نہ کسی تعمیری کام میں معتمد کی خدمات ہی انجام دی تھیں۔ اسی سبب سے اس کے لیے اپنے حوصلے کو برقرار رکھنا ممکن ہو سکا تھا۔

وہ اپنے کام میں عملی دلچسپی رکھتا تھا لیکن اس کے بعد اپنے لیے روحانی غذا کا بندوبست کرتا تھا۔

وہ ان پہلو دار شخصیت رکھنے والے باحوصلہ افراد میں سے تھا جو ہر چیز کو اپنانے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ ایک زمانے میں وہ میری موجودہ تصنیف جیسی کتاب لکھنے کی بابت سوچ رہا تھا جو تمام کیمپوں کے بارے میں ہو گی لیکن وہ اسے کبھی شروع نہ کر سکا۔ اس کی تخلیق اس کے ہم جیسے دوستوں کی دلبستگی کے کام آتی تھی۔ وہ کچھ عرصہ سے ایک بین الاقوامی تکنیکی حوالہ جاتی کتاب تیار کر رہا تھا جس میں جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی تمام شاخوں (ریڈیو والوں کی اقسام سے لے کر ہاتھیوں کے اوسط وزن تک تمام باتیں) کا امتزاج ہو گا اور جو جیبی سائز کی ہو گی۔ ہمارے تمسخر سے ہمت حاصل کرتے

ہوئے اس نے مجھے تنہائی میں اپنی ایک اور محبوب تخلیق دکھائی۔ اسٹینڈہال کی "آن لو" محبت کے بارے میں نامی تصنیف کو قطعاً غیر تشفی بخش پاکر اس نے ایک چمکدار سیاہ نوٹ بک پر ایک نئی کتاب قلم بند کی تھی۔ اس میں ابتدائی شکل میں نامربوط بیانات تھے۔ جس شخص نے اپنی نصف زندگی کیمپوں میں بسر کی ہو اس کے لیے یہ سب کتنی اونچی باتیں ہوں گی۔ چند مختصر مختصر اقتباسات یہاں پیش کرتا ہوں۔

عشق کے بغیر عورت سے تعلق رکھنا جسم اور روح سے کمزور لوگوں کی بدنصیبی ہے۔ پھر بھی لوگ اسے، فتح، سمجھ کر شیخی بگھارتے ہیں۔

جذبات کی ابتدائی فطری تحریک کے بغیر مباشرت سے مسرت کی بجائے ندامت اور بیزاری پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے دور کے لوگ جو اپنی تمام قوت روپیہ کمانے، مناصب حاصل کرنے اور طاقت کا مظاہرہ کرنے میں صرف کر دیتے ہیں، ان میں اعلیٰ عشق کی سکت نہیں رہ جاتی۔ دوسری طرف عورت کی صحیح رہنمائی کرنے والی حس بتا دیتی ہے کہ مباشرت تو اصل تعلقات کو استوار کرنے کی پہلی منزل ہے اس کے بعد ہی عورت مرد کو اپنا محبوب سمجھتی ہے اور اس امر کا مظاہرہ اس کے ساتھ اپنی گفتگو کے انداز سے کرتی ہے۔ جو عورت خواہش کے بغیر خود سپردگی پر آمادہ ہو جاتی ہے وہ بھی ممنونیت آمیز لطف کا احساس کرتی ہے۔

حسد بجز درح خود توصیفی ہے۔ روزانہ ملاقات نہ ہونے پر بھی حقیقی عشق حسد کا شکار نہیں ہوتا بلکہ مر جاتا ہے، بے حس ہو جاتا ہے۔

محبت بھی سائنس، آرٹ اور مذہب کی مانند گنجینۂ علم ہے۔

اس قسم کے بہت سے مختلف موضوعات میں دلچسپی رکھنے کے باعث آرنلڈ لوددیج قدرتی طور پر بڑے مختلف المزاج لوگوں کو جانتا تھا۔ اس نے میرا تعارف ایک ایسے آدمی سے کرایا جس کے پاس سے عام حالات میں میں بغیر نظر اٹھائے گزر جاتا۔ نگاہِ اول میں وہ دیگر متحرک لاشوں کی مانند ہی نظر آتا تھا جو گرسنگی کے ہاتھوں لب گور پہنچ گئی تھیں۔ اس کی ہنسلی کی ہڈی کھلی ہوئی کیمپ جیکٹ سے اس طرح نکلی ہوئی تھی جیسے وہ کسی مردے کی ٹھری ہو۔ اپنی طویل القامتی کی وجہ سے وہ عجیب الخلقت سا لگتا تھا وہ قدرتی طور پر سانولا تھا اور اس کا گٹھا ہوا سر قازقستان کی دھوپ سے مزید سیاہ پڑ گیا تھا۔ وہ تا حال کام کرنے کے لیے کیمپ سے باہر گھسٹتا ہوا چلا آتا ہے اور پیروں پر ایستادہ رہنے کے لیے اپنے کھٹلے سے لپٹا رہتا تھا۔ وہ یونانی بھی تھا اور شاعر بھی! ایک اور شاعر۔ جدید یونان میں اس کی نظموں کا ایک مجموعہ ایتھنس میں شائع ہوا تھا لیکن کیونکہ وہ ایتھنس کا باشندہ نہیں تھا بلکہ ایک سوویٹ قیدی (آزاد سوویٹ شہری) تھا اس لیے ہمارا اخبار اس کے لیے کوئی آنسو نہیں بہا سکتے۔

وہ ادھیڑ عمر کا تھا لیکن موت کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے ان خیالات کو دور کرنے کی ایک بھونڈی سی کوشش کی وہ ذہانت آمیزی سے مسکرایا اور غلط سلط روسی زبان میں اس نے مجھے سمجھایا کہ موت نہیں بلکہ اس کی ذہنی تیاری دہشت کا سبب بنتی ہے۔ اس کا خوف اور رنج اور افسوس ختم ہو چکا ہے وہ اپنے آنسوؤں کا خزانہ ختم کر چکا ہے! اپنی لازموت کا ذائقہ پہلے ہی محسوس کر چکا ہے اور اس کے لیے بالکل تیار ہے۔ اب تو اتنا ہی باقی ہے کہ اس کا جسم مرنے کا عمل مکمل کرے۔

کتنے بہت سے لوگ شاعر نکل رہے ہیں۔ بالکل ناقابلِ یقین سا محسوس ہوتا ہے (بعض اوقات
یہ بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی) وہ یونانی تورنٹ کا انتظار کر رہا ہے۔ لیکن دو نوجوان صرف اپنی سزائے
خاتمے کے منتظر ہیں اور مستقبل میں ادبی شہرت حاصل کرنے کی توقع رکھتے ہیں، وہ شاعر ہیں، علی الاعلان،
اس راز کو پوشیدہ رکھنے کی کوئی سعی نہیں کرتے۔ ان میں جو چیز مشترک ہے وہ ہے ایک قسم کی پرنور پاکیزگی
دونوں طالب علم ہیں جو بیا۔ اسے نہیں کر سکے۔ گویا بوردوکوف جو لیپاریف کا مداح ہے (اور اسی لیے
پشکن کا دشمن ہے) شعبۂ صحت میں بطور اردلی کام کرتا ہے یوروچکا کریئیف، جو تُوریکا باشندہ ہے
اور بلیک کا پرستار ہے خود بھی بلیک کی مانند لکھنے کی سعی کرتا ہے۔ انجینئرنگ ورک شاپ میں کام کرنے
کے لیے کیمپ سے باہر جاتا ہے اس کے احباب (اور کیسے عجیب دوست ہیں اس کے، عمروں میں اس سے
بیس سال بڑے اور خاندانوں کے سرپرست) اس زمانے کا تذکرہ کر کے اسے چھیڑتے ہیں۔ جب وہ کسی
شمالی علاقے کے اصلاحی مشقتی کیمپ میں تھا اور وہاں سب کے لیے دستیاب خاتون نے اپنا جسم اس
کے سپرد کرنا چاہا تھا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور وہ اس کے نام پر سانیٹ تخلیق کرتا رہا۔ اگر آپ
اس کے معصوم چہرے پر نگاہ کریں تو اس واقعہ کا یقین بآسانی کر لیں گے۔ اب اس کی پاکبازی ایک ایسا
عتاب اور بار ہے جسے کیمپوں میں تاعمر ڈھونا پڑے گا۔

کبھی لوگ آپ کی نظر میں آجاتے ہیں اور کبھی لوگوں کی نظر آپ پر اٹک جاتی ہے۔ بڑی غیر منظم
بیرکوں میں، جہاں چار صد قیدی رہتے ہیں، جو بے چینی کے عالم میں اِدھر اُدھر گھوما کرتے ہیں یا اپنے
تختۂ خواب پر پڑے رہتے ہیں، شام کے کھانے کے بعد یا بیزار کن انتظار کے وقت میں ڈبل کی لعنت کا
مطالعہ کرتے ہیں۔ یہیں ایک کتاب تھی جو میں ایک لبرٹی تک لا سکا تھا اور جہاں میں اسے مہروں سے کھدا
موٹا مواد دیکھنے پر مجبور تھا جس پر درج تھا "اسٹیپلاگ، شعبۂ تعلیم و ثقافت" میں نے کبھی اس کے
اوراق نہیں پلٹے کیونکہ شام کے آخری حصے میں میں بمشکل نصف صفحہ پڑھ سکتا تھا اس لیے میں جاتا یا
کسی خاص جزو پر غور کرتا ہوا معلوم کرنے کے لیے آگے بڑھ جاتا۔ میں نو واردین کے اس سوال کا عادی ہو
چکا تھا کہ یہ ضخیم کتاب کون سی ہے اور وہ سوچتے تھے کہ آخر میں اس ردی چیز کا مطالعہ کیوں کرنا چاہتا ہوں
میں اس کا جواب ایک مذاق سے دیا کرتا تھا "کوئی نیا فقرہ سیکھنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے"

لیکن اس کتاب کی وجہ سے بہت سے دلچسپ اشخاص سے میرا تعارف بھی ہوا۔ مثلاً پالتو
مرغ جیسا پستہ قامت آدمی جس کی ناک بہت بڑی تھی اور تیکھا چہرہ مسخرگی کا انداز رکھتا تھا۔ میرے
پاس آیا اور گونجتی ہوئی مترنم آواز میں شمالی لہجے میں بولا:

"کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ کے پاس یہ کون سی کتاب ہے؟"

ہمارے درمیان کچھ آواز کا کچھ الفاظ کا لین دین ہوا اور پھر جیسے اتوار کے بعد اتوار اور مہینے
کے بعد مہینہ آتا ہے، اس ایک آدمی کی ہستی میں میرے لیے ایک ایسی چھوٹی کائنات کا باب کھل گیا
جس میں میرے وطن کی نصف صدی کی تاریخ کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی۔ واسیلی گرگوریوچ پالاسوف
(وہی جو کاڈی مقدمے میں ماخوذ تھا اور تا حال ۲۰ میں سے ۱۴ سال کی قید کاٹ چکا تھا) اپنے آپ کو

ماہر اقتصادیات اور سیاست داں تصور کرتا تھا اور اسے یہ غرور بھی نہیں ہے کہ وہ ہی لفظوں کا جادوگر ہے۔ صوتی الفاظ کا۔ وہ مجھے (الیں سو کبی گماس) تیار کرنے کے بارے میں مطلع کرے یا تاجروں کی دکانوں کی بابت ' (اس نے لڑکپن میں ایک دکان میں کام کیا تھا) سرخ فوج کے کسی دستے کے بارے میں بات کرے یا قدیم دیہی مکان کے بارے میں' مفرورین کو گرفتار کرنے والی صوبائی تنظیم کے جلاد کے متعلق بتائے یا کسی چھوٹے قصبے کی جنسی اعتبار سے تشنہ عورت کے بارے میں گفتگو کرے' میں ان تمام امور کو مختصر سے الفاظ میں سمجھ لیتا ہوں۔ اور اس خوبی کے ساتھ ذہن نشین کر لیتا ہوں جیسے یہ باتیں خود میرے تجربات کا حصہ ہوں۔ میں یہ سب کچھ فوراً قلم بند کر لینا چاہتا تھا لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا میری خواہش ہے کہ وہ سب کچھ مجھے مزید دس سالوں کا لفظاً بہ لفظاً یاد رہے جو ظاہر ہے کہ ممکن نہ ہوگا۔

میں نے تاڑ لیا کہ ایک آدمی اکثر چوری سے مجھ پر اور میری کتاب پر نگاہ رکھتا تھا لیکن گفتگو کرتے ہوئے حجاب محسوس کرتا تھا۔ چھریرے بدن' تیکھے نقش و نگار اور لمبی ناک والا نوجوان جس کی ملائمت بلکہ نکلف ان حالات میں عجیب سے نظر آتے تھے۔ میں نے اس سے بھی تعارف حاصل کر لیا۔ وہ روسی زبان کے الفاظ ٹٹولتا ہوا' ہلکی محجوب آواز میں گویا ہوا۔ وہ روسی زبان کی کئی ایسی غلطیاں کرتا تھا کہ آدمی لوٹ پوٹ ہو جائے لیکن مسکرا کر انھیں بروقت درست کر لیتا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ ہنگرین تھا اور اس کا نام جانوس روز ساس تھا۔ میں نے ڈبل کی لعنت دکھائی۔ تو اس نے ایک واقف کار کے انداز میں سر کو جنبش دی میری نگاہیں اس کی پرشکن، کیمپ کی زندگی کے باعث مضمحل چہرے پر مرکوز تھیں۔ "ہاں۔ ہاں" اس نے کہا "آدمی کو اپنی توجہ بانٹنے کے لیے دوسری اشیاء کی بابت سوچنا چاہیے اور ہر وقت اپنے کھانے کی ہی فکر میں نہ رہنا چاہیے۔" اس کی عمر صرف ۲۵ سال کی تھی لیکن اس کے رخساروں پر شباب کی سرخی نہ تھی۔ خشک پپڑیوں دار جلد جسے آندھیوں نے کانچ کی طرح شفاف بنا دیا تھا۔ یہ جلد اس کے کاسۂ سر کی لمبی تنگ ہڈیوں پر منڈھی ہوئی سی نظر آتی تھی جس کی تہہ میں ذرا سا بھی گوشت نہیں نہ تھا اس کے جوڑ درد کرتے تھے۔ اسے شمال میں درخت کاٹتے ہوئے موسمی بخار ہو گیا۔

کیمپ میں اس کے دو تین ہم وطن موجود تھے لیکن ان کے دماغ دن بھر ہر لمحہ اس فکر میں غرق رہتے تھے کہ زندہ کس طرح رہیں اور پیٹ بھر غذا کیسے حاصل کریں۔ جانوس تو وہی کچھ زہر مار کر لیتا تھا جو فورمین اس کے لیے لے آتا تھا اور ہر چند کہ وہ بھوکا رہتا تھا لیکن پھر بھی اس نے مزید خوراک حاصل کرنے سے باز رہنے کا اصول بنا رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں اور کان ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ وہ سمجھنا چاہتا تھا۔ آپ پوچھتے ہیں کیسے؟ کہا! وہ ہم روسیوں کو سمجھنا چاہتا تھا۔

جب میں یہاں لوگوں سے واقف ہوا تو میری زندگی بے لطف ہو گئی۔ مجھے نہایت حیرت ہے وہ اپنے لوگوں سے محبت کرتے تھے اس لیے گزر گاہ کی سزا پائی لیکن میں سوچتا ہوں کہ یہ زمانۂ جنگ کی افراتفری ہے' کیوں؟ (وہ یہ سوال ۱۹۵۱ء میں کرتا ہے! اگر اس وقت یہ زمانۂ جنگ کی افراتفری تھی تو پھر اس کا آغاز پہلی جنگ عظیم سے ہوا تھا..... ؟)

۱۹۴۴ء میں جب ہماری سپاہ نے ہنگری میں اسے گرفتار کیا' وہ اٹھارہ سال کا تھا اور فوج

میں نہیں تھا) ابھی مجھے لوگوں کا بُرا یا بھلا کہنے کا موقع ہی نہ ملا تھا" اس نے زیرِ لب تبسم کے ساتھ کہا" لوگوں کو مجھ سے سود و زیاں کچھ نہ ملا تھا"۔ جانوس سے تفتیش اس طرح کی گئی۔ تفتیش کنندہ کو ہنگرین زبان کا ایک لفظ بھی نہ آتا تھا اور جانوس روسی زبان سے نابلد تھا۔ بعض اوقات انتہائی خراب قسم کے ترجمان آئے جو کارپیتھین یوکرینی تھے: جانوس نے سولہ صفحات کے ایک بیان پر دستخط کیے لیکن اسے قطعی علم نہ تھا اس میں کیا درج ہے۔ اسی طرح جب ایک اجنبی افسر نے اسے ایک کاغذ کے ٹکڑے سے کچھ پڑھ کر سنایا تب بھی اسے محسوس نہیں ہوا کہ یہ اسپیشل بورڈ کی طرف سے اس کی سزا کا فیصلہ ہے۔[۵۵] انھوں نے اسے شمالی علاقے میں درخت کاٹنے کے لیے بھیج دیا اور وہاں وہ لب گور پہنچ گیا۔ چنانچہ اسے ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔

اس وقت روس نے اسے اپنا صرف ایک ہی رخ دکھلایا تھا (وہ رخ، جو بیٹھنے کے عالم میں تھا) لیکن اس نے اب دوسرا پہلو بدلا۔ سولیکامسک کے نزدیک علیحدہ کیمپ کے علاقے میں بنے ہوئے ہسپتال میں ایک ۵۹ سالہ نرس تھی جس کا نام ڈوسیا تھا۔ وہ غیر سیاسی مجرم تھی لیکن پیشہ ور بدمعاشوں کے گروہ میں نہ تھی اور پانچ سال کی قید کاٹ رہی تھی۔ اسے باہر جانے کا پروانہ دیا گیا تھا۔ وہ تصور کرتی تھی کہ اس کا کام صرف یہی نہیں ہے کہ جو کچھ مل سکے زہر مار کرے اور اپنی سزا کی میعاد مکمل کرے۔ (کیمپوں میں یہ خیال بے حد عام ہوتا ہے۔ ہر چند کہ جانوس اپنی رجائی نظریات کی وجہ سے اس سے لاعلم تھا) بلکہ ان بیکارہ قریب المرگ لوگوں کو دیکھ بھال کرنا بھی اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ جو کچھ ہسپتال سے فراہم کیا جاتا تھا وہ انھیں زندہ رکھنے کے لیے ناکافی ہوتا تھا اس لیے ڈوسیا اپنا صبح کا ۴۰۰ گرام راشن گاؤں میں دے کر اس کے معاوضے میں نصف لیٹر دودھ لے آتی تھی اور اس دودھ سے اس نے جانوس کو نئی زندگی عطا کی (جیسے کہ اس نے جانوس سے پہلے دوسرے لوگوں کی خدمت کی تھی)[۵۶] اس مادرانہ شفقت رکھنے والی خاتون کے طفیل جانوس کو روس اور تمام روسیوں سے عشق ہو گیا اس نے جانفشانی کے ساتھ کیمپ کے وارڈروں اور پہرے داروں کی زبان، عظیم اور پرشکوہ روسی زبان سیکھنی شروع کر دی۔ اس نے ہمارے کیمپوں میں نو سال گذارے اور روس کے دیہی حصے دیکھ سکا جو قیدیوں کی ریل گاڑی سے یا باتصویر پوسٹ کارڈوں پر اور کیمپ میں نظر آتے تھے۔ اس کے باوجود وہ روس سے محبت کرتا تھا جانوس اس طبقہ سے تعلق رکھتا تھا جو ہمارے عہد میں کمیاب ہوتا جا رہا ہے:" وہ لوگ ہیں جنھیں بچپن میں صرف پڑھنے کے نشہ ہوتا ہے اس نے یہ عادت بالغ ہو کر کیمپوں میں بھی برقرار رکھی۔ شمال میں اور ایکی بستنرا اسپیشل کیمپ میں وہ تازہ علم حاصل کرنے اور پڑھنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔ جب میں اس سے متعارف ہوا اس وقت وہ بشکن نیکراسوف اور گوگول کو جانتا اور پسند کرتا تھا۔ میں نے اسے گریبویدوف کی تخلیقات سمجھائیں لیکن دوسروں کی بنسبت، شاید پیٹوفی اور ارانی سے بھی بڑھ کر وہ لرمونتوف کا پرستار بن گیا جسے اس نے پہلی بار قید میں کچھری دو قتبل پڑھا تھا۔[۵۷] جانوس نے مشتری[۵۸] کے ساتھ اپنا ذہنی رشتہ بخوبی استوار کر لیا تھا۔ وہ اس کی مانند قیدی، نوجوان اور نفسی کا شکار تھا۔ اس کی تخلیقات کا بیشتر حصہ اسے ازبر تھا اور جب کئی برسوں تک وہ غیر ملکیوں

کے ایک کالم میں پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ اس اجنبی سرزمین پر اپنے آپ کو گھسیٹتا رہا
تو اجنبیوں کی زبان میں از خود یہ مصرعے گنگنایا کرتا تھا:

شبہات سے ملول دل نے تسبھی کہا تھا۔
اب مادرِ وطن کی خاک قدموں سے کبھی نہ لگے گی۔
زندگی بھر!

وسیع النظر، ملنسار، امداد اور ہلکی ہلکی نیلی کمزور آنکھیں۔ ہمارے سنگدل کیمپ میں جانوس روزساس کا یہ حال تھا وہ میرے تختۂ خواب کے ایک کنارے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا اور احتیاط کے ساتھ کہ جیسا میرا ارادہ کا پورا اور زیادہ گندہ ہو جائے گا اور اس کے بوجھ سے بے ڈول ہو جائے گا۔ وہ پرخلوص جذبے کے ساتھ نرم آواز میں کہتا

میں اپنے پوشیدہ جواب کیسے دکھاؤں؟
اس نے کبھی کسی بات کی شکایت نہیں کی۔

کیمپ کے لوگوں میں گھومتے ہوئے ایسا لگتا ہے۔ جیسے آپ کسی کان کے علاقہ میں ہوں ان میں سے ہر ایک کی تصویر آپ کی چھٹی حس اس خوف کے تحت کھینچ رہی ہے کہ کہیں میں دھماکے کے ساتھ اڑ نہ جاؤں۔ احتیاط کے اس عالم اصول پر کاربند رہنے کے باوجود کتنی مرتبہ مجھے کسی زنگ کی گھسی ہوئی کھوپڑی اور سیاہ جیکیٹ کے پیچھے کسی ــــ شاعرانہ شخصیت کے دیدار ہوئے ہیں۔

اور کتنے آدمیوں نے اپنا راز پوشیدہ رکھا؛
اور کتنے ہی ــــ یقیناً ان سے ہزار گنا لوگ ــــ کبھی میری راہ میں ہی نہیں آئے۔
اور ان دہائیوں میں تو نے کتنے لوگوں کو پارہ پارہ کر دیا؛ او بدنام ابلیسی حکومت!

ایکی بستر میں ثقافتی امور کے لیے ایک سرکاری لیکن نہایت خطرناک مرکز ایکی تھا۔ شعبۂ تعلیم و ثقافت جہاں وہ کتب پر سیاہ لفظوں کی مہریں ثبت کر دیتے تھے اور ہمارے نمبروں کی تجدید کرتے تھے۔
ہماری سی۔ اے۔ ایس میں ایک بے حد رنگین آدمی تھا ڈلا ڈیمر روڈ چک جو اس وقت فنکار رہتا تھا، لیکن پہلے آرک ڈیکن (پادری) رہ چکا تھا اور شاید میٹرپارک (روسی عیسائیوں کے مذہبی رہنما) کا پرسنل سکریٹری بھی تھا۔ کیمپ کے ضابطے میں کہیں کوئی ایسی رعایت چلی آتی تھی کہ مذہبی اداروں کا اراکین کے سر نہ منڈ ھلائے جائیں گے۔ بلاشبہ یہ اصول کبھی شائع نہ کیا گیا اور جو پادری اس سے ناواقف ہیں ان کے سر مونڈھ دیے جاتے ہیں لیکن روڈ چیکو اپنے حقوق کا علم تھا اور مردوں کے لحاظ سے اس کی غیر معمولی لمبی گھونگھریالی سرخ بھوری لٹیں تراشی نہیں گئی تھیں۔ وہ ان کی بڑی حفاظت کرتا تھا اور عموماً اپنے ظاہری حسن کی بھی۔ وہ طویل القامت سڈول اور پرکشش آدمی تھا اور اس کی آواز میں مٹھاس تھی۔ کسی وسیع کلیسا میں مناجات پڑھاتے ہوئے عالم تصور میں اسے بآسانی دیکھا جا سکتا تھا۔ ڈریزدوف نے، جو چرچ وارڈن تھا اور میرے ساتھ ہی ایکی بستر آیا تھا، آرک ڈیکن کو فوراً ہی پہچان لیا جو پہلے روڈ لیک کے بڑے کلیسا میں کام کر چکا تھا۔

یہاں کیمپ میں وہ نہ تو ہمارے مجرم دنیا کا آدمی سمجھا جاتا تھا نہ ان کی مانند رہتا تھا۔ وہ ان مستثنیٰ افراد میں سے تھا جنہوں نے حکومت کی نگاہ میں معتوب ہوتے ہی ازخود آرتھوڈاکس چرچ میں داخلہ لے لیا تھا یا جنہیں اس میں داخل کر دیا گیا تھا۔ انھوں نے کلیسا کو بدنام کرنے کے لیے بہت کچھ کیا۔ روڈ چیک جیل کیسے پہنچا یا کہانی کچھ پر اسرار ہے کسی وجہ سے وہ ایک تصویر (جو سمجھ میں نہیں آتا اس کے پاس کیسے چھوڑ دی گئی) دکھاتا رہتا تھا جس میں وہ اور روسی آرتھوڈاکس کلیسا کا جلا وطن میٹرو پولیٹن اناتاسی نیویارک کی ایک سڑک پر نظر آ رہے تھے۔ کیمپ میں اسے ذاتی کیبن مل گیا تھا۔ جب کام پر جانے والے لوگوں کی قطار بندی سے جس میں وہ حقارت کے ساتھ ہماری ٹوکریاں جیکٹوں اور پتلونوں پر نمبر پینٹ کرتا تھا، فارغ ہو کر پلٹتا تو سارا دن بیکاری میں گزارتا۔ بعض اوقات وہ مقبول کشش تصویروں کی بھونڈی سی نقلیں تیار کرتا تھا۔ اسے زیشیاگوف گیلری کی تصویر کی ایک جلد اپنے پاس رکھنے کی اجازت حاصل تھی۔ اور انھیں کے وسیلے سے میں اس کے قریب پہنچا تھا۔ میں ان تصویروں پر ایک اور نظر شاید آخری نظر ڈالنا چاہتا تھا اس کے پاس ماسکو ٹیٹر پارک دفتر کا بلیٹن کیمپ میں آیا کرتا تھا اور وہ کبھی کبھی عزیم شہداء کے متعلق طریق مناجات کی تفصیل بڑے فخر کے ساتھ بیان کیا کرتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ بے صد پر تصنع عمل تھا۔ اس کے پاس ایک گٹار بھی تھا اور جو واحد کام وہ صدقِ دل سے کیا کرتا تھا وہ تھا اپنے ہی ساز پر سریلی آواز میں نغمہ سرائی۔ اس وقت بھی اس کا سوز اس امر کے اظہار کے لیے کوشاں رہتا کہ وہ مجرم کے کرب کا تاج زیب سر کیے ہوئے ہیں۔

کوئی شخص کیمپ میں جتنے ٹھاٹ کے ساتھ رہتا ہے اسی اعتبار سے اسے زیادہ کوفت اٹھانی پڑتی ہے......

ان دنوں میں ہر درجے محتاج رہا کرتا تھا۔ میں پھر کبھی روڈ چیک سے ملاقات کو نہیں گیا اسے اپنے بارے کچھ بتایا تھا۔ اور ایک بے مزہ حقیر کیڑے کی حیثیت سے اس کی نگاہ سے بچ گیا۔ روڈ چیک کی نگاہ سرکاری حفاظتی پولیس کی نگاہ تھی۔

خواہ کچھ ہو، کیمپ کا ہر قدیم باشندہ واقف تھا کہ سی۔ اے۔ ایس میں مخبر بھرے پڑے تھے اور وہ نئے شناسا اور رسائی بنانے کے لیے سب سے زیادہ نامناسب مقام تھا۔ مشترکہ اصلاحی مشقت کیمپوں میں سی۔ ای۔ ایس قیدیوں کو عورتوں اور مردوں کی جائے صحبت کے اعتبار سے پرکشش نظر آتا تھا لیکن کنوارگا میں وہاں جانے کے لیے کیا کشش ہو سکتی تھی؟

معلوم یہ ہوا کہ کنوارگا کا سی۔ ای۔ ایس بھی (ہر چند کہ وہاں مخبروں کی بہتات تھی۔) آزادی کے حق میں کارآمد ہو سکتا تھا۔ یہ بات مجھے جارج میلینو ٹیوڑر۔ کشکن اور زوضیا کمیشن سے معلوم ہوئی۔

میلینو سے پہلی ملاقات سی۔ ای۔ ایس میں ہی ہوئی تھی اور وہ سرسری سے مختصر ملاقات میرے دل میں دور تک نقش ہو گئی۔ کیونکہ میلینو خود حافظے میں پیوست ہو جانے والا آدمی تھا۔ وہ دبلا پتلا کھلاڑیوں کا سا ڈھانچہ رکھنے والا شخص تھا۔ نا معلوم کیوں انھوں نے اس کی بہری فوجیوں والا کوٹ اور برجیس نا حال نہ لیا اتروائی تھی (کچھ عرصہ قبل گزشتہ ایک ماہ سے اپنے ہی کپڑوں میں ملبوس تھے) اور ہر چند شانے پر لگائی جانے والی کیپٹن سکینڈ کلاس کی پٹیوں کی جگہ وہ کئی مقامات پر ہو الیس کے ایچ بادن کے ہندسے لگا تا تھا

لیکن وہ اس کا ہر عضو بحری افسر کا تھا، جو کسی بھی لمحے میں جہاز پر سوار ہونے کے لیے مستعد ہو۔ جب نہلانے دھلانے سے اس کی آستین کلائیوں پر اوپر چڑھ جاتی تھیں تو بازو پر سرخ روئیں اور گودنے کے نشانات نظر آتے تھے ایک بازو پر لفظ "آزادی" ایک لنگر کے ارد گرد گودا ہوا تھا اور دوسرے پر "گرد یا مرد" انگلش میں لکھا ہوا تھا ٹیٹو اپنی آنکھوں کی تیزی اور ان میں موجود فاخرانہ جھلک کو پوشیدہ رکھنے کے لیے اپنی پلکیں یا پتلیاں نیچے کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اور دوسری چیز جسے وہ چھپانے سے قاصر تھا اس کی روشن مسکراہٹ تھی (میں ابھی یہ بات نہ جانتا تھا لیکن اس تبسم کا مطلب تھا میرے فرار کا منصوبہ مکمل ہے!)

یہ ہے کیمپ آپ کے لیے ــــ ایک معدنی کان جیسا۔ ٹیٹو اور میں دو نو وارد تھے لیکن پھر بھی دور دور تھے ہم۔ مشرقی پروشیا کی سڑکوں پر پڑا ہوا تھا اور وہ اپنی اگلی سیاحت کی راہ میں۔ ہم دونوں کے قلب پراسرار خیالات سے لبریز تھے لیکن جب ہم مصافحہ کرتے تھے یا معمولی علیک سلیک کرتے تھے تو تھوڑی سی چنگاری بھی ہاتھ سے ہاتھ یا آنکھ سے آنکھ میں منتقل نہیں ہوتی تھی! ہم کوئی غیر اہم بات کہتے، میں اپنی ذات کو اپنے اخبارات میں محو کر لیتا تو یارنکو کے ساتھ غیر پیشہ ور ڈرامائی پیش کش کے بارے میں باتیں کرنے لگتا تھا، جو سیاسی قیدی تھا۔ اور پندرہ برس کے لیے آیا تھا۔ لیکن پھر بھی سی ماں۔ ایس کا انچارج تھا اور بڑا پہلودار الجھا ہوا آدمی تھا میں سمجھتا تھا کہ مجھے اس کا اصل معلوم ہے لیکن میرے پاس اس کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ــــــ

یہ بات مضحکہ خیز سی تو لگے گی لیکن وہاں کنڑ گا میں ایک کنسرٹ گروپ ایک اداکاروں کا دستہ بھی تھا جو سی۔ ای۔ ایس سے ملحق تھا یا یوں کہیے کہ ابھی قائم ہو رہا تھا! اس کا رکن بننے سے وہ حق یا حقوق نہیں ملتے تھے، جو اصلاحی مشقت کیمپوں میں مل جاتے تھے۔ قیدی کو کسی بات کی رعایت نہیں دی جاتی تھیں اس لیے لا علاج شوقین ہی اس دستے میں شامل ہونے کی آرزو کر سکتے تھے۔ ایسا نظر آتا تھا کہ ان میں ٹیٹو بھی تھا اگرچہ اسے دیکھ کر آپ اسے برتر درجے کا انسان کہتے علاوہ ازیں جب وہ ایکی لیٹنز میں آیا اسی وقت سے وہ تعزیزی کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا۔ وہ ٹیسٹ اس نے اپنے آپ کو سی۔ ای۔ ایس کے پیش کیا! عہدے داران نے اس بات کو اصلاح کے جذبے کی علامت تصور کیا اور اسے حصہ لینے کی اجازت مل گئی.....

پینٹیا کلنکن، سی ای۔ ایس کا سرگرم کارکن نہیں تھا لیکن کیمپ کا سب سے مشہور آدمی تھا۔ تمام ایکی لیسٹز اسے جانتا تھا۔ جاتے کار اس کی موجودگی پر فخر کرتی تھی۔ کلنکن قرب و جوار میں ہو تو کوئی شخص بے زاری کا احساس نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سر پھرا معلوم ہوتا تھا اور تضحیک کا نشانہ بننے کے لیے آمادہ رہتا تھا۔ حالانکہ وہ کامیڈین کا ایک کردار ادا کرتا تھا لیکن ہر شخص تسلیم کرتا کہ "وہ ہم میں بہتوں کے مقابلے میں زیادہ ہوشمند ہے"۔ وہ اسی قسم کا کامیڈین تھا جیسے پریوں کی کہانی کا برادر خورد "بھولا" آدمی۔ روس میں کلنکن جیسے کردار قرون اولیٰ سے چلے آتے ہیں۔ وہ بد کردار اور طاقتور آدمیوں کو بآواز بلند صداقت سے آگاہ کرتے ہیں، وہ لوگوں کو ان کی وہی شکل دکھاتے ہیں جو ان کی اصل شکل ہے۔ اور یہ سب کچھ مسخرگی کے انداز میں، جس سے انھیں کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔

اس کا ایک خاص اسٹائل یہ تھا کہ وہ کامیڈین کی طرح بے ڈھنگی سینسر جیکٹ زیب تن کرتا تھا اور میزوں سے جھوٹے برتن اٹھاتا تھا۔ یہ از خود ایک دلچسپ کھیل تھا! کیمپ کا مشہور ترین آدمی جھوٹے برتن

اشتہا رہے تاکہ بھوک سے نہ مر جائے۔ ایسا کرنے کا ایک اور سبب بھی تھا کہ جب وہ میزوں کے چار جانب تھرکتا پھرتا تھا اور سب کا مرکز توجہ ہوتا تھا تو وہ کام کرنے والے قیدیوں سے شانے ٹکراتا اور ان میں باغیانہ خیالات کی تخم ریزی کرتا تھا۔

وہ جھپٹ کر میز سے کوئی ایسا پیالہ اٹھا لیتا جس کا سامان ابھی چکھا بھی نہ گیا ہو۔ قیدی ابھی اس کا شوربہ ہی سڑپ رہا ہو۔ قیدی چونک کر پیالہ پکڑ کر جاتا ہے اور کشکن مسکرا کر اسے چھوڑ دیتا ہے (اس کا چہرہ گول تھا لیکن اس میں قدرے سختی تھی) "جب تک کوئی تمہارے کھانے پر ہاتھ نہ ڈالے۔ اس وقت تک تم خود کسی چیز کو نہیں سنبھالتے۔"

اور وہ اپنا طشتریوں کا انبار سنبھالے رقص کرتا ہوا آہستگی سے آگے بڑھ جاتا۔

وقت ختم ہونے سے قبل کشکن کا مذاق کارکن دوسرے گروہوں میں گشت کر رہا ہوگا۔

کبھی وہ میز سے دوسرے جانب جھکتا ہے اور باقیماندہ لوگ اپنی پلیٹوں سے نظر ہٹا کر اس کی طرف تکتے ہیں۔ کھلونے کی بلی کی مانند اپنی بیضاوی آنکھیں گھما کر جن میں مسخرہ پن جھلکتا رہتا ہے، کشکن کہتا ہے۔

سنو لڑکو! اگر باپ احمق اور ماں فاحشہ ہو تو بچوں کو روٹی ملے گی یا وہ بھوکے رہیں گے؟

معقول جواب ملنے کا انتظار کیے بغیر وہ میز پر رکھے ہوئے مچھلیوں کی ہڈیوں کے انبار کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے: "سات سے آٹھ ارب پود (روس میں رائج تقریباً نصف من کا وزن) ہر سال کو بیس کروڑ سے تقسیم کرو۔"

اور وہ چل پڑتا ہے۔ سیدھی سی بات تھی۔ ہم میں سے کسی نے بھی پہلے اس نکتہ پر خود کیوں نہیں کیا! بہت عرصے قبل یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ ہمارے ہاں ہر سال آٹھ ارب پود اناج کی پیداوار ہو رہی ہے۔ جس کا مطلب تھا ہر آدمی کے حصے میں جن میں بچے بھی شامل تھے، روزانہ تقریباً ۲ کلوگرام غلہ آتا تھا۔ ٹھیک ہے ہم خوش خوراک لوگ ہیں جو تمام دن زمین کھودتے ہیں — لیکن ہمارا حصہ کہاں ہے؟

کشکن اپنے موضوعات تبدیل کرتا رہتا تھا کبھی کبھی وہ اپنے خیالات دوسرے انداز میں پیش کرتا تھا۔ کسی بھی مسئلے پر لیکچر دے کر — جب قیدیوں کی قطار میں گارڈ ہاؤس کے سامنے جائے تعمیر یا کیمپ میں انتظار کے عالم میں کھڑی ہو تمہیں اس وقت گفتگو کرنے کی اجازت تھی — ان اوقات کو وہ ہمارے سامنے تقریر میں صرف کرتا تھا۔ اس کا ایک باقاعدہ نعرہ تھا: "تعلیم حاصل کرو! میں کیمپ میں چاروں طرف گھومتا ہوں اور دستیاں دیکھتا ہوں۔ تم سب چہروں سے کتنے جاہل نظر آتے ہو۔ کیا تم اپنے جسم کے گوشت کے سوا اور کسی چیز کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے؟"

ورنہ وہ بلاوجہ زکیوں کے گروہ پر برس پڑے گا: "دارڈینیل! ہائی روٹ!" الفاظ کا کچھ مفہوم سمجھ میں نہ آتا تھا لیکن وہ ایک بار چیخنے کے بعد سب سمجھ گئے کہ "دارڈینیل" کون تھا اور یہ بات اتنی برمحل اور عجیب لگتی تھی کہ ہر شخص کو اپنے چہرے پر دھکیاں دیتا ہوا سرخیں نظر آنے لگتی تھیں — "دارڈینیل!"

ایک افسر نے گارڈ ہاؤس کے باہر کشکن کو آواز دی۔ وہ تکان دور کرنے کے لیے اس سے کہنے لگے

سینے کا خواہشمند تھا کشکن۔۔ تیری توند گالی) تو گنجا کیوں ہے کیا تجھے گھن لگ گیا ہے کشکن نے فی البدیہہ اور بآوازِ بلند جواب دیا ۔۔ "تو کیا ولاڈیمیر ایلیچ کا سر اسی وجہ سے گنجا ہو گیا تھا؟"

یا پھر کبھی وہ باورچی خانے کے چاروں طرف یہ اعلان کرتا ہوا چکر لگاتا کہ بعد از طعام وہ تمام نوجوان لوگوں کو چارلسٹن (ایک قسم کا رقص کی تربیت دے گا)

اچانک ـــــ انتہائی حیرت ناک ـــــ ایک فلم آئی ہے۔ یہ شام کو اسی پرانے میس کے جھونپڑے میں پردے کے بغیر سفیدی پتی ہوئی دیوار پر دکھائی گئی تھی۔ جھونپڑے میں بے حد ہجوم تھا لوگ بنچوں پر، میزوں پر، بنچوں کے درمیان ایک دوسرے پر لدے پڑے رہے تھے لیکن ابھی فلم تھوڑی دیر ہی چلی تھی کہ روک دی گئی۔ دیوار پر سفید شعاعوں کا سلسلہ پھیلتا رہا اور ہم نے دیکھا کہ کئی وارڈر اندر آ گئے ہیں اور سب سے زیادہ آرام دہ جگہیں تلاش کر رہے ہیں۔ انھوں نے ایک بنچ منتخب کی اور قیدیوں کو حکم ملا کہ اسے خالی کر دیں۔ قیدیوں نے وہیں بیٹھے رہنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے برسوں سے کوئی فلم نہیں دیکھی تھی! وارڈروں کی آوازوں میں تحکم پیدا ہو گیا اور کسی نے کہا: "ٹھیک ہے" ان کے نمبر لے لو!" اب کوئی چارہ نہیں تھا، انہیں جگہ چھوڑنی پڑی اور اس لمحے ایک مانوس تضحیک آمیز، جیسے کسی بلی کی آواز ہو" تاریک ہال میں سنائی دی۔

اب، لڑکو، دراصل تم تو جانتے ہی ہو، وارڈر بچارے اور کہیں تو فلم نہیں دیکھ سکتے ـــــ آؤ ہم چلیں۔

وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ مزاح میں کتنی قوت تھی! تمام طاقت وارڈروں کے پاس تھی لیکن وہ نمبر نوٹ کرنے کی جگہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

کشکن کہاں ہے؟ وہ چیخے

اب کشکن چپ تھا۔ کشکن غائب تھا

وارڈر چلے گئے اور فلم چلتی رہی۔

اگلے دن کشکن کو ڈسپلن افسر کے روبرو طلب کیا گیا۔ کوئی شک نہ تھا کہ اسے پانچ دن کی قید تنہائی ہو گی! مگر نہیں۔ وہ مسکراتا ہوا واپس آ گیا۔ اس نے تحریری صفائی پیش کی تھی: وارڈروں اور قیدیوں میں فلم شو کے سلسلے میں ہونے والی تکرار کے دوران میں نے قیدیوں سے کہا کہ تم اپنی سیٹیں چھوڑ دو کیونکہ انھیں چھوڑ دینی چاہیئے اور یہاں سے چلو! اس میں قید تنہائی کا سزا کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

قیدیوں کا فلم شو کے لیے غیر معقول جوش و خروش، ان کا اپنے آپ کو اپنے غموں کو، اپنی توہین کو فلم کی خاطر بھلا دینا، جو تحیر آمیز نہیں یہ دکھاتی تھی کہ دنیا میں سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے یا عملی صورت میں تھوڑی سی بے ہودگی دیکھ کر برداشت کر لینا کشکن کے عمدہ طنز کا ایک اور موضوع تھا کسی فلم شو یا کنسرٹ (غنائی رقص سے پہلے ناظرین بھیڑوں کی طرح جھنڈ بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں وقت گزر رہا ہے اور دروازے ابھی بند ہیں چونکہ وہ ہیڈ وارڈر کے منتظر ہیں۔ غلاموں کی طرح ہجوم بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسروں کی پسلیاں دباتے ہوئے۔ کشکن ہجوم کے پیچھے پہنچ کر اپنے جوتے اتار دیتا ہے اپنے ساتھی کے ہاتھ کا سہارا لے کر ساتھ والے کے کندھوں پر پہنچ جاتا ہے اور جلدی جلدی ایک کے شانے سے دوسرے کے شانے پر لڑھکتا ہوا پورے ہجوم کو پار کر کے اس جنت کے دروازے پر جا پہنچتا ہے! وہ دستک دیتا ہے۔ ۱، ۲، ۱ کا۔

چھوٹا سا جسم اندر داخل ہونے کے لیے بے صبری کا مظاہرہ کرتا ہوا سرے پیر تک تکلیف سے اینٹھ لگتا ہے۔ پھر وہ اتنی ہی تیزی کے ساتھ شانہ بشانہ دوڑتا ہوا واپس آتا ہے اور نیچے کود جاتا ہے۔ پہلے ہجوم قہر ہنستا ہے پھر وہ گہری ندامت کا احساس کرتے ہیں۔ ہم بھیڑوں کی مانند یہاں کھڑے ہیں ٹھیک ہے اس سے تو ظلم ہی دیکھو!

وہ منتشر ہو جاتے ہیں۔ جب وارڈر فہرستیں لے کر آتے ہیں تو کوئی بھی دروازہ توڑ ڈالنے کی کوشش کرتا ہوا نہیں ملتا۔ دراصل وہاں داخل ہونے کے لیے کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ اگر انھیں تماشبین درکار رہیں تو انھیں گھیر کر لانا ہوگا۔

ایک دوسرے موقع پر ایک کنسرٹ میس کے طویل و عریض ہال میں ابھی شروع ہی ہو رہا تھا وہ سب اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ کشکن کنسرٹ کا بائیکاٹ ہونے والوں میں نہیں تھا وہ وہاں آیا تھا اور اپنی سبز جیکٹ زیب تن کیے کرسیاں لا لا کر فراہم کر رہا تھا، پردہ پیچھے کھینچنے میں معاونت کر رہا تھا جب کبھی وہ نظر آتا لوگ تالیاں بجاتے تھے اور ہال میں دو تین بار نعرۂ مسرت بلند کرتے تھے اچانک وہ اسٹیج کے اگلے حصے کے ادھر ادھر دوڑتا ہے جیسے کوئی اس کے تعاقب میں ہو اور بطور تنبیہ ہاتھ ہلاتے ہوئے کہتا ہے: "وارڈ ینل وہیں رہو!" قہقہوں کی بوچھار، پھر کچھ تذبذب پیدا ہو گیا: لیکن اسٹیج خالی تھا۔ کشکن دوڑتا ہوا اسٹیج پہ آ جاتا ہے۔ تماشبین ہنسنے لگتے ہیں لیکن ذرا ان کی آنکھوں میں تیز چمک نظر آتی ہے، وہ کھسیانا سا نظر آنے لگتا ہے اور چاروں جانب بغیر دیکھے نگاہیں گھما کر لرزیدہ آواز میں یہ نظم سناتا ہے:

نظر اٹھاتا ہوں تو کیا منظر میرے سامنے ہے
پولیس کی لاٹھیوں سے بہا خون بہا۔
سڑکوں پر انبار لگے ہیں مردوں اور نیم جانوں کے
بیٹا یہاں، باپ وہاں،
قتل کے شکار، بڑے ...

یہ یوکرینیوں کے لیے تھا جن کی تعداد تماشبینوں میں نصف تھی انھیں حال ہی میں مظلوم علاقوں سے لایا گیا تھا اور کشکن کا یہ عمل تازہ زخم پر نمک پاشی کے مترادف تھا۔ وہ غرّانے لگے۔ ایک وارڈر اسٹیج اور کشکن کی طرف جھپٹا۔ لیکن کشکن کا غمزدہ چہرہ فی الفور نرم پڑ کر طویل مسکراہٹ کی آماجگاہ بن گیا۔ وہ چلایا، اس بار روسی زبان میں ــــ "جب میں چھٹی جماعت میں تھا تو یہ نظم ۸ جنوری کے لیے یاد کی تھی۔"* اور وہ "مسخرگی" کے انداز میں اچھلتا ہوا اسٹیج سے چلا گیا۔ زنیا نشکن ایک خوش دل سادہ مزاج اور ملنسار لڑکا تھا، جس کا چہرہ چوڑا چکلا اور داغ دار تھا (دیہات میں اس کی طرح کے بہت سے لوگ تھے۔ اس وقت تک دیہاتوں پر تباہی نہیں آئی تھی۔ آج کل آپ کو عام طور پر وہاں اس کے متضاد جذبات نظر آتے ہیں) زنیا کی آواز ہلکی تھی اور وہ مجبوراً ہمیشہ اسٹیج پر اپنے دوستوں کی تفریح کے لیے نغمہ سرائی کا شوقین تھا۔

ایک دن اعلان ہوا کہ "وائف آف مائین" لٹل وائف (میری بیوی، ننھی سی بیوی) نغمہ پیش کیا جائے گا۔ موسیقی موذکروسوف کی ہے اور بول الیاکوفسکی، زینیا نشکن گائے گا۔ اور گٹار بجائے گا۔ ایک پرسوز، سادہ راگ گٹار سے برآمد ہوا اور زینیا نے اس وسیع ہال تک رنج کرکے ہم میں سے ہر ایک کے لیے نغمہ پیش کیا اور ہمیں باور کرا دیا کہ اب بھی ہماری دلوں میں کتنی ملائمت اور کتنی محبت جاگزیں ہے۔

اے بیوی، اے میری جان
جان بھی تجھ پہ ہے قربان
تو اور صرف تو ہی ہے میرے دل کا نور

تو اور صرف تو! پیچھے پردے پر لکھا ہوا پیداواری منصوبوں کا گھسا پٹا نعرہ دھندلا پڑ گیا۔ ہال کی نیلی سرمئی مدھم روشنی میں کیمپ کی دنیا کے طویل ترین سال، جو سال گزر چکے تھے، جو سال ابھی باقی تھے۔ اوجھل ہو گئے۔ تو اور صرف تو! نہ وہ جرائم جو ہم پر تھوپ دئے گئے تھے۔ نہ افسروں کے ساتھ ہمارے تصادم نہ ہمارے حریفانہ کام تو اور صرف تو!

نہ کوئی اتنا عزیز ہے
نہ کوئی اتنا قریب ہے

ہم پاس رہیں یا نہیں۔ دور دور۔

یہ اس پیغام کے غیر مختتم انتظار کا نغمہ تھا جو کبھی نہیں پہنچتا۔ تنہائی اور محرومی کتنا موزوں تھا یہ اس کے باوجود جیل کا تذکرہ براہ راست کہیں نہیں آیا تھا یہ پورا گیت کسی طویل جنگ کے تناظر میں بھی لٹنا ہی برمحل نظر آتا تھا۔

ہرچند کہ میں چھپا ہوا شاعر تھا لیکن میری خود پسندی میرے آڑے نہ آئی "مجھے اس وقت اس بات کا احساس نہ ہوا کہ اسٹیج سے ابھرنے والے بول کسی دوسرے پوشیدہ شاعر کے ہیں (وہاں کتنے شاعر تھے!) جو مجھ سے زیادہ گداز طبیعت کے مالک اور سامعین کے دل کو چھونے میں مجھ سے زیادہ کامیاب ہیں

وہ اس کا کیا بگاڑ سکتے تھے؟ اگر وہ طلب کرتے اور تصدیق کرتے کہ وہ واقعتاً الیاکوفسکی اور موکروسوف کا ہے یا نہیں؟ اس نے شاید کہہ دیا تھا کہ یادداشت کے سہارے ہی گیت گا سکوں گا۔

نیلے سرمئی دھندلکے میں بیٹھے یا کھڑے ہوئے تقریباً دو ہزار افراد۔ وہ اتنے ساکت اور خاموش تھے جیسے وہاں تھے ہی نہیں۔ بگڑیل، جنگلی اور بے حس بن جانے والے لوگ لیکن اس وقت سب کے سب دل گداز کیفیت میں غرق۔ محسوس ہونے لگا کہ آنسو اب بھی پھوٹ بہتے ہیں۔ اب بھی باہر آ سکتے ہیں۔

اے بیوی! اے میری جان!
جان بھی تجھ پہ ہے قربان!
تو اور صرف تو ہی ہے میرے دل کا نور۔

چھٹا باب

پختہ عزم مفرور

آجکل جب جارجی پافلووچ ٹیتو گزشتہ مہمات کے بارے میں، اپنے ساتھیوں کے بارے میں اور اُن کے بارے میں جنہیں وہ صرف نام سے جانتا ہے، گفتگو کرتا ہے تو سب سے زیادہ پختہ عزم اور جی داروں کے متعلق، جن میں آئیوان، بورودیوف، مائیخل خیداروف، گریگوری کوڈلا، حافظ حانظوف شامل ہیں، اس قسم کے توصیفی کلمات کہتا ہے:

"وہ ایک مستقل مزاج مفرور تھا۔"

مستقل مزاج مفرور! وہ قیدی جسے ایک لمحے کے لیے بھی کبھی اس بارے میں شبہ نہیں ہوتا کہ انسان سلاخوں میں بند ہونے کے لیے نہیں پیدا کیا گیا خواہ وہ محاسب دفتر میں، شعبۂ تعلیم میں و ثقافت میں انتہائی آرام دہ جگہوں پر کام کر رہا ہو، لائقِ اعتماد سمجھا جاتا ہو یا راشن کا انچارج ہو۔ وہ شخص جو ایک بار جیل میں پہنچ جانے کے بعد عالمِ بیداری کا تمام وقت فرار کے بارے میں سوچ کر گزارتا ہے اور رات کو فرار کے خواب دیکھتا ہے، وہ شخص جس نے اپنے آپ کو کبھی قسمت کے ہاتھوں میں نہ سونپنے کی قسم کھا رکھی ہو اور جو ہر کام اس خیال کے تحت کرتا ہو کہ مجھے فرار ہونا ہے، وہ شخص جس کا جیل کا ایک بھی دن گزشتہ دن جیسا نہیں ہوتا یا تو فرار کی تیاری کا دن ہوتا ہے یا پھر فرار کا دن ہوتا ہے ورنہ دوبارہ پکڑے جانے کا اور پٹنے کے بعد چالیس چکی میں گزارنے کا دن ہوتا ہے۔

ایک مستقل مزاج مفرور! اس کا مطلب ہے وہ شخص جو جانتا ہو کہ کس قسم کی مہم درپیش ہے، وہ شخص جس نے ناکام مفرورین کے گولیوں سے چھلنی بدن بھی دیکھے ہیں جو بطور نمائش بیچ میدان میں رکھے جاتے تھے۔ اُس نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جو زندہ واپس لائے گئے۔ اُس آدمی کو جسے ایک سے دوسرے جھونپڑے میں گھمایا گیا سیاہ اور نیلا، کھانسی کے ساتھ خون تھوکتا ہوا اور اُس سے بآوازِ بلند کہلوایا گیا: "قیدیو! دیکھو میری کیا دُرگت ہوئی ہے یہی حال تمہارا بھی ہو سکتا ہے!" اُسے معلوم ہے کہ مفرور کی لاش اکثر اتنی بھاری ہوتی ہے کہ اُسے لا کر کیمپ کے سپرد نہیں کیا جا سکتا اس لیے صرف اس کا سر موٹے اُون کے تھیلے میں ڈال کر واپس لایا جاتا ہے اور بعض اوقات (ضابطے کے مطابق یہ زیادہ معتبر شہادت ہے)

داہنا بازو بھی کہنی پر سے تراش کر لے آتے ہیں تاکہ اسپیشل سکشن نشانات انگشت ملا سکے اور اُس قیدی کو بٹے کھاتے میں ڈالا جا سکے۔

ایک مستقل مزاج مفرور! آسکا کے مفاد کے پیش نظر کھڑکیوں کی سلاخیں سیمنٹ میں جمائی گئی ہیں، کیمپ کے چاروں طرف کانٹے دار تار، بُرجیاں، باڑیں، کنکریٹ کی فصیلیں اور قدم قدم پر رکاوٹیں لگائی گئی ہیں، دام اور جال بچھائے گئے ہیں، سُرمئی کتوں کو سُرخ گوشت کھلایا جاتا ہے۔

مستقل مزاج مفرور وہ شخص بھی ہے جو اوسط قیدی کی مانند رہنے سے انکار کرتا ہے تم فرار کی سعی کرنے والے باقیماندہ لوگوں کے لیے مصیبتیں نازل کر دیتے ہو۔ ڈسپلن مزید سخت ہو جاتا ہے! ایک دن میں دس دس بار معائنے ہوتے ہیں! ولیہ پتلا ہو جاتا ہے! وہ دیگر قیدیوں کی طرف سے سرگوشیوں میں دیے جانے والے مشوروں کو رد کر دیتا ہے، نہ صرف ان کے مشورے جو اپنی قسمت پر شاکر رہنے کو کہتے ہیں۔ (کیمپ میں بھی زندگی کوئی خاص تلخ نہیں ہے خصوصاً جب آپ کو باہر سے سامان ملتا رہتا ہو) بلکہ اُن کے مشورے بھی جو چاہتے ہیں کہ وہ اُن کے ساتھ احتجاجی مظاہروں اور بھوک ہڑتالوں میں شریک ہو۔ کیونکہ یہ سب کچھ جدوجہد نہیں بلکہ خود فریبی ہے۔ جدوجہد کے تمام ممکنہ وسائل میں سے وہ صرف ایک وسیلے پر نگاہ رکھتا ہے، صرف ایک ترکیب پر اعتبار کرتا ہے اور صرف ایک ہی ذریعے کی تکمیل کے لیے اپنا پورا وقت صرف کرتا ہے۔ فرار!

وہ اس کے علاوہ اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ اُس کی فطرت ہی یہ ہے۔ پرندے مخصوص موسم میں ہجرت کے عمل سے باز نہیں رہ سکتے اور کوئی بھی مستقل مزاج مفرور، فرار سے باز نہیں رہ سکتا۔

ناکام جدوجہد کے دوران، سکون کے ساتھ بسر کرنے والے قیدی ٹینو سے استفسار کرتے تھے: "تم خاموشی کے ساتھ کیوں نہیں بیٹھ سکتے؟ تم ہمیشہ فرار ہونے کی کوشش کیوں کرتے رہتے ہو؟ تم باہر ___ خصوصاً اب ___ کیا حاصل کر سکو گے؟" ٹینو کو حیرت ہوتی "تمہارا کیا مطلب ہے ___ میں کیا حاصل کروں گا ___ یقیناً آزادی ___ چیڑ کے جنگلات میں ایک مکمل دن ہتھکڑیوں کے بغیر ___ اسے میں آزادی کہتا ہوں!"

گلاگ اور حفاظتی پولیس کے اپنے عہد وسطیٰ میں، جو بزدلی کا دور تھا، اس جیسے لعد بور ہیوف جیسے کسی دوسرے قیدی سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس قسم کے قیدی بالکل ابتدائی دنوں میں یا جنگ کے بعد آیا کرتے تھے۔

یہ تھا ہمارا ٹینو ___ ہر نئے کیمپ میں (اس کا اکثر تبادلہ ہوتا رہتا تھا) وہ اس وقت تک اداس اور رنجور رہتا تھا جب تک اس کے فرار کا منصوبہ تیار نہ ہو جاتا۔ ایک مرتبہ منصوبہ مکمل ہو جانے کے بعد ٹینو خوشی سے تمتمانے لگتا تھا اور فاتحانہ مسکراہٹ اس

کے لبوں پر چپک کر رہ جاتی تھی۔
اصل میں، وہ بتاتا ہے کہ جب سزاؤں پر نظرِ ثانی کرنے کا اور جلاوطنی کا دور شروع ہوا تو وہ بہت خوفزدہ ہوا۔ شہر بدری کا دھڑکا اُس کے فرار کی مہمات کے حق میں سمِ قاتل نظر آتا تھا۔

*

اس کی پیچیدہ داستانِ حیات پیش کرنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں ہے۔ لیکن فرار کا جذبہ اُس کی فطرت میں پیدائش کے وقت سے ہی موجود تھا۔ اپنے بچپن میں وہ بڑا انسک سے بورڈنگ سے "امریکہ" کے لیے ڈیسنہ ندی میں ایک چھوٹی کشتی کے سہارے بھاگ نکلا تھا۔ موسم سرما کے وسط میں وہ نیکر پہنے ہوئے پیاٹیگورسک یتیم خانے کے آہنی پھاٹک پر چڑھ گیا تھا اور نانی کے پاس بھاگ گیا تھا۔ وہ ملاح اور سرکس کے اداکار کا غیر معمولی مرکب تھا۔ اس نے ملاحوں کے تربیتی اسکول میں تعلیم پائی تھی، برف توڑنے والے جہاز کے مستول پر کام کر چکا تھا، ٹرالر پر بوسون (ملاحوں کا فورمین) رہ چکا تھا، تجارتی بیڑے میں نیویگیشن افسر کی حیثیت سے تعینات رہا تھا ـــ وہ فوج کے غیر ملکی زبانوں کی درسگاہ کا گریجویٹ تھا، زمانۂ جنگ میں شمالی بیڑے میں تھا۔ برطانوی حفاظتی جہازوں پر افسر رابطہ کی حیثیت سے آئس لینڈ اور انگلینڈ کا بحری سفر کر چکا تھا (تصویر ۶) لیکن اُس نے بچپن سے ہی قلابازیوں کی مشق بھی کی تھی۔ وہ این۔ای۔پی* دور میں اور اس کے بعد دو ہفتوں تک بحری سیاحتوں کے درمیانی وقفوں میں سرکس میں کرتب دکھلا چکا تھا، اس نے شہتیروں پر جمناسٹک کی تربیت دی تھی، یادداشتوں کے کرشمے دکھائے تھے (وہ ڈھیروں الفاظ اور ہندسے سُن کر یاد کر سکتا تھا) اور دل کی بات معلوم کر لینے کے کرشمے دکھاتا تھا۔ سرکس اور بندرگاہوں پر کام کرنے کی وجہ سے مجرم دنیا سے بھی اُس کی تھوڑی بہت شناسائی تھی اور مجرموں کی زبان کا معمولی سا علم بھی اُسے ہو گیا تھا اور مہم جوئی، حاضر جوابی، بے سوچے سمجھے کام کر گزرنے کی جرأت بھی اس نے وہیں سے حاصل کی تھی بعد ازاں متعدد ڈسپلن بیرکوں میں چوروں کے ساتھ وقت گزارتے ہوئے اس نے اُن کی بیش از بیش باتیں سیکھ لی تھیں۔ یہ تمام باتیں مستقل مزاج مفروروں کے لیے بڑے کام کی تھیں۔
ہر شخص اپنے تجربات کی پیداوار ہوتا ہے اسی طرح ہماری شخصیت تشکیل پاتی ہے ۱۹۴۸ء میں اُسے اچانک فوجی خدمات سے سبکدوش کر دیا گیا۔ یہ دوسری دنیا سے ملنے والا اشارہ تھا (وہ کئی زبانیں جانتا تھا، ایک برطانوی جہاز پر سفر کر چکا تھا اور اس کے علاوہ اسٹونین تھا حالانکہ یہ بھی سچ ہے کہ وہ پیٹرسبرگ کا اسٹونین تھا) لیکن اگر ہم جینا چاہتے ہیں تو اُمید کا دامن ہمیشہ تھامے رکھنا ہوگا۔ اس سال کرسمس سے پہلے کی شام کوریگا میں جہاں کرسمس اب بھی کرسمس ہی جیسا اور تعطیل کے دن کی طرح محسوس ہوتا ہے،

اُسے حراست میں لے لیا گیا اور اماٹو اسٹریٹ کے ایک تہہ خانے میں لے جایا گیا جو کنزرویٹری سے اگلا مکان تھا جیسے ہی وہ اپنی پہلی کوٹھڑی میں داخل ہوا وہ بیزاری کے شکار کم سخن وارڈروں کو یہ بتانے کی خواہش نہ روک سکا: "میں نے اور میری اہلیہ نے" دی کاؤنٹ آف مونٹے کرسٹو" کے ٹکٹ لے رکھے تھے اور اس وقت ہم وہ کھیل دیکھ رہے ہوتے! وہ آزادی کے لیے جدوجہد کرتا رہا اور میں بھی کبھی ہار نہیں مانوں گا!"

لیکن ابھی متصادم ہونے کا وقت نہیں آیا تھا ہم ہمیشہ اپنے اس خیال کے اسیر ہو جاتے ہیں کہ کوئی غلطی ہو جاتی ہے۔ جیل؟ کس جرم میں؟ یہ ناممکن ہے۔ جلد ہی حقیقت سامنے آجائے گی۔ سچ پوچھیے تو اُس کے ماسکو تبدیل ہونے سے قبل انہوں نے دانستہ اُسے خوش فہمی میں مبتلا رکھا (یہ طریق کار قیدی کے تبادلے کے وقت حفاظت کے پیش نظر اختیار کیا جاتا ہے) کاؤنٹر اسپائینیج (مخالف جاسوسی) کا سربراہ کرنل مارشنن اُسے رخصت کرنے کے لیے اسٹیشن پر بھی آیا اور اُس سے مصافحہ کیا: خدا کرے تمہارا سفر خوشگوار ہو! وہ چار آدمی تھے، ٹینٹو اور اُس کا خصوصی نگراں دستہ۔ اور انہوں نے درجہ اوّل کے ایک علیحدہ ڈبے میں سفر کیا۔ جب میجر اور فرسٹ لیفٹیننٹ اُن تمام تفریحات کے بارے میں گفتگو مکمل کر چکے جو انہیں ماسکو میں سالِ نو سے پہلے کی شام کو نصیب ہوں گی (شاید خصوصی نگراں دستوں کی ڈیوٹیاں ایسی سیاحتوں کے لیے محض عذرِ لنگ ہی ہوتی ہیں؟) وہ بالائی برتھوں پر لیٹ گئے اور خوابیدہ سے نظر آنے لگے۔ نیچے کی برتھ پر چیف ڈپٹی افسر دراز تھا۔ جب بھی قیدی اپنی آنکھیں کھولتا، افسر کے بدن میں جنبش پیدا ہو جاتی۔ چھت پر آویزاں ایک نیلے بلب سے مدھم روشنی ہو رہی تھی ٹینٹو کے تکیے کے نیچے اُس کی اہلیہ کا ارسال کردہ پہلا اور آخری سامان تھا، اُس کے بالوں کا ایک گچھا اور ایک چاکلیٹ بار۔

ریل کے پہیوں کی پُر آہنگ آواز سکون بخش تھی۔ ہم اُن کی کھٹ کھٹ کا کوئی مفہوم اخذ کرسکتے ہیں، جو پیشین گوئی چاہیں اُس سے برآمد کی جاسکتی ہے اس سے ٹینٹو بہت پُر امید ہو گیا کہ "اصلیت سامنے آجائے گی" اس لیے اس کا فرار ہونے کا کوئی سنجیدہ ارادہ نہ تھا۔ وہ محض اس کا بہترین طریقہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا (بعد ازاں اُسے وہ رات اور شور یاد آتا تو پشیمانی بھی ہوتی تھی کہ فرار اس سے زیادہ سہل پھر کبھی نہیں ہوا آزادی اس کے اتنے نزدیک پھر کبھی نہیں آئی!)

رات میں دو مرتبہ ٹینٹو سنسان کوریڈور میں نکل کر آیا اور ڈپٹی افسر اُس کے ساتھ گیا۔ اُس کی پستول نیچے لٹک رہی تھی جیسی کہ ملاحوں کی عادت ہوتی ہے۔ وہ قیدی کے ساتھ پیشاب گھر کے اندر بھی داخل ہو گیا۔ جوڈو اور داؤ پیچ کے ماہر کے لیے اُسے وہیں دبوچ کر بندوق چھین لینا، اُسے خاموش رہنے پر مجبور کرنا اور گاڑی رکنے پر اطمینان سے نیچے اُتر جانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا۔

دوسری مرتبہ اس تنگ جگہ جاتے ہوئے پیٹی افسر کو خوف محسوس ہوا اور وہ دروازے پر ہی انتظار کرتا رہا! لیکن دروازہ بند تھا اور ٹیٹو حسب مرضی وہاں جتنی دیر چاہتا رہ سکتا تھا وہ کھڑکی توڑ کر دُور لائنوں کے پار چھلانگ لگا سکتا تھا۔ رات کا وقت تھا! گاڑی کی رفتار تیز نہیں تھی ـــــ یہ ۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے ـــــ اور وہ بار بار رُکتی تھی۔ ٹھیک ہے کہ سردیوں کا موسم تھا اور ٹیٹو کے پاس اوور کوٹ نہیں تھا اور اُس کی جیب میں صرف پانچ روبل تھے لیکن ابھی تک گھڑی اس کے قبضے میں ہی تھی۔

ماسکو اسٹیشن پر خصوصی نگراں دستے کی مخصوص سہولت ختم ہوگئی انہوں نے تمام مسافروں کے چلے جانے تک گاڑی پر ہی انتظار کیا اور پھر ہلکی نیلی پٹی شانے پر لگانے والے سارجنٹ میجر، جو جیل گاڑی لایا تھا، اندر آیا اور بولا ـــ "وہ کہاں ہے"؟

داخلے کی تمام کارروائیاں، بےخواب راتیں، جیل کی تنہائی۔ ایک معصوم درخواست کہ تفتیش کے لیے جلد طلب کیا جائے۔ وارڈر نے جماہی لی" اتنی عجلت مت کرو، کچھ دیر بعد نہیں اس سے زیادہ جلے گا جتنی کہ تمہاری آرزو ہے"۔

آخر ش تفتیش کنندہ: " ٹھیک ہے! مجھے اپنی مجرمانہ سرگرمیوں سے آگاہ کرو"۔ " میں بالکل بے قصور ہوں!" " صرف پوپ پائس (مقدس پادری) بالکل بے قصور ہے"۔

اپنی کوٹھڑی میں اُس کی ملاقات ایک مخبر سے ہوئی۔ وہ اُسے پھانسنے کی کوشش کرتا رہا۔ ادھر آؤ اور بتاؤ کہ واقعتا ہوا کیا؟ دوچار سوال اور تمام معاملہ صاف تھا: وہ معاملے کو کبھی ختم نہیں کریں گے، اُسے کبھی جانے نہیں دیں گے۔ اس لیے اُسے فرار ہونا ہی پڑے گا!

لیفورٹو فوجیل کی عالمی شہرت بھی ٹیٹو کے حوصلے کو شکست نہ دے سکی۔ شاید وہ اس فوجی کی مانند تھا جو پہلی بار مورچے پر جاتا ہے جسے کوئی تجربہ نہیں ہوتا اسی لیے کسی بات سے ڈرتا بھی نہیں ہے۔ تفتیش کنندہ اناطولی لیفشن نے ہی ٹیٹو کو فرار کی ترغیب دی تھی ـــــ اپنے کمینے پن اور نفرت آگیں سلوک کے ذریعے۔

افراد اور اقوام کے معیارات مختلف ہوتے ہیں۔ اُن دیواروں کے اندر کتنے لاکھ اشخاص زدوکوب برداشت کرچکے تھے اور انہوں نے اسے اذیت سمجھا بھی نہیں تھا لیکن ٹیٹو کے لیے یہ احساس ہی ناقابلِ برداشت تھا کہ کوئی اُسے پیٹے اور سزا نہ پائے یہ تو شاید ظلم تھا اور وہ اسے برداشت کرنے سے پہلے مرجانا پسند کرے گا اس لیے جب زبانی دھمکیوں کے بعد لیفشن اُس کی طرف بڑھا اور اس نے اپنا گھونسہ بلند کیا تو ٹیٹو نے اُچھل کر فرطِ غیظ میں لرزتے ہوئے اُس سے کہا تھا: "میری زندگی تو اب بہرطور کسی کام کی نہیں رہی لیکن میں تیری ایک یا دونوں آنکھیں ابھی باہر نکال سکتا ہوں! یہ کام میں کرسکتا ہوں!"

تفتیش کنندہ پسپا ہوگیا۔ ایک سڑے ہوئے قیدی کے بدلے ایک اچھی آنکھ کوئی

سُود مند سودا نہیں ہو گا۔ بعد ازاں اُس نے ٹینٹو کی مدافعت کم کرنے کی غرض سے اُسے کال کوٹھڑی میں تھکا ڈالنے کی کوشش کی اور اس کے بعد اُس نے ایک تماشہ کھڑا کیا اور دکھایا کہ اگلے دفتر میں درد سے چیخیں مارنے والی عورت ٹینٹو کی اہلیہ ہے اور اگر وہ اپنے جرم کا اقبال نہیں کرتا تو اُسے زیادہ شدید اذیت سے گزرنا پڑے گا۔

اُس نے پھر اپنے آدمی کو غلط سمجھا تھا۔ اگر ٹینٹو کے لیے ایک گھونسے کی ضرب برداشت کرنا ممکن نہ تھا تو یہ تصور کہ اس کی اہلیہ سے پوچھ تاچھ کی جا رہی ہے کم ناقابلِ برداشت نہ تھا۔ قیدی پر یہ بات واضح تر ہوتی گئی کہ تفتیش کنندہ کو مار ڈالنا چاہیئے۔ اس خیال کو فرار کے منصوبے کے جزو کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ میجر لیفنٹن بھی بحری وردی زیب تن کرتا تھا طویل القامت تھا اور خوبصورت بال رکھتا تھا۔ جہاں تک تفتیشی بلاک کا تعلق تھا، لیفنٹن کی جگہ ٹینٹو بآسانی وہاں سے نکل سکتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ لیفنٹن کا چہرہ گول اور چکنا تھا جبکہ ٹینٹو لاغر ہو گیا تھا (قیدی کے لیے آئینہ دیکھنا محال تھا، اگر تفتیش کے دوران آپ کو پیشاب گھر جانے کی اجازت بھی ملتی تو وہاں آئینے پر سیاہ پردہ ڈال دیا جاتا۔ ایک بار اُسے موقع مل گیا اُس نے جھپٹ کر پردہ ہٹایا۔ یا الٰہی، وہ کتنا زرد رُو اور مضمحل نظر آتا تھا اُسے اپنے بارے میں کتنا افسوس ہوا تھا!)

اس دوران انہوں نے بیکار مخبر کو کوٹھڑی سے ہٹا لیا تھا۔ اس کا پلنگ وہاں پڑا رہ گیا اور ٹینٹو نے اُسکا بغور جائزہ لیا۔ دھات کا ایک جوڑنے والا ٹکڑا جوڑ پر زنگ آلود نظر آیا یہ تقریباً ستر سینٹی میٹر لمبا تھا۔ وہ اسے کس طرح توڑ سکتا ہے؟

پہلے اُسے کچھ تیاریاں کرنی ہوں گی۔ سیکنڈ صحیح صحیح شمار کرنے کی اپنی صلاحیت کو خامیوں سے پاک کرنا ہو گا بعد ازاں یہ حساب لگانا ہو گا کہ ہر ایک وارڈر کے اسپائی ہول (نگرانی کے سوراخ) کے جھانکنے کے درمیان کتنا وقفہ ہوتا ہے (اب جو بھی وارڈر ڈیوٹی پر ہو اُس کی جگہ اپنے آپ کو تصور کر کے حساب لگائیے جب کہ وہ کوریڈور میں اپنی عام رفتار سے چہل قدمی کر رہا ہو) یہ وقفہ پینتالیس۴۵ سے پینسٹھ۶۵ سیکنڈوں کا ثابت ہوا۔

ایسے ہی ایک وقفے میں اُس نے اپنی قوت آزمائی اور دھات کا زنگ آلود ٹکڑا تڑخ کر علیحدہ ہو گیا۔ دوسرے ٹھوس حصے کو توڑنا زیادہ مشکل تھا۔ اُسے توڑنے کے لیے ٹینٹو کو اس پر دونوں پیر جما کر کھڑا ہونا تھا لیکن اس صورت میں وہ ٹوٹ کر زمین پر آ رہے گا اس لیے دو نگرانیوں کے وقفے میں اُسے ایک تکیہ سیمنٹ کے فرش پر رکھنا ہو گا، پلنگ پر چڑھنا ہو گا پھر اسے توڑنا ہو گا، تکیہ اپنی جگہ واپس رکھنا ہو گا اور چھڑ کو فی الحال پوشیدہ رکھنا ہو گا یعنی یوں سمجھیے کہ اپنے بستر کے نیچے رکھنا ہو گا۔ اور اس پوری مدت میں سیکنڈوں کا حساب رکھنا ہو گا۔

چھڑ ٹوٹ گئی۔ ترکیب کارگر ثابت ہوئی!

—— لیکن مسئلہ ابھی آدھا ہی حل ہوا تھا: اگر وہ اندر آ گئے اور انہوں نے سلاخ کو پا لیا تو اُسے کال کوٹھری میں سڑنا پڑے گا، اگر وہاں بیس دن چکی پیس لی تو فرار ہونے کے لیے درکار قوت کا نصف ضائع کر چکا ہوگا یا تفتیش کنندہ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی قوت بھی اس میں نہ رہ جائے گی۔ ہاں یہ ترکیب ٹھیک رہے گی: وہ میٹریس کو اپنی انگلیوں کے ناخنوں سے چیر کر تھوڑا سا روئی کا گُچھا باہر نکال لے گا اور یہ روئی سلاخ کے سرے پر لپیٹ لے گا اور اسے وہیں رکھ دے گا جہاں وہ تھی، سیکنڈ گنتے ہوئے! ٹھیک — سلاخ اپنی جگہ پہنچ گئی!

لیکن یہ بھی تھوڑی دیر کے لیے ہی ٹھیک تھا۔ دس دن میں ایک بار آپ غسل خانے جاتے ہیں اور آپ کی غیر حاضری میں کوٹھری کی تلاشی لی جاتی ہے۔ انہیں توڑ پھوڑ کا علم ہو سکتا ہے اس لیے اس کو فوری اقدام کرنا تھا۔ وہ سلاخ کوٹھری سے تفتیش کے کمرے تک کس طرح منتقل کرے گا؟ جب وہ آپ کو کوٹھری والے بلاک سے چھوڑتے ہیں تو جامہ تلاشی نہیں لی جاتی! البتہ جب آپ تفتیش کے بعد واپس آتے ہیں تو وہ آپ کے کپڑوں پر ہاتھ مارتے ہیں اور اس وقت بھی صرف دائیں اور بائیں حصوں اور سینے پر، جہاں جیب ہوتے ہیں۔ وہ بلیڈ تلاش کرتے ہیں کہ کہیں کوئی خودکشی نہ کر لے۔

اپنی بحری جیکٹ کے نیچے اس نے رِوایتی ملّاح کی دھاری دار جرسی پہن رکھی تھی — یہ جسم اور رُوح دونوں کو مساوی طور پر گرم رکھتی ہے"۔ ملّاح اپنی پریشانیاں کنارے پر چھوڑ جاتا ہے"۔ اُس نے ایک وارڈر سے سُوئی طلب کی (یہ بھی کچھ متعینہ اوقات میں ہی طلب کی جا سکتی تھی) اور ظاہر کیا کہ وہ ڈبل روٹی سے بنائے ہوئے بٹن ٹانکے گا۔ اُس نے اپنی جیکٹ اُدھیڑی، اپنی پتلون اُدھیڑی، اپنی جرسی کا سِرا باہر کھینچا اور اسے اس طرح سی دیا کہ اس سے سلاخ کے نچلے حصّے کے لیے ایک جیب تیار ہو گئی۔ پہلے اُس نے اپنی انڈر ویر سے گوٹ کا تھوڑا سا ٹکڑا توڑ لیا تھا۔ اب اُس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ اپنی جیکٹ پر ایک بٹن لگا رہا ہے اور اس گوٹ کو سینے کے نزدیک جرسی کے اندر ٹانک لیا اس طرح سلاخ کو سیدھی طرح سنبھالے رکھنے کے لیے ایک چھلّا سا تیار ہو گیا۔

اس کے بعد اس نے جرسی سیدھی کر لی اور روز مشق کرنے لگا۔ سلاخ اُس کی پُشت کے ساتھ اور جرسی کے نیچے چھپائی گئی تھی: اسے اُوپر کے چھلّے سے اتنا سرکایا گیا تھا کہ وہ نچلے جیب پر ٹک جائے۔ چھڑ کا بالائی سِرا اُس کی ٹیونک کالر کے نیچے گردن تک پہنچ رہا تھا۔ اس کی مشق کا طریق کار یہ تھا: معائنے کے وقفوں میں قلیل مُدّت میں اُسے اپنا ہاتھ پیٹھ کے سرے پرے جا کر اپنا جسم پچھلی طرف خم کر کے سلاخ کا سرا پکڑنا ہوگا پھر اُلٹی کمان کے چھوڑے ہوئے چلّے کی طرح سیدھا ہونا ہے اور ساتھ ہی سلاخ کھینچ لینی ہے اور تفتیش کرنے والے افسر کے

سر پر ایک بھرپور ضرب لگاتی ہے۔ پھر وہ تمام چیزیں واپس اپنی جگہوں پر رکھ دے گا۔ ایک آنکھ خفیہ سوراخ پر رکھ دے گا۔ قیدی کسی کتاب کے اوراق کی پلٹ رہا ہو گا۔

اُس کی حرکات و عمل میں روز آنہ کی مشق سے تیزی آتی گئی حتیٰ کہ سلاخ برق رفتاری سے ہوا میں سرسرانے لگی۔ اگر ضرب اتنی کاری نہ بھی ہو گی تب بھی تفتیش کنندہ کم از کم بے ہوش تو ہو ہی جائے گا۔ اگر انہوں نے اس کی اہلیہ کو حراست میں لے لیا ہے تو وہ بھی اُن پر ذرا سا ترس نہیں کھائے گا!

اُس نے اپنے لیے بھی اُسی میٹریس کے بھراؤ سے روئی کی دو گدیاں نکال لیں انہیں مُنہ کے اندر رکھ کر وہ اپنے گال پُھلائے رکھ سکتا ہے۔

بلاشبہ اُس دن اس کا خط بھی بنا ہوا ہونا چاہیئے اور وہ ہفتے میں صرف ایک ہی بار کُند استرے سے آپ کو گھر چتے تھے اس لیے دن کا انتخاب احتیاط سے کرنا چاہیئے۔

اپنے گالوں پر تھوڑا سا رنگ کہاں سے لگایا جائے؟ اس آدمی کا خون!

مستقل مزاج مفرور اپنی آنکھوں اور کانوں کا استعمال عام لوگوں کی مانند تساہل کے ساتھ نہیں کر سکتا تھا اُسے اپنے مخصوص منصوبے کی روشنی میں دیکھنا اور سُننا ہو گا۔ اُسے اپنے آس پاس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا مشاہدہ کرنا چاہیئے۔ اُسے جہاں بھی لے جایا جائے، تفتیش کے لیے ورزش والے صحن میں، پیشاب گھر ــــ اُس کے پیر اپنے قدم گنتے ہیں، سیڑھیاں شمار کرتے ہیں (یہ سبھی چیزیں کام نہیں آتیں لیکن اُن کی گنتی ہر حال میں جاری رہتی ہے) اُس کا جسم ہر موڑ کا دھیان رکھتا ہے، وہ حکم کے مطابق اپنی نظر زمین پر رکھتا ہے اور وہ فرش کی جانچ کرتی رہتی ہے (یہ کس چیز کا بنا ہوا ہے؟ کیا اس کی سطح ہموار ہے؟) اُس کی نگاہیں اپنے چہار جانب جہاں تک نظر آسکتا ہے، تلاش کرتی رہتی ہیں، تمام دروازوں کا جائزہ لیتی ہیں (یہ دُہرے ہیں کہ اکہرے؟ ہینڈل کس قسم کے ہیں؟ قفل کیسے ہیں؟ یہ اندر کی طرف کُھلتے ہیں یا باہر کی طرف؟) اُس کا ذہن ہر دروازے کی کارکردگی کا مشاہدہ کرتا ہے، اس کے کان پوری توجہ سے سُنتے ہیں اور تقابل کرتے ہیں (اسے میں نے کوٹھری میں پہلے بھی سنا ہے۔ اب میں جانتا ہوں یہ کیا ہے)

لیفور ٹو فوجیل کے مشہور انگریزی حرف K کی شکل والے بلاک میں تمام منزلوں پر لے جانے والے ایک صدر زینہ ہے، دھات کی گیلریاں ہیں اور کنٹرولر ہے جو ایک چارٹ پر چھوٹی جھنڈیاں لگاتا ہے آپ تھوڑی دیر چل کر تفتیشی بلاک میں پہنچ جاتے ہیں۔ تفتیش کنندگان ایک فہرست کے مطابق کمرے تبدیل کرتے ہیں۔ یہ اور بھی اچھا ہے ــــ آپ تمام گیلریوں کی جائے وقوع اور تفتیشی بلاک کے در و دیوار کا مشاہدہ کرسکتے ہیں تفتیش کنندہ عمارت میں داخل کیسے ہو سکتے ہیں۔ اس چوکور فریم والے دروازے سے۔ کاغذات کی مخصوص جانچ بے شک یہاں نہیں بلکہ بیرونی گارڈ ہاؤس پر ہوتی ہے لیکن یہاں بھی وہ

دستخط کر کے اندر داخل ہوتے ہیں یا اُن کی جانچ پڑتال ہوتی ہے۔ سنو! ایک آدمی زینے سے نیچے جارہا ہے اور اوپر کے کسی شخص سے باوازِ بلند کہتا ہے: "ٹھیک ہے، میں دفترِ وزارت میں جارہا ہوں!" بہت خوب، یہ فقرہ مفرور کے بہت کام کا ہے۔

جہاں تک یہاں سے گارڈز ہاؤس تک کے باقی راستے کا سوال ہے، اُسے محتاط اندازہ قائم کرنا ہوگا اور بغیر ہچکچاہٹ کے اپنا راستہ اختیار کرنا ہوگا لیکن یقیناً برف پر ایک پگڈنڈی سی بن گئی ہوگی یا کولتار زیادہ سیاہ اور گندہ ہوگا۔ وہ سنتری کے پاس سے کس طرح گزرے ہیں شناختی کارڈ دکھلا کر؟ یا انہوں نے داخلے کے وقت اپنے کارڈ وہاں چھوڑ دیئے ہوں گے اور انہیں حاصل کرتے ہوئے اپنا نام بتاتے ہیں؟ یا شاید ان سب کو نظر سے پہچانا جاتا ہوگا اور صرف اپنا ہاتھ باہر کرنے کے بجائے اپنا نام بتانا غلطی ہوگی؟

تفتیش کنندہ کے بیہودہ سوالات پر توجہ دینے کی بجائے اگر آپ اس پر گہرائی کی نظر ڈالیں تو بہت سی باتوں کے جوابات آپ کو مل سکتے ہیں۔ اپنی پنسل تیز کرنے کے لیے وہ ایک ننھی سی نوٹ بک کے اندر سے، جو شاید ذاتی ملکیت ہے، ایک بلیڈ نکالتا ہے۔ یہ نوٹ بک وہ اپنی سامنے والی جیب میں رکھتا ہے۔ سوالات خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں:

"یہ اس کا پاس نہیں ہے۔ کیا اس کا پاس گارڈ ہاؤس میں ہے؟" "وہ ننھی سی نوٹ بک ڈرائیونگ لائسنس جیسی نظر آتی ہے۔ تو وہ کار سے آتا ہے؟ پھر اس کے پاس کار کی کنجی بھی ہوگی۔ کیا وہ کار جیل کے پھاٹک کے باہر کھڑی کرتا ہے؟ دفتر سے روانہ ہونے سے قبل مجھے لاگ بک سے اُس کا لائسنس نمبر پڑھنا ہوگا، وگرنہ میں غلط کار تک جا پہنچوں گا!"

ان کے لیے یہاں کپڑے تبدیل کرنے کا کمرہ نہیں ہے۔ وہ اپنے اوورکوٹ اور کیپ دفتر میں ٹانگتا ہے اور یہ بھی اچھا ہے۔

کوئی اہم بات فراموش نہ کرنی چاہیئے اور یہ سب کچھ چار یا پانچ منٹ میں کر گزرنا ہے۔ جب وہ چوٹ کھا کر وہاں پڑا ہوگا تو مجھے مندرجہ ذیل اقدامات کرنے ہوں گے۔

۱۔ اپنی جیکٹ اُتار کر اس کی پہن لوں جس پر فوجی پٹیاں آویزاں ہے۔
۲۔ اس کے جوتوں کے تسمے نکال لوں اور اپنے ڈھیلے ڈھالے جُوتے ان سے کس لوں۔ اس میں وقت لگے گا۔
۳۔ اس کے ریزر والا بلیڈ اپنے جُوتے کے تلے میں ایک خصوصی طور پر تیار کردہ مقام پر اٹکا لوں (اگر وہ مجھے دوبارہ پکڑ لیں اور سب سے قریبی کوٹھڑی میں ڈال دیں تو میں اپنی شہ رگ کاٹ سکوں گا۔)
۴۔ اُس کے تمام ایسے کاغذات جن کی مجھے ضرورت پڑے گی، چھانٹ کر ساتھ رکھ لوں گا۔
۵۔ لائسنس پلیٹ کا نمبر یاد کرنا ہے اور کار کی کنجی لینی ہے۔

۶۔ اُن کے بھاری بھرکم بریف کیس میں سے اپنی کیس فائل تلاش کر کے نکالنی ہے۔ اور اُسے ہمراہ لے جانا ہے۔
۷۔ اُس کی گھڑی اتارنی ہے۔
۸۔ اپنے رُخسار اس کے لہو سے سُرخ کرنے ہیں۔
۹۔ اُس کی لاش کھینچ کر میز کے پردے کے پیچھے کرنی ہے تاکہ اندر آنے والے خیال کریں کہ وہ جا چکا ہے' اس طرح شور و غل نہیں مچے گا۔
۱۰۔ اُون کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر اپنے منہ کے اندر گالوں کو پھُلانے کے لیے رکھنی ہیں۔
۱۱۔ اس کا کوٹ اور کیپ خود زیب تن کرنے ہیں۔
۱۲۔ روشنی کے سوئچ کے تار علیحدہ کرنے ہیں تاکہ اگر کوئی تھوڑی دیر بعد آ ہی جائے اور تاریکی دیکھے نیز سوئچ سے روشنی کرنے کی سعی کرے تو وہ یقیناً خیال کرے گا کہ بلب خراب ہو گیا ہے اور اس وجہ سے تفتیش کنندہ دوسرے کمرے میں چلا گیا ہے اگر وہ دوسرا بلب بھی لگا دیں تو فی الفور سمجھ نہ سکیں گے کہ حقیقت حال کیا ہے۔

*

اس طرح بارہ کام کرنے ہیں اور فرار ہو جانا'... تیرھواں کام ہوگا ..... یہ تمام رات کی باری میں کرنے ہیں اگر وہ ننھی سی نوٹ بک ڈرائیونگ لائسنس نہ ہوئی تو اچھا نہ ہوگا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تفتیش کنندہ کسی متعینہ بس سے آتا جاتا ہوگا (رات کے نصف پہر میں آمد و رفت کا خصوصی انتظام کیا گیا ہوگا) اور دوسرے لوگوں کو یہ بات غیر معمولی سی محسوس ہوگی کہ تفتیش چار یا پانچ بجے تک انتظار نہ کر سکا اور رات میں پیدل ہی چلا گیا۔

چند اور امور کا لحاظ بھی رکھنا ہے: جب میں چوکور فریم والے دروازے سے گزروں گا تو مجھے رومال اُٹھا کر اپنے چہرے پر لگانا ہوگا جیسے کہ میں ناک صاف کر رہا ہوں اور ساتھ ہی اپنا سر گھما کر گھڑی کی جانب دیکھنا ہوگا اور سنتری کا دماغ پُرسکون رکھنے کی غرض سے میں زینے کی طرف مُنہ اٹھا کر کہوں گا" پیروف! (وہ اس کا دوست ہے) میں وزارت کی طرف جا رہا ہوں۔ ہم کل گفتگو کریں گے"

ظاہر ہے کہ حالات اس کے خلاف ہیں ایک لمحے کے لیے اپنی کامیابی کا پانچ فیصد امکان نظر آیا۔ بیرونی گارڈ ہاؤس کے بارے میں کچھ علم نہ تھا اور اس کے نزدیک سے بحفاظت گزر جانے کی کوئی پختہ اُمید نہ تھی لیکن وہاں وہ غلامانہ موت قبول نہیں کر سکتا! چپ چاپ تشدد برداشت نہیں کر سکتا! آخر شِش اس کے جوتے کے تلے میں ریزر تو ہوگا ہی!

چنانچہ تازہ حجامت کے بعد مُقررات کی تفتیش کے لیے پہنچا۔ آہنی سلاخ اُس کی پشت پر چھپی ہوئی تھی۔ تفتیش کنندہ نے سوالات کیے' مغلظات سے نوازا' دھمکیاں دیں اور تمام وقت مُقررات اُسے حیرت سے دیکھتا رہا: کیا اسے یہ احساس نہیں ہو رہا ہے کہ اُس کا

وقت قریب آ لگا ہے؟

گیارہ بج رہے تھے۔ ٹینٹو کا منصوبہ یہ تھا کہ صبح کے دو بجے تک تن کر بیٹھے رہو بعض اوقات تفتیش کنندگان تھوڑی رات تک ہی کام کرتے تھے اور نصف شب کے قریب روانہ ہونے لگتے تھے۔

اب اُسے مناسب موقع کے لیے مستعد رہنا ہے یا جب تفتیش کنندہ کچھ اوراق دستخط کرانے کے لیے لائے جیسا کہ اس کا معمول تھا، اس وقت تک انتظار کرے، دفعتاً بے ہوش ہو جانے کا مظاہرہ کرے، اوراق کو فرش پر گر جانے دے، اُسے ایک منٹ کے لیے جھکنے کا موقع دے اور ..... یا پھر کا غذات کا انتظار کیے بغیر کھڑا ہو جائے، جھومتے ہوئے علالت کا اظہار کرے اور پانی طلب کرے جب وہ انامیل کا مگ لائے (گلاس اُس کے ذاتی استعمال کے لیے مخصوص تھا) تو ٹینٹو اسے خالی کر کے نیچے گرا دے اور ساتھ ہی اپنا داہنا ہاتھ گردن کے پیچھے لے جائے جو ایک فطری عمل نظر آئے گا کیوں کہ سمجھا جائے گا اُسے چکر آ رہے ہیں۔ تفتیش کنندہ کو گرنے والے گلاس پر نگاہ ڈالنی ہوگی، اور . . . .

ٹینٹو کا دل دھڑکنے لگا۔ خوشی منانے کے لیے دن قریب آ گئے ہیں یا پھر شاید اُس کی زندگی کا آخری دن!

معاملہ بالکل دوسرا ہی ہوگا۔ نصف شب کے قریب کوئی دوسرا تفتیش کنندہ عجلت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور ٹینٹو کے کان میں سرگوشیاں کرنے لگا۔ ایسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ لیفٹن نے بعجلت روانگی کی تیاری کی، بٹن دبا کر وارڈر کو طلب کیا اور قیدی کو لے جانے کا حکم دیا۔

جو ہونا تھا ہو گیا۔ ٹینٹو واپس اپنی کوٹھری میں پہنچا دیا گیا اور اُس نے آہنی سلاخ واپس رکھ دی۔

ایک دوسرے موقع پر تفتیش کنندہ نے اُسے طلب کیا لیکن اس دن اُس کی حجامت نہیں بنائی گئی تھی اور سلاخ کو اپنے ساتھ لے جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

جوش کی تیز لہر گزر چکی تھی اور اب اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ بہت سے مخالف حالات پیش آ چکے ہیں اور بہت کچھ ہو چکا ہے۔

بھاگنے والوں کے موڈ شاید آرٹسٹ کے موڈ کے مقابلے میں زیادہ سیمابی ہوتے ہیں۔

اُس کی طول طویل تیاریاں اکارت گئی تھیں . . . .

لیکن مستقل مزاج مفرور کو ایسے حالات کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ اُس نے اپنی سلاخ ہوا میں سو مرتبہ لہرائی تھی، سو تفتیش کنندگان کو مارا تھا، ایک درجن مرتبہ اُس نے اپنے فرار کا ایک ایک لمحہ محسوس کیا تھا ــــ دفتر میں، چوکور فریم والے دروازے کے باہر آ گئے گارڈ ہاؤس تک، پھر اس سے بھی آگے اُس نے اپنے آپ کو ایک ایسی مہم سے نیم جان کر لیا تھا جو

واقعتاً وہ سرانجام نہ دے سکا۔

کچھ مُدت کے اندر ہی اس کا تفتیش کنندہ تبدیل ہوگیا اور اُس کا تبادلہ لوبیانکا جیل میں کر دیا گیا۔ وہاں سے فرار ہونے کی کوئی پُرجوش سعی ٹینٹو نے نہیں کی (اب اس کا دل اس کام میں نہیں لگ رہا تھا کیونکہ تفتیش کے دوران حالات کچھ پُر امید سے نظر کرنے لگے تھے) لیکن وہ بے تکان مشاہدہ کر رہا تھا اور اُس نے ایک ترتیبی لائحہ عمل تیار کیا۔

لوبیانکا سے فرار؟ کیا یہ ممکن بھی ہے؟ اگر آپ اس بارے میں غور کریں تو شاید یہ لیفورٹوفو سے فرار کی بہ نسبت سہل تر ہے۔ آپ کو جلد ہی اُن طویل گیلریوں اور راستوں کا علم ہونے لگتا ہے جن سے گزر کر آپ تفتیش کرنے والے تک پہنچتے ہیں۔ کوریڈور میں کہیں کہیں آپ کو تیر کے نشانات دیوار پر بنے ہوئے نظر آتے ہیں "صدر دروازہ نمبر ۲ تک" "صدر دروازہ نمبر ۳ تک" (آپ کو افسوس ہوتا ہے کہ جب آپ بالکل آزاد تھے تو آپ کتنے ناسمجھ تھے۔ کہ آپ لوبیانکا کے باہر یہ دیکھنے کے لیے نہیں گھومے کہ ہر صدر دروازہ کہاں واقع ہے) یہاں یہ کچھ آسان ہے جس کا سبب یہ ہے کہ یہ کسی جیل کا نہیں، دفتر وزارت کا حلقۂ اختیار ہے جہاں بہت سے تفتیش کنندگان اور افسران ہیں جنہیں پہریدار چہروں سے نہیں شناخت کر سکتے اس لیے آمد و رفت پاس کے ذریعے سے ہوتی ہے پھر اگر کسی تفتیش کنندہ کو چہرے سے نہیں پہچانتے تو ٹھیک اُس کی طرح نظر آنا بھی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، موٹے طور پر مماثل ہونا کافی ہے۔ نیا تفتیش کنندہ خاکی وردی استعمال کرتا ہے، بحری لباس نہیں، اس لیے اُس کی پوشاک پہننا ضروری ہے۔ اس بار آہنی سلاخ قبضے میں نہیں ہے لیکن اگر ارادہ پختہ ہو تو کوئی نہ کوئی بندوبست ہو ہی جائے گا۔ اُس کے دفتر میں انواع و اقسام کی چیزیں ہیں، مثال کے طور پر سنگ مرمر کا پیپر ویٹ۔ جو بھی ہو ضروری نہیں کہ تم اُسے جان ہی سے مار دو، بس اُسے دس منٹ کے لیے بے ہوش کر دو اور تم باہر آ گئے!

لیکن عام معافی کی دھندلی اُمید اور دلائل و براہین نے ٹینٹو کے ارادے کو ڈھانپ لیا اُس کے ذہن سے یہ بار بوٹیر کی جیل میں ہی دُور ہوا: اُس کی سزا جو اسپیشل بورڈ کی مہر والے ایک کاغذ پر سے پڑھ کر سنائی گئی تھی، پچیس سال کے لیے کیمپوں کی قید تھی۔ اُس نے دستخط کیے اور سکون محسوس کیا، وہ مسکرایا اور اُسے احساس ہوا کہ اُس کی ٹانگیں اسے پچیس سالہ قیدیوں والی کوٹھری تک آسانی سے لے جا رہی ہیں۔ اس سزا نے اُسے توہین سے، مصالحت کر لینے کے لالچ سے، منکرانہ التجاؤں سے، غلامی کرنے سے، بھکاری کو دی جانے والی خیرات کی مانند پانچ سے سات سال کے وعدوں سے آزاد کر دیا تھا۔ یہ پچیس ہی ہے نا، حرام زادو؟ ٹھیک ہے، اگر ہم تم سے اتنی توقع کر سکتے ہیں ـــــ تو ہم فرار ہو جائیں گے!!

یا مر جائیں گے لیکن موت یقیناً ربع صدی کی غلامی سے بدتر ہے نہیں، مقدمے کے بعد

سرمونڈ نے سے بھی، ایک جوہر جرم کے بطور ہنچبال کی ضد جس سے کوئی پریشان نہ ہوتا تھا، ٹیتو کو شدید کوفت ہوئی ایسا لگا جیسے انہوں نے اس کے منہ پر تھوک دیا ہو۔

اب اُسے دوست اور شناسا تلاش کرنے چاہئیں اور دوسروں کے فرار کی تاریخ دیکھنی چاہیئے۔ ٹیتو اس میدان میں اناڑی تھا اُس سے پہلے بھی کسی نے فرار ہونے کی کوشش ضرور کی ہوگی۔

ہم کتنی مرتبہ وارڈروں کے پیچھے لوہے کے اُن حد قائم کرنے والے چوکھٹوں کے درمیان سے گزرے ہیں جو بوئیرکی کے کوریڈوروں کو سکشن میں تقسیم کرتے ہیں پھر بھی ہم میں سے کتنے افراد نے اس بات پر غور کیا ہوگا جو ٹیتو نے فوراً دیکھ لی؛ ہر دروازے میں دو تالے تھے۔ دروازے وارڈر کے ایک تالا کھولنے سے کھل جاتے تھے جس کا مطلب تھا دوسرا تفل کام میں نہیں آرہا ہے۔ اس میں تین کانٹے تھے جو دیوار سے نکل کر دروازے کے اندر داخل ہو جاتے تھے۔

سیل میں دیگر افراد مختلف قسم کے گفتگو کیا کرتے تھے لیکن ٹیتو فرار کی کوششوں اور اُن لوگوں کی داستانیں سُننا چاہتا تھا جنہوں نے فرار کے واقعات میں حصہ لیا تھا۔ وہاں ایک قیدی، مینول گارسیا، ایسا بھی تھا جس نے جیل میں ایک فساد کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور تین کانٹوں کا استعمال اس کی نظروں سے گزرا تھا۔ کوٹھریوں سے قیدیوں کو رفع حاجت کے لیے باہر نکالا گیا تھا، انہوں نے وارڈر کو پکڑ لیا تھا (اگرچہ یہ خلافِ ضابطہ تھا کہ وہ اکیلا ہو۔۔۔ برسوں سے کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی اور انہیں سر جھکا کر چلنے کی عادت پڑ چکی تھی) اُسے برہنہ کر دیا گیا، باندھ کر بیت الخلا میں ڈال دیا گیا اور ایک قیدی نے اُس کی وردی پہن لی۔ لڑکوں نے کنجیاں حاصل کرلیں اور گلیارے میں جتنے دروازے تھے سب کھول دیے (وہ اس سے بہتر جگہ منتخب نہ کر سکتے تھے۔ اس گلیارے میں قیدیوں کو موت کی سزا دی گئی تھی!) انہوں نے چیخنا شروع کر دیا خوشی سے اُچھل اُچھل کر وہ باوازِ بلند کہنے لگے کہ جاکر تمام کوٹھریوں کو کھول دو اور تمام جیل پر قابض ہو جاؤ۔ انہوں نے احتیاط کو بالائے طاق رکھ دیا۔ انہیں خاموشی کے ساتھ فرار کی تیاریاں کرتے ہوئے اپنی کوٹھریوں میں رہنا چاہیئے تھا اور وارڈر کی وردی میں ملبوس قیدی کو ہی گلیارے میں گشت لگانے دینا چاہیئے تھا۔ اس کے برعکس اُنہوں نے ایک پُرشور ہجوم کی صورت اختیار کی۔ اس شوروغل سے متوجہ ہو کر متصل گلیارے کے وارڈر نے آہنی دروازے کے دوطرفہ خفیہ سوراخ سے جھانک کر دیکھا اور الارم کا بٹن دبا دیا۔ جب الارم بجایا جاتا ہے تو دوسرا فاضل تالا ایک مرکزی کنٹرول روم سے گھما دیا جاتا ہے اور اس کی کوئی کُنجی وارڈروں کے گچھے میں نہیں ہوتی۔ باغی گلیارا الگ کٹ گیا بے شمار وارڈر اور سنتری طلب کر لیے گئے اور آمنے سامنے دو قطاروں میں ایستادہ ہو گئے باغیوں کو ایک ایک کر کے نکالا گیا اور مار پیٹ کی گئی۔ سرغنہ افراد کو چھانٹ کر الگ لے گئے۔ ان

لوگوں کو ربع صدی کی سزائے قید ملی تھی۔ کیا سزا دوگنی کر دی گئی؟ یا اُنہیں گولی سے اُڑا دیا گیا؟

کیمپ جانے کے لیے درمیانی پڑاؤ ـــ گارڈ ہاؤس ـــ جو کازان اسٹیشن کے قیدیوں میں خاصا معروف تھا، یہ جگہ بلاشبہ پُرہجوم اور عوامی مقامات سے علیحدہ واقع ہوئی تھی۔ یہاں قیدیوں کو سادہ گاڑیوں میں لایا جاتا ہے اور انہیں جیل گاڑیوں میں بھر کر یہ گاڑیاں ٹرین سے جوڑ دی جاتی ہیں۔ خشمناک فوجی پہریدار لائن کے دونوں جانب ایستادہ ہوتے ہیں، کُتّے کسی کا گلا دبوچنے کے لیے بیتاب رہتے ہیں۔ حکم ملتا ہے: "پہریدارو! تیار!" اور بندوقوں کی بھیانک کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ ان لوگوں کا ارادہ واقعی خطرناک ہے۔ جب وہ قیدیوں کو لائن کے متوازی لے جاتے ہیں تو کُتّے ہمراہ ہوتے ہیں۔ قطار ٹوٹ جائے تو؟ اگر توڑو گے تو کوئی کتا تمہیں دبوچ لے گا۔

لیکن مستقل مزاج مفرور کے لیے جسے وقفے وقفے سے ایک سے دوسرے کیمپ میں منتقل کیا جاتا ہے، اس کی فرار کی کوششوں کے نتیجے میں ایک جیل سے دوسری میں پہنچایا جاتا ہے، مستقبل میں ایسے بہت سے اسٹیشن آئیں گے، متعدد بار لائن کے ساتھ قطاریں چلنا پڑے گا اور بعض مرتبہ کتوں کے بغیر بھی مارچ کرایا جائے گا۔ لنگڑانے اور مریض ہونے کا بہانہ کرو جو اپنا موٹا اُون کا تھیلا اور جیکٹ اپنی پیٹھ پر بمشکل گھسیٹ پاتا ہے، اور پہرے دار کی خشمناکی کم ہو جائے گی۔ اگر لائنوں پر کئی گاڑیاں کھڑی ہیں تو تم ان کے درمیان گم ہو سکتے ہو۔ سیدھا سا طریقہ ہے: اپنا سامان گرا دو، نیچے جھکو اور ریل گاڑی کے کسی ڈبے کے نیچے رینگ جاؤ لیکن جیسے تم اُوپر اٹھو گے، تمہیں ٹرین کی دوسری جانب گشت لگاتے ہوئے دوسرے سنتری کے بوٹ نظر آئیں گے.... ہر غیر متوقع صورتحال کو پہلے ہی ذہن نشین کر لیا گیا ہے تم صرف یہی سوانگ رچا سکتے ہو کہ نقاہت کی وجہ سے گر پڑے ہو اور اسی باعث تمہارا سامان گر گیا ہے بشرطیکہ تمہاری خوش قسمتی سے کوئی ڈائرکٹ ٹرین تیزی سے آگے جاتی ہوئی نہ مل جائے! ایسی صورت میں لائن پار کر کے بالکل انجن کے سامنے آ جاؤ ـــ کوئی پہریدار تمہارا تعاقب نہیں کرے گا! تم آزادی کی خاطر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال سکتے ہو لیکن وہ یہ حماقت کیوں کرے گا؟ جب گاڑی تمہارے پاس سے گزرے گی تو تم جا چکے ہو گے! لیکن اس کے لیے قسمت کی دو عنائتیں درکار ہیں: ٹرین عین تمہارے پہنچنے کے وقت آئے اور تم ٹوٹے پھوٹے بغیر اس کے پہیوں سے پرے نکل جاؤ!)

کونیشیف مغربی جیل سے وہ قیدیوں کو کھلے ٹرکوں میں اسٹیشن لے جا رہے تھے ـــ جس کی وجہ سے سُرخ جیل گاڑیوں کی لمبی قطار بن گئی تھی۔ مغربی جیل میں بنونے ایک مقامی چور سے، "جو مفرورین کی قدر کرتا تھا"، دو مقامی پتے حاصل کیے جن کے پاس وہ ابتدائی

امداد کے لیے جا سکتا تھا۔ اس نے یہ دونوں پتے دیگر ممکنہ مفروروں کو بھی بتائے اور انہوں نے ایک مشترکہ منصوبہ تیار کیا: تینوں پچھلی صف میں بیٹھنے کی کوشش کریں گے اور جب ایک موڑ پر ٹرک کی رفتار کم ہو گی (ٹینو نے آتے ہوئے ایک تاریک گاڑی میں سفر کیا تھا اور ہر چند کہ اُس کی آنکھیں اس موڑ کو شناخت نہ کر سکیں گی لیکن اُس کے ساتھیوں نے اسے ذہن نشین کر رکھا تھا) وہ تینوں ایک ساتھ چھلانگ لگا دیں گے، دائیں، بائیں اور پیچھے کی جانب ــــ پہرے داروں کے پاس سے، اگر ضروری ہو تو انہیں دھکا دے کر نکل جائیں گے۔ پہریدار گولی چلائیں گے لیکن تینوں کو زخمی نہیں کر سکتے بلکہ ممکن ہے وہ سرے سے گولیاں ہی نہ چلائیں ــــ سڑکوں پر راہگیر جو ہوں گے۔ کیا وہ تعاقب کریں گے؟ نہیں وہ سڑک پر بیٹھے ہوئے دیگر قیدیوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے اس لیے وہ صرف چیخیں گے اور ہوائی فائر کریں گے اگر مفرورین کو روکا گیا تو عام لوگوں، ہمارے سوویٹ عوام اور راہگیروں کے ذریعے ہی روکا جائے گا۔ انہیں خائف کرنے کے لیے مفرورین کو ظاہر کرنا ہوگا کہ اُن کے پاس چاقو ہیں (اُن کے پاس چاقو نہیں تھے)

تینوں نے تلاشی کی جگہ چکر لگائے اور پیچھے رہ گئے تاکہ وہ پچھلے ٹرک میں سب کے بعد سوار ہو سکیں اور شام کے دھندلکے سے پہلے نہ روانہ ہوں۔ آخری ٹرک آیا لیکن یہ کم اونچائی والا ایمن ٹن کا ٹرک نہیں تھا بلکہ اونچی سائیڈ والا اسٹوڈی بیکر تھا۔ ٹینو اس میں بیٹھا تو اس نے ایسا کچھ محسوس کیا کہ اس کا سر ریم کی بلندی تک نہ پہنچتا تھا۔ اسٹوڈی بیکر تیزی سے روانہ ہوا مطلوبہ موڑ آیا تو ٹینو نے اپنے ساتھیوں پر نگاہ کی۔ اُن کے چہروں پر دہشت کا سایہ تھا۔ نہیں وہ نہیں کُود یں گے۔ نہیں وہ مستقل مزاج مفرورین نہیں ہیں (لیکن تم نے عزم مصمم کر رکھا ہے؟ وہ سوچ رہا تھا)

تاریکی میں، لالٹین کی روشنی میں بھونکنے، چیخنے، گالیاں بکنے اور کھڑکھڑاہٹ کے شوروغل کے درمیان پریشان کن حالت میں انہیں مویشی ڈھونے والے ڈبوں میں بار کر دیا گیا۔ یہاں ٹینو گر پڑا، بے توجہی میں اُس نے ڈبے کا بیرونی حصہ اچھی طرح نہیں دیکھا تھا (اور تمہارے مستقل مزاج مفرور کو اُسی وقت، جب موقع ہو، ہر چیز کا مشاہدہ کر لینا چاہیئے اُس کو کسی بھی کام میں تساہل برتنے کی اجازت نہیں ہے)

ہر اسٹاپ پر پہریدار پر تشویش انداز میں ڈبوں کو ہتھوڑے سے ٹھونکتے تھے وہ ایک ایک تختے کو بجا کر دیکھتے تھے۔ انہیں کسی بات کا خوف تھا۔ لیکن کس بات کا؟ اس کا کہ کوئی تختہ آری سے چیرا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہ کام کرنے کا ہے!

لوہا کاٹنے والی کسی آری سے توڑا ہوا اور خوب تیز کیا ہوا ایک چھوٹا سا ٹکڑا (چوروں نے) پیش کیا۔ برتھ کے نیچے ایک ٹھوس تختہ کو کاٹنے کی بات طے پائی ہے پھر جب ٹرین کی رفتار کم ہو گی تو وہ خلا میں سے نیچے نکل جائیں گے، لائن پر لیٹ جائیں گے اور اس وقت

تک خاموش پڑے رہیں گے جب تک تمام ڈبے ان کے اوپر سے گزر نہ جائیں۔ یہ صحیح ہے کہ ماہرین کا کہنا ہے مویشیوں کو لے جانے والی گاڑی کے سرے پر عام طور پر ایک ڈریگ ہوتا ہے، دھات کا ایک بڑا جھاڑو، جس کے دندانے زمین سے بہت لگ کر چلتے ہیں۔ اور مفرور کا بدن اس میں پھنس سکتا ہے کنکروں پر گھسٹ گھسٹ کر اس کی جان نکل سکتی ہے۔

تمام رات وہ یکے بعد دیگرے سونے کی برتھ کے نیچے سرکتے رہے اور دیوار میں ایک تختے کو آری سے کاٹتے رہے، اس بلیڈ کو، جس کی لمبائی صرف چند سینٹی میٹر تھی، کپڑے کے ایک ٹکڑے سے پکڑ کر کاٹتے رہے۔ یہ وقت طلب عمل تھا پھر بھی ابتدائی کام مکمل ہو گیا۔ تختہ کچھ ڈھیلا ہونے لگا۔ اسے ڈھیلا کرنے پر انہیں اب صبح کی روشنی میں اپنے ڈبے کے باہر سفید اور سادہ تختے نظر آئے۔ یہ سفید کیوں تھے؟ وجہ یہ تھی کہ پہریداروں کے لیے ایک فاضل فٹ بورڈ اس ڈبے میں بنایا گیا تھا۔ عین اس مقام پر، جہاں سے انہوں نے تختہ تراشا تھا، ایک پہریدار ایستادہ تھا اور اب مزید چیرنا کہ تختہ نیچے گر پڑے، ممکن نہیں تھا۔

دیگر انسانی عمل کی مانند جیل سے فرار کی کوششوں کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے ایک اصول اور ضابطہ ہے، اپنی کوششوں کے آغاز سے پہلے ان سے واقفیت حاصل کر لینا مناسب ہے۔

تاریخ سابقہ جہات کی ہے۔ فرار کی تراکیب سے متعلق شعبۂ تحفظ عوام کے لیے کوئی پمفلٹ شائع نہیں کرتا وہ صرف اپنے استعمال کے لیے تجربات کا ذخیرہ یکجا کرتا ہے۔ تاریخ کا علم آپ کو دیگر ذرائع سے ہو سکتا ہے، اُن سے جو کبھی فرار ہوئے تھے اور دوبارہ حراست میں لے لیے گئے یہ تجربہ انہیں بہت مہنگا پڑا تھا، خون دے کر صعوبتیں جھیل کر، تقریباً اپنی زندگی کی قیمت ادا کر کے یہ تجربہ حاصل کیا گیا تھا لیکن کسی مفرور کی کاوشوں کے بارے میں قدم بہ قدم، تفصیل کے ساتھ معلوم کرنا، پھر کسی تیسرے کے بارے میں، پھر کسی پانچویں سے متعلق معلومات یکجا کرنا کھلواڑ نہیں ہے، یہ بیحد خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ معلوم کرنا اس سے کم خطرناک نہیں ہے کہ آدمی جاننا چاہے کہ کسی خفیہ تنظیم کا رکن بننے کے لیے اُسے کس سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔ مخبر آپ کی تفصیلی گفتگو سن سکتے ہیں اور سب سے خراب بات تو یہ ہے کہ خود واقعات بیان کرنے والے فرار کی کوشش کے بعد اذیتیں پانے پر، زندگی اور موت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کے لیے مجبور کیے جانے کے بعد اپنا حوصلہ کھو چکے ہیں اور فریق ثانی سے مل گئے ہوں، اور اس طرح وہ ایک اہم عنصر ہونے کی بجائے زندہ طعمہ بن گئے ہوں۔ مخبروں کا تقرر کرنے والوں کا ایک اہم کام یہ بھی ہوتا ہے کہ جلد از جلد معلوم کریں فرار کی کوشش کرنے والوں سے ہمدردی رکھنے والے کون ہیں یا ان سے دلچسپی کن لوگوں کو ہے۔ فرار ہونے کی بات دل میں پیدا

ہی نہ ہو اس کی پیش بندی کے طور پر اس کی فائل میں نوٹ لگا دیا جاتا ہے اس کے بعد وہ کسی ڈسپلن دستے میں رہے گا جہاں سے فرار دشوار تر ہو جائے گا۔

پھر بھی ایک سے دوسری جیل میں، ایک کیمپ سے دوسرے میں منتقل ہو جانے پر ٹینو فرار ہونے والوں سے گرما گرم سوالات کرتا تھا۔ اس نے خود فرار کی کوشش کی تھی، وہ دوبارہ پکڑا گیا تھا، کیمپ جیلوں میں فرار کی کوشش کرنے والے دیگر قیدی اس کے ساتھ کوٹھری میں تھے اور اس لیے وہ تفتیش کر سکتا تھا (بعض اوقات وہ غلطیاں کر جاتا تھا۔ بہادر رہم جو اسٹیپن نے اس کے بینگر کے حفاظتی افسر بیلائیف کے ہاتھوں فروخت کر دیا حالانکہ اس نے ٹینو کو اس کے تمام سوالوں کا جواب دیا تھا)

جہاں تک فرار کے نظریے کا تعلق ہے، یہ بیحد سیدھا سادہ ہے۔ آپ جس طرح بھی ممکن ہو فرار ہونے کی کوشش کریں اگر آپ نکل گئے تو ثابت ہے کہ آپ نظریے سے بخوبی واقف ہیں اور اگر پکڑ لیے گئے تو ابھی آپ کو اس میں مہارت حاصل نہیں ہوئی۔ ابتدائی اصول مندرجہ ذیل ہیں: آپ کسی جائے تعمیر سے فرار ہو سکتے ہیں یا رہنے کی جگہ سے بھاگ سکتے ہیں۔ کام کے مقام سے فرار ہونا نسبتاً سہل ہے وہاں بہت سے قیدی ہوتے ہیں، حفاظتی انتظامات اتنے سخت نہیں ہوتے اور مفرور کے پاس اوزار ہوتے ہیں۔ آپ تنہا فرار ہو سکتے ہیں جو زیادہ دشوار ہے لیکن اس صورت میں کوئی آپ کے ساتھ غداری نہیں کرے گا یا پھر آپ گروپ بنا کر بھاگ سکتے ہیں جو نسبتاً سہل ہے لیکن پھر ہر بات کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ کے گروپ کے تمام ساتھی ہم خیال ہیں یا نہیں۔ اصول یہ بھی کہتا ہے کہ آپ کو جغرافیے کا اتنا اچھا علم ہونا چاہیئے جیسے کہ روشنی میں چمکتا ہوا نقشہ آپ کے ہاتھ میں ہو لیکن کیمپ میں نقشہ کبھی آپ کی نظر سے نہیں گزرے گا (اتفاق سے چوروں کو جغرافیے کا کوئی علم نہیں ہوتا، وہ اسے سفری جیل کا شمالی علاقہ تصور کرتے ہیں جہاں انہیں پچھلی بار سردیوں نے پریشان کیا تھا) ایک اور مشورہ: آپ کو اس علاقے کے عوام کے بارے میں واقفیت ہونی چاہیئے جن سے ہو کر آپ کے فرار کا راستہ گزرتا ہے پھر قدرت کی ستم ظریفیوں کے پیش نظر ایک صلاح یہ بھی ہے کہ آپ کو منصوبے کے مطابق فرار کے لیے متواتر تیاری کرتے رہنا چاہیئے لیکن اس کام کو کسی دوسری طرح کرنے کے لیے کسی موقعے کا فائدہ اٹھانے کے لیے ہر لحہ آمادہ رہنا چاہیئے۔

موقع شناسی کی ایک مثال ملاحظہ ہو: ایک بار کینگر میں کال کوٹھری کے تمام قیدیوں کو کچی اینٹیں بنانے کے لیے باہر لے جایا گیا دفعتاً ایسی غبار آلود آندھی آئی جیسے قازقستان میں اکثر آتی رہتی ہے؛ اس کی آمد پر اندھیرا بڑھ جاتا ہے، سورج دکھائی نہیں دیتا، ریت اور سنگ ریزے بڑی طرح آپ کے چہرے سے ٹکراتے ہیں اور درد پیدا کرتے ہیں جس کی وجہ سے آپ آنکھیں کھلی نہیں رکھ سکتے۔ اس طرح اچانک فرار ہونے کے لیے کوئی بھی تیار نہ تھا

نکولائی کراٹیکوف سرحدی باڑ تک گیا، اس نے اپنی جرکن کانٹے دار تار کے اوپر پھینکی، چڑھ کر اس کے پار ہو گیا اور کیمپ حدود کے باہر چھپ گیا۔ آندھی گزر گئی تار پر پڑی ہوئی جرکن سے پتہ چل گیا کہ وہ فرار ہو چکا ہے۔ انہوں نے تلاش کرنے والا گھڑ سوار دستہ روانہ کیا۔ جن کے ہمراہ کتے بھی تھے لیکن سرد آندھی نے بُو اور جانے کا راستہ بالکل صاف کر دیا تھا۔ کراٹیکوف تلاش کے دوران کوڑے کرکٹ کے ایک انبار میں چھپا رہا لیکن اگلے دن اُسے آگے بڑھنا پڑا اور تلاش کرنے کے لیے اسٹیپی کی طرف جو ٹولیاں گئی تھیں اُنہوں نے اُسے حراست میں لے لیا۔

"میئو کا آٹھواں کیمپ ددیز کازگان کے نزدیک واقع نو فورودنوئے تھا اب تم اُسی مقام پر ہو جہاں انہوں نے تمہیں مرنے کے لیے ڈال دیا ہے۔ یہاں سے تمہیں ضرور رفوچکر ہو جانا چاہیئے! چہار سمت ریگستان ہے، نمکین پہاڑ اور ریت کے ٹیلے یا زیادہ سخت زمین جو چھوٹے دلدل گھاس یا پرخار کیمل ویڈ سے پٹی پڑی ہے میدان کے کچھ حصے میں قازق اپنے ریوڑوں کو چراتے ہوئے گھوما کرتے ہیں اور باقی حصے میں انسان کا نام و نشان نہیں ہے۔ دریا بھی نہیں ہیں کہیں کچھ ملنے کی توقع نہیں ہے۔ فرار کے لیے بہترین زمانہ اپریل یا مئی کا ہے جب پگھلتی ہوئی برف کے ڈھیلے کہیں کہیں موجود ہوتے ہیں لیکن کیمپ کے پہریدار اس بات سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں اس لیے اُنہیں اپنے ساتھ ضرورت سے زائد روٹی کا ایک بھی ٹکڑا یا کپڑا لے جانے کی اجازت نہیں ملتی۔

۱۹۴۹ء کی اُن سردیوں میں تین مفرورین، سلو بوڈیانک بزیچینکو اور کوزن نے جنوب کی طرف دوڑ لگانے کا خطرہ مول لیا؛ ان کا خیال تھا کہ دریائے ساریشو کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کائزل اورڈا جا پہنچیں گے لیکن دریا سراسر خشک پڑا تھا جب وہ دوبارہ پکڑے گئے تو تشنگی سے جاں بلب تھے۔

اس تجربے سے سبق لے کر ٹینتو نے طے کیا کہ وہ موسم سرما میں فرار نہیں ہو گا۔ وہ باقاعدگی سے شعبۂ تعلیم و ثقافت میں جایا کرتا تھا یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ کوئی مفرور یا باغی نہیں ہے بلکہ ان دانشور قیدیوں میں سے ہے جو اپنی پچیس سالہ سزا کی تکمیل کے وقت تک اپنے طور طریقے سدھار لینے کی توقع رکھتے ہیں۔ وہ حتی الامکان ہر ممکن معاونت کرتا۔ کیمپ کی تقریبات میں اپنی قلابازیوں کے کھیل اور حافظے کے کرشمے دکھانے کا وعدہ کرتا اور اس دوران شعبۂ تعلیم و ثقافت کا ہر کاغذ پڑھتا رہتا تھا جن میں اُسے آخرش قازقستان کا ایک گھٹیا سا نقشہ مل گیا جو افسر نے بے توجہی میں وہاں چھوڑ دیا تھا۔ ٹھیک ۱۳۵۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع درزو سالی جانے والا ایک کاروانی راستہ تھا اور اس کے کنارے غالباً کنواں بھی ہو گا۔ پھر وہ شمال کی جانب ۴۰۰ کلومیٹر چل کر اسیشم کی طرف جائے گا؛ شاید یہاں پانی کے نزدیک سبز میدان ہوں گے۔ ادھر بلخش جھیل کی طرف جھیا گذالا

ہے جو پانچ سو کلومیٹر کا سپاٹ ریگستان ہے لیکن اس طرف تعاقب کا امکان نہیں ہے۔

فاصلے وہ تھے اور انتخاب یہ تھا۔ متجسس مفرور کا دل نہایت عجیب وغریب خیالات کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ کسی وقت کیمپ میں غلاظت اٹھانے والا ایک ٹرک آیا۔ یہ ایک ٹینک تھا جس پر سکشن پمپ (ہوا کھینچ کر رقیق غلاظت صاف کرنے والا پمپ) لگا تھا۔ پائپ کا مُنہ چوڑا تھا ٹینو اس میں سے رینگ کر آسانی اندر جا سکتا تھا۔ ٹینک میں سیدھا کھڑا ہو جاتا، سر خمیدہ رکھتا اور ڈرائیور غلیظ سیال اس وقت تک ٹینک میں بھرتا رہتا جب تک بالکل اوپر نہ پہنچ جائے۔ تم غلاظت میں لتھڑ جاؤ گے، راستے میں تمہارا دم گھٹ سکتا ہے لیکن ٹینو کو غلاموں کی مانند اپنی سزا کے دن پورے کرنے کے مقابلے میں یہ گوارا نظر آیا۔ اُس نے اپنا جائزہ لیا کیا اُس میں دم ہے؟ ہاں ہے، لیکن ڈرائیور میں؟ اُس کا جرم تو معمولی ہے اور اسے تھوڑی سی سزا کاٹنی ہے اور اس کے پاس باہر جانے کا پروانہ بھی ہے۔ ٹینو نے اس کے ساتھ سگریٹ پی تھی اور اُسے اچھی طرح دیکھا تھا۔ نہیں وہ مناسب آدمی نہیں تھا وہ کسی مفرور کی معاونت کر کے اپنا پروانہ ضائع نہیں کرے گا۔ اس کی ذہنیت اصلاحی مشقت کیمپ کے قیدی کی سی ہے: احمق ہی دوسروں کی معاونت کرتے ہیں:

ان سردیوں میں ٹینو نے ایک منصوبہ بنایا اور اپنے لیے چار ساتھی بھی فراہم کر لیے لیکن ایک بار جب منصوبے کا باریک بینی سے جائزہ لیا جا رہا تھا جیسا کہ اصولاً ضروری ہے تو اُسے اچانک ایک نئی جائے تعمیر پر منتقل کر دیا گیا۔ یہ پتھروں کی ایک کان تھی، پہاڑی جگہ پر واقع تھی جو کیمپ سے نظر نہیں آتی تھی۔ تا حال وہاں نگرانی کی بُرجیاں نہیں بنائی جا سکی تھیں اور نہ کوئی حفاظتی باڑ تھی۔ محض زمین میں بلیاں گاڑ دی گئیں تھیں اور تھوڑے سے تار لگا دیئے تھے تار میں ایک جگہ خالی پڑی تھی جو پھاٹک کا کام دیتی تھی۔ تار کے باہر چھ پہرے دار کھڑے ہوتے تھے اور ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس پر وہ زمین سے کچھ اونچے کھڑے ہو سکیں۔

ان سے آگے اپریل کی اسٹیپی تھی۔ اس کی گھاس تا حال سبز و تازہ تھی اور جہاں تک نگاہ جاتی تھی ٹیولپ پھولوں کا منظر دکھائی پڑتا تھا! ان ٹیولپ پھولوں میں، اس اپریل کی ہوا میں کسی بھی مفرور کا دل قابو میں نہیں رہ سکتا! شاید یہی اس کا موقع تھا؟.... ابھی، جب کہ تم مشتبہ نہیں سمجھے جاتے، ابھی کہ تم چالیس چیکیوں تک نہیں پہنچائے گئے ... یہی وقت ہے نو دو گیارہ ہو جانے کا!

اس دوران ٹینو کیمپ کے بہت سے لوگوں سے واقف ہو چکا تھا۔ اب اُس نے فی الفور چار آدمیوں کا گروپ بنایا: میشا خیداروف (وہ شمالی کوریا میں سیرس دستے میں تھا، ۳۸ ویں عرض البلد پار کر گیا تھا۔ تا کہ کورٹ مارشل سے محفوظ رہے۔ کوریا میں اچھے تعلقات کو

بگاڑنے کی خواہش نہ رکھنے والے امریکیوں نے اُسے واپس کر دیا تھا اور اُسے مربع صدی کی سزائے قید ملی تھی) جازڈک، جو پولش ڈرائیور تھا اور آنڈرس فوج میں رہ چکا تھا۔ وہ اپنے بعیز جوڑے کے جوتوں کی مدد سے ("ایک ہٹلر سے، ایک اسٹالن سے") اپنی داستانِ حیات کے چھینٹے اقتباسات اختصار کے ساتھ سنایا کرتا تھا اور آخری شخص تھا سرگیئی جو کوہیٹیف کا ریلوے کا رکن تھا۔

بعد ازاں ایک لاری آئی جس میں سرحدی باڑ بنانے کے لیے اصلی کھمبے اور کانٹے دار تار کے بنڈل تھے، جیسے ہی کھانے کے لیے چھٹی ملی، منّو کے گروپ نے بیگار کے لیے آمادگی ظاہر کرتے ہوئے، بطورِ خاص جب یہ اُس کی جیل کو زیادہ محفوظ بنانے کے لیے ہو، اپنے آرام کے وقت میں لاری سے سامان اُتارنے کی تجویز رضاکارانہ طور پر پیش کی۔ وہ پچھلے حصّے میں چڑھ گئے لیکن یہ بالآخر کھانے کا وقت تھا اس لیے انہوں نے اس میں زیادہ وقت صرف کیا اور تمام معاملے پر غور و خوض کیا۔ ڈرائیور گاڑی سے دور جا چکا تھا۔ جگہ بجگہ قیدی دھوپ سینکنے کے لیے بیٹھے تھے۔

وہ اس میں فرار ہوں یا نہیں! اُن کے پاس کوئی بھی تیاری نہیں تھی۔ نہ چاقو، نہ سامان، نہ غذا نہ منصوبہ، لیکن اپنے چھوٹے سے نقشے کی بنا پر منّو کو معلوم تھا کہ اگر وہ موٹر لے بھاگیں تو انہیں فوراً دیر دی اور پھر ادلناؤ کی طرف بھاگنا پڑے گا۔ لڑکے اس کو آزمانے کے لیے بیقرار تھے: یہ اُن کا موقع تھا، اُن کی نیک ساعت تھی!

جہاں سے وہ پھاٹک والے پہریدار کی نظر میں تھے وہاں سے راستے میں ڈھلان تھی۔ پھاٹک کے باہر ہی سڑک پہاڑی کے چاروں طرف گھوم جاتی تھی اگر وہ تیزی سے ٹرک چلائیں تو جلد ہی بندوق والوں کی زد سے باہر ہو جائیں گے! اور پہرے دار اپنی جگہ چھوڑ کر جا نہیں سکتے۔

انہوں نے چھٹی ختم ہونے سے پہلے ہی مال اتارنے کا کام پورا کر لیا۔ جازڈک کو موٹر چلانی تھی۔ وہ کود کر نیچے آیا اور لاری میں کنجی داخل کی اور بقیہ تین سستی کے عالم میں عقبی حصّے میں دراز ہو گئے، نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اس توقع کے ساتھ کہ سنتریوں نے یہ نہیں دیکھا ہے کہ وہ کدھر ہیں۔ جازڈک ڈرائیور کو بُلا کر لایا۔ ہم نے تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرایا اس لیے ایک سگریٹ پلاؤ۔ انہوں نے سگریٹیں سُلگائیں۔ ٹھیک ہے، اب اسے اسٹارٹ کرو۔ ڈرائیور لاری میں بیٹھ گیا لیکن انجن نے اسٹارٹ ہونے سے انکار کر دیا (عقبی حصّے میں پڑے ہوئے تینوں اشخاص کو جازڈک کے منصوبے کا علم نہ تھا اور انہوں نے خیال کیا کہ ہماری سعی ناکام ہو گئی ہے۔ جازڈک نے کرینک (چابی) گھمانی شروع کی۔ اب بھی انجن اسٹارٹ نہیں ہوا۔ جازڈک تھک چکا تھا۔ چنانچہ اس نے ڈرائیور کو مشورہ دیا کہ دونوں جگہ تبدیل کر لیں۔ اب جازڈک ڈرائیور کی جگہ آ بیٹھا اور انجن میں فوراً گھڑ گھڑاہٹ پیدا ہو گئی۔ لاری

ڈھلان سے پھاٹک والے پہریدار کی سمت لڑھکنے لگی (جاز ڈک نے انہیں بعد میں بتایا کہ جب ڈرائیور اسٹیرنگ پر تھا تو میں نے تھروٹل کو خراب کر دیا تھا اور جب میں اُس کی جگہ آکر بیٹھا تو جلدی سے اُسے گھما کر ٹھیک کر دیا تھا) ڈرائیور کو جھپٹ کر اندر آنے کی ضرورت نہیں تھی اس نے سوچا کہ جاز ڈک گاڑی روک لے گا لیکن وہ رُکنے کی بجائے تیزی کے ساتھ گیٹ سے آگے نکل گئی۔

"رُک جاؤ" کی دو چیخیں بلند ہوئیں۔ لاری آگے بڑھتی گئی پہرے داروں نے گولیاں چلائیں، پہلے ہوائی فائر ہوئے کیونکہ یہ محض ایک غلطی سی نظر آرہی تھی۔ شاید کچھ گولیاں لاری پر بھی چلائی گئیں۔ مفرورین کو صحیح طور پر علم نہ ہو سکا وہ پٹ پڑے رہے اور ایک موڑ پر پہنچ گئے ایک بار پہاڑی کی آڑ میں ہو جائیں تو وہ گولیوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔ عقبی حصے میں پڑے ہوئے تینوں قیدیوں نے اپنے سر نیچے رکھے۔ یہ راستہ ناہموار تھا۔ اور گاڑی کی رفتار تیز تھی پھر اچانک لاری رُک گئی اور جاز ڈک مایوسی کے عالم میں چیخنے لگا" اس نے غلط موڑ لے لیا تھا اور وہ پھر کان کے پھاٹک کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے جس کی اپنی حدود اور نگرانی کی بُرجیاں تھیں۔

مزید گولیاں چلیں۔ پہرے دار ان کی طرف دوڑے۔ مفرورین نیچے کی طرف منہ کر کے زمین پر لیٹ گئے اور انہوں نے اپنے سروں کو ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ کالونائے کے سنتری ٹھوکریں مار رہے تھے خاص طور پر سر پر، کنپٹیوں پر، اور پھر ریڑھ کی ہڈی پر!

پختہ عالمی اصول: "زمین پر پڑے ہوئے آدمی کو ٹھوکر سے مت مارو" اسٹالن کے کٹورگاہیں نافذ نہیں ہوتا۔ اگر آدمی نیچے پڑا ہو تو وہ یہی کرتے تھے اُسے ٹھوکریں مارتے تھے اور اگر وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو تو گولی مار دیتے تھے۔

لیکن تفتیش کے وقت معلوم ہوا کہ فرار کی کوشش نہیں تھی۔ سب قیدیوں نے بیک زبان کہا کہ جب لاری چلنے لگی تو ہم عقبی حصے میں اونگھ رہے تھے۔ اور بعد ازاں گولیاں چلنے لگیں اگر ہم اس وقت نیچے چھلانگ لگاتے تو کوئی گولی ہمیں لگ جاتی۔ اور جاز ڈک؟ وہ ناتجربہ کار تھا، لاری کو سنبھال نہ سکا موڑ کر وہ گاڑی کو اسٹیپی پر لے جانے کی بجائے اگلی کان تک لے آیا۔

اس طرح وہ صرف مار کھا کر ہی بچ گئے۔[1]

منصوبہ بند فرار کی تیاریاں اپنا وقت لیتی ہیں۔ کمپاس بنانے کا طریقہ: پلاسٹک کا کوئی ڈبہ لے کر اس پر نشانات لگا لو، کسی اسپوک کا ٹکڑا توڑ لو اور اُسے مقناطیسی بنالو اب اُسے لکڑی کے ٹکڑے پر لگا لو، پھر ڈبے میں پانی ڈال دو اور لکڑی کے ٹکڑے کو اس میں تیرنے دو۔ آپ کا کمپاس تیار ہے۔۔۔۔ پینے کا پانی کسی اندرونی ٹیوب میں بآسانی ڈالا جا سکتا ہے جسے مفرور ہونے والا اوور کوٹ میں لے جائے گا۔ یہ تمام اشیاء (اور غذا

نیز کپڑے) آہستہ آہستہ لکڑی کے کارخانے میں منتقل کی جاتی ہیں جہاں سے فرار ہونا ہے اور بڑے آرے کے قریب ایک سوراخ میں چھپا دی جاتی ہیں۔ ایک آزاد ڈرائیور نے اندرونی ٹیوب ان کے ہاتھ فروخت کر دی تھی یہ بھی اب پانی سے لبریز ہے اور اسی سوراخ میں رکھی ہوئی ہے۔ بعض اوقات ٹرین رات میں آتی ہے اور مال لادنے والوں اور ان کے نگرانوں کو کام کی جگہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس وقت انہیں اپنے کام پر دوڑ پڑنا چاہئیے۔ ایک آزاد ملازم نے کیمپ کے علاقے سے لائی ہوئی ایک چادر کے معاوضے میں زیادہ سے زیادہ قیمت دی ہے!) بڑے آرے کے پاس تار کی دو نچلی لائنیں کاٹ دی ہیں اور عمارتی لکڑی اتارنے کے لیے رات تیزی کے ساتھ قریب آ رہی ہے! لیکن ایک قیدی، جو قازق ہے، اُن کے پیچھے پیچھے اس سوراخ تک آ جاتا ہے۔ جسے انہوں نے پوشیدہ مقام بنا رکھا تھا اور اُن کی مذمت کرتا ہے۔

گرفتاری، زد و کوب، پوچھ تاچھ۔ تینو کے معاملے میں بہت سارے اتفاقات تھے جو فرار کی تیاریوں جیسے نظر آتے تھے۔ انہیں کینگر جیل بھیج دیا گیا اور تینو دیوار کی جانب منہ کر کے کھڑا تھا، اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اسی وقت شعبۂ تعلیم و ثقافت کا سربراہ اس طرف سے گزر رہا تھا جو اس کے پاس رک گیا اور بولا:

"کون سوچ سکتا تھا کہ تم ایسی حرکت کرو گے! تم تو کنسرٹ پارٹی کے رکن تھے"! اس کے تئیں یہ انتہائی حیرت انگیز بات تھی کہ جیل کیمپ ثقافت کا مبلغ فرار ہونا چاہئیے۔ کنسرٹ کے دنوں میں انہیں زیادہ خوراک فراہم کی جاتی تھی اس کے باوجود اس نے بھاگ نکلنے کی کوشش کی تھی! کچھ لوگوں کو کبھی مطمئن نہیں کیا جا سکتا!

۹ مئی ۱۹۵۰ء کو مادرِ وطن کی جنگ میں فتحیابی کے پانچویں سالانہ جشن میں بحری فوج کا ایک سابق عہدیدار جارجی تینو شہرۂ آفاق کینگر جیل کی ایک کوٹھڑی میں پہنچ گیا۔ کوٹھری تقریباً تاریک تھی، اس میں بالائی حصے میں صرف ایک روزن تھا اور ہوا کی قلت تھی۔ لیکن کھٹمل بافراط تھے ـــ اور دیواریں کھٹملوں کے خون سے رنگین تھیں۔ اس سال موسمِ گرما میں غیر معمولی شدت تھی اور درجۂ حرارت ۴۰ اور ۵۰ سینٹی گریڈ کے درمیان چل رہا تھا اور ہر شخص کپڑے اتار دیتا تھا۔ تختۂ خواب کے نیچے قدرے خنکی تھی لیکن ایک رات دو قیدی وہاں سے چیختے ہوئے بھاگے۔ انہیں زہریلی مکڑیوں نے وہاں گھیر لیا تھا۔ کینگر جیل کے ساتھی چنیدہ تھے جنہیں متعدد کیمپوں سے لا کر یکجا کیا گیا تھا۔ ہر کوٹھری میں تجربہ کار مفرورین اور ماہرین فن مقیم تھے۔ تینو کو بالآخر اپنے پسندیدہ مستقل مزاج ہم جو مل گئے تھے!

قیدیوں میں کیپٹن آئیوان بور۔ بیوف بھی تھا جو سوویٹ یونین کے دلاور کا تمغہ حاصل کر چکا تھا۔ زمانۂ جنگ میں وہ پسکوف علاقے میں گوریلے دستے کے ہمراہ تھا۔ وہ انتہائی حوصلہ مند اور مستقل مزاج انسان تھا اور قبل ازیں فرار کی ناکام کوششیں کر چکا تھا۔

اور آئندہ انہیں جاری رکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ شومئی قسمت سے اُسے جیل کی چڑیا کا سانولا رنگ نہیں ملا تھا جو مفرور کے لیے بڑا کارآمد ہوتا ہے۔ اُس نے اپنی سپاہیانہ صاف گوئی کو برقرار رکھا تھا۔ اُس کا بھی ایک چیف آف اسٹاف تھا اور وہ تختۂ خواب پر بیٹھ کر آس پاس کا نقشہ بناتے اور کھلے عام منصوبوں پر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ وہ کیمپوں کے منافقانہ اور چوری چھپے والے طریقوں سے ہم آہنگ نہ ہو سکا۔ اور مخبروں کے ہاتھوں اس نے ہمیشہ دھوکہ دیا۔

ان کے دماغ میں ایک منصوبہ اُبھرا: اگر شام کو تقسیم خوراک پر نگرانی رکھنے والا وارڈر تنہا آئے تو اُسے دبوچ لیا جائے پھر اُس کی کنجیوں سے تمام کوٹھریاں غیر مقفل کر دی جائیں قیدی جیل خانے کے بیرونی دروازے کی طرف جھپٹ پڑیں اور اس پر قابض ہو جائیں پھر جیل کا پھاٹک کھول دیں اور کیمپ کے گارڈ ہاؤس کا محاصرہ کریں۔ پہریداروں کو حراست میں لے کر اندھیرا ہوتے ہی کیمپ کے علاقے سے نکل جائیں۔ بعد میں انہیں ایک مکان کی جائے تعمیر پر منتقل کیا گیا تو وہاں بدرَو کی راہ سے بھاگنے کی اسکیم بن گئی!

لیکن ان منصوبوں پر کبھی عمل درآمد نہیں ہوا۔ گرمیوں کے اختتام سے پہلے ہی اس چنیدہ کمپنی کے ہر فرد کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں اور نامعلوم وجوہ سے اسپاسک بھیج دیا گیا وہاں انہیں ایک جھونپڑے میں رکھا گیا جس کی نگرانی کا علیحدہ بندوبست تھا۔ چوتھی رات کو مستقل مزاج مہم جُوؤں نے ایک کھڑکی سے سلاخیں نکال لیں اور وہ صحن میں نکل آئے، بغیر آواز پیدا کیے ہوئے ایک کتّے کو مار ڈالا اور چھت کو پھلانگ کر خاص کیمپ کے علاقے میں پہنچنے کی کوشش کی لیکن لوہے کی چھت اُن کے بوجھ سے گر پڑی اور رات کے سناٹے میں اُس کا شور بجلی کی کڑک جیسا محسوس ہوا۔ وارڈروں نے الارم دے دیا لیکن جب وہ جھونپڑوں میں پہنچے تو ہر شخص آرام کے ساتھ محوِ خواب تھا اور سلاخیں اپنی جگہوں پر لگ چکی تھیں۔ جو کچھ ہوا وارڈروں کا خیال خام تھا۔

کسی ایک جگہ زیادہ دیر تک قیام کرنا اُس کے نصیب میں نہ تھا! مستقل مزاج مفرورین کو فلائنگ ڈچ میں (ایک سیاہ ڈچ بحری جہاز جس کا امیرالبحر جسے ہمیشہ کے لیے طوفانی سمندروں میں سیاحت کرتے رہنے کی سزا دی گئی تھی) کی مانند ناراض مقدر نے ہمیشہ آگے کی طرف ہانک دیا تھا اگر وہ فرار نہیں ہوتے تھے تو ان کا تبادلہ کر دیا جاتا تھا۔ جلدی کرنے والے ان تمام لوگوں کے گروہ کو ہتھکڑیاں لگا کر ایکی بستز کیمپ جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ جہاں اس کیمپ کے اپنے مفرورین برودکن اور موسیانوف اُن کے گروہ میں شامل ہو گئے۔

اپنی مخصوص تعزیری حرکات کے صلے میں انہیں چُونے کی بھٹیوں میں کام کرنے کے

لیے تعینات کیا گیا تھا۔ وہ تیز ہوا میں لاریوں سے خام چُونا اتارتے تھے اور یہ چُونا اُن کی آنکھوں، چہروں، سانس کی نالیوں میں بُجھتا تھا جب وہ بھٹیوں کی صفائی کرتے تھے تو اُن کے پسینے میں شرابور برہنہ جسم بُجھے ہوئے چُونے سے ڈھک جاتے تھے۔ روزانہ کی یہ زہریلی خوراک جو ان کی اصلاح کے لیے فراہم کی جاتی تھی، انہیں جلد فرار ہونے پر مجبور کرتی تھی۔

منصوبہ از خود تیار ہو گیا۔ چونا لاریوں سے لایا جاتا تھا وہ کسی لاری میں ہی بھاگ نکلیں گے۔ سرحدی باڑیں سے فرار ہو جائیں گے جو اس مقام پر ابھی کانٹے دار تاروں کی شکل میں ہی تھی ایسی لاری کا انتخاب کریں جس کی ٹنکی میں کافی پٹرول ہو۔ مفرورین میں کومیا زڈا نوک بھی شامل تھا جو آرابل سے بھاگنے کی ناکام سعی میں ٹینٹو کا شریک کار تھا اس امر پر اتفاق ہو گیا کہ لاری وہی چلائے گا لیکن اتفاق رائے ہو یا نہ ہو، بورو بیوف اتنا مستقل مزاج اور عزم راسخ رکھنے والا انسان تھا کہ وہ اپنے آپ کو کسی دوسرے کے ہاتھوں میں نہیں سونپ سکتا تھا اس لیے جب لاری اُن کے قبضے میں آ گئی (چاقوؤں سے لیس ایک ایک آدمی دونوں طرف کیبن میں بیٹھ گیا اور سفید چہرے والا ڈرائیور اُن کے درمیان ہی بیٹھ سکتا تھا جو نہ چاہتے ہوئے بھی اُن کے ساتھ مفاہمت کرنے پر مجبور تھا) تو بورو بیوف نے اسٹیرنگ وہیل سنبھال لیا۔

ہر منٹ بیش قیمت تھا! اُن سب کو لاری سے چھلانگ لگا دینی چاہیے اور تار کو توڑ کر نکل جانا چاہیے۔" آئیوان۔ اُدھر ہٹو! ٹینٹو نے اس سے درخواست کی جو ایک فرمائش تھی جو آئیوان پوری نہ کر سکتا تھا! ڈرائیور کی حیثیت سے اُس پر بھروسہ نہ کرنے کی وجہ سے ٹینٹو اور زڈا ذوک پیچھے رہ گئے۔ اب صرف تین مفرورین تھے: بورو بیوف، سالوپائیف اور مرٹیروسوف۔ اچانک نہ جانے کس جگہ سے ریڈکن دوڑتا ہوا آیا، وہ دانشور، ماہر ریاضی اور عجیب و غریب شخصیت کا حامل تھا جس کا کوئی ریکارڈ مفرور کی حیثیت سے موجود نہ تھا وہ کسی قطعی دوسری نوعیت کے کام سے ڈسپلن بیرک میں آیا تھا لیکن اس موقع پر وہ نزدیک کھڑا ہوا تھا، اس نے بھانپ لیا کہ کیا ہو رہا ہے اور وہ کسی وجہ سے ہاتھ میں روٹی نہیں صابن کا ایک ٹکڑا لیے ہوئے لاری پر چڑھ گیا۔

"آزادی کی راہ میں میں تمہارا ہمسفر ہوں۔"

(جیسے کوئی کسی بس پر سوار ہوتے ہوئے استفسار کرتا ہے: "یہ بس کیا سیدھے ازگلیائی جائے گی؟")

لاری نے ایک چکر کاٹا اور مدھم رفتار سے آگے بڑھی تاکہ تار کی قطاریں آہستگی کے ساتھ ٹوٹ جائیں! پہلے موٹر کے بمپروں سے، اس کے بعد انجن سے۔ اس کے بعد کیمپ کے باہری حفاظتی علاقے سے لاری کھمبوں کے درمیان گزر سکتی تھی لیکن خاص سرحدی علاقے میں

سے کھمبے دھکا مار کر گرانے پڑتے کیونکہ وہ بہت تھوڑے تھوڑے فاصلے پر نصب تھے ۔

پہلے گیئر میں لاری نے ایک کھمبے پر ٹکریں مارنی شروع کیں ۔

برجیوں پر پہرے دار ہکا بکا رہ گئے: چند روز قبل ایک دوسرے مقام پر ایک حادثہ ہوا تھا جب شراب کے نشے میں دھت ڈرائیور نے خاص الخاص محفوظ علاقے میں ایک کھمبا گرادیا تھا۔ غالباً یہ کوئی دوسرا شرابی ہے؟ پندرہ منٹ تک یہی خیال اُن کے ذہن میں رہا۔ لیکن اس وقت تک کھمبا گر چکا تھا اور لاری دوسرے گیئر میں جا چکی تھی اور پنکچر ہوئے بغیر کانٹے دار تار سے گزر چکی تھی۔ اب گولی چلاؤ! لیکن گولی چلانے کے لیے جگہ ہی نہ تھی۔ پہرے داروں کو قازقستان کی تیز ہواؤں سے محفوظ رکھنے کی غرض سے اُن کی برجیوں پر تین اطراف سے آڑ دی گئی تھی۔ وہ اپنے سامنے والے گھرے ہوئے حصے میں رہ کر ہی گولیاں چلا سکتے تھے.... اب تک لاری اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی اور اسٹیپی کے اوپر تیز دوڑتی ہوئی دھول اڑا رہی تھی۔ پہریداروں نے ہوا میں بے مقصد فائر کیے۔

تمام سڑکیں سنسان تھیں اور اسٹیپی ہموار تھی اس لیے پانچ ہی منٹ میں بوروبیوف کی لاری افق تک پہنچ جاتی لیکن محض اتفاق کہ ایک قیدی ڈھونے والی موٹر جس کا تعلق کیمپ کے شعبۂ نگرانی سے تھا، اس طرف سے گزری۔ یہ مرمت کے لیے موٹروں کے ورکشاپ پر جا رہی تھی۔ اس میں کچھ سنتری سوار ہو گئے اور بوروبیوف کا تعاقب شروع کردیا۔

مہم خاتمے پر آ لگی.... بیس منٹ کے اندر زخمی مفرورین، جن میں ماہر ریاضی ریڈکن بھی تھا، جس کا لہولہان منہ آزادی کا کسیلا نمکین ذائقہ چکھ رہا تھا، لغزیدہ گامی کے ساتھ کیمپ کی جیل میں لائے گئے۔

پھر بھی کیمپ میں خبر پہنچ گئی۔ یہ فرار بیحد دلکش کام تھا اور محض اتفاق تھا کہ انہیں ناکام ہونا پڑا اس لیے دس دن بعد سابق ہوائی فوج کے کیڈٹ بٹانوف اور اس کے دو رفقا نے یہی عمل کیا وہ ایک دوسری کام کی جگہ سے کانٹے دار تار کی باڑ توڑ کر نکل بھاگے اور بس نکلے چلے گئے! لیکن یہ ہوا کہ جلد بازی میں انہوں نے غلط سڑک پکڑ لی اور چونے کی بھٹیوں پر واقع نگرانی کی برجیوں میں سے ایک سے اُن پر گولیاں چلائی گئیں، ایک ٹائر پنکچر کر دیا گیا اور لاری رُک گئی۔ ٹامی گن سے مسلح سپاہیوں نے اُس کا محاصرہ کر لیا "چلو، باہر نکلو!" کیا انہیں باہر نکلنا چاہیئے؟ یا گردن نیچے ڈال کر گھسیٹے جانے کا انتظار کرنا چاہیئے؟ تین میں سے ایک، پسیمنگ نے حکم کی تعمیل کی، وہ لاری سے نکل آیا اور فی الفور غضبناک گولیوں نے اُسے بھون کر رکھ دیا۔

تقریباً ایک ماہ کے اندر ایکی بستنز سے فرار کی تین کوشش کی گئی تھیں — اور اب بھی ٹینو فرار نہیں ہوا تھا! وہ نکل بھاگنے کے لیے ترس رہا تھا۔ انہیں مات دینے کی ناقابل تسخیر عزم ہی نے اُسے بے قرار کر رکھا تھا۔ ساحل پر کھڑے ہو کر آپ تمام غلطیوں کو واضح

طور پر دیکھ سکتے ہیں اور ہمیشہ خیال کرتے ہیں کہ آپ کا عمل اس سے بہتر ہوتا۔ مثلاً اگر زڈانوک نے بورو بیوف کی جگہ گاڑی ڈرائیو کی ہوتی تو وہ جیل گاڑی سے بچ جاتے' یا کم از کم میٹو کا یہی خیال تھا جس وقت بور بیوف کی لاری روکی گئی اسی وقت میٹو اور زڈانوک سوچنے کے لیے بیٹھ گئے کہ ہم کس طرح فرار ہو سکتے ہیں۔

زڈانوک پستہ قامت' مٹ میلے رنگ کا' بیحد چاق وچوبند اور چھٹا ہؤا آدمی تھا۔ وہ اب چھپن سال کا تھا۔ اُسے اپنی جائے پیدائش بائیلوروس سے جرمنی لے جایا گیا تھا اور وہ جرمنوں کے لیے ڈرائیور کا کام کرتا تھا وہ بھی ربع صدی کی سزائے قید کاٹ رہا تھا۔ جب وہ جوش میں آتا تو اُس میں بڑی جان پیدا ہو جاتی تھی' اس نے اپنی ساری قوت اپنے کام میں' ایک جنگ میں' ایک مہم میں لگا دی تھی۔ بیشک اُس میں نظم وضبط کی کمی تھی لیکن یہ صلاحیت میٹو میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔

ہر بات سے یہی اشارہ مل رہا تھا کہ اُن کے فرار کے لیے مناسب ترین مقام چُونے کی بھٹیاں ہیں اگر وہ لاری میں فرار نہیں ہو سکتے تو انہیں محفوظ علاقے کے باہر کوئی لاری چھین کر اپنے قبضے میں لینی ہو گی لیکن اس سے قبل کہ افسرانِ تحفظ اُن کے منصوبے میں مخل انداز ہوں' تعزیری کاموں کے دستے کے فورمین نے اُسے ایک طرف بلایا (وہ بنجارہ تھا) اور اُس کا نام لیوشکا بیروزوف تھا' وہ پستہ قامت تھا لیکن مدِمقابل میں دہشت پیدا کر دیتا تھا کیونکہ اپنے کیمپوں کے قیام کے دوران اس نے درجنوں افراد کو قتل کیا تھا۔ (اس کے لیے کسی معمولی بات پر' سگریٹ کے ایک ڈبے کے لیے قتل کر دینا عام بات تھی)

"میں خود مہم پسند ہوں اور مفرور مجھے اچھے لگتے ہیں۔ یہ تمام گولیوں کے زخموں کے نشانات دیکھو' یہ اس وقت کے ہیں جب میں چیڑ کے جنگل میں فرار ہوا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم بورو بیوف کے ساتھ فرار ہونا چاہتے تھے۔ بس کام کی جگہ سے نہ فرار ہونا' وہاں میری ذمہ داری ہو گی اور میری سزا میں اضافہ کر دیا جائے گا"

بالفاظِ دیگر اُسے مفرورین سے محبت تھی لیکن اپنی ذات سے زیادہ محبت تھی۔ بنجارہ لیوشکا ایک گھٹیا سی زندگی گزارنے پر قانع تھا اور کوئی دوسرا اُس کے سکون کو برباد نہیں کر سکتا تھا۔ پیشہ ور مجرمین کی آزادی سے محبت کا معیار یہی ہوتا ہے۔

لیکن شاید ایکی بسٹز میں فرار کی کاوشوں کا انداز پرانا ہوتا جا رہا تھا؟ ہر شخص کام کی جگہ سے فرار کی کوشش کرتا تھا' کوئی بھی جائے قیام سے نکل جانے کی بات نہیں سوچتا تھا۔ کیا وہ اس کا بیڑہ اُٹھائے گا؟ جائے قیام بھی اس وقت تار سے گھری ہوئی تھی' کوئی ٹھوس فصیل وہاں بھی نہیں تھی۔

ایک دن چُونے کی بھٹی پر انہوں نے سیمنٹ مکسر کا بجلی کا تار خراب کر دیا۔ باہر سے بجلی والا طلب کیا گیا' میٹو نے مرمت کے کام میں اُس کی مدد کی اور زڈانوک نے اُس کی

جیب سے کچھ تار کاٹنے کے اوزار چرا لیے۔ بجلی والے کو علم ہو گیا۔ کیا وہ پہریداروں سے شکایت کر دے؛ شکایت وہ نہیں کر سکتا تھا، خود اُسے اپنی لاپرواہی کے لیے سزا دی جاتی۔ اُس نے پیشہ ور مجرمین کے ہاتھ جوڑے کہ میرے اوزار واپس کر دو لیکن انہوں نے کہا کہ اوزار اُن کے پاس نہیں ہیں۔

جوتے کی بھٹی پر مستقبل میں بھاگنے والوں نے اپنے لیے دو چاقو بنا لیے انہوں نے بیلچے کی دھات کو چھیل کر لوہار کی بھٹی پر تیز کر لیا، ٹمپر کیا اور اُن کے لیے مٹی کے سانچوں میں ٹین کے دستے تیار کیے۔ ٹیتو کے پاس ترکی چاقو تھا، یہ استعمال کے لیے ایک ہلکا پھلکا ہتھیار تھا اور اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس کے پھل کا چمکدار خم بیحد ہولناک نظر آتا تھا۔ اُن کا ارادہ لوگوں کو خائف کرنا تھا مارنے کا نہیں۔ تار کاٹنے کے اوزار اور چاقو وہ اپنی اندرونی پتلونوں کے پائنچوں میں ٹخنوں کے اوپر باندھ کر جائے قیام پر لے گئے اور انہیں جھونپڑیوں کی نیو میں چھپا دیا۔

ایک بار پھر اُن کے فرار کا منصوبہ شعبۂ تعلیم و ثقافت پر منحصر تھا جب اوزار بنائے اور منتقل کیے جا رہے تھے اُسی زمانے میں ایک مناسب لمحے کا انتخاب کر کے ٹیتو نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ اور زڈانوک کیمپ کے ایک کنسرٹ میں حصہ لینا چاہتے ہیں (ایکی بسٹر میں یہ پہلا کنسرٹ ہوتا اور کیمپ کی انتظامیہ اسے معلق نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ وہ قیدیوں کی توجہ سازشوں سے ہٹانے کے ذرائع میں ایک اور کا اضافہ کرنا چاہتی تھی علاوہ ازیں گیارہ گھنٹوں کی شدید مشقت کے بعد انہیں اسٹیج پر اداکاری کے جوہر دیکھنے میں لطف آئے گا) ظاہر ہے کہ زڈانوک اور ٹیتو کو رات میں چالیس چکی والا حصہ بند ہو جانے کے بعد کنسرٹ میں آنے کی اجازت مل گئی جب کہ ابھی کیمپ کے علاقے میں تقریباً رونق تھی اور دو گھنٹے بعد تک ہلچل رہے گی۔ وہ اس وقت تک اجنبی کی طرح کیمپ میں گھومتے رہے، اندازہ لگایا کہ برجیوں پر پہریدار کب تبدیل ہوتے ہیں اور سرحدی باڑ کے نیچے سے رینگ جانے کا سب سے زیادہ سہولت بخش مقام کون سا ہے۔ خود شعبۂ تعلیم و ثقافت میں ٹیتو نے پا فلوور صوبائی اخبار کا بغور مطالعہ کیا، ضلعوں، سرکاری فارموں، اشتراکی زراعتوں، فارم کے سربراہوں، پارٹی کے معتمدوں اور ہر طرح کے نامور اور ماہر کاریگروں* کے نام ازبر کرنے کی کوشش کی بعد ازاں اس نے اعلان کیا کہ میں ایک اسکیچ پیش کروں گا جس کے لیے مجھے اپنے کپڑے کے ذخیرے سے عام شہری کپڑے اور ایک بریف کیس دیا جائے (بریف کیس کے ساتھ فرار ہونے والا ــــ یہ کچھ غیر معمولی سی بات تھی اس طرح اس کی اہمیت بڑھ جائے گی) اجازت مل گئی۔ ٹیتو اب بھی اپنی بحری جیکٹ میں ملبوس تھا اب اُس نے اپنا آئس لینڈ والا لباس نکالا جو ایک شمالی کا نوائے کی یادگار تھا۔ زڈانوک نے اپنے رفیق کار کے سوٹ کیس سے سرمئی رنگ کا ایک بلجیم سوٹ نکالا۔ جو کیمپ کے ماحول میں غیر معمولی طور پر

شاندار لگتا تھا۔ ایک ویتنامی قیدی کے پاس سامان میں بریف کیس تھا یہ بھی نکالا گیا اور کیمپ کی ٹوپیوں کے مقام پر اصل ٹوپیاں بھی آگئیں۔

اسکیم کے لیے اتنی زیادہ ریہرسل کی ضرورت تھی کہ اصل کیمپ کے علاقے میں روشنی گل ہونے تک کا وقت بھی ناکافی تھا اس لیے ایک رات اور پھر دوسری رات مینتو اور زڈلوک چالیس چکا میں سب سے لوٹ ہی نہ سکے اور انہوں نے یہ راتیں ان جھونپڑے میں بسر کیں جس میں شعبۂ تعلیم و ثقافت قائم تھا۔ غایت یہ تھی کہ ان کے وارڈر ان کی غیر حاضری کے عادی ہو جائیں (مفرورین کو کم از کم ایک رات تو آگے رہنا ہوگا!)

فرار کے لیے بہترین ساعت کون سی ہوگی؟ شام کی حاضری کے وقت جب جھونپڑوں کے باہر صفیں بنتی تھیں اور وارڈر قیدیوں کی چیکنگ میں مصروف ہوتے تھے اور قیدیوں کی نگاہیں دروازوں پر مرکوز ہوتی تھیں کیونکہ وہ اپنے بستروں پر پہنچنے کے لیے بے قرار ہوتے تھے۔ بقیہ کیمپ کے علاقوں کو اس وقت کوئی نہیں دیکھتا تھا۔ دن بتدریج چھوٹے ہو رہے تھے اور انہیں ایسے دن کا انتخاب کرنا تھا جب غروب آفتاب کے بعد حاضری ہو چکنے پر جھٹپٹے کے وقت، لیکن اس سے پہلے کہ سرحدی باڑ کے چار جانب قمقمے چھوڑ دیے جائیں، نکلنا ممکن ہو۔ انہیں ان پانچ یا دس بیش قیمت منٹوں کو ضائع نہ کرنا چاہیئے کیونکہ ایک بار قمقمے وہاں پر پہنچ گئے تو رینگ کر نکل جانا ممکن نہیں ہوگا۔ انہوں نے ۱۷ ستمبر، اتوار کا دن منتخب کیا۔ تعطیل کی وجہ سے اور سہولت ہوگی اس طرح وہ شام تک آرام کر کے طاقت یکجا کر سکیں گے اور آخری تیاریوں پر غور و خوض کے لیے وقت بھی نکل آئے گا۔

فرار سے پہلے کی آخری رات! آپ گہری نیند کی توقع نہیں کر سکتے۔ آپ کی سوچ کا سلسلہ طویل تر ہوتا رہتا ہے۔۔۔ کیا کل اس وقت میں زندہ بچوں گا؟ غالباً نہیں۔ اور اگر میں یہیں کیمپ میں رہوں؟ نالی کے کیڑے کی طرح گھسٹ گھسٹ کر مرنے کے لیے؟

نہیں، تمہیں یہ سوچنا ہی نہ چاہیئے کہ تم قیدی ہو۔

سوال یہ ہے کیا تم مرنے کے لیے تیار ہو؟ تیار ہو؟ تو تم فرار کے لیے بھی تیار ہو!

ایک روشن اتوار — اپنے اسکیم کی ریہرسل کے لیے ان دونوں کو تمام دن کال کوٹھڑی سے باہر رہنے کی اجازت تھی۔ یہ دیکھ کر مینتو کو حیرت ہوئی کہ شعبۂ تعلیم و ثقافت میں اس کی ماں کا ایک مراسلہ موجود تھا۔ اسے بھی اسی دن آنا تھا۔۔۔ یہ ایک غمناک مکتوب تھا لیکن شاید اس نے اس کے ارادے کو پختہ تر کر دیا۔۔۔ اس کی اہلیہ اب جیل میں تھی۔ وہ تاحال کسی کیمپ کو نہیں روانہ کی گئی تھی اور اس کی رہائی اس بات کے لیے مشروط ہے کہ اس کا (مینتو کا) بھائی اس غدار (مینتو) سے تعلقات منقطع کر لے۔

مفرورین کے پاس خوراک بہت کم تھی۔ چالیس چکا میں انہیں تھوڑی بہت غذا مل رہی تھی اور روٹیاں جمع کرنے سے شبہات پیدا ہوتے انہیں یقین تھا کہ وہ بستی میں کوئی لاری

اپنے قبضے میں لے لیں گے اور اس پر تیزی کے ساتھ سفر کریں گے لیکن اس اتوار کو گھر سے ایک پارسل بھی موصول ہوا - فرار کے موقع پر اُس کی ماں کی دعائیں۔ گو کوزی کی گولیاں، میکرونی جیٹی کا آٹا یہ چیزیں وہ بریف کیس میں لے جا سکتے تھے۔ سگرٹوں کے بدلے میں مخور کا ٹ لے لیں گے۔ ایک پیکٹ کے علاوہ، جو وہ مریض وارڈ کے اردلی کو پیش کریں گے۔ اور زڈانوک کا نام اس فہرست میں آجائے گا جو اس دن کام سے مستثنیٰ کر دیے گئے تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا: ٹینو شعبۂ تعلیم و ثقافت میں جا کر کہے گا۔ میرا رفیق کار زڈانوک علیل ہے، ہم آج شام کو ریہرسل کے لیے نہیں آسکیں گے۔" چالیس چکی میں وہ وارڈر اور بچارے لیونسکا سے کہے گا: "آج شام کو ہم جھونپڑے میں نہیں لوٹیں گے" ہم ریہرسل کر رہے ہیں"۔ اس طرح دونوں جگہوں میں سے کہیں ان کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔ انہیں ایک کیتوشا (ایک نلکی میں بتی ڈال کر ہاتھ سے تیار کردہ لائیٹر) اور اُسے جلانے کے لیے لوہا اور فلنٹ (چقماق) بھی حاصل کر لینا چاہیئے۔ معذور کے حق میں یہ شے دیا سلائی سے بہتر ہے۔ پھر انہیں حافظے سے اُس کی جھونپڑی میں جا کر آخری ملاقات کرنی چاہیئے وہ ضعیف تاتاری بھی، جو آزمودہ کار مفرور تھا، اُن کے ساتھ فرار ہونے والا تھا لیکن پھر اُس نے طے کیا کہ وہ زیادہ معمر ہے اور اُن کے فرار میں مخل ہو سکتا ہے۔ اب کیمپ میں وہی تنہا آدمی تھا جو اُن کے منصوبے سے واقف تھا وہ اپنے اسٹول پر دوزانو بیٹھا ہوا تھا اُس نے سرگوشی میں کہا، "خدا انہیں کامیاب کرے! میں تمہارے لیے دعا کروں گا" اُس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تاتاری زبان میں کچھ اور الفاظ دہرائے۔

ایکی بسٹر میں ٹینو کے ہمراہ لوبیانسکا جیل کا ساتھی آئیوان کوفرچینکو بھی مقیم تھا! اُسے فرار کے منصوبے کا کوئی علم نہ تھا لیکن وہ اچھا ساتھی تھا۔ وہ نمبردار تھا اور اپنی علیحدہ کوٹھری میں رہتا تھا اسی میں مفرورین اپنے اسکیم کی ضروری چیزیں رکھا کرتے تھے۔ یہی سہولت بخش مقام تھا جہاں ٹینو کی والدہ کے ارسال کردہ پارسل کی جیٹی وغیرہ اُبالی گئی۔ ساتھ ہی کچھ بغیر دودھ کی تیز چائے بھی تیار کی گئی۔ وہ اپنی مختصر سی ٹی پارٹی کا لطف لے رہے تھے، مہمانوں کے دل اُن باتوں میں محو تھے جو انہیں کرنی تھیں اور اُن کا میزبان ایک پُر لطف اتوار کے مزے لے رہا تھا کہ اسی وقت کھردرے تختوں سے تیار کردہ ایک تابوت کھڑکی سے نظر آیا جو گارڈ ہاؤس کی جانب سے مردہ گھر کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔

یہ پائپنک کے لیے تھا جو کچھ دن پہلے گولیوں سے بھون دیا گیا تھا!

"ہاں" کوفرچینکو نے آہ بھر کر کہا، "فرار کی کوشش کرنا بالکل بے کار ہے"!

(اگر اُسے علم ہوتا کہ .....)

جیسے کسی شیطان نے کوفرچینکو کو ترغیب دی ہو کہ وہ اُٹھا، اُن کا پھولا ہوا بریف کیس اُٹھایا، اینٹھ کر کوٹھری میں چاروں طرف گھوما اور کرخت لہجے میں بولا۔

"تفتیش کنندہ افسر اس بارے میں سب کچھ جانتا ہے! تم فرار ہونے کا منصوبہ بنا رہے تھے

وہ مذاق کر رہا تھا۔ اُس کے ذہن میں تفتیش کنندہ افسر کی اداکاری کرنے کا خیال آیا تھا۔

کچھ لوگ مذاق کرتے ہیں.....

(یا شاید یہ ایک رمز یہ بات تھی؟ لڑکو، میں تمہیں سا کہہ سکتا ہوں کہ تم کیا ارادہ رکھتے ہو لیکن میں ایسا نہ کرنے کی صلاح دیتا ہوں!)

جب کو فرچینکو باہر گیا تو مفرورین نے اپنے عام کپڑوں کے نیچے سُوٹ پہن لیے اور تمام نمبر والی پٹیوں کو اُدھیڑ دیا، انہیں محض دو ایک ٹانکوں سے جڑا رہنے دیا ایسا کہ ایک جھٹکے میں علیحدہ ہو جائیں۔ بغیر نمبروں کی ٹوپیاں بریف کیس میں چلی گئیں۔

اتوار خاتمے کے قریب تھا۔ سنہرا سورج غروب ہو رہا تھا۔ ٹینو نے آج جو طویل القامت اور مسرور تھا، نیز زڈانوک نے جو پستہ قامت اور شوخ تھا، اب بھراؤ دار جیکٹوں کو شانوں پر ڈالا اور بریف کیس اُٹھا لیا (اب تک کیمپ کا ہر آدمی اُن کے عجیب و غریب حلیے کا عادی ہو چکا تھا) اور وہ پہلے سے طے شدہ روانگی کے مقام پر پہنچے۔ کچھ جھونپڑوں کی درمیانی گھاس، جو سرحدی باڑ سے زیادہ فاصلے پر نہ تھی اور نگرانی کی ایک بُرجی کے عین مقابل تھی۔ جھونپڑیوں نے اُنہیں دیگر دو نگرانی کی بُرجیوں سے آڑ میں لے رکھا تھا۔ صرف ایک ہی پہریدار اُن کے سامنے کی طرف تھا۔ انہوں نے اپنی بھراؤ دار جیکٹوں کو اتار لیا اور ان پر لیٹ گئے اور شطرنج کھیلنے لگے تاکہ پہریدار کو کوئی خلافِ معمول بات محسوس نہ ہو۔

آسمان مکدّر ہو گیا۔ اب حاضری کا سگنل ہوا۔ قیدی اپنی جھونپڑیوں پر پہنچ گئے۔ مدھم روشنی میں پہریدار اپنی بُرجی پر سے یہ صاف طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا کہ وہ دونوں آدمی تاحال گھاس پر پڑے ہوئے ہیں۔ اُس کی باری ختم ہونے والی تھی اور اب وہ پہلے کی طرح مستعد نہیں تھا۔ تھکا ہوا پہریدار فرار کو ہمیشہ سہل بنا دیتا ہے۔

اُن کا ارادہ تھا کہ تار کھلے میدان میں نہ کاٹیں بلکہ عین بُرجی کے نیچے کاٹیں ظاہر ہے کہ سنتری دُور کی باڑ پر زیادہ دیر تک توجہ دیتا تھا اپنے پیروں تلے کم۔

اُن کے سر نیچے گھاس کے پاس تھے اور شام کا جھٹپٹا تھا اس لیے انہیں وہ جگہ نظر نہیں آتی تھی جس کے نیچے سے رینگ کر وہ کچھ دیر بعد باہر نکلیں گے لیکن اس کا معائنہ پہلے ہی باریکی سے کر لیا گیا تھا۔ سرحدی باڑ کے بالکل باہر کھمبا گاڑنے کے لیے ایک گڈھا بنایا گیا تھا وہاں ایک منٹ کے لیے چھپا جا سکتا تھا۔ کچھ اور آگے سلیگ کے انبار تھے اور پھر سڑک تھی جو سنتریوں کی قیام گاہ سے بستی کی طرف جاتی تھی۔

اسکیم یہ تھی کہ وہ بستی میں پہنچتے ہی کسی لاری پر قبضہ کر لیں گے۔ کسی کو روک کر پوچھیں گے کہ کیا وہ پیسہ کمانا چاہتا ہے؟ ہمیں پُرانے ایکا بسٹز سے شراب کی دو پیٹیاں یہاں لانی ہیں۔ شراب لانے سے کون سا ڈرائیور انکار کرے گا؟ ہم اُس سے سودا کریں گے۔ "نصف لیٹر ٹھیک ہے؟ ایک لیٹر؟ اچھی بات ہے، بیٹھو۔ لیکن کسی سے ایک لفظ بھی نہ کہنا۔" پھر شاہراہ پر ڈرائیور کے ساتھ

اُس کے کیبن میں بیٹھے ہوئے وہ اسے جبڑا باندھ لیں گے، لاری کو اسٹیپی پر لے جائیں گے اور اُسے وہیں بندھا ہوا چھوڑ دیں گے۔ وہ راتوں رات ارنشا پہنچنے کی کوشش کریں گے، لاری کو چھوڑ دیں گے کسی چھوٹی کشتی میں دریا پار کریں گے اور اومسک کی طرف بڑھ جائیں گے!

اب تاریکی مزید گہری ہو گئی تھی۔ اوپر بُرجیوں میں سرچ لائٹیں چمکنے لگی تھیں اُنکی شعاعوں سے سرحد کا باڑ پر روشنی ہو گئی لیکن مفرورین فی الحال ایک تاریک حصّے میں تھے۔ یہی وقت ہے جلد ہی پہرے دار بدل جائے گا، کُتّے ساتھ لائے جائیں گے اور رات کے لیے تعیناتی ہو گی۔

اب جھونپڑوں میں روشنی کر دی گئی۔ وہ حاضری کے بعد قیدیوں کو پلٹتے ہوئے دیکھ سکتے تھے۔ اندر کیسا عمدہ حال ہے، وہاں گرمی ہو گی، راحت ہو گی.... جب کہ اس مقام پر تمہیں ٹامی گن کی گولیوں سے چھلنی کیا جا سکتا ہے اور یہ مزید توہین آمیز ہو گا کیونکہ تم زمین پر پیر پھیلائے پڑے ہو۔

صرف اس وقت تک، جب تک وہ بُرجیوں کے نیچے کھانستے یا چھینکتے نہیں، پہریدار کُتو! پہرہ دیتے رہو۔ تمہارا کام ہے ہمیں یہاں روکنا اور ہمارا کام ہے یہاں سے نو دو گیارہ ہو جانا۔

لیکن آگے کی کہانی ٹیتو کی زبانی سُنیے!

ساتواں باب

سفید بلونگڑے

جارجی ٹینو کی کہانی اسکی زبانی

میں شریکِ غالب ہوں اس لیے پہلے مجھے ہی جانا چاہیے۔ میرے بیلٹ پر چاقو کھونسا ہوا ہے اور تار کاٹنے کا آلہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ میں سرحدی تار سے نکل جاؤں تو میرے پاس آجاتا۔

میں پیٹ کے بل رینگتا ہوا اور اپنے جسم کو زمین کے ساتھ چپکا رکھنے کی کوشش کرتا ہوں مجھے سامنے پہریدار کی طرف نظر اٹھانی چاہیے یا نہیں؟ سامنے دیکھنے کی صورت میں معلوم ہو جائے گا کہ مجھے کون کون سے خطرے درپیش ہیں اور شاید اس کی توجہ بھی اپنی طرف مرکوز کروں گا۔ نگاہ اٹھانے کی کیسی شدید خواہش میرے اندر پیدا ہوتی ہے لیکن میں اوپر نہیں دیکھوں گا

برجی نزدیک آگئی۔ موت بالکل قریب ہے۔ برجی مشین گن کی گویا چٹے اور ان کا نشانہ بننے کا خدشہ محسوس کرتا ہوں مطلب کسی بھی لمحے اس کی کرکراہٹ سنائی دے گی۔ شاید وہ مجھے کبھی دیکھ سکتا ہے اور وہاں کھڑا ہوا مجھ پر ہنس رہا ہے مجھے کچھ اور آگے سرکنے کا موقع دے رہا ہے۔

یہ غالباً سرحدی تار ہے! میں گھوم کر اس کے متوازی لیٹ جاؤں گا۔ میں پہلا تار کاٹتا ہوں۔ تناؤ ختم ہو جانے کی وجہ سے تار کھٹکتا ہے۔ اب مشین گن کا دھاکہ ہوگا ..... نہیں شاید کوئی دوسرا اس کی آواز نہیں سن سکا اگرچہ وہ خاصی بلند تھی۔ میں دوسرا تار کاٹتا ہوں۔ پھر تیسرا۔ میں ایک ٹانگ دوسری طرف اچھالتا ہوں۔ پھر دوسری میرا پاجامہ ایک لٹکتے ہوئے تار کے کانٹے سے الجھ جاتا ہے۔ میں اسے چھڑا آتا ہوں۔ جلد میں کئی میٹر جوتی ہوئی زمین پر رینگتا ہوں۔ میرے عقب میں سرسراہٹ ہوتی ہے۔ یہ کولیا ہے۔ لیکن وہ اتنی تیز آواز کیوں پیدا کر رہا ہے؟ بلاشبہ یہ بریف کیس ہے جو زمین پر گھسٹ رہا ہے۔ یہ رہے خاص باڑ کے ستون۔ تار آڑے ترچھے لگے ہیں۔

میں ان سے میں چند تار کاٹ دیتا ہوں۔ اب ایک پیچ دار الجھاوا ہے۔ میں لمبے دو تار کاٹتا ہوں اور ایک راستہ بنا لیتا ہوں۔ اب میں خاصا ملبڑی کچھ قطاروں کو کاٹ دیتا ہوں۔ کیا ہم زور زور سے سانس لے رہے ہیں؟ شاید نہیں۔

اب بھی وہ فائر نہیں کرتا۔ کیا وہ گھر کے خواب دیکھ رہا ہے یا شاید آج رات کے رقص کی باتیں سوچ رہا ہے۔

میں اپنا جسم بیرونی باڑ کے اوپر سے اچھالتا ہوں۔ ابھی کانٹے دار تاروں کا ایک اور الجھاوا ہے میں اس میں پھنس جاتا ہوں اور تار کاٹ کر اپنے آپ کو اس سے آزاد کرتا ہوں مجھے پورا یقین نہیں ہے، شاید ابھی بیرونی ڈھلان والے بیز شیر بھی آگے ملیں گے۔ یہ رہے۔ میں انھیں بھی کاٹ دیتا ہوں۔

اب گڑھے کی طرف رینگ رہا ہوں۔ یہ آگیا۔ ٹھیک وہی ہے جہاں اسے ہونا چاہیے میں اس میں اتر جاتا ہوں۔ کولیا بھی اتر جاتا ہے۔ ہم دم لینے کے لیے تھم جاتے ہیں۔ لیکن ہمیں جلد آگے بڑھ جانا چاہیے۔ اب کسی بھی لمحے پہلے سنتری کی چھٹی ہو جائے گی اور کتے یہاں پہنچ جائیں گے۔

ہم گڑھے سے باہر نکلتے ہیں اور سلیگ (فضول دھات) کے انبار کی جانب رینگتے ہیں اب بھی ہم ادھر ادھر دیکھنے یا نظر اٹھانے کی جرأت نہ کرتے۔ اس جگہ سے باہر نکلنے کی عجلت میں کولیا ہاتھ پیروں پر کھڑا ہو جاتا ہے میں اسے پھر نیچے کھینچ لیتا ہوں۔

ہم سلیگ کا پہلا ڈھیر چیتے کی طرح رینگتے ہوئے پار کر لیتے ہیں۔ میں تار کاٹنے کا آلہ ایک پتھر کے پیچھے رکھ دیتا ہوں۔

یہ سڑک ہے کچھ اور آگے بڑھ کر ہم کھڑے ہو جاتے ہیں۔

کوئی گولی نہیں چلاتا۔

ہم آگے چل پڑتے ہیں۔ بغیر عجلت کیے۔ وقت آگیا ہے ہمیں اب اپنے آپ کو قریب کی کھلی جیل کے کمینوں جیسا بنا لینا چاہیے۔ ہم اپنے سینے اور گھٹنوں پر ٹنکے ہوئے نمبر پھاڑ دیتے ہیں۔ دفعتاً تاریکی میں سے دو آدمی ہماری طرف آتے ہیں۔ وہ گریغ سے آبادی کی جانب جا رہے ہیں۔ وہ فوجی ہیں اور ہماری پشت پر تا حال نمبر لگے ہوئے ہیں!

"دانیا! میں بآواز بلند کہتا ہوں، "کیا ہم نصف لیٹر کا کوئی بندوبست کر سکتے ہیں؟"

ہم آہستہ آہستہ چلتے ہیں [illegible] نہیں پہنچا ہے اس کی طرف گامزن ہیں۔ ہم رفتار کم کر دیتے ہیں تاکہ وہ آگے نکل جائیں۔ لیکن سیدھے ان کی سمت میں بڑھتے ہیں اور اپنا چہرا چھپانے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ ہم سے دو گز کے فاصلے سے گزر جاتے ہیں۔ اپنی پشت ان کی طرف سے چھپائے رکھنے کے لیے ہم تقریباً رک جاتے ہیں۔ وہ نکل جاتے ہیں۔ اپنے معاملات پر گفتگو کرتے ہوئے۔ اور ہم ایک دوسرے کی پشت پر لگے ہوئے نمبر چاک کر دیتے ہیں!

کیا ہم نگاہوں میں آنے سے بچ گئے ہیں۔

کیا ہم آزاد ہیں؟ کیمپ کے اوپر ایک زوردار چمک پیدا ہوتی ہے۔ ایک اور! پھر تیسری! انھیں ہمارے فرار کا علم ہو گیا ہے۔ فوراً تلاش شروع کر دی جائے گی۔ ہمیں بھاگنا پڑے گا! اب ادھر ادھر دیکھنا نہیں ہے۔ اب غور و فکر کے لیے رکنا نہیں ہے۔ اب احتیاط کے ساتھ حساب نہیں لگانا ہے۔ ہمارا شاندار منصوبہ مٹی میں مل گیا۔ اب ہم دوڑ کر اسٹیپی میں پہنچ جاتے ہیں تاکہ حتی الامکان کیمپ سے دور ہو جائیں۔ ہماری سانس پھول جاتی ہے، ہم نے زمین کے گڑھوں پر گر پڑتے ہیں۔ پھر تیزی کے ساتھ اٹھتے ہیں۔ ادھر یکے بعد دیگرے روشنی کے راکٹ فضا میں بلند ہو رہے ہیں! فرار کی سابقہ کوشش کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم خیال کرتے ہیں کہ تھوڑی دیر میں اسٹیپی پر گھوڑ سوار تلاش کرنے پہنچ جائیں گے ان کے ساتھ زنجیروں میں بندھے ہوئے کتے ہوں گے اس لیے ہم اپنی ساری تحقیق محو کا اپنے نقشِ پا پر چھڑک دیتے ہیں اور لمبے لمبے چھلانگیں لگاتے ہوئے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب ہمیں بستی کے چاروں طرف طواف کرتے جانا ہوگا اور فی الحال اسٹیپی پر ہی رہنا ہوگا۔ اس طرح

بہت وقت صرف ہوگا اور دقتیں پیش آئیں گی۔ گویا کو شبہ پیدا ہوتا ہے کہ میں اسے صحیح راستے پر نہیں لے جا رہا ہوں۔ مجھے ناگواری محسوس ہوتی ہے۔

لیکن یہ پالوورد ریلوے کی لائن ہے۔ اسے دیکھ کر ہم بے حد مسرور ہیں۔ ریلوے لائن سے ہم ایک بستی کی دور دور تک پھیلی ہوئی روشنیاں دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ وہ تو ہم نے جتنا کچھ دیکھا ہے، اس سے بہت بڑا معلوم ہوتا ہے۔

ہم اپنے لیے ایک ایک لکڑی اٹھا لیتے ہیں، ان کا سہارا لیتے ہوئے ہم ایک ایک پٹڑی پر آگے بڑھتے ہیں ایک بار کوئی ٹرین نکل جائے گی تو کتے پٹڑیوں پر ہماری بو نہیں سونگھ سکیں گے۔ ہم اس طرح تقریباً ۱۰۰ میٹر تک جاتے ہیں، پھر کچھ چھلانگیں لگاتے ہیں ـــ اور اسٹیپ میں آ جاتے ہیں۔

آخرکار ہم آزادی سے سانس لے سکتے ہیں۔ ہم گانا اور چیخنا چاہتے ہیں ایک دوسرے کو شانوں سے پکڑ کر ہلاتے ہیں ہم سچ مچ آزاد ہیں! کس طرح ہم فرار ہونے کا تہیہ کرنے پر، فرار میں کامیابی حاصل کرنے پر اور کتوں سے بچ نکلنے پر اپنی تعریف کرتے ہیں!

اگرچہ ہماری قوتِ ارادی کی آزمائش اب شروع ہو رہی ہیں لیکن ہم محسوس کرتے ہیں جیسے خطرناک ترین وقت گزر چکا ہے۔

آسمان صاف ہے، سیاہ اور ستاروں سے لبریز۔ بہت سی روشنیوں کے ساتھ کیمپ سے یہ حسین منظر کبھی نظر نہ آتا تھا۔ قطب ستارے کی مدد سے سمتوں کا تعین کرنے کے بعد ہم شمال سے شمال مشرق کی جانب روانہ ہوتے ہیں بعد ازاں ہم داہنی جانب مڑ جائیں گے اور اٹشا پہنچ جائیں گے۔

اس پہلی رات میں ہمیں زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہیے۔ اس طرح ہم اس علاقے کو، کئی گناہ وسعت دے دیں گے۔ جس میں ہمیں تلاش کرنے والوں کو بھٹکنا پڑے گا۔ مختلف رکاوٹوں کے دوران ہمیں جو کبھی پرجوش نغمہ یاد آتا ہے۔ گاتے چلے جاتے ہیں اور آٹھ کلومیٹر فی گھنٹے کے حساب سے راستہ طے کر لیتے ہیں لیکن چونکہ کئی مہینوں سے اپنی کوٹھڑیوں میں ہی محصور رہے ہیں۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری ٹانگیں چلنے میں دقت محسوس کرتی ہیں اور ہم تھک جاتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ ہمیں پہلے ہی ہو گیا تھا لیکن ہمیں امید تھی کہ ہم سواری پر سفر کریں گے!) ہم آرام کی غرض سے لیٹنا شروع کرتے ہیں اور اپنی ٹانگیں ریڈ انڈینوں کی جھونپڑی کے کھمبوں کی طرح ہوا میں جوڑ لیتے ہیں۔ پھر آگے بڑھتے ہیں پھر لیٹ جاتے ہیں۔

ہمارے عقب میں ایکی بستی کی روشنیاں بتدریج دھندلا پڑتی جا رہی ہیں۔ ہم کئی گھنٹوں سے چل رہے ہیں لیکن اب بھی آسمان پر روشنی کی چمک موجود ہے۔

لیکن اب رات ختم ہونے پر آ گئی ہے اور مشرق میں سفیدۂ سحری نمودار ہونا چاہیے۔ دن کے وقت ہم کھلی اسٹیپ پر سفر جاری نہ رکھ سکیں گے اور نہ اس پر پوشیدہ رہنا سہل ہوگا، علاوہ ازیں نزدیک ہی [illegible] ہوا اور ہم جانتے ہیں کہ ہمیں آسمان سے بھی تلاش کیا جا رہا ہوگا۔

چنانچہ ہم اپنے چاقوؤں سے چھپنے کے لیے گڑھے کھود لیتے ہیں۔ زمین سخت اور مضبوط ہے اور اسے

کھودنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے) جو نصف میٹر چوڑے اور تیس سینٹی میٹر (ایک فٹ) گہرے ہیں اور ہم سر سے پیر تک چھپ کر پڑ جاتے ہیں اور اپنے اوپر اسپٹی کی خشک کانٹے دار زرد جھاڑیاں ڈھانپ لیتے ہیں۔ اب سونے کا اور اپنی قوت کو یکجا کرنے کا وقت ہے! لیکن سونا ممکن نہیں ہے۔ تمام دن اس طرح بارہ گھنٹے تک بے بسی کے عالم میں پڑے رہنا رات بھر چلنے سے زیادہ دقت طلب کام ہے۔ خیالات کی رو نہیں رکتی دھوپ ستمبر کی دھوپ پڑ رہی ہے، پینے کے لیے کچھ نہیں ہے اور کچھ ہوگا بھی نہیں۔ ہم نے قازقستان میں مفرورین کا ضابطہ توڑا ہے۔ موسم بہار میں فرار ہونا چاہیے۔ موسم سرما میں نہیں..... لیکن ہم نے تو سواری سے فرار کا منصوبہ بنایا تھا۔ ہمیں یہ صورت صبح صبح پانچ بجے سے رات کے آٹھ بجے تک برداشت کرنا ہے۔ ہمارے بدن درد کرنے لگے ہیں اور سن پڑ گئے ہیں لیکن ہم پہلو نہیں بدل سکتے۔ اگر ہم اوپر آ جائیں یا کٹیل جھاڑیوں کو حرکت دیں تو کوئی گھڑ سوار ہمیں دور سے دیکھ سکتا ہے۔ ہم دونوں نے دو دو سوٹ پہن رکھے ہیں اس لیے ہم گرمی سے نیم جاں ہو گئے ہیں۔ مسکراؤ اور برداشت کرو۔

آخرش اندھیرا ہو ہی گیا۔ مفرورین کے کام کا وقت یہی ہے۔

ہم اٹھتے ہیں۔ ہماری ٹانگوں میں درد ہے اور کھڑے ہونے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ ہم آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہیں اور اپنے اکڑے ہوئے اعضا کو معمول پر لانے کی سعی کرتے ہیں ہم میں ذرا بھی طاقت نہیں ہے سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے چبانے اور گلوکوز کی گولیاں چوسنے کے علاوہ ہم نے تمام دن کچھ کھایا پیا نہیں ہے۔

تاریکی میں ہمیں آج رات کے خدشات سے چوکنا رہنا ہے یقیناً انھوں نے یہ خبر دور دور تک مشتہر کر دی ہوگی، تمام سمتوں میں موٹریں روانہ کر دی ہوں گی۔ بطور خاص اوسک کی طرف۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ انھیں ہماری حرکت اور شطرنج کے مہرے کب اور کیسے ملے ہوں گے؟ وہ نمبروں سے فوراً معلوم کر لیں گے کہ مفرورین کون ہیں۔ فہرستیں اور ریکارڈ دیکھنے نیز حاضری لینے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

ہم چار کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے زیادہ تیز نہیں چل سکتے۔ ہم بار بار آرام کرنے کے لیے لیٹ جاتے ہیں پانی! پانی! اس رات ہم بیس کلو میٹر سے زیادہ نہیں چل پائے۔ اس کے بعد ہمیں چھپنے کے لیے پھر کوئی جگہ تلاش کرنی پڑتی ہے اور ہم دن کا آزار جھیلنے کے لیے لیٹ جاتے ہیں ہم کو گمان گزرتا ہے کہ مکانات نظر آ رہے ہیں لیکن اچانک وہاں اسٹیپ پر بڑی بڑی چٹانیں نظر آتی ہیں۔

شاید ان کے نشیب میں پانی ہو؟ نہیں..... لیکن ایک چٹان کے نیچے سوراخ سا ہے۔ شاید گیدڑ وغیرہ نے کھودا ہے۔ اس کے اندر دبکنا مشکل ہے اور اگر چٹان لڑھک پڑی تو کیا ہوگا! آپ کا قیمہ تیار ہو جائے گا اور ممکن ہے فوراً موت واقع نہ ہو۔ اب کچھ خنکی ہو رہی ہے۔ صبح سے ہماری آنکھ جھپکی تک نہیں، ہم دن میں سو نہیں پاتے ہم اپنے چاقو نکال لیتے ہیں اور انھیں ایک پتھر پر تیز کرنے لگتے ہیں۔ پچھلے قیام پر جب ہم نسان سے گزرے کھو دستے تو ان کی دھار کند ہو گئی تھی دن میں ہمیں نزدیک ہی پہیوں کی گڑگڑاہٹ سنائی پڑی۔ یہ بڑی بات تھی۔ ہم کسی سڑک کے پاس تھے ایک قانق ہمارے نزدیک سے سواری پر گزرا جب خود بخود گنگنا رہا تھا کیا ہم اچھل کر باہر آ جائیں

اور اس کے پیچھے دوڑیں۔ شاید اس کے پاس پانی ہو۔ لیکن اس علاقے کو دیکھے بھالے بغیر ہم اس سے کس طرح نمٹ سکیں گے۔ ہو سکتا ہے کوئی ہم کو دیکھ لے۔

— کیا تلاش کرنے والی پارٹی اس سڑک سے نہیں گزر سکتی؟ ہم احتیاط کے ساتھ گڑھوں سے سرک کر باہر آگئے اور زمین پر بیٹھے بیٹھے ٹھیک چار جانب نظر دوڑائی۔ سو میٹر کے فاصلے پر ایک شکستہ مکان تھا۔ ہم رینگتے ہوئے وہاں پہنچے۔ اس میں کوئی نہ تھا۔ کوئی کنواں نہیں — یہ کوڑے کرکٹ سے بھرا پڑا تھا۔

ایک گوشے میں پیروں سے دبا ہوا بھُس تھا۔ کیا ہم کچھ دیر کے لیے وہاں لیٹ جائیں؟ ہم دراز ہو گئے۔ نیند نہیں آرہی ہے۔ یا الٰہی! کھٹمل کس بری طرح کاٹ رہے ہیں۔ کھٹمل! اتنے بڑے بڑے اور اتنی کثیر تعداد میں! گویا کی ہلکی سرمئی جیکٹ کھٹملوں سے سیاہ ہو گئی۔ ہم نے اپنے بدن کو جھاڑ پونچھ کر صاف کیا اور دوبارہ رینگتے ہوئے گیہوں کے کھیت میں پہنچ گئے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا، ہماری طاقت زائل ہو رہی تھی اور ہم چل نہیں پا رہے تھے۔

شام ہوئی تو ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم بہت کمزور تھے۔ پیاس نے ہمیں مار دیا تھا۔ ہم نے زیادہ دائیں طرف چلنے کا تہیہ کیا۔ تاکہ اگر ممکن ہو تو جلد پہنچ سکیں۔ شفاف رات، سیاہ آسمان، تاروں سے بھرا ہوا۔ پیگاسس اور پارسیئس تاروں کے جھرمٹ پر۔ میں جب بھی نگاہ ڈالتا ہوں ایک بیل کا ہیولا بنانے کی کوشش کرتا ہوں جس کا سر نیچے ہے اور وہ آگے کی طرف زور لگا رہا ہے اور ہمیں آگے بڑھنے کی ترغیب دے رہا ہے پھر وہ دونوں جھرمٹ مل کر ایک ہو جاتے ہیں اور ہم آگے بڑھ جاتے ہیں۔

دفعتاً ہمارے سامنے آسمان میں راکٹ روشن ہو جاتے ہیں! اب وہ ہم سے آگے ہیں۔ ہم اپنے پیروں پر تھم جاتے ہیں۔ ہمیں ایک فصیل سی نظر آتی ہے یہ ریلوے لائن ہے اب راکٹوں کا گرنا بند ہو گیا ہے۔ لیکن کسی سرچ لائٹ کی شعاع ریلوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور ادھر ادھر حرکت کرتی ہے۔ ایک ہینڈ کار اسٹیشن پر جستجو میں مصروف ہے اب وہ کسی بھی لمحے میں ہمیں دیکھ لیں گے۔ اور سب کچھ ختم ہو جائے گا — ہم خود کو احمق اور لاچار محسوس کرتے ہیں۔ شعاعوں کی رسائی کے اندر دیکھ لیے جانے کے انتظار میں!

شعاع ہم پر سے گزر گئی اور ہم نگاہوں میں نہ آسکے۔ ہم اچھل پڑتے ہیں ہم دوڑنے سے قاصر ہیں لیکن حتی الامکان تیزی کے ساتھ ریلوے لائن سے دور ہٹ جاتے ہیں لیکن جلد ہی آسمان پر بادل چھا جاتے ہیں اور ادھر ادھر بھاگ دوڑ کرنے کے دوران ہمیں سمتوں کا احساس نہیں رہتا۔ اب ہم تقریباً اندازے سے چل رہے ہیں۔ ہم کچھ ہی کلومیٹر چل پاتے ہیں اور یہ بھی بے سمتی میں طواف کرنے کے مترادف ہے۔

ایک رات ضائع ہو گئی ...... اب پھر روشنی ہو رہی ہے۔ ایک مرتبہ پھر ہم اسٹیپ کی جھاڑیاں توڑتے ہیں۔ ہمیں ایک گڑھا کھودنا پڑے گا۔ لیکن اب میرے پاس اپنا خیمہ ترکی چاقو نہیں ہے یا تو وہ وہیں رہ گیا جہاں میں لیٹا ہوا تھا یا پھر ریلوے لائن سے بھاگتے ہوئے کہیں گر گیا۔ سیاس یا کوئی مزدور چاقو کے

کے بغیر کیسے کام چلا سکتا ہے؟ ہم دونوں کو لیک کے چاقو کی مدد سے گڑھا تیار کرتے ہیں۔

اس معاملے کا ایک اچھا پہلو بھی ہے۔ ایک نجومی نے مجھے بتایا تھا کہ میں ۳۰ سال کی عمر میں مروں گا انسان کو توہمات سے کبھی چھٹکارا نہیں ملتا۔ لیکن اب جو دن نکل رہا ہے وہ ۱۰ ستمبر میری سالگرہ کی تاریخ ہے۔ آج میں ۲۹ برس کا ہو گیا۔ اب اس پیشین گوئی کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوگا، میں زندہ رہوں گا۔

ایک بار پھر ہم گڑھے میں ساکت و صامت اور پیاسے پڑے ہوئے ہیں اگر ہم کو نیند آ جاتی — لیکن وہ نہیں آتی۔ اگر بارش ہو جاتی! وقت گزر رہا ہے! حالت خراب ہے۔ ہمیں بھاگتے ہوئے تقریباً تین دن ہو گئے ہیں اور تا حال پانی کی ایک بوند بھی نصیب نہیں ہوئی — ہم روز گلوکوز کی ۵ گولیاں نگل رہے ہیں اور ہم زیادہ آگے نہیں بڑھ سکے ہیں — شاید ارش کا ایک تہائی فاصلہ ہی طے کیا ہے اور کیمپ میں ہمارے دوست خوش ہو رہے ہیں کہ ہم "سبز میدانی" ملک میں آزادی سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔

شام کا جھٹپٹا ہے۔ ستارے۔ راستہ شمال مشرقی — ہم کوشش کرتے ہوئے بڑھ رہے ہیں اچانک فاصلے پر ہمیں آوازیں سنائی دیتی ہیں — "وا۔ وا۔ وا۔ وا" یہ کیا ہے۔ ہمیں ژلدکے ماہر کوڈلہ کا خیال آتا ہے اس کے بقول اس قسم کی آواز قازق اس وقت نکالتے ہیں جب وہ اپنی بھیڑوں کو بھیڑیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بھیڑ! ہمیں ایک بھیڑ مل جائے تو ہماری جان بچ جائے! آزادی کے زمانے میں ہم نے خون پینے کی بات کبھی خواب میں بھی نہ سوچی تھی۔ لیکن یہاں اس وقت — بس لنبے ہاتھ لگ جانے دو۔

ہم دبکتے ہوئے وہاں پہنچتے ہیں، رینگتے ہوئے۔ مکان ہیں لیکن کوئی کتا نظر نہیں آتا۔ مکان میں داخل ہونا بے حد خطرناک ہے — اگر کوئی مل گیا تو ہم اپنا سراغ چھوڑ جائیں گے۔ ہم بھیڑ کی کھال سے ڈھکی ہوئی کچی اینٹوں سے بنی جھونپڑی تک رینگ کر پہنچتے ہیں۔ ہاں یہ ایک قازق عورت ہی تھی جو بھیڑیے کو بھگانے کے لیے چنگھاڑ رہی تھی۔ ہم باڑے کی ایک پچھلی دیوار پھلانگ کر اندر پہنچ جاتے ہیں میرے دانت چاقوں کا کام دے رہے ہیں ہم زمین پر رینگتے ہوئے بھیڑ کا شکار کر رہے ہیں لیکن وہ بار بار گرفت سے نکل جاتی ہے ایک بار پھر ہم زمین پر رینگتے۔ دوسرے مختلف سمتوں میں آگے بڑھتے ہیں کیا میں کسی طرح ایک بھیڑ کی ٹانگ پکڑ سکتا ہوں۔ وہ بھاگ جاتی ہیں (بعد میں اپنی غلطی سمجھ میں آئی — چونکہ ہم رینگ رہے ہیں اس لیے بھیڑیں ہمیں جنگلی جانور تصور کرتی ہیں۔ ہمیں سیدھے کھڑے ہو کر ان کے پاس جانا چاہیے۔ جیسے ہم ان کے مالک ہوں اور وہ چپ چاپ ہمارے ہاتھ آ جائیں۔)

قازق عورت محسوس کر لیتی ہے کہ باڑے میں کچھ گڑبڑ ہے ہمارے نزدیک آ کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرتی ہے اس کے پاس روشنی نہیں ہے لیکن وہ مٹی کے ڈھیلے اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگتی ہے

اور یہ کیا لیا کھتے ہیں اب وہ براہ راست میری طرف آرہی ہے، اب وہ کسی بھی لمحے مجھ پر پاؤں رکھ دے گی! یا تو
وہ ہمیں دیکھ لیتی ہیں یا ہماری موجودگی سے واقف ہو جاتی ہے اور چیختی ہے "بھوت! بھوت!" وہ ہم سے دور
بھاگ جاتی ہے اور ہم اس سے ہم دیوار پھلانگ کر چپ چاپ ہٹ سکتے۔ آدمیوں کی آوازیں، پرسکون آوازیں
شاید وہ کہہ رہے ہیں کہ بیوقوف عورت نے بھوت دیکھ لیا ہے۔"

ہار گئے۔ ٹھیک ہے، چلو آگے بڑھیں

ایک گھوڑے کا ہیولا آہ! کتنا خوبصورت ہے! بس جس کی ہمیں ضرورت ہے ہم اس کے قریب کے قریب
پہنچتے ہیں وہ اطمینان سے کھڑا رہتا ہے۔ ہم اس کی گردن پر تھپکیاں دیتے ہیں۔ اس کو رسی سے باندھتے ہیں زنڈالوک
کو سوار ہونے میں مدد دینے کے لیے میں اس کے پیر کو سہارا دیتا ہوں لیکن خود سوار نہیں ہو پاتا۔ میں کتنا لاغر ہو گیا
ہوں! میں اپنے ہاتھوں سے چمٹ جاتا ہوں - لیکن اپنی ٹانگیں اوپر نہیں لے جا پاتا۔ گھوڑا ابھر رکتا
ہے اچانک وہ رسی تڑا لیتا ہے اور زنڈالوک کو لے کر بھاگ جاتا ہے اور اسے پھینک دیتا ہے خوش قسمتی سے
رسی (بیلٹ) اس کے ہاتھ میں رہ جاتی ہے۔ ہم کوئی نشان نہیں چھوڑتے: وہ ان تمام باتوں کو شیطان کا
کارنامہ قرار دے سکتے ہیں۔

ہم نے گھوڑے کے ساتھ کارروائی سے اپنے آپ کو تھکا مارا ہے چلنے میں پہلے سے زیادہ دقت ہوتی
ہے۔ اب جتی ہوئی زمین پار کر لی ہے۔ ہمارے پاؤں زمین میں دھنس دھنس جاتے ہیں اور ہمیں انہیں کھینچنا
پڑتا ہے۔ لیکن یہ اتنا خراب عمل نہیں ہے۔ جہاں زمین جوتی جاتی ہے وہاں لوگ ہوتے ہیں، پانی ہوتا ہے۔

ہم آگے چلنے میں زور لگاتے ہیں، اپنے آپ کو گھسیٹتے ہیں اور ہیلو! ہم پھر زمین پر دراز ہو جاتے
ہیں اور رینگتے ہیں۔ گھاس کے انبار۔ سبز میدان۔ بہت عمدہ! کیا ہم ارلش کے قریب ہیں؟ (افسوس ہم اب
بھی اس سے بہت دور ہیں) ایک آخری کوشش کر کے ہم گھاس کے انبار پر چڑھ جاتے ہیں اور اپنے آپ کو
اس میں چھپا لیتے ہیں۔

اور اس رتبہ ہم تمام دن محو خواب رہے۔ اپنے فرار کی پہلی رات کو شامل کر کے ہم پانچ راتوں
سے جاگ رہے ہیں۔

ہم دن کے اختتام پر بیدار ہوتے ہیں اور ایک ٹریکٹر کی آواز سنتے ہیں۔ ہم احتیاط کے ساتھ گھاس
ہٹاتے ہیں اور اپنے سر ایک انچ بلند کرتے ہیں۔ دو ٹریکٹر آ گئے ہیں۔ وہاں ایک جھونپڑی ہے شام ہو گئی ہے۔
ایک عمدہ خیال! ٹریکٹر کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے پانی ہوگا۔ ڈرائیور سو جائیں تو ہم پی سکیں گے۔
جھٹپٹا ہو جاتا ہے ہم نے اپنے فرار کا چوتھا دن مکمل کر لیا ہے۔ رینگ کر ہم ٹریکٹر کے قریب پہنچتے ہیں
خوش قسمتی سے وہاں کتے نہیں ہیں ہم چپ چاپ ٹالی کے ڈھکن تک پہنچتے ہیں اور ایک گھونٹ پیتے ہیں
اچھا نہیں ہے۔ پانی میں مٹی کے تیل کی آمیزش ہے، ہم اسے تھوک دیتے ہیں۔

ان لوگوں کے پاس سب کچھ ہے ان کے پاس کھانا ہے، پانی ہے۔ کیوں نہ ہم بھکاریوں کی
مانند دروازے پر دستک دیں "بھائیو! نیک بندو! ہماری مدد کرو! ہم مجرم اور مفرور قیدی ہیں!" جیسا کہ
انیسویں صدی میں ہوا کرتا تھا۔ جب لوگ برتن بھر دلیہ کھڑکی تانبے کے سکے، چھڑکے بجلات سے گزرنے ہوئے

راستوں پر رکھ دیتے تھے۔

گاؤں کی عورتوں نے مجھے روٹی دی۔

اور نوجوانوں نے پلائی مخورکا۔

ہمارے لیے قیامت آجائے گی۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ آج کل وہ آپ کو گرفتار کرا دیتے ہیں۔ اپنے ضمیر کو مطمئن رکھنے کے لیے یا خود کو محفوظ رکھنے کے لیے۔ کیوں کہ مدد کرنے والے اور ترغیب دینے والے کو بھی ربع صدی کی سزائے قید ملتی ہے۔ انیسویں صدی یہ محسوس نہ کرسکی کہ روٹی اور پانی فراہم کرنا بھی سیاسی جرم ہوسکتا ہے۔

اس لئے ہم اپنے آپ کو آگے گھسیٹ رہے ہیں۔ تمام رات ہم اپنے آپ کو گھسیٹتے ہیں۔ ہم ارٹش پہنچنے کا انتظار نہیں کرسکتے۔ ہم ندی کے نزدیک پہنچنے کی علامات بیتابی کے ساتھ تلاش کرتے ہیں جو کہیں نظر نہیں آتیں ہم بے دردی کے ساتھ اپنے جسموں کو آگے اور آگے دھکیلتے ہیں۔ صبح کے قریب ہمیں گھاس کا ایک اور ڈھیر ملتا ہے کل سے بھی زیادہ دشواری کے ساتھ ہم اس پر چڑھ کر چھپ جاتے ہیں۔ ہم نیند کے غلبے کو روک نہیں سکتے۔ جو مقام شکر ہے۔ ہم اٹھتے ہیں تو شام نزدیک ہوتی ہے۔

آدمی کس حد تک برداشت کرسکتا ہے۔ پانچ دن ہوگئے ہم اب تک بھاگ رہے ہیں۔ کچھ ہی فاصلہ پر ہمیں ایک یرٹ (کھال کا خیمہ) نظر آتا ہے اس کے پاس ایک کھلا سائبان ہے ہم خاموشی سے رینگ کر وہاں پہنچتے ہیں۔ زمین پر موٹا اناج ' جوار' باجرا بکھرا ہوا تھا۔ ہم اس سے بریف کیس بھر لیتے ہیں کچھ چبانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن نگل نہیں پاتے۔ ہمارے منہ بالکل خشک ہیں۔ دفعتاً ہمیں یرٹ کے قریب ایک بڑی ٹنکی نظر آتی ہے جس میں کئی گیلن کی گنجائش ہے۔ ہم رینگ کر اس کے پاس پہنچتے ہیں اس کی ٹونٹی گھماتے ہیں۔ کم بخت خالی ہے اسے ٹیڑھا کرتے ہیں تب کہیں دو ایک گھونٹ پانی ملتا ہے۔

ہم لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ لغزیدہ قدم گرتے پڑتے۔ نیچے لیٹ کے سانس لینے میں آسانی ہوتی ہے۔ اب ہم اپنی پیٹ کی طرف سے کھڑے نہیں ہوسکتے۔ پہلے لڑھک کر پیٹ کے بل ہوجاتے ہیں پھر ہاتھ پاؤں کے سہارے سے لٹکتے ہیں پھر جھول کر پیروں پر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس عمل سے بھی ہمارا دم پھول جاتا ہے۔ ہم اتنے لاغر ہوگئے ہیں کہ ہمارا پیٹ ہماری پیٹھ سے چپکا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ صبح ہونے تک ہم دو سو میٹر چلتے ہیں اس سے زیادہ نہیں۔ اور پھر دراز ہوجاتے ہیں۔

اس صبح ہمیں گھاس کا کوئی انبار نہیں ملا۔ پہاڑی پر کسی جانور کا کھودا ہوا بھٹ تھا۔ ہم دن میں اس میں لیٹ گئے لیکن سو نہ سکے۔ اس دن خنکی بڑھ گئی اور ہمیں زمین ٹھنڈی محسوس ہونے لگی یا شاید ہمارا خون ہمیں حرارت نہیں بخش رہا تھا؟ ہم نے خشک آٹے کی سوئیاں چرنے کی کوشش کی۔

اچانک میں فوجیوں کی ایک قطار کو بڑھتے ہوئے دیکھ لیتا ہوں' ان کے شانوں پر اسرخ فیتے ہیں! وہ ہمارا محاصرہ کر رہے ہیں۔ زدزلوک مجھے جھنجھوڑتا ہے "تم خواب دیکھ رہے ہو۔ یہ تو گھوڑوں کا ریوڑ ہے"

ہاں مجھے واہمہ ہو رہا ہے ہم پھر لیٹ جاتے ہیں۔ دن ختم ہونے کو نہیں آتا۔ اچانک ایک گیڈر آیا وہ اپنے



وِنِتسا میں جن لوگوں کو گولی ماردی گئی تھی ان کے رشتے دار
اُن کی لاشیں پہچانتے ہوئے

میں ایک بسٹر میں رہنے کے سارے وقت ایس ایچ سی ایچ #۲۳۲ نمبر لگا کر رہا۔ صرف آخری
کچھ مہینوں میں مجھے اسے بدل کر ایس ایچ سی ایچ #۲۶۲ کر لینے کا حکم دیا گیا۔ اس نمبر والی
چندیاں میں چوری چھپے ایک بسٹر سے باہر لایا اور وہ میں نے آج تک رکھی ہوئی ہیں۔

مصنف ۱۹۵۳ء میں اسپیشل کیمپ سے رہا ہونے کے ٹھیک بعد





جامہ تلاشی



جارجی پاولووچ ٹینو

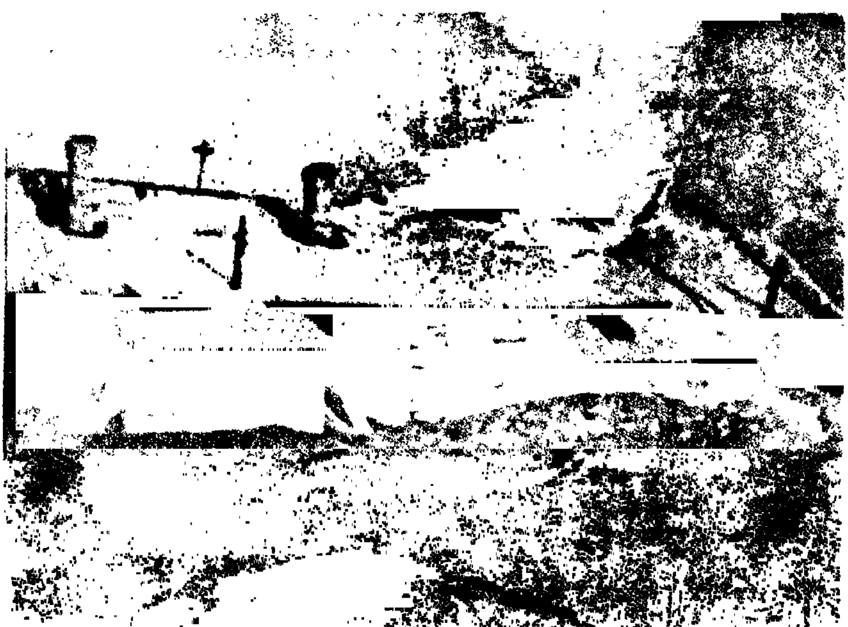


ایکی بسٹ بی یو آر (انتظامی بیرک) کا دروازہ



این وی سرو وتسیوا جھونپڑی کے پاس

ڈی جی ایس بیرکیں



کاداتسکایا اور اس کا شوہر اپنی جوانی میں

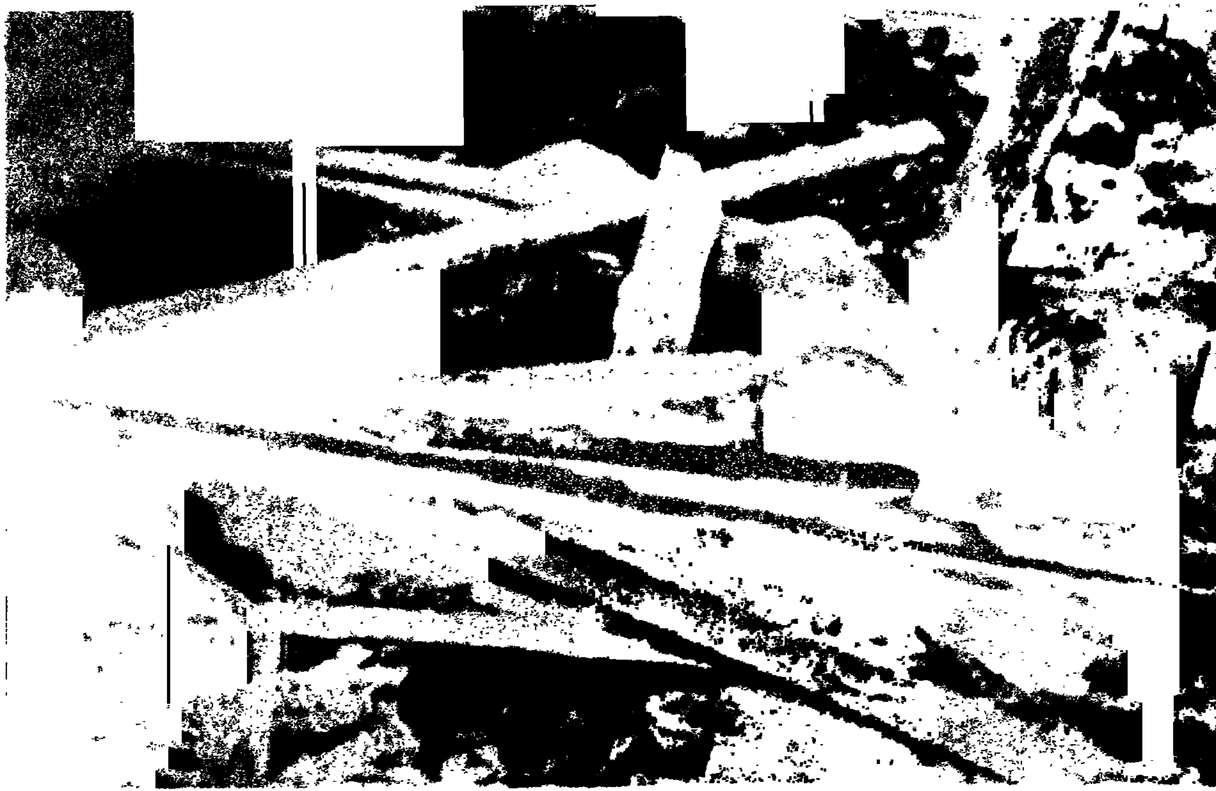




کاداتسکایا ۱۹۶۸ء میں



نیدیو کی بنائی مورتی



وورکٹا کے کھتے پر۔ ایسا پڑاؤ...

بھٹ میں لیٹ گیا۔ ہم نے اس کے لیے کچھ سوئیاں نیچے رکھ دیں اور رینگ کر پرے ہٹ گئے۔ ہمیں توقع تھی کہ لالچ میں ہمارے پیچھے آئے گا اور ہم اسے مار کر کھا لیں گے۔ لیکن اس نے سوئیوں کو سونگھا تک نہیں۔ وہ بھاگ گیا۔

ہمارے ایک طرف نشیب تھا۔ ڈھلان سے کچھ نیچے ایک خشک جھیل کی نمک سے ڈھکی ہوئی ہموار زمین تھی اور دوسرے کنارے پر ایک یرٹ تھا جس سے دھواں ہوا میں بلند ہو رہا تھا۔

چھ دن بیت چکے تھے۔ ہماری انتہا قریب ہے" ہم اپنے تصور میں سرخ بیتے دیکھتے ہیں ہمارے زبانیں تالو سے چپک گئی ہیں اگر ہمیں کسی طرح پیشاب آئے تو وہ خون کا ہوگا۔ یہ صورتحال ٹھیک نہیں! آج رات ہمیں ہر قیمت پر کھانا اور پانی ملنا ہی چاہیے۔ ہم وہاں یرٹ پر جا لیں گے اگر وہ دینے سے انکار کریں گے تو ہم زبردستی حاصل کر لیں گے۔ مجھے پرانے منحرف گریگوری' کو ڈلا اور اس کے جنگی نعرے — ماخاد ڈیرا! — کی یاد آئی (مطلب ہے مانگنا چھوڑو اور چھین لو—!") کولیا اور میں ایک بات کر لیتے ہیں: مناسب وقت آنے پر میں کہوں گا۔ ماخاد ڈیرا—!

اندھیرے میں رینگ کر ہم آہستگی سے یرٹ پر پہنچتے ہیں۔ وہاں کنواں ہے لیکن بالٹی ندارد کچھ ہی فاصلے پر ایک زین کسا ہوا گھوڑا کھونٹے کے پاس کھڑا ہے۔ ہم چھوٹے سے سوراخ سے جھانکتے ہیں— تیل کے لیمپ کی روشنی میں ہمیں قازق میاں بیوی اور کچھ بچے نظر آتے ہیں۔ ہم دستک دے کر اندر جاتے ہیں میں نے کہا۔ سلام—!" اور اس تمام اثنا میں میری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے دھبے تیرتے رہے اور مجھے ڈر لگا کہ میں گر پڑوں گا۔ اندر بیٹھنے کے لیے ایک نیچی گول میز تھی (ان سے بھی نیچی جو آج ہمارے جدت پسند ڈیزائنر بناتے ہیں) یرٹ کے چاروں طرف فلیٹ (راون) سے منڈھی ہوئی بنچ تھی۔ ایک بڑی سی دھات کے پتروں کی الماری تھی۔

قازق جواباً کچھ منمنایا اور جھلایا ہوا سا لگا۔ وہ ہمیں دیکھ کر خوش نہ ہوا۔ اپنے آپ کو اہم آدمی ظاہر کرنے کے لیے (اور بہر حال مجھے اپنی قوت کو سنبھال کر رکھنا تھا، میں نے اپنا بریف کیس میز پر رکھ دیا۔" میں ایک جیالوجیکل سروے پارٹی کا سربراہ ہوں اور یہ میرا ڈرائیور ہے۔ ہم اپنی لاری پیچھے اسٹیپ میں دوسروں کے لیے چھوڑ آئے ہیں وہ لوگ پانچ یا سات کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں؛ ریڈی ایٹر رس رہا ہے اور تمام پانی بہہ گیا ہے تین دن سے ہم نے بھی کچھ کھایا پیا نہیں ہے ہم بھوک سے بے حال ہیں۔ ہمیں کچھ کھانے کو دو اکساکال!" اور ہمیں بتاؤ کہ تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

لیکن قازق اپنی نگاہ نہیں اٹھاتا اور کھانا یا مشروب کچھ بھی دینے کے لیے نہیں کہتا۔" تمہارا نام کیا ہے باس؟" وہ پوچھتا ہے۔

میں اس سوال کے لیے تیار تھا لیکن میرا سر چکرا رہا ہے اور بھول گیا ہوں۔

آنیوانوف!" میں جواب دیتا ہوں (بے شک میں نے احمقانہ جواب دیا تھا)" تو آؤ کچھ آٹا دال ہمارے ہاتھ فروخت کر دو اکساکال!" "نہیں میرے ہمسائے کے پاس جاؤ۔" "وہ کتنی دور ہے؟" "دو کلومیٹر۔"

میں پروقار انداز میں بیٹھ جاتا ہوں لیکن کولیا زیادہ ضبط نہیں کر پاتا اور ایک گریڈل کیک اٹھا لیتا ہے اور

اسے چبانے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ وہ صریحًا اس کے لیے ناکافی ہے۔ اچانک قازق ایک تازیانہ اٹھا لیتا ہے۔ جس کا ایک دستہ اور ایک لمبا چمڑے کا پٹہ ہے اور زڈالوک کو اس سے دھکاتا ہے۔ میں اٹھ کھڑا ہوتا ہوں: "تو تم اس قسم کے آدمی ہو۔ یہی تمہاری مشہور مہمان نوازی ہے؟" اب قازق کوڑے کا دستہ زڈالوک کی پشت پر چبھا رہا ہے اور اسے یرٹ سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نعرہ لگاتا ہوں "ماخادڑیرا!" میں اپنا چاقو نکال لیتا ہوں اور قازق سے کہتا ہوں "چل کونے میں جا کر زمین پر لیٹ جا۔" قازق ایک پردے میں غوطہ لگاتا ہے میں ٹھیک اس کے پیچھے ہوں۔ ہو سکتا ہے وہاں اس کے پاس بندوق ہو اور وہ غفلت میں ہمیں گولی مار دے۔ لیکن وہ بستر میں دبک جاتا ہے اور چیختا ہے: "جاؤ سب لے جاؤ۔ میں کچھ نہیں کہوں گا" "او ذلیل کتے! مجھے تیرے سب سے کیا لینا ہے تو نے تھوڑی سی اشیائے خورد و نوش کیوں نہیں دیں جو میں نے پہلے طلب کی تھیں؟

میں کولیا سے کہتا ہوں: "اپنی آنکھیں کھلی رکھنا!" میں چاقو لے کر دروازے پر کھڑا ہو جاتا ہوں، قازق عورت چیخ رہی ہے بچے رو رہے ہیں۔ "اپنی بیوی سے کہو ہم تم میں سے کسی کو ضرر نہیں پہنچائیں گے۔ ہم صرف کھانا چاہتے ہیں۔ کچھ گوشت۔" وہ اپنے ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔ "یوک"* لیکن کولیا یرٹ میں ادھر ادھر تلاش کرتا ہے اور گوشت کے پٹارے سے خشک گوشت نکال لیتا ہے۔ "تو مجھ سے جھوٹ بولتا ہے؟" کولیا ایک بوسا کی کا پیالہ بھی قبضے میں کر لیتا ہے۔ مدتوں سے ہونے پر لے کے مجھے اچانک محسوس ہوتا ہے کہ میز پر رکھے ہوئے جگوں میں کومیس (گھوڑی کے دودھ کا نشہ آور مشروب) ہے کولیا اور میں اسے پیتے ہیں۔ ہر گھونٹ کے ساتھ زندگی واپس آتی ہے! کیا نفیس مشروب ہے! میرا سر چکرانے لگتا ہے لیکن سرور سے مجھے سعادت ملتی ہے، اور میں ہر لمحہ قوت میں اضافہ ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہوں۔ کولیا منہ میں آنے لگا ہے وہ مجھے کچھ پیسے تھماتا ہے یہ اکتالیس روبل نکلے ہیں شاید کچھ اور بھی کہیں دبا ہوا ہے۔

ہم خشک گوشت ایک تھیلے میں ڈال لیتے ہیں اور بورساکی گریڈل کیک اور ایک قسم کی مٹھائیاں — "اور گندی سانس کی گدیاں" اور دوسرے تھیلے میں ٹھونس لیتے ہیں۔ کولیا بھنے ہوئے گوشت کی قاب بھی اٹھا لیتا ہے۔ ایک چاقو! اس چیز کی تو ہمیں حقیقی ضرورت ہے ہم کوشش کرتے ہیں کہ کچھ بھول نہ جائیں۔ لکڑی کے چمچے نمک ... میں تھیلے باہر لے آتا ہوں، واپس آ کر پانی کی ایک بالٹی اٹھاتا ہوں۔ ایک کمبل، فاضل لگام، تازیانہ۔ (وہ اپنے آپ بڑبڑاتا ہے۔ وہ یہ سب پسند نہیں کرتا۔ ۔ وہ ہمیں کیسے پکڑے گا؟)

"اچھا تو... " میں قازق سے کہتا ہوں "تمہارے لیے یہ ایک سبق ہے اور اسے یاد رکھنا ہو نامت تمہیں اپنے مہمانوں سے دوستانہ سلوک کرنا چاہیے۔ ہم ایک درجن بورساکی اور ایک بالٹی پانی کے لیے تمہارے سامنے گھٹنوں کے بل آتے۔ ہم بھلے آدمیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔ تمہارے لیے آخری ہدایت یہ ہے کہ جہاں پڑے ہو چپ چاپ وہیں پڑے رہو۔ ہمارے کچھ دوست باہر ہیں!

میں کولیا کو دروازے پر چھوڑ دیتا ہوں اور سارا مالِ غنیمت گھوڑے پر باندھتا ہوں۔ میرا خیال ہے ہمیں جلدی کرنی چاہیے لیکن میرا دماغ پرسکون ہے میں گھوڑے کو کنویں پر لے جاتا ہوں اور جی بھر کر پانی پلاتا ہوں اسے بھی آئندہ بہت محنت کرنی ہے، تمام رات غیر معمولی بوجھ ڈھونا ہے۔ میں خود کو اسے پانی پیتا ہوں۔ کولیا

بھی پیتا ہے۔ اسی وقت کچھ بطخوں پر نظر پڑتی ہے۔ کولیا پولٹری فارم دیکھ کر ضبط نہیں کر پاتا: "بطخیں دبوچ لیں؟" وہ کہتا ہے۔ "کیا ہم ان کی گردن مروڑ دیں؟ اس سے بہت شور پیدا ہوگا۔ وقت برباد نہ کرو۔"

میں رکاب نیچے کرکے کمر پٹہ تنگ کر دیتا ہوں۔ ذرا لوک کمبل زین کے پیچھے رکھ دیتا ہے اور کنوئیں کی دیوار کے سہارے گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہے وہ پانی کی بالٹی ہاتھ میں اٹھا لیتا ہے۔ ہم نے دونوں تھیلیوں کو ایک ساتھ باندھ کر گھوڑے کی پشت پر لاد دیا ہے۔ میں زین پر بیٹھا ہوں اس طرح ہم تاروں کی روشنی میں مشرق کی سمت چل پڑتے ہیں تاکہ تعاقب کرنے والوں کو ہمارا راستہ نہ مل سکے۔

دو سواروں پر گھوڑے نے احتجاج کیا پھر دونوں ہی اجنبی اس نے سر کو جھٹکنے کا سلسلہ جاری رکھا اور پیٹھ گھما گھما کر پلٹنے کی کوشش کرتا رہا۔ ہم نے کسی طرح اسے قابو میں رکھا اور اسے تیز چلایا قریب ہی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہم نے چکردار راستہ اختیار کیا کولیا نے آواز دبا کر میرے کانوں میں گانا شروع کیا:

وسیع میدان جہاں آزاد ہوا بہتی ہے
چرواہے کی زندگی بھی میری زندگی ہے
گھوڑا ہو جس پر دل کو اعتماد ہو۔

میں نے اس کا پاسپورٹ بھی دیکھا تھا۔ کولیا نے کہا: "تم نے اسے کبھی کیوں نہیں رکھ لیا؟ پاسپورٹ ہمیشہ کارآمد ہوتا ہے۔ تم انھیں صرف بالائی جلد دیکھنے دو، زیادہ نزدیک سے نہیں۔"

سڑک پر ہم نے گھوڑے سے اترے بغیر کئی بار پانی پیا۔ اور پراٹھے وغیرہ کھائے۔ اب ہم بالکل دوسرے موڈ میں تھے! اب ہمیں صرف یہ خواہش تھی کہ دن کی روشنی سے پہلے جتنی دور ممکن ہو نکل جائیں۔

ہم نے پرندوں کی چہچہاہٹ سنی۔ ایک جھیل۔ اس کی چار جانب بڑا راستہ پڑے گا اور ہمیں وقت بچانا تھا۔ پر لیا اتر پڑا اور لگام پکڑ کر گھوڑے کو پھسلن والی کیچ پلیا سے لے چلا۔ ہم پار ہو گئے لیکن اچانک ہمیں معلوم ہوا کمبل نہیں ہے۔ ہم نے کہیں گرا دیا۔ ہم نے ایک سراغ اپنے پیچھے چھوڑ دیا تھا!

یہ بہت بری بات تھی۔ میں نے گھوڑے کی لگام تھام لی پھر ہم نے کھانا پینا شروع کیا۔ یہ سلسلہ انتہا کو جا پہنچا۔ پانی بالٹی کی تقریباً تہ تک پہنچ گیا۔ ہمارے لیے اس بات پر یقین کرنا بہت دشوار تھا۔

راستہ ـــ ٹھیک شمال۔ گھوڑا دلکی تو نہیں پھر بھی تیز قدمی سے چل رہا تھا۔ آٹھ سے دس کلو میٹر فی گھنٹے کی رفتار سے۔ چھ راتوں میں ہم صرف ڈیڑھ سو کلو میٹر طے کر پائے تھے لیکن اس رات ہم نے ستر کلو میٹر کا سفر کیا۔ اگر ہم گھماؤ پھراؤ کے ساتھ نہ چلے ہوتے تو اب تک ارتش پہنچ جاتے۔

سویرا۔ لیکن چھپنے کی کوئی جگہ نہیں۔ ہم گھوڑے پر سفر کرتے رہے اب یہ عمل خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔ پھر ہم نے ایک گہرا گڑھا دیکھا تقریباً غار ہم گھوڑے کو اس کے اندر لے گئے اور ہم نے پھر کھانا پینا شروع کیا اچانک ایک موٹر سائیکل پھٹ پھٹ کرتی ہوئی قریب سے گزری۔ یہ بری بات تھی ـــ یہ سڑک تھی۔ ہمیشہ پوشیدہ رہنے کے لیے زیادہ محفوظ مقام تلاش کرنا چاہیے۔ ہم نے باہر نکل کر چار جانب نظر دوڑائی ـــ کچھ فاصلے پر ایک اجڑا ہوا ویران قازق گاؤں تھا۔ ہم نے وہاں تک اپنا راستہ تلاش کیا، ایک مکان کے کھنڈر کی تین دیواروں کے درمیان اپنا سامان اتار کر رکھا پھر گھوڑے کے پاؤں میں رسی ڈال دی اور اسے چرنے

کے لیے چھوڑ دیا۔

لیکن اس دن نیند نہیں آئی۔ قازق اور یمبل کی شکل میں ہم سراغ چھوڑ آئے تھے۔
شام۔ اب سات دن ہو گئے۔ گھوڑا کچھ فاصلے پر چر رہا تھا ہم اس کے پیچھے گئے اور وہ پیچھے ہٹ گیا، ہم سے بچتا رہا۔ کولیا نے اس کی رسّی پکڑ لی لیکن گھوڑا اسے گھسیٹ لے گیا اور وہ گر پڑا۔ اس نے اپنی اگلی ٹانگیں آزاد کر لی تھیں اور اب اس پر کوئی گرفت نہیں تھی۔ ہم تین گھنٹے تک اسے گھیرنے کی کوشش کرتے رہے اور تکان سے چور چور ہو گئے، اپنے بیلٹوں سے ایک پھندہ بنا کر اس کی گردن میں ڈالنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی طرح قابو میں نہ آیا۔ جس میں ہم نے اپنے ہونٹ کاٹ لیے لیکن اسے چھوڑ دینا پڑا۔ ہم نے صرف تازیانہ اور لگام وہاں پر چھوڑ دی۔

کچھ کھا کر ہم نے اپنا آخری پانی پی لیا۔ کاندھے پر کھانے کا تھیلا اور خالی بالٹی لٹکا کر ہم روانہ ہو گئے۔ آج ہم میں اس کام کے لیے طاقت عود کر آئی تھی۔

اگلے دن ہم ایک بے تکی جگہ پھنس گئے اور ہمیں کچھ جھاڑیوں میں پناہ لینی پڑی جو سڑک سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھیں۔ جگہ اچھی نہ تھی، ہمیں دیکھا جا سکتا تھا۔ ایک بیل گاڑی کھڑکھڑاتی ہوئی گزری ہم اس دن بھی نہیں سو سکے۔

آٹھواں دن ختم ہوا اور ہم پھر آگے روانہ ہوئے۔ ہم کچھ ہی دور چلے تھے کہ اچانک ہمیں پیروں کے نیچے زمین نرم محسوس ہوئی "یہ جتی ہوئی زمین تھی۔ ہم آگے بڑھے اور سڑکوں کے ساتھ ساتھ ہیڈلائٹوں پر نظر پڑی خبردار رہنا چاہیے!

بادلوں کے درمیان سے نیا چاند ابھی نمودار ہوا تھا۔ ایک اور ویران بستی۔ قازقوں کی آبادی، اس کے آگے سے ایک گاؤں کی روشنی اور گانے کے بول ہم تک پہنچے۔

"اے لڑکو! کھول دو گھوڑے..."

ہم نے تھیلے کھنڈر میں رکھ دیے اور بر[illegible] بالٹی لے کر گاؤں کی طرف چلے۔ چاقو ہماری جیبوں میں تھے۔ یہ پہلا مکان ہے۔ ایک سور کا بچہ چیخ رہا ہے اگر وہ ہمیں اسٹیپی پر مل جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ ایک لڑکا سائیکل پر ہماری طرف آیا "سنو دوست ہمارا ٹرک ادھر ہے ہم اناج ڈھو رہے ہیں۔ ریڈی ایٹر کے لیے پانی کہاں مل سکے گا؟" لڑکا اتر پڑا اور ہمارے آگے چلتا ہوا ایک مقام پر لایا اور اس نے اشارے سے بتایا: گاؤں کے سرے پر ایک تالاب تھا شاید مویشی اس میں پانی پیتے تھے۔ ہم نے بالٹی اس میں ڈبو لی اور پانی پیے بغیر اس کو بھر کر چل دیے ہم لڑکے سے دور آ گئے اور پھر بیٹھ کر پانی پینے لگے پیتے چلے گئے۔ ہم نے ایک ہی سانس میں بالٹی آدھی کر دی۔ (آج ہم ہمیشہ سے زیادہ پیاسے تھے کیونکہ ہم نے جی بھر کے کھانا کھایا تھا)

ہوا میں قدرے خنکی تھی اور ہمارے قدموں تلے اصلی گھاس تھی۔ قریب ہی کوئی ندی ہونی چاہیے ہمیں اس کی تلاش کرنی چاہیے ہم چل پڑتے ہیں، چلتے جاتے ہیں۔ گھاس بہت اونچی ہے۔ جھاڑیاں ہیں۔ ایک بید — جہاں بید کی جھاڑی ہے وہاں پانی لازماً ہوگا۔ سرکنڈے! پانی! یقیناً سیلاب کے بعد رک جانے والا ار[illegible] کا پانی۔ اب ہم چھپ چھپا کر نہا سکتے ہیں۔ سرکنڈے دو میٹر بلند ہیں۔ بطخیں ہمارے پیروں کے نیچے کڑکڑاتی

ہیں۔ یہاں ہم آزادی سے سانس لے سکتے ہیں۔ یہاں ہم مصیبت میں نہیں پڑیں گے!

اور یہ کیفیت اس وقت کی تھی جب آٹھ دن میں پہلی بار معدے کو پتہ چلا کہ وہ اب بھی کام کرسکتا ہے۔ آٹھ دن کی بے عملی کے بعد یہ کتنی شدید تکلیف تھی! دردِ زہ غالباً اس سے زیادہ تکلیف دہ نہ ہوتا ہوگا!

اب ہم اس اجڑی ہوئی بستی میں چلے وہاں ہم نے دیواروں کے درمیان آگ روشن کی اور کچھ خشک گوشت ابالا ہمیں وہ رات آگے چلتے ہوئے گزارنی تھی لیکن ہم صرف کھاتے رہنا اور کھاتے جانا چاہتے تھے۔ ہم نے پیٹوں میں اتنا کچھ ٹھونس لیا کہ ہمارا چلنا دوبھر ہو گیا۔ پھر زندگی کی خوشگواری کا احساس لیے ہم ارٹش کی تلاش میں آگے بڑھے۔ ایک سہ راہے پر ایسی بات ہوئی جو آٹھ دن میں پہلی بار پیش آئی تھی۔ ہم میں تکرار ہو گئی۔ میں نے کہا: دائیں طرف۔" زلاٹوک نے کہا "بائیں طرف۔" مجھے یقین تھا کہ راہ دائیں جانب ہے لیکن وہ اسے تسلیم نہ کرتا تھا۔ مفرورین کے لیے جو ایک خطرہ ہمیشہ گھات لگائے بیٹھا رہتا ہے وہ ہے لڑائی۔ ایک دوسرے سے جھگڑا کرنا۔ فرار کے دوران آپ میں سے کسی ایک کا فیصلہ حتمی ہونا چاہیے ورنہ آپ مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ اپنی ہی راہ پر جانے کا تہیہ کرکے میں دائیں طرف چل پڑا۔ میں سو میٹر چلا لیکن مجھے اپنے عقب میں کوئی آہٹ سنائی نہ دی۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ ہم اس طرح جدا نہیں ہو سکتے۔ میں گھاس کے ایک ڈھیر پر بیٹھ گیا اور اپنے پیچھے نگاہ ڈالی کو لیا آرہا تھا! میں نے اسے گلے سے لگا لیا اور ہم شانہ بشانہ اس طرح چلنے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اب جھاڑیاں پہلے سے زیادہ ہیں اور زیادہ گھنی ہیں۔ ہم ایک گہری گزر کے کنارے پر ہیں۔ وہاں دریا ارٹش چپ چپ اور بڑبڑ کر رہا ہے اور اچھلتا کودتا ہوا ہم پر سانسیں چھوڑ رہا ہے۔ ہم بے حد مسرور ہو گئے ہیں۔

ہمیں گھاس کا ایک انبار نظر آتا ہے اور ہم اس میں گھس جاتے ہیں۔ اب کیا خیال ہے، سونگھنے والے کتو! کیا تم اب بھی ہمیں گرفتار کرسکتے ہو؟ تمہارے لیے کوئی امید نہیں۔ ہم خوابِ خرگوش میں محو ہو جاتے ہیں۔

گولی چلنے کی آواز نے ہماری نیند اڑا دی ہے اور کتے بالکل پاس ہی بھونک رہے ہیں؟.....

تو کیا یہی انجام ہونا تھا؟ کیا ہماری آزادی کا خاتمہ اتنی جلد ہو جائے گا! ہم آپس میں لپٹ گئے اور اپنی سانسیں روک لیں۔ ایک آدمی قریب سے گزرا اس کے ساتھ کتا تھا! شکاری!..... ہم اور زیادہ گہری نیند میں مگن ہو گئے۔... اور تمام دن سوتے رہے۔ اس طرح ہم نے اپنا نواں دن گزارا۔

جب اندھیرا ہو گیا تو ہم ندی کے کنارے آگے بڑھے تین دن سے ہم نے اپنا کوئی سراغ نہیں چھوڑا ہے۔ کتے چھوڑنے والے اب ہماری تلاش ارٹش کے ساحل پر ہی کر رہے ہوں گے۔ وہ سمجھیں گے کہ ہم پانی کی طرف جا رہے ہیں۔ اگر ہم کنارے کنارے چلتے رہے تو ضرور کسی جال میں پھنس جائیں گے علاوہ ازیں یہ ایک دشوار گزار کام بھی تھا ــــ ہمیں موڑ، قدرتی چٹانیں، سرکنڈے سے ڈھکے ہوئے علاقے کے چاروں طرف چکر لگا کر جانا پڑتا تھا۔ ہمیں ایک ناؤ کی ضرورت تھی!

[illegible] ایک چھوٹا سا مکان ہے لب ساحل۔ پتوار کی چپ چپ، پہرہ... ہم لیٹ گئے اور کچھ دیر تک انتظار کیا۔ انھوں نے روشنی گل کر دی۔ ہم چپکے سے نیچے اتر کر پانی تک پہنچے۔ کشتی وہاں موجود تھی۔

اور ایک جوڑا پتوار بھی۔ شاندار! ان کے مالک چپوؤں کو ساتھ لے جا سکتے تھے۔" ملاح اپنی پریشانیاں کنارے پر چھوڑ دیتا ہے۔ میرا فطری احساس! خاموشی کے ساتھ پہلے پتوار کے بغیر ایک بار وسطی دھار میں پہنچ کر میں نے تیزی سے کھینا شروع کر دیا۔

ہم ارتش کے بہاؤ پر آگے بڑھتے ہیں۔ ایک موڑ پر روشنی میں چمکتا ہوا اسٹیمر ہماری سمت آرہا ہے۔ اتنی بہت سی روشنیاں! تمام کھڑکیاں جگمگا رہی ہیں! پورا جہاز رقص و سرود سے گونج رہا ہے! مسافر آزاد اور مسرور ہیں اور عرشے پر چہل قدمی کر رہے ہیں یا ریستوران میں بیٹھے ہیں۔ وہ محسوس نہیں کر سکتے کہ وہ کتنے مسرور ہیں، نہ انھیں اپنی آزادی کا علم ہے اور ان کے کیبن کتنے آرام دہ ہیں۔۔۔

اس طرح ہم بہاؤ کے ساتھ تقریباً بیس کلو میٹر سے اوپر گئے ہماری اشیائے خوردنی ختم ہونے والی تھیں دانشمندی کا تقاضا یہ تھا کہ ہم راتوں رات اپنے لیے غذا بھر فراہم کر لیں۔ ہمیں مرغوں کی اذانیں سنائی دیں کشتی کو کنارے سے لگے اور چپ چاپ آوازوں کی سمت بڑھے۔ ایک چھوٹا سا مکان۔ کتا کہیں نہ تھا۔ مویشیوں کا باڑا؛ ایک گائے، ایک بچھڑا، مرغیاں، زڈانوک پولٹری کا شائق ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ بچھڑا لے چلیں۔ ہم اسے کھول لیتے ہیں۔ زڈانوک اسے کشتی کی جانب لے چلا۔ میں زمین پر پڑے ہوئے نقوش پامٹاتا ہوں۔ ورنہ سراغ رساں کتوں کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ہم کشتی سے سفر کر رہے ہیں۔

بچھڑا کنارے تک تو سکون سے چلا گیا۔ لیکن کشتی پر سوار ہوتے ہوئے بری طرح اڑ گیا ہم دونوں بمشکل اسے سوار کر کے لٹانے میں کامیاب ہوئے۔ زڈانوک اس کے اوپر بیٹھ گیا تاکہ وہ نیچے دبا رہے اور میں کشتی کھینچنے لگا۔ کھلی جگہ پہنچ کر ہم اسے مار لیں گے۔ لیکن یہ ہماری غلطی تھی کہ ہم اسے زندہ لے جانے کی کوشش کر رہے تھے! بچھڑا اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے زڈانوک کو ایک طرف پھینک دیا اور اپنی ٹانگیں پانی میں اتار لیں۔

تمام ہاتھ ڈیک پر! زڈانوک بچھڑے کے پچھلے دھڑ کو پکڑ رہا ہے۔ میں زڈانوک کو پکڑ رہا ہوں۔ ہم سب ایک جانب کافی دور تک جھک جاتے ہیں اور پانی ہم پر آپڑتا ہے ہم ارتش ندی میں غرقابی کے بالکل نزدیک ہیں، پھر بھی ہم بچھڑے کو اندر کھینچ لاتے ہیں۔ لیکن کشتی ندی میں بہت نیچی ہو گئی ہے لست بلند کرنا ہوگا۔ اس کے لیے بھی رکنا ہوگا۔ تاوقتیکہ ہم بچھڑے کو مار نہ کھالیں۔ میں چاقو اٹھاتا ہوں اور اس کی گردن کے پچھلے حصے کی رگیں کاٹنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ شہ رگ وہیں کہیں ہے۔ لیکن یا تو میں اسے تلاش نہیں کر پاتا یا چاقو بے حد کند ہے وہ اندر داخل ہی نہیں ہوتا۔ بچھڑا لرزتا ہے، زور لگاتا ہے اور صورت جو طیش میں آجاتا ہے اور میں بھی پریشان ہوں میں اس کا گلا کاٹنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن اس سے بھی پر نہیں ہوتا۔ وہ ڈکارتا ہے، پیر چلاتا ہے لگتا ہے وہ کشتی سے صاف چھلانگ لگا دیگا یا ہمیں غرق کر دے گا۔ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ لیکن، ہمیں بھی تو جینا ہوگا۔

میں اسے ذبح کرتا ہوں لیکن کافی گہرائی سے نہیں کاٹ پاتا۔ وہ کشتی کو جھکولے دیتا ہے اس کے کنارے پر پیر مارتا ہے ۔۔۔ بے وقوف، گدھا ۔۔۔ ہمیں کسی بھی لمحے غرقاب کر سکتا ہے کیوں وہ اتنا شریر النفس اور ضدی ہے اس لیے اس کے خلاف سرخ نفرت کی لہر مجھ میں دوڑ جاتی ہے۔ جیسے وہ میرا جانی دشمن ہو

اور میں بے رحمی کے ساتھ اندھا دھند اسے چاقو چبھانے اور مارنے لگتا ہوں۔ اس کا خون اچھلتا ہے اور ہمیں رنگین کر دیتا ہے وہ زور سے ڈکارتا ہے اور بدحواسی میں پاؤں مارتا ہے۔ زڈانوف اپنے ہاتھوں سے بچھڑے کا منہ بند کر دیتا ہے! کشتی زوروں کے ساتھ ہلتی ہے اور میں تیزی سے چاقو چلاتا ہوں۔ ذرا غور کیجیے میں کبھی کسی چوہے یا مکھی کو بھی ضرر نہیں پہنچا سکتا تھا۔ لیکن یہ رحم کے اظہار کا موقع نہیں ہے، یا تو وہ زندہ رہے گا یا ہم!

بالآخر وہ ساکت ہو گیا۔ ہم نے تیزی کے ساتھ ایک بالٹی اور ٹین کے ڈبوں سے پانی الیچنا شروع کیا دونوں آدمی دونوں ہاتھوں سے کام کر رہے تھے۔ پھر ہم نے اگلا سفر شروع کیا۔

بہاؤ نے ہمیں اگلی دھار تک پہنچا دیا۔ آگے ایک جزیرہ تھا۔ یہ پوشیدہ رہنے کے لیے مناسب مقام ہو گا، جلد ہی صبح ہو جائے گی۔ ہم نے کشتی کو سرکنڈوں میں اچھی طرح الجھا دیا۔ بچھڑا اور دوسری تمام اشیا کنارے کھینچ لیں اور کشتی کو مزید محفوظ کرنے کے لیے اس پر سرکنڈے بکھرا دیئے۔ بچھڑے کو ٹانگوں سے گھسیٹ کر اس کھڑے کنارے پر لے جانا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن ایک بار وہاں پہنچ گئے تو وہاں کمر تک پانی تھا اور درخت تھے۔ پرستانی داستانوں کی مانند! اب تک ہم نے کئی برس ریگستانوں میں بسر کیے تھے ہم بھول گئے تھے کہ جنگل اور گھاس اور دریا کیسے ہوتے ہیں؟....

روشنی پھیلنے لگی تھی۔ بچھڑا اداس نظر آتا تھا، ہمارے خیال میں۔ لیکن بھلا ہو ہمارے بچھڑے دوست کا، ہم اس جزیرے پر کچھ دن قیام کر سکتے تھے۔ ہم نے اپنی "کلیوٹ" سے تیار کردہ سامان پر چاقو تیز کیے میں نے کبھی کسی جانور کی کھال نہیں ادھیڑی تھی لیکن اب . . کی تربیت حاصل کر رہا تھا۔ میں نے اس کا شکم چاک کیا، کھال پیچھے کھینچیں اور آنتیں الگ کر دیں۔ جنگل کی گہرائیوں میں ہم نے آگ روشن کی اور گوشت کے ساتھ جنگلی ... ابالی۔ پوری ایک بالٹی۔

شاندار ضیافت! اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم راحت محسوس کر رہے تھے۔ راحت اس لیے کہ ہم ایک جزیرے پر ہیں۔ جزیرہ ہمیں کینہ پرور لوگوں سے علیحدہ کرتا ہے، اچھے لوگ بھی ہیں لیکن سفر دریں سے ان کی ملاقات کبھی نہیں ہوتی۔ انھیں صرف کینے ملتے ہیں۔

گرم، دھوپ سے لبریز دن ہے۔ گیدڑ کے بھٹ میں بدن سکوڑ کر چھپنے کی ضرورت نہیں ہے گھاس گھنی اور سبز ہے جو اس پر رقص پاؤں رکھتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ یہ کتنی بیش قیمت شے ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ سینے تک بلند گھاس میں سما جانے کا اپنا چہرہ اس میں چھپا لینے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

ہم جزیرے میں ادھر ادھر چکر لگاتے ہیں اس میں جنگلی گلاب (ڈاگ روز) کی بڑی افراط ہے ہم انھیں خوب کھاتے ہیں، کھاتے ہی جاتے ہیں ہم۔ اور شوربا پیتے ہیں کچھ اور گوشت ابالتے ہیں۔ ہم گردوں کا کھانا تیار کرتے ہیں۔

ہم بشاشت محسوس کرتے ہیں، اپنے سفر کی بابت سوچتے ہیں اور اس کی بہت ساری باتوں پر ہنستے ہیں ہم سوچتے ہیں کہ وہ کیمپ میں ہمارا اسٹیج دیکھنے کے انتظار میں ہوں گے۔ ہمیں گالیاں دیتے ہوئے انتظامیہ کے مدیر و اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے۔ ہمیں یہ سب تماشا سا لگتا ہے۔ ہم ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔

ہم ایک موٹے تنے کی چھال اتارتے ہیں اور سرخ تار کو گرم کرکے اس پر لکھ دیتے ہیں" اکتوبر ۱۹۵۰ء میں اپنی آزادی کی راہ پر چلتے ہوئے دو بے گناہ افراد نے، جنہیں تاعمر قید بامشقت کی سزا دی گئی تھی یہاں پناہ لی تھی!" ہماری موجودگی کی یہ یادگار قائم رہے۔ یہاں جنگل میں اس یادگار سے ہمارا تعاقب کرنے والوں کو مدد نہیں مل سکتی اور بعد میں کسی دن لوگ اسے پڑھیں گے۔

ہم طے کرتے ہیں کہ عجلت نہ کی جائے۔ جس چیز کے لیے ہم فرار ہوئے تھے وہ ہمیں حاصل ہے۔ ہماری آزادی اوسک یا ماسکو پہنچ کر یہ اس سے زیادہ مکمل نہیں ہو سکتی، ہمیں گرم، دھوپ سے لبریز دن، صاف ہوا، سبز گھاس اور فرصت سب کچھ حاصل ہے۔ گوشت وافر مقدار میں موجود ہے۔ صرف یہ ہے کہ روٹی نہیں ہے اور اس کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔

ہم نے جزیرے پر تقریباً ایک ہفتہ قیام کیا اپنے فرار کے دسویں دن سے سولہویں دن تک جنگل کے سب سے گھنے حصے میں ہم نے اپنے لیے لکڑیوں کا ایک سائبان بنا لیا تھا۔ رات میں وہاں بھی سردی لگتی تھی لیکن ہم باقی ماندہ نیند دن میں پوری کر لیتے تھے۔ اس تمام عرصے میں سورج ہمارے اوپر چمکتا تھا۔ ہم خوب پانی پیتے تھے اور اونٹوں کی طرح پانی کا ذخیرہ اپنے اندر یکجا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم سنجیدگی کے ساتھ بیٹھ کر ٹہنیوں کے درمیان سے گھنٹوں ساحل پر گزرتی ہوئی زندگی کو دیکھا کرتے تھے۔ وہاں اوپر ہوائیاں آتی جاتی رہتی تھیں۔ گھاس پھر تراشی جا رہی تھی۔ اس موسم گرما کی دوسری کٹائی۔ ہم کسی کی نگاہ میں نہیں آئے۔

ایک دن تیسرے پہر جب ہم گھاس پر نیم غنودگی کے عالم میں دراز تھے، اور سورج کی آخری کرنوں کا لطف لے رہے تھے ہم نے دفعتاً جزیرے پر کلہاڑی چلنے کی آواز سنی احتیاط کے ساتھ اوپر اٹھ کر ہم نے دیکھا کہ کچھ ہی فاصلے پر ایک آدمی شاخیں تراش رہا ہے اور آہستہ آہستہ ہماری جانب بڑھ رہا ہے۔

پندرہ دن میں، حجامت کا کوئی وسیلہ نہ ہونے کے باعث میرے چہرے پر داڑھی بڑھ آئی تھی کسی دہشتناک کیتل سرخ جھاڑی جیسی اور اب میں اصلی مفرور قیدی نظر آنے لگا تھا۔ لیکن زڈانوک کی ڈاڑھی، بالکل نہیں بڑھی تھی وہ چکنے چہرے والے لڑکے جیسا تھا اس لیے میں نے فرار یگی کا بہانہ کیا اور زڈانوک سے کہا کہ اس آدمی سے ملے، اس سے سگریٹ مانگیں اسے بتائے کہ ہم اومسک سے آئے ہوئے سیاح ہیں اور معلوم کرے کہ وہ خود کہاں کا ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو میں کارروائی کے لیے تیار رہوں گا۔

کریانے آگے جا کر اس سے گفتگو کی۔ انھوں نے سگریٹ سلگائے۔ وہ ایک قریبی کرخوز کا قازق نکلا۔ بعد میں میں نے اسے کنارے جا کر اپنی ناؤ میں بیٹھنے کے لیے اور اپنی تراشیدہ شاخیں لیے بغیر کشتی لے جاتے ہوئے دیکھا۔

اس کا کیا مطلب تھا؟ کیا اسے ہمارے بارے میں مخبری کرنے کی عجلت تھی؟ (یا شاید اسے ڈر تھا کہ ہم اس کی رپورٹ نہ کر دیں۔ لکڑی کے سرقے پر بھی آپ کو اندر کیا جا سکتا تھا۔ ہماری زندگی اس حال کو پہنچ گئی ہے کہ ہر شخص دوسرے شخص سے خوف زدہ تھا) تم نے اسے بتایا تھا کہ ہم کون ہیں؟" ——— "کو دیکھا۔" میری سمجھ میں نہ آیا کہ ہنس دوں یا گریہ کروں ——— زڈانوک ہمیشہ معاملات کو گڈمڈ کر دیتا تھا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ سیاح بتانا! یہ میدانی اسٹیپ پر کون ہے یا کہاں سے لیے آئیں گے؟

نہیں، ہم وہاں مزید نہیں ٹھہر سکتے۔ ہمارا پر لطف زندگی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ ہم نے بہ عجلت تمام جزیرہ

گھسیٹ کر ناؤ میں بار کیں۔ ہرچند کہ دن کا وقت تھا لیکن ہمیں روانگی کی عجلت تھی۔ گویا فرش پہ پڑا تھا۔ نظر سے اوجھل رہنے کے لیے۔ اس طرح دور سے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ کشتی میں ایک ہی فرد ہے۔ میں کشتی کو ارتش کے درمیان رکھ کر کھینے لگا۔

ہمارا مسئلہ یہ تھا کہ روٹی کہاں سے خریدیں؟ دوسری دقت یہ تھی کہ اب ہم آباد علاقوں میں داخل ہو رہے تھے۔ اب میں حجامت کے بغیر گزر نہیں کر سکتا تھا۔ ہم نے اومسک میں اپنا ایک سوٹ بیچ کر کوئی اسٹیشن آ سکنے کا ٹکٹ خریدنے اور ٹرین کے ذریعے دور نکل جانے کا منصوبہ بنایا تھا۔

شام کے قریب ہم ایک لوائٹ کیپر (ندی میں پڑے ہوئے تاروں کو معلق رکھنے والے پیپوں کے نگراں) کی برجی پر پہنچ کر اوپر چلے گئے۔ ہم نے دیکھا ایک عورت تھی — تنہا۔ وہ خوفزدہ ہو گئی اور ادھر اُدھر کیا گئے "میں فوراً اپنے شوہر کو بلاؤں گی" اور وہ نکل بھاگی۔ میں اس پر نگاہ رکھنے کے لیے پیچھے گیا۔ اچانک زڈانوک نے مکان سے گھبرا کر آواز دی — زورا! "لعنت ہو تجھ پر اور تیری دریدہ ذہنی پر۔ ہم نے طے کیا تھا کہ میں اپنے آپ کو دکھرا انگرائنڈر روچ کہوں گا۔ میں واپس آگیا۔ دو آدمی۔ ایک کے پاس شکاری رائفل۔ "تم کون ہو؟" "سیاح! اومسک سے آئے ہیں، ہم کچھ اشیائے خوردنی خریدنا چاہتے ہیں۔" اور ان کے شبہہ کو رفع کرنے کے لیے "ہمیں مکان کے اندر تو آنے دو — تم لوگ اتنے بد اخلاق کیوں ہو؟" اس کا اثر ہوا اور وہ نرم پڑ گئے۔ "یہاں ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ سوفزنیہ پہ ہو سکتا ہے۔ دو کلومیٹر اور آگے۔"

ہم ناؤ میں گئے اور بیس کلومیٹر تک آگے بہتے رہے۔ چاندنی رات تھی۔ ہم کھڑے کنارے پر چڑھ گئے ایک چھوٹا سا مکان کوئی روشنی نہ تھی۔ ہم نے دستک دی ایک قازق باہر آگیا اور یہ ہمیں پہلا آدمی ملا جس نے ہمارے ہاتھ ایک روٹی اور چوتھائی پورا آلوؤں کا فروخت کیا۔ ہم نے ایک سوئی اور دھاگا بھی خریدا (شاید یہ ہماری جلد بازی تھی) ہم نے ایک ریزر بھی طلب کیا لیکن اس کے ڈاڑھی نہیں تھی۔ چنانچہ ریزر اس کے پاس نہیں تھا پھر بھی وہ پہلا ہمدرد آدمی ہمیں ملا تھا۔ ہماری تمنائیں بڑھنے لگیں اور ہم نے پوچھا کہ کچھ مچھلی مل سکتی ہے اس کی بیوی اٹھی اور دو چھوٹی چھوٹی مچھلیاں لے آئی اور بولی "بیش دیگا" پھر پیسہ نہیں آیا ہماری توقع سے بڑھ کر تھا۔ وہ مچھلیاں ہمیں مفت دے رہی تھی۔ یہ لوگ واقعی بڑے رحم دل ہیں۔ میں مچھلی بورے میں ڈالنے لگا لیکن اس نے انھیں کھینچ لیا۔ "بیش دیگا" پانچ روبل۔ شوہر نے وضاحت کی۔ اوہ تو یہ بات ہے! نہیں ہمیں نہیں چاہیے۔ بہت مہنگی ہے۔ بقیہ رات بھر ہم کشتی رانی کرتے رہے۔ اگلے دن جو ہمارے فرار کا سترواں دن تھا، ہم نے کشتی کو جھاڑیوں میں چھپا دیا اور سوکھی گھاس پر سو گئے۔ ہم نے اپنا اٹھارہواں اور انیسواں دن بھی اسی طرح گزارا اور لوگوں سے دور رہنے کی کوشش کی۔ ہماری ضرورت کی تمام اشیا؟ ہمارے پاس تھیں — پانی — آگ — گوشت — آٹا — نمک — ایک بالٹی۔ داہنی طرف کھڑی اونچائی پر پتوں سے بھرے جنگل تھے، بائیں جانب سرسبز گھاس کے میدان اور بلند قامت گھاس۔ دن میں ہم جھاڑیوں کے درمیان آگ روشن کر لیتے، شوربا تیار کرتے اور سو جاتے۔

لیکن اومسک زیادہ دور نہیں تھا اور ہمیں جلد لوگوں سے ملنا پڑے گا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ میرے پاس ریزر ہونا لازمی ہے میں بہت بے چارگی کا احساس کر رہا تھا۔ ریزر تھا نہ قینچی تھی۔ سمجھ میں

نہ آتا تھا کہ اپنے ڈھیر سے بالوں سے کس طرح نجات حاصل کروں گا۔ کیا ایک ایک کرکے تمام بال اکھاڑ ڈالوں؟

چاندنی سے روشن ایک رات میں ہم نے ارتش پر ایک اونچا ٹیلہ دیکھا۔ ہم سوچنے لگے کہ یہ نگرانی کی چوکی تو نہیں؟ یہ ماک کے دور سے؟ دیکھنے کے لیے ہم اوپر چڑھ گئے۔ چاندنی کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ یہ خام اینٹوں سے تعمیر کردہ مکانات کا کوئی پراسرار مردہ شہر تھا۔ شاید ۱۹۳۰ء کے آس پاس کے زمانے میں اس حال میں ہوگا جو کچھ جل سکتا تھا اسے نذرِ آتش کر دیا گیا تھا، کچھ اینٹوں کی دیواریں ڈھا دی گئی تھیں۔ کچھ لوگوں کو ان کے گھوڑوں کی دُموں سے باندھا گیا ہوگا۔ یہ ایسا ہی مقام تھا جہاں سیاح کبھی نہیں جاتے تھے۔

ان دو ہفتوں میں ایک بار بھی بارش نہیں ہوئی تھی لیکن راتیں پہلے کے مقابلے میں زیادہ خنک تھیں جلدی کے لحاظ سے کشتی رانی زیادہ تر میں نے ہی کی اور زڈاوک پتوار سنبھالے بیٹھا جماہیاں لیتا رہا اور یقیناً بیسویں رات میں وہ سینکنے کے لیے آگ اور گرم پانی مانگنے لگا۔ میں نے اسے کشتی چلانے پر لگا دیا۔ لیکن وہ بُری طرح کانپ رہا تھا اور اسے آگ کے سوا کچھ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔

اس کے فرار کا ساتھی اسے آگ سے محروم نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ گویا کوئی بات سمجھنی چاہیے تھی اور اپنے آپ پر قابو رکھنا تھا لیکن زڈاوک کا مزاج ہی ایسا تھا۔ وہ اپنی خواہشات پر قابو نہیں رکھ سکتا تھا۔ یا دیکھیے اس نے میز سے گریڈل کیک کیسے جھپٹ لیا تھا اور مرغیوں کے لیے کس بری طرح مچلا تھا۔

وہ کپکپاتا رہا اور آگ روشن کرنے پر مصر رہا لیکن وہ دریائے ارتش کے تمام ساحلی علاقے پر ہمارے لیے آنکھیں پھاڑے بیٹھے ہوں گے۔ مقام حیرت ہے کہ ابھی تک کسی سراغ رساں پارٹی نے ہمارا راستہ نہیں کاٹا۔ کہیں چاندنی رات میں ارتش کے درمیان دیکھا اور روکا نہیں گیا۔

پھر ہمیں زیادہ بلند کنارے پر ایک روشنی نظر آئی۔ گویا آگ۔۔۔ کے لیے گڑگڑاتا ہوا رک گیا وہ تاپنے کے لیے رکنا چاہتا تھا جو مزید خطرناک ہوگا۔ مجھے ہرگز رضامند نہ ہونا چاہیے تھا۔ ہم اتنا کچھ دیکھ چکے تھے، اتنی دشواریاں اٹھا چکے تھے، آخر کس لیے؟ لیکن میں اسے آخر منع کس طرح کرتا! شاید وہ بری طرح بیمار تھا اور کسی بھی چیز کی طرف سے خود کو روک پانا اس کے بس میں نہ تھا۔

تیل کے لیمپ کی روشنی میں دو قازق، ایک مرد ایک عورت، فرش پر محوِ خواب تھے۔ وہ ڈر کے مارے اچھل پڑے: "یہ آدمی بیمار ہے" میں نے بتایا" اسے گرم ہو جانے دو۔ ہم اناج خریدنے والے شعبہ کے سرکاری کام پر آئے ہیں۔ انھوں نے ہمیں دوسرے کنارے سے کشتی کے ذریعے اس طرف اتار دیا ہے"۔ "لیٹ جاؤ" قازق نے کہا۔ گویا ان کے ایک ڈھیر پر دراز ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ میں بھی تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاؤں تو کیا حرج ہے۔ اپنے فرار کے بعد سے تو پہلی مرتبہ ہم کسی چھت کے نیچے لیٹے تھے۔ لیکن میں گرم اینٹوں کے اوپر تھا میں اطمینان سے لیٹ بھی نہ سکا، سونے کی بات تو دور رہی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہم نے اپنے ساتھ غدّاری کی ہے کھلی آنکھوں کے ساتھ ایک پھندے میں قدم رکھ دیا ہے۔

بوڑھا آدمی صرف انڈرویر پہنے ہوئے باہر نکل گیا (ورنہ میں اس کا تعاقب کرتا) اور تادیر باہر رہا۔

مجھے پردے کے پیچھے قازق زبان میں سرگوشیاں سنائی دیں۔" نوجوان! تم کون ہو؟" میں نے پوچھا" بولسے کیبر: "نہیں ہم جمہوریہ کیا بائی کے سرکاری مویشی فارم نمبر ایک سے آئے ہیں۔" ہم اس سے زیادہ غلط جگہ کا انتخاب نہیں کر سکتے تھے۔ جہاں کہیں سرکاری فارم تھے وہاں سرکاری افسران اور پولس بھی ہوتی تھی۔ پھر اس جمہوریہ کا بہترین فارم ــــ وہ یقیناً متجسس مزاج ہوں گے۔

میں نے کولیا کا ہاتھ دبایا" میں کشتی پر چل رہا ہوں۔ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ بریف کیس لے کر۔" باہر آکر میں نے بآوازِ بلند کہا" ہمیں سامان کنارے پر نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔" میں سیدھا صدر دروازے پر گیا اور اسے کھولنے کی کوشش کی۔ وہ باہر سے مقفل تھا۔ تو یہ بات ہے۔ میں اندر واپس چلا گیا اور کولیا کی قمیص کھینچ کر اسے آگاہ کیا اور دروازے پر پلٹ آیا۔ کاریگر نے یہ دروازہ لاپرواہی سے بنایا تھا اور اس کا نچلا تختہ بقیہ تختوں سے چھوٹا تھا۔ میں نے اس میں ہاتھ ڈالا اور اپنا بازو جہاں تک پہنچ سکتا تھا۔ پھیلایا اور چاروں طرف ٹٹول کر دیکھا۔ اوہ، یہ معاملہ تھا۔ دروازہ باہر ایک کھونٹی سے اٹکا ہوا تھا۔ میں نے اسے ہٹا دیا۔

میں باہر نکل گیا اور تیزی سے نیچے کنارے کی طرف بڑھا۔ کشتی وہیں کھڑی تھی جہاں ہم اسے چھوڑ گئے تھے۔ میں کھلی چاندنی میں کھڑا انتظار کرتا رہا۔ لیکن کولیا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ یہ خطرناک بات تھی! ظاہر ہے کہ وہ اپنے آپ کو اٹھنے پر آمادہ نہیں کر سکا۔ وہ کچھ دیر تک اور گرم ہونا چاہتا تھا۔ یا پھر انہوں نے اسے پکڑ لیا ہے۔ مجھے واپس جاکر اسے چھڑانا ہوگا۔

میں پھر ٹیلے پر چڑھا۔ مکان سے چار آدمی میری جانب آرہے تھے ان میں سے ایک زبانوف تھا۔ "زورا" وہ بآوازِ بلند چیخا (پھر زورا!" یہاں آؤ۔ وہ ہمارے کاغذات دیکھنا چاہتے ہیں۔" وہ بریف کیس نہیں لایا تھا جس کے لیے میں نے ہدایت کی تھی۔

میں ان کے پاس پہنچتا ہوں۔ قازق لہجے میں ایک نیا آدمی کہتا ہے" تمہارے کاغذات؟" میں حتی الامکان سکون کا مظاہرہ کرتا ہوں" لیکن تم ہو کون؟" "میں کمانڈنٹ ہوں۔" "تو ٹھیک ہے۔" میں اسے مطمئن کرنے کے لیے کہتا ہوں" چلو چلیں۔ تم ہمارے کاغذات جب جی چاہے دیکھ سکتے ہو۔ وہاں مکان میں زیادہ روشنی ہے۔" ہم مکان میں چلے جاتے ہیں۔

میں نے فرش سے بریف کیس آہستگی کے ساتھ اٹھا لیا اور لیمپ کے پاس پہنچا۔ میں اس گھات میں تھا کہ ان کے بغل سے نکل گھر سے باہر بھاگ جاؤں ان کی توجہ ہٹانے کے لیے اس دوران باتیں کرتا رہا" ہمارے کاغذات جب جی چاہے دیکھ لو۔ شوق سے دیکھو۔ ایسے حالات میں کاغذات کا معائنہ ضرور کر لینا چاہیے۔ آپ میں لاپرواہی نہیں برتنی چاہیے۔ ہماری خریداری کی ایجنسی کا ایک ایسا ہی کیس تھا۔۔۔" اب میرا ہاتھ قفل پر تھا، بریف کیس کھولنے کو تیار۔ وہ میرے چاروں طرف اکٹھے ہو گئے۔ پھر میں نے کمانڈنٹ کو اپنے کندھے سے دھکا دیا اور وہ بوڑھے سے جا ٹکرایا۔ دونوں گر پڑے۔ داہنی طرف کھڑے ہوئے نوجوان کے جبڑے پر میں نے ایک گھونسہ رسید کیا۔ وہ چیخے اور غرائے۔ "خدا حافظ" میں نے چیخ کر کہا اور بریف کیس لے کر اندرونی دروازے سے پھر بیرونی دروازے سے بھاگا۔ پھر کولیا اندرونی دروازے سے چلایا" زورا! انہوں نے مجھے پکڑ لیا ہے۔" وہ دروازے کی چوکھٹ سے چپٹا ہوا تھا اور وہ لوگ اسے اندر کھینچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے اس کا

بازو کھینچا لیکن اسے چھڑا نہیں سکا۔ پھر میں نے چوکھٹ پر پاؤں ٹکا کر زور لگایا اور ایسا جھٹکا دیا کہ خود بھی زمین پر آرہا اور گویا میرے سر پہ آگرا۔ ان میں سے دو نے مجھے اوپر سے دبوچ لیا۔ نہیں معلوم میں ان کی گرفت سے کیسے نکلا۔ ہمارا قیمتی بریف کیس پیچھے چھوٹ گیا۔ میں نیچے کی طرف بھاگا اور اس پر سے نیچے چلا گیا۔ اپنے عقب میں کسی کو روسی میں چیختے ہوئے سنا "کلہاڑی پھینک کر مار دو! کلہاڑی!" غالباً ہمیں خوفزدہ کرنے کے لیے، ورنہ وہ قازق زبان میں گفتگو کرتے۔ میں اپنے بدن پر دور تک ان کے عقب ہاتھوں کا لمس محسوس کر سکتا ہوں۔ میں ٹھوکر کھاتا ہوں اور قریب قریب زمین بوس ہو جاتا ہوں۔ گویا پہلے ہی کشتی میں پہنچ چکا ہے۔ خیریت گزری کہ ان کے پاس بندوق نہیں تھی۔ "بیٹھا ہوں۔" میں نے کشتی کو دھکا دیا۔ کشتی پہ سوار ہوتے ہوئے میں گھٹنے گھٹنے پانی میں تھا۔ قازق پانی میں گھسنے کو تیار نہ تھے وہ کنارے کنارے یہ چیختے ہوئے دوڑتے رہے: "ٹھہر جا، ٹھہر جا!" میں نے چیخ کر اُن سے کہا: "حرام زادو! سمجھ رہے ہوگے کہ تم نے ہمیں پکڑ لیا؟"

ہاں، یہ خوش قسمتی ہی تھی کہ ان کے پاس بندوق نہیں تھی۔ میں نے دھارے کے ساتھ ناؤ دوڑانا شروع کردی۔ وہ کنارے پر بھاگتے ہوئے ہمارا تعاقب کرتے رہے۔ لیکن ایک چھوٹی سی خلیج ان کے آڑے آگئی۔ میں نے اپنی دونوں پتلونیں، بکری اور سرمئی، اتار لیں اور انھیں نچوڑا۔ میرے دانت کٹکٹا رہے تھے: "کیوں کو لیا؟ ہماری اچھی ٹھکائی ہوئی!" میں نے کہا۔ وہ خاموش تھا۔

ظاہر ہے کہ اب ارلش سے رخصتی کی گھڑی آگئی تھی۔ صبح ہوتے ہی ہمیں کنارے پر اتر جانا چاہیے اور اومسک تک بقیہ راستہ لفٹ لے کر طے کرنا چاہیے۔ اب اومسک زیادہ دور نہیں تھا۔

کینٹو شا اور نمک پیچھے بریف کیس میں رہ گئے تھے۔ اور ہمیں ریزر کہاں مل سکتا ہے۔ یہ میں خود سے کیا پوچھتا کہ ہم اپنے کپڑے کس طرح خشک کریں گے۔ دیکھو! وہاں ساحل پر ایک کشتی اور ایک جھونپڑی۔ ظاہر ہے کہ کوئی کیمپر ہے۔ ہم کنارے پہنچے اور دستک دی۔ کوئی روشنی نہیں ہوئی۔ کسی مرد کی بھاری آواز — "کون ہے؟" "ہمیں ذرا گرم ہونے کے لیے اندر آنے دو، ہماری کشتی الٹ گئی ہے اور بمشکل غرقابی سے بچے ہیں۔" کافی دیر تک ٹٹولنے کی آوازیں — پھر دروازہ کھل گیا۔ دھندلی روشنی والے صدر دروازے پر ایک موٹا تازہ روسی بوڑھا۔ دروازے کے ایک جانب ہاتھ اوپر کیے کھڑا تھا اور ہمیں ایک کلہاڑی سے دھمکا رہا تھا۔ وہ اسے ہم میں سے کسی ایک پر مار سکتا تھا اور اسے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے پھر اسے اطمینان دلانے کی کوشش کی "ڈرو مت! ہم اومسک سے آئے ہیں۔ ہم ایک کام سے آبادی کے سرکاری فارم پر گئے تھے۔ ہم کشتی سے نیچے ضلع کے صدر مقام تک جانا چاہتے تھے لیکن اوپر کچھ اوتھلی جگہوں پر جال پڑے ہوئے تھے ہم ان میں الجھ گئے اور کشتی الٹ گئی۔" وہ اب بھی شبہہ کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس نے کلہاڑی نہیں چلائی۔ میں نے پہلے اسے کہاں دیکھا تھا، کس تصویر میں؟ کسی لوک کہانی کا بوڑھا آدمی۔ اس کے سفید گل مچھے اور سفید داڑھی۔ بالآخر اس نے جواب دینا کا فیصلہ کیا "تمہارا مطلب ہے تم زلینزیانکا جا رہے ہو؟ بہت خوب۔ اب ہمیں معلوم ہو گیا کہ ہم کہاں ہیں! ہاں۔ ہاں۔ زلینزیانکا۔ سب سے افسوسناک امر یہ ہے کہ میرا بریف کیس ڈوب گیا۔ اس میں ڈیڑھ سو روبل تھے۔ ہمیں نے سرکاری فارم پر کچھ گوشت خرید لیا تھا لیکن اب وہ بیکار ہے۔ شاید وہ تم ہم سے خرید لو۔" زڈانوف گوشت لینے چلا گیا۔ بوڑھے نے مجھے اندر کمرے میں آنے کو کہا۔ جہاں مٹی

کے تیل کی لالٹین روشن تھی اور دیوار پر ایک شکاری بندوق آویزاں تھی۔ اب ہم تمہارے کاغذات دیکھیں گے۔ میں نے حتی الامکان پر سکون لہجے میں بولنے کی کوشش کی" میں ہمیشہ اپنے کاغذات اپنے ہمراہ رکھتا ہوں۔ خوش قسمتی سے یہ میری بالائی جیب میں تھے ورنہ یہ بھی بھیگ جاتے۔ میں ہوں اسٹولیارووف وکٹر الگزینڈرووچ، صوبائی مویشی تنظیم کا نمائندہ" اب مجھے تیزی کے ساتھ حالات کو اپنے حق میں کرنا ہے "تم کون ہو؟" میں ایک بولٹے کیپر ہوں" "نام اور خاندانی نام؟" اسی وقت کولیا آ گیا اور بوڑھے نے پھر کاغذات کا نام نہیں لیا۔ اس نے کہا کہ میرے پاس گوشت خریدنے کی گنجائش نہیں ہے لیکن میں آپ لوگوں کی چائے سے تواضع کر سکتا ہوں۔

ہم اس کے ساتھ تقریباً ایک گھنٹہ رہے۔ اس نے ہمارے لیے لکڑی کی چپٹی یوں کی آگ پر چائے گرم کی ہمیں روٹی دی اور فیٹ بیکن گوشت کا ایک ٹکڑا بھی دیا۔ ہم ارٹش کے بحری دھاروں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ہم نے ناؤ کا کیا کرایہ ادا کیا اسے کہاں فروخت کرنا ہے۔ زیادہ تر وہی بولتا رہا۔ وہ اپنی تجربکار بوڑھی آنکھوں سے ہمدردی کے ساتھ ہمیں دیکھتا رہا اور مجھے ایسا لگتا تھا وہ ہمارے بارے میں سب کچھ جانتا تھا اور وہ ایک سچا انسان تھا۔ میرے دل میں اسے سچ سچ سب کچھ بتا دینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ لیکن اس سے ہمیں کوئی فائدہ نہ ہوتا واضح تھا کہ اس کے پاس ریڈیو نہیں تھا۔ اس کی داڑھی خود ہی ایسی بے ترتیب تھی جیسے جنگل کی دوسری تمام چیزیں۔ علاوہ ازیں خود اس کے لیے بھی عدم واقفیت کم خطرے کی چیز تھی۔ "مگر نہ یہ ہو گا کہ تم جانتے تھے اور تم نے بتایا نہیں"

ہم نے اپنا گوشت اس کے پاس چھوڑ دیا اور اس نے ہمیں کچھ دیا سلائیاں دیں وہ ہمیں وداع کرنے باہر آیا اور ہمیں سمجھایا کہ ہمیں کہاں کہاں اور کس کس طرف رہنا چاہیے ہم نے کشتی ڈھکیلی اور اپنی آخری رات میں زیادہ سے زیادہ دور نکل جانے کی غرض سے تیزی سے چپوار چلانے لگے۔ جب ہم کنارے پر پہنچے تو چاند اوجھل تھا لیکن آسمان صاف تھا اور ہم نے کھڑی ڈھلان، جنگل والے دلہنے ساحل پر اپنے عقب میں آتی ہوئی ایک کشتی دیکھی جو ہماری طرح بہاؤ کی طرف جا رہی تھی اور اتنی تیز رفتار نہیں تھی۔

کیا یہ کوئی خفیہ پولیس کا عملی دستہ ہو سکتا ہے؟ ..... ہم متوازی لائنوں میں چل رہے ہیں میں نے آمنا سامنا کرنے کا تہیہ کیا اور زور سے چلایا" اور ہم ان کے قریب آ گئے" "کیوں دوستو کدھر جا رہے ہو؟" "اومسک آئے کہاں سے ہو؟" "پافلوڈر" "اتنی دور کا سفر کیسے طے کیا؟" "ہم مستقلاً منتقل ہو رہے ہیں" اس کی آواز میں کسانوں کی مانند "او" اتنی بار آتا تھا کہ یقین ہو گیا کہ وہ ناخواندہ تھا اور پولیس افسر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر جواب دیتا تھا اور ... وہ ہمیں دیکھ کر خوش بھی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی بیوی کشتی میں محوِ خواب تھی اور وہ رات چپوار چلا کر گزار رہا تھا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ بہت کچھ بیل گاڑی جیسا عالم تھا، چیزیں ٹھسا ٹھس بھری تھیں۔ گٹھڑیوں پر گٹھڑیاں لگی ہوئی تھیں۔

میں نے تیزی کے ساتھ غور کیا۔ اس قسم کی ملاقات ـــ ہماری آخری رات میں ـــ ندی پر ہمارے اختتامیہ گھنٹوں میں! اگر وہ اپنا گھر بار لے کر مستقلاً جا رہا ہے تو ان کے پاس کھانے پینے کا سامان؟

پیسے اور پاسپورٹ ہوں گے، کپڑے اور ریزر بھی ہوگا۔ اور یہاں کوئی یہ سوچنے والا نہ ہوگا کہ وہ کہاں گئے؟ وہ تنہا ہے اور ہم دو ہیں اس کی بیوی کس شمار قطار میں ہے؟ میں اس کے پاسپورٹ پر سفر کروں گا۔ کولیا زنانہ پوشاک پہن سکتا ہے۔ وہ پستہ قامت ہے اور اس کا چہرہ ریش و بروت سے پاک ہے، اس پہ میک اپ کر دیا جائے گا۔ ان کے پاس یقیناً کوئی سوٹ کیس ہوگا جو ہمیں بظاہر سیاح نظر آنے میں مدد دے گا۔ جو بھی ڈرائیور ملے گا وہ ہمیں آج صبح تک اودسکے پہنچا دے گا۔

کسی نے آج تک ایسی روسی ندی کا نام سنا ہے جس میں جانجی (بحری قزاق) نہ ہوں گے۔ قسمت بڑی بے رحم ہے لیکن ہم اور کیا کر سکتے ہیں؟ اب کے ہم ندی پر ایک سراغ چھوڑ آئے ہیں یہ ہمارا واحد اور آخری موقع ہے۔ کسی مزدور آدمی سے اس کا سامان چھین لینا بہت بُرا ہے لیکن خود ہماری مصیبتوں پر کس نے کب ترس کھایا! اور آگے کون رحمدلی دکھائے گا۔

یہ تمام باتیں ایک لمحہ کے اندر میرے ذہن میں کوندگئیں اور زگالوف کے ذہن میں بھی۔ مجھے سرگوشی میں صرف اتنا پوچھنا پڑا "ہو جائے؟" اور اس نے دھیرے سے جواب دیا "ناخوم ڈیرا!"

میں بتدریج اس کے قریب آرہا ہوں اور اب کشتی کو کھڑی ڈھلان والے سیاہ جنگلات کی طرف دبا رہا ہوں۔ دریا میں نئے موڑ تک پہنچنے سے باز رکھنے کے لیے مجھے تیزی کرنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ آگے جنگلات کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ میں اپنی آواز میں تحکم پیدا کر لیتا ہوں اور اسے حکم دیتا ہوں۔

"خبردار! ہم لوگ ریاستی حفاظتی پولس کے ایک عملی دستے سے متعلق ہیں۔ کنارے چلو، میں تمہارے کاغذات کی جانچ کرنا چاہتا ہوں۔"

کھینے والے نے اپنی پتواریں نیچے ڈال دیں۔ کیا وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے؟ یا پھر وہ اس خیال سے بے حد مسرور ہے کہ ہم پولس والے ہیں، ڈاکو نہیں!

بے شک اس نے کہا "تم خواہ یہاں خواہ ساحل پر چل کر کاغذات دیکھ سکتے ہو۔" میں نے کہا "کشتی کو کنارے پہ لے چلو، یہیں تمہیں کرنا ہے۔ اور جلدی کرو۔"

ہم ان کے قریب آگئے اور ہمارے پہلو تقریباً ایک دوسرے سے مس ہو رہے تھے۔ ہم اس کی کشتی پر کود گئے۔ وہ جیسے تیسے اپنی گٹھڑیوں پر چڑھا اور ہم نے دیکھا کہ وہ لنگڑا رہا تھا۔ اس کی اہلیہ بیدار ہو گئی۔ "ہم ابھی کتنی دور ہیں؟" نوجوان نے اپنا پاسپورٹ آگے بڑھا دیا۔ "تمہارا ڈرافٹ (فوجی بھرتی کا کارڈ) کہاں ہیں؟" "میں معذور تسلیم کر لیا گیا تھا۔ زخمی ہو گیا تھا۔ مجھے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ یہ رہا صداقت نامہ!" مجھے اس کی کشتی کے اگلے حصے میں دھات کی چمک نظر آئی۔ ایک کلہاڑی۔ میں نے کولیا کو اشارہ کیا کہ وہ اسے اٹھا لے۔ اس نے تیزی کے ساتھ جھپٹ کر کلہاڑی اٹھا لی۔ عورت نے دال میں کالا محسوس کیا اور بڑبڑانے لگی "شور کیوں کر رہی ہو؟" میں نے ڈپٹ کر کہا: "اس کو ہٹا دو۔ ہم مفرور لوگوں کی تلاش میں ہیں۔ مجرموں کی —— اور کلہاڑی بھی اسلحے میں شمار کی جاتی ہے۔" وہ کچھ پرسکون ہو گئی۔

میں کولیا کو حکم دیتا ہوں ——

لیفٹننٹ، نگراں چوکی پر اتر جاؤ۔ وہاں کیپٹن بوڑبیوف ملیں گے۔

(نام اور عہدے میرے ذہن میں از خود آگئے ـــــ وجہ میں بتاتا ہوں: "ہمارا ایک دوست کیپٹن بورو بیوف، پیچھے ایکی لیسٹر میں تھا۔ جو فرار کی کوشش میں چالیس چکی میں بند تھا) کو لیا سمجھ گیا: اسے دیکھنا تھا کہ اوپر کوئی ہے تو نہیں، یا ہم کیا کارروائی کر سکتے ہیں۔ وہ اوپر دوڑا۔ اس دوران میں نے تفتیش اور معائنہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ میرا مشتبہ آدمی میری مدد کے لیے دیا سلائیاں سلگا رہا تھا۔ میں نے ان کے پاسپورٹوں اور صداقت ناموں کو پڑھ کر دیکھا۔ اس کی عمر بھی مناسب تھی۔ سابق فوجی چالیس سے نیچے تھا اس نے لوائے کپیر کا کام کیا تھا اب انھوں نے اپنا مکان اور گائے فروخت کر دی تھی (بلاشبہ ان کی قیمت اس کے پاس ہوگی) وہ اپنی قسمت آزمانے جا رہے ہیں۔ وہاں وہ ایک دن میں نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے رات میں روانہ ہو گئے تھے۔

نایاب موقع۔ غیر معمولی اتفاق ہے۔ سب سے بڑھ کر اس لیے کہ ان کی عدم موجودگی کی جانب کسی کی توجہ مرکوز نہیں ہوگی۔ اور ہمیں ان سے کس چیز کی ضرورت تھی؟ کہ ہم کو ان کی جان لینی پڑے گی؟ نہیں، میں نے کبھی قتل نہیں کیا تھا اور نہ اب کرنا چاہتا تھا۔ وہ تفتیش کنندہ یا کارروائی افسر، جب وہ مجھے تنگ کر رہا تھا ـــ ہاں لیکن میں عام مزدور آدمی پر اپنا ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ کیا میں ان کا پیسہ چھین لوں؟ ٹھیک ہے۔ لیکن تھوڑا سا۔ لیکن کتنا تھوڑا؟ جتنا ماسکو تک دو ٹکٹ خریدنے کے لیے کافی ہو اور کچھ اشیائے خوردنی! اور ان کے کچھ کپڑے۔ لٹنے سے وہ برباد نہیں ہو جائیں گے۔ اچھا اگر ہم ان کے کاغذات اور کشتی بخش دیں اور ان کے ساتھ معاہدہ کر لیں کہ وہ ہماری رپورٹ نہ کریں گے ان پر آسانی سے بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور کاغذات کے بغیر ہمارا کام کیسے چلے گا؟

اگر ہم نے ان کے کاغذات چھین لیے تو پھر ان کے پاس ہماری رپورٹ کرنے کے سوا کوئی راستہ نہ ہوگا۔ انھیں اس سے باز رکھنے کے لیے ہم انھیں ابھی یہیں باندھ کر ڈال دیں۔ انھیں اچھی طرح پیچ پیچ باندھ دیں تاکہ ہمیں دو یا تین دن کا بھاگنے کا موقع مل جائے۔

لیکن اس صورت میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ بس.....

کولیا پلٹ آیا اور اس نے اشارہ دیا کہ اوپر سب کچھ ٹھیک ہے۔ وہ میرے "ماخوم ڈیرا" کہنے کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

ایکی لیسٹر کا غلام کیمپ میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ کیا میں دوبارہ اس میں چلا جاؤں؟ یقیناً ہمیں حق حاصل ہے۔

اور اچانک ـــــ اچانک کوئی ہلکی سی چیز میری ٹانگوں سے ٹکرائی میں نے نیچے دیکھا۔ ایک چھوٹی سی سفید چیز تھی۔ میں اس پر جھکا یہ ایک سفید بلونگڑا تھا۔ بلی کا یہ بچہ ناؤ میں کود آیا تھا اور اپنی دم لکڑی کی طرح سخت کر کے میاؤں میاؤں کی آوازیں نکال رہا تھا اور میری ٹانگوں سے اپنا بدن رگڑ رہا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ میں نے محسوس کیا جیسے اس سفید بلونگڑے کے لمس نے میری تمام قوت سلب کر لی ہو۔ میں بیس دن سے اعصابی کشیدگی کے عالم میں رہا ہوں۔ جب سے میں تاروں کے

نیچے سے سرک کر فرار ہوا تھا۔ اس وقت سے۔ اچانک وہ باتیں کرتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے اندازہ کیا کہ خواہ کولیا مجھے کچھ بھی کہے میں ان کی جان نہیں لے سکتا نہ وہ پیسہ چھین سکتا ہوں جو ان کی محنت کی کمائی ہے۔

اب بھی میں نے چہرے پر سختی برقرار رکھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے۔ یہیں انتظار کرو، ہم ابھی دیکھتے ہیں کہ صداقت کیا ہے؟"

ہم کھڑی ڈھلان پر چڑھ گئے، کاغذات میرے ہاتھوں میں تھے، میں نے کولیا کو اپنے احساسات سے مطلع کیا۔

وہ خاموش رہا۔ اسے اتفاق نہیں تھا لیکن وہ چپ رہا۔

دنیا اسی طرح قائم ہے۔ وہ کسی سے بھی اس کی آزادی چھین سکتے ہیں۔ بغیر کسی تکلف کے۔ اگر ہم وہ آزادی، جو ہمارا پیدائشی حق ہے دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں ـــــ تو وہ ہماری زندگی لے کر، اور ان کی جان لے کر، جو ہمیں راہ میں ملے، اس آزادی کی قیمت وصول کرتے ہیں۔

وہ جو جی چاہے کریں لیکن ہم نہیں کر سکتے۔ متفق الرائے ہوئے بغیر ہم پھر نیچے آ گئے۔ صرف لنگڑا آدمی کشتی میں موجود تھا۔ "تمہاری بیوی کہاں ہے؟"

"وہ خوف زدہ ہو گئی تھی جنگل میں بھاگ گئی ہے۔"

"یہ لو اپنے کاغذات ـــــ تم اپنے راستے پر جا سکتے ہو۔"

وہ میرا شکریہ ادا کرتا ہے اور جنگل کی طرف منہ کر کے صدا لگاتا ہے ـــــ

"ماریا! واپس آ جاؤ۔ یہ لوگ سچے آدمی ہیں۔"

ہم کشتی کو دھکا دیتے ہیں میں تیزی سے پتوار چلاتا ہوں۔ عام محنت کش، لنگڑا آدمی، اچانک یاد کرتا ہے اور مجھے پیچھے سے آواز دیتا ہے۔

"کامریڈ افسر! کل ہم نے دو آدمی دیکھے تھے بالکل ڈاکو نظر آتے تھے۔ اگر ہمیں علم ہوتا تو ہم بدمعاشوں کو پکڑ لیتے۔"

"کیا اب بھی اس پر رحم آ رہا ہے؟" کولیا استفسار کرتا ہے۔

میں کچھ نہیں کہتا۔

ـــــ ٭ ـــــ

اس رات سے ـــــ اس لمحے سے، جب ہم تاپنے کے لیے کسان کے گھر میں گئے تھے یا شاید جب پہلی بلی کا سفید بچہ ملا تھا، ہماری مہم میں گڑبڑ پیدا ہو گئی۔ ہم نے کچھ چیزیں ضائع کر دی تھیں، ہمارا استقلال ہماری لگن! سیدھے سادے انداز میں سوچنے کی صلاحیت؟ ہماری عام فہم و فراست! اب کہ ہم اوسک پہنچنے ہی والے تھے ہم نے غلطیوں کا آغاز کر دیا۔ علیحدہ علیحدہ سمتوں میں زور لگانے لگے۔ جب مسافر دریا میں یہ رویہ اختیار کر لیں تو زیادہ آگے تک نہیں جا سکتے۔

صبح کے وقت ہم نے کشتی چھوڑ دی۔ دن ہم نے ایک گھاس کے انبار میں سو کر گزارا لیکن بیقراری کے عالم میں جھٹ پٹا ہو گیا۔ ہمیں بھوک لگی تھی۔ گوشت کا کچھ شوربہ تیار کرنے کا وقت تھا لیکن جنگل سے

چلتے وقت ہم نے اپنی بالٹی گم کر دی تھی۔ میں نے سوچا گوشت بھون لیا جائے۔ ہمیں ٹرکیز کی ایک سیٹ مل گئی تھی، وہ کڑھائی کا کام دے گی۔ آلو ہم یوں ہی بھون لیں گے۔

قریب ہی ایک اونچی جھونپڑی تھی جیسے گھاس کاٹنے والے بنا کر چھوڑ گئے تھے۔ میرے دل میں اس دن جو غبار چھایا ہوا تھا اس کے پیش نظر جھونپڑی میں ہی آگ روشن کرنا مناسب معلوم ہوا۔" اس طرح روشنی کسی طرف سے دیکھی نہ جا سکے گی۔ کوبا کو شام کے کھانے کی کوئی خواہش نہیں تھی: "چلو آگے بڑھیں!" ایک بار پھر ہم متفق الرائے نہ ہو سکے۔

میں نے جھونپڑی میں آگ روشن کر ہی لی۔ لیکن اس میں بہت زیادہ لکڑیاں ہو گئیں چنانچہ تمام جھونپڑے میں آگ لگ گئی اور میں رینگتا ہوا جیسے تیسے باہر نکل آیا۔ پھر آگ بڑھ کر گھاس کے انبار تک جا پہنچی۔ اُسی انبار میں، جس پر ہم تمام دن سوئے تھے اور وہ دھڑا دھڑ جلنے لگا۔ اچانک مجھے گھاس کی بربادی پر تاسف کا احساس ہوا۔ ایسی میٹھی خوشبو والی اور ہم پر اتنی مہربان گھاس۔ میں نے اسے پھیلانا شروع کیا اور اسے بجھانے کی کوشش میں آگ کو پھیلنے سے روکنے کے لیے زمین پر لڑھکنے لگا۔ کوبا بیزار سا بیٹھا رہا، خشمناک۔ اس نے میری کوئی معاونت نہیں کی۔

اب میں نے کیا سراغ چھوڑ دیا ہے۔ یہ کتنی بھیانک آگ تھی۔ اس کی چمک کئی کلومیٹر کے فاصلے پر نظر آئی ہو گی اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ یہ تخریبی کارروائی تھی۔ فرار کی کوشش کے لیے وہ ہمیں دہی ربع صدی کی سزائے قید دیتے جو ہمیں پہلے سے ملی ہوئی تھی۔ لیکن کولخوزکی گھاس کی تخریب کاری کے لیے اگر وہ چاہتے تو ہمیں سزائے موت دے سکتے تھے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر غلطی سے آئندہ کئی دوسری غلطیوں کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ آپ کی خود اعتمادی ختم ہو جاتی ہے۔ آپ حالات کا جائزہ نہیں لے پاتے۔

جھونپڑی جل کر خاک ہو گئی تھی لیکن آلو بھن گئے تھے۔ انگاروں نے راکھ نے نمک کی کمی پوری کر دی تھی۔ ہم نے کچھ آلو زہر مار کیے۔

رات بھر ہم پیدل چلتے رہے ایک بڑے قصبے کا طواف کرنا پڑا۔ ایک بیلچہ ہاتھ لگا۔ ہم نے اس خیال سے کہ وہ کسی موقع پر کام آ سکتا ہے۔ اٹھا لیا۔ ہم ارٹش کے اور قریب آ گئے تھے۔ ایک خلیج کی وجہ سے رکنا پڑا۔ کیا ہم دوسرا چکر لگائیں؟ ایک مصیبت تھی۔ ہم نے کچھ ادھر اُدھر دیکھا تو بغیر پتوار کی ایک کشتی پر نظر پڑ گئی۔ کوئی پروا نہیں، بیلچہ چپو کا کام دے گا۔ خلیج ہم نے پار کر لی پھر میں نے بیلچے کو اپنی پشت پر باندھ لیا۔ تاکہ اس کا دستہ بندوق کی نال کی طرح اوپر نکلا رہے۔ اندھیرے میں ہم خود کو شکاری ظاہر کرتے ہوئے نکل جاتے

تھوڑی دیر بعد کوئی ہماری طرف آیا اور ہم ایک طرف ہٹ گئے: "پیٹرو" اس نے کہا۔ "تم غلط آدمی سے مخاطب ہو، میں پیٹرو نہیں ہوں!"

ہم تمام رات سفر کرتے رہے پھر ایک گھاس کے انبار میں سو گئے۔ کسی اسٹیمر کی سیٹی سے آنکھ کھلی۔ ہم نے اپنے سر باہر نکالے۔ قریب ہی ایک گھاٹ نظر آیا۔ لاریاں وہاں سے تربوزے کر جا رہی تھیں۔ اومسک قریب ہے۔ اومسک قریب ہے۔ حجامت بنا ڈالو کچھ پیسے حاصل کرو۔

گویا مجھے ٹوکتا رہا: "اب ہم نہیں پہنچ سکیں گے۔ تم لوگوں پر ترس کھانے لگو تو پھر پہلے ہی بھاگنے سے کیا فائدہ تھا؟ ہماری قسمت معلق ہے اور تم لوگوں پر رحم کر رہے ہو اب ہم نہیں پہنچ سکیں گے۔"

اس کی بات سچ تھی۔ اب یہ بات کیسی احمقانہ لگتی تھی۔ نہ ہمارے پاس ریزر تھا نہ پیسے۔ دونوں چیزیں ہماری دسترس میں تھیں اور ان سے دستبردار ہوگئے۔ سوچو تو ذرا فرار کی خواہش نے ان طویل برسوں کے بعد اتنی جفاکشی کے بعد تار کے نیچے سے رینگنے کے بعد کسی بھی لمحے پشت پر گولی کھانے کا دھڑکا لیے، چھ دن مسلسل پیاسے رہنے کے بعد، دو ہفتے ریگستان کا سفر کرنے کے بعد ہم نے وہ سامان چھوڑ دیا جو ہم بآسانی حاصل کر سکتے تھے۔ میں خط بنائے بغیر اوڈیسک میں کیسے داخل ہو سکتا ہوں؟ ہم اوڈیسک سے آگے کا خرچ کہاں سے پورا کریں گے۔

ہم دن بھر گھاس کے ایک انبار میں پڑے رہے۔ بیشک سو نہیں سکے۔ تقریباً پانچ بجے زڈانوک کہتا ہے "چل کر روشنی میں چاروں طرف ایک نظر ڈال لی جائے۔" "ہرگز نہیں!" میں کہتا ہوں۔ "اب تقریباً ایک مہینہ ہونے جارہا ہے۔ تم ضرورت سے زیادہ احتیاط سے کام لے رہے ہو! میں تو نکل رہا ہوں، اکیلا ہی دیکھ آتا ہوں۔" میں اسے دھکاتا ہوں: "خبردار! ورنہ چاقو اتار دوں گا۔" لیکن یقیناً میں اسے چاقو نہیں ماروں گا۔

وہ خاموش ہو گیا اور چپ چاپ پڑا رہا۔ پھر دفعتاً وہ انبار سے نکل کر چل دیا۔ مجھے کیا کرنا چاہیے اسے جانے دو اس طرح؟ میں بھی نیچے کود پڑا اور پیچھے گیا۔ ہم کھلی روشنی میں آگے بڑھے۔ اگر اب ہمیں کوئی مل گیا تو اسے جانے نہیں دیں گے۔ کہیں وہ اندھیرا ہونے سے پیشتر ہماری رپورٹ نہ کردے۔ گویا لاپرواہی کے ساتھ دوڑ کر یہ دیکھنے گیا کہ سڑک صاف ہے یا نہیں، اور ایک نوجوان نے فوراً اسے دیکھ لیا۔ مجھے اس کو اپنے پاس بلانا پڑا۔ "ادھر آؤ دوست! سگریٹ کے کش لے کر کچھ غم غلط کریے۔" "تم کو کیا غم ہے؟" "میں اور میرا برادر نسبتی تعطیل مناتے ہوئے ندی میں سفر کر رہے تھے۔ میں اوڈیسک کا رہنے والا ہوں اور وہ پاپلوڈر کے جہاز کی مرمت کرنے والے کارخانے میں فرٹر ہے اور بھری رات میں ہماری کشتی کا لنگر کھل گیا اور وہ بہہ گئی۔ ہمارے پاس اتنا ہی سامان رہ گیا ہے جو ساحل پر تھا۔" "اچھا تم کون ہو؟" "میں بولائے کیپر ہوں۔" "تمہاری ناؤ تو تمہیں نظر نہیں آئی؟ شاید سرکنڈوں میں ہو۔" "نہیں۔" "تمہاری چوکی کہاں ہے؟" "ادھر۔" اس نے ایک چھوٹے سے مکان کی جانب اشارہ کیا۔ "تو چلو وہیں چل کر تھوڑا سا گوشت کا شوربہ تیار کریں اور حجامت بنالیں۔"

ہم چل پڑتے ہیں لیکن جو مکان ہم نے دیکھا تھا وہ اس کے ہمسائے کا نکلا۔ یہ ایک دوسرا بوائے کیپر تھا اور ہمارے ساتھی کا مکان مزید تین سو میٹر دور تھا۔ اور کچھ دور ساتھ رہے گا۔ جیسے ہی ہم مکان میں داخل ہوئے فوراً ہمسایہ سائیکل پر ہمیں دیکھنے کے لیے آپہنچا اور اپنی شکاری بندوق ساتھ لایا۔ اس نے میرا بڑھا ہوا خط دیکھا اور مجھ سے اوڈیسک کے حالات دریافت کیے۔ مجھ جیسے قیدی پرندے سے بیرونی زندگی کے بارے میں سوالات کرنے سے فائدہ — میں نے مبہم الفاظ میں جواب دیے جن کا لب لباب یہ تھا کہ مکانات کی حالت خراب ہے اور ضروریات زندگی کی خراب تر۔ میں نے سوچا کہ یہ باتیں غلط نہیں ہو سکتیں وہ جھلایا ہوا سا لگا۔ اور اس نے میری بات کاٹ دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ (کمیونسٹ) پارٹی کا کارکن ہے۔ گویا نے میرے لیے شوربا تیار کیا۔ کھانے کا موقع دستیاب ہو تو ہمیں شکم سیر ہو کر کھالینا چاہیے۔ شاید اوڈیسک تک ہمیں اور کوئی موقع ہاتھ نہ آئے۔

شام کا انتظار خاصا بیزار کن تھا۔ ہم ان میں کسی کو بھی وہاں سے ہٹا نہیں سکتے تھے اور کوئی تیسرا آ جائے تو؟ بالآخر وہ دونوں اپنی روشنیوں کا بندوبست کرنے کے لیے جانے پر تیار ہوئے۔ ہم نے اپنی خدمات پیش کیں۔ پارٹی کے رکن نے انکار کر دیا۔ "میں صرف دو روشنیاں لگاؤں گا۔ اور پھر مجھے ایک گاؤں جانا ہوگا میں اپنے کنبے کے لیے لکڑیوں کا ایک گٹھا لے جاؤں گا۔ بعد میں پھر آؤں گا۔" میں کولیا کو اشارہ کرتا ہوں کہ پارٹی کے رکن پر نگاہ رکھے اور ذرا بھی گڑبڑ کا اندیشہ ہو تو جھاڑیوں میں جا چھپے۔ میں اسے وہ جگہ دکھاتا ہوں جہاں وہ مجھ سے مل سکے گا۔ میں اپنے آدمی کے ہمراہ جاتا ہوں۔ اس کی کشتی کے ساحل کے آس پاس کے مقامات کا جائزہ لیتا ہوں اور اس سے فاصلوں کے بارے میں سوالات کرتا ہوں وہ ہمسائے کے ساتھ ہی ساتھ لوٹتے ہیں اور اس طرح میرے دل کو تسکین ملتی ہے؛ تاحال اسے ہم لوگوں کو گرفتار کروانے کی مہلت نہیں ملی ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ گاڑی لے کر آتا ہے جیسا کہ اس نے کہا تھا کہ وہ آئیگا اور اس کی گاڑی پر لکڑیوں کا ایک گٹھا ہے لیکن آگے جانے کی بجائے وہ کولیا کے شوربے کا ذائقہ لینے کے لیے بیٹھ جاتا ہے۔ وہ نہیں جائے گا۔ ہمیں کیا کرنا ہوگا؟ ان دونوں کو باندھ لیں؟ ایک کو تہ خانے میں بند کر دیجئے اور دوسرے کو پلنگ سے باندھ دیں؟ ان دونوں کے قبضے میں کاغذات ہیں اور ہمسائے کے پاس سائیکل اور بندوق ہے۔ مفرور زندگی کا یہ اثر ہوتا ہے سیدھی سادی مدارات کافی نہیں، آپ کو اس سے زائد بالجبر وصول کرنا پڑتا ہے۔

اچانک پتواروں کی رکنے کی آوازیں۔ میں کھڑکی میں جھانک کر دیکھتا ہوں ایک کشتی میں تین افراد اس طرح اب پانچ اور دو کا مقابلہ ہے۔ میرا میزبان باہر چلا جاتا ہوں اور ذرا کنستر لینے کے لیے واپس پلٹ آتا ہے۔ "ذرین، مٹی کا تیل لایا ہے۔" وہ کہتا ہے۔ "عجیب بات ہے کہ وہ خود آیا ہے! آج تو اتوار ہے۔"

اتوار! ہم نے ہفتہ بھر سے دنوں کا حساب رکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ہم جس دن فرار ہوئے تھے وہ اتوار کی شام تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے فرار کو ٹھیک تین ہفتے ہو گئے! کیمپ کا جانے کیا حال ہوگا؟۔ کتوں کا غول اب ہماری جانب سے نا امید ہو چکا ہوگا۔ تین ہفتے میں، اگر ہم کسی لاری پر بھاگے ہوتے تو بہت پہلے کہیں کریلیا یا بائیلوروس میں جم گئے ہوتے، پاسپورٹ اور ملازمتیں حاصل کر چکے ہوتے یا اگر قسمت ساتھ دیتی تو اور بھی آگے مغرب میں۔ اب تین ہفتوں کے بعد شکست سے دوچار ہونا کتنا تکلیف دہ ہوگا....

"اچھا کولیا اب ہم کوٹلے چکے، کیا خیال ہے رفع حاجت کر لیں؟" ہم باہر جھاڑیوں میں جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے؛ ہمارا میزبان آنے والی کشتی سے مٹی کا تیل لے رہا ہے اور پارٹی کا رکن ہمسایہ بھی ان سے جا ملا ہے۔ وہ کسی بارے میں باتیں کر رہے ہیں جو ہمیں سنائی نہیں دیتیں۔

وہ چلے گئے ہیں۔ میں کولیا کو تیزی کے ساتھ واپس جانے کے لیے کہتا ہوں۔ میں بوائے کیپردن کو اپنے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا۔ میں چپ چاپ میزبان کی کشتی تک جاتا ہوں۔ زنجیر کی آواز پیدا نہ کرتے ہوئے احتیاط کے ساتھ وہ میخ اکھاڑ دیتا ہوں جس سے کشتی بندھی ہوئی ہے۔

میں حساب لگاتا ہوں کہ ہمارے پاس کتنی مہلت ہے؛ اگر نورمین بولٹے کیپر ہماری مخبری کرنے گیا ہے تو وہ جگہ گاؤں سے سات کلومیٹر دوری پر ہے جس کا مطلب ہے تقریباً چالیس منٹ۔ اگر "سرخ فیتے" گاؤں میں ہے تو انہیں تیاری کرنے اور یہاں تک پہنچنے میں تقریباً پندرہ منٹ لگیں گے۔

میں گھر کے اندر جاتا ہوں۔ ہمسایہ تاحال رخصت ہونے پر آمادہ نہیں، وہ اپنی گپ شپ سے ان کا دل بہلا رہا ہے۔ عجیب و غریب بات ہے! تو ہمیں ان دونوں سے بیک وقت نپٹنا ہو گا۔ "کو لیا! کیا خیال ہے تمہارا؛ سونے سے پہلے ایک بار غسل کر لیں؟ (ہمیں کسی منصوبے پر اتفاق رائے کرنا چاہیے) جیسے ہی ہم باہر آتے ہیں، اندھیرے میں جوتوں کی کھٹ پٹ سنائی دیتی ہے۔ نیچے جھک کر ہم زرد آسمان کی روشنی میں (چاند اب تک طلوع نہیں ہوا۔ مکان کا محاصرہ کرنے کے لیے جھاڑیوں کے آس پاس ایک دوسرے کے آگے پیچھے دوڑتے ہوئے آدمیوں کو دیکھ سکتے ہیں۔

"کشتی کی طرف" میں سرگوشی میں کو لیا سے کہتا ہوں۔ میں ندی کی طرف دوڑتا ہوں، کھڑے کنارے سے نیچے کی طرف پھسل جاتا ہوں۔ گرتا ہوں اور کشتی پر پہنچتا ہوں۔ ہر سیکنڈ کا مطلب ہے زندگی اور موت کا فاصلہ۔ لیکن کو لیا غائب ہے! کہاں؟ اوہ وہ کہاں جا سکتا ہے! میں اسے تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔

آخر کار وہ تاریکی میں دوڑتا ہوا سیدھا میری طرف آتا ہے۔ کو لیا! کیا یہ تم ہو؟ ایک کوندا! فائر بالکل نزدیک سے! میں نیچے دبکتا ہوں۔ کشتی میں بازو پھیلائے کھردی ڈھلان سے مشین گن کی گولیوں کی تڑ تڑ! شور و غل: ہم نے ان میں سے ایک کو گھیر لیا وہ میرے اوپر جھکتے ہیں۔ "زخمی ہو گیا ہے۔" میں کراہتا ہوں۔ وہ مجھے باہر کھینچ لیتے ہیں اور گھسیٹ کر لے چلتے ہیں۔ میں لنگڑانے لگتا ہوں (اگر میں زخمی ہوں تو وہ مجھے کم ماریں گے) اندھیرے میں ان کی نظریں بچا کر دونوں چاقو گھاس میں پھینک دیتا ہوں۔

اوپر پہنچ کر سرخ فیتے میرا نام دریافت کرتے ہیں (میں اپنا نام نہیں بتانا چاہتا اگر ظاہر کر دوں گا تو میری آزادی فی الفور ختم ہو جائے گی) وہ میرے منہ پر وار کرتے ہیں "نام!" "اسوڈ لیارودت" وہ مجھے جھونپڑے میں کھینچ لاتے ہیں۔ مجھے کمر تک عریاں کر دیتے ہیں اور تار سے میرے ہاتھ پشت پر اتنی سختی سے باندھ دیتے ہیں کہ وہ گوشت کو کاٹنے لگتا ہے۔ وہ میرے پیٹ پر سنگینوں کی نوک لگا دیتے ہیں ان میں سے ایک کے نیچے سے خون بہنے لگتا ہے جس ملیشیا مین نے مجھے پکڑا ہے وہ سینئر لیفٹننٹ سیوتا زنکو ف ہے، وہ اپنا ریوالور میرے منہ پر اڑا دیتا ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ اس کا گھوڑا چڑھا ہوا ہے۔ "نام!" مدافعت فضول ہے، میں انھیں بتا دیتا ہوں۔ "دوسرا آدمی کہاں ہے؟ وہ اپنے ریوالور کو جنبش دیتا ہے۔ سنگینیں زیادہ گہرائی تک پہنچ جاتی ہیں۔ "ہم ساتھ ہی تھے" میں انھیں مطلع کرتا ہوں۔ "عین ممکن ہے کہ وہ مارا گیا ہو۔"

چکمہ دار نیلے ترے والا ایک افسر تحفظ، جو قازق ہے آ پہنچا۔ اس نے مجھ دست بستہ کو چارپائی پر دھکا دیا اور جب میں وہاں نیم دراز اور نصف بیٹھا ہوا تھا، اس نے میرے منہ پر دھادھم مارنا شروع کیا ــ بائیں، دائیں، بائیں، دائیں، جیسے وہ تیر رہا ہو ہر وار کے ساتھ میرا سر دیوار سے ٹکراتا تھا۔ "تمہارے اسلحے کہاں ہیں؟" "کون سے اسلحے؟" "رات میں تمہارے پاس بندوق دیکھی گئی تھی۔" چنانچہ ہم نے جس شکاری کو دیکھا تھا اس نے ہمیں دھوکا دیا۔ "وہ بیلچہ تھا، رائفل نہیں۔" اس نے یقین نہیں کیا اور جب مجھے

مارتا رہا۔ دفعتاً درد کا احساس جاتا رہا۔ مجھے غش آگیا۔ میں ہوش میں آیا تو وہ کہہ رہا تھا ــــ "یہ مت سمجھو کہ اگر ہم میں سے کوئی زخمی ہوا تو ہم تمہیں فوراً ڈھیر کر دیں گے۔"

(انھوں نے کسی طرح بھانپ لیا ہوگا۔ کولیا کے پاس واقعی بندوق تھی۔ یہ سب معاملہ بعد میں مجھ پر واضح ہوا۔ جب میں نے کہا تھا: "کشتی کی طرف" تو کولیا دوسری طرف جھاڑیوں میں بھاگ گیا تھا؛ اسے تمام دن اپنی راہ کھوئی ہونے کا احساس رہا تھا اور اب اس نے وہ کام کر ڈالا تھا۔ علاوہ ازیں اسے سائیکل کا بھی علم تھا۔ گولیوں سے اپنی سمت کا فیصلہ کرتے ہوئے وہ دریا کی مخالف سمت اور اس راہ سے رینگ کر نکل گیا۔ جدھر سے وہ آیا تھا۔ اب تک واقعی اندھیرا چھا گیا تھا اور جب وہ سارا غول میرے گرد جمع تھا، کولیا کھڑے ہو کر بھاگ نکلا۔ بھاگا اور بھاگتے ہوئے یہ سوچ کر روتا رہا کہ انھوں نے مجھے مار دیا ہے وہ دوسرے چھوٹے مکان میں ہسلاٹے کی قیام گاہ تک دوڑا۔ اس نے ایک کھڑکی پر ٹھوکر ماری اور بندوق تلاش کرنے لگا۔ اس نے چہار جانب ٹٹول کر دیکھا اور آخر کار وہ دیوار پر اس کے ہاتھ لگ گئی۔ اس کے ساتھ ہی کارتوسوں کی ایک تھیلی بھی تھی۔ اس نے بندوق لوڈ کر لی۔ وہ سوچتا رہا، جیسا کہ اس نے بیان کیا کہ کیا وہ میرا انتقام لے" کیا میں واپس جا کر زور کا بدلہ لینے کے لیے ان پر گولیاں برساؤں؟" لیکن اسے عقل آگئی۔ اسے سائیکل مل گئی اور ایک کلہاڑی بھی۔ اس نے دروازہ اندر سے کاٹ دیا، ایک تھیلے میں نمک رکھا۔ نہیں معلوم یہ چیز اسے سب سے زیادہ اہم معلوم ہوئی یا اس کے پاس یہ سب سوچنے کے لیے وقت نہ تھا ــــ اور وہ سائیکل پر سوار ہو کر چل پڑا۔ پہلے ایک کچی گلی پر، پھر گاؤں سے درمیان سے، سیدھے فوجیوں کے پاس سے ہوتا ہوا ــــ انھوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی)

اس دوران مجھے ایک گاڑی پر ڈال دیا گیا، دو فوجی مجھ پر سوار ہو گئے اور مجھے دو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک سرکاری فارم پر لایا گیا۔ یہاں ٹیلیفون تھا اور وہیں سے جنگلات کے رینجر نے (وہ فورمین لوائے کیپر کے ہمراہ کشتی میں تھا) سرخ پٹی والوں کو طلب کیا تھا؛ یہی وجہ تھی کہ وہ اتنی جلدی پہنچ گئے تھے ــــ کیوں کہ انھیں فون کیا گیا تھا۔ میں نے اس کا حساب نہیں لگایا تھا۔

میں نے اور رینجر افسر نے ایک تماشہ کھڑا کر دیا جو بیان کرنے میں بھونڈا لگے گا۔ لیکن اس بات کا نمونہ پیش کرے گا کہ گرفتار شدہ مفرور کیا کیا توقعات وابستہ کر سکتا ہے میں رفع حاجت کے لیے جانا چاہتا تھا۔ کھڑے کھڑے۔ اور کسی کو میری مدد کرنی تھی۔ بڑی اپنائیت کے ساتھ کیوں کہ میرے ہاتھ پشت کی طرف مڑے ہوئے تھے۔ شامی گن والے فوجی خیال کرتے تھے کہ یہ ہماری شان کے خلاف ہے اور انھوں نے جنگل والے کو حکم دیا کہ وہ میرے ساتھ باہر جائے۔ تاریکی میں ہم، جہاں فوجی کھڑے تھے۔ اس مقام سے کچھ دور گئے اور جب وہ میری مدد کر رہا تھا تو اس نے میرے ساتھ غداری کرنے پر معذرت کے الفاظ کہے، میری ملازمت کا سوال تھا۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔

میں نے جواب نہیں دیا۔ کوئی آدمی فیصلہ کیسے کر سکتا ہے؟ ہمیں ملازم پیشہ لوگوں نے بھی دھوکا دیا اور غیر ملازموں نے بھی۔ جن سے بھی ہم ملے اس نے ہمیں دھوکا دیا سوائے اس سفید گل مچھوں والے بوڑھے آدمی کے۔

میں شاہراہ کے ایک جھونپڑے میں بیٹھا ہوں۔ کمر تک برہنہ اور بندھا ہوا۔ مجھے بہت پیاس لگی ہے لیکن وہ پینے کے لیے مجھے کچھ نہیں دیتے۔ لال فیتے وحشی جانوروں کی مانند مجھے گھورتے ہیں اور ان میں سے ہر فرد کسی نہ کسی حیلے سے مجھے اپنی بندوق کے کندے سے ڈھکیلتا ہے۔ لیکن یہاں وہ میری جان نہیں لے سکتے۔ وہ آپ کو جان سے اُسے وقت مارتے ہیں جب وہاں تھوڑے سے لوگ ہوں اور شہادت نہ مل سکے۔ (ان کا خیال سمجھنے میں آتا ہے۔ اتنے دنوں وہ سرکنڈوں میں تلاش کرتے رہے ہیں، ذرا بھی آرام نہیں کر سکے۔ ڈبوں کی غذا ملی گرم کھانا کبھی نصیب نہ ہوا)

پورا خاندان جھونپڑے میں موجود ہے۔ چھوٹے بچے حیرت سے مجھے تک رہے ہیں، لیکن زیادہ قریب آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ وہ خوف سے کانپتے بھی ہیں۔ ملیشیا کا لیفٹیننٹ اپنے میزبان کے ساتھ بیٹھ کر دو دھکا پی رہا ہے۔ وہ اپنی کامیابی پر اور اس کی بنا پر ملنے والے انعام کے بارے میں سوچ سوچ کر مسرور ہے "جانتے ہو یہ کون ہے؟" وہ شیخی بگھارتا ہوا اپنے میزبان سے کہتا ہے" یہ ایک کرنل ہے۔ ایک مشہور امریکی جاسوس! ایک بہت خطرناک مجرم — یہ فرار ہو کر امریکی سفارت خانے کی طرف جا رہا تھا۔ انھوں نے یہاں آنے ہوئے لوگوں کو قتل کیا ہے اور انھیں کھا گئے ہیں"!

اس بات پر شاید وہ خود بھی یقین رکھتا ہے۔ ریاستی محکمۂ تحفظ نے ہمیں زیادہ جلد پکڑنے کی غرض سے ہر آدمی کی نگاہ میں تنفر پیدا کرنے کے لیے ہماری بابت ایسی افواہیں پھیلائی ہوں گی۔ وہ طاقت اسلحہ اور تیز رفتاری کی سہولیات سے ہی مطمئن نہیں ہیں۔ انھیں جھوٹی بدنامی سے بھی مدد لینی پڑتی ہے۔

(اس اثنا میں کوئی اپنی سائیکل پر سوار جھونپڑے کے پاس سے سڑک پر گزرتا ہے۔ رائفل اس کے شانے پر آویزاں ہے جیسے اسے دنیا میں کسی بات کی تشویش نہ ہو۔ اسے ایک بے در روشن جھونپڑا نظر آتا ہے، فوجی سگریٹ پی رہے ہیں اور برآمدے میں با آواز بلند مصروفِ گفتگو ہیں اور میں نیم برہنگی کے عالم میں کمرے کے دکھائی پڑ جاتا ہوں۔ وہ تیزی سے پیڈل مارتا ہے اوسک کی سمت۔ جہاں میں گرفتار کیا گیا تھا وہاں جھاڑیوں کو محاصرے میں لے کر فوجی گھات لگا کر بیٹھیں گے اور صبح ہونے پر انھیں اچھی طرح دیکھیں گے۔ تا حال کسی کو معلوم نہیں کہ ہمسائے بولنے کہیں کی سائیکل اور بندوق ندارد ہے۔ وہ بھی غالباً ایک پیگ پینے کے لیے اس طرف چلا آیا ہے)

جب وہ اپنی کامیابی پر کافی موج منا چکا ہے کہ یہ مقامی اعتبار سے ایک شاندار کارنامہ تھا تو ملیشیا لیفٹیننٹ مجھے گاؤں پہنچا دینے کا حکم دیتا ہے۔ ایک بار پھر وہ مجھے گاڑی پر پھینک دیتے ہیں اور مجھے حوالات لے جاتے ہیں (کوئی نہ کوئی حوالات قرب وجوار میں ضرور موجود ہوتی ہے۔ ہر گاؤں کی سوویٹ میں ایک حوالات کا بندوبست ہے) دو ٹامی گن والے گلیوں پر پہرے پر تعینات ہیں اور دو کھڑکی کے باہر ایستادہ ہیں! ایک امریکی جاسوس کرنل! وہ میرے ہاتھ کھول دیتے ہیں لیکن مجھے کمرے کے وسط میں فرش پر لیٹ جانے اور کسی دیوار کی طرف نہ جانے کی ہدایت کرتے ہیں۔ اکتوبر کی ایک رات میں اس عالم میں گزارتا ہوں کہ فرش پر دراز ہوں اور میرے جسم کا نصف بالائی حصہ عریاں ہے۔

صبح ایک کیپٹن آتا ہے اور اپنی نگاہیں مجھ پر مرکوز کر دیتا ہے۔ وہ میرا ٹیونک میری طرف اچھالتا ہے (میری باقی ماندہ اشیاء انھوں نے شراب خریدنے کے لیے پہلے ہی فروخت کر دی تھیں!) اطمینان کے ساتھ اور ایک آنکھ سے دروازے کو دیکھتے ہوئے وہ مجھ سے ایک انوکھا سوال کرتا ہے۔

"تو مجھے کیسے جانتا ہے؟"

"میں تمہیں نہیں جانتا۔"

"تو تجھے کیسے علم ہوا کہ اس تلاش کا انچارج افسر کیپٹن بوردیوف ہے؟ تو جانتا ہے، تو نے مجھے کیسی پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے، سؤر؟"

اس کا نام بوردیوف تھا! اور وہ کیپٹن تھا! رات جب ہم اپنے آپ کو حفاظتی افسر ظاہر کر رہے تھے تو میں نے کیپٹن بوردیوف کا نام لیا تھا اور جس محنت کش کو میں نے زندگی بخش دی تھی اس نے احتیاط کے ساتھ یہ خبر آگے پہنچا دی تھی! اور اب کیپٹن پریشانی میں مبتلا تھا اگر تلاش کرنے والے دستے کے کمانڈر کا کسی مفرور قیدی سے رابطہ ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ تین ہفتے گزرنے کے بعد وہ اسے گرفتار نہ کر سکے!

افسران کی ایک اور ٹولی آتی ہے وہ مجھ پر چیختے ہیں اور دیگر امور کے علاوہ بوردیوف کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ محض ایک اتفاقی امر تھا۔

انھوں نے پھر تار سے میرے ہاتھ باندھ دیے۔ میرے جوتوں کے تسمے نکال لیے اور کھلے عام مجھے گاؤں میں لے گئے۔ پہرے داروں کے دستے میں یقیناً بیس کے قریب ٹامی گن والے شامل تھے۔ سارا گاؤں امنڈ پڑا! عورتوں نے سروں کو جنبش دی، بچے میرے پیچھے چیختے ہوئے دوڑنے لگے۔ "ڈاکو اب اسے گولی مارنے کے لیے لے جا رہے ہیں۔"

تار میرے بازوؤں کے گوشت میں پیوست ہو رہا تھا۔ میرے جوتے بار بار پیروں سے نکل کر گر پڑتے تھے لیکن میں نے اپنا سر بلند رکھا اور آنکھیں کھول کر گاؤں والوں کی طرف فاخرانہ انداز میں دیکھا! انھیں یہ محسوس کرنے کا موقع دیتے ہوئے کہ میں کوئی ایماندار آدمی ہوں۔

وہ اسی طرح مجھے ایک مجسمۂ عبرت کے طور پر گھما رہے تھے۔ ان عورتوں اور بچوں کو یاد رکھنے کے لیے ایک سبق (اب سے بیس سال بعد اس کی کہانیاں سنائی جائیں گی۔ گاؤں کے سرے پر انھوں نے مجھے اٹھا کر ایک ٹرک کے پچھلے حصے میں پٹک دیا جس میں نہ کوئی بیٹھنے کی چیز تھی نہ کچھ اور پرانے تختوں کی کھپچیاں نکلی ہوئی تھیں۔ پانچ ٹامی گن والے کیبن کی طرف منہ کر کے بیٹھے تاکہ میں ان کی نگاہ سے اوجھل نہ ہونے پاؤں۔

اب مجھے وہ سارا راستہ پھر پار کرنا ہے جس پر موج مناتے ہوئے ہم فرار ہوئے تھے۔ وہ سارے کلومیٹر جو ہمیں کیمپ سے دور لے گئے تھے۔ موٹر کے پیچدار راستے سے یہ فاصلہ لگ بھگ پانچ سو کلومیٹر پر مشتمل تھا۔ انھوں نے میری کلائیوں کو ہتھکڑیوں سے جکڑ دیا اور انھیں زیادہ سے زیادہ تنگ کر دیا میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور اپنے چہرے کو محفوظ رکھنے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں رہ گیا تھا۔

میں وہاں آدمی کی بجائے کسی چوبی لیٹھے کی مانند دراز تھا۔ لیکن ہم جیسوں کو سزا یونہی دی جاتی ہے۔

اور پھر سڑک بے حد خراب ہو گئی۔ مسلسل بارش ہوتی رہی اور لاری سڑک کے نشیب و فراز میں دھچکے کھاتی رہی، ہر دھکے پر لاری کا نچلا حصہ میرے سر اور چہرے پر خراشیں ڈال دیتا تھا۔ کھپچیاں میری جلد میں گھس جاتی تھیں۔ میرے ہاتھ چہرے کی حفاظت کر ہی نہیں سکتے تھے۔ بلکہ وہ خود ہچکولوں میں بری طرح کٹ گئے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ ہتھکڑیاں میری کلائیوں کو کاٹ کر گوشت میں پیوست ہوئی جاتی تھیں۔ میں نے بغل کی طرف رینگ کر پیپڑ کے سہارے بیٹھنے کی کوشش کی۔ کوئی فائدہ نہیں! سہارے کے لیے پکڑنے کو کوئی چیز نہیں تھی اور پہلے ہی بڑے دھکے میں، میں فرش پر آرہا اور بے بسی کے عالم میں پڑا رہ گیا۔ بعض مرتبہ ہچکولے مجھے اتنی زور سے اچھال دیتے تھے اور میں تختوں پر اتنی زور سے گرتا تھا کہ میں نے محسوس کیا میری آنکھیں باہر نکل پڑیں گی۔ میں اپنی پشت پر نہیں ٹک سکتا تھا کیوں کہ اس طرح کلائیاں کٹ جاتیں۔ میں نے پہلو بدلا۔ کوئی فائدہ نہیں۔ میں اپنے پیٹ کے بل چاروں طرف لڑھکتا ہوں۔ کوئی فائدہ نہیں۔ میں اپنی گردن جھکانے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ سر اٹھا سکوں اور ان ضربوں سے محفوظ رہوں لیکن میری گردن اینٹھ جاتی ہے۔ میرا سر نیچے لڑھک جاتا ہے اور میرا منہ تختوں سے ٹکراتا ہے۔

پانچوں پہرے دار میری اذیتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں بے حسی کے ساتھ یہ سفر ان کی نفسیاتی تربیت کا ایک حصہ بنے گا۔

لیفٹننٹ یاکو فلیف، جو کیبن میں بیٹھا ہے۔ ہر اسٹاپ پر پیچھے دیکھتا ہے اور ہنس ہنس کر کہتا ہے "تو بھاگ نہیں پائے؟" میں رفع حاجت کی اجازت طلب کرتا ہوں اور وہ مضحکہ اڑاتا ہے۔ "کرلے کرلے اپنی پتلون میں ہی کرلے۔ ہم بُرا نہیں مانتے!" میں اس سے ہتھکڑی نکالنے کی التجا کرتا ہوں اور وہ ہنستا ہے: "خیر مناکہ تجھے اس لڑکے نے گرفتار نہیں کیا جو تیرے تار کے نیچے سے نکلنے کے وقت ڈیوٹی پر تھا ورنہ تو اس وقت زندہ نہ ہوتا۔"

پچھلے ہی دن میں خوش ہو رہا تھا کہ اب تک کی زد و کوب اس سے کم تھی جو اس طرح کے حالات میں ہوا کرتی ہے۔ لیکن اپنے ہاتھوں کو کیوں زحمت دی جائے جب لاری کا فرش ہی تمہارا یہ کام کر دے گا، میرے جسم کا ہر حصہ چھل گیا تھا اور میں مجسم زخم بنا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ جیسے آرے سے چیرے جا رہے ہوں، سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور میری جلد کی دھجیاں اڑ گئی تھیں۔

ہم نے تمام دن اور تقریباً ساری رات سفر کیا۔

جب میں نے لاری سے محفوظ رہنے کی کوشش ترک کر دی اور یہ محسوس کرنا بھی بند کر دیا کہ میرا سر لاری کے تختوں سے ٹکرا رہا ہے تو ایک سنتری سے نہ رہا گیا اور اس نے میرے سر کے نیچے ایک بورا رکھ دیا، دوسروں کی نظر بچا کر میری ہتھکڑیاں کچھ ڈھیلی کر دیں اور میرے اوپر جھکتے ہوئے سرگوشی میں بولا: "سب ٹھیک ہے، ہمت نہ ہارو، ہم جلد ہی وہاں پہنچ جائیں گے۔" (اس لڑکے نے کیا سوچ کر یہ سلوک کیا؟ اس کی پرورش و پرداخت کس نے کی تھی، نہ میکسم گورکی نے اور نہ اس کی کمپنی کے

سیاسی افسر نے یہ طے شدہ بات ہے:

ایکی لبسٹز۔ چار جانب اندھیرا" باہر نکل! مجھ میں کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی، اگر ہو سکتا تو وہ خوشی منانے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے۔

وہ مجھے گارڈ ہاؤس میں سے گھسیٹتے ہوئے ڈسپلن بیرک یا چالیس چکی میں لے گئے انھوں نے مجھے تنہائی کی کوٹھڑی میں نہیں ڈالا بلکہ براہِ راست عام سیل میں لے گئے تاکہ جو بھی آزادانہ پرواز کے منصوبے بنا رہا ہو وہ ایک نگاہِ عبرت مجھ پر ڈال سکے۔

سیل میں مجھے ملائمت کے ساتھ اٹھا لیا گیا اور بالائی تختۂ خواب پر رکھ دیا گیا لیکن صبح کا راشن آنے سے قبل وہ مجھے کھانے کے لیے کچھ نہ دے سکے۔

اسی رات کو لیا سائیکل پر اودسک کی طرف جا رہا تھا۔ وہ سواریوں سے بچ کر چل رہا تھا اور جب بھی ہیڈلائٹ نظر آتی وہ اسٹیپی میں چلا جاتا اور وہیں لیٹ جاتا تھا پھر وہ کھیت میں بنے ہوئے کسی تنہا مکان کے مرغی خانے میں گھس گیا اور اس نے اپنی وہ خواہش پوری کی جو فرار کے وقت سے ہی اسے بے قرار کیے ہوئے تھی — تین مرغیوں کی گردن مروڑ کر اس نے انھیں اپنے تھیلے میں ٹھونس لیا۔ دوسری مرغیاں کڑکڑانے لگیں اس لیے وہ جلدی سے بھاگ آیا۔

استقلال کی حس کمی نے ہماری ابتدائی غلطیوں کے بعد ہمیں اتنا ڈھل یقین بنا دیا تھا وہ اب کولیا پر اس بری طرح غالب آگئی کہ نتیجے میں میں گرفتار ہو گیا اور بآسانی پریشان اور متاثر ہو جانے والا کولیا اب بدحواسی کے عالم میں بھاگ رہا تھا اور یہ سوچنے سے قاصر تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ یہ سوچنے کے لائق نہیں رہ گیا تھا کہ اس وقت تک سائیکل اور بندوق کی عدم موجودگی کا علم ہو چکا ہوگا۔ اس لیے ان چیزوں سے اپنی روپوشی میں کوئی مدد نہیں مل سکے گی اور صبح ہوتے ہی انھیں سب سے پہلے پھینک دینا چاہیے کیوں کہ وہ فوری طور پر اپنی جانب توجہ کرتی ہیں اور یہ کہ اسے اس شاہراہ کے ذریعے اودسک نہیں جانا چاہیے۔ بلکہ لمبا چکر کاٹ کر شرت زمین اور پگڈنڈیوں پر ہو کر جانا چاہیے۔ بندوق اور سائیکل کو فوراً فروخت کر دینا چاہیے۔ اس طرح اسے اپنی ضرورت کے مطابق پیسے مل جاتے لیکن وہ آدھے ارتش کے نزدیک جھاڑیوں میں چھپا رہا پھر رات کے آغاز سے پہلے ہی صبر و تحمل کا دامن چھوڑ بیٹھا اور ندی کے کنارے کنارے پگڈنڈی پر چل پڑا۔ امکان غالب تھا کہ مقامی ریڈیو اسٹیشن سے اس کا حلیہ پہلے ہی نشر کیا جا چکا ہو   انھیں ملک کے یوروپی حصے میں اس بارے میں کچھ تکلف بھی ہوتا، سائبیریا میں کیا ڈر تھا۔

وہ سائیکل سے ایک چھوٹے مکان تک پہنچا اور اندر گیا۔ جہاں ایک بوڑھی عورت اور اس کی تیس سالہ بیٹی موجود تھی۔ وہاں ریڈیو بھی تھا اور یہ ایک غیر معمولی اتفاق ہی تھا کہ اس وقت گانا ہو رہا تھا: —

سخالن سے بھاگا ہوا مجرم
تنگ راستے اور چھپی ہوئی پگڈنڈی سے.....

کولیا کا دل پارہ پارہ ہو گیا اور رونے لگا۔ "تم کیوں اتنے ملول ہو؟" عورت نے پوچھا۔ ان کی ہمدردی پاکر
کولیا زار و قطار رونے لگا اور وہ اس کی ڈھارس بندھانے لگیں۔ "میں بالکل تنہا ہوں۔ سب نے مجھے
چھوڑ دیا ہے۔" اس نے بتایا۔ "تو شادی کر لے۔" بوڑھی عورت نے ازراہِ مذاق یا شاید سنجیدگی کے ساتھ
کہا۔ "میری لڑکی بھی اکیلی ہے۔" کولیا نے جو اس وقت سب سے زیادہ پامال حالت میں تھا، ہونے والی
دلہن پر نگاہیں دوڑانی شروع کیں۔ لڑکی نے صورت حال کو عملی موڑ دیا۔ "وودکا کے لیے کچھ رقم ہے؟" کولیا
نے ٹٹول کر اپنے آخری روبل برآمد کیے لیکن وہ ناکافی تھے۔ "کوئی بات نہیں، بقیہ پیسے میں بعد میں دے دوں گا۔"
وہ چلی گئی۔ "اوہ — ہاں" کولیا نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے کچھ تیتر مارے ہیں۔ شادی کی ضیافت کا
بندوبست کرد خوش دامن صاحبہ!" بوڑھی نے انھیں لیتے ہوئے کہا "ارے یہ تو مرغیاں ہیں!" "میں نے شکار
اندھیرے میں کیا تھا، تمیز نہیں کر سکا۔" "ٹھیک ہے لیکن ان کی گردنیں کیوں مروڑ دی ہیں؟"

کولیا نے سگرٹ طلب کی اور بڑھیا نے مخورکا کے لیے اپنی بیٹی کے منگیتر سے قیمت طلب کی۔ کولیا
نے اپنی ٹوپی اتار دی اور بوڑھی عورت بھڑک اٹھی: "تو کوئی سزا یافتہ مجرم معلوم ہوتا ہے۔ تبھی تو تیری حجامت
اس طرح کی بنائی گئی ہے؟ ابھی وقت ہے، بھاگ جا، ورنہ میری بیٹی کی واپسی پر ہم تجھے گرفتار کرا دیں گے۔"

اس تمام عرصے میں کولیا کے ذہن میں یہ خیال چکر اتا رہا کہ ہم نے ارٹش میں آزاد لوگوں میں ترس
کیوں کھایا تھا جب کہ کسی آزاد آدمی نے ہم پر رحم نہیں کیا؟ اس نے ایک ماسکو۔ جیکٹ دیوار سے اتاری
(باہر خنکی تھی اور وہ ایک سوٹ میں ہی ملبوس تھا) اور اسے پہن لیا۔ یہ ٹھیک اس کے سائز کی تھی۔ بوڑھی
چلائی: "میں تجھے ملیشیا سے گرفتار کرا دوں گی!" لیکن کولیا کھڑکی سے دیکھ رہا تھا اور اس نے لڑکی کو سائیکل
پر کسی شخص کے ہمراہ گھر کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ اس نے پہلے ہی اس کی رپورٹ کر دی تھی!

اس کا بدلہ صرف ایک چیز تھی — ماخوم ڈیرا! اس نے بندوق چھینا لی: "چل کونے میں جا کر لیٹ
جا!" اس نے بوڑھی عورت کو حکم دیا اور خود دیوار کے سہارے لگ کر کھڑا ہو گیا، بقیہ دونوں کو دروازے
سے اندر آنے دیا اور پھر انھیں بھی لیٹ جانے کا حکم ملا۔ پھر اس نے آدمی سے کہا — "اور تم مجھے اپنے
جوتے پیش کرو۔ شادی کے تحفے کی شکل میں! اتارو انھیں، ایک ایک کر کے!" بندوق اس پر تنی ہوئی تھی۔ چنانچہ
اس شخص نے جوتے اتار دیے اور کولیا نے انھیں پہن لیا۔ نیز اپنے کیمپ کے گھسے ہوئے جوتے پھینک دیے۔
اور یہ دھمکی دے کر نکل آیا کہ جو اس کے پیچھے باہر آئے گا اسے گولی مار دی جائے گی۔

وہ سائیکل پر سوار ہو گیا لیکن دوسرا آدمی تیزی کے ساتھ اس کے پیچھے اپنی سائیکل پر ہو لیا۔ کولیا اتر
گیا اور اس نے بندوق تان لی: "ٹھہر جا، سائیکل وہیں ڈال دے۔ پرے ہٹ!" اس نے اس آدمی کو دور بھگا دیا
اس کی سائیکل کی تیلیاں توڑ دیں۔ چاقو سے ٹائروں میں شگاف کر دیے اور آگے بڑھ گیا۔

جلد ہی وہ شاہراہ پر آ گیا۔ اومسک سامنے تھا اس لیے وہ سیدھا سائیکل چلاتا گیا۔ عورتیں اپنے
باغیچوں میں آلو کھود رہی تھیں۔ جرکینوں میں ملبوس تین مزدوروں کو پیچھے بٹھائے ہوئے ایک موٹر سائیکل
اس کے پیچھے لگ گئی۔ کچھ دیر تک وہ مدھم رفتار سے چلتی رہی پھر اچانک سیدھے کولیا کی جانب آئی۔ سائیکل
کار سائیکل سے ٹکرائی اور کولیا گر پڑا۔ وہ سب چھلانگ لگا کر اترے اور ڈنڈا ڈک پر چڑھ گئے۔ اور ایک نے

پستول سے اس کے سر پر ضرب لگائی۔
سبزی کے باغیچے سے عورتیں چیخیں: "تم اسے کیوں مار رہے ہو؟ اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"
واقعی اس نے ان کا کیا بگاڑا تھا!
لیکن کسی نے کس کے ساتھ کیا کیا اور آئندہ کون کس کے ساتھ کیا کرے گا! یہ عام آدمی کی سمجھ سے باہر ہے۔ جرگنوں کے پیچھے تینوں آدمی وردیوں میں تھے (عملی دستہ شہر کی شاہراہ پر چوبیس گھنٹے نگرانی میں تھا) عورتوں کو جواب مل گیا: "یہ قاتل ہے"۔ یہ کہہ دینا سب سے زیادہ آسان تھا۔ چنانچہ عورتیں قانون پر اعتماد کر کے دوبارہ آلو کھودنے لگیں!

عملی دستے نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ تلاش مفرور سے دریافت کرنا کہ اس کے پاس کچھ تو نہیں ہے کولیا نے سچ سچ بتا دیا کہ اس کے پاس پیسہ نہیں ہے۔ اس کی جامہ تلاشی لی گئی تو نئی ماسکو جیکٹ کی جیب سے انھیں پچاس روبل ملے۔ انھوں نے یہ رقم ضبط کر لی اور پھر اسے ایک ہوٹل میں لے گئے اور اس رقم کا بیشتر حصہ کھانے اور پینے میں صرف کر دیا۔ لیکن انھوں نے اس میں کولیا کو بھی شریک رکھا۔

اس طرح ہم بہت دنوں کے لیے جیل میں بند ہو گئے۔ اگلے سال کی جولائی تک ہم پر مقدمہ نہیں چلایا گیا نو ماہ کی طویل مدت تک ہم ڈسپلن بیرک میں سڑتے رہے۔ بس کبھی کبھار تحقیق و تفتیش کے لیے ہم کو گھسیٹ کر باہر لے جاتے تھے۔ یہ تفتیش اعلیٰ افسر جیل پیچوفسکی اور تحفظاتی لفٹننٹ لی وٹینسن کرتے تھے۔ تفتیش کنندہ جاننا چاہتے تھے کہ ہم کو کن کن قیدیوں سے مدد ملی تھی اور شہری ملازموں میں سے کن لوگوں نے ہمارے فرار کو ممکن بنانے کے لیے تھوڑی دیر کو بجلی فیل کر کے ہمارے ساتھ سازش میں حصہ لیا تھا (بے شک ہم نے نہیں بتایا کہ ہمارا منصوبہ قطعی مختلف تھا اور یہ کہ بجلی کا فیل ہونا ہمارے لیے مضر ثابت ہوا تھا) اور ملک میں ہمارے ملنے کا قیام کون سا تھا؟ بالآخر ہم کون سی سرحد پار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے؟ (انھیں اس بات پر یقین نہ آیا کہ لوگ اپنی مادرِ وطن میں مقیم رہنے کے آرزومند ہو سکتے ہیں) ہم بھاگ کر ماسکو کی مرکزی کمیٹی کو غیر قانونی گرفتاریوں سے آگاہ کرنے جا رہے تھے بس اتنی ہی بات تھی: انھوں نے ہماری اس بات پر بھی یقین نہیں کیا۔

ہم سے کوئی دلچسپ بات معلوم نہ کر سکے تو انھوں نے عام مفرورین کا لیبل ہم پر بھی چسپاں کر دیا۔ دفعہ ۵۸/۱۴ (انقلاب دشمن تخریب) دفعہ ۵۹/۳ (راہزنی) "چار بٹا چھ" زمان "ایک" "دو" (گروہ کی شکل میں ڈاکہ زنی) وہی احکام، دفعہ "دو، دو" (زندگی کو خطرہ پیدا کرنے والے تشدد کے ساتھ مسلح لوٹ مار) دفعہ ۱۸۲ (کسی آتشگیر ہتھیار کے کوئی خطرناک ہتھیار بنانا یا لے کر چلنا)

لیکن الزامات کی اس حوصلہ شکن کڑی سے ہمیں اس وقت کی ہتھکڑیوں سے زیادہ تکلیف دہ خطرات کا احساس نہ ہوا تھا۔ عدالتوں کا نظام تعزیر عرصے سے تمام معقول حدود سے تجاوز کرتا چلا آ رہا تھا اور ان الزامات کے تحت بھی عدلیہ ان پچیس برسوں کی سزا سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتی تھی جو کسی بھی شخص کو خدا کی عبادت کرنے پر دی جاتی تھی اور جو ہم فرار کی کوشش سے پہلے ہی بھگت رہے تھے۔ واحد فرق

یہ تھا کہ اب جو حاضری لی جائے گی اس میں ہمیں سزا کا خاتمہ ـــــ ۱۹۷۵ء کہنا ہوگا "۱۹۷۲ء" نہیں!

اس فرق کا احساس ہمیں ۱۹۵۱ء میں کیا ہو سکتا تھا!

صرف ایک مرتبہ تفتیش نے خطرناک موڑ لیا۔ جب انھوں نے ہمیں بتایا کہ تم پر اقتصادی تخریب کار کی حیثیت سے مقدمہ چلایا جائے گا۔ یہ بے ضرر سا لفظ گھسے پٹے "تخریب کار" "ڈاکو" "راہزن" "چور" جیسے الفاظ سے زیادہ خطرناک تھا۔ یہ لفظ سزائے موت کے امکانات کا باب وا کرتا تھا جو ایک سال پہلے ہی شروع کی گئی تھی۔

ہم تخریب کار تھے کیونکہ ہم نے عوامی حکومت کے اقتصادی نظام میں بدنظمی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ جیسا کہ تفتیش کنندگان نے واضح کیا ہمیں دوبارہ گرفتار کرنے میں ایک لاکھ دو ہزار روبل خرچ آیا تھا۔ کام کے کچھ مقامات کئی دنوں تک بند پڑے رہے تھے (قیدیوں کو جائے کار تک چلا کر نہیں لے جاتے تھے کیوں کہ ان کے پہرے داروں کو مفرورین کی تلاش کے کام پر مامور کر دیا گیا تھا) تیئس [۲۳] گاڑیاں فوجیوں کے ساتھ شب و روز اسٹیپی پر چکر لگاتی رہی تھیں اور انھوں نے پٹرول کا سالانہ کوٹہ تین ہفتوں میں ختم کر دیا تھا۔ عملی دستے تمام قرب و جوار کے شہروں اور بستیوں میں روانہ کیے گئے تھے۔ ایک ملک گیر تلاش کے احکامات جاری ہوئے تھے اور چار سو تصویریں میری نیز چار سو کوبیا کی پورے ملک میں تقسیم کی گئی تھیں۔

ہم نے یہ فہرست فخر کے ساتھ سماعت فرمائی......

ــــــ ؞ ــــــ

خیر انھوں نے ہم دونوں کو پچیس پچیس سال کی سزا دی۔

جب قاری پڑھنے کے لیے یہ کتاب اٹھائیں گے۔ اس وقت تک ہماری سزائیں شاید مکمل نہیں ہوئی ہوں گی۔؎

تھیوکے فرار کی کوشش کا ایک اور نتیجہ یہ ہوا کہ شعبۂ تعلیم و ثقافت میں کنسرٹ پارٹی کو (راشکنی اسکیم کے باعث) ایک سال کے لیے معطل کر دیا گیا۔ کیونکہ تہذیب و ثقافت نفیس چیزیں ہیں لیکن انھیں غلامی کے حق میں کام کرنا چاہیے، آزادی کے لیے نہیں!

آٹھواں باب

کیمپ سے فرار: جرأت اور طریق کار

اصلاحی مشقت کیمپوں سے فرار کی کوششوں کو بشرطیکہ وہ ویانا جیسے کسی مقام یا بیرنگ جیل سلسلے کو پار کرنے کے لیے نہ ہوں، گلاگ کے حکمراں اور گلاگ کے قوانین بے بسی کے عالم میں دیکھتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ وہ انہیں سرتا فطری، ایسی فضول خرچی کا اظہار جو کسی بھی بہت زیادہ وسیع اقتصادی لائحۂ عمل میں ناگزیر ہوتی ہے، تصور کرتے تھے۔ اس قسم کے واقعات جیسے کہ علالت یا گرسنگی کی وجہ سے مویشیوں کا مرجانا، کچھ شہتیروں کا تیرنے کی جگہ غرق ہو جانا: دیواریں جہاں مکمل اینٹ کی جگہ آدھی اینٹ رکھی گئی ہو، خلا رہ جانا۔

خصوصی کیمپوں میں یہ بات کچھ مختلف تھی۔ "بابائے عوام" کی مخصوص خواہش کے مطابق ان کیمپوں میں تحفظ کا نظام بے حد مضبوط تھا اور طاقتور اسلحہ، جدید ترین موٹروں سے لیس بڑی افواج کی سطح پر (یہ وہ دستے ہیں جو وسیع سے وسیع تر غیر مسلح ہونے کے معاہدے کے تحت بھی کبھی اسلحہ سے دستبردار نہ ہوں گے) فراہم کیے گئے تھے۔ ان کیمپوں میں وہ بالائی طبقے کے ساتھی" قسم کے قیدی* نہیں رکھتے تھے جن کے بھاگ جانے سے کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوتا یہاں اب یہ صفائی پیش کرنا ممکن نہیں تھا کہ مسلح افراد کی تعداد ضرورت سے کم تھی یا اُن کے اسلحہ قدیم طرز کے تھے۔ اُن کے قیام کے وقت ہی خصوصی کیمپوں کے لیے جاری کردہ احکامات کے ذریعے طے کر دیا گیا تھا کہ ان سے فرار ہونا ممکن نہیں ہوگا کیونکہ اگر وہاں سے ایک قیدی بھی بھاگ نکلا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ایک اہم جاسوس سرحد پار کر گیا اور کیمپ کی انتظامیہ اور کانوائے (نگراں) فوجیوں کے کمانڈنگ افسران کے سیاسی ریکارڈ پر دھبہ آتا تھا۔

لیکن اُسی زمانے سے جب دفعہ ۵۸ والے اشخاص وہاں پہنچنے شروع ہوئے، وہ پہلے کی دس سال سزا پائے ہوئے لوگ نہ تھے، بلکہ رُبع صدی والے قیدی تھے۔ قانون زیادہ سے زیادہ اتنی ہی مُدت کی سزا کی اجازت دیتا تھا۔ یہ بے سوچے سمجھے سختی میں انتہائی اضافہ کر دینے کے ساتھ ساتھ ایک اور دشواری یہ تھی: جس طرح قتل کرنے والے نئے قتل کرنے سے

خائف نہیں ہوتے (ہر بار اُس کی دس سال کی سزا میں خفیف سا اضافہ ہو جاتا ہے) اسی طرح سیاسی قیدیوں کو بھی فرار ہوتے وقت تعزیری قوانین کا خوف نہیں رہ گیا تھا۔

علاوہ ازیں ان کیمپوں میں بھیڑوں کی طرح بھرے ہوئے لوگ اس قسم کے نہیں تھے۔ جو عہدیداران کے بے عنان رویے کو "واحد اور خالصتاً صحیح رویے" کا روشنی میں معقول قرار دے سکتے ہوں بلکہ فوجی اور جی دار لڑکے ہیں جو تمام عرصۂ جنگ میں اپنے پیٹ کے بل رینگے تھے، جن کی انگلیاں دستی بم پھینک پھینک کر تاحال مُڑی ہوئی تھیں۔ جارجی مینڈ، آئیوان بوربو یوف واسیلی بردفن، ان کے رفقائے کار اور اُن کی مانند دیگر کیمپوں کے بہت سے لوگ غیر مسلح حالت میں بھی نئی تربیت یافتہ فوج کے پہریداروں کے موٹرنشین پیادہ فوجیوں کی تڑاک بھڑک سے متصادم ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

اور حالانکہ اسپیشل کیمپوں سے فرار ہونے والوں کی تعداد اصلاحی مشقت کیمپوں کے مفرورین سے کم تھی (اور پھر خصوصی کیمپ بہت زمانے تک تو وجود ہی میں نہ تھے!) لیکن وہ زیادہ خونخوار، زیادہ مستقل مزاج، زیادہ اذیت رسیدہ اور اسی وجہ سے زیادہ پُروقار لوگ تھے۔

اُن کے بارے میں بیان کردہ داستانوں سے ہمیں اس نکتے پر اپنے خیالات کو واضح کرنے میں مدد مل سکتی ہے کہ کیا ہمارے عوام واقعتاً اتنے عرصے تک مصائب جھیلنے والے تھے۔ اُس زمانے میں کیا عوام اتنے ہی بزدل تھے۔

ان میں سے چند بیان پیش کی جاتی ہیں۔

ٹینو کی کوشش سے ایک سال پیشتر فرار کی ایک کوشش کی گئی تھی اور اسی کے طرز پر فرار کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ ستمبر ۱۹۴۹ء میں دو قیدی اشٹیپلاگ (روڈنک، وزیرِ کازگان) کے پہلے ڈویژن سے فرار ہوئے۔ گریگوری کوڈلا جو ایک مضبوط، سلیم الطبع اور متوازن ذہن کا معمر آدمی تھا اور یوکرینی تھا (لیکن جب اُس کو غصہ آجائے تو اس کا مزاج زپوروزین قازق کی مانند بیحد چڑچڑا ہو جاتا تھا اور بہت عادی مجرم بھی اُس سے خوفزدہ رہتے تھے) اور آئیوان دشیچکن، جو ایک پینیس ۲۵ سالہ پُرسکون بائیلوروسی تھا۔ جس پٹ (کان سے چھتے) میں وہ کام کرتے تھے وہاں انہیں کسی پُرانے معدنی جائے کار میں ایک پراسپکٹنگ شیفٹ ہاتھ لگ گیا جس کے بالائی سرے پر ایک گریٹنگ لگا تھا۔ جب وہ رات کی شفٹ میں تھا اس وقت انہوں نے آہستہ آہستہ اس گریٹنگ کو ڈھیلا کر لیا اور ساتھ ہی ساتھ وہ شیفٹ کے اندر روٹی کے ٹکڑے، چاقو اور شعبۂ صحت سے سرقہ کی ہوئی گرم پانی کی ایک بوتل رکھ آئے۔ فرار کی کوشش والی رات کو ایک بار نیچے پہنچ جانے پر دونوں نے علیحدہ علیحدہ فورمین کو مطلع کیا کہ آج اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، کام نہیں کر سکتے کچھ آرام کریں گے۔ رات کے وقت وہاں زمین کے نیچے کوئی وارڈر نہیں تھا، فورمین ہی حکومت کا واحد نمائندہ تھا اور اُسے دھمکانے کا کام ذرا سوچ سمجھ کر کرنا پڑتا تھا ورنہ ان کا سر اندر ہی توڑ دیا جاتا۔ مفرورین

نے گرم پانی کی بوتل بھرلی، اپنا کھانے کا سامان لیا اور پراسپکٹنگ شیمنٹ کے اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے زور لگا کر گرٹینگ کو الگ کر دیا اور رینگ کر باہر نکل آئے۔ نکلنے کی جگہ نگرانی کی برجیوں کے پاس تھی لیکن کیمپ کی سرحد سے دُور تھی۔ انہیں فرار ہوتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔

وزیز کازگان سے وہ ریگستان کو پار کرتے ہوئے شمال مغرب کی طرف نکل گئے دن کے وقت وہ لیٹ جاتے تھے اور راتوں رات سفر کرتے تھے۔ انہیں ایک بار بھی پانی دستیاب نہیں ہوا۔ اور ایک ہفتہ کے بعد دشیچکن میں کھڑے ہونے کی سکت بھی نہ رہ گئی کوڈلا نے اُسے اس توقع سے پیروں پر کھڑا کر دیا کہ شاید آگے پہاڑیوں پر پانی مل جائے وہ اتنی دور تک اپنے آپ کو گھسیٹ لے گئے لیکن گڈھوں میں پانی نہیں تھا، صرف کیچڑ تھی۔ اس وقت دشیچکن نے کہا: "میں اب کسی طور آگے نہیں جا سکتا تم گلا کاٹ کر خون پی لو۔"

اور اے اخلاقیات کے ٹھیکیدارو! کیا کام کرنا مناسب تھا؟ کوڈلا بھی اب نظر جما کر نہیں دیکھ پاتا تھا۔ دشیچکن مرنے والا تھا، کوڈلا بھی کیوں اپنی جان ضائع کرے؟ لیکن اگر تھوڑی دیر بعد ہی پانی مل جاتا تو کوڈلا باقیماندہ زندگی دشیچکن کے بارے میں سوچ کر کس طرح زندہ رہ پاتا۔؟ کوڈلا نے طے کیا کہ میں کچھ اور آگے جاؤں گا اور اگر صبح بغیر پانی کے واپس آیا تو اس کی تکلیف دہ زندگی سے نجات دے دوں گا اور ہم دونوں کو مرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ وہ لغزیدہ قدموں کے ساتھ ایک ٹیلے پر چڑھ گیا وہاں اُسے ایک دراڑ نظر آئی اور ٹھیک اُسی طرح جیسے سب سے زیادہ سنسنی خیز ناولوں میں ہوتا ہے، وہاں پانی موجود تھا۔ کوڈلا سرک سرک کر منہ کے بل اس پر لیٹ گیا اور پانی پیتا رہا (صبح جا کر اُس نے پانی میں بلبلگی (ڈیٹ پول) اور آبی پودے دیکھے) وہ گرم پانی کی پوری بوتل لبریز کر کے دشیچکن کے پاس گیا "میں تمہارے لیے پانی لایا ہوں، ہاں پانی!" دشیچکن کو یقین نہ آتا تھا، اُس نے پانی پیا (گھنٹوں سے وہ تصور میں پانی پی رہا تھا) پھر وہ گھسٹتے ہوئے دراڑ پر گئے اور وہاں پانی پیتے ہوئے پڑے رہے۔

جب وہ پانی پی چکے تو بھوک کا سلسلہ شروع ہوا لیکن اگلی رات وہ ایک ٹیلے پر چڑھ گئے اور ایک فردوس نما وادی میں اُتر گئے جہاں دریا، گھاس، گھوڑے اور زندگی تھی۔ اندھیرا ہونے پر کوڈلا رینگ کر گھوڑوں تک پہنچا اور اُن میں سے ایک کو مار ڈالا۔ انہوں نے براہِ راست زخم کے ذریعے اس کا خون چوسا (امن کے علمبردارو! اُسی سال تم ویانا یا اسٹاک ہوم میں زور شور کے ساتھ سیمنار کر رہے تھے اور اسٹرا سے کاک ٹیل پی رہے تھے کیا تمہارے دل میں یہ بات آئی کہ نسلم گو تخونوت اور صحافی اہرنبرگ کے ہموطن مُردہ گھوڑوں کا خون چوس رہے تھے؟ کیا انہوں نے اپنی تقریروں میں تمہیں یہ بات سمجھائی کہ امن، سوویٹ طرز کے امن کا مفہوم یہ ہے!)

اُنہوں نے آگ پر گھوڑے کا گوشت بھون لیا اور کئی دن تک اُسے کھا کر اپنا سفر جاری رکھا وہ تیغانی ندی پر آباد امانگیلڈی سے کترا کر نکل گئے لیکن شاہراہ پر ایک لاری میں سفر کرتے

ہوئے قازقوں نے انہیں کاغذات دکھلانے کو کہا اور انہیں ملیشیاؤں کو سونپ دینے کی دھمکی دی۔

آگے چل کر انہیں کئی نالے اور تالاب ملے۔ کوڈلا نے ایک مینڈھا بھی پکڑ کر ذبح کرلیا۔ اب تک وہ بھاگتے ہوئے ایک ماہ گزار چکے تھے! اکتوبر خاتمے پر تھا؛ سردی پڑنے لگی تھی جس پہلے جنگل میں وہ پہنچے اس میں انہیں ایک بنان (رگھدائی کا مقام) ملا اور انہوں نے اس میں مکان بنا لیا۔ وہ لوگ یہ خوشنما مقام چھوڑنے کو آمادہ نہ تھے وہ ایسی آب وہوا میں آباد ہو گئے تھے کہ اپنے وطن کو جانے کی خواہش نہ ہوتی تھی یا کہیں اور یہاں سے زیادہ پُرسکون زندگی ملنے کی توقع نہ تھی۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اُن کے فرار کی کوئی منزل نہیں تھی اور اُسے ناکام ہونا ہی چاہیئے تھا۔

رات کو وہ کسی قریبی گاؤں پر دھاوا مارتے، کوئی برتن چرا لاتے یا آٹے، نمک، کلہاڑی کراکری کی کوٹھریوں میں گھس جاتے (یہ ناگزیر ہے۔ پارٹیزن کی طرح مفرور بھی جلد ہی چور بن جاتا ہے جو اپنے قرب وجوار کے پُرامن شہریوں کے یہاں سے سامان اُٹھا لاتا ہے) ایک مرتبہ وہ گاؤں سے ایک گائے لے آئے اور اُسے جنگل میں ذبح کر ڈالا۔ لیکن پھر پہلی برفباری ہوئی اور اپنے پاؤں کے نشانات نہ چھوڑنے کی غرض سے انہیں اپنے بنان میں بند ہو جانا پڑا۔ کوڈلا صرف ایک بار لکڑیاں لینے کے لیے گیا تھا اور فارسٹر نے اُس پر بلا تامل گولی چلا دی تھی ـــ "تو تم ہو وہ چور! کیوں ـ؟ تمہیں لوگوں نے گائے چرائی تھی؟" یقیناً غار کے چاروں طرف خون کے نشانات پائے گئے تھے انہیں گاؤں میں لے جا کر حوالات میں بند کر دیا گیا۔ لوگ چیخے کہ انہیں فوراً گولی مار دی جائے اور اُن پر کوئی ترس نہ کھایا جائے لیکن ضلع کے صدر مقام سے ایک تفتیش کنندہ آپہنچا۔ جس کے پاس ملک گیر تلاش میں مدد لینے کے لیے مشتہر کردہ ایک تصویر تھی اور اس نے گاؤں والوں سے گفتگو کی "شاباش!" اُس نے کہا "تم نے جن لوگوں کو پکڑا ہے وہ معمولی چور نہیں ہیں بلکہ خطرناک سیاسی مجرم ہیں!"

اچانک گاؤں والوں کا رویّہ بالکل بدل گیا۔ گائے کا مالک، جس کے بارے میں بعد میں پتہ چلا کہ چیچین تھا، قیدیوں کے لیے روٹی، گوشت اور پیسے بھی لایا جو اُس نے لوگوں سے بطور چندہ جمع کیے تھے: "کتنے افسوس کی بات ہے" اس نے کہا "تم لوگ سیدھے میرے پاس چلے آتے اور مجھے بتاتے کہ کیا تم کون ہو تو میں تمہیں وہ تمام چیزیں فراہم کرتا جن کی تمہیں ضرورت تھی!" (اس بیان پر شبہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، چیچین لوگ ہوتے ہی اس قسم کے ہیں) کوڈلا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اتنے سالوں کی وحشیانہ زندگی کے بعد وہ ہمدردی برداشت نہ کر سکا۔

قیدیوں کو کوستنائی بھیج دیا گیا اور ریلوے جیل میں بند رکھا گیا جہاں اُنہیں قید کرنے والے نہ صرف یہ کہ چیچینوں کی سوغاتیں لے جاتے تھے (اور انہیں کھا جاتے تھے) بلکہ اُنہیں

کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں دیتے تھے (کیا کورنیچک نے امن کانفرنس میں آپ کو یہ بات نہیں بتائی؟) کوسٹنائی کے باہر ٹرین پر سفر کرنے سے قبل جب اُن کے ہاتھ پشت کی طرف ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے، انہیں دیر تک اسی طرح رکھا گیا تاکہ لوگ عبرت پکڑیں۔۔۔۔

اگر ماسکو، لینن گراڈ، کیف یا کسی دوسرے خوشحال شہر کے ریلوے اسٹیشن پر یہ واقعہ پیش آتا۔ تو ہر شخص اس سفید سر والے بوڑھے کے قریب سے، جو دوزانو تھا اور جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور جو ایمپن کی کسی تصویر سے مشابہہ نظر آتا تھا، بغیر اس پر توجہ مرکوز کیے یا رُکے بغیر گزر گیا ہوتا۔ ناشروں، ترقی پسند فلم پروڈیوسروں، انسانیت نواز استادوں، فوجی افسروں، ٹریڈ یونین اور پارٹی کے عہدیداروں کا نام لینے کی تو ضرورت ہی نہیں۔ اور تمام معمولی غیر ممتاز شہریوں نے بھی، جو کسی لائقِ ذکر منصب پر نہ تھے، چشم پوشی کر کے نکل جانے کی کوشش کی ہوتی اس خوف سے کہ کہیں پہریدار ان کا نام نہ پوچھ بیٹھے اور اسے نوٹ نہ کر لے۔ کیونکہ اگر آپ کے پاس ماسکو میں قیام کا پرمٹ ہے، جہاں عمدہ دوکانیں ہیں، تو وہاں آپ کو خطرہ مول نہیں لینا چاہیئے۔۔۔۔ (۱۹۴۹ء میں یہ بات بآسانی سمجھ میں آتی تھی لیکن کیا ۱۹۶۵ء میں صورتحال مختلف ہے؟ کیا ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سے کوئی ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے گھٹنوں کے بل پڑے ہوئے اس بوڑھے کے بارے میں پہریدار سے کچھ کہنے کے لیے رُک سکتا تھا؟)

لیکن کوسٹنائی کے لوگوں کا کچھ نہیں بگڑ سکتا تھا۔ وہ یا تو سب کے سب "حلفیہ دشمن" تھے ورنہ ایسے لوگ تھے جن کے ناموں پر سیاہ نشان لگا دیے گئے تھے یا بس جلاوطن تھے انہوں نے قیدیوں کے چہار جانب ہجوم کی شکل اختیار کر لی اور اُن کی طرف مخورکا، سگرٹ اور روٹیاں اُچھالنے لگے۔ کوڈلا کی کلائیاں پشت پر بندھی ہوئی تھیں اس لیے وہ روٹی کا ایک ٹکڑا اپنے دانتوں سے پکڑنے کے لیے جھکا لیکن پہرے دار نے اُسے ٹکڑے کو ٹھوکر مار کر دور ہٹا دیا۔ کوڈلا نے لڑھک کر اُسے اٹھانے کے لیے پھر منہ جھکایا تو پہریدار نے دوسری ٹھوکر مار کر ٹکڑا اور دور پھینک دیا (اے ترقی پسند فلم ڈائرکٹرو! جب تم حکومت کے محبوب "اہم شہری" کے شاٹ لو تو شاید اس منظر اور اس بوڑھے شخص کو یاد رکھو گے؟) لوگ آگے بڑھنے لگے اور شور مچنے لگا: "انہیں چھوڑ دو! انہیں چھوڑ دو!" ایک ملیشیائی دستہ پہنچ گیا۔ پولیس والوں کے پاس طاقت تھی، انہوں نے لوگوں کو تتر بتر کر دیا۔

ٹرین آئی اور قیدیوں کو کینگر جیل کے لیے اس پر لاد دیا گیا۔

قازقستان میں فرار کی کوشش کی تمام داستانیں اُسی طرح ہموار و یکساں ہیں جیسی کہ خود اسٹیپی۔ لیکن شاید اس یکسانی کی وجہ سے ایک بہت اہم بات کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

ایک کان سے فرار کی ایک اور کوشش کی گئی تھی۔ یہ بھی دوریزکازگان کا ہی واقعہ ہے لیکن ۱۹۵۵ء میں ہوا تھا۔ تین آدمی رات میں ایک پرانے شیفٹ پر چڑھ کر زمین پر پہنچ گئے اور تین راتوں تک سفر کرتے رہے۔ پیاس کی شدت سے اُن کی حالت خستہ ہو گئی۔ جب انہیں

کچھ یُرٹ نظر آئے تو ان میں سے ایک نے تجویز پیش کی کہ دو آدمی وہاں جاکر قازقوں سے پانی طلب کریں۔ لیکن اسٹیپن نے وہاں جانے سے انکار کر دیا اور ایک پہاڑی سے اُنہیں دیکھتا رہا۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کے ہمراہی ایک یُرٹ میں داخل ہوئے پھر بھاگتے ہوئے باہر نکلے: کچھ قازق اُن کے تعاقب میں تھے جنہوں نے جلد ہی انہیں پکڑ لیا۔ اسٹیپن، جو پستہ قامت چھوٹا سا آدمی تھا، وہاں سے کھسک گیا اور نشیبی علاقوں میں بھاگتا ہوا تنہا سفر کرتا رہا۔ اُس کے قبضے میں واحد ہتھیار ایک چاقو تھا۔ اُس نے شمال مغرب کی جانب بڑھنے کی کوشش کی لیکن لوگوں سے محفوظ رہنے کے لیے متواتر راستہ تبدیل کرتا رہا۔ وہ جنگلی جانوروں کا شائق تھا۔ اُس نے گلہریوں اور زیربوا (چوہا کی ایک قسم) کا شکار کرنے کے لیے ایک چھڑی تراش لی اور وہ انہیں اس وقت مارنے کی کوشش کرتا جب وہ اپنے بِلوں کے کنارے پچھلی ٹانگوں پر بیٹھ کر ٹرٹراتے تھے اور اس ترکیب میں کچھ کا شکار کر لیتا تھا اگر وہ اُن کا خون پی سکتا تو پی لیتا تھا اور اُن کا گوشت اسٹیپی کی خشک لکڑیاں جلا کر بھُون لیتا تھا۔

آگ ہی اُس کی گرفتاری کا باعث ہوئی۔ ایک دن اسٹیپن نے دیکھا کہ ایک قازق اسپ سوار ایک بڑا سا سُرخ فر کا ٹوپ لگائے سرپٹ اُس کی جانب آ رہا ہے اور اُسے بمشکل اتنا وقت مل سکا کہ وہ اپنا شسلک کسی پُرخار جھاڑی کے نیچے چھپائے تاکہ قازق یہ نہ دیکھ سکے کہ وہ کتنا عمدہ کھانا کھا رہا ہے۔ قازق نے اُس کے پاس پہنچ کر دریافت کیا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ اسٹیپن نے جواب دیا کہ وہ دوریزدی کی مینگنیز کی کان میں کام کرتا ہے (وہاں آزاد کارکن اور قیدی دونوں کام کرتے تھے) اور اپنی اہلیہ سے ملنے کے لیے ڈیڑھ سو کلومیٹر کی دُوری پر واقع ایک سرکاری فارم پر جا رہا ہے: قازق نے فارم کا نام دریافت کیا، اسٹیپن نے سب سے زیادہ مناسب نظر آنے والا نام بتایا" اسٹالن سرکاری فارم"!

اے فرزندِ اسٹیپی! تم اپنے گھوڑے پر چھلانگیں لگاتے ہوئے اپنی راہ کیوں نہیں ہو لیے اُس غریب نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ لیکن نہیں۔ قازق نے دھمکاتے ہوئے کہا: " تمہیں جیل جانا ہو گا! تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا"۔ اسٹیپن نے اُسے کوستے ہوئے ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ قازق اس کے ہمراہ گھوڑے پر چل رہا تھا اور اُسے چپ چاپ چلے آنے کی ہدایت دے رہا تھا۔ بعد ازاں اُس نے کچھ آگے بڑھ کر اپنے لوگوں کو ہاتھ ہلا کر بلایا لیکن اسٹیپی پر کوئی نہیں تھا۔ اے اسٹیپی کے فرزند! تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ تمہیں معلوم تھا کہ ابھی اُسے سیکڑوں کلومیٹر کا فاصلہ اسٹیپی پر طے کرنا تھا اور اُس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا سوائے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ایک چھڑی کے۔ اور خوراک بھی نہیں تھی، اس لیے بہر صورت اُسے لقمۂ اجل بننا تھا۔ کیا تمہیں ایک کلوگرام چائے کی اتنی شدید حاجت تھی۔

اس ہفتے سفر کے دوران جنگلی جانوروں سے مقابلہ کرتے ہوئے اسٹیپن کو ریگستان کی سرسراہٹ اور سنسناہٹ کی آوازیں سننے کی مشق ہو گئی تھی اچانک اُس کے کانوں میں ہوا

کے ساتھ ایک سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ہر چند کہ وہ نئے خطرے کی طرف سے چوکنا نہیں تھا لیکن اُسے جانور کی مانند پیٹ کی گہرائی میں اس کا احساس ہو گیا تھا چنانچہ وہ ایک طرف کو کُود گیا اور اس طرح بچ گیا! اُس نے محسوس کیا کہ قازق نے اُسے ستو (مویشی پکڑنے کی) رسّی میں پھنسانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کمند سے بچ کر نکل گیا تھا۔

دو پایہ جانوروں کا شکار کرنا۔ محض ایک کلو گرام چائے کے لیے ایک آدمی کی زندگی! قازق چیختا رہا اور اپنی کمند گھماتا رہا اور اسٹیپن آگے چلتا گیا لیکن محتاط ہو کر۔ اپنے دشمن کو اس نے نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ قازق نزدیک آ گیا اور اُس نے اپنی رسّی کو لپیٹا اور اُس کی جانب اُچھالا، جیسے ہی وہ پھینکنے کے لیے جُھکا اسٹیپن نے اس پر جھپٹ کر اپنی چھڑی سے سر پر وار کیا اور اُسے گھوڑے سے گرا دیا! اُس میں اتنی زیادہ قوت تو نہیں تھی لیکن یہ اُس کی زندگی اور موت کا سوال تھا) "یہ تمہارا انعام ہے دوست!" جس طرح بے رحمی کے ساتھ ایک وحشی جانور دوسرے کو زخمی کرتا ہے، اُسی طرح اسٹیپن نے قازق کو پیٹنا شروع کیا لیکن جب اُس کا خون بہنے لگا تو وہ رُک گیا۔ رسّی اور چابک دونوں قازق سے چھین کر وہ گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ فتراک میں اشیائے خورد نی بھی موجود تھیں۔

اسٹیپن مزید کئی دن، تقریباً دو ہفتوں تک بھاگتا رہا لیکن وہ جہاں بھی گیا، اپنے سب سے بڑے دشمن، عوام سے، اپنے ہموطنوں کی نگاہوں سے بچنے کی پوری پوری کوشش کرتا رہا۔ اُس نے گھوڑا چھوڑ دیا اور کچھ ندیوں کو تیر کر پار کرنے کی کوشش کی (حالانکہ وہ تیر نہیں سکا) اُس نے شکار کیا اور اندھیرے میں کسی بڑے جانور، غالباً ریچھ سے بچ کر بھاگا پھر ایک دن بھوک پیاس اور پناہ گاہ کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہو گئی اور گرم گرم کھانے کی خواہش پر وہ قابو نہ کر سکا اس لیے اُس نے ایک سنسان یُرٹ میں جا کر کچھ مانگنے کا ارادہ کیا یُرٹ کے سامنے ایک چھوٹا سا باڑا تھا جس کے گرد کچی اینٹوں کی دیوار تھی، جب وہ اس کے نزدیک پہنچا تو اُسے کچھ فاصلے پر زمین سے آراستہ دو گھوڑے کھڑے ہوئے دکھائی دیے اور تمغوں سے سجا ہوا ٹیونک اور برجیس زیب تن کیے ایک قازق اپنی جانب آتا نظر آیا۔ بھاگنے کا موقع اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور اُس نے سوچا کہ میرا کھیل ختم ہو گیا۔ قازق ہوا خوری کی غرض سے باہر آیا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے اسٹیپن کی خستہ حالی پر کوئی خاص توجہ نہ دی تھی "اندر آؤ، اندر آؤ۔ تم ہمارے مہمان ہو!" یُرٹ کے اندر ویسا ہی ایک اور نوجوان قازق تمغے لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ اور ایک ضعیف آدمی۔ دونوں بھائیوں نے مورچے پر جنگ کی تھی اور اب وہ دونوں الماتا کے ممتاز افراد میں سے تھے۔ اُنہوں نے اک کوخوز سے گھوڑے مانگ لیے تھے تاکہ تیزی کے ساتھ اپنے والد کے یُرٹ میں جا کر اُس کی مزاج پُرسی کر آئیں یہ دونوں نوجوان جنگ کا ذائقہ چکھ چکے تھے اور اسی چیز نے انہیں انسانیت پیدا کر دی تھی علاوہ ازیں وہ مخمور تھے اور شراب کی پیدا کردہ خوش مزاجی ان میں دوڑ رہی تھی (وہ خوش مزاجی جیسے عظیم

اسٹالن اپنی بھرپور کوشش کے بعد بھی بیخ و بنیاد سے اُکھاڑ پھینکنے میں ناکام رہا) انہیں مسرت تھی کہ ایک اور مہمان دعوت میں شریک ہو گیا تھا حالانکہ وہ اور سک جہاں اُس کی بیوی کو جلد ہی بچہ ہونے والا تھا، کی طرف جانے والا ایک معمولی کان مزدور تھا۔ انہوں نے اُس کے کاغذات دیکھنے کی بات نہیں کی اور اُسے کھانے، پینے اور سونے کی سہولیات فراہم کیں۔ ایسی باتیں بھی کبھی کبھار ہو جاتی ہیں.... (کیا شراب ہر حال میں انسان کی دشمن ہوتی ہے؟ کیا یہ بعض مرتبہ اُس کی بہترین صفات کو باہر نہیں لے آتی؟)

اسٹیپن اپنے میزبانوں سے پہلے بیدار ہو گیا اور تمام باتوں کے باوجود کسی خطرے سے محفوظ رہنے کے لیے باہر نکل آیا۔ نہیں، دونوں گھوڑے وہیں تھے جہاں باندھے گئے تھے اور وہ ان میں سے ایک پر برق رفتاری کے ساتھ بھاگ سکتا تھا لیکن وہ رحمدل لوگوں کو نقصان پہنچانے والا فرد نہیں تھا چنانچہ پیدل ہی وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

کچھ دن مزید سفر کرنے کے بعد اُسے کاریں اور لاریاں ملنے لگیں وہ ہمیشہ عجلت کے ساتھ ان کی راہ سے ہٹ جاتے تھے بالآخر وہ ایک ریلوے لائن پر پہنچ گیا اور اس کے کنارے کنارے چلتا ہوا اُسی رات وہ اورسک اسٹیشن کے نزدیک آ گیا اب صرف یہ رہ گیا تھا کہ وہ کسی ٹرین پر سوار ہو جائے! وہ فتحیاب ہو گیا تھا! اُس نے ایک عجوبہ کر دکھایا تھا، ایک لق و دق ریگستان کو تنِ تنہا پار کر لیا تھا! اپنے ساتھ صرف ایک گھر کا بنایا ہوا چاقو اور چھری لے کر! اور اب وہ اپنی منزل مقصود تک آ گیا تھا۔

دفعتاً اسٹیشن کے بجلی کے قمقموں کی روشنی میں اس نے فوجیوں کو لائن کے کنارے گشت کرتے ہوئے دیکھ لیا اس لیے وہ ریلوے لائن کے متوازی جاتے ہوئے بیل گاڑی کے راستے پر آگے بڑھ گیا۔ اب اُس نے چھپنے کی زحمت گوارا نہیں کی، دن نکل آیا اس وقت بھی نہیں۔ کیونکہ اب وہ روس میں تھا، اپنی مادرِ وطن میں! غبار کا ایک بادل اُس کی طرف آیا اور پہلی مرتبہ کار دیکھ کر اسٹیپن دُور نہیں بھاگا۔ اس پہلی حقیقی رُوسی کار میں سے ایک اصلی رُوسی ملیشیا مین کُود کر باہر نکلا: "کون ہے تو؟ اپنے کاغذات معائنے کے لیے پیش کر" اسٹیپن نے کہا کہ میں ٹریکٹر ڈرائیور رہوں اور کام کی تلاش میں ہوں۔ ہوا یہ کہ ایک کالخوز کا صدر ملیشیا مین کے ہمراہ تھا: "چلو چھوڑو۔ مجھے ٹریکٹر ڈرائیوروں کی اشد ضرورت ہے! فارم پر کام کرنے والوں میں سے کتنوں کے پاس کاغذات ہیں؟"

انہوں نے تمام دن سفر کیا، راستے میں سودا سلف خریدتے ہوئے، کھانے پینے کے لیے رُکتے ہوئے۔ لیکن رات ہونے سے ٹھیک پہلے اسٹیپن مزید برداشت نہ کر سکا اور درختوں کی جانب بھاگا جو تقریباً دو سو میٹر کے فاصلے پر تھے۔ ملیشیا مین نے اپنی محبوب دلیری کا مظاہرہ کیا اور گولی چلا دی۔

پھر گولی چلی! مجبوراً اسٹیپن کو رُکنا پڑا۔ انہوں نے اُس کی مشکیں کس لیں۔

ممکن ہے کہ اُس کی جستجو کا خیال ترک کر دیا گیا ہو یا انہوں نے اُسے مردہ تصور کر کے تلاش بند کر دی ہو، ہو سکتا ہے کہ اور سک والے فوجی کسی اور کی گھات میں بیٹھے رہے ہوں کیونکہ ملیشیا مین اُسے چھوڑ دینے کے حق میں تھا اور ریاستی حفاظتی پولیس کے ضلعی اسٹیشن پر اتیدار میں تو انہوں نے بڑا شور و غل کیا، اُسے چائے اور سینڈوچ اور کازبک سگرٹ پیش کیے کمانڈنٹ نے خود اُس سے پوچھ تاچھ کی اور اُس نے اسٹیپن کے ساتھ ملائمت کے ساتھ خطاب کیا۔ (ان جاسوسوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا ___ کل اسے ماسکو لے جائیں گے اور بآسانی شکایت درج کرا سکتے ہیں: "تمہارا ٹرانسمیٹر کہاں ہے؟ کیا دو ایک نقشے تیار کرنے کے لیے تمہیں یہاں اُتارا گیا ہے؟ تم کس شعبے میں سروس کرتے ہو؟" اسٹیپن چکرا گیا: "میں نے کبھی جیالوجیکل سروس میں کام نہیں کیا، میں تو کان مزدور ہوں۔"

اس مہم کا اختتام سینڈوچوں یا جسمانی قید سے بھی زیادہ بُرے حال میں ہوا۔ جب وہ واپس کیمپ لایا گیا اُسے دیر تک بے رحمی کے ساتھ مارا پیٹا گیا۔ اپنی سابقہ تکلیفوں سے تھکا ہارا اسٹیپن اخلاقی طور پر بہت گر گیا، اس نے کینگر کے حفاظتی افسر بیلیائیف سے صلح کر لی کہ وہ ممکنہ مفرورین کا سراغ لگانے میں مدد کرے گا۔ وہ ایک قسم کا طعمہ بن گیا۔ اُس نے کینگر جیل کے اپنے دو ایک کوٹھری کے ساتھیوں سے اپنے فرار کی تفصیلات بیان کیں اور اُن کے ردِ عمل پر نگاہ رکھی۔ اگر اُن کا کوئی ارادہ ہوتا، اُس کی طرح واضح کوشش کی خواہش کا اظہار ہوتا تو اسٹیپن اس کی اطلاع اپنے اوپر والے تک پہنچا دیتا۔

— x —

فرار کی کسی بھی دشوار گزاری کے ساتھ جو متعلقہ مظالم ہوتے ہیں وہ ایک پُر تشدد اور پیچیدہ فرار میں جو دیزکازگان سے ہی اور ۱۹۵۱ء ہی کی گرمیوں میں ہوا تھا، بڑے واضح انداز میں سامنے آئے تھے۔

ایک کان کی پٹ (گڈھے) سے رات کے وقت بھاگنے والے چھ قیدیوں نے ایک ساتویں قیدی کو مار کر اتیدار کی جسے وہ مخبر سمجھتے تھے بعد ازاں وہ ایک پُرانے پراسپیکٹنگ شیفٹ پر چڑھ کر باہر اسٹیپی میں اُتر گئے۔ ان چھ قیدیوں میں بڑے مختلف المزاج لوگ شامل تھے اور انہوں نے فی الفور الگ ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ بات بھی اُن کے لیے مفید ہوتی بشرطیکہ انہوں نے فرار کا کوئی سوچا سمجھا منصوبہ تیار کیا ہوتا۔

لیکن اُن میں سے ایک سیدھا آبادی کو روانہ کیا گیا جہاں آزاد مزدور رہتے تھے یہ آبادی کیمپ کے داہنی طرف واقع تھی۔ اُس نے وہاں پہنچ کر اپنی دوست عورت کے دروازے پر دستک دی اس کا ارادہ وہاں چھپنے کا، کچھ عرصے تک تختوں کے نیچے یا اوپر یا کوٹھری میں پوشیدہ رہنے کا نہ تھا (یہ بھی ایک دانشمندانہ فعل ہوتا) بلکہ جب تک ممکن ہو اس عورت کے ساتھ دادِ عیش دینے کا تھا (ہم فوراً عادی مجرم کی حرکات و سکنات کو پہچان سکتے ہیں) وہ

ایک شب و روز مزے کرتا رہا اور اگلی شام کو اس عورت کے سابق شوہر کا سیوٹ زیب تن کرکے اُسے ایک کلب میں فلم دکھانے لے گیا جہاں کیمپ کے کچھ جیلر موجود تھے جنہوں نے اُسے پہچان کر فوراً احراست میں لے لیا۔

دو اور مفرورین، جو چار جیا کے تھے، اور اپنے معلق بے فکری کے ساتھ مگن تھے، بھاگ کر اسٹیشن پہنچے اور کاراگنڈا جانے والی ٹرین پر سوار ہو گئے۔ لیکن وریز کازگان سے مویشیوں کی پگڈنڈی کو چھوڑ کر بیرونی دنیا کے لیے دوسرا کوئی راستہ نہیں جاتا — کاراگنڈا کی سمت اور ٹرین سے! ریلوے لائن کے کنارے کیمپ ہیں اور ہر اسٹیشن پر ایک حفاظتی چوکی قائم ہے اس لیے وہ کاراگنڈا پہنچنے سے پیشتر ہی پکڑے گئے!

بقیہ تین نے سب سے دشوار راہ اختیار کی اور جنوب مغرب کی طرف روانہ ہو گئے۔ ادھر لوگ تو نہ تھے لیکن پانی بھی نہیں تھا۔ سمتر یو کریچی پروکوپینکو کے پاس، جو فوج میں رہ کر جنگ کر چکا تھا، ایک نقشہ تھا اور اسی نے اُنہیں یہ راستہ اختیار کرنے کی ترغیب دی تھی اور اُن سے کہا تھا کہ میں تمہارے لیے پانی تلاش کروں گا۔ اس کے ہمراہیوں میں ایک کریمیا کا تاتار تھا جو کیمپوں کے قیام کے دوران مجرم بن گیا تھا اور ایک شریر النفس چغلی خور چور تھا۔ وہ چار شب و روز میدان کے پیاسے سفر کرتے رہے اور جب اُن کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تو تاتار اور چور نے پروکوپینکو سے کہا: "ہم نے تمہاری ہمسفری ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے"

"وہ کچھ نہیں سمجھا" تمہارا کیا مطلب ہے دوستو؟ کیا تم اپنی راہ مختلف کرنا چاہتے ہو؟" "نہیں تمہارا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سب پار نہیں پہنچ سکتے! پروکوپینکو اُن کی منت سماجت کرنے لگا۔ اُس نے اپنی ٹوپی کا استر ادھیڑ کر اس میں سے اپنی بیوی اور بچوں کی تصویر نکالی۔ اس توقع پر کہ وہ پگھل جائیں گے "بھائیو! دوستو! میں نے سوچا تھا کہ ہم سب مل کر آزادی کی راہ پر گامزن ہوں گے! میں تمہیں پار پہنچاؤں گا۔ جلد ہی ایک کنواں ملے گا اس میں پانی ضرور ہوگا۔ کچھ اور صبر سے کام لو۔ مجھ پر رحم کرو!"

لیکن انہوں نے اُسے چھریوں سے مار ڈالا انہیں اُمید تھی کہ اُس کے لہو سے وہ اپنی تشنگی رفع کر سکیں گے۔ اُنہوں نے اُس کی شریانیں کاٹ دیں لیکن خون نہیں نکلا — وہ جم چکا تھا۔

ایک اور عجیب و غریب منظر: دو آدمی اسٹیپی میں ایک تیسرے شخص پر جھکے ہوئے سوچ رہے تھے کہ اُس کے بدن سے خون کیوں نہیں نکلتا. . . .

ایک دوسرے کو بھیڑیوں کی طرح گھورتے ہوئے، کیونکہ ان میں سے ایک کو مرنا ہوگا، وہ اُسی جانب بڑھ گئے جو "بوڑھے بابا" نے انہیں بتائی تھی اور دو گھنٹے کے بعد ایک کنوئیں پر پہنچ گئے۔

اس کے اگلے ہی دن انہیں ایک ہوائی جہاز سے تاڑ لیا گیا اور وہ گرفتار ہو گئے۔

انہوں نے دورانِ تفتیش ان باتوں کا اقبال کر لیا۔ کیمپ کو اس بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا۔ دیگر قیدیوں نے پراکوپینکو کا انتقام لینے کی غرض سے اُن کے سر توڑ دینے کا تہیہ کیا لیکن انہیں علیحدہ سیل میں رکھا گیا اور مقدمے کے لیے دوسرے مقام پر منتقل کر دیا گیا۔

—x—

اگر آپ چاہیں تو باور کر سکتے ہیں کہ ہر بات کا انحصار اس پر ہے کہ مہم کی ابتدا کے وقت اندرونی حالات کیا تھے۔ آپ کا منصوبہ اتنی باریک بینی سے تیار کیا گیا ہے، اتنے پہلے بنایا گیا ہے لیکن عین نازک موقع پر احاطے میں بجلی فیل ہو جاتی ہے اور لاری پر قبضہ کرنے کا موقع آپ کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے جبکہ بعض اوقات کسی فوری تحریک کے تحت کی گئی فرار کی کاوش حالات کے عین موافق ہوتی ہے جیسے یہ آپ کے پروگرام کے مطابق پیدا کر دی گئی ہو۔

۱۹۴۸ء کے موسمِ گرما میں دوریز کارگان کے ہی فرسٹ ڈویژن (یہ ابھی خصوصی کیمپ نہیں بنا تھا) میں ایک صبح سویرے کوڑا کرکٹ ڈھونے کے ایک ٹرک کو کچھ فاصلے پر واقع ایک کان سے ریت لا کر سیمنٹ مکسروں پر پہنچانے کے کام پر لگایا گیا۔ ریت کا گڑھا کوئی کام کا مقام نہ تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہاں پیدا نہیں تھا اور کہیں لادنے والوں — تین طویل میعاد کے سزا والے قیدیوں کو، جن میں سے ایک کو دس سال کی، اور بقیہ دو کو رُبع صدی کی سزا دی گئی تھی، لاری پر لے جانا پڑا۔ اُن کے نگرانوں میں ایک لانس کارپورل اور دو فوجی تھے اور ڈرائیور ایک غیر سیاسی قیدی، نمبردار تھا۔ یہ سنہرا موقع تھا! لیکن موقع کا فائدہ فی الفور اُٹھا لینا چاہیئے۔ فیصلہ کرنا تھا اور ایک منصوبے کی چولیں بٹھانی تھیں اور سب کچھ پہریداروں کی آنکھوں اور کانوں کے نزدیک، جو ریت لادنے کے وقت قریب ہی کھڑے تھے۔ تینوں اشخاص کے حالاتِ زندگی یکساں تھے: پہلے مورچہ، پھر اسیرانِ جنگ کا جرمن کیمپ، فرار، دوبارہ گرفتاری تعزیری جیل کیمپ، جنگ کے اختتام پر رہائی اور اس سب کے انعام کے طور پر اپنے فریق کے ہاتھوں قید میں ڈالا جانا۔ وہ جرمنی کے پار فرار ہوتے ہوئے نہیں ڈرے تھے تو اپنے ہی وطن میں بھاگنے سے کون باز رکھ سکتا تھا؟ انہوں نے ڈھلائی ختم کی۔ کارپورل کیبن میں اپنی جگہ براجمان ہو گیا دونوں سپاہی لاری کے اگلے حصے کی طرف کیبن کی جانب پُشت کر کے بیٹھے، اُن کی ٹامی گنیں قیدیوں پر تنی ہوئی تھیں جو پچھلے حصے میں ریت پر بیٹھے رہے۔ جیسے ہی ریت کی کان سے باہر نکلے، قیدیوں نے اشاروں اشاروں میں ایک دوسرے سے بات چیت کی اور سنتریوں کی آنکھوں میں دُھول جھونک ماری اور اُن کے سروں پر آ پڑے انہوں نے اُن کی ٹامی گنیں چھین لیں اور کارپورل کو کیبن کی کھڑکی سے بندوق کا کندہ مار کر بے ہوش کر دیا۔ لاری رُک گئی۔ ڈرائیور فرطِ خوف سے سفید پڑ گیا۔ "ڈرو مت"! انہوں نے اُسے تسلی دی، ہم تمہیں چوٹ نہیں پہنچائیں گے، تم ان کتوں میں سے نہیں ہو! اپنا بوجھ نیچے پھینک دو۔ انجن چلا اور ریت، وہ قیمتی ریت جو اپنے ہم وزن سونے سے بیش قیمت تھی کیونکہ وہ اُن کے لیے آزادی لائی تھی، زمین پر آ گری۔

یہاں بھی، جیسا کہ فرار کی تمام کاوشوں میں ہوتا ہے ـــ تاریخ کو اسے فراموش نہیں کرنا چاہئیے ـــ! غلاموں نے اپنے آپ کو سنتریوں کے مقابلے میں زیادہ کشادہ قلب ثابت کیا۔ انہوں نے اُن کی جان نہیں لی، انہیں مارا پیٹا نہیں، صرف انہیں اپنی وردیاں اور بُوٹ اتارنے کا حکم دیا اور انہیں زیرِ جاموں میں چھوڑ دیا گیا۔ "تیرا کیا خیال ہے ڈرائیور؟ تو ہمارے ساتھ ہے یا ان کے ساتھ؟" "بے شک تم لوگوں کے ساتھ، تمہارا کیا خیال ہے؟"

برہنہ پا پہریداروں کو دھوکہ دینے کے لیے (یہ اُن کے رحم کا صلہ تھا) وہ پہلے لاری کو مغرب کی طرف لے گئے (سپاٹ اسٹیپی پر آپ لاری کو جدھر چاہیں لے جا سکتے ہیں) بعد ازاں ایک نے کارپول کی وردی پہن لی اور بقیہ دونے سپاہیوں کی اور برق رفتاری سے شمال کی طرف بڑھے۔ وہ سب مسلح تھے ڈرائیور کے پاس لائسنس تھا، کوئی بھی اُن پر شبہ نہ کر سکتا تھا پھر بھی جب اُن کا راستہ کسی ٹیلی گراف کی تار لائن کو قطع کرتا تھا تو وہ خبر رسانی کے ذرائع کو تباہ کرنے کی غرض سے تار کاٹ دیتے تھے (وہ ایک رسی میں پتھر باندھ کر تار کے اوپر پھینکتے جس کے بوجھ سے تار جھک جاتے تھے بعد ازاں وہ ٹک سے اس پر زور لگاتے تھے) اس میں وقت صرف ہوتا تھا لیکن بحیثیت مجموعی انہیں زیادہ فائدہ پہنچا تھا۔ وہ تمام دن پوری رفتار سے بھاگتے رہے اور آدھ میٹر تین سو کلو میٹر تک جا پہنچا نیز پٹرول کی سُوئی صفر پر آ لگی انہوں نے قریب سے گزرنے والی کاروں کو روکنا شروع کیا۔ ایک پو بیدا ادھر سے نکلی۔ انہوں نے اُسے روک لیا "معاف کرنا کامریڈ! ہم صرف اپنا فرضِ منصبی نبھا رہے ہیں۔ اپنے کاغذات دکھاؤ!" وہ بہت بڑا آدمی نکلا۔ ضلع کی پارٹی کا صدر۔ اپنے کولخوزوں کا معائنہ کرنے، کارکنوں کا حوصلہ بڑھانے یا صرف شیرباک کھانے کے لیے جا رہا تھا ـــ "ٹھیک ہے۔ باہر نکل کر اپنے کپڑے اُتار دو!" "مجھے گولی مت مارو!" وہ بڑا آدمی گڑگڑایا۔ مفرورین اُسے باہر اسٹیپی پرے گئے، اُسے باندھ دیا اُس کے کاغذات چھین لیے اور پو بیدا میں آگے بڑھ گئے۔ جن فوجیوں کو انہوں نے دن میں ننگا کر دیا تھا وہ قریب ترین ریت کے گڑھے تک شام سے پہلے نہیں پہنچے اور وہاں بُرجی سے حکم ملا: "آگے مت بڑھنا"! "ہم تمہاری مانند فوجی ہیں"! "ہرگز نہیں! تم فوجی نہیں ہو۔ فوجی اس طرح زیرجاموں میں نہیں گھوما کرتے!"

ادھر یہ ہوا کہ پو بیدا کی ٹنکی پوری طرح بھری ہوئی نہیں تھی۔ تقریباً دو سو کلو میٹر آگے چل کر پٹرول ختم ہو گیا اور فاضل ڈبوں میں بھی تیل نہیں رہا۔ اب تک اندھیرا ہو چکا تھا انہیں کچھ گھوڑے چرتے ہوئے نظر آئے، قیدیوں نے کسی طرح انہیں پکڑ لیا اور حالانکہ اُن کے پاس لگامیں نہیں تھیں پھر بھی گھوڑوں کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر وہ آگے بڑھے۔ ڈرائیور اپنے گھوڑے سے نیچے گر پڑا اور اُس کی ایک ٹانگ زخمی ہو گئی۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ وہ دوسرے گھڑسوار کے پیچھے بیٹھ جائے لیکن اُس نے انکار کر دیا "ڈرو مت نوجوانو! میں تمہارا راز کسی کو نہیں بتاؤں گا!" انہوں نے کچھ رقم اُس کے سپرد کی اور پو بیدا سے ہاتھ لگنے والے کاغذ اس کو دے کر گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے آگے نکل گئے۔ ڈرائیور کے بعد انہیں پھر کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ کبھی اپنے کیمپ میں واپس نہیں

لائے گئے اور اس طرح انہوں نے اپنی رُبع صدی کی سزا اور اپنے "ناقابلِ تبدیلی دس سال" پیچھے انسپر تحفظ کی تجوری میں چھوڑ دیئے "سبز میدان" مفرورین کی معاونت کرتا ہے۔

ڈرائیور نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اُن کے راز کو افشاء نہیں کیا اُسے پیڑو پاملونسک کے نزدیک ایک کولخوز میں ملازمت مل گئی اور چار سال تک سکون سے رہا۔ فن کی محبت نے اُسے مار ڈالا۔ وہ اکارڈین بہت اچھی بجاتا تھا چنانچہ کولخوز کلب میں اُس نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا پھر شوقیہ رقص و سرود کی تقریبات کے مواقع پر مقابلوں میں حصہ لیا، پہلے ضلعی مرکز میں پھر صوبائی دارالسلطنت میں۔ وہ اپنی سابقہ زندگی کو عملاً فراموش کر چکا تھا لیکن وریز کارزگان کے ایک جیلر نے، جو سامعین میں شامل تھا اُسے پہچان لیا اور اسٹیج سے ہٹتے ہی اُسے گرفتار کر لیا گیا اور اس مرتبہ انہوں نے دفعہ ۵۸ کے تحت اُسے پچیس سال کی چپکا دی!

—— x ——

ان مہمات کو ہمیں ایک علیحدہ ہی خانے میں رکھنا ہوگا جو بد حواسی کے بطن سے پیدا نہیں ہوتیں بلکہ تکنیکی حساب کتاب اور عمدہ فنی مہارت کے تحت وجود میں آتی ہیں۔

کینگر میں ریل کے ذریعے فرار ہونے کے لیے ایک مشہور منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ سیمنٹ یا اسبسٹس ڈھونے کے لیے مال گاڑیوں کو ایک جائے تعمیر پر مال پہنچانے کے لیے باقاعدگی سے لایا جاتا تھا۔ اُن کا مال محفوظ علاقے میں آتارا جاتا تھا اور یہ خالی واپس جاتی تھیں۔ پانچ قیدیوں نے اپنے فرار کا منصوبہ اس طرح تیار کیا کہ انہوں نے ایک بھاری باکس کار کے لیے ایک فرضی آخری دیوار تیار کی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ فولڈنگ پردے کی طرح اُسے قبضوں سے جڑ دیا تھا تاکہ وہ اسے جب کار تک کھینچیں تو یہ ایک چوڑے تختے سے زیادہ جگہ نہ گھیرے جو کھینچنے کے لیے سہولت بخش بھی ہوگا۔ منصوبہ یہ تھا کہ جب باکس کار آتاری جا رہی تھی تو قیدی اس کے انچارج تھے وہ اپنی تخلیق کو اندر کھینچ لیں گے اور اُسے باہر کی طرف کھول دیں گے، اسے باکس کار کے ٹھوس حصے کے ساتھ جڑ دیں گے، پانچوں آدمی دیوار کی جانب پشت کرکے کھڑے ہو جائیں گے اور نقلی دیوار کو رستوں کے سہارے اُس کی جگہ کھڑا کر دیں گے۔ باکس کار اسبسٹس کی دھول سے پوری طرح ڈھکی ہوئی تھی اور اسی طرح تختہ بھی۔ عام نگاہ کو باکس کار کی گہرائی کا فرق نہیں نظر آئے گا لیکن وقت کا مسئلہ ٹیڑھا تھا۔ انہیں ٹرین سے مال آتارنے کا کام ختم کرکے اُسے روانگی کے لیے تیار حالت میں اُسی وقت چھوڑنا تھا جب کہ قیدی ابھی جائے کار پر ہی موجود تھے لیکن وہ اس پر قبل از وقت سوار نہیں ہو سکتے تھے۔ انہیں اس بات کا یقینی علم ہو جانا چاہیئے کہ اُن کے سوار ہوتے ہی ٹرین فوراً چل دے گی وہ اپنے آخری لمحوں کی بھاگ دوڑ کر رہے تھے جس میں چاقو اور اشیائے خورد و نی رکھنا بھی شامل تھا — اور اچانک ایک مفرور کا پاؤں سوراخ میں الجھ گیا اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی جس کے باعث اُسے رُکنا پڑا اور انہیں پہرے داروں کے گاڑی کے معائنے سے پیشتر باکس جانے کا کام پورا کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

اس طرح اُن کا راز افشا ہو گیا۔ پوری پوری تحقیقات کی گئی اور مقدمہ چلا۔

یہی طریقہ زیرِ تربیت ــــ ہوا باز واٹا نوب نے تنِ تنہا فرار کی کوشش کے دوران اختیار کیا۔ ایکی بسٹز میں دروازوں کے فریم تیار کر کے جائے تعمیر کو روانہ کیے جاتے تھے۔ ورکشاپ میں دن رات کام ہوتا تھا اور پہریدار برجیوں سے کبھی نہ ہٹتے تھے لیکن جائے تعمیر پر دن کے وقت ہی پہرہ ہوتا تھا۔ دوستوں کی معاونت سے واٹا نوب فریم کے ساتھ ایک لاری پر سوار ہو گیا اور جائے تعمیر پر اُتر گیا۔ لکڑی کے کارخانے میں اُس کے دوستوں نے شفٹ آنے پر گنتی کا گھپلا کر دیا تاکہ شام تک اُس کی غیر حاضری کا علم نہ ہو سکے۔ جائے تعمیر پر وہ اپنے بکس سے نکل آیا اور باہر چلا گیا۔ لیکن اُسے اسی رات یا فلوڈر جانے والی سڑک پر گرفتار کر لیا گیا (یہ واقعہ اس کے ایک اور فرار کی کاوش کے ایک سال بعد کا ہے۔ اُس وقت اس نے ایک کارکن کے ذریعے فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور انہوں نے اس کا ایک ٹائر پنکچر کر دیا تھا)

——X——

کامیاب فرار اور ابتدائی منزل میں ہی فرار کی ناکام کوشش جیسے وہ واقعات جو پہلے ہی پیروں تلے کی زمین کو گرم بنا رہے تھے یہ جیل افسروں کے عمیق غور و خوض کے بعد ڈسپلن سے متعلق فیصلے؛ کام بند، ہڑتالیں اور جد وجہد کی دوسری شکلیں ــــ ان وجوہ سے ایکی بسٹز کی ڈسپلن بریگیڈ کی تعداد متواتر بڑھتی جا رہی تھی۔ جیل کے دو پتھروں والے حصوں اور ڈسپلن بیرکوں (جھونپڑی نمبر ۲، اسٹاف کوارٹر کے پاس) میں اب اُن کی سمائی نہ ہوتی تھی۔ ایک دوسری ڈسپلن بیرک (جھونپڑی نمبر ۸) بطورِ خاص بنیڈرسٹوں کے لیے تیار کی گئی۔

ہر نئے فرار اور ہر نئے فساد کے بعد تینوں خصوصی شعبوں میں ڈسپلن سخت سے سخت تر ہو جاتا تھا (جرائم کی دنیا کے مورخین کی سہولت کے لیے ہم درج کر دیں کہ ایکی بسٹز کیمپ جیل میں شکایتیں کرنے والے قیدی اس بات کے شاکی رہتے تھے: "حرام زادو! یہ بھاگنے کا کام بند کرو! تم فرار کی کوشش کرتے ہوئے وہ ہمارا سانس لینا دوبھر کر دیتے ہیں۔ تم ایسے کاموں کے لیے کسی عام جیل میں کیوں نہیں مرتے؟" بالفاظِ دیگر وہ وہی کہتے تھے جو اُن کے آقا اُن سے کہلانا چاہتے تھے)

۱۹۵۱ء کے موسمِ گرما میں ساری کی ساری ڈسپلن بیرک نمبر ۸ کے دماغ میں بیک وقت فرار کی دُھن سوار ہو گئی۔ وہ کیمپ سرحد سے تقریباً تیس میٹر کے فاصلے پر تھے اور انہوں نے سرنگ بنانے کا تہیہ کر رکھا تھا لیکن بہت ساری زبانیں چلتی تھیں اور یوکرینی لڑکے تقریباً سرِعام آپس میں اس پر تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے اور یہ احتیاط نہیں برتتے تھے بنیڈرا والوں کا کوئی آدمی مخبر بھی ہو سکتا ہے۔ جب کہ ان میں سے چند مخبر تھے۔ اُن کی سرنگ ابھی چند میٹر ہی تیار ہوئی تھی کہ اُن کا راز فروخت کر دیا گیا۔

ڈسپلن بیرک نمبر ۲ کے لیڈر اس انکشافِ راز سے بہت پریشان ہوئے ــــ اس لیے

نہیں کہ اُنہیں انتقام لیے جانے کا خوف تھا جیسا کہ شکایت کرنے والوں نے کیا تھا بلکہ اُن کی پریشانی کا سبب یہ تھا کہ وہ بھی باڑے تین میٹر کی دُوری پر تھے اور انہوں نے جھونپڑی نمبر ۸ والوں سے پہلے ہی ایک عمدہ سرنگ تیار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اس پر عملدرآمد شروع بھی کر دیا تھا۔ اب انہیں خدشہ لاحق ہو گیا کہ اگر دو ڈسپلن بیرکوں میں بھی رجحان فروغ پا گیا تو کتوں کا غول اس سے واقف ہو جائے گا اور انہیں پکڑ لیا جائے گا۔ لیکن ایجی بسٹز کے افسران سواریوں کے ذریعے فرار کی کوشش سے زیادہ ڈرتے تھے اور انہوں نے کام کے تمام مقامات اور رہائشی علاقوں کے ارد گرد ایک میٹر گہری خندقوں کی تیاری کو اپنی کاوشوں کا مرکز بنا لیا تھا تاکہ ادھر سے گزرتے والی سواری گاڑی اس میں گر جائے۔ جیسے کہ دورِ وسطیٰ میں دیواریں کافی نہیں تھیں اور خندقوں کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ کھدائی کی ایک مشین نے کام کے مقامات کے چہار جانب یکے بعد دیگرے اس قسم کی خندقیں صفائی کے ساتھ مناسب طول وعرض میں تیار کر دیں۔

ڈسپلن بیرک نمبر ۲ ایک چھوٹے احاطے پر مشتمل تھی جس کے چاروں طرف کانٹے دار تار کھنچا ہوا تھا اور یہ تمام چیزیں ایجی بسٹز کے بڑے احاطے کے اندر تھیں اس کے دروازے کا تالا ہمیشہ بند رہتا تھا۔ چھُونے کی بھٹیوں پر صرف ہونے والے وقت کے علاوہ ڈسپلن بیرک کے قیدیوں کو محض بیس منٹ کے لیے اپنے چھوٹے سے آنگن میں ورزش کرنے کی اجازت دی جاتی تھی بقیہ وقت وہ اپنی بیرکوں میں مقفل رکھے جاتے تھے اور خاص صحن کو وہ صرف کام پر جانے اور واپس آنے کے وقت ہی پار کرتے تھے۔ انہیں عام کمرۂ طعام میں داخل ہونے کی سخت ممانعت تھی۔ اُن کے لیے باورچیخانے سے کارکنان کھانا لایا کرتے تھے۔

جہاں تک ان لوگوں کا تعلق تھا، ان کے لیے چُونے کی بھٹیوں پر کچھ آرام اور دھوپ حاصل کرنے کا موقع تھا اور وہ احتیاط برتتے تھے کہ مضرت رساں چُونے کو ہلاتے ہوئے زیادہ تھکانے والا کام نہ کریں۔ جب ان سب سے بالاتر، اگست ۱۹۵۱ء میں ایک قتل کی واردات ہو گئی (مجرم اسپانوف نے مفرور انیکن کو ایک کُدال سے مار ڈالا) انیکن نے برفیلے طوفان میں ایک اسنو ڈرفٹ کی مدد سے سرحدی تار پار کر لیے تھے لیکن ایک دن کے بعد ہی دوبارہ حراست میں لے لیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ ڈسپلن بیرک میں تھا (ملاحظہ ہو حصّہ سوم کا چودھواں باب) مائننگ ٹرسٹ نے اس قسم کے مزدوروں سے مزید کام کرانے سے انکار کر دیا۔ اور ستمبر کے پورے مہینے میں ڈسپلن بیرک کے قیدیوں کو باہر بالکل نہیں نکالا گیا لیکن وہ اسی طرح بسر کرتے رہے جیسے عام جیل میں ہوں۔

ان میں بہت سے "مستقل مزاج مفرورین" تھے اور موسم گرما میں تقریباً ایک معیار کے مہم جو رفتہ رفتہ ایک خفیہ مہم جوئیوں کی ٹولی میں یکجا ہو گئے (محمد کا نزئیف جو ایجی بسٹز کے مسافروں کا نائندہ تھا، واسیلی کوسترنیکوف، واسیلی بروخن، ولنٹین رائزکوف، موٹیافنٹ، ایک

پولش افسر جو سُرنگیں بنانے کا شائق تھا اور دیگر لوگ) وہ یُوں تو ایک دُوسرے کی ٹکر کے تھے لیکن خوبان کا ایک قازق اسپیس کونوالوف اُن کا رہبر تھا۔ انہوں نے اپنے باہمی معاہدے کو حلف اُٹھا کر تقویت پہنچائی: اگر اُن میں سے کسی نے کسی ذی رُوح کو یہ بات بتائی تو اُس کا نمبر آگیا۔ یا تو وہ خود اپنے آپ کو ختم کرے گا یا پھر دوسرے ساتھی اپنے چاقو اس کے جسم میں اُتار دیں گے!

اس وقت تک ایکی بسٹز کا احاطہ ایک چار میٹر اونچی مضبوط تختوں والی باڑ سے پہلے ہی گھرا ہوا تھا باڑ کے بعد چار میٹر چوڑی جتی ہوئی زمین کی پٹّی تھی اور اس کے باہر ایک پندرہ میٹر چوڑا ممنوعہ علاقہ تھا جس کے سرے پر ایک میٹر گہری خندق تھی۔ انہوں نے اس تمام محفوظ علاقے کے نیچے سرنگ کھودنے کا عزم کیا جو اتنی احتیاط کے ساتھ چھپائی جائے گی کہ اُن کے فرار سے قبل کسی کو اس کا علم نہ ہو سکے گا۔

ابتدائی معائنے سے معلوم ہوگیا کہ بیرکوں کی بنیادیں بہت کم گہری ہیں اور کہ فرش کے تختوں کے نیچے بہت کم گنجائش ہونے کی وجہ سے کھودی ہوئی مٹی کو پھیلانے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ یہ مسئلہ ناقابلِ تسخیر نظر آتا تھا۔ کیا فرار کا خیال ترک کر دیا جائے؟

پھر کسی نے کہا کہ بالائی چھت پر وافر جگہ ہے اور یہ مشورہ دیا کہ مٹی اُچھال کر وہاں پھیلا دی جائے! پہلے پہل سننے پر یہ مشورہ قابلِ توجہ نظر نہیں آیا۔ درجنوں مکعب میٹر مٹی اُٹھا کر بالائی چھت پر کسی کی توجہ مرکوز کیے بغیر بیرکوں کی جائے رہائش سے پہنچا دینا، جس پر ہمیشہ نگاہیں مرکوز ہوتی تھیں اور جس کا باقاعدگی سے معائنہ ہوتا رہتا تھا، ہر روز، ہر گھنٹے۔ اور ایک چٹکی بھر مٹی بھی گرائے بغیر کیونکہ اس طرح پکڑے جانے کا خدشہ تھا۔

لیکن جب انہوں نے اس پر عمل پیرا ہونے کا ایک طریقہ ایجاد کر لیا تو بے حد خوش ہوئے اور اُن کے فرار کا ارادہ مزید مستحکم ہوگیا۔ یہ فیصلہ کرنے میں انہیں جس چیز سے معاونت ملی وہ تھا ان کا ایک سکشن یعنی ایک کمرے کا انتخاب۔ اُن کی فِنش جھونپڑی جو ابتدا میں آزاد مزدوروں کے لیے تیار کی گئی تھی، غلطی سے احاطے میں بن گئی تھی۔ کیمپ میں اس کی مانند کوئی اور جھونپڑی نہ تھی، اس میں چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جن میں سے ہر ایک میں سونے کے تین تین تختے تھے (سات نہیں، جیسے کہ دوسرے کمروں میں ہوتے ہیں) اس طرح ہر کمرے میں بارہ آدمی آسکتے تھے۔ انہوں نے ایک ایسے کمرے کا انتخاب کیا جس میں پہلے سے اُن کے کچھ آدمی مقیم ہوں۔ مختلف ترکیبوں سے، رضاکارانہ منتقلی سے، بد دل اقامت گزینوں کو بالجبر باہر کر کے، انہیں تنگ کر کے یا اُن کا مضحکہ اڑا کے (تو بہت زور زور سے خرّاٹے لیتا ہے اور تو بہت ـــــ) انہوں نے غیر متعلق لوگوں کو وہاں سے باہر نکال باہر کیا اور اپنے گروہ کے تمام افراد کو اس کمرے میں یکجا کر لیا۔

ذیسلن بیرکوں میں بقیہ کیمپ کے مقابلے میں قیدیوں کو جس سختی کے ساتھ الگ رکھا جاتا تھا اور جتنی سخت سزا دی جاتی تھی اور دھمکایا جاتا تھا، کیمپوں میں اُن کی اخلاقی شہرت کو اتنا ہی

فروغ ملتا تھا. ڈسپلن بیرکوں کے قیدیوں کی ہر درخواست کیمپوں کے تمام قیدیوں کے لیے حکم کا سا درجہ رکھتی تھی اب انہیں جن اشیاء کی ضرورت تھی ان کے لیے وہ ہدایات بھیجنے لگے۔ یہ چیزیں کسی جائے تعمیر پر کی تیار کی جاتی تھیں پھر خطرہ مول لے کر تلاشی والے مقامات سے نکالی جاتی تھیں اور پھر مزید خطرہ اٹھا کر آگے ڈسپلن بیرک میں پہنچا دی جاتی تھیں. ملشرتیوں کی دھلائی کے گدے پانی میں رکھ کر، ڈبل روٹیوں کے اندر چھپا کر یا دوائیوں کے ساتھ!

جن اشیاء کے لیے سب سے پہلے درخواست کی گئی اور جو سب سے پہلے فراہم کی گئیں اُن میں چاقو اور دھار رکھنے والے پتھر شامل تھے بعد ازاں پیچ، مٹی، کیلیں، سیمنٹ، سفیدہ بجلی کے تار اور سا پنے مہیا کیے گئے. انہوں نے اپنے چاقوؤں سے فرش کے تین تختوں کے نچلے سرے صفائی کے ساتھ تراش دیے اور وہ اسکرٹنگ تختہ علیحدہ کر دیا جس سے نچلے تختے دبے ہوئے تھے ان تختوں کے دیوار سے لگے ہوئے سروں پر جڑی ہوئی کیلوں اور وہ کیلیں جن سے وہ کمرے کے وسط میں ایک دوسرے تختے سے جُڑے ہوئے تھے، نکال دی گئیں. اس طرح نکالے ہوئے تینوں تختے انہوں نے چوڑائی میں اپنے نیچے لگے ہوئے تختوں سے جڑ دیے تاکہ وہ سب مل کر ایک سلیب سی بن جائیں. بنیادی کیل اس موٹے تختے میں اوپر سے ٹھونک دی گئی. اس کے جوڑے سرے پر فرش کی ہمرنگ پٹی لگا دی گئی اور اس پر دھول ڈال دی گئی. سلیب فرش میں پوری طرح فٹ بیٹھتا تھا اور اس پر کوئی گرفت نہیں تھی لیکن انہوں نے ایک مرتبہ بھی اسے دراڑوں میں کلہاڑی پھنسا کر نہیں اٹھایا. سلیب اٹھانے کا طریقہ یہ تھا کہ اسکرٹنگ بورڈ ہٹا کر کیل کی پیشانی کے چاروں طرف تھوڑی سی درز میں تار کا ایک ٹکڑا پھنسایا جاتا تھا اور اسے کھینچ دیا جاتا تھا جب سرنگ کھودنے والے باری تبدیل کرتے تھے تو اسکرٹنگ بورڈ پھر فٹ کر دیا جاتا تھا اور دوبارہ از سر نو نکالا جاتا تھا. وہ فرش کو روز دھوتے تھے تاکہ پانی میں بھیگ کر تختے پھول جائیں اور دراڑیں بند ہو جائیں. داخلے کا یہ مرحلہ سب سے زیادہ دقت طلب تھا. سرنگ کی راہ والا کمرہ ہمیشہ بطور خاص صاف ستھرا اور باقاعدہ رکھا جاتا تھا. کوئی بھی جوتوں کے ساتھ تختۂ خواب پر نہیں چڑھتا تھا. کوئی سگرٹ نہیں پیتا تھا. چیزیں ادھر ادھر بکھری ہوئی حالت میں نہیں رکھی جاتی تھیں، الماریوں میں روٹیوں کے ٹکڑے نہیں تھے. کسی بھی معائنہ افسر کو تا دیر کمرے میں ٹھہرنے کا جواز کوئی بھی جواز اس کمرے میں باقی نہیں رہنے دیا جاتا تھا. "بہت مہذب!" اور آگے چل دیتا.

دوسرا مسئلہ تھا اُٹھانے کا — زمین سے چھت تک. دیگر تمام سکشنوں کی مانند سرنگ والے سکشن میں بھی ایک بھٹی یا اسٹوو تھا. اسٹوو اور دیوار کے درمیان تھوڑی سی جگہ بس اتنی سی کہ اس سے آدمی سمٹ کر نکل سکے، چھوڑی گئی تھی: ان کا خیال یہ تھا کہ اس خالی جگہ کو بند کر دیا جائے، اسے قیام گاہ سے ہٹا کر سرنگ کے مقام پر پہنچا دیا جائے. ایک خالی سکشن میں انہوں نے سونے کا ایک تختہ بالکل اکھاڑ دیا اور ان تختوں سے انہوں نے اس خالی جگہ کو پُر کر دیا نیز اُسے فوراً مسالے اور پلستر سے ڈھانپ دیا اور سفیدی پھیر کر اُسی رنگ کا بنا دیا

جس رنگ کی بھٹی تھی۔ کیا وارڈروں کو یاد رہ سکتا ہے کہ بیس چھوٹے چھوٹے کمروں میں سے کس میں بھٹی دیوار سے چپکی ہوئی ہے اور کس میں تھوڑی سی ہٹ کر ہے؟ واقعتاً سونے کے تختے کی عدم موجودگی بھی اُن کی توجہ کا مرکز نہیں بن سکتی۔ واحد چیز جو پہلے یا دوسرے دن جیلر کی نظر میں آ سکتی تھی وہ تھا گیلا پلستر، لیکن اس کے لیے اُسے بھٹی کے چہار جانب گھومنا پڑتا اور تختے پر سکڑنا پڑتا۔ نیچے جھک کر دیکھنے کی کوئی تُک نہیں تھی کیونکہ سکشن خالی حالت میں تھا! اگر وہ اس کام میں پکڑے بھی گئے ہوتے تو بھی ضروری نہ تھا کہ اس کا یہ مطلب لیا جاتا کہ سرنگ کھودنے کا فیصلہ ناکام ہو گیا ہے، یہ کام تو اُنہوں نے محض سکشن کو زیادہ دلکش بنانے کے لیے کیا ہے خالی جگہ میں ہمیشہ کالی دھول بھری رہتی تھی اور وہ گندہ گندہ نظر آتا تھا۔

جب پلستر اور سفیدی خشک ہو گئی تو تاحال بیکار رکھے ہوئے آلات یعنی چاقوؤں سے چھت اور سیلنگ کو کاٹ دیا گیا اور ایک زینے دار سیڑھی وہاں موجود تختۂ خواب کے ساتھ جوڑ کر بنا لی گئی اس طرح فرش کے نیچے کا اُتھلا خالی مقام چھت کے بہت بڑے بند کمرے سے ملحق ہو گیا۔ یہ ایک کان کی شیفٹ جیسا بن گیا جو اُن کے جیلروں کی نگاہوں سے اوجھل تھا اور سالوں سے اسی کان میں کام کرتے ہوئے یہ قوی نوجوان محسوس کرتے رہے تھے کہ وہ اپنا پسینہ فضول بہائے جا رہے تھے!

کیا کسی جیل کیمپ میں کوئی کام آپ کے خواب سے ملتا ہوا بالکل ہو سکتا ہے؟ جو آپ کی روح کو تقویت پہنچائے، آپ کی نیندیں اُڑا دے؟ ہو سکتا ہے — لیکن صرف وہی کام جو آپ فرار ہونے کے لیے کرتے ہیں!

اگلا مسئلہ کھدائی کا تھا۔ انہیں چاقوؤں کی مدد سے کھودنا ہو گا اور چاقو تیز رکھنے ہوں گے یہ بات تو صاف تھی — لیکن اس کے بعد بھی کئی مسائل باقی رہ جاتے تھے۔ اوّل تو کان کے سروئیر کی جمع تفریق: (انجینئر مولیانوف) آپ کو حفاظت کی غرض سے مطلوبہ گہرائی تک ہر حال میں جانا ہو گا لیکن ضرورت سے زائد نہیں۔ قریب ترین راستہ اختیار کرنا ہو گا، سرنگ کے لیے مناسب ترین چوڑائی متعیّن کرنی ہو گی اور ہمیشہ اس بات سے واقف رہنا ہو گا کہ ہم کہاں تک آ پہنچے ہیں اور باہر نکلنے کی مناسب جگہ طے کرنی ہو گی۔ اس کے بعد باری کا تصفیہ۔ ہر چوبیس گھنٹوں میں حتی الامکان زیادہ سے زیادہ وقت کھدائی میں صرف کیا جائے گا، لیکن شفٹوں کی بہت زیادہ تبدیلیاں نہیں ہونی چاہئیں اور اس بات کی احتیاط رکھنی ہو گی کہ صبح و شام کے معائنوں کے اوقات میں وہ سب حاضر رہیں اور بالکل مناسب حالت میں۔ پھر کام کرنے کے کپڑوں کا سوال غور طلب تھا اور انہیں دھونے کا انتظام؟ آپ غبار میں اَٹ کر اُوپر نہیں آ سکتے! پھر پیدا ہوا روشنی کا سوال۔ آپ ساٹھ میٹر لمبی سرنگ اندھیرے میں کیسے تیار کر سکتے ہیں؟ انہوں نے فرش کے نیچے ایک تار پہنچایا اور اسے سرنگ کے ساتھ آگے بڑھاتے رہے (اور انہیں اس طریقے سے جوڑنا بھی تھا کہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول نہ کرے) پھر کوئی طریقہ ایسا ہونا

چاہیئے کہ سگنل دیے جا سکیں: اگر اچانک کوئی بیرک میں آجائے تو آپ سرنگ کے دوسرے سرے پر کھدائی میں مصروف آدمی کو کس طرح بلائیں گے؟ اور اس طرح کہ دوسرے کو سنائی نہ دے! اور سرنگ کے اندر والے کس طرح محفوظ طور پر یہ اشارہ دے سکتے تھے کہ انہیں فی الفور باہر آنے کی ضرورت ہے۔

ڈسپلن بیرکوں کا روزانہ کے پروگرام میں سخت پابند ہونا بھی اس کی خامی تھی۔ جیلر خاموشی کے ساتھ دفعتاً بیرکوں میں نہیں پہنچتے تھے انہیں گیٹ تک پہنچنے کے لیے ہمیشہ کانٹے دار تاروں کے پیچیدہ درمیانی راستوں سے گزرنا پڑتا تھا، تالا کھولنا پڑتا تھا، پھر وہ پیدل چلتے ہوئے بیرک تک پہنچتے تھے اور دوسرا قفل کھولتے تھے پھر دستک دیتے۔ اُن کی تمام حرکات و سکنات پر بآسانی نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔ یہ درست ہے کہ نگرانی سرنگ بنانے والے کمرے کی کھڑکی سے نہ کی جا سکتی تھی اُن کے لیے صرف یہ ضروری تھا کہ وہاں ایک نگراں متعین کر دیں۔ کام کرنے والے دستوں کو اشارے روشنی کے توسط سے دیے جاتے تھے دو بار روشنی گل ہونے کا مطلب تھا —— احتیاط، خالی کرنے کی تیاری کرنا، بار بار بلب بجھنے کا مفہوم تھا خطرہ! سُرخ ہوشیاری، جلدی سے نکل کر باہر آجاؤ!

فرش کے نیچے جانے سے قبل وہ سارے کپڑے اُتار کر انہیں تکیوں کے نیچے یا چٹائی کے اندر رکھ دیتے تھے ایک مرتبہ چور دروازے کے باہر ہو جانے کے بعد وہ ایک تنگ جگہ میں سے سرک جاتے تھے کوئی قیاس بھی نہ کر سکتا تھا کہ اس کے پار ایک چوڑا کمرہ ہوگا جس میں روشنی کی غرض سے ایک بلب وقفے وقفے سے روشن ہوتا تھا اور کام کے دوران پہننے کے لیے جیکٹیں اور پتلونیں رکھی تھیں۔ چار دوسرے افراد، برہنہ اور گندی حالت میں (تھکی ہوئی شفٹ) اوپر چڑھ آتے تھے اور اچھی طرح اپنی صفائی کر لیتے تھے (مٹی اُن کے مسامات پر چھوٹے چھوٹے ذرّوں کی شکل میں یکجا ہو جاتی تھی اور اُسے بھگو کر یا بالوں سے کھینچ کر علیحدہ کرنا پڑتا تھا)۔

یہ تمام کام اس وقت چل رہا تھا جب ڈسپلن بیرک ۵ کی سرنگ تعمیر کرنے والی کارروائی پکڑی گئی تھی۔ جن فنکاروں کی فراست کا اس طرح مضحکہ اُڑایا گیا تھا اُن کی پریشانی بلکہ کوفت کا آپ بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں لیکن کوئی مضرت رساں بات نہیں ہوئی۔

ستمبر کے آغاز میں تقریباً ایک سال جیل میں رہنے کے لیے ٹینو اور زڈانوک اس بیرک میں منتقل کر دیے گئے۔ جیسے ہی ٹینو کے دم میں دم آیا، وہ بے قرار ہو گیا۔ اُسے فرار کا منصوبہ تیار کرنا ہوگا لیکن وہ نکل بھاگنے کے بہترین موسم کو مفت گنوانے اور ہاتھ پر ہاتھ کر بیٹھے رہنے کے لیے خواہ کتنا ہی مطعون کرتا مگر زیادہ سے زیادہ مستقل مزاج اور اذیت میں مبتلا مہم جو پر بھی اس کا کوئی ردِ عمل نہ ہوتا (سرنگ بنانے والے چار چار آدمیوں کی تین شفٹوں میں کام کرتے تھے اور اُن کے لیے تیرھواں آدمی، خواہ وہ کوئی بھی ہو، بیکار تھا) اب ٹینو نے گول مول باتیں کرنے کی جگہ سرنگ کھودنے کی تجویز پیش کی اور انہوں نے جواب دیا کہ اس

ضمن میں وہ پہلے ہی غور کر چکے ہیں لیکن بنیادیں بہت کم گہری ہیں (بلاشبہ یہ سنگدلانہ عمل تھا: ایک مستقل مزاج مزدور کا پرجوش چہرہ دیکھ کر بے اتفاقی کے ساتھ انکار میں گردن ہلا دینا ویسا ہی عمل ہے جیسے شکار کی بُو سے بے قرار پھرتیلے شکاری کتّے کو آگے بڑھنے سے روک دینا) لیکن ٹینٹو ان لڑکوں کی نفسیات سے اتنی اچھی طرح واقف تھا کہ اس بے نیازی کے دوروں پر اُسے یقین نہیں آیا۔ وہ سب کے سب بیک وقت ناکارہ نہیں ہو سکتے تھے!

اس لیے اُس نے زوڈانوک کے ساتھ مل کر اُن کی حرکات وسکنات پر اپنی عقابی نگاہیں مرکوز کر دیں۔ ایسی نگرانی جس کی صلاحیت وارڈروں میں نہ تھی۔ ٹینٹو نے محسوس کیا کہ لڑکے سگرٹ نوشی کے لیے ایک ہی کیبن انتخاب کرتے ہیں اور ہمیشہ صرف ایک ہی آدمی جاتا ہے، کوئی ہمراہ نہیں ہوتا۔ کہ اُن کے سکشن کا دروازہ ہمیشہ دن میں کنڈی سے بند رہتا ہے کہ دستک کے فوراً بعد وہ دروازہ نہیں کھولتے اور کہ ان میں سے چند گہری نیند میں مستغرق رہتے ہیں جیسے کہ رات کافی طویل نہ ہوتی ہو یا پھر یہ کہ واسکا بردخن اس کمرے سے تر بتر نکلتا ہے جس میں "بول و براز بند" رکھا جاتا تھا! تم کیا کرتے رہتے ہو ــــ؟" طبیعت نہانے کو چاہ رہی تھی!"

وہ کھدائی کر رہے تھے اُس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں! ٹینٹو پہلے ایک کے پاس گیا پھر دوسرے کے پاس، اور جانسہ دینے کی کوشش کی؛ اس معاملے میں مزید احتیاط برتنے کی ضرورت ہے لڑکو! اگر میں تمہیں کھدائی کرتے ہوئے دیکھ لوں تو کوئی بات نہیں لیکن اگر کسی مخبر نے بھانپ لیا تو کیا ہوگا؟"

بالآخر انہوں نے سر جوڑ کر نظرثانی کی اور ٹینٹو نیز تین دوسرے افراد کو اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ انہوں نے اس سے کہا کہ اس کمرے کا معائنہ کر کے بتاؤ کہ کیا کوئی سُراغ مل سکتا ہے۔ ٹینٹو نے دیوار اور فرش کے ایک ایک انچ کو جانچ کر پرکھ کر دیکھا لیکن اُسے کوئی مشکوک علامت نظر آئی! وہ اور تمام لڑکے بیحد مسرور ہوئے۔ خوشی سے کانپتا ہوا وہ اپنا کام کرنے کے لیے فرش کے نیچے کھسک گیا۔

زیرزمین شفنٹ اس طرح چلتی تھی: ایک آدمی لیٹ کر سامنے کی مٹی ہٹاتا تھا دُوسرا اس کے پیچھے سمٹ کر بیٹھتا اور چھوٹے چھوٹے کینوں اس کے تھیلوں میں مٹی بھرتا تھا۔ یہ تھیلے بطور خاص اسی کام کے لیے تیار کیے گئے تھے، تیسرا ہاتھ پاؤں کے بل بیٹھا ہوا اپنے کندھوں پر لگی ہوئی رسّیوں کے سہارے ان تھیلوں کو پیچھے کھینچتا تھا پھر فرش کے نیچے شیفنٹ پر لے جاتا تھا اور یکے بعد دیگرے انہیں اوپر سے لٹکائے جانے والے ہُک میں پھنسا دیتا تھا۔ چوتھا آدمی اوپر تھا جو تھیلے خالی کر کے نیچے پھینک دیتا تھا اور بھرے ہوئے تھیلے اوپر کھینچ لیتا تھا اُنہیں اُتار کر آہستگی کے ساتھ چلتا ہوا بالائی کمرے میں مٹی کو چہار جانب پتلی پرت کی شکل میں بکھیر دیا تھا۔ اور شفنٹ کے خاتمے پر اس مٹی پر جلی ہوئی لکڑیوں کی راکھ بچھا دی جاتی تھی جس کی وہاں چھت پر کمی نہ تھی یہ ٹولی شفنٹ کے درمیان اپنے کام بدل سکتی تھی لیکن ہمیشہ نہیں بدلتی تھی کیونکہ ہر آدمی، بیحد

تھکا دینے والا مٹی کھودنے کا کام اور اُسے ڈھونے کا کام نہیں کر سکتا تھا۔

پہلے پہل وہ ایک ساتھ دو تھیلے کھینچتے تھے لیکن پھر ان کی تعداد چار کر دی گئی۔ اس کام کے لیے انہوں نے چالاکی کے ساتھ باورچی سے ایک لکڑی کا تھال حاصل کر لیا جس پر بورے جا کر اوپر کھینچ لیے جاتے تھے۔ رسیاں اور بیلٹ پیچھے سے گردن تک آجاتے تھے اور پھر بغلوں کے نیچے چلے جاتے تھے۔ گردن میں اُن کی رگڑ سے خراش پڑ جاتی تھی، شانے درد کرنے لگتے تھے، گھٹنے چھل جاتے تھے ایک ہی پھیرے میں آدمی پسینے پسینے ہو جاتا تھا اور شفٹ کے خاتمے تک تو آپ پسینے کا لوٹا بھر لیجیے۔

کھودنے کے لیے بڑے بیڈھنگے انداز میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ ایک چھوٹے دستے کا بیلچہ تھا جسے وہ ہر بار تیز کرتے تھے۔ اس سے اُنہیں ایک سنگین کے گھاؤ جتنی گہرائی تک اُوپر سے نیچے کی طرف کھانچے تراشنے پڑتے تھے۔ خمیدہ ہو کر اپنی پشت پر تازہ کھدی ہوئی مٹی سے نکال کر وہ مٹی کے ڈھیلے بناتے تھے اور اُنہیں اُٹھا کر شانوں کے پیچھے پھینک دیتے تھے مٹی بعض اوقات پتھریلی ہوتی تو کبھی سخت اور چکنی۔ انہیں بڑے بڑے پتھروں کے چاروں طرف سے مٹی نکالنی پڑتی تھی اور سُرنگ میں جھک کر چلنا پڑتا تھا۔ آٹھ سے دس گھنٹے کی شفٹ میں سرنگ کی لمبائی میں دو میٹر سے زائد کا اضافہ نہ ہوتا تھا اور بعض اوقات تو کھدائی ایک میٹر سے بھی کم ہوتی۔ سب سے خراب بات یہ تھی کہ سُرنگ میں ہَوا کی قلت تھی، سر چکرانے لگتا، غشی کا عالم طاری ہو جاتا، اُتے ہونے لگتی تھی۔ اس لیے ابھی ایک اور مسئلہ بھی حل طلب تھا اور یہ تھا ہوا کی آمد و رفت کا بندوبست کرنا۔ ہوا کے لیے سُوراخ صرف اوپر کیے جا سکتے تھے، سرحدی باڑ کے اس سب سے خطرناک علاقے میں جس کی ہمیشہ نگرانی کی جاتی تھی۔ لیکن اس کے بغیر سانس لینا بھی دشوار تھا۔ انہوں نے اسٹیل کے ایک پروپیلر بلیڈ کا بندوبست کیا اور اس پر ایک آڑی چھڑ ٹھونک دی جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ انہیں بڑھئی کی طرح کافی محنت کرنی پڑی مگر انہوں نے باہر کی وسیع دنیا میں سُوراخ کر لیا۔ ہوا کا جھونکا آنے لگا اور سانس لینا آسان ہو گیا (جب سرنگ باڑ کے باہر اور کیمپ کے آگے نکل گئی تو انہوں نے ایک سوراخ بنا لیا)

وہ اپنے تجربات ایک دوسرے کو منتقل کر رہے تھے اور باہمی مشورہ کرتے تھے کہ کام مزید اچھی طرح کیسے ہو سکتا تھا؟ اور یہ حساب لگائے رکھتے تھے کہ اب کہاں تک پہنچ گئے ہیں؟

فرار کی سرنگ بنیادوں کی دیوار کے نیچے سے جاتی تھی اور اس کے بعد سیدھے راستے سے صرف وہاں مڑتی تھی جہاں پتھروں کی وجہ سے مجبوری ہو یا کھدائی میں نقص واقع ہوتا ہو۔ یہ نصف میٹر چوڑی اور نوے سینٹی میٹر بلند تھی اور اس کی چھت محراب دار تھی۔ اُن کے حساب کے مطابق اس کی چھت کی موٹائی ۲۔۱ یا ۴۔۱ میٹر تھی۔ سرنگ کے کنارے تختوں سے مضبوط کر دیے گئے تھے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھے، بجلی کے کئی بلب آویزاں کرتے رہے۔

اگر آپ اس کو سیدھے دیکھیں تو یہ زیرِ زمین ریلوے لائن جیسی تھی۔ کھاگ میٹرو!

اب تک سرنگ کئی درجن میٹر بن چکی تھی اور وہ سرحدی باڑ سے آگے کھدائی کر رہے تھے
اُنہیں اوپر گشت کرتے ہوئے پہریداروں کے بوٹوں کی چاپ سنائی دیتی تھی اور کتوں کی غراہٹ
اور بھونکنے کی آوازیں پاس سے سنی جا سکتی تھیں۔
اور اچانک..... ایک دن اچانک صبح کے معائنے کے بعد جب دن کی شفٹ والے نیچے جا چکے تھے اور ڈولی کے سخت قوانین کے، تصوروار ٹھہرانے والی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی، انہوں نے جیلروں کے ایک گروہ کو بیرکوں کی طرف آتے ہوئے دیکھا جن کے آگے آگے پستہ قد بدمزاج اعلیٰ افسر جیل لیفٹننٹ میچو فسکی تھا۔ مفرورین کے دل بیٹھ گئے۔ کیا ہم پکڑے گئے؟ کیا کسی نے ہمارا راز فروخت کر دیا؟ یا پھر یہ اتفاقی معائنہ ہے؟ احکامات گونجنے لگے: اپنا اپنا سامان اکٹھا کر لو! ان بیرکوں سے باہر آجاؤ۔ ایک ایک آدمی!"
احکامات کی تعمیل کی گئی۔ سب قیدیوں کو باہر کر دیا گیا اور تنگ سے گھومنے پھرنے کے احاطے میں بٹھا دیا گیا۔ اندر سے ہلکی ہلکی ٹھک ٹھک سنائی دے رہی تھی۔ وہ تختۂ خواب ہٹا رہے تھے! "اپنے اوزار لے کر یہاں آؤ!" میچوفسکی چیخا اور جیلروں نے اُن کے کلہاڑے اور کدالیں اندر کھینچ لیں۔ تختے اکھاڑتے ہوئے اُن کی کھڑکھڑاہٹ اور کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔
یہ انجام ہوتا ہے مفرورین کا! اُن کی تمام ہوشیاری، اُن کی محنت، اُن کی اُمیدیں، اُن کا جوش وخروش ــ سب کچھ اکارت ہو گیا علاوہ بریں پھر تعزیری جیل، زدوکوب، تفتیش اور نئی سزائیں بھی دی جائیں گی....
لیکن میچوفسکی یا کوئی بھی جیلر اپنے ہاتھ وحشیانہ مسرت کے ساتھ لہراتا ہوا باہر نہیں دوڑا۔ وہ پسینے میں تربتر غبار اور مٹی جھاڑتے ہوئے، ہانپتے ہوئے آئے۔ وہ اس بات پر ذرا بھی مسرور نہ تھے اُنہوں نے یہ چیتھڑوں والا کام فضول کیا۔ بے دلی کے ساتھ جاری کردہ حکم ملا۔ "ایک ایک کر کے اندر آؤ!" ذاتی سامان کی تلاشی لی گئی۔ قیدی بیرکوں میں پلٹ آئے۔ کیسا کباڑا ہو گیا! فرش کئی مقامات پر اُکھاڑ دیا گیا تھا (جہاں تختوں پر کیلیں نہیں جڑی ہوئی تھیں یا صاف دراڑیں تھیں) ہر سیکشن میں ہر چیز اِدھر اُدھر پھینک دی گئی تھی اور جھلاہٹ میں تختۂ خواب پلٹ دیے گئے تھے۔ صرف "مہذب سیکشن" کو ویسا ہی چھوڑ دیا گیا تھا!
رازسے ناواقف قیدی بیحد بوکھلائے۔ "یہ کتے خاموش کیوں نہیں بیٹھ سکتے؟ آخر انہیں کس چیز کی تلاش ہے؟"
فرار کی کوشش کرنے والوں نے اب محسوس کیا کہ فرش کے نیچے مٹی کے ڈھیر نہ لگا کر انہوں نے کتنی دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ تختوں کی درمیانی دراڑوں کے توسط سے فوراً پکڑ میں آجاتے۔ بالائی چھت پر کوئی نہیں چڑھا تھا کیونکہ اُوپر سے تو کوئی پر لگا کر ہی فرار ہو سکتا تھا! پھر وہاں ہر چیز کوئلے کی راکھ سے اچھی طرح ڈھک دی گئی تھی۔
کتوں کی قوتِ شامہ اس کھیل کا سُراغ نہ پا سکی۔ کتنی خوشی کی بات ہے! آپ عزم راسخ

کے ساتھ کام کا آغاز کریں اور اپنے اعصاب باریکی سے نگاہ رکھیں تو یقیناً آپ کی محنت کا پھل ملے گا۔
اب ہمیں یقین ہے کہ ہم اپنا کام مکمل کر لیں گے۔ چاروں طرف کھدی ہوئی خندق تک پہنچنے کے لیے صرف چھ یا آٹھ میٹر اور رہ گئے ہیں (آخری چند میٹر خاص الخاص احتیاط کے ساتھ کھودتے تھے تاکہ سرنگ خندق کی سطح پر نکلے نہ اُس سے اوپر ہو نہ نیچے۔)

توپھر، کونو والوف، موُنیا توف، گاوزیف اور ٹیلو نے اب تک ایک منصوبہ تیار کر لیا تھا جس پر بقیہ بارہ لوگ متفق تھے۔ فرار کا کام رات کو تقریباً دس بجے ہو گا جبکہ شام کا معائنہ پورے کیمپ میں مکمل ہو چکے گا، جیلر اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں گے یا اسٹاف کی جھونپڑی میں ہوں گے۔ سابقہ سنتری برجیوں سے ہٹ گئے ہوں گے اور نئے پہریدار اپنی جگہ آ گئے ہوں گے۔

وہ یکے بعد دیگرے زیرِ زمین سرنگ میں اتریں گے۔ آخری شخص کیمپ کے میدان پر کیبن سے اُس وقت تک نگاہ رکھے گا جب تک بقیہ لوگ نیچے ہوں گے۔ بعد ازاں وہ اور آخر سے پہلے والا آدمی اسکرٹنگ بورڈ کے ہٹائے جانے کے قابل حصے کو چور دروازے کے تختے پر مضبوطی کے ساتھ جڑ دیں گے تاکہ جب وہ اسے اندر سے دھکیلیں تو اسکرٹنگ بورڈ اپنی جگہ فٹ بیٹھ جائے۔ چوڑی پیشانی والی کیل اس وقت تک نیچے کھینچی جائے گی جب تک کہ وہ بالائی سطح سے چسپاں نہ ہو جائے۔ اور ان سب کے علاوہ چور دروازے کے جوڑنے کے لیے فرش کے بولٹ تیار ہوں گے تاکہ اگر کوئی اُسے اوپر سے اکھاڑنے کی کوشش کرے تو یہ ذرّہ بھر بھی نہ ہل سکے۔

ایک بات اور۔ فرار ہونے سے پیشتر وہ برآمدے کی ایک کھڑکی کی سلاخیں نکال دیں گے۔ صبح کے معائنے کے وقت سولہ افراد کو غائب پا کر وہ فی الفور یہ نتیجہ نکال سکیں گے کہ وہ سرنگ تیار کر کے باہر نکل گئے ہیں بلکہ وہ لپک کر احاطے میں تلاش کریں گے اور خیال کریں گے کہ وہ سپلن بیرک کے قیدی مجبوروں کی خبر لینے گئے ہیں۔ وہ دوسرے کیمپ کے علاقے بھی دیکھیں گے اور سوچیں گے کہ مفرورین دیوار پھاند کر وہاں پہنچ گئے ہوں گے۔ یہ ایک خوبصورت کام تھا! وہ سرنگ تک کبھی نہ پہنچ سکیں گے۔ کھڑکی کے نیچے کوئی پیروں کے نشانات نہیں ہیں اور سولہ آدمی نکل گئے انہیں فرشتے آسمان میں اڑا لے گئے!

وہ رینگ کر چاروں طرف کا احاطہ کرنے والی خندق میں نکل آئیں گے پھر وہ اس کی سطح پر رینگتے ہوئے برجیوں سے آگے نکل جائیں گے (سرنگ سے نکلنے کا راستہ برجی کے بہت قریب تھا) وہ یکے بعد دیگرے سڑک پر آئیں گے اور چار چار کے بعد تھوڑا تھوڑا وقفہ دے کر نکلیں گے تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو اور انہیں چاروں طرف کا جائزہ لینے کے لیے وقت مل جائے (آخری آدمی ایک اور حفاظتی تدبیر کرے گا وہ نکلنے کے سوراخ کو باہر سے ایک لکڑی کے ڈھکن سے بند کر دے گا جس پر مٹی تھپی ہوئی ہو گی اور ڈھکن کو اپنے جسم کے بوجھ سے دبا کر فٹ کر دے گا۔ اور پھر اسے مٹی سے ڈھانک دے گا تاکہ صبح خندق کی طرف سے بھی کسی سرنگ کا سراغ لگانا ناممکن نہ رہ جائے۔)

وہ ایک ایک دو دو کر کے بستی میں اکٹھا ہو جائیں گے اور بلند آواز میں بے فکری کے انداز میں ہنسی مذاق کرتے رہیں گے اگر انہیں روکنے کی کوشش کی گئی تو وہ سب مل کر اس کی مدافعت کریں گے۔ ضرورت ہوئی تو چاقوؤں سے ....

سب کے یکجا ہونے کا مقام ایک ریلوے کراسنگ طے پایا جس پر کافی تعداد میں موٹروں کی آمد و رفت رہتی تھی یہاں سڑک ریلوے لائن کو قطع کرتی تھی وہاں سڑک پر چڑھائی تھی۔ وہ سب قریب ہی زمین پر نگاہوں سے بچ کر لیٹ جائیں گے۔ کراسنگ ناہموار تھی (انہوں نے کام پر جاتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور اس پر چل چکے تھے) سلیپر پرانے انداز میں لگائے گئے تھے اور لاریاں خواہ وہ کوئی ڈھو رہی ہوں یا خالی ہوں۔ اس پر سے بمشکل رینگ کر گزرا کرتی تھیں۔ دو آدمی اس وقت کسی لاری کو روکنے کے لیے ہاتھ اٹھائیں گے جب وہ کراسنگ عبور کر رہی ہو اور دونوں طرف سے کیبن کے قریب پہنچیں گے۔ وہ لفٹ کے لیے التجا کریں گے۔ رات میں ڈرائیور عام طور پر تنہا ہوتے ہیں اگر وہ تنہا ہوا تو فوراً اپنے چاقو نکال لیں گے آگے بڑھ کر درمیان میں بیٹھنے کو مجبور کریں گے اور والسکاریز کوف اسٹیرنگ سنبھال لے گا۔ بقیہ سب پچھلے حصے میں کود جائیں گے اور برق رفتاری کے ساتھ آگے پا[illegible] کی جانب بڑھ جائیں گے۔ وہ چند ہی گھنٹوں میں یقیناً ۱۳۰ یا ۱۴۰ کلو میٹر کا فاصلہ طے کر لیں گے اور اس طرح طوفان کی آمد سے قبل دریا کا رخ موڑ [illegible] علاقوں سے نکل گئے تھے تو انہوں نے اپنی آنکھیں بند نہیں رکھی [illegible] لاری کو چھوڑ دیں گے اور کشتی سے [illegible] مختلف ٹولیوں میں منقسم ہو جائیں گے اور علیحدہ علیحدہ اپنی اپنی راہیں لیں گے! [illegible] گوداموں میں منتقل کی جا رہی تھی اور تمام سڑکیں لاریوں سے اٹی پڑی تھیں۔

وہ ۶ر اکتوبر کو کام مکمل کرنے والے تھے۔ دو دن پیشتر ان میں سے چار کو، جن میں منفردین کے دو اراکین مینو اور وولوڈیا کریوشن (جو چور تھا) بھی شامل تھے، بیرک سے تبدیل کر دیا گیا۔ انہیں علیل ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ وہ کسی طرح وہاں مزید قیام کر سکیں لیکن افسر انچارج نے دھمکی دی کہ خواہ کچھ ہو میں ہر حال میں انہیں ہتھکڑی پہنا کر بھیج دوں گا! انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کے زیادہ اصرار کرنے پر شبہ پیدا ہو گا چنانچہ ان دونوں نے اپنے دوستوں کے لیے اپنے مفادات کو قربان کر دیا۔

اس طرح ٹینو کو سرنگ کھودنے والی پارٹی میں شمولیت کے اصرار سے کوئی فائدہ نہیں ہوا اس کی جگہ تیرھواں رنگ روٹ اس کا مددگار زڈانوک ہو گا جو اب بہت ہی سیماب صفت اور غیر مستقل مزاج ہو گیا تھا۔ اسٹیپن کو نو واٹوف کے لیے وہ ذہن نحس صاحب اس نے ٹینو کو اپنا ہمراز بنایا تھا۔

انہوں نے کھدائی مکمل کر لی اور ٹھیک مقام پر جا کر ختم کی۔ مونیا نوف نے کوئی غلطی نہیں

کا لیکن زمین پر برف تھی اس لیے انہوں نے اپنا فرار اس وقت تک کے لیے ملتوی کر دیا جب تک موسم کچھ خشک نہ ہو جائے۔

واکتوبر کو انہوں نے ہر کام اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق صحیح طور پر انجام دیا پہلے چار کامیابی کے ساتھ نکل گئے، کوزوالوف، رزکوف، موٹیا نوف اور وہ پولش انجینئر کے کاموں میں منصوبے میں اُس کی معاونت کر رہا تھا۔

لیکن اس کے بعد خندق میں رینگ کر نکلنے والا آدمی بدنصیب پستہ قامت کو بیازڈ الوک تھا۔ بے شک یہ اُس کی غلطی نہ تھی کہ پیروں کی آہٹ دُور کے بجائے بالکل سر کے اوپر سے سنائی پڑ گئی لیکن اُسے تحمل سے کام لینا تھا لیٹ جاتا اور ایسا بن جاتا کہ کسی کی توجہ اس کی طرف مبذول ہی نہ ہوتی اور جب پیروں کی آہٹ دُور چلی جاتی تو پھر رینگتا ہوا آگے چلا جاتا۔ ایسا کرنے کی بجائے اُس نے اپنی فطری چالاکی کے تحت سر نکال کر دیکھا کہ اُوپر کون چل رہا ہے۔

تیز طرار جوئیں کندھے پر سب سے پہلے آتی ہیں لیکن اس احمق جوں نے اپنے ہمراہ ایک ایسی مفرور ٹولی کو بھی غارت کر دیا جو اپنے منصوبے کی معقولیت کے اعتبار سے اتنی ہی ممتاز تھی جتنی اشتراکِ عمل کی اپنی غیر معمولی صلاحیت کے اعتبار سے۔ اُس نے چودہ لمبی اور طویل زندگیوں کو برباد کر دیا جن کی راہیں اس فرار میں ایک دوسرے سے جُڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کی زندگی میں اس کوشش کا اہم مقام تھا اور اس کے بغیر اُن کے ماضی اور مستقبل بے معنی تھے۔ اُن میں سے ہر ایک پر لوگ اب بھی کہیں نہ کہیں انحصار کرتے تھے۔ بیویاں، بچے اور نا آفریدہ بچے۔ لیکن ایک جوں نے اپنا سر اُٹھایا اور پورا منصوبہ چوپٹ ہو گیا!

اوپر سے گزرنے والا ڈپٹی گارڈ کمانڈر تھا اُس نے جوں کو دیکھا، چیخا اور گولی چلا دی اور اس طرح پہرے دار، جن کے ذہنی معیار سے یہ منصوبہ بہت بلند تھا اور جنہیں اس کے متعلق بھنک تک نہ پڑی تھی، ہیرو بن گئے۔ اور میرا قاری، مارکسی مورّخ، ورق کو اپنے رول سے تھپتھپاتا ہے اور اپنے فاخرانہ لہجے میں دریافت کرتا ہے:

"ا ۔ ۔ ۔ ۔ ل ۔ لیکن تم بھاگ کیوں نہیں گئے۔ تم نے بغاوت کیوں نہیں کی؟"

مفرورین نے گریٹنگ کو پھر جما دیا تھا اور اب اُنہیں دھیرے دھیرے تکلیف اُٹھاتے ہوئے واپس رینگنا پڑا۔

اس قسم کی مایوس کن اور بدحواس کر دینے والی صورتحال سے کسے دوچار ہونا پڑا ہو گا؛ اتنی عظیم الشان کوششوں کو اتنی ذلت آمیز پستی میں گرتے ہوئے دیکھنا پڑا ہو گا؟

وہ پلٹ آئے، سرنگ کی بجلیاں بند کیں، گریٹنگ کو اس کے ڈھانچے میں فٹ کیا۔

تھوڑی ہی دیر میں تمام ڈسپلن بیرکوں میں کیمپ کے افسروں، ڈویژن کے عہدے داروں، پہریدار فوجیوں اور جیلروں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ تمام قیدیوں کی ریکارڈ سے چیکنگ کی گئی اور انہیں سنگین جیل میں ہانک دیا گیا۔

لیکن انہیں سرنگ کا پتہ نہ چل سکا! (اگر سب کچھ منصوبے کے مطابق عمل میں آتا تو انہیں کتنے دنوں تک اس کی تلاش کرنی پڑتی؟) اس جگہ کے قریب جہاں زوڈانوک نے اپنے آپ کو ظاہر کر دیا تھا، انہیں ایک نصف بھرا ہوا سوراخ نظر آیا لیکن جب وہ بیرکوں کے نیچے سرنگ میں گئے تب بھی اُن کی سمجھ میں نہ آسکا یہ لوگ پہنچ کس طرح گئے؟ انہوں نے مٹی کہاں چھپائی؟ لیکن ہنڈب سیکشن میں چار افراد کم پائے گئے اور انہوں نے بقیہ آٹھ کو سنگدلی کے ساتھ زدوکوب کیا جو کور مغزوں کے لیے حقیقت کو جاننے کا سب سے آسان راستہ ہے۔

مزید پوشیدہ رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی؟.... بعد ازاں تمام حفاظتی دستہ اور تمام جیلروں کو گائیڈ کے ہمراہ اس سرنگ کا معائنہ کرایا گیا۔ ایجی بسٹز کیمپ کا بڑی توند والا کمانڈینٹ میجر ٹیکسمیلکو گلاگ ہیڈ کوارٹر پر دیگر علاقائی کمانڈنٹوں کے سامنے لن ترانی کیا کرتا تھا "میرے ہاں آکر سرنگ ضرور دیکھو.... میٹرو (زمین دوز ریل) جیسی....! لیکن ہم..... اور ہماری نگرانی.....؟

نہیں صرف ایک چھوٹی سی جڑن....

—— x ——

شور وغل نے اولیں چار کو بھی ریلوے کراسنگ پر پہنچنے سے روک دیا۔ منصوبہ غارت ہو گیا تھا۔ وہ سڑک کی دوسری سمت ایک ویران جائے کار کی باڑ پر چڑھے اس کو پار کیا، دوبارہ باڑ پر چڑھے اور اسٹیپی میں نکل گئے۔ اب انہوں نے بستی میں پہنچ کر لاری حاصل کرنے کا ارادہ بدل دیا کیونکہ آبادی پہلے ہی گشتی پولس سے بھر گئی ہو گی۔

جیسا کہ ایک سال پہلے ٹینئر کے ساتھ پیش آیا تھا یہ لوگ بھی جلد ہی رفتار اور خود اعتمادی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

وہ جنوب مغرب کی طرف روانہ ہوئے، سیمی پلٹنسک کی جانب۔ اُن کے پاس نہ اشیائے خورد و نوش تھیں نہ پاپیادہ اتنے طویل سفر کے لائق طاقت تھی۔ گزشتہ دو ایک دن کے دوران اُنہوں نے سُرنگ کا بقیہ کام مکمل کرنے میں اپنی تمام طاقت لگا دی تھی۔

اپنے فرار کے پانچویں دن اُنہوں نے ایک یُرٹ میں جھانک کر دیکھا اور قازقوں سے کچھ کھانے کو مانگا۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ انہوں نے انکار کر دیا اور ان فاقہ کش لوگوں پر گولی چلائی (کیا یہ روایت اسٹیپی کے ان چرواہوں میں نسل در نسل چلی آتی ہے؟ اور اگر نہیں تو اس کی داغ بیل کیسے پڑتی!)

اسٹیپن کونووالوف نے ایک قازق پر حملہ کر دیا۔ بندوق کے مقابلے پر چاقو ـــــ اور بندوق نیز کچھ اشیائے خوردنی اس سے چھین لیا۔ وہ اور آگے بڑھے قازقوں نے گھوڑوں پر سوار ہو کر اُن کا تعاقب کیا اور ارتش ندی کے پاس انہیں جا لیا اور ایک عملہ دستے کو اپنی معاونت کے لیے طلب کیا۔

اس کے بعد اُن کا محاصرہ کر لیا گیا، ان کو مار پیٹ کر لال بھُرتہ بنا دیا گیا اور اس کے بعد ... اس کے بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے....؟

—— × ——

اگر کوئی شخص میرے سامنے یہ ثابت کر سکے کہ انیسویں یا بیسویں صدی کے روسی انقلاب پسندوں کو فرار کی کسی بھی کوشش میں اتنی دشواریاں پیش آئیں، باہر والوں کی حمایت کی اتنی کمی تھی آس پاس کے عوام نے اتنا مخاصمانہ رویہ اختیار کیا تھا اور پھر گرفتار شدہ لوگوں سے اس قسم کے غیر قانونی اُنتقام لیے گئے تھے — تو آئے سامنے آکر ثابت کرے!
اور اس کے بعد اگر وہ کہہ سکتے ہیں تو کہیں کہ ہم نے مدافعت نہیں کی۔

نواں باب

ٹامی گن والے لڑکے

کیمپ پر سیاہ کف والے لمبے اوور کوٹ میں ملبوس پہرے دار پہرہ دیتے تھے ـــ اور پہرے داروں کی نگرانی پر سرخ فوج کے سپاہی مامور تھے۔ پھر ان سپاہیوں پر سینئر ریزرو سٹوں کا پہرہ ہوا کرتا تھا اور سب کے آخر میں وہ تندرست و توانا بچے تھے جن کی پیدائش پانچ سالہ منصوبے کے زمانے میں ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے جب اپنی عمدہ ٹامی گنیں سنبھالی تھیں اور ہم پر نگرانی رکھنے کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ اس وقت تک انھوں نے کسی جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔

دن میں دو بار، ہر مرتبہ ایک گھنٹے کے لیے ہم اور وہ خاموش اور خطرناک بھائی چارے کی ڈور میں بندھے ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک ہمیں جان سے مار دینے کا حق رکھتا تھا۔ ہر صبح ہم بے زاری کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتے تھے ہم سڑک پر اور وہ کیمپوں پر ایسے مقامات کی طرف جہاں خود جانا چاہتے تھے نہ ہم۔ ہر شام کو ہم لوگ تیز قدم اٹھاتے تھے کیوں کہ نہ ان کا کوئی اصل گھر تھا نہ ہمارا، اس لیے بارڑے ہی ہمارے گھر تھے۔

ہم چلے تھے لیکن ان کے بھیڑ کی کھال سے تیار کردہ کوٹ اور ٹامی گن پر کبھی نظر نہیں ڈالتے تھے۔ ان کا ہم سے کیا تعلق تھا؟ وہ تمام وقت ہماری سیاہ قطاروں کو نظر میں رکھ کر چلتے تھے۔ ضابطے میں درج تھا کہ وہ ہر وقت ہماری نگرانی کریں زبان ان کا فرض تھا، کوئی غلط اقدام، کوئی غلط حرکت۔ انھیں گولی سے روک دینی چاہیے۔

وہ ہمارے بارے میں تلخی کے ساتھ سوچتے تھے۔ ہماری سیاہ جیکٹیں، ہماری اسٹالن فر* کی بنی ہوئی سرمئی ٹوپیاں، ہمارے فیلٹ کے عجیب بوٹ جو تین سردیاں مکمل کر چکے ہیں اور جن کے چار پیندے بدل چکے تھے، ہماری نمبروں والی پٹیوں سے آراستہ عجیب و غریب پوشاک۔ ظاہر ہے کہ مہذب لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کبھی نہیں کیا جائے گا۔

کیا یہ مقام حیرت تھا کہ انھیں ہماری صورت سے بھی نفرت تھی۔ بالکل یہی جذبہ ابھارنا ان کا مقصد تھا۔ ان کی تنگ جھونپڑیوں سے بستی کے آزاد باشندے، خاص کر اسکول کے بچے اور ان کی استانیاں اس وقت ہمارے کالموں پر دہشت زدہ نظریں ڈالتے تھے۔ جب ہم کو شاہراہ پر لے جایا جاتا تھا۔ وہ ظاہر کرتے تھے کہ انھیں اس بات کا کتنا ڈر تھا کہ ہم فاشسٹ شیطان کی اولاد اچانک بالکل بہک سکتے تھے اور آمنے سامنے صورت میں ساتھ چلنے والے پہرے داروں کو دبا لیں گے اور رہزنی، زنا بالجبر، آتش زنی اور قتل عام کرتے ہوئے چاروں طرف دور دور بکھر دیں گے۔ ظاہر تھا کہ جنگلی جانوروں میں اس کے سوا اور کوئی خواہش پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور بستی کے باشندوں کی ان جنگلی جانوروں سے حفاظت پہرے دار فوجیوں کی وجہ سے ہی ممکن تھی

عظیم پہریدار فوجی! کانوائے گارڈ کا ایک سارجنٹ ہمارے بنائے ہوئے کلب میں کسی اسکول کی استانی کو رقص کی دعوت دے کر چمکدار زرہ بکتر والے نائٹ کی طرح محسوس کر سکتا تھا۔

یہ لڑکے حصار سے اور پہرے کی برجیوں سے تمام وقت ہم پر نگاہ رکھتے تھے۔ لیکن انھیں ہمارے بارے میں کچھ واقفیت حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ انھیں صرف متنبہ کیے بغیر گولی چلانے کا اختیار دیا گیا تھا۔

اگر کسی شام کو وہ ذرا ہماری جھونپڑیوں میں آئے ہوتے، ہمارے تختۂ خواب پر بیٹھے ہوتے اور انھوں نے یہ سنا ہوتا کہ یہ بوڑھا شخص، یا وہ دوسرا ادھر بیٹھا ہوا معمر شخص جیل میں کیوں ہے! تو اُن برجیوں پر پہرہ دینے والا ایک بھی آدمی نہ ہوتا اور ان مانی گنوں سے گولیاں کبھی نہ برستیں۔

لیکن انتظامیہ کی ساری چالاکی اور قوت اس بات میں مضمر تھی کہ ہمارا خطرناک تعلق ناواقفیت سے جڑا ہوا تھا۔ ہمارے تئیں وہ جو بھی ہمدردی برتتے اسے حکومت سے بغاوت سمجھ کر لائق تعزیر قرار دیا جاتا۔ ہم سے گفتگو کرنے کی ان کی خواہش کو مذہبی قسم کی خلاف ورزی کہا جاتا۔ پھر ہم سے بات کرنے میں کیا تُک تھی جب کہ سیاسی اتالیق متعینہ اوقات میں آکر، جن عوام دشمنوں کی وہ نگرانی کر رہے تھے ان کے سیاسی اور اخلاقی کردار پر تقریریں کرتا تھا۔ وہ تفصیل کے ساتھ بار بار ایک ہی بات کو دہراتا ہوا واضح کرتا تھا کہ یہ کائیاں کتّے کتنے خطرناک ہیں اور حکومت پر ایک بوجھ ہیں (اس وجہ سے انھیں زندہ بھوت سمجھ کر گولی کا نشانہ بنانے میں اور مزا آنے لگتا تھا) وہ ان کے سیاہ کرتوتوں کے متعلق کچھ ٹائپ شدہ کاغذات پڑھ کر سناتا تھا جن کے لیے اوسک وٹز کی تمام بھٹیاں بھی سزا دینے کے لیے ناکافی تھیں۔ ان کا مصنف وہ قریب ہی کھمبے پر بجلی درست کرنے والے الیکٹریشین کو یا اس نجار کو بتاتا تھا جسے کچھ فوجیوں نے ناعاقبت اندیشی کے تحت ایک الماری بنانے کا آرڈر دینے کی بات سوچی تھی۔

سیاسی اتالیق کبھی اپنی بات کو کاٹنے والی بات نہیں کہتا تھا، کبھی غلطی نہیں کرتا تھا۔ وہ لڑکوں کو یہ بھی نہیں بتائے گا کہ کچھ لوگ یہاں صرف اس لیے مقید ہیں کہ وہ خدا کو مانتے ہیں یا صرف اس لیے کہ وہ حقیقت کے متلاشی ہیں یا صرف اس لیے کہ وہ انصاف پسند ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی معقول وجہ کے بغیر مقید ہیں۔

انتظامیہ کی ساری قوت اس بات میں ہے کہ ایک آدمی دوسرے سے براہ راست گفتگو نہیں کر سکتا۔ صرف افسر کے توسط سے کر سکتا ہے۔

ان لڑکوں کی تمام قوت ان کی لاعلمی میں چھپی ہوئی ہے۔

ان کیمپوں کی قوت کا انحصار انھیں لڑکوں پر ہے۔ شانے پر سرخ فیتے لگانے والے لڑکے! نگرانی کی برجیوں سے قتل کرنے والے۔ معذورین کا شکار کرنے والے!

یہاں ایک ایسا سیاسی سبق پڑھایا جاتا تھا جو ایک پرانے کانوائے گارڈ (جو نمبر دو بلاک میں تھا) کی یاد تازہ کرتا تھا۔ لیفٹنٹ سموشن ایک دراز قد اور تنگ شانوں والا آدمی تھا اور اس کا سر کنپٹیوں کے اوپر سے چپٹا تھا جس کی وجہ سے وہ سانپ سے مشابہ نظر آتا تھا۔ وہ ہلکے رنگ کے بالوں والا اور ابروؤں سے محروم آدمی تھا ہمیں معلوم تھا کہ ماضی میں اس نے لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے گولیاں ماری تھی۔ اب وہ سیاسی اتالیق تھا۔

فاشسٹ
اور خشک آواز میں یہ الفاظ دہرایا کرتا تھا۔ عوام کے دشمن، جن کی تم نگرانی کرتے ہو، ویسے ہی ہیں جیسے تیت
غلاظت۔ ہم مادرِ وطن کی طاقت اور سزا دینے والی تلوار کی علامت ہیں اور ہمیں سخت بننا چاہیے۔ یہاں جذبا
کا موقع نہیں ہے، رحم کی گنجائش نہیں ہے۔"

اس مہیج پر یہ لڑکے ڈھالے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ مغرور کے نیچے گر جانے پر اس کے سر پر ٹھوکر مارنا
مزدوری سمجھتے ہیں۔ جو لڑکے ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے۔ سفید بالوں والے بوڑھے کے منہ سے روٹی کا ٹکڑا
ٹھوکر مار کر دور پھینک دیتے ہیں، جو کسی لاری کے تختوں پہ دست وپابستہ مغرور کو لاپرواہی سے دیکھ سکتے
ہیں، اس کا چہرہ خون سے لت پت ہو رہا ہے، اس کا سر زخمی ہے لیکن وہ سنگدلی کے ساتھ اسے دیکھتے
رہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ مادرِ وطن کی تعزیری تلوار ہیں اور مغرور ایک مبینہ امریکی کرنل ہے۔

اسٹالن کی وفات کے بعد میں مستقل جلاوطنی میں بسر کرتا ہوا تاشقند کے ایک عام آزاد شفاخانے
میں بحیثیت مریض مقیم تھا اچانک ایک دن میں نے ایک مریض کو جو نوجوان ازبک تھا۔ اپنے پڑوسیوں کو اپنی
فوجی ملازمت کی روداد سناتے ہوئے پایا۔ اس نے کہا کہ ہمارے یونٹ نے جانوروں اور قصائیوں پر پہرا دیا
تھا۔ ازبک نے تسلیم کیا کہ کانوائے کے پہریداروں کو خوراک کچھ قلیل مقدار میں ملتی تھی اور انھیں اس بات
پر غصہ آتا تھا کہ قیدیوں کو بھی کان مزدوروں کی طرح راشن فراہم کیا جاتا تھا (بشرطیکہ وہ متعینہ معیار کا
۱۲۰ فیصد کام کریں) جو بچے فوجیوں کے راشن سے کچھ زیادہ کم نہ ہوتا تھا۔ انھیں اس بات پر طیش آتا تھا۔
کانوائے گارڈ کا خون برجیوں پہ سردیوں میں پہرا دیتے ہوئے منجمد ہو جاتا تھا (سر سے پیر تک بھیڑ کی کھال
کا اوورکوٹ پہننے کے باوجود، یہ سچ ہے) جب کہ عوام کے دشمن ایک بار کام کی جگہ داخل ہو جانے کے بعد
گرم رکھنے والے جھونپڑوں کے آس پاس ہی رہتے ہیں (نگرانی کی بُرجی سے اس نے یقیناً دیکھا ہوگا، کہ
ایسی بات نہیں تھی) اور وہاں تمام دن سوتے رہتے ہیں (وہ سنجیدگی سے یہ سوچا کرتا ہوگا کہ اپنے
دشمنوں کے ساتھ حکومت کا رویہ ملائم تھا)

یہ خاصا دلچسپ موقع تھا کسی اسپیشل کیمپ کو ایک کانوائے گارڈ کی نگاہوں سے دیکھنے کا ــــ میں
نے پوچھا کہ وہ کس قسم کے کیڑے تھے اور کیا میرے ازبک دوست نے اُن سے خود بات کی تھی اور بلاشبہ
اس نے مجھے مطلع کیا کہ یہ تمام باتیں اسے سیاسی افسر سے معلوم ہوئی تھیں اور ان لوگوں کو سیاسی تربیت
کے دوران لیکچروں میں انھیں کیسے کیسے سنائے گئے تھے اور قیدیوں کے تمام دن سوتے رہنے کے بارے
میں اس کے کینہ پرور غلط تصورات کو افسران نے تائید میں سر ہلا کر زیادہ پختہ بنا دیا تھا۔
لعنت ہو تم پر کہ چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو جھوٹی باتیں سکھاتے ہو۔ اچھا ہوتا کہ تم کبھی پیدا ہی
نہ ہوئے ہوتے ـــــ!

ازبک نے یہ بھی بتایا کہ ایم۔ وی۔ ڈی کے فوجی دستوں میں پرائیویٹ کام کرنے والوں کو ۲۳۰
روبل ماہانہ مشاہرہ ملتا تھا (جتنا کہ اسے فوج میں دیا جاتا) اس سے بارہ گنا زیادہ! اتنی کشادہ قلبی کس
لیے؟ شاید اس کی ملازمت بارہ گنا زیادہ مشکل تھی!) اور قطبی علاقوں میں ایک خاص دور تک ملازمت
کے لیے چار سو روبل نیز تمام اخراجات بذمہ سرکار!

آگے چل کر اس نے ہمیں کچھ واقعات سنائے۔ مثلاً ایک مرتبہ اس کا ایک ساتھی کا نوائے میں مارچ کر رہا تھا اور اسے گمان گزرا کہ کوئی قیدی کام سے فرار ہو رہا ہے۔ اس نے بندوق کی لبلبی دبائی اور ایک ہی وقت میں پانچ قیدیوں کو ختم کر دیا۔ چونکہ بعد میں دوسرے پہرے داروں نے شہادت دی کہ کام پرامن طریقے پر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس لیے اس سپاہی کو ہولناک سزا دی گئی۔ پانچ لوگوں کا قتل کر دینے کے جرم میں اسے پندرہ دن تک نظر بند (بلاشبہ آرام دہ گارڈ ہاؤس میں) رکھا گیا)

لیکن اس مجمع الجزائر کے کس باشندے کے پاس سنانے کے لیے اس قسم کی داستانیں نہیں ہیں۔ وہاں اصلاحی مشقتی کیمپ میں ہم ان میں سے کتنے بہت سے لوگوں کو جانتے تھے۔ ایک کام کی جگہ پر جہاں باڑ نہیں تھی۔ بلکہ ایک نادیدہ حد قائم کر دی گئی تھی۔ ایک فائر کی آواز گونجی اور ایک قیدی مردہ ہو کے گر پڑا۔ وہ سرحد کے اوپر چلا گیا تھا۔ ان لوگوں کے بیان کے مطابق۔ اس نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا ہوگا۔ ملحوظ رہے کہ سرحد نادیدہ تھی لیکن کوئی بھی جلدی سے جانچ کرنے کے لیے نہیں جائے گا۔ کیونکہ اسے خوف ہے کہ وہ بھی کہیں مار گرایا جائے گا۔ کوئی کمیشن اس کی تفتیش کرنے کے لیے نہیں آئے گا کہ مرنے والے کے قدم کس جگہ تک پہنچے تھے۔ لیکن شاید اس کا قدم سرحدی لائن پر پڑ گیا ہو۔ آخر ش سنتری اس جگہ کی نگرانی کر رہے تھے۔ جب کہ قیدیوں کو دوسرے کام کرنے تھے۔ زیادہ سے زیادہ اصول پسند قیدی کے، جو اپنے کام کے سوا کچھ نہیں سوچتا، اس طرح مارے جانے کا امکان سب سے زیادہ تھا نو چیکار سٹیشن (اوزرلاگ) پر ایک گھاس کاٹنے والا قیدی دو تین قدم کے فاصلے پر گھاس دیکھتا ہے اور ایک کفایت شعار دہقان کی طرح اسے اس طرف کھینچنے کا فیصلہ کرتا ہے — فائر! اور سپاہی کو ملتی ہے..... ایک ماہ کی رخصت!

کبھی کوئی خاص پہرے دار کسی خاص قیدی سے خفا ہے (کیوں کہ اس نے اس کا کوئی کام کرنے سے انکار کر دیا ہے یا جو چیز بنانے کا حکم دیا گیا تھا وہ تیار نہیں کی) اور وہ گولی مار کر اس سے انتقام لیتا ہے۔ بعض اوقات یہ کام دھوکا دے کر کیا جا رہا ہے۔ پہرے دار قیدی کو سرحد کے پار سے کوئی چیز لانے کو کہتا ہے۔ قیدی کوئی شبہ کیے بغیر چلا جاتا ہے۔ اور پہرے دار اسے گولی سے اڑا دیتا ہے یا شاید وہ اس کی طرف سگریٹ اچھالتا ہے — "لے سگرٹ پی لے"۔ قیدی کے لیے سگریٹ بھی ایک طعمۂ حرص ہے۔ اس کی زندگی اتنی ہی حقیر ہوتی ہے۔

وہ گولیاں کیوں مارتے ہیں؟ بعض اوقات اس کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ مثلاً کینگر میں ایک انتہائی منظم کیمپ میں، دن دہاڑے، جب کسی کے فرار کا شمہ برابر امکان بھی نہ تھا۔ مغربی یوکرین کی ایک لڑکی لیڈانے کام کے اوقات میں اپنی جرابیں دھونے کی مہلت نکال لی اور انھیں خشک کرنے کے لیے کیمپ کے کنارے، ڈھلوان زمین پر پھیلا دیا۔ برجی پر بیٹھے ہوئے آدمی نے نشانہ لیا اور اسے ڈھیر کر دیا (ایک مبہم سی افواہ تھی کہ بعد میں اس آدمی نے خودکشی کرنے کی کوشش کی۔)

کیوں؟ چونکہ آدمی کے پاس بندوق ہے! کیوں کہ ایک آدمی کے پاس دوسرے کو مارنے یا نہ مارنے کا اختیار ہے!

اس سے بھی بڑھ کر ایک بات اور ہے۔ اس طرح پیسے ملتے ہیں۔ افسرانِ بالا ہمیشہ آپ کی طرفداری کرتے ہیں۔ وہ کسی کو مار ڈالنے پر آپ کو کبھی سزا نہیں دیتے۔ بلکہ اس کے برعکس آپ کی تعریف کریں گے آپ کو انعام دیں گے اور آپ جتنی تیزی کے ساتھ لبلبی دباتے ہیں۔ جیکہ اس نے ابھی نصف قدم ہی غلط رکھا ہے۔ آپ اسے مار گراتے ہیں۔ آپ کو اتنا ہی مستعد سمجھا جاتا ہے۔ اتنا ہی زیادہ انعام کا حقدار قرار دیا جاتا ہے ایک مہینے کی تنخواہ، ایک مہینے کی رخصت (اپنے آپ کو ہیڈ کوارٹر کی حیثیت میں رکھیے: یہ کس قسم کا ڈویژن ہے جو مستعدی کا کوئی مظاہرہ نہیں کرتا؟ اس کے افسران میں کیا خرابی ہے؟ یا شاید نکے اتنے بزدل ہیں کہ پہرے داروں کی تعداد کم کی جا سکتی ہے؟ ایک بار تیار کردہ حفاظتی نظام کو ہمیشہ مرنے والوں کی حاجت رہتی ہے!)

سچ پوچھیے تو تیز دوڑ سے گولیاں چلانے والوں میں ایک قسم کا مقابلہ سا ہوتا ہے اس نے کسی کو مار ڈالا اور انعام میں ملنے والی رقم سے کمفن خریدا اس لیے میں بھی کسی کو مار دوں گا اور کمفن خریدوں گا گھر جانا چاہتے ہو اور اپنی محبوبہ کے ساتھ کچھ دن موج منانا چاہتے ہو؟ بس ایک سرمئی گھوڑے کو وہاں ڈھیر کر دو اور ایک ماہ کے لیے چلے جاؤ!

یہ سب معاملات ایسے تھے کہ ہم اصلاحی مشقت کیمپوں میں ان سے واقف تھے! لیکن اسپیشل کیمپوں میں چند نئی باتیں تھیں، مثال کے طور پر سیدھے مارچ کرتے ہوئے کالم پر ہی گولیاں برسا دینا. جیسا کہ ازبک کے ساتھی نے کیا تھا یا جیسا کہ انھوں نے اوزلاگ میں ۸ ستمبر ۱۹۵۲ء کو کیا دیا۔ برجیوں سے کیمپ کے علاقے میں گولیوں کی بارش کر دینا

اس کا مطلب یہ تھا کہ انھیں اس کی تربیت دی گئی تھی۔ یہ سیاسی افسروں کا کام تھا مئی ۱۹۵۲ء میں کینگر میں ان شامی گن برادروں نے ایک کالم پر اچانک بغیر کسی اشتعال انگیز سبب کے اس وقت گولی چلائی جب کالم داخلے کے وقت تلاشی دینے کے لیے انتظار کر رہا تھا۔ سولہ افراد زخمی ہوئے لیکن یہ معمولی زخم نہیں تھے، پہرے دار ڈم ڈم کارتوس استعمال کر رہے تھے۔ جن پر سرمایہ داروں اور اشتراکیوں نے مشترکہ طور پر بہت عرصے سے پابندی لگا دی تھی۔ گولیوں سے ان کے جسموں پر سیاہ گڑھے بن گئے، ان کی آنتوں اور جبڑوں میں چھید ہو گئے۔ ان کے ہاتھ پیر ناکارہ ہو گئے۔

اب یہ سوال ہے کہ کسی اسپیشل کیمپ میں کانوائے کے پہرے داروں کو ڈم ڈم کی گولیاں کیوں فراہم کی جاتی تھیں؟ یہ ہمیں کبھی معلوم نہ ہو سکے گا......

پھر بھی انھیں اس وقت بے حد صدمہ ہوا جب انھوں نے میری کہانی پڑھی کہ قیدی ان کے نگراں دستوں کو "لٹیرے" کہتے تھے۔ اس لفظ کے اعادے سے وہ رنجور ہوئے۔ جیسے تمام دنیا سن رہی ہے۔ نہیں، نہیں۔ قیدیوں کو ان سے محبت کرنی چاہیے تھی۔ اور انھیں نگراں فرشتے کا خطاب دینا چاہیے۔

ان لڑکوں میں سے ایک، یہ حقیقت ہے کہ وہ اچھے لڑکوں میں سے ایک تھا، جو حقیقت کو جس شکل میں دیکھتا ہے۔ اسی کی صفائی پیش کرنا چاہتا ہے، ولاڈیلن زدوورنی جس کی پیدائش ۱۹۳۳ء میں ہوئی تھی اور جو اٹھارہ سے بیس برس کی عمر تک نیڈر لاگ میں ریاستی حفاظتی دستے

(بیدل نگراں یونٹ) میں رہا تھا۔ اس نے مجھے کئی خط لکھے ہیں ــــ "لڑکے اپنی مرضی سے بھرتی نہ ہوتے تھے۔ انھیں دفتر کمیسریٹ برائے جنگ کے لیے طلب کیا جاتا تھا۔ دفتر کمیسار انھیں وزارت داخلہ کے پاس بھیج دیتا تھا۔ لڑکوں کو ماڑ جنگ کرنے اور پہرا دینے کی تربیت دی جاتی تھی۔ رات کو لڑکے سردی سے روتے اور چیختے تھے۔ انھیں نیرد بلاگ جیسے مقامات اور وہاں کی چیزوں میں کیا دل چسپی ہو سکتی تھی! آپ کو لڑکوں کو خطاکار نہیں قرار دینا چاہیے۔ وہ فوجی تھے جو اپنی مادرِ وطن کی خدمت پر مامور تھے اور اگرچہ وہ ملازمت کے بیڈ ھنگے اور ہولناک پہلو سے واقف نہ تھے (پھر وہ سمجھتے ہی کیسے تھے!..... یہ تو سب کچھ یا پھر کچھ نہیں..... والا معاملہ تھا۔ الف ــ سین) انھوں نے حلف اٹھا لیا تھا اور ان کی ملازمت بے حد کٹھن تھی۔"

یہ سچی اور ایماندارانہ بات ہے۔ یہاں کچھ غور و تامل کی ضرورت ہے۔ ان لڑکوں کو الفاظ کے ایک تنگ حصار میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اپنے حلف کو یاد رکھو۔ تم اپنی مادرِ وطن کی خدمت پہ مامور ہو! اب تم فوجی ہو!

ہاں۔ لیکن ان میں بنیادی انسان دوست جذبے کی کمی رہی ہو گی یا یہ جذبہ قطعی نہ ہو گا، اگر حلف اور کچھ سیاسی تربیتی گھنٹوں کے بعد یہ جذبہ ختم ہو جاتا تھا تو کمزور تھا۔ نہ تو ہر نسل اور نہ ہر قوم اس مٹی سے بنی ہوئی ہے۔ جس سے یہ لڑکے بنائے جاتے ہیں۔

یقیناً یہ بیسویں صدی کا خاص مسئلہ ہے: کیا محض احکامات کی تعمیل کر لینا اور اپنے ضمیر کو دوسروں کے پاس رہن رکھ دینا مناسب ہے؟ کیا کوئی فرد نیکی اور بدی کے بارے میں اپنے ذاتی نظریات کے بغیر جی سکتا ہے اور صرف مطبوعہ ہدایات اور افسرانِ بالا کے زبانی احکامات سے انھیں اخذ کر سکتا ہے؟ حلف نامے! وہ صمیم قلب سے اٹھائے ہوئے حلف جو آواز کی تھرتھراہٹ کے ساتھ بُرے لوگوں سے عوام کو محفوظ رکھنے کے لیے ہوتے ہیں؛ دیکھیے انھوں نے کس طرح بدی کی خدمت اور عوام کی مخالفت کو ایک سمت عطا کر دی ہے!

اس بات کو ہمیں ملحوظ رکھنا چاہیے جو واسلی ولاسوف، ۱۹۳۰ء میں اپنے جلاد سے کہنا چاہتا تھا: "یہ تمہاری غلطی ہے۔ صرف تم اس بات کے لیے قصوروار ہو کہ وہ لوگوں کو قتل کرتے ہیں! میری موت کا سہرا صرف تمہارے سر ہے اور تمام عمر تم اس داغ کو لیے پھرو گے۔ اگر جلاد نہ ہوں گے تو پھانسیاں بھی نہ ہوں گی۔"

اور نگراں دستے نہ ہوں تو کیمپ بھی نہ ہوں گے!

بلاشبہ نہ تو ہمارے معاصرین اور تاریخ غلط کار افسر شاہی نظام کو فراموش کر سکیں گے۔ بے شک یہ حقیقت سب پر روشن ہے کہ ان کے افسران کا قصور زیادہ ہے یہ حفاظتی افسر اور زیادہ قصوروار ہیں۔ جنھوں نے احکامات اور ہدایات تیار کی تھیں۔ وہ ان سے بھی زیادہ بڑے خطاکار ہیں اور جنھوں نے احکامات جاری کیے کہ یہ ہدایات اور احکامات قلم بند کیے جائیں سب سے بڑے مجرم ہیں۔

لیکن گولیاں برسائی جاتی تھیں۔ کیمپوں پر پہرے ہوتے تھے۔ تمامی گنیں تیار رکھی جاتی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ ان لڑکوں کے ہاتھوں میں! زمین پہ پڑے ہوئے آدمیوں کو ٹھوکریں لگائیں

جاتی تھیں۔ کوئی دوسرا نہیں، یہی لڑکے ٹھوکریں مارتے تھے![1]

ولاڈیلین بھی رقم کیا:

"وہ ہمارے کانوں میں پھونکتے رہے تھے۔ وہ ہمیں یو۔ ایس۔ او۔۳۴۴ ایس ایس — پیادہ جیل سنتریوں کے لیے ۱۹۴۴ء کے ضابطے (انتائی بصیغۂ راز[2]) از بر کر لینے کو کہتے تھے جو ایک ظالمانہ اور وحشتناک دستاویز ہے۔ پھر حلف تھے۔ اس کے بعد ہمیں حفاظتی افسران اور سیاسی اتالیق کی باتوں پر توجہ مبذول کرنی پڑتی تھی — افسروں کی باتوں پر توجہ دینی پڑتی تھی۔ تان آمیز باتیں کہی جاتی تھیں اور مذمت کی جاتی تھی۔ خود کچھ فوجیوں کے خلاف جھوٹے کیس بنا دیے جاتے تھے ... لکڑی کی فصیلوں اور کانٹے دار تاروں سے انھیں الگ تو کر دیا گیا تھا۔ اور آل جیکٹوں والے لوگ اور بڑے کوٹوں والے لوگ یکساں طور پر قیدی تھی۔ اوّل الذکر ۲۵ برسوں کے لیے اور مؤخر الذکر تین برسوں کے لیے!

یہ بات تو صورتِ حال کو ذرا سخت الفاظ میں ظاہر کرتی جیسی ہے کہ پیادہ فوج والے بھی زیرِ حراست تھے۔ اتنا ہی ہے کہ انھیں کسی فوجی عدالت نے نہیں بلکہ دفتر کمیسار برائے جنگ نے قید کیا تھا۔ یکساں طور پر قیدی تو وہ نہیں تھے کیوں کہ بڑے کوٹ پہننے والے لوگ اپنی ٹامی گنوں سے کام لے کر جیکٹ والوں کو کسی رکاوٹ کے بغیر مار ڈالنے کی قدرت رکھتے تھے۔ پیچ پوچھیے تو ان کے ہجوم کو بھون سکتے تھے۔ جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے۔

ولاڈیلین آگے چل کر وضاحت کرتا ہے: "لڑکے ہر قسم کے تھے (عقل سے عاری پکے بدمعاش بھی تھے جو زیکوں (قیدیوں) سے متنفر تھے۔ کبھی کسی اینٹھک عقلیت سے بھی ہوتے تھے — بشکیر، یا باٹ یا قوت سے آنے والے نئے رنگروٹ بے حد نرم مزاج تھے پھر ایسے لوگ تھے جنھیں پروا ہی نہ تھی، یا اکثریت میں تھے۔ وہ سکون کے ساتھ ملازمت کرتے تھے اور کوئی شکایت نہ کرتے تھے۔ جو چیز انھیں سب سے زیادہ پسند تھی وہ تھا ڈاک شدہ کلنڈرا اور خط تقسیم کرنے کا وقت۔ اور شریف لڑکے بھی آخر تھے ہی، جو زیکوں کو قسمت کا شکار سمجھ کر ان کے تئیں ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے اور ہم میں سے بیشتر لوگ یہ محسوس کرتے تھے کہ ہماری ملازمت لوگوں میں ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہے۔ جب ہم رخصت پر ہوتے تھے تو اپنی وردی استعمال نہ کرتے تھے۔

ولاڈیلین کی اپنی روداد حیات ہی اس کے خیالات کی تائید کے لیے سب سے اچھی دلیل ہے ہر چند کہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس جیسے لوگوں کی تعداد وہاں بہت کم تھی۔

اسے کانوائے گارڈ کی ملازمت میں ایک تاہل پسند اسپیشل سیکشن کی غلطی سے بھرتی کر لیا گیا تھا۔ اس کے سوتیلے باپ وائیٹنوکو، جو ٹریڈ یونین کا پرانا لیڈر تھا، ۱۹۳۷ء میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اور اس کے نتیجے میں اس کی ماں کو پارٹی سے خارج کر دیا گیا تھا اس کے باپ نے جو ایک چیکا (پولس) اسکورڈ کا کمانڈر رہ چکا تھا اور ۱۹۱۷ء سے پارٹی کارکن تھا، جلد بازی میں اپنی پہلی بیوی اور بیٹے سے قطع تعلق کا اعلان کر دیا (اور اس طرح اپنی پارٹی کی رکنیت برقرار رکھی، لیکن پھر بھی اس کے عہدے میں تخفیف کر دی گئی)۔[3]

اس کی ماں نے زمانۂ جنگ میں چندے میں خون دے کر اپنا داغ مٹانے کی کوشش کی (یہ بالکل ٹھیک تھا پارٹی کے رکن اور غیر رکن یکساں طور پر اس کا خون حاصل کرتے تھے) لڑکے کو بچپن ہی سے نیلی ٹوپی والوں سے نفرت رہی تھی" اور انھوں نے میرے ہی سر پر نیلی ٹوپی رکھ دی!..... وہ ہولناک رات جب میرے باپ جیسی وردی پہنے ہوئے لوگوں نے بدتمیزی کے ساتھ میری چارپائی کی تلاشی لی، میرے بچپن کی یادداشت پر بہت گہرا نقش چھوڑ گئی"۔

"میں اچھا کانوائے گارڈ نہیں تھا۔ میں زیکوں کے ساتھ بات چیت کرنے لگتا تھا۔ اور انھیں سہولت پہنچایا کرتا تھا۔ میں جب ان کے لیے اسٹال سے چیزیں خریدنے یا ان کے خطوط ڈاک میں ڈالنے جاتا تھا تو اپنی رائفل کیمپ فائر کے پاس چھوڑ جاتا تھا۔ میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ انٹرمیڈیٹ، میاکورٹ اور پرا سیپریٹ کیمپ میں ایسے افراد موجود تھے جواب بھی پراٹیویٹ وو لوڈیا کو یاد کرتے تھے۔ ایک قیدی فورمین نے مجھ سے کہا: "اگر تم لوگوں پر نگاہ کرو اور ان کی پریشانیاں سنو تو تم سمجھ جاؤ گے....." ہر سیاسی قیدی میں مجھے اپنے نانا، اپنے ماموں اور اپنی خالہ کی جھلک نظر آتی تھی۔ میں بس اپنے افسروں سے متنفر تھا۔ میں بڑبڑاتا اور شکایت کرتا اور دوسرے فوجیوں سے کہتا تھا: "یہ ہیں عوام کے حقیقی دشمن!" اس لیے مجھے صریحاً حکم عدولی (تخریب) اور زیکوں کے ساتھ رابطہ رکھنے کے باعث تحقیق و تفتیش کے لیے بھیج دیا گیا۔ بلند قامت سیموشن نے میرے منہ پر تازیانے سے ضربیں لگائیں۔ ایک پیپرویٹ سے میرے گھٹنے توڑ دیے..... کیونکہ میں تحریری اقبال نہیں کر رہا تھا کہ میں نے زیکوں کے خطوط پوسٹ کیے تھے۔ میں نے اس لمبے کیڑے کو رگڑ دیا ہوتا۔ مجھے باکسنگ میں چاندی کا میڈل ملا تھا۔ میں اسی پونڈ وزن اٹھا کر بآسانی چل سکتا تھا۔ لیکن دو وارڈروں نے مجھے پکڑ رکھا تھا..... پھر بھی تفتیش کنندگان کے دلوں میں دوسرے خیالات تھے ـــ ۱۹۵۳ء میں ایم۔ وی۔ ڈی (ریاستی حفاظتی پولس) کو تا حال یہ علم نہ تھا کہ یہ آمد تھی یا رفت انھوں نے مجھے اندر نہیں کیا اور مجھے دفعہ ۷ م ب کے تحت محض غیر اعزازی طور پر سبکدوش کر دیا۔ ایم۔ وی۔ ڈی کے اصولوں کی تردید اور ایم۔ وی۔ ڈی کے ضابطے کی شدید خلاف ورزی کی بنا پر کام سے الگ کر دیا گیا۔ بعد ازاں انھوں نے مجھے ڈویژن کے گارڈ ہاؤس سے باہر پھینک دیا۔ مجھے مارا پیٹا گیا اور اس صورت میں کہ میں سردی سے منجمد ہو رہا تھا۔ مجھے اپنے گھر جانے کا حکم ملا۔ اس وقت ایک آزاد فورمین۔ آرسین نے راستے میں میری تیمارداری کی۔

ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ایک کانوائے گارڈ کا افسر قیدیوں کے ساتھ کچھ ملائمت کا برتاؤ کرنا چاہتا تھا بلاشبہ وہ یہ کام اپنے سپاہیوں کے توسط سے اور ان کی موجودگی میں ہی کر سکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دلوں کی عام بربریت کے مقابلے میں یہ "پریشان کن عمل" تھا اور یہ پوچھیے تو ناممکن ہوگا۔ علاوہ ازیں کوئی شخص فوراً اس کی مخبری کر دے گا۔

یہ انتظام ہے آپ کے لیے!

دسواں باب

تاروں کے پیچھے زمین جل رہی ہے

نہیں، حیرت کی بات یہ نہیں ہے کہ کیمپوں میں فوجیوں کے غدر اور عوامی ہنگامے نہیں ہوئے بلکہ حیرت اس بات کی ہے کہ ان تمام حالات کے باوجود ہوئے!

ہماری تاریخ کے تمام پریشان کن واقعات کی مانند، جس کا مطلب ہے جو کچھ واقعتاً ہوا اُس کے تین چوتھائی حصّے کی طرح — یہ ہنگامے صاف صاف اور الگ الگ دکھائی پڑتے تھے اور درمیانی جگہ ایک نادیدہ رابطے کی طرح پوشیدہ رہتی ہے جن لوگوں نے ان میں حصّہ لیا وہ تباہ ہو گئے ہیں اور دُور کے گواہ بھی خوف کی وجہ سے خاموش رہے ہیں، جنہوں نے انہیں پامال کیا اُن کی رپورٹیں نذرِ آتش کر دی گئی ہیں یا تجوریوں میں دفن کر دی گئی ہیں — اس وجہ سے ہنگامے پہلے ہی افسانے بن چکے ہیں اگرچہ ان میں سے کچھ محض پندرہ اور دوسرے صرف دس سال پہلے ہوئے تھے (کوئی تعجب نہیں کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عیسیٰؑ کا وجود ہی نہ تھا محمدؐ کبھی تھے ہی نہیں۔ وہاں آپ ہزاروں برس کی بات کر رہے ہیں . . . .)

جب کسی ذی رُوح کو اس سے کوئی نقصان نہ ہو سکے گا تب مورخین کو بچی کھچی دستاویزات دیکھنے کی اجازت ملے گی، آثارِ قدیمہ کے ماہرین کچھ کھدائی کریں گے، کسی چیز کو تجربہ گاہ میں گرم کریں گے اور ان ہنگاموں کی تاریخیں، مقامات، نوعیت اور اُن کے رہنماؤں کے نام روشنی میں آئیں گے۔

ہمیں پہلے ہنگامے، جنوری ۱۹۴۲ء کے ریٹیونن والے معاملے کی طرح، اسٹوبی کے نزدیک اوشکریبے سپیریٹ کیمپ۔ کے علاقے میں نظر آئیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ ریٹیونن آزاد کا رکن تھا، شاید دستے کا انچارج بھی تھا۔ اُس نے دفعہ ۵۸ والوں کی اور سماجی اعتبار سے مضرت رساں لوگوں (دفعہ ۳۵/۷) کی قیادت کی تھی اس نے چند سو رضا کار یکجا کر لیے۔ انہوں نے کانوائے (سفری نگراں دستہ) کو (جس میں تھوڑی سزا پانے والے قیدی، پہریدار تھے) غیر مسلح کر دیا اور پارٹیزن کی طرح رہنے کے لیے کچھ گھوڑے لے کر جنگل میں بھاگ گئے۔ انہیں آہستہ آہستہ ختم کر دیا گیا۔ ۱۹۴۵ کے موسمِ بہار تک، جن لوگوں کا اس سے کوئی بھی تعلق نہ تھا، انہیں ریٹیونن والے معاملے میں جیل بھیجا جا رہا تھا۔

شاید ہمیں (نہیں بذات خود ہمیں نہیں) اُسی وقت عوامی جائے تعمیر نمبر ۵۰۱ پر ۱۹۴۸ء میں رونما ہونے والے تقریباً افسانوی طرز کے فساد کا علم ہوگا جہاں سوایا ماسکا سلخرڈ ریلوے کی تعمیر کا کام جاری تھا۔ اس کی حیثیت افسانوی اس وجہ سے تھی کہ کیمپ میں ہر شخص اس کے بارے میں سرگوشیاں تو کرتا تھا لیکن اصلیت کا علم کسی کو نہ تھا۔ افسانوی نوعیت اس وجہ سے بھی تھی کہ اسکی ولادت اسپیشل کیمپ کے نظام میں نہیں ہوئی جہاں اُس وقت موافق نفسیاتی فضا اور آب و گل موجود تھی بلکہ ایک اصلاحی مشقتی کیمپ میں ہوئی جہاں مخبروں کے خوف سے ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے تھے اور چور اُنہیں روندا کرتے تھے۔ جہاں اُن کے سیاسی قیدی ہونے کے حق پر بھی تھوکا جاتا تھا اور اس وجہ سے وہاں جیل میں فساد کا تصور بھی ناممکن نظر آتا تھا۔ افواہوں کے مطابق یہ سب سابق فوجیوں (حال ہی میں سبکدوش ہونے والے فوجی) کی کارستانی تھی اُن کے بغیر دفعہ ۵۸ والوں میں جرارت، جذبے اور قیادت کی کمی تھی۔ لیکن یہ نوجوان (ان میں کوئی مشکل سے تیس سے اوپر کا ہوگا) ہماری جنگجو سپاہ کے افسران اور بھرتی ہوئے فوجی تھے یا اُن کے ساتھی تھے جو جنگی قیدی رہ چکے تھے۔ ان میں وہ لوگ شامل تھے جو ایک دوسرے کے خلاف لڑ چکے تھے لیکن یہاں کے مظالم نے اُنہیں متحد کر دیا تھا۔ یہ نوجوان جو ایک عالمی جنگ میں تمام مورچوں پر لڑ چکے تھے جو آج کل کی پیادہ جنگ، کیموفلاج (روپوش ہونے والوں) اور گشت کرنے والوں کا سراغ لگانے کے ماہر تھے ۱۹۴۸ء میں بھی اپنی زمانۂ جنگ کی مستعد زندگی اور خود اعتمادی کے حامل تھے اور یہ خیال اُن کے گلے سے نہ اُترتا تھا کہ اُن جیسے لوگ، پوری کی پوری بٹالین سرِ تسلیم خم کر کے مر جائے۔ فرار یا اس کا منصوبہ بھی انہیں ایک لائق نفرین نصف حل بلکہ مل کر دشمن کا مقابلہ کرنے کی بجائے ایک ایک کرکے میدان چھوڑ بھاگنے کے مترادف تھا۔

اس سب منصوبہ کی تیاری اور آغاز ایک خاص گروہ میں ہوا۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک سابق کرنل جسے وہ رونن یا دورونوف کہتے تھے اور جو یکچشم تھا، ان کا رہنما تھا۔ بکتر بند فوج کے ایک فرسٹ لیفٹننٹ، ساکورینکو کا ذکر بھی آتا ہے۔ اس گروہ نے اپنے کانوائے گارڈوں (قیدیوں پر مارچ کی نگرانی کرنے والا دستہ) کو ختم کر دیا (ان دنوں کانوائے میں حقیقی فوجی نہ تھے بلکہ ریزرو دستے ہوتے تھے جبکہ اُن کے سپرد اکثر فوجی کیے جاتے تھے) اس کے بعد انہوں نے جا کر ایک دوسری اور پھر تیسری ٹولی کو آزاد کر دیا۔ انہوں نے کانوائے گارڈوں کے جھونپڑے پر حملہ کر دیا پھر باہر سے کیمپ پر یلغار کی، برجیوں پر سے گارڈوں کو پسپا کر دیا اور کیمپ کا علاقہ کھول دیا (بعد ازاں لازمی آپسی نفاق پیدا ہو گیا اگرچہ گیٹ پوری طرح کھلے ہوئے تھے لیکن بیشتر زیکوں کو ان میں سے آنا جانا منظور نہ تھا۔ ان میں قلیل سزا والے قیدی بھی شامل تھے جنہیں فساد سے کوئی فائدہ نہیں پہنچنے والا تھا۔ دس سالہ سزا والے یا "سات اٹھے" یا "چار چھکے" والے احکامات کے تحت پندرہ سال والے بھی تھے جو دفعہ ۵۸ کے تحت اور بُرے حال کو پہنچ جائیں گے۔ آخر میں دفعہ ۵۸ والے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے پیروں پر کھڑے رہ کر جان دینے کی بجائے وفاداری کے

ساتھ گھٹنے ٹیک کر مرنا پسند کرتے تھے۔ وہ تمام لوگ جو گیٹ سے باہر نکلے، یقیناً باغیوں کی مدد کرنے کے لیے گئے۔ کچھ بدمعاشوں نے آزاد باشندوں کی بستیاں لوٹنے کے لیے خوشی خوشی اپنا رضا کارانہ حلف بھی توڑ دیا)

پہرے داروں سے حاصل کردہ اسلحہ سے لیس ہو کر (پہریداروں کو بعد میں کوچاس قبرستان میں دفن کر دیا گیا) باقی قریبی کیمپ ڈویژن پر قبضے کی نیت سے بڑھے۔ دونوں کی مشترکہ طاقت کے بھروسے پر انہوں وورکتا پر یلغار کرنے کا فیصلہ کیا! جو صرف ساٹھ کلو میٹر کے فاصلے پر تھا لیکن یہ ممکن نہ ہوا۔ اُن کی راہ روکنے کے لیے پیراشوٹ بردار فوجی اُتارے گئے۔ نیچے اُڑنے والے جنگی طیاروں نے مشین گن کی گولیوں سے انہیں منتشر کر دیا۔

ان پر مقدمات چلائے گئے۔ کچھ لوگوں کو گولی ماری گئی اور بقیہ کو پچیس[۲۵] پچیس سال یا دس دس سال کی سزا دی گئی (ساتھ ہی ان میں سے بہت سے لوگوں کی جنہوں نے کارروائی میں حصہ نہیں لیا تھا اور کیمپ میں رہے تھے، "سزائیں تازہ کر دی گئیں"!)

فوجی کارروائی کی حیثیت سے اس کوشش کی نری مہملیت روشن ہے لیکن کیا آپ کہیں گے کہ خاموش رہ کر ایک ایک انچ مرتے رہنا زیادہ معقول فعل ہوتا؟

اس کے فوراً بعد اسپیشل کیمپوں کا قیام عمل میں آیا۔ زیادہ تر دفعہ ۵۸ والوں کو ادھر ادھر سے جمع کیا گیا۔ انجام کیا ہوا؟

۱۹۴۹ء میں بیرلاگ کے نیزنی اٹریاخ ڈیویژن میں ایک غدر کا آغاز کم و بیش اسی ڈھنگ سے ہوا: انہوں نے اپنے سنتریوں کے ہتھیار چھین لیے، چھ یا آٹھ ٹامی گنوں پر قبضہ کر لیا اور باہر سے کیمپ پر حملہ کر دیا، برجیوں سے پہرے داروں کو مار بھگایا، ٹیلی فون کے تار کاٹ دیے اور کیمپ کھول دیا۔ اس مرتبہ کیمپ میں ایسا کوئی فرد نہ تھا جس پر نمبر نہ پڑا ہو، جسے داغ نہ دیا گیا ہو، جو بدنصیبی کا شکار نہ ہو، جو ساری اُمیدوں سے دستبردار نہ ہو چکا ہو۔

اور آپ کے خیال سے ہوا کیا؟

بیشتر قیدی گیٹ سے باہر جانے پر رضا مند نہ تھے!

جنہوں نے یہ سب شروع کیا تھا اور جنہیں اب اور کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا انہوں نے غدر کو جیل سے فرار کی شکل دے دی اور اُن کا ایک گروہ ٹنگی کی جانب نکل بھاگا۔ ایلگانا ٹوسکانا پر اُن کا راستہ فوجیوں اور ہلکے ٹینکوں نے روک دیا (جنرل سومیوتوف اس کارروائی کا کمانڈر تھا) وہ سب مارے گئے۔[۱]

پہیلی: دنیا میں سب سے تیز رفتار چیز کون سی ہے؟ جواب: خیال۔

یہ ہے بھی اور نہیں بھی۔ یہ سست رفتار بھی ہو سکتا ہے۔ اور کتنا سست رفتار! انسان گروہ اور سماج بہت سست رفتاری کے ساتھ اور دشواری سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں کیا ہو گیا ہے وہ کتنی سست رفتاری سے اپنی کیفیت کے بارے میں حقیقتِ حال کو تسلیم کرتے ہیں۔

دفعہ ۵۸ کے قیدیوں کا ریوڑ اسپیشل کیمپ میں جمع کر کے اسٹالن اپنی قوت کا استعمال خاص طور پر اپنی ہی تفریح کے لیے کر رہا تھا۔ وہ پہلے ہی انہیں اتنی مضبوطی کے ساتھ قید میں ڈال چکا تھا جتنا کہ ممکن تھا لیکن اُس نے سوچا کہ وہ مزید چالاک ثابت ہوگا اور اپنی تا حال بہترین مہارت میں اصلاح کرے۔ وہ سوچتا تھا کہ وہ اسے مزید ہولناک بنانے کا گُر جانتا ہے۔ نتیجہ اس کے برعکس ہوا۔

اس دورِ حکومت میں تیار کردہ سارے نظامِ ظلم کا انحصار تھا غیر مطمئن لوگوں کو منتشر رکھنے پر انہیں ایک دوسرے سے آنکھیں چار کرنے کا موقع نہ دینے پر اور یہ معلوم کرنے پر کہ وہاں اُن کی تعداد کیا تھی اور اُن سب کے دلوں میں سب سے زیادہ نا مطمئن کے دل میں بھی یہ خیال پیدا کرنے پر کہ تھوڑے سے بدنصیب لوگوں کے علاوہ، جنکی حالت غیر ہے اور جو اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو چکے ہیں، بقیہ لوگ مطمئن ہیں۔

لیکن اسپیشل کیمپوں میں ہزاروں غیر مطمئن تھے وہ اپنی عددی طاقت سے واقف تھے اور انہیں یہ احساس تھا کہ وہ اخلاقی دیوالیے نہیں ہیں کہ انہیں اس بات کو اپنے جیلروں سے اپنے غداروں سے۔ ان نظریہ سازوں سے جو یہ بتلانے کی کوشش کرتے تھے کہ انہیں کیمپوں میں کیوں سڑنا چاہیئے زیادہ بہتر طور پر جانتے تھے کہ زندگی کو کیا اور کس قسم کا ہونا چاہیئے۔

اسپیشل کیمپ کے اس نئے پہلو پر پہلے توجہ تقریباً دی ہی نہ گئی تھی۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ یہ کیمپ اصلاحی مشقتی کیمپوں کی توسیعِ محض ہیں اتنا ضرور تھا کہ چوروں کے جو کیمپ تنظیم اور ڈسپلن نیز اقتدار کے بنیادی ستون تھے، دل ٹوٹ گئے۔ پھر سخت مزاج و سنگدل جیلروں اور زیادہ بڑی ڈسپلن بیرکوں سے اس نقصان کی تلافی ہوتی ہوئی نظر آتی تھی۔

لیکن یاد رکھیے: جب چوروں کے دل ٹوٹ گئے تو کیمپوں میں چوریوں کا سلسلہ بند ہو گیا اب آپ اپنا راشن اپنی الماری میں چھوڑ کر جا سکتے تھے رات کو اپنے جوتے تکیے کے نیچے رکھنے کی جگہ انہیں فرش پر چھوڑ سکتے تھے اور وہ صبح اپنی جگہ ہوں گے۔ آپ اپنا بٹوہ جیب میں رکھ کر سونے کی بجائے جس میں رگڑ کھا کر تمباکو چُور چُور ہو جاتی تھی، رات کو اپنی الماری پر چھوڑ سکتے تھے۔

آپ کہتے ہیں کہ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں؟ نہیں یہ سب بیحد اہمیت رکھنے والی باتیں ہیں! جب وہاں چوریاں بند ہو گئیں تو لوگ اپنے ہمسایوں کی طرف محبت سے اور اعتماد کے ساتھ دیکھنے لگے۔ سنو لڑکو! ہم دراصل سیاسی قیدی ہیں۔۔۔۔

اور اگر ہم سیاسی قیدی ہیں تو ہم دو تختۂ ہائے خواب کے درمیان یا جلائے کار پر آگ کے پاس ذرا کھل کر گفتگو کر سکتے ہیں۔ ہاں چہار سمت اچھی طرح دیکھ ضرور لو کہیں کوئی سن تو نہیں رہا ہو۔ ذرا یوں سوچو اگر وہ ہم پر کوئی الزام عائد کریں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر آپ پہلے ہی چوتھائی صدی کی سزا پا چکے ہیں تو اب وہ آپ کا اور کیا بگاڑ سکتے ہیں؟

پُرانے کیمپ کی نفسیات ـــــــ پہلے تم کرو، میں کچھ انتظار کروں گا۔ یہاں انصاف کہیں نہیں ہے

اس لیے اُسے بھُول جاؤ. پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور آگے بھی یوں ہی چلے گا. اس طریقِ فکر کا اُتار شروع ہوا۔

کیوں بھُول جائیں؟ کیوں ہمیشہ یُوں ہی چلتا رہے؟

ٹولیوں کے ساتھی ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ گفتگو شروع کرتے ہیں۔ راشن کے بارے میں نہیں، دبے کے بارے میں بھی نہیں. اُن باتوں کے بارے میں جنکا ذکر آپ باہر کبھی نہیں سُنتے اور پھر وہ زیادہ کھُل کر گفتگو کرنے لگے. اب فورمین اپنی نخوت میں آکر گھونسہ نہیں ہلا سکتا کچھ فورمین یہ عادت بالکل ترک کر دیتے ہیں اور کچھ دوسرے اس کا استعمال کم مرتبہ اور پہلے سے کم طاقت کے ساتھ کرتے ہیں. خود فورمین اپنے آدمیوں سے کام لینے کی جگہ سننے اور باتیں کرنے کے لیے بیٹھ جاتا ہے اور اُس کی ٹولی کے لوگ اُسے اپنا سمجھنے لگتے ہیں. آخر کار وہ ہم میں سے ہی ہے!

فورمین پیداوار کے تنظیمی شعبے میں یا محاسب دفتر میں آتے ہیں اور اُن کے ساتھ درجنوں چھوٹے چھوٹے سوالوں، کس کا راشن گھٹنا چاہیئے کس کا نہیں، کسے کس کام پر لگایا جائے ـــ یہ گفتگو کرکے نمبردار بھی تازہ ہوا کے جھونکے سے سنجیدگی، ذمہ داری اور منصوبے کے اس چھوٹے سے بادل کے متاثر ہوتے ہیں.

سب کے سب ایک ساتھ نہیں. وہ ان کیمپوں میں سب سے عمدہ منصب پانے کے لالچ میں آئے تھے اور وہ کامیاب ہوئے تھے انہیں ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ ویسے ہی آرام سے کیوں نہ رہیں جیسے کہ اصلاحی مشقتی کیمپوں میں رہتے تھے. اپنے ذاتی کمرے بند کرکے ان میں یورک کی چربی میں آلو بھُونتے ہوئے، مزدوروں سے مختلف انداز میں اپنی زندگی کیوں نہ بسر کریں لیکن نہیں! نتیجہ یہ نکلا کہ اہم ترین بات کوئی اور ہے. اور وہ کیا ہوسکتی تھی؟... یہ شیخی بگھارنا کہ ہم خون چوسنے والے ہیں، یہ شیخی مارنا کہ ہمارے لیے محنت دوسرے لوگ کرتے ہیں جس طرح کہ لوگ اصلاحی مشقتی کیمپوں میں کیا کرتے تھے، بد اخلاقی تصور کی جانے لگی. اب نمبردار مزدوروں کو درست بناتے مزدوروں کی میلی کچیلی جرکنوں میں اپنی عمدہ جرکنیں چھپا لیتے اور آرام کے ساتھ زمین پر لیٹ کر اپنی اتوار کی تعطیل گزارتے تھے.

اب لوگوں کو اس قسم کے موٹے طبقات میں منقسم نہیں کیا جاسکتا تھا جیسا کہ اصلاحی مشقتی کیمپوں میں کیا جاتا تھا: نمبردار اور مزدور، غیر سیاسی اور دفعہ ۵۸ والے. اب تقسیم زیادہ پیچیدہ اور دلچسپ ہو گئی: اُسی علاقے کے لوگ، مذہبی گروہ، عملی تجربہ رکھنے والے لوگ، تعلیم یافتہ لوگ.

عہدیداران کو یہ بات محسوس کرنے اور سمجھنے میں بہت وقت لگے گا لیکن کام کا تعین کرنے والے لوگ اب ڈنڈے لے کر نہیں چلتے اور پہلے کی طرح زور زور سے دہاڑتے نہیں. وہ فورمین سے دوستانہ انداز میں گفتگو کرتے، مثال کے طور پر: "تمہارے آدمیوں کو کام پر لے جانے کا وقت ہو رہا ہوگا، کو موف!" (اس لیے نہیں کہ اب انہیں ندامت کا احساس ہونے لگا تھا بلکہ اس لیے کہ ماحول میں کوئی نئی اور غیر تسلی بخش بات تھی)

لیکن یہ سب کچھ بتدریج ہوا. اِن تبدیلیوں سے لیے مہینوں صرف ہوگئے. ان کے اثرات

ہر فورمین اور ہر نمبردار پر مرتسم نہیں ہوئے صرف وہ لوگ متاثر تھے جن میں کچھ ضمیر اور بھائی چارے کا جذبہ تا حال خاکستر کے نیچے جھلملا رہا تھا جو لوگ حرامزدگی پر آمادہ تھے انہیں اپنی روش پر کاربند رہنے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ اب تک شعور کی حقیقی تبدیلی کوئی جرات مندانہ تبدیلی کوئی باطنی اُبال پیدا نہیں ہوا تھا۔ کیمپ پہلے ہی کی طرح کیمپ رہا۔ ہم لوگ پہلے کی طرح پسماندہ و پامال تھے ہمیشہ کی مانند لاچار تھے اب بھی ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم تار کے نیچے سے رینگ کر نکل بھاگیں اور اسٹیپی میں فرار ہو جائیں، گولیوں کی بوچھار کا سامنا کریں اور کتوں سے ہمارا شکار کیا جائے۔

ایک جرأتمندانہ خیال۔ بدحواسی کے بطن سے پیدا ہونے والا خیال، کسی آدمی کو اُوپر اُٹھانے والا خیال۔ حالات کو کس طرح ایسا موڑ دیا جائے کہ ہم اُن سے دُور نہ بھاگیں بلکہ وہ ہم سے دُور بھاگنے لگیں؟

ایک مرتبہ یہ سوال اُٹھایا گیا تھا، ایک بار کچھ لوگوں نے اس کے بارے میں غور کیا تھا اسے الفاظ میں منتقل کیا گیا تھا اور کچھ لوگوں نے اُن کی بات سُنی ــ تسلیم کی تھی۔ فرار کی کوششوں کا زمانہ بیت گیا۔ بغاوت کرنے کا دور شروع ہو چکا تھا۔

———×———

لیکن آغاز کیسے کیا جائے؟ کہاں سے ابتدا کی جائے؟ ہم بندھے ہوئے تھے ہر چہار سمت سے بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے، ہم نقل و حرکت کی آزادی سے محروم تھے، ہم کہاں سے شروعات کر سکتے تھے؟

آسان ترین چیزیں اپنی زندگی میں کبھی سہل نہیں ہوتیں۔ اصلاحی مشقتی کیمپوں میں کچھ لوگوں کے ذہنوں میں یہ دُھن سمائی تھی کہ مخبروں کو مار ڈالا جائے۔ وہاں بھی کبھار حادثات کا انتظام کیا جاتا تھا۔ کوئی شہتیر کسی انبار سے لڑھک جائے گا اور اسٹولی (مخبر) کو سیلابی ندی میں پھینک دے گا۔ اس طرح اسپیشل کیمپوں میں سوچنا دشوار نہیں ہونا چاہیئے تھا کہ کون سے بندھن پہلے کاٹ پھینکے جائیں۔ آپ ہر شخص کو یہ بات سمجھانے کی اُمید رکھتے تھے لیکن کوئی بھی اسے نہ سمجھتا تھا۔

اچانک ــ ایک خودکشی۔ ڈسپلن بیرکوں کی جھونپڑی نمبر۲ میں ایک آدمی پھانسی پر لٹک گیا۔ (ایکی بسٹز میں یہ عمل جن منزلوں سے گزرا میں ان کا ذکر کر رہا ہوں۔ لیکن ملحوظ رکھیے کہ دیگر اسپیشل کیمپوں میں بھی یہی حالات تھے۔) افسران بالا کو کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی انہوں نے رسیاں کاٹ کر اُسے اتارا اور ٹھیلے پر رکھ کر گندگی کے ڈھیر پر پھینک آئے۔

کام کے دستوں میں چاروں طرف ایک افواہ پھیل گئی لیکن کوئی بھی اتنا جنگلی اتنا گنوار اتنا بےشرم نہیں تھا جتنا ٹوفی الیس ٹیلے جو باورچیخانے والی جھونپڑی کا انچارج تھا۔ اُس کے باڈی گارڈ مُٹنے تازے سؤر کے مُنہ والے باورچی تھے اور اُس نے کچھ بدمعاش اردلیوں کو بھی کھلا پلا کر قریب کر لیا تھا وہ اور اُس کے خوشامدی زیکوں کو گھونسوں اور لاٹھیوں سے مارتے تھے۔ ایک مرتبہ اس نے بالکل

ناجائز طریقے سے ایک پستہ قد سانولے قیدی کو زدوکوب کیا جسے لوگ بچّہ کہتے تھے وہ عادتاً یہ غور بھی نہ کرتا تھا کہ کیسے پیٹ رہا ہے! لیکن اب اسپیشل کیمپوں میں جو حالات تھے انہیں وہاں طفلِ مکتب کوئی نہیں تھا اور یہ بچّو تھا بھی مسلمان۔ کیمپ میں کئی مسلمان تھے۔ وہ عام مجرم نہیں تھے۔ آپ انہیں غروب آفتاب کے وقت کیمپ کے مغربی علاقے والے گوشے میں نماز ادا کرتے ہوئے دیکھ سکتے تھے (اصلاحی مشقتی کیمپوں میں لوگ اُن کا مضحکہ اُڑاتے لیکن ہم ایسا نہیں کرتے تھے) جس میں وہ اپنے بازو اوپر اُٹھاتے تھے اور زمین پر سجدہ کرتے تھے۔ اُن کے بزرگ بھی تھے اور زمانے کے جذبات کے مطابق انہوں نے بھی اپنا جلسہ کیا۔ تجویز پاس کی گئی کہ انتقام لیا جائے گا!

ایک دن اتوار کو علی الصبح پٹنے والا لڑکا ایک جوان ساتھی، انگمش کے ساتھ نمبردار نیلا کی جھونپڑی میں گھس گیا جبکہ وہ بھی بستروں پر کروٹیں ہی بدل رہے تھے اور اُن دونوں نے موٹے سؤر کے جسم میں ایک ایک چاقو گھونپ دیا۔

لیکن اب بھی ہم کتنے بچّے تھے؛ انہوں نے اپنے چہرے چھپانے یا فرار ہونے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ دل کی بھڑاس نکالنے اور فرض ادا کر دینے کے بعد اپنے خون آلود چاقو لے کر لاش کے پاس سے سیدھے وارڈر کے کمرے میں گئے اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ اُن پر مقدمہ چلایا جائے گا۔

یہ سب ابتدائی شگون شاں تھی۔ یہ سب شاید کسی اصلاحی مشقتی کیمپ میں بھی وقوع پذیر ہو سکتا تھا لیکن عوامی مفاد کی تشویش میں مزید اضافہ ہوا: شاید زنجیر کی نازک ترین کڑی پر ضرب لگانی پڑے گی۔

"اسٹولی (مخبر) کو ختم کر دو!" یہی وہ نازک ترین حلقہ تھا۔ اسٹولی کے سینے میں چاقو بھونک دو! اور اسٹولیوں کے گلے کاٹ دو! یہی تھی وہ کڑی!

اب جب کہ میں یہ باب لکھ رہا ہوں، انسانی ہمدردی سے لبریز کتابوں کی قطاریں دیواروں سے میری طرف گھور رہی ہیں، اُن کی گِھسی پٹی پشتوں پر مٹا مٹا سا سنہرا رنگ بادلوں میں سے جھانکتے ہوئے ستاروں کی طرح منتشر انداز میں چمک رہا ہے۔ دنیا کی کوئی بھی شے تشدد کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے! تلوار، چاقو، رائفل اُٹھا کر ہم اپنے آپ کو جلد از جلد اپنے اذیت دہندگان اور ظالموں کی صف میں شامل کر لیتے ہیں اور پھر اس کا کوئی اختتام نہیں ہوا کرتا...!

اس کا کوئی اختتام نہیں ہوتا۔ یہاں اس گرم و محفوظ جگہ اپنی میز کے پاس بیٹھا ہوا میں اس بات سے کلیتاً اتفاق کرتا ہوں۔

اگر آپ کو بے قصور ہونے کے باوجود پچیس سال کی سزا دیدی جائے اگر آپ اپنے کپڑوں پر چار نمبر پڑی ہوئی پٹیاں لگی دیکھیں، اپنے ہاتھ مستقل طور پر پشت کے پیچھے بندھے ہوئے دیکھیں، صبح و شام جامہ تلاشی دیتے ہوں۔ تھک کر چور ہو جانے کی منزل تک کام کرتے رہیں اور اگر کسی کی طرف سے بھی آپ کو مجرم قرار دیا جائے تو آپ کو گھسیٹ کر ٹھنڈی جگہ پر ڈال دیا جاتا ہو؛ زمین میں زیادہ

گہرائی تک کچلنے کی کوشش کی جاتی ہو ــــــ جس سوراخ (کوٹھری) میں آپ مقید ہیں وہاں عظیم انسانیت نوازوں کے نفیس الفاظ، اچھے کھاتے پیتے اور آزاد لوگوں کی گپ شپ اور لفاظی جیسے معلوم ہوتے تھے۔

اس کا کوئی اختتام نہیں ہوتا... لیکن کہیں سے اس کا آغاز ہو گا؟ ہماری زندگیوں میں اُمید کی کوئی کرن آئے گی یا نہیں؟

کم از کم مظلومین اس نتیجے پر پہنچے کہ بدی کو نیکی کے ذریعے دُور نہیں کیا جا سکتا۔

آپ کہتے ہیں کہ اسٹولی بھی انسان ہیں؟ ..... وارڈر بیرک میں آئے اور ہمیں خوفزدہ کرنے کے لیے انہوں نے ایک فرمان پڑھ کر سنایا جو سارے مغربی کیمپ کو مپلکس کے نام تھا۔ عورتوں کے ایک ڈویژن میں دو لڑکیوں نے (اُن کی پیدائش کی تاریخیں درج کی گئی تھیں، وہ بہت کمسن تھیں) سوویٹ مخالف باتیں کی تھیں۔ ایک ٹریبونل نے، جس کے اراکین ..." انہیں گولی مار کر موت کی سزا دی گئی۔

وہ لڑکیاں، اپنے سونے کے تختوں پر دراز سرگوشیاں کر رہی تھیں پہلے ہی دس دس سال کی سزا نے اُن کی گردنیں ڈھلکا دی تھیں۔ کس منحوس شخص نے، اپنا ذاتی بار ہلکا کرنے کے لیے انہیں اندر پہنچا دیا تھا؟ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اسٹولی بھی انسان ہیں؟

کوئی غلط فہمی نہیں تھی لیکن پچھلے زخم اب تک ہرے تھے!

مجھے دیگر مقامات کے بارے میں علم نہیں ہے (لوگوں نے سب اسپیشل کیمپوں میں، حتیٰ کہ مریض اور ناکارہ لوگوں کے اسپاسک کیمپ میں بھی مار کاٹ شروع کر دی) لیکن ہمارے کیمپ میں اس کی ابتدا، ڈبوفکا ٹرانسپورٹ۔ بطور خاص مغربی یوکرینی، او۔یو۔این۔ کے اراکین کی آمد کے بعد ہوئی۔ ہر جگہ اس تحریک کا بیشتر سہرا انہیں لوگوں کے سر تھا۔ اور دراصل پہیوں کو حرکت انہیں لوگوں نے دی۔ ڈبوفکا ٹرانسپورٹ ہمارے یہاں بغاوت کے جراثیم لے کر آیا۔

ان مضبوط نوجوان لوگوں نے، جو حال ہی میں گوریلا سرگرمیوں سے لوٹے تھے، ڈبوفکا میں اپنے چہار جانب نظر ڈالی، انہوں نے جو پامالی اور غلامی دیکھی اس سے انہیں بڑی نفرت ہوئی اور انہوں نے اپنے چاقو سنبھالیے۔

دفوفکا میں اس کا سلسلہ جلد ہی غدر، آتش زنی اور نفاق کی صورت میں ظاہر ہوا۔ لیکن کیمپ کے افسر اتنے نا عاقبت اندیش تھے (تیس سال تک انہوں نے کوئی غدر نہیں دیکھا تھا اور وہ اس کے عادی نہیں رہے تھے) کہ انہوں نے باغیوں کو ہم سے علیحدہ رکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور انہیں کام کے مختلف دستوں میں کیمپ بھر میں بکھیر دیا گیا۔ اصلاحی مشقتی کیمپوں میں دستور تھا کہ وہاں بکھیر دینے سے غدر ختم ہو جاتا تھا لیکن ہمارے نسبتاً صاف ماحول میں انتشار کے عمل سے شعلوں کو تمام مادوں تک پہنچنے میں سہولت ملی۔

نو وارد دین اپنے عملی دستوں کے ساتھ کام پر جاتے تھے لیکن کام کرنے کے لیے اُنگلی تک نہ

بلاتے تھے یا محض کام کرنے کی نمائش کرتے رہتے تھے۔ کام کرنے کی بجائے وہ دھوپ میں لیٹے رہتے (موسم گرما تھا) اور اطمینان سے گپ شپ کرتے۔ ایسے اوقات میں وہ سرکاری طور پر معائنہ کرنے والوں کو قانون بنانے والے چوروں سے مشابہہ نظر آتے تھے بطور خاص اس باعث کہ اچھے تنومند اور چوڑے شانوں والے نوجوان تھے۔

واقعی ایک قانون پیدا ہو گیا تھا لیکن ایک نیا اور حیرتناک قانون تھا: "چونکہ تمہارا ضمیر ناپاک ہے اس لیے آج رات تم مر جاؤ گے!"

اب یکے بعد دیگرے قتل اتنی تیزی سے رونما ہونے لگے جتنی تیزی کے ساتھ موافق ترین ماحول میں بھی فرار کی کوششیں بھی نہ کی جاتی تھیں۔ وہ اعتماد کے ساتھ اور گمنام رہ کر قتل کرتے تھے کوئی بھی خون آلود چاقو لے کر اپنے آپ کو حراست کے لیے پیش نہیں کرتا تھا وہ اپنی ذات اور اپنے چاقو کو آئندہ عمل کے لیے بچا کر رکھتے تھے۔ اپنے پسندیدہ وقت میں، جب کوئی تنہا وارڈر ایک کے بعد دوسری جھونپڑی بند کر رہا ہوتا تھا اور جب بقیہ تمام قیدی محوِ خواب ہوتے تھے، انتقام لینے والے نقاب پوش کسی خاص سکشن میں داخل ہو جاتے، ایک خاص تختۂ خواب تک جاتے اور غدار کو بے تامل موت کے گھاٹ اُتار دیتے جو عالمِ بیداری میں بھی ہو سکتا تھا اور فرطِ خوف سے منت سماجت کرتا ہوا بھی، یا عالمِ خواب میں ہو سکتا تھا۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ وہ مر چکا ہے وہ سُرعت کے ساتھ جائے واردات سے ہٹ جاتے تھے۔

وہ نقاب میں رہتے تھے اور اُن کے بجز نہیں دیکھے جا سکتے تھے۔ انہیں یا تو ہٹا دیا جاتا تھا یا ڈھانپ کر رکھا جاتا تھا لیکن اگر شکار کے پڑوسی انہیں عام حلیے کی بنیاد پر پہچان لیں تو جلدی سے مخبری کرنے کی بجائے وہ تفتیش کے دوران افسران کی دھمکیوں کے باوجود یہ راز افشا نہیں کرتے تھے بلکہ بار بار دُہراتے رہتے تھے، "نہیں، نہیں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم، میں نے کچھ نہیں دیکھا!" اور یہ صورت حال محض ایک دھندلی سچائی کو، جس سے تمام اذیت رسیدہ لوگ واقف تھے، جاننے کی وجہ سے تھی: "جو آپ نہیں جانتے وہ بات آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔" یا حفظِ ماتقدم کا ایک انداز تھا۔ کیونکہ جو بھی نام بتاتا تھا اُسے اگلی صبح پانچ بجے قتل کر دیا جاتا تھا اور افسر تحفظ کی حمایت اُس کے کسی کام نہیں آتی تھی۔

اور اس طرح قتل (ہر چند ان کی تعداد ابھی ایک درجن سے بھی کم تھی) قانون بن گیا۔ ایک عام بات ہو گئی: "کیا آج کوئی مارا گیا؟" قیدی صبح نہانے کے لیے یا ناشتہ لینے کے لیے جاتے ہوئے ایک دوسرے سے دریافت کرتے تھے۔ اس ظالمانہ کھیل میں قیدی کا نقصان یا نیچا ہاتھ نظر آتا تھا۔

یہ وارداتیں بالکل سازشی انداز میں کی جاتی تھیں۔ کہیں پر کوئی (جس کا اقتدار تسلیم کیا جاتا تھا) کسی دوسرے کو صرف ایک نام بتا دیتا تھا: وہ آدمی ہے! یہ کام اُس کے سوچنے کا نہیں تھا کہ کون مرے گا اور کب مرے گا یا چاقو کہاں سے آئیں گے۔ اور مارنے والا آدمی، جسے ان

چیزوں سے واسطہ تھا، اُس منصف سے ناواقف رہتا تھا جس کی سنائی ہوئی سزا پر اُس کو عمل کرنا تھا۔

اگر ہم یہ بات ملحوظ رکھیں کہ کسی شخص کے مخبر ہونے کا دستاویزی ثبوت ملنا مشکل ہے تو ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ مناسب طریقے سے بنائی ہوئی غیر قانونی اور نادیدہ عدالت ان ٹربیونلوں تین اراکین کے پینلوں، فوجی عدالتوں، خصوصی بورڈوں کی بہ نسبت جن سے ہم روشناس ہیں، زیادہ صحیح فیصلہ اور بے حد کم غلط تصفیے کرتی تھی۔

یہ کام، جسے ہم مارکاٹ کہتے تھے اتنی کامیابی کے ساتھ چلا کہ دن میں بھی قتل ہونے لگے اور تقریباً سرعام ہونے لگے۔ ایک پستہ قد، داغدار چہرے والے "بیرک کے بوڑھے" کو جو روسلوک میں ایم۔ کے۔ وی۔ ڈی (حفاظتی پولس) کا ایک بڑا آدمی تھا اور ایک بدنام چغل خور بھی، ایک اتوار سہ پہر میں بالٹیوں والے کمرے میں مار ڈالا گیا۔ قیدیوں کا دل اتنا پکا ہوگیا تھا کہ وہ خون میں لت پت لاش کو دیکھنے کے لیے وہاں بھیڑ لگا کر کھڑے ہو گئے۔

اگلی بار انتقام لینے والے دن دہاڑے چاقو لیے ہوئے ایک مخبر کے تعاقب میں دوڑے جس نے ڈسپلن بیرکوں کی جھونپڑی نمبر ۸ سے کیمپ کے نیچے نیچے کھودی جانے والی ایک سرنگ کے بارے میں غدّاری کی تھی (کیمپ کمانڈ والے بیدار ہو گئے انہوں نے دبونکا کے سرغنوں کو پھانس لیا تھا لیکن مارکاٹ کا عمل اُن کی عدم موجودگی میں بھی جاری تھا) مخبر اُن سے بچ کر بھاگتا ہوا اسٹاف کوارٹروں میں جا پہنچا، وہ اس کے پیچھے پیچھے گئے، وہ ڈویژنل کمانڈر، موٹے میجر میکسیمکو کے دفتر میں گھس گیا اور وہ اب بھی اُس کا پیچھا کرتے رہے۔ اس وقت کیمپ کا ایک نائی آرام کرسی پر دراز میجر کی حجامت بنا رہا تھا۔ کیمپ کے قوانین کے مطابق میجر غیر مسلح تھا۔ کیمپ کے علاقے میں انہیں اسلحے سے مزین رہنے کی ضرورت نہیں ہے جب اُس نے قاتلوں کو چاقوؤں سے لیس دیکھا تو خوفزدہ میجر استرے کے نیچے سے کود پڑا اور رحم کی بھیک مانگنے لگا کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ اسی کو چاقو مارنے والے ہیں۔ یہ دیکھ کر اُسے تسلی ہوئی کہ انہوں نے مخبر کو اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کر دیا (میجر کے پیچھے کوئی تھا بھی نہیں۔ نوزائیدہ تحریک نے ایک ہدایت پر عمل کیا تھا: صرف مخبروں کو مارا جائے، وارڈروں اور افسروں کو نہ چھیڑا جائے) پھر بھی میجر آدمی حجامت میں ہی کھڑکی سے باہر کود گیا، وہ سفید لنگی لپیٹے ہوئے تھا اور گھبراہٹ میں چیختا ہوا گارڈ ہاؤس کی طرف بھاگ رہا تھا: "اے بُرجی والو! گولی چلاؤ۔ میں کہتا ہوں فائر کرو!" لیکن بُرجی والوں نے فائر نہیں کیا۔

ایک موقع پر ایک مخبر اس کے کام تمام ہونے سے قبل ہی چھوٹ کر بھاگا اور زخمی حالت میں اسپتال میں گھس گیا وہاں آپریشن کر کے اس کے پٹیاں باندھی گئیں لیکن اگر وہ چاقوؤں کے خوف سے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا تو کیا اسپتال والے کسی مخبر کو محفوظ رکھ سکتے تھے؟ دو یا تین دن بعد انہوں نے اُسے اسپتال کے بستر پر ہی ختم کر دیا!

پانچ ہزار آدمیوں میں سے تقریباً ایک درجن مارے گئے لیکن چاقو کی ہر ضرب کے ساتھ بندھن اور جال کٹ کٹ کر گرتے رہے۔ ایک عجیب تازہ ہوا بہہ رہی تھی۔ اوپر سے دیکھنے میں ہم پہلے ہی کی مانند ایک کیمپ میں مقید تھے لیکن حقیقتاً ہم آزاد ہو گئے تھے — آزاد ان معنوں میں کہ اپنی زندگی میں بالکل پہلی مرتبہ ہم نے علی الاعلان اور برسرِعام وہ سب کچھ کہنا شروع کر دیا جو ہمارے دل میں آتا تھا۔ جس نے بھی اس تبدیلی کو محسوس نہیں کیا وہ یہ قیاس ہی نہیں کر سکتا کہ اس کی کیا قدر و قیمت ہے؟

اور مخبروں نے — خبریں پہنچانا بند کر دیا۔

اس سے قبل کوئی حفاظتی افسر، جسے چاہتا، دن کے وقت کیمپ ہی میں رُک جانے کے لیے کہہ سکتا تھا اور اُس سے گھنٹوں بات چیت کر سکتا تھا، اُن سے مذمت میں بیان حاصل کرنے کے لیے نئے احکامات جاری کرنے کے لیے یا اُن قیدیوں کے نام معلوم کرنے کے لیے جو عام لوگوں سے مختلف نظر آتے تھے: جنہوں نے تاحال کچھ نہیں کیا تھا لیکن کر سکتے تھے، جن پر مستقبل میں مدافعت کی سازش کر سکنے کا شبہ ہو سکتا تھا۔ جب اُن کے عملی دستے شام کو کام سے واپس آتے تو وہ اُن سے پوچھا کرتے تھے "انہوں نے تجھے کیوں بلایا تھا؟" اور ہمیشہ اُس کا جواب ہوتا تھا، خواہ ڈھیٹ ہو یا بے حیائی سے لبریز: "وہ مجھے کچھ فوٹوگراف دکھانا چاہتے تھے۔"

واقعی بہت سے قیدیوں کو فوٹوگراف دکھائے جاتے تھے اور اُن لوگوں کو شناخت کرنے کے لیے کہا جاتا تھا جنہیں انہوں نے جنگ کے دوران دیکھا ہو۔ لیکن افسرانِ تحفظ یہ تصویریں سب کو نہیں دکھا سکتے تھے اور بہرطور یہ بے معنی کام تھا۔ پھر بھی ہر شخص، دوست اور غدار یکساں طور پر ہمیشہ ان کی نشاندہی کرتے تھے۔ ہمارے اندر شبہات جنم لیتے اور اس طرح ہمیں اپنے خولوں میں چھپ جانے پر مجبور کر دیا جاتا تھا۔

لیکن اب ہوا شک و شبہ سے پاک اور صاف ہوتی جا رہی تھی؛ اب اگر کوئی افسرِ تحفظ بھی کسی شخص کو کام پر جانے کے وقت قطار بندی سے علیحدہ رہنے کی ہدایت کرتا تو وہ نہیں مانتا تھا۔ ناقابلِ یقین؟ چیکا، جی پی یو، ایم وی ڈی کے وجود کے تمام برسوں میں ایسی بات سننے میں نہیں آئی تھی! انہوں نے ایک شخص کو بلایا اور اس کے بجائے کہ وہ دھڑکتے ہوئے دل اور ڈگمگاتے ہوئے پیروں سے وہاں گھسٹتا ہوا جاتا، اس کے بجائے کہ وہ اپنے بوکھلائے ہوئے چہرے پر غلامانہ جذبات طاری کر کے جاتا، اُس نے اپنی بُردباری کو برقرار رکھا (اُس کے گرد والے اُسے بغور دیکھ رہے تھے) اور حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا! کام پر جاتے وقت قطار بندی کے اوپر ہوا میں ایک نادیدہ میزان معلق تھی اس کے ایک پلڑے میں تمام جلانے پہنچانے تو ہتماتی ہیرے یکجا تھے، تفتیش کنندہ افسر زدو کوب مسلسل بیداری کے عالم میں ایستادہ رہنا، صندوق (ایسی تنگ کوٹھڑیاں جن میں بیٹھنا، لیٹنا ممکن نہ تھا) سرد سیلن بھری سزا کی کوٹھڑیاں، چوہے، "کمپل ٹریبیونل"، دوسری اور تیسری سزائیں۔ لیکن یہ سب کچھ بیک وقت نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ آہستہ آہستہ ہڈیوں کو پیسنے والی چکی تھی، یہ ہم سب کو ایک ساتھ نہیں نگل سکتی تھی اور ایک ہی دن میں ہمیں قیمہ نہیں بنا سکتی تھی — اور جب وہ اس میں سے گزر آئے

تھے، جیساکہ ہم میں سے ہر شخص گز رآیا تھا، اُن کا وجود اب تک برقرار تھا۔

دوسرے پلڑے میں ایک چاقو کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ لیکن وہ چاقو تمہارے ہی لیے تھا اگر تم غدّاری کروگے! یہ صرف تمہارے لیے تھا، سینے میں۔ اور کسی دن نہیں، کل ہی علی الصبح۔ اور چیکا ایم۔ جی۔ بی کے تمام جوان بھی تمہیں اس سے محفوظ نہیں رکھ سکتے تھے! یہ چاقو لمبا نہیں تھا بلکہ تمہاری پسلیوں کے درمیان صفائی سے گھونپ دینے کے لیے بس مناسب سائز کا تھا۔ اس کا دستہ بھی بہت اچھا نہ تھا صرف پُرانا انسولیشن ٹیپ پھل کے کُند سرے پر لپٹا ہوا تھا لیکن یہ گرفت میں بہت اچھی طرح آتا تھا اور چاقو اس کی وجہ سے ہاتھ سے پھسلتا نہیں تھا۔

اور یہ طاقتور دھمکی مزید وزن دار ہو جاتی تھی؛ اس سے کمزوروں کو طاقت ملتی تھی کہ وہ چنگل کو چیر پھاڑ ڈالیں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اور اُن کے پیچھے چلیں اس کی وجہ سے بعد میں اُنہیں ایک مناسب حیلہ بھی ہاتھ آ گیا: ہم تو پیچھے رُک جاتے افسر صاحب! لیکن ہمیں چاقو سے خوف آتا ہے... آپ کو اس کا خوف نہیں ہے، آپ نہیں جانتے کہ یہ کیسا ہوتا ہے)

یہی نہیں، انہوں نے نہ صرف حفاظتی افسروں اور کیمپ کے دیگر عہدیداروں کے طلب کرنے پر حاضر ہونا چھوڑ دیا بلکہ وہ اب لفافے یا تحریری کاغذ بھی اس لیٹر بکس میں ڈالنے لگے جو کیمپ کے علاقے میں لگا ہوا تھا، افسرانِ بالا کو تحریری شکایتیں بھیجنے لگے۔ کوئی خط ڈاک میں ڈالنے یا شکایت نامہ ارسال کرنے سے پہلے وہ کسی کو اس پر نگاہ ڈالنے کے لیے کہتے، "بھئی ذرا اسے پڑھ لو، اس میں چغلیاں نہیں کھائی گئی ہیں۔ میرے ساتھ آؤ، میں اسے سپردِ ڈاک کرنے جا رہا ہوں۔"

اس طرح اب افسران اچانک اندھے اور بہرے ہو گئے۔ بظاہر تو ایسا نظر آتا تھا کہ وہ (توندیل میجر اور اُس کا اتنی ہی بھاری توند والا نمبر دو، کیپٹن پروکوفیت اور تمام وارڈر کیمپ میں بے خطر گشت لگاتے ہیں جہاں اُنہیں کوئی خدشہ نہیں؛ ہمارے درمیان چلتے پھرتے ہیں، کیمپ پر نگرانی رکھتے ہیں — لیکن دراصل وہ کچھ دیکھتے نہیں تھے۔ وجہ یہ تھی کہ مخبروں کے بغیر وردی میں ملبوس کوئی آدمی کچھ دیکھنے سننے کے ناقابل ہوتا ہے۔ قیدی باتیں کرنا بند کر دیتے ہیں، اپنی پیٹھ پھیر لیتے ہیں، چیزوں کو چھپا دیتے ہیں، اُن کے پاس سے ہٹ جاتے ہیں... چند گز کے فاصلے پر دغادار مخبر اپنے ساتھیوں کو فروخت کرنے کے لیے بیقرار ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی معمولی سا اشارہ تک کرنے کی جراءت نہیں رکھتا۔

وہ خبر رساں مشین، جس کی طاقت پر انتہائی طاقتور اور وسیع حفاظتی تنظیموں کا کئی دہائیوں سے طوطی بول رہا تھا، ٹوٹ کر گر پڑی تھی!

بظاہر تو اب بھی وہی عمل دستے اُنہیں تعمیر گاہوں پر کام کرنے کے لیے جاتے تھے (لیکن ہم نے آپس میں طے کر رکھا تھا کہ ہم کانوائے گارڈوں کی مزاحمت بھی کریں گے، پانچ پانچ کی قطاریں از سرِ نو نہیں بنانے دیں گے یا مارچ کرتے ہوئے دوبارہ شمار نہ کرنے دیں گے۔ اور ہم کامیاب ہوئے! ہمارے مابین کوئی مخبر نہ تھا چنانچہ ٹامی گن والے بھی کمزور پڑ گئے) کارکن دستے اپنے کام کا

معیار تسلّی بخش رکھتے تھے، واپسی پر وہ حسب سابق وارڈروں کو اپنی تلاشیاں بھی لینے دیتے تھے (لیکن اُن کے چاقو کبھی دستیاب نہیں ہو سکے) لیکن حقیقتاً اب دوسری ہی نوعیت کی انسانی یکجہتی نے اُن لوگوں کو متحد رکھا تھا جنہیں انتظامیہ نے معنوعی طریقوں سے منتشر کر دیا تھا سب سے اہم تو قومی بندشیں تھیں: یوکرینی نیشنل گروپ، متحد مسلمان، اسٹونیائی، لتھوانین — جنہیں مخبر نہیں ٹٹول سکتے تھے۔ یہ فرقے پیدا ہوئے اور پھیلنے لگے۔ قائدین کا کوئی انتخاب نہ کرتا تھا لیکن تنظیمی تجربہ، ذہانت اور تکلیف برداشت کرنے کی صلاحیت رکھنے والے افراد کے منصفانہ اقتدار کو کوئی ناپسند نہیں کرتا تھا اور اپنے فرقے پر اُس کی بالادستی کی مخالفت نہیں کرتا تھا ایک مشاورتی رابطہ کمیٹی بھی علی الاعلان تشکیل دی گئی جیسے کہ وہ فرقوں کی کونسل ہو۔

ٹولیاں رہی تھیں اور ان میں شامل لوگ پہلے سے تعداد میں زیادہ بھی نہ تھے لیکن اب ایک عجیب بات تھی: کیمپ میں دفعتاً فورمینوں کی قلت ہو گئی۔ گلاگ میں یہ ایک نرالا واقعہ تھا۔ ابتدا میں اُن کی اِزالہ فطری معلوم ہوتی تھی۔ ایک اسپتال چلا گیا، دوسرا سروس یارڈ میں کام کرنے لگا۔ تیسرے کی رہائی کا وقت قریب آ گیا تھا۔ لیکن کام کا تعین کرنے والوں کے پاس ہمیشہ ایسے اشخاص کا ہجوم لگا رہتا تھا جو فیٹ بیگ کا ایک ٹکڑا یا ایک سوئیٹر دے کر فورمین کا منصب حاصل کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ اب اُمیدواروں کی بجائے کچھ ایسے فورمین موجود تھے جو پیداواری منصوبہ بندی کے شعبے کے چاروں طرف روزانہ گھوما کرتے اور اپنے عہدے سے حتی الامکان جلد از جلد نجات پانے کی کوشش کرتے تھے!

اب جو حالات تھے ان میں فورمینوں کو بطور سزا کسی مزدور کے خلاف حربے کی طرح استعمال کرنے کا طریقہ فرسودہ ہو گیا تھا اور ہر شخص میں نئے حربے ایجاد کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ جلد ہی فورمینوں کی اتنی کمی پڑ گئی کہ کام تقسیم کرنے والے کسی گروہ کے کوارٹروں میں سگرٹ پینے اور گپ شپ کرنے کے بہانے آتے اور واضح طور پر اُن سے معاونت طلب کرتے ہوئے منت سماجت کرتے تھے "ادھر آؤ لڑکو! تمہارا ایک فورمین ہونا ضروری ہے۔ یہ صورت تو خاصی مضحکہ خیز ہے۔ اب آؤ اور اپنے لیے فورمین کا انتخاب کر لو، ہم بھی اُسے ترقی دے دیں گے!"

ایسے واقعات اس وقت اور بڑھ گئے جب فورمینوں نے بھاگ کر ڈسپلن بیرکوں میں جانا، سنگین دیواروں کے پیچھے چھپنا شروع کر دیا۔ وہی نہیں بلکہ اڈاسکن جیسے خونخوار، کام تقسیم کرنے والے، راز کھولنے والے خطرناک مخبر یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اگلا نمبر اُنہیں کا ہے، خوفزدہ ہو کر بھاگنے لگے۔ کل ہی تو وہ جی داروں کا سا چہرہ بنائے ہوئے تھے، ایسا رویّہ اختیار کیے ہوئے تھے اور یوں سلوک کرتے تھے جیسے وہ جو کچھ ہونے والا ہے اُس کی تائید کرتے ہوں (زیکوں کے موجودہ موڈ میں خدا اُن سے کچھ اور قسم کی بات کہنے کی کوشش کر کے تو دیکھو!) کل رات ہی تو وہ متصل جھونپڑے میں بستر پر لیٹے تھے (سفید کیے پاکشیدہ ماحول میں اپنی زندگی کے تحفظ پر آمادہ، یہ انتظار کرتے ہوئے کہ اس طرح کی مزید راتیں اب اُن کی زندگی میں نہیں آئیں گی) لیکن آج وہ غائب ہو گئے ہیں کسی اطلاع

کو حکم ملتا ہے فلاں فلاں کا سامان ڈسپلن بیرک میں پہنچا دو۔

اسپیشل کیمپ کی زندگی میں یہ ایک نیا دور، ایک مستی کا اور گدگدی پیدا کرنے والا دور تھا۔ ہم لوگ سر پر پیر رکھ کر نہیں بھاگ رہے تھے، وہ بھاگ رہے تھے اور ہمیں اپنی موجودگی سے چھٹکارا دے رہے تھے! ایسے دور کا ہم نے کبھی تجربہ نہیں کیا تھا نہ کبھی اس صفحۂ زمین پر اس کا تصور ہی کیا تھا۔ جب کوئی ناپاک ضمیر والا شخص پُرسکون انداز میں بستر پر لیٹ بھی نہ سکتا تھا! انتقام سر پر لہرا رہا تھا عقبیٰ میں نہیں۔ تاریخ کی عدالت میں نہیں بلکہ انتقام زندہ و مجسم، صبح کی روشنی میں تم پر چھا تو بلند ہو گا۔ یہ پریوں کی کہانی جیسی کیفیت تھی، ایماندار افراد کے پیروں کے نیچے زمین نرم و گرم ہے لیکن غداروں کے پیروں میں یہی چُبھ رہی ہے، تپ رہی ہے۔ اگر ہمارا وسیع بیرونی جزو بھی اتنا ہی خوش نصیب ہو سکتا، آزاد لوگوں کا وطن، جس نے ایسا کا زمانہ کبھی نہیں دیکھا جو شاید کبھی دیکھے گا بھی نہیں!

سخت پتھروں کا قید خانہ، جسے اب وسیع اور مکمل کر دیا گیا تھا، اس کی چھوٹی بند اور ڈھکی ہوئی کھڑکیاں، سیلن اور تاریکی، ایک دوسرے کو دباتے ہوئے دو دو انچ کے تختوں کے حصار سے گھرا ہوا — یہ ڈسپلن بیرکیں جو کیمپ کے افسران نے ہیکڑ لوگوں، مفروروں، بے تکے گاہکوں، احتجاج کرنے والوں، جی دار قیدیوں کے لیے بڑی محبت سے بنوائی تھیں، اچانک پنشن یافتہ مخبروں، خون چوسنے والوں اور دھمکانے والے لوگوں کے لیے آرام گاہیں بن گئی ہیں۔

جو یقیناً کوئی صاحبِ عقل ہو گا جسے پہلے لپک کر چیکسٹوں کے پاس جانے اور یہ درخواست کرنے کا خیال آیا ہو گا کہ اپنے وفادار خادم کو عوام کے غضب سے محفوظ رکھنے کے لیے اس سنگین پنجرے میں پناہ لینے دی جائے۔

خود انہوں نے یہ درخواست کی کہ انہیں زیادہ محفوظ مقام پر بند کیا جائے وہ جیل سے نہیں جیل میں بھاگتے تھے! انہوں نے اپنی مرضی سے یہ بات قبول کی تھی کہ ہم پھر صاف ہوا میں سانس نہیں لیں گے یا سورج کی روشنی نہیں دیکھیں گے۔ میں نہیں جانتا کہ تاریخ میں ایسی کسی بات کا ذکر ملتا ہے۔

جیل کے سربراہوں اور افسرانِ تحفظ نے ان میں سے پہلے والوں پر رحم کھایا اور انہیں اپنی پناہ میں لے لیا۔ انہیں اپنے خاص لوگوں کی دیکھ بھال تو کرنی ہی تھی بیرکوں کی بہترین کوٹھریاں انہیں عطا کی گئیں (کیمپ کے زندہ دل اسے "سیف ڈپازٹ" کہتے تھے!) وہاں چٹائیاں بچھوائی گئیں، زیادہ بہتر کام کام کرنے کا حکم دیا گیا، ایک گھنٹے کی ورزش (باہر گھومنے پھرنے) کا وقت متعین ہوا۔

لیکن پہلے مستعد لوگوں کے پیچھے دوسرے اشخاص کی ایک لمبی قطار لگ گئی جو کم طاقتور ہونے کے باوجود زندہ رہنے کے کم خواستگار نہیں تھے (کچھ نے بھاگتے ہوئے بھی بات رکھنے کی کوشش کی: کون جانے انہیں پھر کسی دن واپس جانا پڑے اور پھر زیکوں کے درمیان رہنا پڑے۔ آرکڈیکن روڈچک کے ڈسپلن بیرکوں میں فرار کو باحتیاط ناٹک کی حیثیت دی گئی۔ قفل بندی کا وقت گزر جانے کے بعد وارڈر جھونپڑی میں آئے، انہوں نے بے رحمی کے ساتھ تلاشی لی۔ اس کی بیڑیوں کے اندر کا سامان بکھا کر باہر نکال دیا، روڈچک کو گرفتار کیا اور آگے وہاں سے لے گئے۔ لیکن کیمپ

کو جلد ہی باوثوق ذرائع سے علم ہو گیا کہ مغرور آرکڈ یکن، جو مصوری اور گٹار کا شائق تھا، دوسرے لوگوں کے ساتھ "سیف ڈپارٹ" میں تھا) کچھ ہی مدت کے بعد اُن کی تعداد ایک "درجن" پندرہ، بیس سے اوپر ہو گئی! ("میچیخو فسکی کا دستہ!" لوگوں نے اُن کا نام اعلیٰ ڈسپلن افسر کے نام پر رکھ دیا!) ایک دوسری کوٹھری بھی اس کام میں لانی پڑی جس کی وجہ سے ڈسپلن بیرکوں کا پیداواری علاقہ اور بھی کم ہو گیا۔

لیکن مخبر کی ضرورت اُسی وقت تک ہوتی ہے اور وہ اُسی وقت تک کارآمد رہتا ہے جب تک وہ بھیڑ میں شامل رہے اور پہچانا نہ جا سکے۔ ایک بار شناخت کر لیے جانے پر وہ ناکارہ ہو جاتا ہے اور اُسی کیمپ میں کام نہیں کر سکتا وہ ڈسپلن بیرک میں بیٹھے بیٹھے روٹی کھاتا ہے، کام پر نہیں جاتا، ثمہ برابر کام نہیں کرتا۔ حفاظتی پولس (ایم۔ وی۔ ڈی) کے کارہائے خیر کی کوئی حد ہے!

اس وجہ سے حفاظت کے لیے گڑگڑاتے ہوئے مخبروں کا سیلاب تھم گیا۔ تاخیر کے ساتھ آنے والوں کو اپنے بیرک کے کپڑوں میں ہی رہنا پڑا اور چاقو کا انتظار کرنا پڑا۔

مخبر تو ملاّح کی طرح ہوتا ہے، ایک بار کام نکل گیا تو کوئی اُسے یاد نہیں رکھنا چاہتا۔ کیمپ کے عہدیداران کو یہ خطرناک تحریک روکنے اور اس کی کمر توڑنے کے لیے اُس کے سدِّباب کی فکر تھی سب سے پہلے انہوں نے وہ طریقہ اختیار کیا جس سے وہ سب سے زیادہ مانوس تھے۔ تحریری فرمان جاری کرنا۔

ہمارے جسم و روح کے مالک یہ تسلیم نہ کرنے کے لیے خصوصی طور پر کوشاں تھے کہ ہماری تحریک کا اندرونی ہیولا سیاسی ہے۔ اپنے دھمکی آمیز احکامات میں (وارڈر تمام جھونپڑیوں میں انہیں پڑھ کر سناتے تھے) اس نئے رُجحان کو غالباً گروہ بندی قرار دیا گیا۔ اس طرح ساری بات بے حد آسان اور قابلِ فہم اور کسی وجہ سے زیادہ قابلِ قبول ہو جاتی تھی۔ کل ہی یہ معلوم ہو رہا تھا کہ انہوں نے ہمارے یہاں "سیاسی قیدی" کا لیبل لگا کر غنڈے چھوڑ دیے ہیں اور سیاسی افراد، جو پہلی بار صحیح معنوں میں سیاسی ہوئے تھے، اب "غنڈے" ہو گئے تھے یہ اعلان کیا گیا تھا لیکن بہت اعتماد کے ساتھ نہیں، کہ غنڈوں کا جلد ہی پتہ لگا لیا جائے گا (اب تک اُن میں سے ایک بھی گرفتار نہیں ہوا تھا) نیز اور بھی کم اعتماد کے ساتھ یہ کہا گیا تھا کہ انہیں گولی مار دی جائے گی۔ احکامات میں آگے چل کر قیدیوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ غنڈوں کی مذمت کریں اور اُن کے خلاف جدوجہد کریں!

قیدیوں نے سُنا اور مذاق اڑا کر چلے گئے، یہ دیکھ کر کہ ڈسپلن افسر "سیاسی" کردار کو اس کے اصل نام سے یاد کرتے ہوئے ڈرتے ہیں (اگرچہ گزشتہ تیس برسوں سے تمام تفتیشوں کا مقصد سیاسی ترغیبات کے الزام عائد کرنا ہوا کرتا تھا) ہم اُن کی دُکھتی رگ کو پہچان گئے تھے۔

اور بے شک یہ دُکھتی ہوئی رگ تھی! اس تحریک کو "گروہ بندی" کا "غنڈہ گردی" کا نام دینا کیمپ کی انتظامیہ کو اس ذمہ داری سے نجات دلانے کا بہانہ تھا کہ انہوں نے کیمپ میں ایک تحریک کو پنپنے کا موقع دیا! یہ بہانہ اوپر والوں، ایم۔ وی۔ ڈی کی صوبائی اور کیمپ تنظیموں کے "گلاگ کے

مرکزی دفاتر اور وزارت کے لیے اتنا ہی سہولت بخش اور لازمی تھا جو انتظامی تشہیر سے خائف رہ کر کام کرتی ہے۔ اور اپنے دائرۂ اختیار میں رہنا پسند کرتی ہے۔ اگر مقتولین ہی وارڈر یا ڈسپلن افسر ہوتے تو دفعہ ۲/۵۸ (دہشت پسندوں سے متعلق) کے تحت کارروائی نہ کرنا دشوار ہو جاتا اور کیمپ کے عہدیداران بآسانی قید کی سزائیں سنا دیتے لیکن موجودہ حالات میں ہمارے مالکوں کو اس بات کا کھلا ہوا موقع ملا کہ وہ، کیمپ میں جو کچھ ہو رہا تھا اُسے "غنڈوں کے گروہوں کا باہمی تصادم" کہہ کر دبا دیں حالانکہ یہ تحریک اصلاحی مشقت کیمپوں کی بیخ و بنیاد ہلائے دے رہی تھی اور یقیناً گلاگ کی انتظامیہ اس کے لیے ذمہ دار تھی۔[۱]

اپنے کام کی لیپا پوتی کرنے کا اُن کا یہی طریقہ تھا۔ لیکن انہوں نے کیمپ کے قاتلوں کو گولی مار دینے کے حق سے بھی اپنے آپ کو محروم رکھا جو واحد کارگر ذریعۂ تدارک تھا۔ اور وہ روزافزوں تحریک کا انسداد نہیں کر سکے۔

فرمان سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ عام قیدیوں نے قتل کی مذمت کرنا اور اپنے مالکوں کی طرف سے جدوجہد کرنا شروع نہیں کیا۔ اگلا قدم یہ تھا کہ سارے کیمپ کو تعزیری پروگرام کے تحت چلایا جائے جس کا مطلب یہ تھا کہ ہفتے کے چھ دنوں میں، تعطیل کے گھنٹوں میں، اتوار کے تمام دن ہم تالوں میں بند رہتے تھے اور ہمیں رفع حاجت کے لیے بالٹیاں استعمال کرنی پڑتی تھیں اور ہمیں کھانا بھی جھونپڑیوں میں فراہم کیا جاتا تھا انہوں نے بڑے بڑے ٹبوں میں سالن ہر جگہ لے جانا شروع کر دیا اور باورچیخانہ ویران ہو گیا۔

یہ سخت انتظام تھا لیکن زیادہ دن تک نہیں چل سکا ہم کام میں سست تھے۔ چنانچہ کان کے ٹرسٹ نے ہنگامہ کھڑا کر دیا اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وارڈروں پر چار گنا کام کا بوجھ آ پڑا وہ مسلسل کیمپ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ بھاگ کرتے رہتے تھے اور دیگوں کو بالٹیوں کے ساتھ اندر بھیجتے، پھر انہیں باہر نکالتے، ہر جگہ کھانا پہنچاتے، مریضوں کو شعبۂ صحت میں لے جاتے اور وہاں سے واپس لاتے۔

کیمپ کے نظام کا مقصد ہمارے لیے زندگی کو اتنا سخت بنا دینا تھا کہ پریشان ہو کر ہم قاتلوں کے نام ظاہر کر دیں۔ ہم نے بڑی جرات کے ساتھ مصیبتیں جھیلیں: صبر و تحمل سے کام لیا اور یہ مناسب ہی تھا! اُن کا دوسرا مطمحِ نظر جھونپڑیوں کو بند رکھنا تھا تاکہ قاتل باہر نہ نکل سکیں اس طرح اُن کا سُراغ آسانی سے مل سکے گا۔ لیکن قتل کی ایک اور واردات ہو گئی اور اس بار بھی کوئی پکڑا نہ جا سکا۔ بالکل اُسی طرح جیسے کسی نے پہلے کچھ دیکھا تھا نہ کچھ جانتا تھا۔ پھر کام پر کسی کا سر توڑ دیا گیا۔ مقفل جھونپڑیوں سے ان حالات کو روکا نہیں جا سکتا تھا۔

انہوں نے تعزیری نظام ختم کر دیا اور اس کی جگہ انہیں "چین کی دیوارِ عظیم" تعمیر کرنے کا شاندار خیال آیا۔ یہ دو اینٹوں کی موٹائی اور چار میٹر بلند دیوار تھی جو کیمپ کے رقبے کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ وہ کیمپ کو دو حصوں میں منقسم کرنے کی بات سوچ رہے تھے۔ لیکن

فی الحال انہوں نے یہ خیال ترک کر دیا (سب اسپیشل کیمپوں میں یہی ہوتا تھا۔ کیمپ کے بڑے علاقوں کو چھوٹے حصّوں میں بانٹنے کے لیے بیریئیر [رکاوٹیں] دیگر بہت سے مقامات پر بن رہے تھے) کیونکہ کان ٹرسٹ اس کام کے لیے رقم نہیں دے سکتا تھا اور چونکہ بستی کو اس سے کوئی فائدہ نہ تھا اس لیے تمام بار، کچی اینٹیں بنانا، انہیں خشک کرنے کے لیے اِدھر اُدھر منتقل کرنا، دیوار تک لے جانا، انہیں چننا، ایک مرتبہ پھر ہم پر، ہمارے اتواروں پر اور کام سے پلٹنے کے بعد ہمارے ہلکے موسم گرما کی شاموں پر آ پڑا۔ ہم اس دیوار سے بہت بیزار تھے — ہم جانتے تھے کہ افسران کوئی گندی چال چلنے والے ہیں لیکن ہمارے پاس اُسے تعمیر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہمارا بہت تھوڑا سا بدن ہی ابھی آزاد ہوا تھا ہمارے سر اور ہمارے مُنہ۔ لیکن اب بھی اپنے شانوں تک ہم غلامی کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے۔

یہ سب تدبیریں، دھمکی آمیز احکام، تعزیری نظام، دیوار۔ بھونڈے اور زندانی طرز فکر کی عظیم روایت کے حصّے تھے۔ لیکن یہ کیا تھا؟ بغیر کسی تنبیہہ یا وضاحت کے یکے بعد دیگرے گروہوں کو فوٹو گرافی کے کمرے میں طلب کیا گیا۔ اُن کی تصویریں کھینچی گئیں، لیکن ملائمت کے ساتھ؛ اُن کی گردنوں کے چاروں طرف کالروں پر نمبر لگائے بغیر، اُن سے اپنے سر کو ایک خاص زاویے پر موڑنے کا حکم دیے بغیر، بس آرام سے بیٹھ جاؤ اور جس طرف چاہو دیکھتے رہو۔ شعبۂ تعلیم و ثقافت کے ایک بے احتیاط بیان سے مزدوروں کو علم ہوا کہ اُن کے فوٹو "دستاویزوں کے لئے کھینچے جا رہے ہیں۔"

کن دستاویزات کے لیے؟ قیدیوں کے پاس کون سی دستاویزیں ہو سکتی ہیں؟

رجائیت پسندوں میں اُمنگ کی لہر دوڑ گئی، شاید وہ پاس تیار کر رہے ہیں تا کہ قیدی نگراں کا نوائے کے بغیر چل سکیں؟ یا شاید؟ یا شاید ....؟

پھر ایک وارڈر رخصت گزار کر پلٹا اور اُس نے دوسرے سے بآوازِ بلند (قیدیوں کی موجودگی میں) کہا کہ راہ میں اُس نے گھر جانے والے رہا کردہ قیدیوں سے بھری ہوئی گاڑیاں دیکھی تھیں۔ جو نعرے لگا رہے تھے اور سبز شاخیں لہرا رہے تھے!

یا الٰہی! ہمارے دل کتنی تیزی سے دھڑکنے لگے! اُنہیں جنگ کے اختتام پر اسی طرح آغاز کرنا چاہیئے تھا! کیا بالآخر یہ واقعی شروع ہو گیا؟

ہم نے سنا کہ کسی کے پاس اپنے خاندان والوں کا مکتوب آیا تھا کہ اُس کے پڑوسی رہائی پا چکے ہیں اور گھر آ گئے ہیں!

اچانک فوٹو کھنچوانے والی بریگیڈ کے ایک آدمی کو ایک بورڈ کے روبرو طلب کیا گیا۔ ایک ایک کر کے اندر جاؤ۔ ایک میز کے پاس جس پر سرخ کپڑا بچھا تھا، اسٹالن کی تصویر کے نیچے ہمارے کیمپ کے اعلٰی افسران براجمان تھے لیکن تنہا نہیں، وہاں دو غیر معروف آدمی بھی تھے ایک قازق تھا، دوسرا روسی یہ پہلے ہمارے کیمپ میں کبھی نہ آئے تھے۔ وہ کام کی بات کرنے والوں کے ساتھ خوش مزاجی سے پیش آ رہے تھے اور اُن کے فارموں کی خانہ پُری کر رہے تھے: خاندانی نام؟ پہلا نام؟ سال پیدائش؟ جائے ولادت؟ اور پھر روایتی سوال "کس دفعہ کے تحت سزا ہوئی؟ سزا کی میعاد؟ سزا کا خاتمہ؟" کے بجائے

انہوں نے تفصیل کے ساتھ اس آدمی کے خاندانی حالات، اُس کی اہلیہ، اُس کے والدین، بچے ہیں یا نہیں، کتنی عمر کے ہیں، وہ سب کہاں رہتے ہیں، یکجا رہتے ہیں، الگ الگ، قسم کے سوالات دریافت کیے اور ان سب باتوں کو قلمبند کر لیا گیا۔ بورڈ کا کوئی ممبر کلرک سے کہتا کہ "یہ بات بھی لکھ لو"۔

عجیب، بیحد خوشگوار قسم کے سوالات ہیں! ان میں ہم میں سے سخت ترین آدمی بھی پُر امید ہونے لگے اور اُن کا جی بھی بھر آیا۔ سالہا سال سے وہ جھڑکے سے دریافت کیے جانے والے یہ سوالات، "دفعہ؟ سزا؟ عدالت" ہی سن رہے تھے اور اچانک وہ رحمدل، سنجیدہ، انسان دوست ہمدرد افسروں کو بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں جو ان سے اطمینان اور ملائمت کے ساتھ، ہاں ہمدردانہ لہجے میں ایسی باتیں دریافت کر رہے ہیں جنہیں اتنی گہرائی میں دفن کر دیا گیا تھا کہ قیدی خود اُنہیں چھونے سے ڈرتے تھے اور وہ باتیں جن کے بارے میں کبھی کبھار تختۂ خواب پر سونے سے پہلے وہ دو ایک لفظ اپنے پڑوسی سے کہہ دیتے تھے یا پھر بھی نہ کہتے تھے... اور یہ افسر (اگر تمہیں یہ بات ذرا سی بھی یاد ہے تو تم اس لیفٹننٹ کو معاف کر دو گے جس نے تم سے تمہارے خاندان کی تصویر چھین لی تھی اور انقلاب اکتوبر کی سالگرہ کے دن اُسے چاک کر دیا تھا!) یہ افسر، جب وہ سُنتے ہیں کہ تمہاری بیوی نے دوسری شادی کر لی ہے، کہ تمہارے والد کی صحت تیزی سے گرتی جا رہی ہے اور وہ تمہیں پھر سے دیکھنے کی اُمید ترک کر چکے ہیں، تو اداسی کے ساتھ اظہار افسوس کرتے ہیں نظروں سے اشارے کرتے ہیں اور ہمدردی کے طور پر سروں کو جنبش دیتے ہیں۔

نہیں، آخرش وہ اتنے بُرے نہیں ہیں، ابھی ان میں انسانیت باقی ہے، قصور تو اس کمبخت ملازمت کا ہے جس میں وہ اُلجھ گئے ہیں اور جب وہ یہ سب قلمبند کر چکتے ہیں تو ہر قیدی سے آخری سوال یہ کیا جاتا ہے:

"ٹھیک ہے، اب تم یہ بتاؤ کہ تم کہاں رہنا چاہتے ہو؟ جہاں تمہارے والدین ہیں یا جہاں تم پہلے مقیم تھے؟"

نیک کی آنکھیں پھٹ جاتی ہیں "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ میں بیرک نمبر ۲ میں مقیم ہوں....!"

"دیکھو، یہ سب ہمیں معلوم ہے" افسر ہنستے ہیں "ہم دریافت کر رہے ہیں کہ تم کہاں رہنا پسند کرو گے۔ فرض کرو کہ تمہیں رہا کر دیا جائے تو تمہارے کاغذات کہاں کے لیے تیار کیے جائیں؟"! قیدی کی آنکھوں کے سامنے ساری دُنیا گھومنے لگتی ہے، دُھوپ پھٹ کر رنگین دُھند بن جاتی ہے، اپنے دل میں وہ سمجھتا ہے کہ یہ عالم خواب ہے، پریوں کی کہانی ہے۔ اور یہ حقیقی نہیں ہو سکتی۔ کہ اُس کی سزا پچیس یا دس سال کی ہے، کہ کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا ہے، کہ وہ ہر طرف سے مٹی میں لتھڑا ہوا ہے اور کل پھر اپنے کام پر جائے گا۔ لیکن وہاں کئی افسران براجمان ہیں، ان میں سے دو میجر ہیں جو سکون کے ساتھ، ہمدردی کا سے اصرار کر رہے ہیں:

"تو پھر وہ کون سی جگہ ہو گی؟ اس کا نام بتاؤ۔"

اس کے دل پر ہتھوڑے سے چل رہے ہیں اور شکر گزاری کی گرم لہریں اس پر سے گزر رہی ہیں جس طرح کوئی لڑکا اپنی محبوبہ کا نام لیتے ہوئے شرماتا ہے، وہ اپنا چھپا ہوا راز افشا کر دیتا ہے۔

اگر وہ چار ہندسے پہننے والا بد نصیب قیدی نہیں رہے گا تو اپنی باقیماندہ زندگی سکون کے ساتھ کہاں گزارنا پسند کرے گا۔

اور وہ ۔۔۔۔ اسے قلمبند کر لیتے ہیں! اور اگلے آدمی کو بلانے کے لیے کہتے ہیں ادھر پہلا نیم مجنوں سا ہو کر بھاگتا ہوا برآمدے میں آتا ہے اور دوسرے لڑکوں کو بتاتا ہے کہ اس پر کیا گزری۔

گروہ کے آدمی پیچھے بعد دیگرے جاتے ہیں اور دوستانہ رویے والے افسروں کے سوالوں کا جواب دیتے ہیں اور پچاس میں کوئی ایک ایسا ہے جو چوڑی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا ہے:

یہاں سائبیریا میں سب کچھ بہت عمدہ ہے صرف آب و ہوا قدرے گرم ہے۔ کیا میں قطب شمالی میں نہیں جا سکتا؟

یا، "یہ لکھ لیجئے: کیمپ میں ہی میری ولادت ہوئی تھی۔ اور میں یہیں مروں گا، اس سے بہتر جگہ کا علم مجھے نہیں ہے۔"

انہوں نے اس قسم کی گفتگو دو یا تین ٹولیوں سے کی (کیمپ میں ایسے دو سو گروہ تھے) کیمپ میں کچھ دنوں تک خاصا جوش و خروش رہا۔ اب گفتگو کے لیے ایک موضوع ہاتھ آچکا تھا ہر چند کہ ہم میں سے نصف آدمی اس پر حقیقتاً یقین نہیں کرتے تھے۔ وہ زمانہ گزر چکا تھا۔ لیکن بورڈ کی نشست پھر کبھی نہیں ہوئی۔ فوٹو گرافی پر ان کا کچھ صرف نہ ہوا تھا، کیمرے کلک کرتے تھے مگر اُن میں فلمیں نہیں تھیں۔ لیکن ان بدمعاشوں کے ساتھ دل کھول کر بات چیت کرنے کے لیے بھیڑ لگا کر بیٹھنے سے اُن کی قوت برداشت پر بڑا اثر پڑا۔ اور اس طرح اس فریب کاری کا کوئی ثمر برآمد نہ ہو سکا۔

(ہمیں تسلیم کرنا ہو گا کہ یہ ایک عظیم فتح تھی! ۱۹۴۹ء میں ہولناک شدائد والے کیمپ قائم کئے گئے تھے اور بلا شبہ یہ آخر تک برقرار رہنے کے لیے وجود میں آئے تھے۔ پھر ۱۹۵۱ء تک اُن کے مالک اس طرح گریہ و زاری کرنے اور ڈھونگ رچانے پر اُتر آئے تھے۔ ہم اپنی کامیابی کی اور اُس کی منظوری کی توقع اور کس طرح کر سکتے تھے؟ انہیں اصلاحی مشقت کیمپوں میں کبھی اس طرح کا کوئی ڈرامہ نہیں کرنا پڑا!؟)

چاقو بار بار لہراتے رہے۔

تو ہمارے آقاؤں نے گرفتار کرنے کا تہیہ کیا، مخبروں کی کمی کے باعث انہیں صحیح علم نہ تھا کہ وہ کنہیں گرفتار کرنا چاہتے ہیں لیکن اب بھی اُن کے اپنے قیاسات اور شکوک تھے اور شاید چغلیاں کسی اور طرح فریب دے کر کرائی جاتی تھیں۔

کام کے بعد دو وارڈر ایک جھونپڑے میں آئے اور انہوں نے عمومی انداز میں ایک قیدی سے کہا، "تیار ہو جاؤ اور ہمارے ساتھ چلو!"

قیدی نے اپنے چاروں طرف لڑکوں پر نگاہ ڈالی اور بولا، "میں نہیں جاؤں گا!"

سچ پوچھیے تو اس سہل روز مرہ کی کیفیت میں، کوئی گرفتاری، جس کی ہم نے کبھی مدافعت نہیں کی تھی جسے ہم اپنا نصیب سمجھ کر تسلیم کر لینے کے عادی ہو چکے تھے، ایک اور امکان بھی رکھتی تھی۔ ہم

کہہ سکتے تھے، "میں نہیں جاؤں گا!" ہمارے آزاد ذہن اب اس بات کو سمجھنے لگے تھے۔ وارڈراس پر جھپٹ پڑے: "کیا مطلب ہے؟ کیسے نہیں جائے گا؟"

"ہاں، ہاں۔ میں نہیں جاؤں گا!" زنیک نے استقلال کے ساتھ کہا "میں اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہوں!" چہار جانب سے آوازیں بلند ہوئیں۔

"اُسے کہاں لے جا رہے ہو؟ اُسے کس لیے لے جا رہے ہو؟ ہم تمہیں اس کی اجازت نہیں دیں گے ہم نہیں لے جانے دیں گے! بھاگ جاؤ۔۔۔!"

اور بھیڑیے سمجھ گئے کہ اب ہم وہ بھیڑیں نہیں ہیں جو کبھی ہوا کرتے تھے کہ اب اگر وہ ہم میں سے کسی کو گرفتار کرنا چاہیں تو انہیں فریب کاری سے کام لینا ہوگا یا یہ عمل گارڈ ہاؤس پر کرنا ہوگا۔ یا ایک قیدی کو گرفتار کرنے کے لیے تمام پولس کے عملے کی ضرورت ہوگی۔ ہر طرف بھیڑ ہوگی تو اُسے وہ کبھی نہ لے جا سکیں گے۔

انسانی غلاظت سے نجات پاکر، جاسوسوں اور چغل خوروں سے آزاد ہوکر ہم نے متحیرانہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور سمجھا کہ۔۔۔ ہم ہزاروں تھے! کہ ہم۔۔۔ سیاسی قیدی تھے کہ ہم مدافعت کر سکتے تھے۔

ہم نے اچھا انتخاب کیا تھا۔ اگر ہم نے زنجیر کے اس حلقے پر زور ڈالیں گے تو زنجیر ٹوٹ جائیگی ــ مخبر اور غدار ــ! ہم ہی میں سے تھے جنہوں نے ہمارا جینا دوبھر کر رکھا تھا جیسے کسی قدیم قربان گاہ پر اُن کا لہو بہایا گیا ہو تاکہ اُس عتاب سے نجات مل سکے جو ہم پر نازل ہوا تھا۔

انقلاب قوت حاصل کر رہا تھا۔ جو ہوا مدھم پڑ گئی تھی وہ ہمارے بیقرار پھیپھڑوں کو بھرنے کے لیے آندھی بن کر دوبارہ اُبھر آئی تھی۔

گیارھواں باب

سعیِ سلاسل شکنی

اب درمیانی زمین دھنس گئی تھی۔ ہمارے اور ہمارے سرپرستوں کے درمیان جو خندق تھی اب اس نے خلیج کی شکل اختیار کر لی تھی اور ہم کو ڈھلانوں پر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہو کر حالات کا جائزہ لیتے ہوئے کھڑے تھے۔

"کھڑے تھے" تو بلاشک روزمرہ کی گفتگو کا انداز ہے۔ ہم اپنے نئے فورمین کے ساتھ روز کام پر جاتے تھے (کچھ فورمین خفیہ طور پر منتخب کیے گئے تھے اور سب کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے کام کرنے پر مجبور کیے گئے تھے اور کچھ اس وقت قسمتی نہیں تھے لیکن اب اتنے ہمدرد، اتنے رفیق اور اتنے خیراندیش ہو گئے تھے کہ شناخت میں نہ آتے تھے) ہم اس کام کے لیے قطار بندی میں کبھی تاخیر نہ کرتے تھے، کوئی حیلہ سازی یا کام چوری کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے ہم ایک پورے دن کا کام کرتے تھے۔ آپ شاید خیال کریں کہ ہمارے آقا ہم سے خوش ہوتے ہوں گے۔ اور کہ ہم ان سے خوش ہو سکتے تھے وہ چیخنا اور دھمکیاں دینا بالکل بھول گئے تھے اور اب معمولی معمولی باتوں پر ہمیں ڈسپلن بیرکوں میں نہیں گھسیٹتے تھے۔ ان کا رویہ ایسا نہیں معلوم ہوتا تھا جیسے ہم نے ان کی آمد پر تغلیظا ٹوپیاں اتارنا بند کر دیا ہو۔ میجر میکسیمنکو کام کے لیے قطار بندی کی غرض سے اب صبح نہیں بیدار ہوتا تھا لیکن شام کو نگرانی کے پھاٹک پر کام کرنے والے کالموں کا استقبال کرنا ضرور پسند کرتا تھا اور جب وہ اس جگہ انتظار کر رہے ہوتے تھے تو قیدیوں کے ساتھ ایک آدھ مذاق بھی کر لیتا تھا۔ وہ موٹے آدمیوں والی بے فکری سے ہماری طرف مسرور مسکراہٹ کے ساتھ ایسے دیکھتا تھا جس طرح کوئی یوکرینی رینجر (بھیڑ یا پالنے والا) شاید ایمن اپنے کشیر ریوڑ کو اسٹیپی سے گھر کی طرف پلٹتے ہوئے دیکھتا ہو۔ انھوں نے اتوار کے دن کبھی کبھار ہمیں فلمیں دکھانی شروع کر دیں۔ بس ایک بات تھی، وہ ہمیں "عظیم دیوار چین" سے پریشان کرتے رہے۔

پھر بھی ہم اور وہ، اگلی منزل کے بارے میں پوری قوت کے ساتھ سوچ رہے تھے۔ حالات جہاں سے تھے وہیں نہیں رہ سکتے تھے، جو کچھ ہوا تھا۔ ہم اس پر قناعت نہیں کر سکتے تھے۔ نہ وہ قانع ہو سکتے تھے۔ کسی نہ کسی کو چوٹ کرنی تھی۔

لیکن ہمارا مجوزہ نظر کیا ہو؟ اب ہم بلند آواز میں، گھبراہٹ کے ساتھ ادھر ادھر تاک جھانک کیے بغیر، جو بھی چاہیے کہہ سکتے تھے۔ وہ تمام باتیں جو ہمیں بے قرار کرتی تھیں (اور بولنے کی آزادی تھی، خواہ وہ وہاں کیمپ تک ہی محدود تھی، ہر چند کہ اتنی تاخیر سے حاصل ہوئی تھی لیکن مسرت بخش تھی!) لیکن

کیا ہم اس آزادی کی توسیع کیمپ کے باہر بھی کر سکتے تھے یا اسے اپنے ساتھ باہر لے جا سکتے تھے؟ بلا شک نہیں! ہم اور کون سے سیاسی مطالبات پیش کر سکتے تھے؟ اب ہم کوئی بات کبھی سوچ نہیں پاتے تھے، خواہ بے تکی اور یاسیت آمیز ہی کیوں نہ ہو۔ ہم کچھ بھی سوچ نہ پاتے تھے۔ جس جگہ ہم تھے وہاں سے یہ مطالبہ تو کر نہ سکتے تھے کہ ملک کو مکمل طور پر تبدیل کیا جائے نہ یہ کہ وہ کیمپوں کو ختم کر دیں۔ وہ ہم پر بمباری کر دیتے ۔

ہمارے لیے یہ مطالبہ پیش کرنا فطری ہوتا کہ ہمارے معاملات پر نظرِ ثانی کی جائے اور بے وجہ ٹھونپی ہوئی نامناسب سزائیں رد کی جائیں۔ لیکن یہ مطالبہ بھی فضول سا نظر آتا تھا وطن کے اوپر دہشت کا جو غلیظ اور دبیز کہرا چھایا ہوا تھا اس میں، ہم میں سے بیشتر کے خلاف چلائے گئے مقدمات اور دی گئی سزائیں ہمارے منصفوں کو قرینِ انصاف نظر آتی تھیں اور انھوں نے خود ہمیں یہ بات باور کرا دی تھی۔ علاوہ ازیں منصفانہ نظرِ ثانی محض ایک نمائشی عمل تھا۔ جس پر عوام کی گرفت تھی اور ہمیں فریب دینے کا اس سے سہل اور کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ وعدہ کر سکتے تھے، کارروائی شروع کر سکتے تھے۔ اور مزید تفتیش کے لیے واپس آ سکتے تھے۔ یہ سلسلہ برسوں تک جاری رہ سکتا تھا۔ فرض کیجیے کسی کو دفعتاً آزاد کر دیا گیا اور ہٹا دیا گیا۔ ہمیں یہ کیسے یقین آتا کہ اسے گولی سے اڑانے کے لیے نہیں لے جایا گیا، یا دوسری جیل میں، از سرِ نو سزا بھگتنے کے لیے منتقل نہیں کر دیا گیا؟

کیا، لوہرڈ، کے ڈرامے نے ہمیں پہلے ہی نہیں سکھایا تھا کہ فریب میں مبتلا کرنا کس قدر سہل عمل ہے لوہرڈ تو ہمیں منصفانہ نظرِ ثانی کے بغیر ہی گھر پہنچانے کی بات کر رہا تھا.....

جس بات پر ہم سب کا اتفاق تھا اور ہمارے دلوں میں کوئی شک و شبہ نہ تھا، وہ یہ تھی کہ سب سے زیادہ توہین آمیز چلن ختم ہونا چاہیے؛ جھونپڑیوں پر رات کو تالا نہیں پڑنا چاہیے۔ وہاں سے پاخانے کی بالٹیاں ہٹنی چاہئیں، نمبروں کی پٹیاں اترنی چاہئیں، ہماری محنت سرے سے اجرت کے بغیر نہیں ہونا چاہیے، ہمیں سال میں بارہ خط لکھنے کی اجازت ملنی چاہیے (لیکن یہ سب ادوان سے بھی زیادہ۔ سچ پوچھیے تو سال میں چوبیس خط لکھنے کا حق ـــــ اصلاحی مشقتی کیمپوں میں ہمیں حاصل تھا۔ لیکن کیا ان سے وہاں زندگی قابلِ برداشت بن گئی تھی؟)

اس سوال پر ہم متفق الرائے نہ تھے کہ ہمیں آٹھ گھنٹے کی محنت کے مطالبے کے لیے لڑنا چاہیے یا نہیں۔ ہمیں آزادی کی عادت اتنی کم رہ گئی تھی کہ ایسا محسوس ہوتا تھا اس کے لیے ہماری خواہش ہی ختم ہو گئی ہو۔

طریقہ اور وسائل پر بھی غور و خوض کیا گیا۔ ہم اپنے مطالبات کیسے پیش کریں؟ ہم کیا کارروائی کریں، ظاہر تھا کہ جدید اسلحہ کے سامنے ہم خالی ہاتھوں کے ساتھ کچھ نہ کر سکتے تھے اس لیے ہمارے پاس اختیار کرنے کے لائق راستہ مسلح بغاوت کا نہیں بلکہ ہڑتال کا تھا۔ ہڑتال پر ہم، مثال کے طور پر اپنی نمبروں والی پٹیاں خود پھاڑ کر پھینک سکتے تھے۔

لیکن ہماری تعلیمات کی شکل اب بھی غلامانہ اور جی حضوری کی تھی۔ اسی وجہ سے اپنے نمبروں سے

ان توہین آمیز نمبروں کو ہٹانا ہم سب کو ایسا جرأت مندانہ اور گستاخانہ، ایسا ناقابلِ تبدیل اقدام معلوم ہوتا تھا جیسے کہ جیسے ہم مشین گنیں لے کر سڑکوں پر آگئے ہوں! اور لفظ "ہڑتال" ہماری سماعت کو اتنا ہولناک لگتا تھا کہ ہم نے زیادہ مستحکم بنیاد تلاش کرنے کی کوشش کی: "جب ہم کام کرنے سے انکار کر دیتے تھے تو کھانے سے بھی انکار کر کے ہمیں ایسا لگتا تھا۔ اخلاقی جواز حاصل ہو گیا ہے۔ ہمیں محسوس ہوتا تھا کہ ہمیں ایک طرح سے ہڑتال کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن عام معنوں میں ہڑتال کرنا؟ ہمارے وطن سے نسل در نسل اس یقین کے ساتھ پروان چڑھی تھی کہ بھیانک اور خطرناک اور بلاشبہ انقلاب دشمن لفظ "ہڑتال" انشانٹ (روس کے خلاف سازش)، "ڈنکین" "قلاق تخریب" اور ہٹلر جیسے الفاظ کے ساتھ رشتہ رکھتا ہے۔

اس طرح اپنی مرضی سے ہم نے ایک غیر ضروری بھوک ہڑتال کر کے اپنی جسمانی قوت کو کمزور کرنا قبول کر لیا جس کی جد و جہد کے دوران اشد ضرورت تھی (خوش نصیبی سے دوسرے کسی کیمپ نے ایکی باسٹز کی اس غلطی کا غالباً اعادہ نہیں کیا)

ہم نے مجوزہ کام کی ہڑتال اور بھوک ہڑتال کی باریکیوں پر بار بار غور کیا۔ کیمپوں کے لیے تیار کردہ، عام ڈسپلن پالیسی سے جو ہم پر حال ہی میں نافذ کی گئی تھی۔ یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ جواباً ہمیں ہماری جھونپڑیوں میں مقفل کر دیں گے۔ اس وقت ہم ایک دوسرے سے رابطہ کیسے قائم کریں گے، ہڑتال کو جاری رکھنے کے لیے ہدایات ایک سے دوسری جھونپڑی تک کیسے پہنچائیں گے؟ کسی کو کچھ اشارے متعین کرنے ہوں گے اور جھونپڑیوں والوں کو اتفاق رائے سے طے کرنا ہوگا کہ یہ ہدایات کن کھڑکیوں سے دی جائیں گی اور کن کھڑکیوں پر وصول کی جائیں گی۔

اس بارے میں کئی جگہ بات چیت ہوئی۔ اس گروہ میں یہ اس وقت میں ناگزیر اور لازمی معلوم ہوتا تھا کیوں کہ یہ کام اتنا نیا اور ایک طرح سے ناممکن العمل تھا۔ ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہم فرداً فرداً یکجا ہوں گے۔ اپنے مذاکرات مکمل کریں گے، ارادوں کا اعلان کریں گے اور.....

لیکن ہمارے سرپرستوں کو چپ چاپ سازش نہیں کرنی پڑی۔ ان کے پاس واضح ہدایات جاری کرنے والی تنظیم تھی، وہ عمل کے زیادہ عادی تھے۔ انھیں کارروائی کرنے سے اتنا زیادہ نقصان نہیں ہو سکتا تھا جتنا بے عملی کی صورت میں۔ اور انھوں اپنی ضرب پہلے لگائی۔

اس کے بعد واقعات کا سلسلہ از خود زور پکڑتا گیا۔

اپنے مانوس سکشنوں میں اپنے مانوس تختہ ہائے خواب پر سکون اور اطمینان کے ساتھ دراز ہو کر ہم نے سال ۱۹۵۲ء کو خوش آمدید کہا۔ پھر ۶ر جنوری اتوار کو جو آرتھوڈاکس کرسمس کی چاندرات تھی۔ یوکرینی اپنے طور پر چھٹی منانے کی تیاری کر رہے تھے، وہ کٹیا* بنائیں گے اور پہلا ستارہ طلوع ہونے پر روزہ رکھیں گے پھر قبر دل جائیں گے ــــ تب صبح کے معائنے کے بعد دروازے بند کر دیے گئے۔ اور پھر نہیں کھولے گئے۔

کسی کو بھی یہ توقع نہ تھی بلکہ تبادلے خفیہ طور پر چھپا کر کی گئی تھیں۔ کھڑکیوں سے ہم نے دیکھا کہ

وہ اگلی جھونپڑی کے تقریباً سو قیدیوں کو ان کے سارے سامان کے ساتھ برف میں مارچ کراتے ہوئے گارڈ ہاؤس کی طرف لے جا رہے تھے۔

کیا انھیں کسی دوسرے کیمپ میں منتقل کیا جا رہا ہے؟

اب ہماری باری تھی۔ وارڈر آئے اور کارڈ لیے ہوئے افسر بھی۔ انھوں نے کارڈ پڑھ کر نام پکارے۔ اپنا تمام سامان، چٹائیاں جیسی ہیں ویسی ہی، انھیں خالی کیے بغیر ساتھ لے کر باہر آ جاؤ۔

تو یہ بات تھی۔ نئے گروپ بنائے جا رہے ہیں! دیوارِ چین میں تعمیر شدہ راستے پر نگراں پہرے دار تعینات کر دیے گئے۔ اگلے دن اسے اینٹوں سے بند کر دیا جائے گا۔ ہمیں، سینکڑوں افراد کو ریوڑ کا ریوڑ پورے میٹرلیس اٹھائے ہوئے، جیسے کسی آتش زدہ گاؤں سے نکلتے ہوئے پناہ گزین ہوں۔ گارڈ ہاؤس سے آگے، سرحدی باڑ کے پاس سے نکلتے ہوئے، الٹی جانب ہانکا جا رہا تھا۔

سارے دماغ یہ حساب لگانے میں مصروف تھے کہ کنھیں ہٹایا گیا تھا۔ اور کون پیچھے رہ گئے تھے اس الٹ پھیر کا کیا مطلب ہے، ہمارے مالکوں کے دل میں کیا تھا۔ یہ بات جلد ہی واضح ہو گئی۔ کیمپ کے نصف حصے (کیمپ ڈویژن نمبر۲) میں صرف یوکرینی قوم پرست۔ تقریباً دو ہزار افراد رہ گئے تھے۔ جس نصف حصے میں ہمیں دھکیلا گیا تھا اور جو اب کیمپ ڈویژن نمبر۱ کے نام سے موسوم ہونے والا تھا، اس میں تقریباً ۳۵۰۰ آدمی تھے جو باقی ماندہ تمام فرقوں کا اجتماع تھا۔ روسی، اسٹونی، آرمینی، یہودی، پول، مولڈاوین، جرمن اور یورپ و ایشیا کے وسیع قطعہ ہائے زمین سے چنیدہ اور مختلف فرقوں کے تھوڑے تھوڑے متفرق اشخاص ایک لفظ میں — ہمارا وطن، ایک اور ناقابلِ تقسیم! یہ عجیب بات تھی۔ حفاظتی پولس کا اندازِ فکر جسے اشتراکیت نامی انتہائی قوم پرستانہ اصول سے باخبر ہونا چاہیے تھا، ابھی اسی پرانے ڈھرے پر کاربند تھا (فرقے سے فرقے کو علیحدہ کرنے کا طریقہ)

پرانے گروپ ٹوٹ گئے، نئی ٹولیاں بنائی گئیں۔ وہ نئے تعمیری کاموں پر جائیں گی، نئی جھونپڑیوں میں قیام کریں گے۔ مختصراً ایک مکمل الٹ پھیر۔ یہاں صرف ایک اتوار کے لیے ہی نہیں پورے ہفتے تک سوچنے کے لیے کافی مواد تھا۔ بہت سی کڑیاں ٹوٹ گئیں، لوگ علیحدہ علیحدہ دستوں میں بٹ گئے، اور ہڑتال جو بہت قریب نظر آ رہی تھی، ٹوٹ گئی۔ اوہ وہ چالاک نکلے۔

پورا اسپتال، کمرۂ طعام اور کلب یوکرینی کیمپ ڈویژن میں رہے۔ ہمارے پاس ان کے بدلے میں کیمپ جیل رہ گئی اور یوکرینی بینڈرسٹ جو سب سے خطرناک باغی تھے۔ اس سے اور دور ہٹا دیے گئے۔ اس کا کیا مطلب تھا؟

ہمیں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ سب کیا تھا؟ باوثوق تمام افواہیں کیمپ میں گشت کرنے لگیں (ان کام کرنے والے قیدیوں سے جو بی۔ یو۔ آر میں دلیہ لے جایا کرتے تھے) کہ "سیف ڈپازٹ" میں مخبر گستاخ ہو گئے تھے۔ اِدھر اُدھر سے گرفتار شدہ، مشتبہ لوگ۔ ایک وقت میں دو یا تین کی تعداد میں مخبروں کے ساتھ رکھے جاتے تھے جو اپنے مشترکہ سیل میں انھیں ایذائیں پہنچاتے تھے۔

ان کے گلے گھونٹ رہے تھے، انھیں زدوکوب کرتے تھے انھیں "گانے" اور نام اگلنے پر مجبور کرتے تھے۔ "مارپیٹ کون کر رہا ہے؟" اس سے سارا منصوبہ روز روشن کی طرح منکشف ہو گیا۔ وہ اینڈا پھنچا رہے تھے خود کتوں کا غول نہیں۔ اس کا اختیار غالباً انھیں حاصل نہ تھا اور جھیلے میں پڑ سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے یہ کام مخبروں کو تفویض کر دیا۔ اپنے قاتلوں کو خود تلاش کر لو! مخبر خاصے متفکر تھے اور انھیں کسی ترغیب کی ضرورت نہیں تھی! اور ان دوسروں پر کفالت کرنے والوں کے لیے یہ روزی کمانے کا ایک ذریعہ نکلا تھا اس لیے جیڈر سوٹوں کو بی۔ یو۔ آر سے ہٹایا گیا تھا تاکہ وہ ان پر حملہ آور نہ ہو سکیں۔ ہم لوگوں کی طرف سے اتنی تشویش نہیں تھی۔ بزدل لوگ، علیحدہ علیحدہ مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے ہم متحد نہیں ہو سکتے۔ باغی..... دوسری جگہوں پر تھے۔ اور دیوار چار میٹر بلند تھی۔

اپنے سارے ذہین مورخین نے اتنی بہت سی ذہانت آمیز کتابیں لکھی ہیں اور پھر بھی یہ نہیں سیکھ سکے کہ انسانی روح کے ان پراسرار پہلوؤں کے بارے میں پیشین گوئی کیسے کریں۔ کسی سماجی دھماکے کی پراسرار ولادت کو کس طرح شناخت کریں۔ حتیٰ کہ پیچھے دیکھ کر ان کی توضیح کرنا بھی وہ نہیں سیکھ سکے۔

بعض اوقات آپ شہتیروں کے نیچے سلگتے ہوئے سن کے بنڈل پر بنڈل رکھتے جائیں لیکن شہتیر آگ نہیں پکڑتے۔ لیکن کبھی اوپر سے ایک تنہا چھوٹی سی چنگاری چمنی سے اڑ کر آ جاتی ہے اور سارا گاؤں خاکستر ہو جاتا ہے۔

ہمارے تین ہزار لوگوں نے کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا اور تیاری سے بالکل کورے تھے۔ لیکن ایک شام کام سے چھٹنے کے بعد بی۔ یو۔ آر سے اگلی جھونپڑیوں کے قیدیوں نے اپنے تختۂ خواب توڑنے شروع کر دیے، لمبی لمبی چپڑیں اور کراس کے ٹکڑے اٹھا لیے۔ تاریکی (بی۔ یو۔ آر) کے ایک طرف ایک تاریک سا مقام تھا۔ میں ہو کر کیمپ جیل کے چاروں طرف کی مضبوط باڑ توڑنی شروع کر دی۔ ان کے پاس نہ کلہاڑے تھے نہ کدالیں کیوں کہ کسی بھی کیمپ کے علاقے میں یہ چیزیں نہیں رکھی جاتیں بشرطیکہ انھوں نے مرمت یا رڈے دو ایک ہتھکنڈے نہ لی ہوں۔

ضربات چلنے کا شور ہو رہا تھا۔ وہ تربیت یافتہ نجاروں کی ٹولی کی مانند کام کر رہے تھے۔ تختوں کے الگ ہوتے ہی انھیں لیور بنا کر نکال لیتے تھے اور بارہ سینٹی میٹر لمبی میخوں کی رگڑ کی آواز پورے کیمپ میں سنی جا سکتی تھی۔ یہ نجاروں کے کام کرنے کا وقت نہیں تھا۔ لیکن خود کار ہتھیاروں کے کام کرنے جیسا ہی تھا اور شروع میں نہ تو برجی والوں نے نہ وارڈروں نے اور نہ قیدیوں نے اس کے بارے میں کچھ سوچا۔ زندگی اپنے روز مرہ کی شام کے انداز پر چل رہی تھی۔ کچھ گروہ شام کا کھانا کھانے جا رہے تھے، کچھ کھا کر واپس آ رہے تھے، کچھ شفاخانہ علاج میں تھے، کچھ گودام کی طرف اور دیگر کچھ لوگ پارسل گھر کی طرف جا رہے تھے۔

پھر بھی وارڈروں کو فکر لاحق ہوئی، وہ عجلت میں بی۔ یو۔ آر کی اوپر نصف روشن دیوار پر گئے جہاں ساری ہل چل ہو رہی تھی اور جس طرح جلنے کے بعد زخمی بلیاں بھاگتی ہیں وہ اسٹاف بیرکوں کی طرف بھاگے۔ کوئی قیدی ایک وارڈر کے پیچھے ڈنڈا لے کر دوڑا۔ پھر آرکسٹرا کی مکمل موسیقی

پیش کرنے کے لیے کوئی اشارات بیرکوں میں پتھروں یا ڈنڈوں سے کھڑکیاں توڑنے لگا۔ اسٹاف کی کھڑکیوں کے شیشے مسرورکن چھنوں کے ساتھ چور چور ہو گئے۔

لڑکوں کے دل میں بغاوت جیسی کوئی بات نہ تھی، بی۔ یو۔ آر پر قابض ہونے کا خیال بھی نہیں تھا (یہ کوئی آسان بات نہ تھی۔ تصویر نمبر ۵ میں، جو کئی برس کے بعد کھینچی گئی ہے۔ ایک لبسٹڑ بی یو آر کا قبضوں سے الگ نکلا ہوا دروازہ نظر آرہا ہے) وہ تو محض مجبوروں کے سیل میں پٹرول انڈیلنے اور کوئی جلتی ہوئی چیز اس پر پھینکنے کی غرض سے یہ سارا ہنگامہ کر رہے تھے ـــ جس کا مطلب تھا اپنے قدم سنبھالو، ورنہ ہم اب بھی تمہیں مزا چکھا دیں گے۔ ایک درجن آدمی اس خلا میں سے پار ہو گئے جو بی۔ یو۔ آر کی باڑھ میں راستے کے طور پر کھل گئی تھی۔ انھوں نے سیل کی تلاش میں چہار سمت توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ انھوں نے کھڑکی کو نشانہ بنایا تھا لیکن انھیں یقین نہیں تھا۔ چنانچہ کھڑکی پر چڑھا ہوا پردہ ہٹانا پڑا، کسی نے دوسرے کے کندھوں پر پیر رکھ کر زقند بھری اور پٹرول کا برتن پکڑ لیا لیکن دفعتاً برجیوں کے اوپر سے مشین گنوں کی گولیوں کی تڑ تڑ کیمپ کے اس سرے سے اس سرے تک گونجنے لگی اور وہ مطلوبہ آگ کبھی نہ لگا سکے۔

وارڈر اور اعلیٰ ڈسپلن افسر میچیزونسکی کیمپ سے بھاگ کر گئے تھے اور انھوں نے ڈویژن کو مطلع کیا تھا۔ (ایک قیدی نے چاقو لے کر میچیزونسکی کا بھی تعاقب کیا تھا، وہ مرقت یارڈ کے شیڈ کا راستہ چھوڑ کر ایک کونے کی برجی پر پہنچ گیا تھا اور چیخا تھا، "اے برجی والے! گولی مت چلانا، میں دوست ہوں"، اور بیرونی باڑھ پر سے چڑھ کر نکل گیا تھا۔[1]

ڈویژن (اب ہم کمانڈر کا نام کہاں سے دریافت کریں) نے کونے کی برجی کو ٹیلیفون کے ذریعے مشین گنوں سے گولیاں چلانے کا حکم دیا ـــ تین ہزار نہتے لوگوں پر، جنھیں کوئی علم نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے (مثلاً ہماری ٹولی کمرۂ طعام میں تھی اور جب ہم نے باہر اندر گولیاں چلتی ہوئی سنیں تو پوری طرح بدحواس ہو گئے۔)

یہ قسمت کا چھوٹا سا مذاق تھا کہ یہ واقعہ ۲۲ جنوری (نیا کلینڈر) ۹ جنوری (پرانا کلینڈر) کو رونما ہوا جو "خون آلود اتوار" اتوار کی سالگرہ تھی اور اس سال کے پہلے تک وہ کلینڈر میں خدیہ ماتمی دن کے طور پر درج کیا جاتا تھا۔ ہمارے لیے یہ خون آلود منگل ثابت ہوا اور قصائیوں کو پیٹرسبرگ سے زیادہ سہولت ملی، شہر کا چوراہا نہ تھا بلکہ اسٹیپ تھی جہاں کوئی گواہ نہ تھا اور گرد کوئی اخبار نویس یا غیر ملکی نہیں تھا۔[2]

تاریکی میں کسی خاص نشانے کے بغیر گولیاں برساتی ہوئی مشین گنیں کیمپ کے علاقے پر دھاکے کرتی رہیں۔ یہ سچ ہے کہ گولی زیادہ دیر نہ چلی، بیشتر گولیاں شاید سروں کے اوپر ہی سے گزر گئیں، ان میں سے کچھ نیچی بھی تھیں ـــ ایک آدمی کو کتنی گولیوں کی حاجت ہوتی ہے؟ انھوں نے جھونپڑیوں کی پتلی دیواریں چھلنی کر دیں، اور جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے وہ انھیں زخمی نہیں کر سکے جو بی۔ یو۔ آر میں داخل ہو گئے تھے بلکہ دوسروں کو زخمی کیا۔ جن کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ پھر بھی انھیں اب اپنے زخم چھپانے پڑے

شعبۂ علاج سے دور رہنا پڑا۔ کتّوں کی مانند وقت کے ساتھ زخموں کے از خود مندمل ہو جانے کا انتظار کرنا پڑا۔ ورنہ انھیں کبھی غدر میں حصہ لینے والا تصور کر لیا جاتا۔ بالآخر غیر مشخص ہجوم میں سے کسی کو گرفتار کرنا ہی تھا۔ جھونپڑی نمبر ۹ میں ایک بے ضرر ستر سالہ شخص، جس کی دس سال سزا کی میعاد جلد ہی ختم ہونے والی تھی، اپنے بستر پر ہی مارا گیا وہ ایک ماہ کے بعد رہا ہونے والا تھا۔ اس کے جوان بیٹے اسی فوج میں کام کر رہے تھے جس کے جوانوں نے برجیوں سے ہم پر گولیاں چلائی تھیں۔

محاصرہ کرنے والے جیل کے احاطے سے چلے گئے اور جلد ہی سے منتشر ہو کر اپنی اپنی بیرکوں میں پہنچ گئے (جہاں انھیں اپنے اپنے تختۂ خواب دوبارہ درست کرنے تھے تاکہ ان کی کارستانی کے آثار ختم ہو جائیں) بہت سے دیگر اشخاص نے گولی چلنے کو اس امر کی تنبیہہ پر محمول کیا کہ وہ ان جھونپڑیوں کے اندر ہی رہیں اس کے برعکس کچھ لوگ مشتعل ہو کر باہر نکل آئے اور کیمپ کے آس پاس چکر لگاتے ہوئے یہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگے یہ سارا قصہ کیا ہے۔

اس وقت تک کیمپ کے علاقے میں کوئی وارڈر نہیں رہا تھا۔ اسٹاف بیرکوں سے افسران ندارد تھے اور اس کی کھڑکیوں میں تا حال اونچے نیچے سوراخ منہ پھاڑتے نظر آ رہے تھے۔ برجیاں خاموش تھیں۔ متجسس لوگوں اور حقیقت کے جویا کیمپ میں چکر کاٹ رہے تھے۔

اچانک ہمارے کیمپ ڈویژن کے پھاٹک کھول دیے گئے اور کانوائے کی ایک پلٹن، بھری ہوئی ٹامی گنیں سنبھالے ہوئے بغیر نشانہ لیے ہوئے۔ جھٹ پٹ فائر کرتی ہوئی آ گئی، وہ ہر طرف پھیل گئے۔ ان کے پیچھے غضبناک وارڈر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں لوہے کے پائپ، ڈنڈے یا کوئی اور ایسی ہی چیز جو فی الفور ہاتھ آ گئی، نظر آ رہی تھی۔

وہ یکے بعد دیگرے ہر جھونپڑے میں داخل ہوئے اور تمام علاقہ چھان مارا۔ بعد ازاں ٹامی گن والے خاموش ہو گئے اور تھم گئے جبکہ وارڈر چھپے ہوئے قیدیوں کو باہر نکالنے کے لیے دوڑ پڑے خواہ وہ زخمی ہوں یا نہیں اور سب کو بری طرح مارا۔

یہ سب بعد میں معلوم ہوا لیکن اس وقت ہم کیمپ کے علاقے میں بڑے پیمانے پر گولیاں چلنے کے دھماکے ہی سن سکتے تھے اور نیم تاریکی میں کچھ سمجھنے سے قاصر تھے۔

ہماری جھونپڑی کے دروازے پر ایک بھیانک کشمکش شروع ہو گئی۔ قیدی بیک وقت اور بالجبر اندر داخل ہونے کے لیے لستہ بیتاب تھے کہ کوئی بھی اندر گھس نہ سکتا تھا (یہ بات نہ تھی کہ جھونپڑی کی پتلی دیواروں کے سوراخ انھیں تحفظ عطا کرتے لیکن ایک مرتبہ اندر داخل ہو جانے کے بعد آدمی غدر میں شامل نہیں رہتا) میں ان لوگوں میں سے تھا جو زینے کے پاس تھے۔ مجھے اپنی دلی کیفیت کا بخوبی اندازہ ہے: اپنی قسمت کے تئیں تلخ بیزاری، ایک لمحاتی تشویش کہ میں زندہ بچوں گا یا نہیں۔ تم نے اپنی سنگینیں ہم پر کیوں تان رکھی ہیں۔ لعنت ہو تم پر، ہم کیوں اس دکھ بھری دنیا میں پیدا ہوئے۔ کہ جرم میں تا عمر تمھیں جرمانہ ادا کرتے رہیں؟ ہم کیا تا ابد تمہاری جیلوں میں بیٹھے رہیں گے؟ جیل کا مرض، جس میں طبیعت مالش کرتی ہے اور ذہنی کوفت، مجھ پر طاری ہو گیا۔ تا حال زیرِ قلم نہ آنے والی نظم اور

اپنے لطن میں موجود ڈرامے کے لیے میرا مستقل خوف بھی غایب ہو گیا۔ موت کے بالکل سامنے، جو فوجی کوٹھوں کی شکل میں ہماری طرف بڑھ رہی تھی، میں نے دروازے میں دھینگا مشتی کر کے اندر داخل ہونے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ یہ اصلی قیدی کی نفسیات تھی: انھوں نے ہمیں اس حال کو پہنچا دیا تھا۔

رفتہ رفتہ دروازے کا راستہ صاف ہو گیا اور میں اس میں سب کے بعد داخل ہونے والوں میں سے تھا۔ اسی وقت گولیاں چلنے لگیں اور کھوکھلی عمارت میں ان کی آواز کئی گنا بڑھ گئی۔ ہمارے پیچھے جو تین گولیاں انھوں نے چلائیں وہ دروازے کی چوکھٹ میں ایک قطار میں دھنس گئیں۔ چوتھی گولی ٹکرا کھا کر اوپر کی طرف چلی گئی جس سے دروازے کے بالائی شیشے میں چھوٹا سا سوراخ بن گیا اور باریک باریک دراڑیں پڑ گئیں۔

ہمارا تعاقب کرنے والے جھونپڑیوں میں داخل نہیں ہوئے انھوں نے ہمیں اندر بند کر دیا جو لوگ سرعت کے ساتھ اندر داخل نہ ہو سکے تھے انھیں خوب مارا پیٹا گیا۔ دو درجن قیدی زخمی ہوئے یا بُری طرح مارے گئے۔ کچھ نیچے پڑ گئے اور انھوں نے اپنے زخم چھپا لیے۔ دیگر کو ابتدا میں شعبۂ علاج میں بھیج دیا گیا اور بعدازاں غدر میں حصہ لینے کے لیے تفتیش اور جیل سنگتنی پڑی۔

لیکن یہ سب حالات بعد میں معلوم ہوئے۔ دروازے تمام رات بند رکھے گئے اور اگلے دن صبح مختلف جھونپڑیوں کے مکینوں کو کمرۂ طعام میں ملاقات کرنے پوری داستان معلوم کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ کچھ جھونپڑیوں میں جہاں بظاہر کوئی زخمی نظر نہ آتا تھا اور مار پیٹ کے بارے میں کوئی جانکاری نہیں ملی تھی دس سوں میں گرفتار قیدی کام پر جانے کے لیے نکل آئے۔ ہماری جھونپڑی انھیں میں سے ایک تھی۔

باہر تو ہم آ گئے لیکن ہمارے بعد کسی کو بھی کیمپ کے پھاٹک سے نہیں لے جایا گیا۔ بیچ کا راستہ خالی تھا۔ کام کے لیے کوئی قطار بندی نہیں کی گئی۔ ہمیں دھوکا دے کر پھانسا گیا تھا۔

اس دن انجینئرنگ ورکشاپ میں ہم نے توہین کا احساس کیا۔ لڑکے ایک سے دوسری بینچ پر گئے گزشتہ دن کی وارداتوں پر تبادلۂ خیال کرنے کے لیے اور یہ مشورہ کرنے کے لیے کہ ہم غیرودں کی طرح کب تک کام کرتے رہیں گے اور کب تک دم دبا کر یہ سب کچھ سہتے رہیں گے۔ کیمپ کے تجربہ کار بوڑھے جو کبھی اپنی کر سیدھی نہیں کر سکیں گے اشکل وپنج میں تھے۔ ہم اور کیا کر سکتے تھے؟ وہ پوچھتے تھے کیا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پوری طرح پامال ہوئے بغیر ہم زندہ بچ سکتے ہیں؟ (یہ ۳۷ ۹اء کے آندھی کے جھکڑ کی فلاسفی تھی۔)

جب ہم جھٹپٹے کے وقت کام سے پلٹے تو کیمپ دوبارہ سنسان ہو چکا تھا۔ ہمارے اسکاؤٹ (معلومات یکجا کرنے والے لڑکے) دوسری جھونپڑیوں کی کھڑکیوں پر جھپٹے۔ انھوں نے دیکھا کہ نمبر ۹ جس میں ۲ مردہ اور تین زخمی تھے اور اس سے اگلی جھونپڑی کے لوگ کام پر نہیں گئے تھے۔ افسروں نے انھیں ہمارے بارے میں بتایا تھا اور انھیں توقع تھی کہ اگلے دن وہ بھی کام کے لیے باہر نکل آئیں گے لیکن جو حالت تھی اس سے ظاہر تھا کہ ہم خود بھی صبح کام پر نہیں جائیں گے۔

دیوار پرسے پرچے اچھالے گئے اور پڑوسیوں کو مطلع کیا گیا کہ ہم نے کیا فیصلہ کیا ہے اور اسکی

تائید چاہی گئی۔

کام بند — مکمل ہڑتال منصوبہ بہ ہوشیاری کے ساتھ تیار نہیں کیا گیا تھا۔ یہ کوئی اتفاقی ارادہ بھی نہیں تھا۔ یہ وقتی جوش میں ابھرا تھا۔ جس کا کوئی انتظامی مرکز یا اطلاعات فراہم کرنے کا وسیلہ بھی نہ تھا۔

دوسرے کیمپوں کے جن قیدیوں نے اشیائے خوردنی کے گوداموں پر قبضہ کرلیا اور پھر کام سے الگ رہے انھوں نے بے شک زیادہ دانشمندی کا ثبوت دیا تھا۔ لیکن ہماری کارروائی بہت دانش مندانہ نہ ہونے کے باوجود کچھ موثر ثابت ہوئی تھی۔ تین ہزار آدمیوں نے بیک وقت کام کرنے اور بھوکے رہنے کا حلف اٹھایا تھا۔

اگلے دن سویرے ایک بھی ٹولی نے ڈبل روٹیاں تراشنے والے کمرے میں اپنا کوئی نمائندہ نہیں بھیجا ایک بھی ٹولی کمرۂ طعام میں نہیں گئی جہاں شوربا اور گوشت ان کا انتظار کر رہے تھے۔ وارڈروں کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ دو بار، تین بار، چار بار وہ ترش احکامات لے کر ہمیں بلانے کے لیے جھونپڑیوں میں آئے پھر ہمیں دھمکیاں دے کر باہر نکالنے اور بعد ازاں شرافت سے کہنے کے لیے آئے۔ صرف کمرۂ طعام تک اپنی روٹی لینے چلو۔ فی الحال کام کے لیے قطار بندی کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں۔

لیکن کوئی بھی نہیں گیا۔ وہ سب کپڑے اور جوتے پہنے ہوئے تیار اپنے تختہ ہائے خواب پر پڑے رہے اور خاموش رہے۔ صرف ہم نے جو فورمین تھے (اس گرم سال میں، میں فورمین بن گیا تھا) جواب دینے کی ضرورت محسوس کی کیوں کہ وارڈر ہمیں کو مخاطب کرتے تھے۔ ہم بقیہ لوگوں کی مانند اپنے سونے کے تختوں پر پڑے ہوئے تھے۔ ہم اپنی آنکھوں سے بدبدائے! "کوئی فائدہ نہیں صاحب.....

جو طاقت کبھی درگزر کرنے کی عادی نہ تھی اسے یہ غیر معمولی پُرسکون چیلنج، یہ مستحکم عدولی حکم طویل المیعاد بھی، گولیوں کا نشانہ بن کر چیخنے اور بھاگنے کے عمل سے کہیں زیادہ خائف کر رہی تھی۔ بالآخر انھوں نے ہمیں چھیڑنا بند کر دیا۔ اور جھونپڑے باہر سے بند کر دیے۔

بعد ازاں کئی روز تک اردلیوں کے سوا کوئی بھی جھونپڑوں سے باہر نہیں نکلا۔ اردلی پاخانے کی بالٹیاں لے جانے اور پینے کا پانی نیز کوئلہ لانے کے لیے ہی جاتے تھے۔ صرف شعبۂ علاج میں صاحب فراش مریضوں کو فاقہ کشی سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔ صرف ڈاکٹروں اور شعبۂ علاج کے اردلیوں کو کام کرنے کی اجازت تھی۔ باورچی خانے والے کوئی کھانا تیار کرتے تھے اسے پھینک دیتے تھے۔ دوسرا پکاتے تھے اسے پھینک دیتے تھے اور پھر انھوں نے پکانا بند کر دیا۔ جو نمبردار وہاں کام پر تھے وہ ایک دن پہلے ہی کیمپ کے عہدیداروں کے سامنے متعین ہونے والے نظر آتے تھے اور انھوں نے کہہ دیا تھا کہ ہم آگے کام نہیں کریں گے اور باورچی خانہ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

صاحب لوگ ہمیں اب دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ہمارے باطن میں جھانک نہیں سکتے تھے۔ نگرانی کرنے والوں اور غلاموں کے درمیان ایک خلیج پیدا ہو گئی تھی۔

جن لوگوں نے ان تمام کارروائیوں میں حصہ لیا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی ہماری زندگیوں سے

وہ تین دن فراموش نہ کر سکے گا۔ ہم دوسری جھونپڑیوں کے اپنے ساتھیوں سے مل نہیں سکے نہ وہ لاشیں دیکھ سکے جو وہاں بے گور و کفن پڑی تھیں۔ پھر بھی وہ بندھن، جو اس سنسان کیمپ کے متخالف گوشوں میں پڑے ہوئے ہم بدنصیبوں کو ایک رشتے میں پروتے تھے، فولادی تھے۔

یہ ہڑتال ان فربہ کھاتے پیتے لوگوں نے نہیں کی تھی۔ جن کی جلدوں کے نیچے چربی کا انبار ہوتا ہے بلکہ لاغر دبلے پتلے لوگوں نے کی تھی۔ جو لگاتار برسوں تک بھوک کے تازیانے سہہ چکے تھے اور پشت در پشت جسمانی توازن کو برقرار رکھا تھا اور جنھیں ایک بار بھی سو گرام کا راشن نہ ملنے پر بے حد مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جنھیں بھوک کی برداشت نہ تھی، ان چوروں نے بھی بقیہ لوگوں کے ساتھ بھوک ہڑتال کی۔ حالانکہ تین دن کی فاقہ کشی نے انھیں جان لیوا اور دیرپا نقاہت سے بدحال کر دیا۔ جس کھانے کو قبول کرنے سے ہم نے انکار کر دیا تھا اور جسے ہم نے ہمیشہ بھکاریوں کا کھانا سمجھا تھا وہ نحیف و لاغر لوگوں کے سرسام زدہ دماغوں کے لیے سراب جیسا تھا۔

یہ ایک ایسی بھوک ہڑتال تھی جو بیسیوں برس سے جنگل کے قانون کی تربیت پانے والے لوگوں نے کرائی تھی۔ "پہلے تم مرو، بعد میں مروں گا۔" اب انھوں نے از سر نو زندگی پائی تھی۔ انھوں نے غلاظت کی دلدل سے اپنے آپ کو بلند کیا۔ اور آج مرنا قبول کر لیا۔ سب نے ایک ساتھ مرنا اس سے بہتر سمجھا کہ اس ڈھرّے کے مطابق کل بھی جیتے رہیں۔

جھونپڑیوں میں ان کے مکین، ایک دوسرے کے ساتھ ایک نوع کی رسمی محبت کا اظہار کرنے لگے۔ اگر تھوڑی بہت اشیائے خوردنی کسی کے پاس بچ گئی تھیں۔ صرف وہ لوگ جن کے پاس گھر والوں سے سامان آیا کرتا تھا، وہ سب یک جا کر لی گئیں۔ ایک کپڑے کے ٹکڑے کو میز پوش کی طرح بچھا کر ان پر یہ چیزیں پھیلا دی گئیں اور پھر پورے کمرے کی متفقہ رائے سے کچھ چیزیں سب نے مل کر کھائیں اور کچھ اگلے دن کے لیے محفوظ رکھ دی گئیں (پارسل، یعنی گھر سے سامان حاصل کرنے والوں کے پاس ذاتی اشیائے خوردنی کے گودام میں کافی ذخیرہ رہا ہوگا۔ لیکن اول تو یہ کہ انھیں لانے کے لیے کوئی آدمی کیمپ کے پار نہیں جا سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ ہر شخص اپنا پس انداز کیا ہوا سامان واپس لا کر مسرور بھی نہ ہوتا؛ وہ حساب لگا رہا ہوگا کہ ہڑتال کے اختتام پر وہ ان اشیائے خوردنی کو استعمال کر کے اپنی ضائع شدہ طاقت دوبارہ حاصل کرے گا۔ اس طرح ہڑتال جیل میں واقع ہونے والی ہر بات کی طرح طاقتور اور کمزور کے مابین ایک قسم کا آزمائش تھی اور حقیقی ہی دار لوگ وہ تھے۔ جن کے پاس کوئی ذخیرہ نہ تھا۔ جنھیں ہڑتال کے خاتمے پر اپنی کھوئی طاقت دوبارہ حاصل کرنے کی کوئی امید نہ تھی۔ اگر کھانے کے لائق کوئی چیز ہوتی تھی تو اسے اسٹوو پر ابال لیتے تھے اور دلیہ چمچوں سے ناپ کر تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ آگ کو روشن رکھنے کے لیے انھوں نے سونے کے تختے توڑ لیے حکومت کا فراہم کردہ بستر تباہ ہو گیا لیکن اس کی پروا وہ لوگ کیا کرتے۔ جنھیں رات بھر زندہ رہنے کا بھی یقین نہ ہو!

افسران کیا کریں گے؟ یہ بات قبل از وقت کوئی نہ بتا سکتا تھا۔ ہم نے سوچا کہ شاید وہ جھونپڑیوں

پر برجیوں سے پھر گولی برسانا شروع کریں گے۔ ہمیں کسی قسم کی رعایت کی قطعی امید نہ تھی ہم نے عمر بھر ان سے کوئی بھی چیز طاقت سے حاصل نہیں کی تھی۔ ہماری ہڑتال میں یاسیت کا تلخ ذائقہ تھا۔

لیکن اس قنوطیت کے احساس میں ایک قسم کی طمانیت بھی شامل تھی۔ ہم نے ایک فضول اور بدحواسی کا اقدام کیا تھا اس کا انجام بُری شکل میں ہی ہو سکتا تھا اور یہی اچھی بات تھی۔ ہمارے معدے خالی تھے ہمارے دل ہمارے جوتوں میں تھے لیکن کسی بالاتر جذبے کو تسکین مل رہی تھی ان طول طویل فاقہ کشی کے دنوں میں شاموں اور راتوں میں تین ہزار اشخاص اپنی تین ہزار سزاؤں، اپنے خاندانوں، اپنے خاندانوں کی کمی کو، ان سب کو جو انھیں ترک کر چکے تھے اور عاق کر دیں گے، کے بارے میں سوچا کرتے تھے اور ہر چند کہ ہزاروں چھاتیوں میں چھپے ہوئے دل ایک ساتھ نہیں دھڑک سکتے تھے۔ اور ایسے افراد بھی تھے، جو صرف افسوس، محض یاسیت محسوس کرتے تھے، پھر بھی ان میں سے بیشتر وقت گزارتے رہے، حالت ویسی ہی ہے جیسی ہونی چاہیے! ہم تمہاری ناک کاٹنے کے لیے اسی حالت کو برقرار رکھیں گے۔ حالت خراب ہے۔ جتنی زیادہ خراب ہو اُتنا ہی اچھا ہے!

یہ بھی ایک اہم واقعہ ہے جس کا مناسب تجزیہ نہیں کیا گیا: ہم اس قانون کو نہیں جانتے جو تمام عقل و خرد کو چیلنج کر کے عوامی جوش کی ہنگامی لہروں پر نافذ ہوتا ہے۔ میں نے یہ بلند پرواز جوش و خروش خود محسوس کیا ہے۔ مجھے محض ایک سال کی سزا اور بھگتنی تھی۔ توقع یہ تھی کہ میں اس واقع پر خوف اور پریشانی کے سوا کچھ بھی محسوس نہ کرتا کہ میں ایک ایسے جھمیلے میں اپنے ہاتھ آلودہ کر رہا ہوں جس سے ایک نئی سزا پائے بغیر نہ بچ سکوں گا لیکن اس کے باوجود مجھے کوئی افسوس نہ تھا تم سب پر لعنت ہو، اگر تم یہی چاہتے ہو تو میں دوبارہ اپنی سزا بھگت لوں گا!

اگلے دن ہم نے کھڑکیوں سے افسروں کے ایک جتھے کو یکے بعد دیگرے جھونپڑوں میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وارڈروں کی ایک ٹولی دروازہ کھولتی تھی۔ برآمدوں میں جاتی تھی، کمروں کا معائنہ کرتی تھی اور ہمیں بلاتی تھی (پرانے طریقے سے نہیں جیسے کہ ہمیں مویشی سمجھا جا رہا ہے۔ بلکہ نرمی کے ساتھ فورمینو! آپ کو دروازے پہ یاد کر رہے ہیں!"

ہم لوگوں میں بحث شروع ہو گئی۔ فیصلہ گروہوں کو کرنا ہے۔ ان کے فورمینوں کو نہیں۔ لوگ صلاح مشورے کے لیے مختلف کمروں میں گئے۔ ہماری حالت دو طرفہ تھی۔ مخبروں کو ہمارے درمیان سے صاف کر دیا گیا تھا لیکن ہمیں شبہ تھا کہ ابھی کچھ اور مخبر ہیں اور بلاشبہ کچھ مخبر تھے بھی مثلاً طعلل یقین بشینی خور فورمین مکینک میخائل جزالوف۔ اور ہر حالت میں انسانی نفسیات کا علم ہونے کی وجہ سے ہمیں معلوم تھا کہ جو لوگ آج آزادی کے لیے ہڑتال پر ہیں اور فاقہ کشی کے مصائب جھیل رہے ہیں ان میں سے بہت سے ہتھکڑیوں میں رہ کر پرسکون زندگی گزارنے کے لیے کل راز افشا کر کے مصیبت کھڑی کریں گے۔ اس وجہ سے جو لوگ ہڑتال کی سربراہی کر رہے تھے (اور قائدین وہاں بہرحال موجود تھے) وہ سامنے نہیں آئے بلکہ چھپے رہے۔ انھوں نے علی الاعلان اقتدار نہیں سنبھالا اور فورمین نے کھلے عام اپنا اقتدار چھوڑ دیا۔ اس طرح ہڑتال کرنے والے بظاہر کسی مرکزی قیادت کے

بغیر دھارے میں بہتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ آخرش کسی نادیدہ مقام پر فیصلہ کیا گیا ہم پانچ چھ فورمین دروازے پر گئے جہاں افسران تحمل کے ساتھ ہمارے منتظر تھے (یہ اسی جھونپڑی نمبر ۲ کا باب داخلہ تھا جو کچھ عرصہ قبل ایک ڈسپلن بیرک تھی، جس سے "میٹرو" سرنگ کھودی گئی تھی اور اس وقت جہاں نشست ہو رہی تھی وہاں سے چند ہی میٹر کے فاصلے پر فرار کے راستے کا منہ تھا۔ ہم نے دیواروں سے پشت ٹکا کر اپنی نگاہیں جھکالیں اور سنگین مجبوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ نگاہیں ہم نے یوں جھکالی تھیں کہ اب ہم میں سے کوئی بھی خوشامدانہ نظروں سے افسروں کو نہیں دیکھ سکتا تھا اور باغیانہ نظریں رکھنا حماقت ہوتی۔ ہم اتالیقوں کی نشست گاہ میں طلب کردہ شیطان طلبہ کی مانند کھڑے رہے۔ خمیدہ، جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے، سر نیچے کیے اور دوسری طرف کو موڑے ہوئے، ناقابلِ اصلاح ناتراشیدہ، ان گڑھ!

لیکن دونوں کوریڈروں سے زیکوں کی بھیڑ دروازوں سے اندر گھس آئی اور سامنے والوں کے پیچھے چھپ کر پچھلی قطار والے آزادی سے بول سکتے تھے۔ ہمارے مطالبات اور ہمارے جوابات پیش کر سکتے تھے۔

سرکار کی نمائندگی کرنے والے نیلی پٹیوں کو شانوں پر آویزاں کرنے والے افسروں نے (کچھ کو ہم جانتے تھے اور کچھ کو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا) صرف فورمینوں کی طرف دیکھا اور انھیں کو مخاطب کیا۔ ان کا انداز متوازن تھا انھوں نے ہمیں خوفزدہ کرنے کی کوشش نہیں کی لیکن ان کا لہجہ ہمیں یاد دلانا چاہتا تھا کہ ہم چھوٹے اور حقیر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہڑتال اور بھوک ہڑتال کو ختم کرنا ہمارے ہی مفاد میں ہوگا۔ اگر ہم نے ہڑتال ختم کردی تو ہمیں نہ صرف آج کا، بلکہ کلاگ میں صریحاً انہونی بات ــــ کل کا بھی راشن ملے گا (انہیں یہ سوچنے کی عادت سی پڑ گئی تھی کہ بھوکے آدمیوں کو ہمیشہ خریدا جا سکتا ہے) ہمارے مطالبات کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں، جیسے کہ ان کا وجود ہی نہ ہو۔

وارڈر دو رویہ کھڑے تھے اور ان کے داہنے ہاتھ جیبوں میں تھے۔

کوریڈور سے چیخنے کی آواز آئی:

"گولیاں چلانے والے قصور وار لوگوں کو عدالت کے سامنے پیش کیا جائے!"

"دروازے مقفل کرنا بند کرو!"

"ہمارے کپڑوں سے نمبر ہٹاؤ!"

دوسری جھونپڑیوں میں بھی انھوں نے اسپیشل بورڈ والے معاملات پر کھلی عدالتوں میں نظر ثانی کا مطالبہ پیش کیا۔

ہم فورمین لوگ، ہیڈ ماسٹر کی ڈانٹ پھٹکار ختم ہونے کے انتظار میں ایستادہ شیطان طلبہ کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔

افسران چلے گئے اور جھونپڑیاں پھر مقفل کردی گئیں۔

ہر چند کہ ہم سے بیشتر کو بھوک نے نیم جان کر رکھا تھا، ہمارے سر بھاری تھے اور ہمارے خیالات

گڑگڑ رہے تھے لیکن ہماری جھونپڑی میں سپرانداز ہونے کے حق میں ایک بھی آواز بلند نہیں ہوئی۔ کسی نے اظہارِ افسوس نہیں کیا۔

ہم نے اندازہ لگانے کی سعی کی کہ ہماری باغیانہ صدا کس بلندی تک پہنچ سکی ہے۔ یقیناً وزارتِ داخلہ کے لوگ اب تک واقف ہو چکے ہوں گے یا آج واقف ہو جائیں گے لیکن کیا وہ بڑی مونچھ والا بھی جانتا ہے؟ وہ قصائی ہم سب پانچ ہزار لوگوں کو گولیاں مار دینے سے باز نہ آئے گا۔

شام کے وقت ہمیں آس پاس کہیں ایک ہوائی جہاز کی گھرگھراہٹ سنائی دی اگرچہ آسمان ابر آلود تھا اور اڑان کے لیے موسم اچھا نہیں تھا۔ ہم نے قیاس کیا کہ کوئی اعلیٰ افسر طیارے سے آیا ہے۔

گلاگ کا ایک تجربہ کار بیٹا، نکولائی خلیبونوف، جو ہم سے کچھ کا دوست تھا، انیس سال جیل میں رہنے کے بعد کہیں کسی باورچی خانے میں کام پر گیا تھا اور جب وہ اس دن کیمپ میں سے گزرا تو اس نے دلیری کے ساتھ تیزی سے جئی کے آدھے پود کی پوری گٹھڑی سے ہمارے پاس سرکا دی اسے ساتوں ٹولیوں میں بانٹ دیا گیا اور رات کو پکایا گیا تاکہ وارڈر اس کی تیاری سے واقف نہ ہو سکیں۔

خلیبونوف نے بہت بڑی خبر سنائی: کیمپ ڈویژن نمبر ۲ میں جہاں 'دیوارِ چین' کے اس پار یوکرینی تھے، ہماری تائید نہیں کی گئی تھی اس دن اور اس سے پچھلے دن یوکرینی اس طرح کام کے لیے نکلے تھے جیسے سب کچھ معمول پر ہو۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ انھیں ہمارے پرچے مل گئے تھے انھیں پڑھ کر پتہ چل سکتا تھا کہ پچھلے دو دن ہم نے کس طرح پُرامن رہ کر گزارے تھے' وہ جائے تعمیر ٹاور کرین سے دیکھ سکتے تھے کہ ہمارے کیمپ کا علاقہ گولی چلنے کے بعد سے سنسان تھا۔ کیمپ سے باہر ہمارے کالم سے ان کی ملاقات نہ ہونے کی وجہ بھی ان کے ذہن میں ضرور آئی ہو گی پھر بھی انھوں نے ہماری تائید نہیں کی تھی (ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ جو نوجوان یوکرینیوں کی قیادت کر رہے تھے اور جنھیں تاحال عمل سیاست سے واقفیت نہ تھی۔ انھوں نے یہ جواز پیش کیا تھا کہ یوکرینیوں کا مطمعِ نظر ماسکو والوں کے انجام سے مختلف ہے۔ جن لوگوں نے اتنے جوش و خروش سے ابتدا کی تھی وہ اب پسپا ہو گئے تھے اور انھوں نے ہمیں تنہا چھوڑ دیا تھا) اس طرح اب ہم پانچ نہیں، صرف تین ہزار تھے۔

دوسری رات، تیسری صبح اور تیسرے دن بھی بھوک ہماری آنتوں کو کچوکے لگاتی رہی۔

لیکن جب تیسری صبح چیکسٹوں نے، جن کی تعداد اب اور بڑھ گئی تھی، فورمینوں کو پھر دروازے پر طلب کیا اور ایک مرتبہ پھر ہم وہاں کھڑے ہوئے، غصّے کو ضبط کیے، تیوریاں چڑھائے، نظریں جھکائے تو ہمارا مجموعی ارادہ یہ تھا کہ گھٹنے نہیں ٹیکیں گے۔ ہم بےحسی کی طاقت پر آگے بڑھ رہے تھے۔

افسروں نے ہمیں صرف نئی قوت عطا کی۔ نو وارد افسرِ اعلیٰ نے کہا:

"پیشانی کیمپ کی انتظامیہ آپ سے درخواست کرتی ہے کہ کھانا کھانے کا آغاز کریں۔ انتظامیہ تمام شکایتیں وصول کرے گی، ان پر غور و خوض ہو گا اور انتظامیہ نیز قیدیوں کے مابین اختلافات کو دور کر دیا جائے گا۔"

کیا ہمارے کان دھوکا دے رہے تھے، وہ ہم سے کھانا کھانے کی درخواست کر رہے ہیں! اور کام کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں۔ ہم نے کیمپ کی جیل پر دھاوا بول دیا تھا، کھڑکیاں اور جھلیاں توڑ دی تھیں چاقوؤں کے ساتھ وارڈروں کا تعاقب کیا تھا۔ اور اب یہ بات نکلی کہ غدار ہونے کے بجائے..... کے مابین اختلافات (!) مساوی درجہ رکھنے والے کے مابین، انتظامیہ اور قیدیوں کے درمیان اختلافات تھے!

متحدہ کارروائی کے صرف دو دن اور دو راتیں گزری تھیں ـــــ اور دیکھیے، ہمارے گلاگ کے آقاؤں نے کس طرح اپنا لہجہ بدل دیا ہے! ہم نے اپنی زندگیوں میں کبھی، صرف بطور قیدی ہی نہیں بلکہ آزاد افراد کی حیثیت سے بھی۔ ٹریڈ یونینوں کے اراکین کی حیثیت سے بھی اپنے افسران کو اتنے خلوص کے ساتھ بولتے ہوئے کبھی نہیں سنا تھا!

پھر بھی ہم نے خاموشی کے ساتھ ہٹنا شروع کر دیا۔ کوئی بھی فرد وہیں فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ نہ کوئی وہاں فیصلہ کا وعدہ کر سکتا تھا۔ فورمین ایک بار بھی اپنی آنکھیں اٹھائے بغیر یا چاروں طرف نظر کیے بغیر چلے گئے اگرچہ سپرنٹ کیمپ کے صدر نے ہم میں سے ایک ایک کا نام لے کر مخاطب کیا تھا۔

یہ تھا ہمارا جواب۔

جھونپڑیاں پھر مقفل کر دی گئیں۔

باہر سے افسران کو ہم گونگے اور ہار نہ ماننے والے نظر آئے لیکن اندر سیکشنوں میں زوردار بحثیں چھڑ گئیں۔ لالچ بہت بڑی تھی! نرم لفظیات نے سمجھدار قیدیوں کو دھمکیوں سے زیادہ متاثر کیا۔ سپر انداز ہونے کے حق میں آوازیں بلند ہوئیں۔ سچ پوچھیے تو ہم اور کیا کامیابی حاصل کرنا چاہتے تھے!

ہم تھک چکے تھے! ہم بھوکے تھے! جس پُراسرار طاقت نے ہمارے زخموں کو پگھلا کر ہمیں متحد کر رکھا تھا اور ہمیں اونچا اٹھا دیا تھا اس کی بلندی گھٹ رہی تھی اور لرزیدہ بال و پر کے ساتھ وہ ہمیں دوبارہ زمین پر لا رہی تھی۔ پھر بھی جو زبانیں بیسیوں برس سے بند تھیں، جو عمر بھر خاموش رہے تھے، اب کھل گئے تھے۔ جو لوگ ان کی باتیں سن رہے تھے ان میں بلاشبہ باقی ماندہ مخبر بھی تھے۔ اس جوش و خروش کی قیمت، اچانک چند منٹوں میں ابھرنے والی آوازوں میں سے گونجدار آواز (ہمارے کمرے میں دیمتری پینن کی آواز میں) جوش خروش کے اس مظاہرے کی قیمت قید کی ایک نئی میعاد سے، گردن کو جکڑنے والے پھندے کی صورت میں، جس کی وجہ سے آزادی کی دھڑکن پھڑ پھڑا کر رہ جائے گی، چکانی پڑے گی، یہ قیمت اس لائق تھی کہ چکائی جائے کیونکہ قوتِ گویائی پہلے بار اس کام میں صرف ہو رہی تھی جس کے لیے وہ تفویض کی گئی تھی۔

اب سپر انداز ہو جائیں، اس کا مطلب ہوگا کسی کے وعدے پر اعتبار کر لینا۔ اصلاً یہ کس کے الفاظ ہیں؟ ہمارے جیلروں کے، کیمپ کے کتوں کے غول کے الفاظ۔ جب سے جیلیں وجود میں آئیں، جب سے یہ چلی آ رہی ہیں۔ کیا انھوں نے اپنے کسی وعدے کو نبھایا ہے؟

گزشتہ الاؤتوں اور سیاہ کارناموں اور سب عزیموں کی تہمت اس طرح پر کھٹکنے کے عمل سے اوپر آ گئی۔ ہم نے پہلی بار یہ صحیح راستہ اختیار کیا تھا۔ کیا ہم اتنی جلد گھٹنے ٹیک دیں؟ ہم نے

پہلی مرتبہ محسوس کیا تھا کہ انسانی اقدار کا مطلب کیا ہے، کیا صرف اتنی عجلت میں شکست تسلیم کرنے کے لیے؟ ہمارے چاروں طرف ایک شریر، تند، تازگی بخش ہوا چل رہی تھی، ہم جاری رکھیں گے! ہڑتال کے ختم کرنے سے پہلے وہ کوئی اور راگ الاپیں گے! وہ خود گھٹنے ٹیک دیں گے! لیکن ہم ان کی کسی بات پر اعتبار کب کر سکیں گے؟ یہ بات آج بھی، ہمیشہ کی طرح مسلمہ تھی۔ اذیت رسیدگان کا نصیب ہی یہ ہے انھیں اعتبار کرنے اور شکست تسلیم کر لینے کی لیے مجبور کیا جاتا ہے.....)

ایک بار پھر دو سو آدمیوں کے جذبات گھل مل کر ایک جذبے میں ڈھل گئے، عقاب کے بازو ہوا میں تیرنے لگے — وہ بلندی پر پرواز کرنے لگا۔

اپنی قوت کو محفوظ رکھنے کے لیے ہم لیٹ جاتے ہیں، کم سے کم چلنے اور غیر ضروری گفتگو سے پرہیز کی روش اپناتے ہیں۔ ہمارے خیالات ہمیں مصروف رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

جھونپڑی میں روٹیوں کے آخری ریزے کب کے ختم ہو چکے تھے۔ کسی کے پاس بھی پکانے کے لیے یا حصہ بانٹنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ وسیع پیمانے پر خاموشی اور سکوت میں واحد صدائیں کھڑکیوں سے چپکے ہوئے نگرانوں کی آوازیں تھیں، وہ ہمیں کیمپوں میں باہر ہونے والے واقعات کے بارے میں مطلع کرتے تھے۔ ہم ان بیس سالہ لڑکوں کی تعریف کرتے تھے، ان کا حوصلہ بھوک نے کمزور نہیں کیا تھا سپرانداز ہونے کی بجائے زندگی کی دہلیز ہی پر، جب کہ ابھی سب کچھ ان کے مستقبل کی گود میں تھا، انھوں نے مرنے کا عزم مصمم کر رکھا تھا۔ ہمیں ان پر رشک آتا تھا کیوں کہ سچائی ہمارے ذہنوں میں بہت تاخیر کے ساتھ پیدا ہوئی تھی جبکہ ہمارے ریڑھ کی ہڈیاں بہت پہلے خمیدہ ہو کر غلامی کی کمان بن گئی تھیں۔

میرا خیال ہے اب میں نام لے کر ان کا ذکر کر سکتا ہوں — جانیک براتوشکی، ودلوڈیاڑد ونیوفت اور فولادی جفاکش لوگڑا۔

اچانک تیسرے دن کی سہ پہر، جب مغربی آسمان شفاف ہو رہا تھا اور غروب آفتاب کا منظر دکھائی پڑتا تھا، ہمارے مشاہدین نے غصے اور خوف کے ساتھ کہا۔

"جھونپڑی نمبر ۹! نو نمبر والوں نے ہتھیار ڈال دیے! وہ لوگ کھانا کھانے جا رہے ہیں!"

ہم سب اچھل پڑے۔ کوریڈور کی دوسری طرف کے قیدی لپک کر ہمارے کمرے میں آئے۔ کھڑکیوں کی سلاخوں کے درمیان سے، بالائی اور نچلے سونے کے تختوں سے کچھ لوگ ہاتھوں اور پیروں کے سہارے کھڑے ہوئے کچھ لوگ دوسروں کے کندھوں کے اوپر سے جھانکتے ہوئے، ہم نے سکتے کے عالم میں وہ اداس جلوس دیکھا۔

دو سو پچاس قابل رحم چھوٹی چھوٹی مورتیاں، شام کے دھندلکے میں ہمیشہ سے زیادہ سیاہ خمیدہ اور شکست آلودہ، ترچھی ہو کر کیمپ سے دھیرے دھیرے گزر رہی تھیں، وہ حرکت کر رہے تھے ان میں سے ہر ایک غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنوں کو تھوڑی دیر تک دیکھا۔ ایک رفتہ رفتہ حرکت کرتی ہوئی لامحدود زنجیر جیسے پیچھے والے متاسف ہوں کہ آگے والے چل پڑے ہیں اور وہ ان کے پیچھے چلنے میں بیزاری محسوس کر رہے ہوں۔ کچھ لوگ جو دوسروں سے کمزور تھے۔ بازو یا ہاتھ پکڑ کر

لے جائے جا رہے تھے اور ان کے قدم لستے لڑکھڑا رہے تھے۔ کہ وہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر چلنے والے نابینا اشخاص کی طرح گھسیٹ رہے تھے۔ بہتوں نے میس کے ڈبے یا مگ ہاتھوں میں تھام رکھے تھے اور جیل کے حقیر برتن اس خیال سے لے جا رہے تھے کہ سکڑے ہوئے پیٹوں میں زیادہ خوراک نہیں جا سکے گی۔ یہ ڈبے اور پیالے کاسۂ گدائی کی مانند ہاتھوں میں اٹھائے اتنے زوال آمادہ، غلامی کے نمائندے اور قابلِ رحم نظر آ رہے تھے جتنی کہ کوئی اور شے نہ ہو سکتی تھی۔

میں نے اپنے کو روتا ہوا محسوس کیا۔ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے میں نے اپنے ساتھیوں پر نگاہ کی اور ان کے چہرے دیکھے۔

جھونپڑی نمبر ۹ بول پڑی تھی اور ہم سارے بقیہ لوگوں کے لیے اس نے فیصلہ کر دیا تھا یہی وہ جھونپڑی تھی جہاں گزشتہ چار دن سے، منگل کی شام سے لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔

وہ کمرۂ طعام میں گئے اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کہ انھوں نے اپنی روٹی کے راشن اور گوشت کے بدلے میں قاتلوں کو معاف کر دینے کا فیصلہ کیا ہو۔

نمبر ۹ ایک بھوکی جھونپڑی تھی۔ اس کی ٹولیوں میں سب عام مزدور تھے اور بہت ہی تھوڑے قیدیوں کے لیے گھروں سے پارسل آتے تھے۔ ان میں سے بیشتر نحیف و نزار تھے۔ شاید انھوں نے یہ سوچ کر ہتھیار ڈال دیے ہوں کہ لاشوں کی تعداد بڑھ جائے گی!

اس وقت میں نے پولش وتار کے معنی سمجھے اور ان کی ناعاقبت اندیشانہ لیکن جرأتمندانہ بغاوتوں کا مطلب سمجھا۔ پولش انجینئر جیرزی دیگرسکی، جس کا ذکر میں نے پہلے بھی کیا ہے، اب ہماری ٹولی میں تھا۔ وہ اپنا توانا اور آخری سال بھگت رہا تھا۔ جب کام متعین کرنے کی خدمت پر فائز تھا اس وقت بھی کسی نے اسے زور سے بولتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ وہ ہمیشہ پرسکون مہذب اور نرم گفتار رہتا تھا۔

لیکن اب اس کا چہرہ فرطِ غضب، کرب اور نفرت سے مسخ ہو گیا اور اس نے کوشش کر کے بھکاریوں کے اس جلوس کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں اور غضبناک فولادی آواز میں بولا:

"فورمین! کھانے کے لیے مجھے بیدار مت کرنا، میں نہیں جاؤں گا!"

وہ بالائی تختے پر چڑھ گیا اور منہ دیوار کی طرف گھما لیا اور پھر نہیں اٹھا۔ اس رات ہم کھانے کے لیے گئے لیکن وہ نہیں اٹھا۔ اس کے پاس کھانے کے پارسل کبھی نہیں آتے تھے وہ بالکل تنہا تھا اور اس کے پاس ہمیشہ غذا کی قلت رہتی تھی۔ لیکن وہ نہیں اٹھا۔ اس کی باطنی آنکھ میں گوشت کے پیالے سے اٹھتی ہوئی بھاپ، آزادی کے مقصد کو نہیں ڈھانپ سکتی۔

اگر ہم سب اتنے ہی پُر وقار اور ایسے ہی قوی کردار کے حامل ہوتے تو کون ظالم ہمارے مقابل ٹھہر سکتا تھا؟

اگلا دن ۱۰ر جنوری، اتوار تھا۔ انھوں نے ضائع ہونے والی مدت کی تلافی کے لیے ہمیں

کام پر جانے کے لیے نہیں ہانکا (اگرچہ افسران متعینہ پروگرام پر دوبارہ پہنچنے کے لیے یقیناً بیتاب تھے) بلکہ ہمیں صرف کھانا کھلایا گیا، باقی ماندہ راشن فراہم کیا گیا اور ہمیں کیمپ میں اِدھر اُدھر گھومنے دیا گیا۔ ہم سب ایک سے دوسری جھونپڑی میں گئے۔ ایک دوسرے کو بتاتے رہے کہ پچھلے کچھ دنوں میں ہم نے کیسا محسوس کیا اور ہم سب تعطیل کے موڈ میں تھے جیسے ہمیں شکست نہیں فتح نصیب ہوئی ہو۔ علاوہ ازیں ہمارے رحمدل مالکان نے اب پھر وعدہ کیا تھا کہ تمام جائز درخواستیں (لیکن کیسے معلوم کہ جائز کی تعریف کون متعین کرے گا!) پوری کی جائیں گی۔

لیکن ایک چھوٹا سا بیڈھنگا حادثہ ہو گیا۔ دو لوڈ کا پونز ماریت نام کا ایک قیدی جو "غنڈہ پارٹی" میں تھا، تمام وقت ہڑتال میں ہمارے ساتھ رہا تھا، اس نے بہت سی غیر متوازن تقریریں سن رکھی تھیں اور بہتوں سے آنکھیں چار کر چکا تھا، بھاگ کر گارڈ ہاؤس میں چلا گیا جس کا مطلب تھا کہ وہ ہمارے راز افشا کرنے کے لیے کیمپ کے علاقے سے باہر بھاگ گیا۔ جہاں وہ چاقوؤں سے محفوظ رہ سکتا تھا۔

میری نگاہ میں، پونز ماریت کے فرار سے مجرم دنیا کی روح تک رسائی ممکن ہو گئی۔ ان کی مبینہ شرافت صرف اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کا حصہ ہے لیکن جب وہ اپنے آپ کو انقلاب کے گرداب میں مبتلا دیکھتے ہیں تو وہ لازماً غداری کرتے ہیں۔ وہ کسی اصول کو نہیں سمجھ سکتے صرف حیوانی طاقت کو سمجھتے ہیں۔

یہ قیاس کرنا سہل تھا کہ ہمارے افسران سرغنہ لوگوں کو گرفتار کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ لیکن انھوں نے اعلان کیا کہ اس کے برعکس معاملے کی تحقیقات کرنے کے لیے کاراگنڈا، اتماتا اور ماسکو سے تحقیقاتی کمیشن آ گئے ہیں۔ کیمپ کے درمیان منجمد ہو جانے والی ایک زمین پر میز بچھائی گئی۔ یہاں ہمارے کاموں کا تعین ہوتا تھا اور اس کے لیے ہم قطار بنایا کرتے تھے۔ کچھ اعلیٰ افسر بھیڑ کی کھال کے کوٹ اور اونی بوٹ پہنے، وہاں آ کر بیٹھ گئے اور انھوں نے ہم سے اپنی شکایات پیش کرنے کو کہا —— بہت سے قیدی پہنچے اور انھوں نے ان سے باتیں کیں۔ نوٹ قلمبند کیے گئے۔

منگل کو کام کے بعد انھوں نے "شکایتیں پیش کرنے کے لیے" فورمینوں کو یکجا کیا۔ دراصل یہ کمیشن ایک بھونڈا فریب۔ تفتیش کا بہانہ محض تھا۔ وہ واقف تھے کہ قیدی بے اطمینانی سے کھول رہے تھے۔ انھیں پھر اس نکالنے کا موقع دو تاکہ ان میں سے مناسب لوگوں کو گرفتار کرنے کا تصفیہ ہو سکے۔

فورمین کی حیثیت سے میرا یہ آخری دن تھا: میرا متوقع ٹیومر تیزی سے بڑھ رہا تھا اور میں بہت دنوں سے اپنا آپریشن اس وقت تک کے لیے ملتوی کرتا آ رہا تھا، جب تک یہ کیمپ کی لفظیات میں "سہولت بخش" نہ ہو جائے۔ جنوری میں اور خاص طور پر بھوک ہڑتال کے گزشتہ دنوں میں، ٹیومر نے ہی میری جانب سے فیصلہ کر دیا کہ اب یہ "سہولت بخش" ہو گا چونکہ وہ ہر گھنٹے پہلے کے مقابلے میں بڑھتا جا رہا تھا جیسے ہی جھونپڑی کھلے، میں نے ڈاکٹروں کو اپنی حالت دکھائی اور انھوں نے آپریشن کی تاریخ مقرر کر دی۔ لیکن میں اس آخری اجلاس میں اپنے آپ کو کھینچ لایا۔

یہ اجلاس غسلخانے کے بڑے کمرے میں منعقد ہوا۔ انھوں نے حجاموں کی کرسیوں کے سامنے صدارتی مجلس کی میز رکھ دی اس کے پاس ایک حفاظتی پولس کا کرنل، کئی لیفٹننٹ کرنل اور کچھ چھوٹے افسر بیٹھے تھے۔ ہمارا کیمپ کمانڈر ان کے عقب میں دوسری صف میں معمولی طور پر بیٹھا تھا۔ وہاں بھی صدارتی مجلس کے پیچھے نوٹ کرنے والے بیٹھے۔ یہ نشست کے دوران تیزی کے ساتھ قلم بند کرتے رہے جب کہ سامنے کی صف والے مقررین کے نام دہرا کر ان کی معاونت کرتے رہے۔

ایک شخص بقیہ سب سے علیحدہ کھڑا تھا۔ اسپیشل سکشن یا سدر دفتر کا کوئی لیفٹننٹ کرنل تھا۔ چاق و چوبند، ذہین اور شریر النفس جس کی بھنویں اونچی اور چہرہ لمبوترا تھا، یہ حاضر جوابی، یہ تیکھے نقش و نگار اس بات کو تسلیم کرنے میں حارج ہوتے تھے کہ وہ موٹی عقل والے پولس افسران کے غول میں شامل تھا۔

فورمینوں کے سامنے آنے کی خواہش نہیں تھی۔ انھیں پُرہجوم بنچوں سے تقریباً کھینچ کر کھڑا کرنا پڑا۔ جیسے ہی انھوں نے اپنی بات کہنا چاہی، انھیں ٹوک دیا گیا اور ان سے یہ واضح کرنے کو کہا گیا کہ لوگوں کے قتل کیوں ہو رہے ہیں اور ہڑتالیوں کا مقصد کیا ہے؟ اور اگر کوئی بدقسمت فورمین، سوالات، قتلوں کے اسباب، مطالبات کی نوعیت کے بارے میں کچھ جوابات دینے کی کوشش کرتا تو سارا غول ایک ساتھ اس پر جھپٹ پڑتا۔ تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟ تو تم ان غنڈوں سے تعلق رکھتے ہو؟ ٹھیک ہے اب ان کے نام بتاؤ!!

ہمارے مطالبات کے "جائز" ہونے کے بارے میں اور منصفانہ و مہذب تحقیق کے لیے یہ تھا وہ تحقیقاتی کمیشن!

اونچی بھووں والا لیفٹننٹ کرنل مقررین کو لقمہ دینے میں خاصا تیز تھا، اس کی زبان بہت تیزی سے چلتی تھی اور اسے ترانہ ہونے کی سہولت حاصل تھی۔ اپنی تیکھی جرح میں اس نے ہمارا اپنا معاملہ پیش کرنے کی ہر کاوش ناکام کر دی۔ کارروائی جو رخ اختیار کرتی جا رہی تھی اس سے آپ یہ خیال کرتے کہ صرف ہم پہ کچھ الزامات عائد کیے جا رہے ہیں اور ہمیں اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

اس سب کو روکنے کی ایک خواہش میرے دل میں پیدا ہوئی۔ میں کھڑا ہو گیا اور میں نے اپنا نام بتایا (جو بیانات قلم بند کرنے والوں کے لیے دہرایا گیا) میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ سمجھتے ہوئے بنچ سے اٹھا کہ اس پورے بند میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو پورا ایک با مفہوم فقرہ مجھ سے زیادہ آسانی کے ساتھ پیش کر سکتا ہو! ایک ہی دشواری تھی وہ یہ کہ میں دل میں یہ تصفیہ نہیں کر پایا تھا کہ انھیں کیا بتایا جائے، جو کچھ ان صفحات پر لکھا گیا ہے وہ سب، جو کچھ ہم نے بھگتا تھا وہ سب اُن برسوں کے دوران ہم اپنے دل ہی دل میں جو گھمن لگائے بیٹھے تھے وہ سب اور بھوک ہڑتال کے وہ تمام ایام —— میں انھیں یہ سب بتانے کی کوشش کرتا تو ایسا ہی تھا جیسے اورنگ اوٹانوی (بندروں) کو کچھ بتانے کی کوشش کی جائے! وہ کسی عملی شکل میں تو ردِ عمل دی سکتے تھے، اب بھی کافی آسان روسی زبان سمجھنے کے قابل تھے جیسے "داخلے کی اجازت؟" "بولنے کی اجازت جناب!" لیکن طویل میز کے پاس ایک قطار میں بیٹھے "ہشت دہ

لوگ جب اپنے تیکھے، سفید، لاپروا ایک جیسے جذبات سے عاری الگ چہرے اٹھاتے تو ظاہر ہو جاتا تھا کہ وہ انسانیت سے الگ بہت عرصہ قبل ایک ایسے علیحدہ جاندار کی شکل اختیار کر چکے ہیں کہ ہمارے درمیان لفظوں کے ذریعے ترسیل خیال کا سلسلہ قطعاً منقطع ہو گیا ہے۔ اور ہم صرف گولیوں کا تبادلہ کر سکتے ہیں۔

صرف وہ لمبوترے چہرے والا آدمی ابھی اور ننگ۔ اوٹان نہیں بنا تھا! اس کی قوت سماعت و فراست درجۂ اوّل کی تھی۔ میرے بولتے ہی اس نے مجھے ٹوکنے کی کوشش کی۔ تمام حاضرین پوری توجہ سے سن رہے تھے اور برق آسا تیز سوال جواب کے داؤں پیچ شروع ہو گئے:

"تم کہاں کام کرتے ہو؟"

(اس سے کیا فرق پڑتا ہے! میں سوچتا ہوں)

"انجینیئرنگ ورکشاپ میں" میں نے فوراً بلند تیکھی آواز میں کہا اور جلدی سے زیادہ اہم باتوں پر آ گیا۔ اس نے براہِ راست میری پشت پر وار کیا ——

"جہاں وہ چاقو بناتے ہیں؟"

"نہیں" میں نے اس کا وار بچاتے ہوئے کہا "جہاں وہ خودکار آلات کان کنی کی مرمت کرتے ہیں"

(میں خود نہیں جانتا کہ میرا دماغ کس طرح اتنی تیزی اور وضاحت کے ساتھ کام کرنے لگے)

جلدی کرو، جلدی کرو۔ انھیں خاموش کر کے اپنی بات سننے کے لیے آمادہ کرو، یہی اہم بات ہے۔

وہ جنگلی میز کے پیچھے آ گیا اور اچانک اپنے دانت مجھ میں چبھونے کے لیے جھپٹا۔

"تم یہاں اس لیے آئے ہو کہ لیڈروں نے تمہیں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے؟"

"نہیں بلکہ اس لیے کہ آپ نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی ہے" میں نے برق رفتاری کے ساتھ جواب دیا اور بولتا گیا، بولتا گیا۔

وہ مجھ پر دو ایک بار اور بھی حملہ آور ہوا، شکست کھائی اور بالکل خاموش ہو کر بیٹھ گیا میں فتحیاب ہو گیا تھا۔

میں فتحیاب ہو گیا تھا؟ لیکن کس مقصد میں! صرف ایک سال اور رہ گیا ہے! صرف ایک سال اور کاٹنا ہے۔ اور اس خیال نے مجھے کچل دیا۔ میں وہ الفاظ منہ سے نہیں نکال سکتا جو انھیں سنانے چاہئیں میں اسی وقت وہاں ایک ناقابلِ فراموش تقریر کر سکتا تھا اور اگلے دن گولی سے اڑا دیا جاتا۔ اس کے باوجود میں وہ تقریر کر گزرتا اگر وہ ساری دنیا میں اسے ریڈیو سے نشر کرتے لیکن سامعین کی تعداد بہت ہی کم تھی!

اس لیے میں نے انھیں یہ نہیں بتایا کہ ہمارے کیمپ فاشسٹ طرز پر چل رہے ہیں اور حکومت کے زوال کی علامت ہیں۔ میں نے ان کی متجسس ناکوں کے نیچے محض مٹی کے تیل سے بھیگا ہوا ایک چیتھڑا لہرا دینا کافی سمجھا مجھے معلوم تھا کہ کاؤلے فوج کا کمانڈر وہاں براجمان تھا اس لیے میں نے کیمپ کے پہریداروں

کے ناقص نظام کی مذمت کی جو اب سوویٹ مجاہد سپاہیوں کے مماثل نہیں رہ گئے تھے۔ جو جانے تعمیرے چوری کرنے میں شامل ہوتے تھے اور جو جنگلی تھے سینگ مارتے تھے اور قاتل بھی تھے۔ بعدازاں میں نے کیمپ کے وارڈروں کو حریص بد معاشوں کا گروہ قرار دیا۔ جو اپنے لیے زکیوں کو تعمیری سامان چرالانے پر مجبور کرتے تھے (یہ بات بالکل سچ تھی البتہ یہ ہے کہ اس کا آغاز وہاں بیٹھے ہوئے افسروں نے کیا تھا!)

میں نے کہا، جو اپنی اصلاح کے خواہش مند تھے!

خود مجھے اپنی تقریر پسند نہیں آئی اس میں واحد خوبی یہ تھی کہ اب ہم بات کو راہ پر لا رہے تھے۔

درمیانی سکوت کے وقفے میں جسے میں نے قائم کر دیا تھا، ایک فورمین ــــ ٹی..... اٹھا اور اس نے ڈھیرے ڈھیرے تقریباً غیرواضح نامکمل فقرے کہے، خواہ اس لیے کہ یہ اس کے لیے فطری تھا یا اس لیے کہ وہ حد درجہ بدحواس تھا۔

"جب دوسری قیدی کہتے تھے..... ہم کتوں کی زندگی..... بسر کرتے ہیں..... تو میں ان سے..... اتفاق کرتا تھا۔

مجلس صدارت کا جنگلی پہلو بدلنے لگا۔

ٹی نے ٹوپی اپنے ہاتھوں میں موڑلی۔ ایک بھونڈا سا گنجے سر والا قیدی، مناسب الفاظ تلاش کرنے کی کاوش میں اس کا خشک چہرہ اینٹھ سا گیا ــــ

"لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ میرا خیال غلط تھا....."

جنگلی کے چہرے پر چمک آ گئی۔

"ہم جی رہے ہیں، لیکن کتوں سے کئی گنا بدتر زندگی....." ٹی نے اچانک زور دے کر کہا اور تمام فورمین ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے: "کتے کے کالر پر صرف ایک نمبر ہوتا ہے! ہم پر چار ہیں۔ کتوں کو گوشت کھلایا جاتا ہے، ہمیں مچھلی کی ہڈیاں کھلائی جاتی ہیں۔ کتے کو کوٹھری میں بند نہیں کیا جاتا، کتے پر برجیوں سے گولیوں کی بارش نہیں ہوتی۔ کتوں پر پچیس سال کی جیل کی پرچیاں نہیں ٹانکی جاتیں!"

اب وہ جب چاہیں ٹوک دیں اس نے مطلب کی باتیں کہہ ڈالی تھیں)۔ جیر فوگورروت اٹھا۔ اس نے "سوویٹ یونین کے دلاور" کا تمغہ حاصل کرنے والے کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا، پھر ایک اور فورمین اٹھا اور دونوں ہمت اور جوش کے ساتھ بولے۔ مجلسِ صدارت میں ان کے ناموں سے بڑی پرتاثیر گونج پیدا ہو گئی۔

ہو سکتا ہے لڑکو! اس سے ہم تباہی کے نزدیک پہنچ جائیں..... اور ہو سکتا ہے کہ اپنے سروں کو اس سے ٹکرا ٹکرا کر ہم اس کم بخت دیوار کو زمین بوس کر دیں۔

اجلاس کے خاتمے پر بازی برابر کی رہی۔

کچھ دنوں تک سب کچھ پُرامن رہا۔ کمیشن پھر دکھائی نہیں دیا اور کیمپ ڈویژن میں زندگی اتنی پُرسکون تھی کہ جیسے وہاں کبھی ہنگامہ ہوا ہی نہ ہو۔

ایک پہرے دار مجھے لوکر بنی جستے والے اسپتال میں لے گیا بھوک ہڑتال کے بعد وہاں منتقل ہو گیا

میں پہلا فرد تھا۔ پہلا پرندہ!

سرجن یا چینگونے، جسے میرا آپریشن کرنا تھا، مجھے جانچ کے لیے بلایا تھا لیکن اس کے سوالات اور میرے جوابات میرے ٹیومر سے متعلق نہیں تھے۔ اُسے میرے ٹیومر میں دلچسپی نہیں تھی اور مجھے ایسا بھروسے کا ڈاکٹر ہاتھ آنے پر خوشی ہوئی تھی۔ اس کے سوالات کی کوئی انتہا نہیں تھی اس کا چہرہ اس تکلیف سے سیاہ پڑ گیا تھا۔ جو ہم سب نے مل کر برداشت کی تھی۔

ایک تجربہ مختلف زندگیوں میں مختلف زاویے سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ٹیومر، جو بہرا عتبار تکلیف دہ اور ڈھیٹ معلوم ہوتا تھا اگر میں آزاد ہوتا تو یہ میرے لیے کتنا اذیت ناک ہوتا مجھے کیسی شدید کوفت ہوتی، میرے اعزا و اقربا کتنے پریشان ہوتے لیکن اس جگہ جہاں سر برٹا نے تکلفی کے ساتھ دھڑ سے علیحدہ کر دیے جاتے ہیں، وہی ٹیومر بستر پر آرام کرنے کا حیلہ بن گیا تھا اور میں اس کے بارے میں زیادہ فکر مند نہ ہوتا تھا۔

میں اسپتال میں ان زخمیوں کے درمیان پڑا تھا جو اس خونی رات کو زخمی اور اپاہج بنے تھے وہ لوگ بھی وہاں تھے جنھیں وارڈروں نے مار مار کر بھرتا بنا دیا تھا ان کے جسم کا کوئی عضو ایسا نہ تھا جس کے بل وہ لیٹ سکیں، ان کا گوشت پٹیوں سے بندھا ہوا تھا ایک اکھڑ وارڈر نے اپنے ہاتھ کے لیے پاٹپ سے یہ بربریت کا عمل کیا تھا (حافظہ۔ حافظہ آج مجھے اس کا نام یاد نہیں آرہا ہے) ایک آدمی زخموں کی تاب نہ لاکر پہلے ہی مر چکا تھا۔

باوثوق ذرائع سے خبر آئی "روسی" کیمپ ڈیویژن میں تعزیری کارروائی شروع ہو گئی تھی۔ چالیس آدمی گرفتار ہوئے تھے۔ نئی بغاوت کے خطرے کے تحت انھوں نے یہ گرفتاریاں اس طرح کیں: بالکل آخری دن تک صاحب لوگ ملائمت برتتے رہے اور آپ صرف فرض کر سکتے تھے کہ وہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ افسروں میں کون کون قصور وار ہیں۔ لیکن مقررہ دن جب عملی دستے پھاٹکوں سے گزر رہے تھے، انھوں نے دیکھا جو ٹکڑاں ٹولی انھیں لی جاتی تھی اس کی تعداد عام دنوں کے مقابلے دو تین گنی ہے منصوبہ یہ تھا کہ قیدیوں کو وہاں دبوچ لیا جائے جہاں وہ ایک دوسرے کے معاون نہ ہو سکیں۔ پہریدار کالموں کو مارچ کراتے ہوئے کیمپ سے باہر لائے اور انھیں الگ الگ راستوں سے اسٹیپی میں لے گئے لیکن ان میں سے کسی کو اس کی منزل پر لانے سے قبل کمانڈر افسروں نے احکام نہیں دیے "ٹھیرو! اسلحہ تیار! بندوقوں میں کارتوس بھر لو! قیدیو، بیٹھ جاؤ! میں تین تک گنتی گنوں گا اور تمہیں بیٹھے تو گولی چلا دوں گا۔ سب بیٹھ جائیں!"

جس طرح سال گزشتہ، ایپفینی (ایک تہوار) پر ہوا تھا اسی طرح اس بار پھر دھونس دے کر پھنسایا گیا اور بے بس غلاموں کو برف سے ٹانک دیا گیا بعد ازاں ایک افسر نے ایک کاغذ کھولا۔ ان لوگوں کے نام اور نمبر پڑھے جنھیں کھڑا ہونا تھا۔ مدافعت کے بغیر ریوڑ سے نکل جاتا تھا اور حصار سے گزرنا تھا اس کے بعد ان مٹھی بھر باغیوں کو علیحدہ پہرے داروں کے ساتھ واپس مارچ کرایا گیا، یا پھر انھیں لینے کے لیے ایک مدریا گاڑی پہنچ گئی اس کے بعد ریوڑ کو، جس میں سے ابال پیدا کرنے والے عناصر خارج کر دیے

گئے تھے، کھرڈاک کے کام پر ہانک دیا گیا۔

ہمارے اساتذہ نے مجھے بتا دیا تھا کہ ان کی باتوں پر کبھی بھروسہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔

انھوں نے کیمپ کے میدان میں انھیں دن بھر کے لیے تنہا کر کے، جیل کے امیدوار بھی چھانٹ کر نکال لیے اور گرفتاریاں اس چار میٹر بلند دیوار کو بآسانی پھلانگ گئیں جسے ہڑتال پار نہیں کر سکی تھی، اور یوکرینی کیمپ ڈویژن کو کترنے لگیں۔ جس دن میرا آپریشن ہونے والا تھا اسی دن سرجن یاچنکو کو گرفتار کر لیا گیا۔

قیدیوں کو ابتدائی احتیاط برتے بغیر گرفتار کیا جاتا رہا یا دوسرے کیمپوں میں بھیجا جاتا رہا۔ یہ معلوم کرنا ہمیشہ دشوار ہوتا تھا کہ انھیں کہاں بھیجا گیا ہے۔ بس بیس یا تیس کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بھیج دی گئیں اس کے بعد اچانک ۱۹ ارفروری کو انھوں نے بہت سی موٹریں، تقریباً سات سو، جمع کرنی شروع کر دیں، انھیں خصوصی نگرانی میں رکھا گیا۔ جب وہ کیمپ سے روانہ ہوئے تو ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ تقدیر نے سختی کے ساتھ انتقام لیا تھا! یوکرینی جنھوں نے ماسکو والوں کی معاونت سے احتیاط برتی تھی، موٹروں میں ہم سے زیادہ خوار ہو رہے تھے۔

یہ بے شک سچ ہے کہ چلنے سے قبل انھوں نے ہماری ٹوٹی ہوئی ہڑتال کو سلام کیا۔ لکڑی پکانے کے ایک نئے کارخانے میں، جو عجیب بات تھی کہ سرتاپا لکڑی سے بنا دیا گیا تھا (قازقستان میں جہاں عمارتی لکڑی کی قلت ہے اور پتھروں کی افراط) آگ لگ گئی اور بیک وقت کئی جگہوں سے جل گیا جس کے اسباب حکومت کی جانب سے کبھی نہیں بتائے گئے اور دو گھنٹوں کے اندر [illegible] روبل دھواں بن کر اڑ گئے۔ جن لوگوں کو گولی کا لشانہ بنانے کے لیے لایا جا رہا تھا ان کے لیے یہ آتش زدگی کسی وائکنگ کی تدفین کی مانند تھی۔ اسکینڈی نیویا میں پرانے زمانے میں رسم تھی کہ ہیرو کی کشتی بھی اس کی لاش کے ساتھ پھونک دی جاتی تھی۔

میں ایک بار پھر بسترِ علالت پر اسپتال میں تھا۔ میں وارڈ میں اکیلا تھا، کیمپ میں اتنی افراتفری تھی کہ کسی کو بھرتی نہیں کیا جاتا تھا اور اسپتال کا کام ٹھپ پڑا تھا۔ میرا کمرہ جھونپڑے کے آخری سرے پر تھا اور اس کے عقب میں مردہ گھر تھا۔ جہاں ڈاکٹر کارن فیلڈ کی لاش نہ معلوم کتنے عرصے تک رکھی رہی تھی کیونکہ اسے دفن کرنے کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں تھا۔ صبح و شام ایک وارڈر اپنا گشت مکمل کرتے ہوئے باہر رکتا تھا اور گنتی کو مختصر کرنے کی غرض سے میرے کمرے اور مُردہ گھر کو ملا کر ایک ہی اشارے میں شمار کر لیا کرتا تھا، "اور دو یہاں ہوئے" اور ہمارے متعلق اپنے پرچے میں نشان لگا لیتا تھا۔

پادیلا لوروشیک کو بھی اس بڑے جتھے میں جانے کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ وہ ہجوم کو چیرتا ہوا جانے سے قبل مجھ سے بغل گیر ہونے کے لیے آیا وہ نہ صرف ہمارے کیمپ بلکہ تمام دنیا میں اجڑا ہوا اور طوفان کے سامنے لرزتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہم طوفان زدہ تھے اور یہ محسوس نہیں کر پاتے تھے کہ کیمپ کے باہر سب کچھ ہمیشہ کی طرح پرسکون اور معمول پر تھا۔ ہم ایسا محسوس کرتے تھے جیسے بڑی بڑی موجوں پر سوار ہوں، کسی اپنے مقام پر کھڑے ہیں جو شاید ہمارے پیروں کے نیچے ڈوب جائے گا اور اگر ہم

پھر کبھی ایک دوسرے سے ملے تو یہ ملاقات کسی دوسرے ہی ملک میں ہوگی!
لیکن صرف اگر ——— الوداع میرے دوست ——— الوداع میرے تمام رفیقو!

———— ٭ ————

حماقت اور بے حسی کا وہ سال ——— ایکی بنز میں میرا آخری سال اور گلاگ مجمع الجزائر پر اشالن حکومت کا آخری سال گھٹتا چلا گیا۔ کچھ عرصہ جیل میں رکھنے کے بعد اور ان کے خلاف کوئی شہادت نہ ملنے کی وجہ سے چند ——— لیکن چند ہی لوگوں کو واپس کیمپ پر، بھیج دیا گیا۔ بہت سے، بہت سارے جنھیں ہم کئی سالوں سے جان گئے تھے اور پیار کرنے لگے تھے، کہیں اور لے جائے گئے، کچھ کو مزید تحقیق و تفتیش اور مقدمے کے لیے، کچھ کو ان کی فائلوں پر منقش والے سیاہ نشانوں کے باعث علیحدہ رکھنے کا بندوبست کرنے والوں کے پاس (خواہ وہ عرصے سے قیدیوں کی بجائے فرشتوں کی طرح عمل کرنے لگے ہوں) بھیجا گیا اور کچھ کو دوسری کارگان کی کانوں میں بھیج دیا گیا۔ ایک عارضی ذہنی توازن کھو دینے والوں کے لیے بھی تھی۔ کامیڈین کشکن کو اسی گروہ میں شامل کر دیا گیا اور ڈاکٹروں نے رد لود یا گرشنی کو بھی دہیں کے لائق سمجھا۔

جانے والوں کی جگہ لینے کے لیے "سیف ڈپارٹ" سے مجبر ایک ایک کرکے باہر آنے لگے پہلے قدرے خوف اور گھبراہٹ کے ساتھ اور پھر بے دھڑک۔ ایک اور شخص جو کیمپ میں واپس آیا وہ انتہائی بدمعاش دولود کا پونو ماریف تھا، جو پہلے کبھی محض لیتھ آپریٹر تھا لیکن اب پارسل روم کا انچارج بنا دیا گیا۔ محتاج خاندانوں کے جمع کردہ ٹکڑے تقسیم کرنے کا فرض چیکسٹ میکسیکو نے قدرتی طور پر ایک بدنام چور کے سپرد کیا۔

افسرانِ تحفظ پھر جب جی چاہے کسی کو بھی اپنے دفتر میں طلب کرنے لگے۔ یہ ایک حبس زدہ موسمِ بہار تھا ہر شخص نے جس کے سینگ یا کان زیادہ بڑھ گئے تھے، تیزی کے ساتھ سرِ تسلیم خم کرنا سیکھ لیا۔ میں دوبارہ اپنے فورمین کے کام پر نہیں گیا (اب پھر بہت سے فورمین دستیاب تھے) بلکہ فاؤنڈری میں اسملٹر کا مددگار بن گیا اس برس ہمیں سخت محنت کرنی پڑی۔ جس کا سبب میں بیان کروں گا۔ انتظامیہ نے واحد رعایت یہ برتی کہ ہمیں خود کفیل بنا دیا گیا۔ لیکن ہمارے سارے مطالبات التواء میں پڑے رہے۔ اس طریق عمل کے تحت ہم جو کچھ پیدا کرتے تھے وہ گلاگ کے بڑے پیٹ میں بلا معاوضہ نہیں ہضم ہو جاتا تھا بلکہ اس کی قیمت لگائی جاتی تھی۔ اور اس کا ۴۵ فی صد ہماری کمائی متصور ہوتی تھی (بقیہ حکومت کا حصہ تھا) اس کمائی میں سے ستر فی صد رقم کیمپ کے نگرانوں، کتوں، کانٹے دار تار، کیمپ جیل، افسرانِ تحفظ اور ڈسپلن نیز سنسر شپ کے لیے اور شعبۂ تعلیم کے افسروں کے لیے ——— القصہ ان تمام چیزوں کے لیے وضع کر لیا جاتا تھا جن کے بغیر ہماری زندگی جینے کے لائق نہ رہ جاتی ——— لیکن باقی ماندہ ۳۰ فی صد (ساری پیداوار کا ۱۳½ فی صد) قیدی کے حساب میں شمار کیا جاتا تھا اور اس رقم کا کچھ حصہ، ہر چند کہ سب نہیں (بشرطیکہ آپ نے اپنا برتاؤ خراب نہ رکھا ہو، لیٹ نہ ہوئے ہوں، گستاخی نہ کی ہو، اپنے افسروں کی نگاہ میں بے کار نہ قرار پائے ہوں) درخواست دے کر مہینے میں ایک نئی کیمپ کرنسی ——— واؤچروں کی شکل میں بدلا جا سکتا تھا اور یہ واؤچر آپ خرچ کر سکتے تھے۔ یہ نظام اس انداز سے مرتب کیا گیا تھا کہ آپ جتنا زیادہ پسینہ بہاتے، جتنا زیادہ خون جلاتے (۱۰۰ فی صد کے اتنا ہی نزدیک آ جاتے لیکن اگر آپ اپنی پیٹھ توڑنے کے خواہشمند نہ ہوں تو آپ کی ساری محنت کیمپ کے حصے پر چلی جاتی اور کیمپ کے حصے میں صفر آتا تھا۔

اور اکثریت نے، یہ ہماری تاریخ میں اکثریت کا کیا کردار رہا ہے بطورِ خاص اس وقت جب وہ اکثریت خصوصی احتیاط کے ساتھ پروان چڑھائی گئی ہو، اپنے افسران کی پیش کردہ یہ میٹھی گولی شکریے کے ساتھ نگل لی اور اپنے لیے صحت کا خطرہ اٹھاتے ہوئے کام کیا تاکہ وہ اشیائے خوردنی کے کاؤنٹر پر منجمد دودھ، مارجرین (خوردنی تیل) اور گندی مٹھائیاں خرید سکیں یا بازاری کھانے کے کمرے میں اپنے لیے مختلف کھانے کا بندوبست کر سکیں اور چونکہ خوراک شیٹ تمام گروہوں کے لیے ایک ہی جگہ تیار کی جاتی تھی اس لیے جو لوگ مارجرین کے لیے اپنی صحت کو غارت نہیں کرنا چاہتے تھے انھیں بھی کام کرنا پڑتا تھا تاکہ ان کے ساتھی زیادہ کما سکیں۔

انھوں نے کیمپ میں فلمیں بھی پہلے سے زیادہ دکھانی شروع کر دیں، جیسا کہ کیمپوں میں یا گاؤں اور مزدوروں کی دور افتادہ بستیوں میں ہمیشہ ہوتا ہے۔ کسی کے بھی دل میں تماش بینوں کے لیے عزت کا ذرا سا بھی جذبہ نہیں تھا کہ فلموں کے ناموں کا پہلے سے اعلان کر دیں ـــــ آخرش سوز کر پہلے سے مطلع نہیں کیا جاتا کہ ان کی ناندوں میں کیا ڈالا جائے گا۔ پھر بھی قیدی ـــــ کیا یہ وہی قیدی تھے جنھوں نے اتنی بہادری کے ساتھ موسم سرما میں بھوک ہڑتال کا سلسلہ جاری رکھا تھا؟ اب ہجوم کی شکل میں آتے تھے اور کھڑکیوں پر پردے کھینچنے سے ایک گھنٹہ پیشتر ہی سیٹوں پر قابض ہو جاتے تھے اور اس بات کی قطعی پرواہ نہ کرتے تھے کہ فلم لائق دید ہے بھی یا نہیں۔

روٹی اور سرکس..... وہ ایسے لفظوں کی جوڑی ہے کہ اسے دہراتے ہوئے بھی پریشانی محسوس ہوتی ہے۔

اتنے برسوں کی بھوک کے بعد شکم سیر ہو کر کھانے کی خواہش رکھنے والے لوگوں کو کوئی بھی الزام نہیں دے سکتا لیکن جب ہم ادھر شکم پُری کی فکر میں مبتلا تھے تو ہمارے ساتھی، کچھ لوگ جنھوں نے ہمیں لڑنا سکھایا تھا، کچھ جنھوں نے جنوری کے ان ایام میں اپنے ساتھیوں سے چیخ کر کہا تھا "ہم سپر انداز نہ ہوں گے!" اور کچھ جو ذرا بھی نہیں الجھے تھے، اس وقت کہیں مقدمات میں مبتلا تھے، ہمارے ساتھی گولیوں کا نشانہ بن رہے تھے یا نئی سزائیں بھگتنے کے لیے سیپریٹ کیمپوں میں لے جائے جا رہے تھے۔ متواتر تفتیش کے عمل سے پست ہو گئے تھے اور ان کو کوٹھڑیوں میں ڈال دیے گئے تھے جن کی دیواروں پر موت کی سزا پانے والے لوگوں نے کھرچ کر صلیبیں ہی صلیبیں بنادی تھیں اور سیجر کی شکل میں ایک سانپ مسکرا کر وعدہ کرنے کے لیے آتا تھا: "آہ! نہیں! میں تمھیں بھولا نہیں ہوں۔ اوہ ہاں ـــــ مجھے یاد ہے! پیچھے گھوم رہے ہیں، فکر مت کرو۔ ہم جلدی تمھارے معاملات پر غور کریں گے!"

کیسا عمدہ فقرہ ہے۔ معاملات پر غور کریں گے۔ آپ کسی شخص کو دوسری دنیا کے لیے پروسس کر سکتے ہیں۔ کسی آدمی کو چوبیس گھنٹے کے لیے کوارٹر میں پروسس کر سکتے ہیں، سیکنڈ ہینڈ پتلون کے لیے تحریر کردہ ایک پرزے کو بھی پروسس کر سکتے ہیں لیکن دروازہ جھٹکے کے ساتھ بند ہو گیا ہے۔ سانپ جا چکا ہے۔ پُراسرار مسکراہٹ بکھراتے ہوئے آپ کو قیاس آرائی کے لیے چھوڑ گیا ہے۔ ایک ماہ تک آپ عالم بیداری میں سو بچا سکتے ہیں، اپنا سر پتھر دراسے ٹکراتے ہوئے سوچتے رہیے کہ وہ آپ کو ٹھیک ٹھیک کس صورت میں پروسس کرنا چاہتے ہیں.....

اس کے بارے میں بات کرنا آسان ہے۔

اچانک ایکی بستیز میں انھوں نے بسیار اشخاص کی ایک پارٹی باہر روانگی کے لیے تیار کی۔ یہ کچھ عجیب سی پارٹی تھی۔ انھیں کسی تعین کے بغیر یکجا کیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ کا برتاؤ نہیں کیا گیا جیسے کہ انھیں ہلاک کرنے کے لیے جمع کیا گیا ہو لیکن ان میں سے ایک آدمی کی بھی سزا کی میعاد نزدیک نہیں تھی اور نہ ان میں کوئی ویسا بچہ کا نزدیک تھا جنھیں افسر کم وقت کوٹھڑی میں رکھ کر خصوصی اذیت پہنچا کر توڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نہیں، وہ سب اچھے قیدی تھے جنھیں ان کے مالکان اچھا سمجھتے تھے۔ ان میں ایک بار پھر سوار یا

مرمت کرنیوالے کارخانے کا دھلتی لقین کارکن اور اپنی بات کو بہ اصرار کہنے والا فوردین مینائل میخائلووچ حبرالوف بھی تھا۔ ایک فوردین سادہ لوح میکینک فیلسوف، انجینئر اور ٹکنیشین کلشیائیف، ماسکو کا ڈرامہ نویس نذر کیوف جو بہت سنجیدہ مزاج اور صابر شاکر آدمی تھا اور چہرے سے قوی سیدھا نظر آتا تھا شیریں کلام اور سب کا دوست زینکا طیدکوف جو پستہ قد پر تیز تھا اور جس کا چہرہ گت خانہ تھا۔ ایک دوسرا لطیفہ آپر بیڑ جارجین کوکی کو جیرا جاتا تھا جو بڑا حق گو تھا اور لوگوں کے سامنے انصاف کی بات کرنے کا مظاہرہ کرتا تھا۔

وہ کہاں جارہے تھے ؟ پارٹی میں جو لوگ شامل تھے انھیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ کسی زیادہ سخت تعزیری جیل میں تو مر بچا نہیں جارہے تھے۔ ان سے کہا گیا کہ جہاں تم لوگ جارہے ہو بڑی نفیس جگہ ہوگی۔ وہاں تم پر سے پہرے دار ہٹالیے جائینگے۔" لیکن ان میں سے کسی نے مسرت کا اظہار نہیں کیا، لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں! انھوں نے اپنے سر مغموم انداز میں ہلائے، بیدلی کے ساتھ اپنا سامان جمع کیا۔ انھیں تذبذب تھا کہ سامان ساتھ لے جائیں یا چھوڑ جائیں۔ وہ مار کھائے ہوئے آوارہ کتوں کی طرح لگتے تھے کیا وہ اپنی بستی کے نشیب وفراز سے اتنی محبت کرنے لگے تھے ؟ انھوں نے الوداع بھی بڑے بے جان ہونٹوں سے ساتھ کہی اور انکی آواز کا آہنگ عدم اعتمادی کی جھلک رکھتا تھا۔

انھیں وہاں سے منتقل کردیا گیا۔

ہمیں انھیں فراموش کرنے کے لیے وقت نہیں دیا گیا۔ تین ہفتوں کے بعد چاروں طرف یہ خبر گشت کرگئی کہ انھیں واپس لایا گیا ہے! واپس یہاں؟ ہاں۔ ان سب کو؟ ہاں — بس اتنا ہے کہ وہ اشاف بیرکوں میں بیٹھیں یا اور اپنی جھونپڑیوں میں نہیں جائینگے!

ایکی باستڑ میں تین ہزار قیدیوں کے ذریعے کی جانے والی بھوک ہڑتال کا یہ آخری دور تھا —— غداروں کی ہڑتال! یہ تو ان کی نہ جانے کی خواہش کی بات ہوئی! تفتیش کنندگان کے دفتر میں جب وہ ہمارے دوستوں کی مخبری اور جھوٹے بیانات پر دستخط کر رہے تھے تو کیا انھیں یہ توقع تھی کہ وہ تمام جرائم کے اقبالی بیانات منظوری کی سیل لگا کر رکھ دیے جائیں گے ؟ بلاشبہ کبھی دوبارہ ان سے یہی ہوتا آیا تھا کہ سیاسی شکایتی بیان کو جرح کی حدود سے باہر کی دستاویز تصور کیا جاتا تھا اور مخبر کا نام صیغہ راز میں رکھا جاتا تھا لیکن ہماری ہڑتال کے بارے میں کوئی ایسی بات تھی، شاید اپنے افسران بالا کے سامنے اپنے عمل کا جواز پیش کرنے کی ضرورت تھی! جس نے ہمارے افسران کو کارگنڈا میں کسی جگہ بڑے پیمانے کا مقدمہ چلانے پر مجبور کردیا۔ ان افراد کو ایک دن وہاں لے جایا گیا اور جب انھوں نے ایک دوسرے کے متفکر چہرے دیکھے تو انھیں احساس ہوا کہ وہ سب عدالت میں شہادت دینے کے لیے لے جائے جارہے ہیں۔ اس میں بھی انھیں کوئی پریشانی نہ ہوتی لیکن وہ گلاگ کے قبل از جنگ والے اس قانون سے واقف تھے کہ کسی عارضی کام کے لیے طلب کردہ قیدی کو اس کے سابقہ کیمپ میں ہی واپس بھیجا جائے گا۔ لیکن ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ انھیں استثنائی صورت کے طور پر کارگنڈا میں ہی رکھ لیا جائے گا۔ اصل میں ایک فرمان کا مسودہ بھی تیار کیا گیا تھا لیکن یہ درست شکل میں نہ تھا ناقص تھا اور کاراگنڈا نے انھیں رکھنے سے انکار کردیا۔

وہ تین ہفتے سڑک پر رہے۔ انھیں کے پہرے داروں نے انھیں اسٹولی پن کاروں سے درمیان کے سفری کیمپوں میں پہنچا دیا تھا اور سفری کیمپوں سے پھر اسٹولی پن کاروں میں بھر دیا گیا۔ چیخ کر ان سے فرش پر بیٹھ جانے کو کہا گیا، ان کی جامہ تلاشیاں لی گئیں، ان کا سامان بار کیا گیا۔ انھیں جلدی جلدی غسل خانوں میں پہنچایا گیا، کھانے کے لیے بیرنگ مچھلی ملی اور پینے کو کچھ نہیں، ان کے ساتھ ہر وہ سلوک روا رکھا گیا جو عام اور غیر معاون قیدی کی حوصلہ شکنی کے لیے کیا جاتا ہے۔ بعد ازاں انھیں پہرے میں کمرۂ عدالت تک لایا گیا جہاں انھیں پھر ان لوگوں کا سامنا کرنا پڑا جن کی انھوں نے مذمت اور چغلی کی تھی۔ ان کے تابوتوں میں یہ آخری کیلیں جڑنے کے لیے، انکی

قید تنہائی کی کوٹھریوں کو منتقل کرنے کے لیے دوبارہ اپنی سزاؤں کا آغاز کرنے کے لیے تاکہ وہ آئندہ سالہا سال تک جاری رہ سکیں اس کے بعد وہاں تمام سزوی جیلوں سے گزر کر گھر واپس لائے گئے اور کسی نقاب کے بغیر پرانے کیمپوں میں پھینک دیے گئے۔

اب ان کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ تجربہ ملاحوں کی طرح ہوتے ہیں۔۔۔۔

لیکن کیا اب کیمپ میں امن نہیں تھا؟ کیا تقریباً ایک ہزار افراد وہاں سے ہٹائے نہیں گئے تھے؟ کیا اب کوئی انھیں افسروں کے دفتر تک جانے سے روک سکتا تھا؟ پھر بھی وہ اسٹاف والی عمارت سے ہٹنے کو آمادہ نہ تھے! وہ ہڑتال پر تھے۔ انھوں نے کیمپ کی زمین میں داخل ہونے سے انکار کر دیا! صرف کورچزایا اپنے حق پسند کردار کی نمائش کا حوصلہ ظاہر کرتا ہوا وہاں جانے پر رضامند ہوا — وہ اپنی ٹولی کے پاس گیا اور بولا،

"ہمیں نہیں معلوم کہ وہ ہمیں کیوں لے گئے تھے اور ہمیں نہ معلوم کہاں کہاں گھماتے پھرے اور پھر واپس لے آئے۔۔۔۔"

لیکن اس کا حوصلہ صرف ایک شب و روز قائم رہا۔ اگلے دن وہ اسٹاف روم میں اپنے دوستوں کے پاس بھاگ گیا۔

اس طرح جو کچھ وقوع پذیر ہوا تھا وہ بیکار نہیں گیا۔ اور ہمارے ساتھیوں کی جانی قربانیاں ضائع نہیں ہوئیں۔ کیمپ کا ماحول پہلے کی طرح تشدد آمیز نہیں ہو سکے گا۔ ہر چند کہ کمیٹی اپنی مسند پر لوٹ آئی تھی لیکن بڑے خطرے میں مبتلا تھی۔ جھونپڑی میں سیاسی گفتگو کھل کر ہوتی تھی۔ کوئی فورمین یا کام تقسیم کرنے والا کسی زیک کو ٹھوکر مارنے یا تھپڑ لگانے کی کوشش نہیں کرے گا کیونکہ ہر شخص کو معلوم تھا کہ چاقو بنانا بے حد سہل ہے اور وہ پسلیوں کے درمیان بہت آسانی سے دھنس جاتے ہیں!

ہمارے چھوٹے سے جزیرے نے ایک زلزلہ پیدا کیا تھا اور اب وہ مجمع الجزائر کا حصہ نہیں رہا تھا۔

یہ کیفیت ایکی بسٹز کی تھی۔ یقینی طور پر معلوم نہیں کہ ہمارا گنشڑا کی صورت حال بھی ایسی ہی تھی یا مختلف۔ اور یہ طے شدہ ہے کہ ماسکو میں مختلف تھی۔ اسپیشل کیمپ کا نظام یکے بعد دیگرے دوسرے مقامات پر رائج ہو رہا تھا اور ہمارے "سرپرست" اور "اتالیق" کو اس کی کوئی بھنک نہیں ملی تھی۔ یقیناً اس کی رپورٹ اس تک نہیں پہنچائی گئی (اور چونکہ وہ کسی چیز سے بھی دستبردار ہونے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا اس لیے وہ بہر طور کشور کا اسی دن ختم کرتا جس دن اس کی کرسی آگ کی لپیٹ میں آجاتی) اس کے برخلاف اس نے ۱۹۵۲ء کے لیے ایک بڑی لہر کا منصوبہ بنایا، شاید ایک نئی جنگ کے سلسلے میں، اور ۱۹۵۲ء میں اسی کے بقول اسپیشل کیمپوں کا جال اور پھیلایا گیا۔ اس طرح یہ فرمان جاری ہوا کہ ایکی بسٹز کیمپ کو اسٹیپلاگ یا کبھی کبھار پیشچلاگ کے ایک ڈویژن سے بدل کر ارتش کی وادی میں ایک بڑے نئے اسپیشل کیمپ کمپلکس کا صدر مقام بنا دیا جائے (جسے عارضی طور پر دلاگ کے نام سے یاد کیا جائے گا) اس طرح ان ہتھیار تھام بانکنے والوں کے علاوہ جو وہاں پہلے سے موجود تھے، ایکی بسٹز میں خون چوسنے والوں کا ایک پورا کا پورا انتظامیہ غول آگیا اور ہمیں اپنی مشقت سے ان کی پرورش و پرداخت کرنی تھی۔

کسی بھی دن نئے قیدیوں کے آجانے کی توقع تھی۔

اس دوران آزادی کی وبا پھیل رہی تھی۔ لیکن یہ اس مجمع الجزائر سے کہاں جا سکتی تھی؟ جس طرح اسے ڈبو لنکا قیدی ہمارے یہاں لائے تھے اسی طرح ہمارے ساتھی اسے آگے لے گئے۔ اس سال کے موسم بہار میں یہ تحریر قازقستان میں ہر ریلوے شیڈ گھر کی دیوار پر گھر پا کر یا کھود کر درج کی ہوئی نظر آتی تھی۔

"ایکی بسٹز کے مجاہدین کو خوش آمدید۔"

مرکز کے باغیوں کی پہلی صفائی میں تقریباً چالیس آدمی عظیم زدہ ٹرانسپورٹ میں سے ۲۵۰ "پختہ معاملات" فاصلے پر کینگر میں منتقل کیے گئے (بستی کا نام کینگر تھا اور اسٹیشن کا دوریہ مارتمان۔ یہ تیسرا اسٹیپلاگ کیمپ ڈویژن تھا جہاں اسٹیپلاگ کی انتظامیہ

کے افسران (وہ ذیل کرنل جمیون مقیم تھا) ایکی لبسٹر کے جن دوسرے قیدیوں کو سزا دی گئی تھی انھیں باشیاگ کے پہلے اور دوسرے کیمپ ڈویژنوں (روڈنیک) میں بانٹ دیا گیا۔

بطور حفظ ما تقدم کینگر کے آٹھ ہزار زکیوں کو بتایا گیا تھا کہ نوار دین ڈاکو تھے۔ انھیں اسٹیشن سے کینگر جیل تک ہتھکڑیوں میں مارچ کرایا گیا۔ اس طرح کسی زنجیروں میں جکڑی ہوئی داستان کی طرح ہماری تحریک اب تک غلامی میں پڑے ہوئے کینگر کو بھی خوابِ غفلت سے بیدار کرنے آ پہنچی۔ ایک سال قبل جو حالات ایکی لبسٹر میں تھے اُسی طرح یہاں بھی اکھڑ اور مجبر لوگوں کا طوطی بولتا تھا۔

جب کینگر کیمپ ڈویژن کے کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل فیڈ وٹوف نے ہمارے ڈھائی صد کو اپریل تک جیل میں رکھا تھا اور یہ سمجھا تھا کہ انھیں کافی خوفزدہ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس نے حکم بھیجا کہ انھیں کام کے لیے باہر نکالا جائے۔ مرکز نے بالکل نئی پالش شدہ ہتھکڑیوں کے ١٢٥ جوڑیاں جدید ترین فاشسٹ ڈیزائن کی تھیں' فراہم کیں جو ٢٥٠ قیدیوں کے لیے اسی صورت میں کافی ہو سکتی تھیں جب دو دو قیدی ایک ساتھ باندھے جائیں (شاید اسی حساب سے انھوں نے یہ تعداد طے کی ہو گی۔)

ایک ہاتھ کھلا ہو تو زندگی اتنی دشوار گزار نہیں ہوتی! کالم کے متعدد لڑکوں کو کیمپ جیلوں کا تجربہ تھا اور ان میں پرانے مفرورین بھی تھے (نیز کبھی ہو تو گرفتاری میں شامل کیا گیا تھا) جو ہتھکڑیوں کے سارے گر گھاٹ سے واقف تھے اور کالم میں اپنے پڑوسیوں کو بتا رہے تھے کہ اگر ایک ہاتھ کھلا ہو تو ان ہتھکڑیوں کو نکال دینا مشکل کام نہیں ہے کسی سوئی سے یا بغیر سوئی کے بھی انھیں نکالا جا سکتا ہے۔

جب وہ جائے تعمیر کے نزدیک پہنچے تو وارڈ کالم میں کئی جگہوں پر ایک ساتھ ہتھکڑیاں کھولتے گئے تاکہ دن کا کام بلا تاخیر شروع کیا جا سکے۔ اس موقع پر جو لوگ اس گُر سے واقف تھے انھوں نے جلدی جلدی اپنی اور دوسرے قیدیوں کی ہتھکڑیاں کھول دی ہیں اور انھیں اپنے کوٹوں میں چھپا لیا اور کہا "دوسرے وارڈر نے ہماری ہتھکڑیاں کھول دی ہیں"۔ وارڈروں کو قطعی احساس نہ ہوا کہ کام کو آگے بڑھانے سے پہلے ہتھکڑیاں شمار کر لیں۔ جائے تعمیر میں داخل ہونے کے وقت قیدیوں کی جامہ تلاشی بھی نہیں لی گئی۔

اس طرح پہلی ہی صبح کو ١٢٥ جوڑیوں میں سے ہمارے لڑکے ٤٣ پار کر لائے وہاں جائے تعمیر پر انھوں نے ہتھکڑیوں کو پتھروں سے چکنا چور کرنے کا کام کا آغاز کیا لیکن جلد ہی انھیں ایک پُر لطف خیال آیا۔ انھیں مومی کاغذ میں لپیٹ لیا جائے تاکہ زیادہ دن محفوظ رہیں اور اسی حالت میں انھیں ان عمارتوں کی دیواروں اور بنیادوں میں چُن دیا جائے جن پر وہ اس دن کام کر رہے تھے (رہائشی بلاک نمبر ٢٥ کینگر کے ثقافتی ایوان کے سامنے) اور ان پر حقیقت ظاہر کرنے والی پرچیاں لگائی جائیں۔

"آنے والی نسلو! یہ تعمیر سوویٹ غلاموں نے کی تھی۔ یہاں تم وہ ہتھکڑیاں دیکھ سکتے ہو جو انھیں پہنائی جاتی تھیں۔"

وارڈروں نے ڈاکوؤں کو مغلظات سنائیں اور کو سا پیٹا اور واپسی کے سفر کے لیے کچھ زنگ خوردہ پُرانی ہتھکڑیاں لے آئے۔ اب وہ بے حد محتاط تھے لیکن اس کے باوجود لڑکوں نے راستے میں چھ جوڑیاں پار کر دیں اور کیمپ میں لے آئے۔ اگلے کام کے دنوں میں بھی انھوں نے کچھ مزید جوڑیاں غائب کیں۔ ایک جوڑی کی قیمت ٩٣ روبل ہوتی تھی۔

اب کینگر کے افسران نے لڑکوں کو ہتھکڑیاں پہنا کر لے جانے سے انکار کر دیا!

آدمی کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے لڑنا ضرور چاہیے۔

مئی کے آغاز کے آس پاس انھوں نے ایکی لبسٹر والے گروپ کو جیل سے رفتہ رفتہ خاص کیمپ میں منتقل کرنا شروع کیا۔

ان کے لیے وہاں کے پرانے قیدیوں کو کچھ سمجھانے بجھانے کا وقت آگیا تھا بسم اللہ کے طور پر انھوں نے ایک سا احتجاجی مظاہرہ کیا۔ ایک "مخبر لڑکا" جو ایک قطار کے آگے گھس رہا تھا جیسا کہ وہ حق سمجھتا تھا اسکو گھونسا گیا۔ لیکن اسے پوری طرح جان سے نہیں مارا گیا۔ لوگوں میں بات چیت کی ابتدا کرنے کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ یہاں حالات بدلنے والے ہیں۔ سنئے لوگ ہمارے جیسے نہیں ہیں۔ (یہ کہنا غلط ہوگا کہ دوزیکازگان کے آس پاس کے متعدد کیمپوں میں مخبروں کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا گیا تھا۔ لیکن یہ چیز فطرت میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۵۱ء میں روڈنیک کی جیل میں قیدیوں نے ایک بار وارڈر سے کنجیاں چھین لی تھیں اور مطلوبہ کوٹھڑی کو کھول کر کوزلاسکاس کو چاقو گھونپ دیا تھا)

اب کینگر میں خفیہ مرکز قائم کیے گئے۔ ایک یوکرینی ایک خالص روسی۔ چاقو اور نقاب میں تیار کی گئیں مار کاٹ کے لیے تیار۔ اور پوری داستان نئے سرے سے شروع ہوگئی۔

دو شینلو دو پھانے اپنی کوٹھڑی کی سلاخوں سے "فلک کر جان دے دی" دوسرے مارے جانے والوں میں فورمین بولوکوپٹ اور انتظامیہ کا مخبر لفشتز (خانہ جنگی کے زمانے میں کُدروُف کا مقابلہ کرنے والی افواج کی انقلابی فوجی کیمپ کا رکن) شامل تھے (لفشتز روڈنیک کیمپ ڈویژن میں آرام سے رہتا تھا۔ جہاں وہ شعبۂ تعلیم و ثقافت میں لائبریرین تھا۔ لیکن اسکی شہرت اس سے پہلے پہنچ گئی تھی اور کینگر پہنچنے کے دوسرے ہی دن اسے چاقو مار دیا گیا) شعبۂ مرمت کے ایک ہنگرین اردلی کو غسل خانے کے قریب کلہاڑیوں سے کاٹ ڈالا گیا۔ سب سے پہلے بھاگنے والا اور "سیف ڈپازٹ" کی راہ دکھانے والا سادرستاجو اس سے قبل سوویٹ اسٹونیا میں وزیر تھا۔

لیکن اس وقت تک کیمپ کے افسران کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ بہت عرصے سے کینگر کے چار کیمپ ڈویژنوں کے درمیان دیواریں چلی آتی تھیں۔ اب یہ خیال تھا کہ ہر جھونپڑی کے چاروں طرف اس کی اپنی چار دیواری اٹھا دی جائے اور آٹھ ہزار آدمیوں نے اپنے فاضل وقت میں یہ کام شروع کر دیا۔ انھوں نے ہر جھونپڑے کو بھی چار حصوں میں تقسیم کر دیا اور ان کے مابین تبادلۂ خیال کا کوئی وسیلہ باقی نہیں رہنے دیا۔ ہر کیمپ کے تمام حصوں اور سکشنوں کو مقفل کر دیا جاتا تھا۔ بلاشبہ ان کا بس چلتا تو تمام دنیا کو ایک ایک آدمی والے کمروں میں منقسم کر دیتے۔

کینگر جیل کا سربراہ سار جنٹ میجر ایک پیشہ ور تکے باز تھا اور قیدیوں کو گھونسہ بازی کے تھیلوں کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اپنی جیل میں انھوں نے قیدیوں کو پلائی ووڈ کی تہہ کے بیچ دبا ہوئی ایک موگری سے مارنے کی ترکیب بھی وضع کی تھی تاکہ جسم پر کوئی نشان نہ پڑے (یہ عملی تجربہ رکھنے والے حفاظتی پولس کے ملازمین جانتے تھے کہ مار پیٹ اور قتل کے بغیر تعلیم و اصلاح کا اطلاق ناممکن تھا اور ہر تجربہ کار وکیل سرکار اس بات سے متفق ہوگا۔ لیکن یہ خطرہ ہمیشہ لاحق رہتا تھا کہ کوئی اصول پسند انھیں دھر نہ دبائے۔ اس تقریباً ناممکن سے خدشے کے پیش نظر موگری کے ساتھ پلائی ووڈ کا استعمال ضروری ہو جاتا تھا) مغربی یوکرین کے ایک قیدی نے جسے اس کی قوت برداشت سے زیادہ اذیتیں پہنچائی گئی تھیں اور اس بات کا خوف تھا کہ کہیں وہ اپنے رفیقوں کے ساتھ غداری کا ارتکاب کر بیٹھے، پھانسی لگا کر جان دیدی تھی۔ دوسرے لوگ اور بھی بُرا سلوک کرتے تھے۔ اس طرح دونوں مرکزوں کو ناکارہ بنا دیا گیا۔

اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ "مجاہدین" میں کچھ لالچی بد معاش بھی تھے جنھیں تحریک کی کامیابی سے دلچسپی نہیں تھی صرف سوچ کرنے سے مطلب تھا وہ چاہتے تھے کہ ان کے لیے باورچی خانے سے فاضل کھانا فراہم کیا جائے اور دیگر قیدیوں کے پارسلوں سے انھیں بھی حصہ ملتا رہے۔ اس سے افسران کو اس تحریک کو بدنام اور ناکام کرنے میں بہت مدد ملی۔

یا پھر یہاں کا خیال تھا لیکن اس اوّلین ریہرسل کے بعد ہی مخبروں کے سر نیچے آگئے۔ کم از کم کیمپ میں فضا پہلے کی بہ نسبت کچھ صاف ہو گئی۔
تخم ریزی کی جا چکی تھی لیکن فصل آنے میں وقت لگے گا۔ اور حیرت بھی ہو گی۔

ہمیں ہمیشہ یاد دلایا جاتا ہے کہ خود تاریخ نہیں بتاتے بطور خاص جب وہ ترقی کی راہ میں حارج ہوں گے ربع صدی تک ایک ہی آدمی ہماری سوچیں اس طرح مروڑتا رہا جیسے ہم بھیڑیں ہوں۔ اور ہمیں میانے تک کی جرأت نہ ہوئی۔ اب وہ کہتے ہیں کہ کوئی سمجھا نہیں تھا۔ پچھلے لوگ نہیں سمجھے، اگلے لوگ نہیں سمجھے، صرف پرانوں میں سب سے سن رسیدہ لوگوں کی سمجھ میں آیا اور انھوں نے کہیں کانوں میں چھپ کر زہر کھا لینا، تنہائی میں گولی مار کر اپنی جان دے دینا یا معذور بنکر وظیفے لے کر اپنی عمر بسر کر دینے پر اکتفا کی کسی عوامی اسٹیج سے شور و غل کرنا مناسب نہ جانا۔
اس لیے نجات دہندگی کا فرض ہم نابالغوں پر آ پڑا۔ ایکی بسٹز میں جیل کی ان محرابوں کے تلے پانچ ہزار شانے لگا کر اور ہانپتے ہوئے ہم نے کم از کم ایک دراڑ پیدا کر دی تھی۔ بہت معمولی سی، شاید دور سے دکھائی بھی نہ دے اور شاید ہم نے اپنی استعداد سے زیادہ بوجھ اپنے اوپر ڈالا۔ لیکن درازوں سے غار دھنس جاتے ہیں۔
ہماری بغاوتوں کے علاوہ، اسپیشل کیمپوں میں ہونے والے فسادات سے الگ ہٹ کر بھی بغاوتیں ہوئیں لیکن پورا خونی ماضی اس احتیاط کے ساتھ صاف کر دیا گیا ہے۔ اور اس پر ایسا رنگ و روغن اور غازہ مل دیا گیا ہے کہ اب میرے لیے کیمپوں ہی میں ہونے والی بغاوتوں کی محض فہرست سازی بھی ناممکن ہو گئی ہے۔ حسنِ اتفاق سے مجھے یہ علم ضرور ہے کہ ۱۹۵۱ء میں سخالن میں باخروشیو اصلاحی مشقتی کیمپ میں پانچ سو افراد نے اس وقت پانچ دن تک بھوک ہڑتال کی تھی اور جوش و خروش بہت بڑھ گیا تھا۔ نیز چن چن کر گرفتاریاں کی گئی تھیں، جب تین مفرورین کو گارڈ ہاؤس کے سامنے بے رحمی کے ساتھ سنگینیں بھونک دی گئی تھیں۔ ہم نے اوزرلاگ میں ہونے والے ایک فساد کے بارے میں بھی سنا ہے جو ۸ ستمبر ۱۹۵۲ء کو اس وقت ہوا تھا جب گارڈ ہاؤس پر قطار بندی کرتے ہوئے ایک آدمی کو مار ڈالا گیا تھا۔
شہادتوں سے ثابت ہے کہ اسٹالینی کیمپ پالیسی خاص طور سے اسپیشل کیمپوں میں چھٹی دہائی کی ابتدا میں خطرے کے نشان کو چھو رہی تھی۔ صاحب اقتدار کل کی زندگی میں بھی دیسی لوگ اپنی زنجیریں توڑنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔
یہاں نہیں کہا جا سکتا کہ اگر وہ بقید حیات ہوتا تو حالات کا رخ کیا ہوتا؟ لیکن ہوا یہ کہ ایسی وجوہ سے جن کا اقتصادیات یا معیشت کے اصولوں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس پستہ قامت چیچک رو وجود کی شریانوں میں سست اور مسموم خون کا دوران اچانک بند ہو گیا۔
پیش قدم (آواں گارڈ) اصولوں کے مطابق اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے تھا نہ ہی نیلی ٹوپی والوں کو کسی تبدیلی سے خائف ہونا چاہیے تھا۔ حالانکہ وہ ۵ مارچ* کو کیمپ کے پھاٹکوں کے باہر روئے تھے نہ سیاہ جرکن والوں کو تبدیلی کی توقع کرنے کی ہمت پڑنی چاہیے تھی۔ حالانکہ انھوں نے اس دن اپنے بلالائکا (تین تاروں والا ایک روسی ساز) بجائے تھے (اس دن انھیں باہر کیمپ کے میدان میں نہیں نکلنے دیا گیا تھا) جب انھیں علم ہوا کہ تدفین کے مارچ کی روداد نشر کی جا رہی ہے اور سیاہ حاشیے والے جھنڈے آویزاں کیے گئے ہیں۔ تو بھی کوئی نامعلوم کپکپاہٹ زمین کا کھسکنا اور دھنسنا شروع ہو گیا تھا۔

سچ ہے کہ مارچ ۱۹۵۳ء کے آخر میں دی جانے والی عام معافی، جو کیمپوں میں عام طور پر عام معافی کہلاتی ہے، مرنے والے کی اخلاقی وراثت کے تئیں پوری طرح وفادار تھی۔ چوروں کے لیے رحم دل اور سیاسی قیدیوں کے حق میں خوں آشام۔ مجرم دنیا کے ساتھ بہتر تعلقات رکھنے کے لیے عام معافی کے خالقوں نے چوروں کو طاعون کی وبا کی طرح وطن پر نازل کر دیا جس کی وجہ سے عام شہری آفت میں پڑ گئے۔ گھر گلیوں پر سلاخیں لگوانی پڑیں اور گھروں کو قید خانہ بنانا پڑا اور ملیشیا (شہری فوج) والوں سے کہہ دیا گیا کہ ان سب کو دوبارہ گرفتار کر لو جو پہلے کبھی پکڑے جا چکے ہیں۔ دفعہ ۵۸ والوں کو تو عام تناسب کے اعتبار سے ہی رہائی ملی۔ کینگر کے نمبر ۲ کیمپ ڈویژن کے تین ہزار افراد میں سے رہائی پانے والوں کی تعداد تھی ـــــ تین!

اس نوع کی عام معافی سے کٹورگا میں مقیم لوگوں کو صرف ایک بات کا یقین دلایا جا سکتا تھا۔ کہ اسٹالن کی موت سے کچھ بھی فرق نہیں پڑا ہے۔ ان پر نہ کبھی رحم کھایا گیا تھا اور نہ اب رحم کیا جائے گا۔ اگر وہ اس دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انھیں لڑنا پڑے گا۔

۱۹۵۲ء میں مختلف مقامات پر کیمپوں میں فسادات کا سلسلہ جاری رہا۔ معمولی تصادم کا ذکر نہیں۔ جیسے کارلاگ میں کیمپ ڈویژن نمبر ۱۲ میں اور ایک بڑا فساد گورلاگ (نوریلسک) میں جس کے متعلق ایک خصوصی باب لکھا جاتا اگر مجھے ذرا سا بھی مواد مل سکتا۔

لیکن وہ عالم فضول نہیں رہا، نظروں سے اوجھل کوئی چیز حرکت میں آئی اور ہٹ گئی اور اچانک جیسے خالی بالٹی کے گرنے سے کھڑکھڑاہٹ ہوتی ہے ' اس قسم کی آواز پیدا کرتا ہوا ایک وجود زینے کے سب سے بالائی پائیدان سے سر کے بل لڑھکتا ہوا گندگی کی تحت الثریٰ میں جا گرا۔

اور اب ہر شخص نے حتیٰ کہ سابقہ گلاگ کے ارذل ترین اور حقیر شہریوں نے بھی محسوس کیا کہ ایک نئے دَور کا آغاز ہوا ہے۔

مجمع الجزائر پر ہم لوگوں کے لیے بیریا کا زوال بجلی کی کڑک کی مانند تھا۔ وہ سر پرستِ اعلیٰ تھا اور مجمع الجزائر کا داشرائے تھا! ایم۔ وی۔ ڈی کے افسران حیران و پریشان اور الجھن میں تھے۔ جب یہ خبر ریڈیو سے نشر کی گئی تو اس وقت اگر ان کے بس میں ہوتا تو اس ہولناک بیان کو واپس لاؤڈ اسپیکر میں ٹھونس دیتے۔ لیکن اس کے بجائے انھیں اپنے محبوب و رحم دل حامی کی تصویروں پر ہاتھ رکھنا پڑا' انھیں اسٹیپلاگ کے صدر دفتر کی دیواروں سے اتارنا پڑا۔ "اب سب ختم" کرنل چیچف نے لرزیدہ ہونٹوں سے کہا (لیکن یہ اس کا خیالِ خام تھا اسے گمان تھا کہ اگلے ہی دن ان سب پر مقدمہ چلا دیا جائے گا۔ چیکم) افسروں اور وارڈروں میں سے ایک غیر یقینی کیفیت طاری ہو چکی ہے جسے قیدیوں نے فوراً محسوس کر لیا۔ کینگر کے کیمپ ڈویژن نمبر ۳ کا ڈسپلن افسر' جس نے کبھی کسی قیدی کو نرم نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ اچانک ڈسپلن بیرک میں ایک ٹولی کے پاس' جو کام کر رہی تھی' نیچے بیٹھ گیا اور انھیں سگریٹیں پیش کرنے لگا۔ (وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس غبار آلود فضا میں کون سی چنگاریاں اڑ رہی ہیں اور ان سے کسی قسم کے خطرے کا امکان ہو سکتا تھا!) "تو آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟" انھوں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے پوچھا "کیا آپ کا سب سے بڑا آقا واقعی عوام کا دشمن تھا؟" "ہاں اب تو یہی معلوم ہوتا ہے"۔ ڈسپلن افسر نے مغموم لہجے میں کہا "لیکن وہ اسٹالن کا دستِ راست تھا؟" قیدیوں نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا "تو یہ مطلب ہوا کہ اسٹالن بھی

دھوکا کھائی! ہے نا؟ ـــــ ہا..... ں" اس شیریں کلام شیلی فورنے کہا "بھئی لڑکو! ایسا لگتا ہے کہ اگر تم نے صبر سے کام لیا تو وہ تمہیں چھوڑ دیں گے۔"

یہ کانعال ہو چکا تھا اور اس نے اپنے نام پر لگا ہوا کلنک اپنے وفادار حکموں کے نام کر دیا تھا۔ اس سے قبل کسی بھی قیدی نے اور کسی بھی آزاد آدمی نے، اگر وہ اپنی زندگی کی کوئی قیمت سمجھتا تھا۔ ہر پولس افسر کی مکمل وفاداری میں شبہ کا خیال تک دل میں لانے کی جرأت نہ کی تھی لیکن اب میں ان میں سے کسی کو بھی سینسو لیے کو "بیریا پرست" کہہ دینا کافی تھا اور وہ لاجواب ہو جاتا۔

ریچلاگ (وورکتا) میں جون ۱۹۵۳ء میں بیریا کو معتوب کرنے سے پیدا شدہ افراتفری کے زمانے ہی میں کارا گنڈا اور تائیشیٹ سے لائے ہوئے باغی وہاں پہنچے (ان میں بیشتر مغربی یوکرینی تھے) وورکتا ابھی پامال و پس ماندہ تھا اور نووارد قیدیوں نے اپنی بے حیائی اور اڑیل پن سے وہاں کے پرانے قیدیوں کو حیران کر دیا؟

اور جس سلسلۂ عمل میں ہمیں کئی مہینے لگے تھے وہ یہاں ایک مہینے میں پورا ہو گیا۔ جولائی ۲۲ء کو سمنٹ کے کارخانے تعمیری و بیکٹ ٹی۔ ای۔ ٹی۔ ایس ـــ ۲ اور پٹ نمبر ۷، نمبر ۲۹ اور نمبر ۶ میں ہڑتال ہو گئی۔ ان کام کی جگہوں کے قیدی ایک دوسرے کو کام بند کرتے ہوئے دیکھ سکتے تھے۔ پٹ فریموں میں پہیے رکتے ہوئے دیکھ سکتے تھے۔ اس بار ہماری ایکی باسٹر والی غلطی کا اعادہ نہیں کیا گیا، بھوک ہڑتال نہیں کی گئی۔ تمام وارڈر کیمپ میدان سے فوراً بھاگ گئے لیکن روزانہ کی اس پرشور آواز "سردار، کھانا لاؤ" پر وہ اشیائے خورد و نوش ڈھو کر بارشتک لے آتا اور پھاٹک سے اندر رکھا دیتے تھے (میرا خیال ہے بیریا کے انحطاط نے انھیں اتنا باشعور بنا دیا تھا۔ ورنہ وہ تو قیدیوں کو بھوکا مار ڈالتے) متاثرہ کیمپ ڈیویژنوں میں ہڑتال کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ "انقلابی نظام" نافذ کیا گیا۔ کمرۂ طعام کے ملازمین نے فی الفور چوری کرنا بند کر دیا اور ہر چند کہ راشن کی مقدار میں اضافہ نہیں کیا گیا۔ اس میں اصلاح کی علامتیں صاف نظر آنے لگیں۔ پٹ نمبر ۷ میں انھوں نے ایک جھنڈا آویزاں کر دیا اور نمبر ۲۹ پر ایک قریبی ریلوے لائن کے سامنے کی جانب انھوں نے پولٹ بیورو کی تصویریں لگا دیں۔ وہ کسی چیز کی نمائش کر سکتے تھے؟ اور کون سے مطالبات پیش کر سکتے تھے؟ انھوں نے مطالبہ کیا کہ نمبروں کی پٹیاں، کھڑکیوں کی سلاخیں اور دروازوں کے قفل ہٹائے جائیں، لیکن بذات خود ان میں سے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا انھوں نے خط و کتابت کرنے کے حق، ملاقاتیوں سے ملنے کے اختیار اور اپنے معاملات پر نظر ثانی کی مانگ بھی پیش کی۔

صرف پہلے دن یہ کوشش کی گئی کہ ہڑتالیوں سے گفتگو کر کے معاملہ ہموار کر لیا جائے پھر ایک ہفتے تک کوئی ان کے نزدیک نہیں پھٹکا لیکن برجیوں پر مشین گنیں لگا دی گئیں اور ہڑتالی کیمپ ڈیویژنوں کی حصار بندی کر لی گئی بلاشبہ بہت اوپر کے افسران پھر وورکتا اور ماسکو کے درمیان طواف کر رہے تھے۔ یہ معلوم کرنا دشوار تھا کہ نئے حالات میں کیا کیا جائے اس ہفتے کے اختتام پر جنرل ماسلینکوف ریچلاگ کے سربراہ ڈیریویانکو اور ووڈینکو کے اعلیٰ وکیل سرکار (پراکیورٹر جنرل) نے افسروں کے بہت بڑے گروہ (جس میں چالیس افراد تھے) کے ساتھ کیمپ کے چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ اس چمچماتے ہوئے گروہ سے ملاقات کرنے کے لیے ہر شخص کیمپ کے پریڈ گراؤنڈ پر جمع ہوا تھا۔ قیدی زمین پر بیٹھے تھے اور جنرل ان پر "تخریب" اور "وحشیانہ برتاؤ" کے لیے گالیوں کی بوچھار کر رہے تھے۔ اسی وقت انھوں نے یہ نہیں مانا کہ کچھ معاملات تحفظ معلوم ہوتے ہیں "تم اپنے نمبروں کی پٹیاں ہٹا سکتے ہو!

• ہتھکڑیوں کی سلاخوں کے بارے میں ہدایات جاری کی جا چکی ہیں") لیکن قیدیوں کو فی الفور کام پر آنا چاہیے
"ملک کو کوئلے کی سخت ضرورت ہے"۔ پٹ نمبر ۷ پر کوئی پیچھے سے چیخا" اور ہمیں آزادی کی ضرورت ہے'
بدمعاشو! ـــــ" اور قیدی زمین سے اٹھے اور منتشر ہونے لگے حتیٰ کہ جنرلوں کے سامنے ایک بھی سامع نہ رہ گیا۔

اس موقع پر انھوں نے نمبروں کی پٹیاں پھاڑ کر پھینک دیں اور ہتھکڑیوں کی سلاخیں نکالنے لگے لیکن فوراً ہی ان میں نفاق پیدا ہو گیا اور ان کے حوصلے گر گئے: شاید ہم حد سے گزر گئے ہیں؟ ہم ان سے مزید کچھ حاصل نہ کر سکیں گے۔ رات کی شفٹ کے کچھ لوگ کام پر آئے اور دن کی پوری شفٹ آئی۔ پٹ کے پہیے پھر چلنے لگے اور مختلف کام کے دستوں نے ایک دوسرے کو لوٹتے ہوئے دیکھا۔

لیکن پٹ نمبر ۲۹ ایک پہاڑی کے عقب میں تھی اور دوسروں کی نگاہ سے اوجھل تھی اسے بتایا گیا تھا کہ باقی ماندہ تمام لوگوں نے کام شروع کر دیا ہے لیکن وہاں قیدیوں نے ان کا اعتبار نہیں کیا اور کام پر نہیں آئے۔ اس میں کوئی دقت نہیں تھی کہ پٹ نمبر ۲۹ کے چند نمائندگان کو دوسرے کام کے مقامات پر لیجا کر صورتحال سے واقف کرا دیا جاتا لیکن قیدیوں کو اتنی اہمیت دینا توہین آمیز عمل ہوتا اور بہر صورت جنرل خون کے پیاسے ہو رہے تھے، خون بہائے بغیر فتح کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ خون کے بغیر یہ تمغے جنگی کبھی نہیں مانیں گے۔

۱۱ر اگست کو فوجیوں سے بھرے ہوئے گیارہ ٹرک پٹ نمبر ۲۹ پر پہنچ گئے۔ قیدیوں کے باہر پریڈ گراؤنڈ میں پھاٹک کی طرف چلا گیا۔ گیٹ کی دوسری طرف فوجیوں کی قطار بند کثیر تعداد تھی" کام پر جاؤ ورنہ ہم سختی کریں گے"۔

یہ مت پوچھو کہ کس قسم کی سختی؟ بس ان ٹامی گنوں کے دیدار کرو سب خاموش رہے۔ پھر بھیڑ میں انسانی اعضا کی حرکت۔ جان کس لیے خطرے میں ڈالی جائے؟ خصوصاً جب تمہاری سزا کے کچھ ہی دن باقی رہ گئے ہیں۔ جن کے ایک یا دو سال باقی تھے وہ آگے بڑھے لیکن دیگر لوگ بھی تھے جو قطاروں میں سے قدم بڑھا کر آگے نکل آئے، سامنے کی قطار میں شامل ہونے' ایک دوسرے کے بازو پکڑنے اور ہڑتال توڑنے والوں کے سامنے رکاوٹ کھڑی کرنے کے لیے۔ ہجوم شش و پنج میں تھا۔ ایک افسر نے دائرہ توڑنے کی کوشش کی اور اس پر لوہے کی سلاخ پڑی ـــــ جنرل ڈیریویانکو ایک طرف ہٹ گیا اور اس نے حکم دیا "گولی چلاؤ!" ـــــ ہجوم پر۔

تین بوچھاریں ہوئیں۔ درمیان میں مشین گنوں نے گولیاں برسائیں۔ چالیس آدمی کھیت رہے (مارے جانے والے کون تھے؟ سامنے کی قطار والے ـــــ یعنی سب سے زیادہ جیالے لوگ' اور وہ بھی جو سب سے پہلے کمزور پڑ گئے تھے۔ یہ قانون بہت دور دور تک لاگو ہوتا ہے ـــــ آپ کو کہاوتوں میں بھی اس کا وجود ملے گا) بقیہ لوگ بھاگ گئے۔ ڈنڈے اور لوہے کی سلاخیں لیے ہوئے پہریدار زیکوں کے پیچھے دوڑے اور انھیں مار مار کر کیمپ سے باہر نکال دیا۔

جو کیمپ ڈویژن ہڑتال پر تھے ان سب میں تین دن تک (یکم تا ۳ر اگست) گرفتاریاں ہوتی رہیں لیکن گرفتار شدگان کا کیا کیا جا سکتا تھا؟ وزارت تحفظ کا کمانے والا جب مر اکتا تو اس کی تیغ آمد ار بھی کند پڑ گئی تھی۔ دوسری تحقیقات تک نہیں جا سکتے تھے اور اسپیشل گاڑیاں ادھر ادھر تبادلے' یہ وبا دور دور تک

نمک پھیلانے کے لیے۔ یہ مجمع الجزائر اتنا تنگ ہوتا جا رہا تھا کہ وقت پیش آنے لگی تھی!

پٹ نمبر ۲۹ کی جھونپڑیوں کی چھتوں پر پتلی لکڑی کے کچھ ٹکڑے دکھائی دیے جو بھیڑ کے سروں کے اوپر سے گزرنے والی فوجی گولیوں سے ٹوٹ گئی تھی۔ نامعلوم فوجی جنھوں نے قاتل بننے سے گریز کیا تھا۔

لیکن وہاں اکثریت ان کی تھی جنھوں نے صحیح نشانے پر گولیاں چلائی تھیں۔

پٹ نمبر ۲۹ پر سلیگ (فاضل دھات کے انبار) کے ڈھیر کے پاس عہدِ حزن چھپیف میں کسی نے اجتماعی قبر پر ایک صلیب، ٹیلیگراف کے کھمبے جیسے بلند ستون سے، نصب کر دی۔ پھر اسے گرا دیا گیا اور کسی نے اسے دوبارہ لگا دیا۔

معلوم نہیں وہ صلیب اب تک کھڑی ہے یا نہیں۔

بارہواں باب

کینگر کے چالیس دن

اسپیشل کیمپوں کے لیے بیریا کے زوال کا ایک پہلو اور تھا۔ کٹور زانے میں اُمید کی جوت جگا کر انہیں ذہنی انتشار، بدحواسی اور بے سمتی میں مبتلا کر دیا۔ فوری تبدیلی کی توقعات کو تقویت ملی اور مخبروں کو مارنے، اُن کی گھات میں رہنے، ہڑتالیں اور بغاوتیں کرنے میں قیدیوں کو دلچسپی نہ رہی۔ اُن کا غصہ سرد پڑ گیا۔ حالات بہر طور رو بہ اصلاح نظر آتے تھے اور انہیں محض ایک کام کرنا تھا — انتظار!

ایک دُوسرا رُخ بھی تھا۔ شانوں پر نیلی پٹیاں آراستہ کرنے والے (لیکن فضائی افواج کے بازوؤں سے عاری)، جنہیں تاحال سب سے زیادہ عزّت دی جاتی تھی۔ جن سے عام طور پر مسلح افواج میں سے سب سے کم جواب طلبی کی جاتی تھی، اب صرف قیدیوں اور اُن کے اعزا کی نظروں میں ہی نہیں (اُن کی پروا کون کرتا ہے) بلکہ شاید حکومت کی نگاہوں میں بھی بے وقار ہو گئے۔

اُس حادثاتی سال، ۱۹۵۲ء میں حفاظتی پولس (ایس۔ وی۔ ڈی) کے افسروں کی دوسری آمدنی ("اپنے ستاروں کے لیے") بند ہو گئی جس کا مطلب یہ تھا کہ اب انہیں صرف ایک تنخواہ ملتی تھی اور ملازمتوں کے برسوں کے اعتبار سے، اضافہ، قطبی بھتہ اور بے شک بونس بھی ملتے تھے۔ اُن کی جیبوں پر یہ بڑی ضرب تھی لیکن اُن کی اُمیدوں پر اُس سے بڑی ضرب پڑی۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اب ہماری ضرورت کم رہ گئی ہے؟

بیریا کے زوال سے وزارتِ تحفظ کے لیے یہ بات فوری اہمیت اختیار کر گئی کہ وہ کسی خاص انداز میں اپنی لاجیت اور اہمیت کا احساس دلائے۔

جن بغاوتوں کو افسرانِ تحفظ تاحال ایک خطرہ سمجھتے رہتے تھے وہی اب شمعِ نجات کی طرح جگمگانے لگیں۔ زیادہ بغاوتیں اور فسادات ہونے دو تاکہ کچھ اقدامات کی ضرورت پیش آئے ایسی صورت میں اسٹاف اور تنخواہیں کم نہیں کی جائیں گی۔

ایک برس سے بھی کم کی مدت میں پہریداروں نے معصوم لوگوں پر کئی گولیاں چلائیں یکے بعد دیگرے واقعات رونما ہوئے: اور یہ بات غیر ارادی طور پر نہیں ہو سکتی تھی۔[1]

انہوں نے مسالہ ملانے والی نوجوان لڑکی لیڈا کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ اُس نے اپنی جرابیں خشک ہونے کے لیے باڑ پر پھیلا دی تھیں۔

انہوں نے اس بوڑھے چینی پر گولی چلا دی۔ کیمپ میں کوئی بھی اس کے نام سے واقف نہ تھا اور وہ روسی زبان کے چند الفاظ بمشکل ہی بول پاتا تھا' لیکن دانتوں میں پائپ دبا کر سنجیدہ گول مٹول چہرے اور جھوم جھوم کر چلنے والے اُس بزرگ کو ہر شخص جانتا تھا ایک پہریدار نے اُسے بُرجی پر طلب کیا' سرحدی باڑ کی طرف تمباکو کا ایک پیکٹ اُچھالا اور جب وہ چینی اُسے اُٹھانے کے لیے گیا تو اُسے گولی مار کر زخمی کر دیا۔

اسی قسم کی ایک اور واردات میں پہریداروں نے بُرجی سے کچھ کارتوس گرا دیے' ایک قیدی کو انہیں اُٹھانے کا حکم دیا اور گولی چلا دی۔

پھر اس کالم کا مشہور کیس ہے جو اور ڈریسنگ پلانٹ سے کیمپ کو لوٹ رہا تھا اور اُس پر ڈمڈم گولیاں برسائی گئی تھیں جن سے سولہ افراد زخمی ہو گئے (دیگر دو درجن افراد نے اپنے زخم چھپا لیے تاکہ اُن کے نام رپورٹوں میں نہ آئیں اور سزا کا خطرہ نہ اُٹھانا پڑے)

زیک اس واقعے پر خاموش نہ رہ سکے۔ وہاں بھی ایک بسٹرز والا عمل دُہرایا گیا۔ کینگر کیمپ ڈویژن نمبر ۳ تین دن تک لگاتار کام کے لیے باہر نہیں آیا (لیکن کھانا کھاتا رہا) اور قصور واروں کو سزا دینے کی مانگ کرتا رہا۔

ایک کمیشن آیا اور اُس نے انہیں سمجھایا کہ قصور وار لوگوں پر مقدمات قائم کیے جائیں گے (جیسے کہ اس کے بارے میں تحقیقات کرنے کے لیے زیکوں کو مدعو کیا جائے گا!) وہ پھر کام پر چلے گئے۔

لیکن فروری ۱۹۵۴ء میں لکڑی کے کام کے کارخانے میں ایک اور قیدی کو گولی مار دی گئی۔ پورا کیمپ اُسے (پادری)" ایونجلسٹ کے نام سے یاد کرتا تھا (میرے خیال سے اُس کا نام الگزینڈر سیسیوف تھا) یہ شخص اپنی دس سالہ قید کے نو سال نو ماہ گزار چکا تھا۔ اُس کا کام محرابی چھڑوں کو خمیدہ کرنا تھا اور وہ یہ کام ایک چھوٹے سے شیڈ میں کرتا تھا جو سرحدی باڑ کے نزدیک تھا۔ وہ شیڈ کے پاس رفع حاجت کے لیے گیا اور ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ایک بُرجی سے اس پر گولی چلا دی گئی۔ گارڈ ہاؤس سے سنتری دوڑ کر مُردہ شخص کو سرحد کے اندر کھینچنے لگے یہ ظاہر کرنے کی غرض سے کہ وہ سرحد پار کر گیا تھا۔ یہ چیز زیکوں کی برداشت سے باہر ہو گئی۔ انہوں نے پھاوڑے اور بیلچے سنبھال لیے اور قاتلوں کو مقتول سے دُور بھگا دیا۔ (اس پوری واردات کے دوران لکڑی کی ورکشاپ کے پاس ایک زین سے آراستہ گھوڑا کھڑا تھا جو افسر تحفظ بیلیائیف کا تھا جسے منہ کٹے کہتے تھے کیونکہ اس کے بائیں رخسار پر ایک نشان تھا۔ کیپٹن بیلیائیف ایک ماہر قاتل تھا اور اس طرح قتل کی سازشیں کرنے میں خصوصی مہارت رکھتا تھا)

لکڑی کی ورکشاپ میں غوغا مچ گیا قیدیوں نے اصرار کیا کہ ہم مردہ شخص کو اپنے کاندھے پر اُٹھا کر کیمپ میں لے جائیں گے۔ افسرانِ کیمپ اس کی اجازت دینے پر آمادہ نہ تھے۔ "تم نے اس کی جان کیوں لی؟" قیدیوں نے چیخ کر پوچھا۔ افسروں کے پاس جواب صفائی تیار تھا: "مُردہ شخص کا قصور تھا اُس نے بُرجی پر پتھر پھینک کر اس واردات کی ابتدا کی تھی۔ (کیا اُن کے پاس اس کا شناختی کارڈ پڑھنے کے لیے وقت تھا؟ کیا انہیں معلوم تھا کہ اُس کی سزا کے صرف تین ماہ باقی رہ گئے تھے اور وہ ایونجلسٹ عیسائی تھا؟ ....)

واپسی پر فضا بےحد کشیدہ تھی اور اس بات کے آثار نظر آ رہے تھے کہ افسران تیار ہیں۔ مشین گن والے برف میں اِدھر اُدھر پڑے ہوئے گولیاں برسانے کے لیے مستعد تھے (فوری طور پر آمادہ، جیسا کہ کینگر والے جہان گئے تھے) مشین گن والوں کو نگران فوجیوں کے کوارٹروں کی چھتوں پر بھی تعینات کر دیا گیا تھا۔

یہ واردات اُس کیمپ ڈویژن نمبر ۳ میں ہوئی تھی جس میں پہلے سولہ آدمی گولیوں سے زخمی کر دیے گئے تھے۔ اگرچہ اس بار صرف ایک آدمی کی جان گئی تھی لیکن انہوں نے زیادہ تکلیف کے ساتھ محسوس کیا کہ وہ مدافعت میں قاصر ہیں۔ اسٹالن کی موت کو ایک سال ہو چکا تھا لیکن اس کے کتوں کی خصلت نہیں بدلی تھی۔ دراصل کوئی بھی چیز ذرا بھی نہیں بدلی تھی۔

شام کے کھانے کے بعد انہوں نے یہ وطیرہ اختیار کیا کہ کسی سکشن میں روشنی اچانک گُل ہو جاتی اور دروازے سے ایک غائبانہ صدا آتی "بھائیو! ہم کب تک کارخانے تعمیر کرتے رہیں گے اور اپنی اُجرت گولیوں کی صورت میں وصول کریں؛ کل کوئی کام پر نہیں جائے گا!" یکے بعد دیگرے تمام سکشنوں میں دوسرے جھونپڑوں میں بھی یہی عمل دہرایا گیا۔

دیوار کے اوپر دوسرے کیمپ ڈویژن کے پاس ایک رقعہ پہنچایا گیا۔ اب تک وہ بھی کچھ تجربہ کار ہو چکے تھے اور اس بارے میں اکثر سوچتے رہے تھے اس لیے وہ وہاں بھی ہڑتال کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ دوسرے کیمپ ڈویژن میں، جس میں کئی فرقوں کے لوگ تھے، زیادہ تر لوگ دس سالہ سزا والے تھے اور بیشتر کی میعاد اب مکمل ہونے والی تھی لیکن پھر بھی وہ ہڑتال میں شامل ہو گئے۔

صبح مردوں کے کیمپ ڈویژن ۲ اور ۳ کام کرنے کے لیے نہیں گئے۔

یہ عجیب عادت — حکومت کی روٹی اور کپڑا لینے میں منہ پھیرے بغیر ہڑتال کرنا — قیدیوں میں بیش از بیش ہر دلعزیزی اختیار کرتی جا رہی تھی اور اب افسران میں کم سے کم قوتِ برداشت باقی رہ گئی تھی۔ انہیں ایک نکتہ سوجھا: وارڈر اور نگران فوجی غیر مسلح ہو کر ہڑتالی کیمپ ڈویژنوں میں گئے جہاں ان میں سے دو نے ایک زیک کو پکڑ لیا اور اُسے ہاتھوں سے کھینچتے ہوئے گھسیٹنے لگے (یہ بےحد انسانی طریقہ تھا اس طرح سنبھال کر تو صرف چوروں کو ہی لے جانا مناسب ہے عوام کے دشمنوں کو نہیں۔ لیکن بیریا کے گولی کا نشانہ بننے کے بعد سے کوئی بھی جنرل یا کرنل ایسا تھا کہ مشین گن والوں کو کیمپ پر گولی برسانے کا حکم دینے کی جرات نہ کر سکا تھا) یہ فضول محنت تھی۔ قیدی نکل کر حوائج ضروری سے فارغ ہونے چلے گئے یا کیمپ کے میدان میں منتشر ہو گئے۔ کام پر جانے کے سوا کچھ بھی کرنے لگے۔

دو دن تک وہ اسی طرح ڈٹے رہے۔ جس فوجی نے ایونجلسٹ کو مارا تھا اُسے سزا دینے کا معمولی سا خیال بھی افسروں کو غیر معمولی اور غیر منصفانہ معلوم ہوا اس کی بجائے کاراگنڈا کا ایک کرنل، جس کے ہمراہ بہت سے ماتحت تھے، ہڑتال کی دوسری حالت کو کیمپ میں گشت کے لیے آیا۔ اُسے اطمینان تھا کہ کوئی خطرہ نہیں ہے اور وہ ہر شخص کو اچھے طریقے سے چلاتا پھرا: "تم لوگ کتنے دن تک بیکار پڑے رہنا چاہتے ہو؟" پھر وہ جو وہاں کسی کو بھی نہ ملتا تھا، کسی جانب انگلی اٹھا کر کہتا: "اے فلاں — ادھر والے — نکلو باہر! اور تم... تم بھی باہر نکلو!" اور اتفاقاً نظر آ جانے والے آدمیوں کو اس دلیر اور ماہرِ فن انسانوں کے حاکم نے

پہ سوچ کر جیل میں ڈال دیا کہ یہی سست الوجود لوگوں سے نمٹنے کا بہترین طریقہ ہے۔ لٹویا کے پل روز برگ نے جب اس قسم کی اول جلول حرکتیں دیکھیں تو اُس نے کرنل سے کہا "میں بھی چلوں گا!" "تو چل!" کرنل فوراً تیار ہو گیا اُس نے غالباً یہ محسوس بھی نہیں کیا کہ یہ احتجاج کا ایک انداز تھا یا کہ احتجاج کے اظہار کا کوئی سبب بھی موجود تھا!

اُسی رات اعلان کر دیا گیا کہ فیاضانہ غذا رسانی کا طریقہ ختم ہو رہا ہے اور جو لوگ کام پر نہ جائیں گے انہیں کم خوراک دی جائے گی۔ کیمپ ڈویژن نمبر ۱۲ اگلی صبح کام پر پہنچ گیا۔ نمبر ۳ تیسرے دن بھی کام پر نہیں نکلا۔ اب دھینگا مشتی والا حربہ اُن پر آزمایا گیا لیکن زیادہ آدمیوں کے ہمراہ کینگر میں تعینات تمام افسران جو معاونت کے لیے حاضر تھے (وہ سب تحقیقاتی کمیشن کے ساتھ تھے) یکجا ہوئے۔ افسروں نے ایک تجویز کا انتخاب کیا اور ہجوم کی شکل میں وہاں داخل ہوئے اور اپنے سفید فر والے ٹوپوں اور شانے پر آویزاں پٹیوں کی چمک دمک سے قیدیوں کی نگاہوں کو خیرہ کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ تختہ ہائے خواب کے درمیان جھکے "ناک بھوں سکوڑیں اور صاف ستھری برجسوں میں ملبوس سیلن زدہ گندے تکیوں پر بیٹھ گئے۔" ادھر آؤ۔ کچھ آگے سرکو۔ تمہیں نظر نہیں آتا کہ میں لیفٹننٹ کرنل ہوں۔" لیفٹننٹ کرنل نے کہنی آگے کر کے اور کمر پر ہاتھ رکھ کر اپنا پہلو بدلا اور اسی طرح مسلسل حرکت کرتے ہوئے بستر کے مالک کو بیدخل کر کے کوریڈور میں پہنچا دیا جہاں وارڈروں نے اُس کے کوٹ کی آستین پکڑ کر زبردستی اُسے کام کے علاقے تک پہنچا دیا۔ اگر وہ مزاحمت پر اصرار کرتا تو اُسے جیل لے جاتے تھے (کینگر کی دونوں جیلوں کی استعداد محدود تھی جس کی وجہ سے ملازمین کو بڑی دقت ہوتی تھی: دونوں میں تقریباً پانچ سو آدمی بند کیے گئے)

افسروں کے وقار اور اختیارات کے زیاں کی پرواہ کیے بغیر ہڑتال قابو میں کر لی گئی۔ یہ ایثار اُنہیں حالات کی کشمکش کو ملحوظ رکھ کر کرنا پڑا تھا اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اُن سے کیا توقعات وابستہ کی جاتی تھیں اور غلطیوں کا انجام خطرناک ہو سکتا تھا! اگر وہ زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کریں تو ان کا انجام بیریلکے رفیقوں جیسا ہو سکتا تھا لیکن اگر وہ مناسب مستعدی کا مظاہرہ نہ کریں اور جوش کے ساتھ ہڑتالیوں کو کام پر واپس لانے کی تدابیر نہ اختیار کریں تب بھی بالکل یہی انجام ہو سکتا تھا۔ علاوہ ازیں ریاستی حفاظتی پولس کے افسروں نے ہڑتال دبانے میں اپنے موثر ذاتی تعاون سے شاندار طریقے پر ثابت کر دیا کہ رائج نظامِ تحفظ میں اُن کے شانے کی پٹیوں کا کتنا اہم مقام ہے اور کارکنان کی تعداد میں تخفیف کرنا ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی ذاتی دلیری کا سکہ بھی جما دیا۔

تمام آزمودہ طریقے استعمال میں لائے گئے۔ مارچ اور اپریل میں نمبر ۲ قیدیوں کے کئی جتھے دوسرے کیمپوں کو روانہ کر دیے گئے تھے (مستعدی مرض اور آگے بڑھا!) تقریباً ستر افراد (جن میں مینزو جی تھا) محفوظ ترین جیلوں میں بھیجے گئے جو اس ٹکسالی مقدمے سے منسوب تھے۔ اصلاح کی ہر کوشش فضول ثابت ہوئی۔ دوسرے قیدیوں کو بگاڑتا ہے، "مشقتی کیمپ کے لیے نامناسب ہے" جن لوگوں کو محفوظ ترین جیلوں میں روانہ کیا گیا تھا اُن کی فہرستوں کو دوسروں کی عبرت کے لیے کیمپوں میں مشتہر کیا گیا تھا۔ خود کفالتی کے طریقے کو، جیسے یہ گلاگ کی نئی اقتصادی پالیسی ہو۔ آزادی اور انصاف کا زیادہ تشفی بخش

بدل بنانے کے لیے پہلے کم مال رکھنے والے خریداری مراکز کو متفرق اشیائے خوردنی بھیجی گئیں ۔۔ ناقابلِ یقین سا لگتا ہے (!) لیکن انہوں نے قیدیوں کو پیشگی دینا بھی شروع کیا تاکہ وہ اشیاء خرید سکیں (گلاگ اپنے باشندوں کو قرض فراہم کرے! کس نے اس طرح کی بات کبھی سُنی ہوگی!)

اس طرح کیسعگر میں دوسری بار ایک پکنے والا پھوڑا پھوٹنے سے قبل ہی چیر دیا گیا۔

اب افسروں نے حد کر دی انہوں نے دفعہ ۵۸ والوں پر وہ چھڑی استعمال کی جو اُن کا آخری حربہ تھی ۔۔ چور! (جب "طبقاتی دوست" موجود ہیں تو وہ اپنے ہاتھ کیوں گندے کریں اور شانے کی پٹیوں کو کیوں میلا کریں؟)

افسروں نے اب اسپیشل کیمپوں کے نظریے ہی کو غلط بتایا، یہ تسلیم کیا کہ اگر ہم نے سیاسی قیدیوں کو علیٰحدہ کر دیا تو ہمارے پاس اپنی بات سمجھنے کا کوئی وسیلہ نہ رہ جائے گا اور یوم مئی کی تقریبات سے عین قبل ۶۵۰ آدمی لائے گئے اور انہیں باقی نمبر ۳ کیمپ ڈیویژن میں بانٹ دیا۔ ان میں سے بیشتر چور تھے، کچھ چھوٹے موٹے جرائم پیشہ تھے (جن میں نابالغ بھی شامل تھے)" ایک صاف ستھرا گروہ ہمارے ساتھ شامل ہو رہا ہے!" افسروں نے بڑی مہارت کے ساتھ ۵۸ والوں کو بتایا "اب تم سوچ سمجھ کر سانس لینا" اور انہوں نے نوواردوں سے کہا کہ "ہمارے گھر کو ٹھیک کرو"!

افسران بخوبی سمجھتے تھے کہ ٹھیک کرنے والے اپنے کام کا آغاز کس طرح کریں گے: چوری کر کے دوسروں کو شکار بنا کر اور ہر شخص کو اس کے ساتھیوں کے خلاف ورغلا کر۔ اور افسروں نے اس وقت اسی دوستانہ مسکراہٹ سے کام لیا جیسے وہ ایسے لوگوں کے لیے محفوظ رکھتے ہیں۔ جب چوروں نے سنا کہ قریب ہی عورتوں کا ایک کیمپ بھی ہے تو گستاخ بھکاریوں کی طرح باچھیں پھیلا کر کہا "حضور! ایک جھلک عورتوں کی ہمیں بھی دیکھنے کو مِل جائے"!

لیکن ہم یہاں پر دیکھتے ہیں کہ انسانی جذبات اور سماجی تحریکات کے رُخ کی پیش بینی کرنا کتنا دشوار ہوتا ہے۔ کینگر نمبر ۳ میں ایک تجرباتی ٹرمین (ایک دوا) کی کافی مقدار کا انجکشن لگانے کے بعد انسان کو ایک بھی پُرامن کیمپ نہیں ملا بلکہ گلاگ مجمع الجزائر کی تاریخ کے سب سے بڑے غدر سے سابقہ پڑا۔

—— × ——

گلاگ کے جزیرے حالانکہ اتنی دُور دور بکھرے ہوئے اور بڑی احتیاط کے ساتھ ایک دوسرے سے الگ رکھے جانے والے نظر آتے ہیں لیکن وہ سفری جیل کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک ہیں جس کی وجہ سے اُن سب میں ایک سی ہوا چلتی ہے اور سب کی شریانوں میں ایک ہی حیاتیاتی سیال گردش کرتا ہے۔ اسطرح مخبروں کا قتلِ عام بھوک ہڑتالیں، عام ہڑتال اور اسپیشل کیمپوں کے فسادات چوروں کے دائرۂ معلومات سے باہر نہیں تھے ہمیں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۵۴ء تک سفری جیلوں میں یہ نکتہ سامنے آیا تھا کہ چور سیاسی قیدیوں کا احترام کرنے لگے ہیں۔

اگر یہ بات سچ ہے ۔۔ تو ہمارے لیے اُن کا احترام حاصل کرنے میں پہلے کون سی رکاوٹ تھی؟ تیسرے، چوتھے اور پانچویں دہائیوں میں تمام وقت ہم غضبناک اور غیر مہذب لوگ تھے چونکہ ہم خیالیں

اپنے آپ کو اہم ترین سمجھنے میں محو تھے۔ موٹے اون کے جھولوں میں ہمارا سامان ہوتا تھا، اپنے جوتے اور پتلونیں تھیں جو ہمارے پاس رہنے دی گئی تھیں۔ چوروں کے خیال میں ہمارا رویہ ایسا تھا جیسے ہم کسی مزاحیہ اسٹیج کے کردار ہوں۔ جب وہ ہمارے ہمسائے، ہماری ہی طرح کی عالمگیر اہمیت کے حامل دانشور کو لوٹ لیتے تو ہم شرم اور تکلف سے اپنی نگاہیں بچا لیتے اور سمٹ کر اپنے گوشوں میں جمع ہو جاتے اور جب یہ گھٹیا درجے کے لوگ ہمارا "علاج" کرنے کے لیے کمرے میں آتے تو ظاہر ہے کہ اس وقت ہم اپنے پڑوسیوں سے امداد کی توقع نہیں رکھ سکتے تھے بلکہ احسان کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا سارا اثاثہ ان بھونڈے خواستگاروں کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے ورنہ خوف تھا کہ وہ ہمارے سر اڑا دیں گے۔ ہاں ہمارے دل کہیں اور لگے ہوئے تھے اور ہم کچھ دوسری چیزوں کے عادی تھے! ہمیں ایسے بدمعاش اور ڈھیٹ دشمن سے کبھی ملاقات کا گمان بھی نہیں گزرا تھا! ہم لوگ جو روس کی تاریخ کے پیچ و خم کا سنگم تھے عوام کے روبرو ساری دنیا کی نگاہوں کے سامنے خوبصورتی کے ساتھ اور تمام بنی نوع انسان کی آخری نجات کے لیے ہی جان دینا چاہتے تھے۔ اگر ہم کچھ کم عقلمند ہوتے تو غالباً ہمارا حال بہتر ہوتا۔ شاید جب ہم نے پہلی بار کسی سفری جیل کی کوٹھڑی میں قدم رکھا تھا اسی وقت ہمیں اس جگہ کے ہر آدمی کو ان غنڈوں اور بدمعاشوں سے جنہیں نیلی وردی والے لڑکوں نے ہمارا گوشت نوچنے کے لیے وہاں لا کر جمع کر دیا تھا کسی گندے جھگڑے میں شامل ہو کر پاخانے کی بالٹی کے پاس پسلن پر کسی تم گوشے میں اپنی پسلیوں اور پیٹ کے درمیان چاقو کھانے کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا۔ اگر ہم نے یہ عمل کیا ہوتا تو شاید ہمیں بہت کم فرق پہنچتا۔ ہم نے اپنی جرأت دوبارہ جلد حاصل کر لی ہوتی اور کیا پتہ کہ انہیں چوروں کے شانہ بہ شانہ اسٹالن کے کیمپوں کی دھجیاں اڑا دی ہوتیں! ورنہ کس وجہ سے چور ہمارا احترام کرتے؟ ....

خیر تو جب چور کینگر میں آئے اس وقت وہ دو ایک باتیں سن چکے تھے، وہ اس امکان پر غور کرتے ہوئے آئے تھے کہ سیاسی قیدیوں میں جد و جہد کا جذبہ ہوگا اور قبل اس کے کہ وہ اپنے قدم جما سکتے اور کیمپ کے افسران انہیں پھسلانے والی باتیں کہہ سکتے، کچھ متین اور چوڑے شانوں والے لڑکے ان کے سرغنہ کے پاس گئے اور زندگی کے بارے میں بات چیت کرنے کے لیے بیٹھ گئے اور انہوں نے کہا: "ہم نمائندے ہیں تم اسپیشل کیمپوں میں سر کاٹے جانے کی بات سن چکے ہوں گے اور اگر نہیں سنا ہے تو ہم سے سن لو۔ ہم اتنے ہی بھنس چاقو بنا لیتے ہیں جیسے تمہارے پاس ہیں۔ تم چھ سو ہو ہماری تعداد دو ہزار چھ سو ہے ذرا سوچ سمجھ لو اور اپنا فیصلہ سناؤ۔ اگر تم ہم کو کچلنے کی کوشش کرو گے تو ہم تم میں سے بہتیروں کو کاٹ پھینکیں گے:

اگر کوئی دانشمندانہ قدم ہو سکتا تھا تو وہ یہی تھا اور یہ بہت پہلے اٹھانا چاہیئے تھا۔ چوروں کے پاس جو کچھ تھا، اس سب کے ساتھ ان کا محاصرہ کرنا۔ انہیں اصل دشمن سمجھ کر چلنا۔

بلاشبہ افسروں کے لیے کھلے جھگڑے سے زیادہ موافق اور کوئی دوسری بات نہیں تھی۔ لیکن چوروں نے اس آفت کے بارے میں غور و خوض کیا اور سمجھ لیا کہ نئے موٹے والے ان دو نمبر کے قیدیوں سے ایک کے مقابلے چھ ہمارے طاقت آزمائی کرنا سود مند نہ ہوگا۔ آخر ش ان کے محافظین تو کیمپ سے باہر رہتے تھے اور ہم بہر صورت کسی کام کے نہیں ہیں۔ کسی چور نے کیمپ ان کا احترام کیا ہے؟ ادھر ہمارے لڑکوں نے جو

دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے وہ ایک نیا اور مزیدار سلسلہ ہے جس کے تحت انہوں نے سوچا کہ باڑ کو پھلانگ کر عورتوں کے کیمپ تک پہنچنے کی بھی گنجائش ہے۔

چنانچہ اُن لوگوں کا جواب تھا "نہیں، ہم پہلے سے زیادہ دانشمند ہو گئے ہیں۔ ہم تم لوگوں کے ساتھ ہیں!" اس اجلاس کی کوئی رپورٹ تاریخ کے لیے محفوظ نہیں رکھی گئی اور اس میں حصہ لینے والوں کے نام بھی کسی معاہدے میں محفوظ نہیں ہیں۔ یہ مقام افسوس ہے کہ وہ چالاک لڑکے تھے!

———X———

جب یہ صحت مند گروہ اپنے کارنٹین (متعدی امراض سے دُور رکھنے کے لیے) کے دَور میں ابھی اپنی پہلی ہی جھونپڑی میں تھا تو انہوں نے ایک افتتاحیہ پارٹی دی۔ اپنے تختوں اور الماریوں کی سیمنٹ کے فرش پر ہولی جلادی اور پھر دھواں کھڑکی سے نکلنے دیا۔ انہوں نے جھونپڑی کے دروازے مقفل کرنے پر اپنی ناخوشی کا اظہار کنجی کے سوراخوں میں لکڑی کا بُرادہ ٹھونس کر کیا۔

دو ہفتوں تک چوروں نے ایسا برتاؤ کیا جیسے وہ صحت افزا مقام پر لائے گئے ہوں وہ کام کے لیے پیش ہوئے لیکن صرف اتنا کیا کہ دھوپ سینکتے رہے۔ یقیناً افسران اُن کی خوراک کم کرنے کی بات خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے البتہ پیسے کی کمی کی وجہ سے اُن لوگوں کو اُجرت نہیں دے سکے جن سے انہیں اتنی اچھی توقعات تھیں لیکن جلد ہی چوروں کے پاس داؤپیچ (رقم کی جگہ جیل میں خرچ کرنے کے لیے ٹکٹ) آگئے اور وہ کھانا خریدنے کے لیے اسٹالوں پر گئے۔ افسران یہ خیال کرکے بہت خوش ہوئے کہ صحتمند گروہ نے آخرش چوریاں شروع کردی ہیں لیکن اُن کی معلومات خام تھیں، اور وہ غلط سوچ رہے تھے۔ سیاسی قیدیوں میں چوروں کی مدد کے لیے چندہ کیا گیا تھا (بلاشبہ یہ بھی مصالحت کا ایک جزو تھا ورنہ چوروں میں دلچسپی نہ پیدا ہوتی) اور اس طرح داؤپیچ اُن کے پاس آئے تھے! یہ بات اتنی غیر معمولی تھی کہ افسر لوگ اس کا گمان بھی نہ کر سکتے تھے۔

بے شک کھیل نیا اور نامانوس ہونے کی وجہ سے مجرموں کو بیحد دلچسپ معلوم ہوا، خاص طور پر نا بالغوں کو: فاشسٹوں سے ملائمت کا سلوک کرنا، اُن کے سکشنوں میں بغیر اجازت داخل نہ ہونا۔ بغیر بلائے اُن کے تختوں پر نہ بیٹھنا۔

گزشتہ صدی میں پیرس نے اپنے کچھ مجرمین کو (معلوم ہوتا ہے کہ وہاں وہ کثیر تعداد میں تھے) شہر کی فوج (ملیشیا) میں بھرتی کر لیا تھا اور انہیں موبائل (متحرک) نام دیا تھا۔ بڑا برمحل تذکرہ ہے! یہ اتنی متحرک قوم ہے کہ کسی معمولی غیر دلچسپ مقام پر خول میں بند ہو کر نہیں رہ سکتی بلکہ لازماً اُسے توڑ ڈالتی ہے! انہوں نے چوری نہ کرنے کا اصول بنایا تھا اور سرکار کے لیے کام کرنا غیر اخلاقی بات تھی لیکن انہیں کچھ تو کرنا ہی تھا۔ چھوٹے لڑکے وارڈروں کی ٹوپیاں اُچک لے جاتے تھے، جھونپڑیوں کی چھتوں پر اور شام کی حاضری لینے کے وقت کیمپ ڈویژن نمبر ۲ سے اونچی دیوار پھاند کر نمبر ۱ میں چلے جاتے تھے اور گنتی میں گڑبڑ کر دیتے تھے، سیٹیاں بجاتے، ہڑبونگ کرتے اور رات کے وقت پہرے والوں کو ڈرا دیتے تھے۔

جب ڈسپلن افسر یا انہیں تعلیم یا اخلاق دینے والے لوگ چوروں کو جونپڑیوں میں دوستانہ گفتگو کی غرض سے لاتے تو یہ چھوکرے اُن کی جیبوں سے نوٹ بکیں یا پرس کھینچ لیتے یا کسی بالائی تختے سے دفعتاً بچے

جھک کر افسر کی ٹوپی سر سے اُتار لیتے اور اُسے اُلٹے رُخ سے پہنا دیتے تھے اور اس طرح اُن کے جذبات کو بُری طرح مجروح کر دیتے تھے۔ گلاگ میں ایسا عمل پہلے کبھی نہیں ہوا تھا یا پھر تمام صورتحال ہی نرالی تھی۔ ماضی میں اُن کے سرپرستوں نے ہمیشہ اُنہیں گدھا سمجھا تھا اور وہ نیلی ٹوپی والے جس قدر سنجیدگی سے یہ سمجھتے تھے کہ وہ چوروں کو از سرِ نو تعلیم دینے میں کامیاب ہو رہے ہیں، چور اُن سے اتنی ہی زیادہ نفرت کرتے تھے۔ جیسے ہی وہ گھٹیا چلا کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے کی بات کرنے کے لیے کسی تختے پر یا مائیکروفون کے سامنے کھڑے ہوتے ویسے ہی چور تمسخر آمیز ہنسی سے پھٹ پڑنے کے لیے تیار رہتے تھے لیکن تاحال افسروں سے جھگڑے کا کوئی موقع نہیں آیا تھا۔ جن سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ ہونے والے معاہدے نے چوروں کی تازہ آزاد قوتوں کو مالکوں کے خلاف موڑ دیا تھا۔

اس طرح گلاگ کے افسران نے، چونکہ اُن میں نوکر شاہی کی گھٹیا عقل تھی اور بنی نوعِ انسان کے اعلیٰ درجے کی عقلی قوتوں کی کمی تھی، از خود کینگر آتش فشانی کی تیاری کر دی: ابتدا میں ناسمجھی کے ساتھ گولی چلا کر: پھر بہت گرم ماحول میں پٹرول کا دھواں بھرنے کی مانند کثیر تعداد میں چوروں کو کیمپ میں لا کر۔

—— واقعات اپنے ناگزیر راستے پر چل نکلے۔ سیاسی قیدیوں کے لیے ناممکن تھا کہ وہ چوروں کے رو برو جنگ یا آشتی میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی تجویز نہ رکھتے۔ چوروں کے لیے دوستی سے انکار کر دینا ناممکن تھا اور ایک بار دوستی کا معاہدہ ہو جانے کے بعد اس کا تعطل میں رہنا بھی ناممکن تھا۔ اگر یہ تعطل میں رہتا تو شکست ہو جاتا اور خانہ جنگی کا آغاز ہو جاتا۔

انہیں کچھ نہ کچھ شروع کرنا تھا خواہ انجام کچھ بھی ہو۔ اور چونکہ جو لوگ کچھ شروع کرتے ہیں وہ اگر ۵۸ کے قیدی ہوں تو کشیدگی کا شکار ہو جاتے ہیں، چونکہ اُن کی گردنوں میں پھندے پڑے رہتے ہیں اور اگر وہ چور ہیں تو انہیں اپنی سیاسی کلاس میں ہلکی سی ڈانٹ پلائی جاتی ہے اس لیے چوروں نے آسان تجویز پیش کی: ہم شروع کریں گے، تم ہمارے ساتھ ہو جانا!

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ تمام کینگر کیمپ کومپلکس ایک ہی مستطیل میدان تھا جس کی بیرونی باڑ مشترکہ تھی اور اسے چوڑائی سے منقسم کر کے علیٰحدہ علیٰحدہ کیمپوں کے علاقے بنائے گئے تھے۔ سب سے پہلے کیمپ ڈویژن نمبر ۱ (عورتوں کا کیمپ تھا) پھر سروس یارڈ تھا (اس کے کارخانوں کی صنعتی اہمیت کے بارے میں ہم پہلے گفتگو کر چکے ہیں) بعد ازاں نمبر ۱ پھر نمبر ۲ اور اس کے آگے جیل کا علاقہ تھا جس میں دو قید خانے تھے، ایک کی عمارت پرانی تھی اور دوسرے کی نئی، جس میں نہ صرف کیمپ کے باشندے بلکہ بستی کے آزاد شہری بھی وقتاً فوقتاً قید کیے جاتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اوّلین مقصد تھا سروس والے احاطے پر قبضہ کرنا جس میں کیمپ کے تمام سامانِ رسد کا ذخیرہ تھا انہوں نے کارروائی کا آغاز ایک تعطیل کے روز (اتوار، مئی ۱۶، ۱۹۵۴ء) کیا۔ پہلے چور اپنی جھونپڑیوں کی چھتوں پر چڑھ گئے اور قدرے توقف کے ساتھ کیمپ ڈویژن نمبر ۱ اور نمبر ۲ کے وسط میں آگئے۔ پھر اپنے قائدین کی ہدایات پر جو اوپر بلندی پر ٹھہر گئے تھے وہ اپنے ہاتھوں میں ڈنڈے لیے ہوئے کیمپ ڈویژن نمبر ۲ میں پھاند گئے اور وہاں قطار لگا کر کھڑے ہو گئے اور مرکزی سڑک پر مارچ کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ یہ سڑک نمبر ۲ کے وسط سے شروع ہو کر سروس احاطے کے عین اندرونی پھاٹکوں تک پہنچتی تھی جہاں آ کر وہ رُک گئے۔

ان تمام علی الاعلان کی جانے والی کارروائیوں میں کچھ وقت صرف ہوا جس کے دوران وارڈنوں نے

اپنے آپ کو جیسے تیسے منظم کیا اور احکامات حاصل کیے اور ایک بہت ہی دلچسپ بات ہوئی۔ وارڈر ادھر اُدھر جاتے ہوئے دفعہ ۵۸ والوں کی جھونپڑیوں میں پہنچے اور اُن سے جنہیں وہ پینتیس ۳۵ سال سے کوڑا کرکٹ سمجھتے آرہے تھے۔ اپیل کرنے لگے: "دوستو! دیکھو تو، چور عورتوں کے کیمپ میں گھسنے جارہے ہیں۔ وہ تمہاری بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ بدکاری کریں گے۔ آؤ اور ہماری مدد کرو۔ آؤ انہیں ایسا کرنے سے باز رکھیں!" لیکن معاہدہ آخر معاہدہ ہے اور جن لوگوں نے لاعلمی میں افسروں کا ساتھ دینا چاہا انہیں روک دیا گیا۔ عام حالات میں ۵۸ والے اس جال میں پھنس جاتے لیکن اس مرتبہ وارڈروں کو اُن کی طرف سے کوئی امداد نہیں مل سکی۔

وارڈر اپنے چہیتوں سے عورتوں کی حفاظت کیسے کرتے؟ یہ کوئی نہیں جانتا لیکن پہلے انہیں سروس یارڈ کے چاروں طرف بنے ہوئے گوداموں کو محفوظ رکھنے کی بات سوجھی تھی۔ سروس یارڈ کے پھاٹک پورے کھول دیے گئے اور غیر مسلح فوجیوں کی ایک ٹکڑی حملہ آوروں سے ملاقات کے لیے آئی۔ اس ٹکڑی کی تیاری دیر تک پیچھے رہ کر بیلیا ٹیف کر رہا تھا۔ شاید فرض شناسی کے جوش میں وہ اتوار کے دن بھی کیمپ میں رُک گیا تھا یا شاید اُس دن اُس کی ڈیوٹی رہی ہو۔ فوجیوں نے چوروں کو پیچھے دھکیلنا شروع کیا اور اُن کی قطاریں توڑ دیں۔ اپنے ڈنڈوں کو استعمال کیے بغیر چور اپنے کیمپ نمبر ۳ کی طرف پسپا ہونے لگے اور پھر ایک دیوار پر چڑھ گئے جس کے عقب سے چور فوجیوں پر کچی اینٹیں اور پتھر پھینک کر راستہ صاف کر رہے تھے۔

بے شک اس کارستانی کے لیے کوئی چور گرفتار نہیں ہوا۔ افسران نے اب بھی اسے بدمعاشی کے جوش کے سوا اور کچھ نہیں سمجھا اور کیمپ کے اتوار کو پُرامن طور پر گزر جانے دیا۔ بغیر کسی واردات کے کھانا سب کو پہنچا دیا گیا اور شام کو اندھیرا ہوتے ہی انہوں نے ایک فلم "رِسکی کورساکوف" کی نمائش شروع کر دی اور اس کے لیے کمرۂ طعام کے نزدیک ایک خالی جگہ کو اوپن ایر تھیٹر بنا دیا۔

لیکن جیالے سازشی مظالم اور اذیت رسانی کے خلاف اظہارِ غضب کرتے ہوئے ابھی گوداموں سے ہٹے بھی نہیں تھے کہ سرحدی علاقے کے آس پاس کے لیمپوں کے ٹوٹتے ہوئے کانچ کی چھن چھن سنائی دی: چور غلیلوں سے کیمپ کے علاقے کی بجلیاں گل کرنے کے لیے اُن کا نشانہ لے رہے تھے۔ تاریکی میں وہ تمام کیمپ ڈیویژن نمبر ۲ میں بھی گھس آئے اور اُن کی تیز، ڈکیتی والی سیٹیوں سے آسمان گونجنے لگا۔ انہوں نے ایک شہتیر سے سروس یارڈ کا گیٹ توڑ کر نیچے پھینک دیا اور وہاں سے ریل پٹری کے ایک ٹکڑے سے دیوار میں نقب لگائی اور اس کی راہ سے عورتوں کے کیمپ میں داخل ہو گئے (اُن کے ساتھ چند ۵۸ والے نوجوان بھی تھے!)

برجیوں سے چلائی جانے والی گولیوں کی چمک میں ہمارا دوست افسرِ تحفظ بیلیا ٹیف کیمپ کے باہر سے گارڈ ہاؤس میں ہوکر ٹامی گن والوں کے ایک دستے کے ساتھ سروس یارڈ میں داخل ہوا اور گلاگ کی تاریخ میں پہلی بار طبقاتی دوستوں پر گولیاں برسائیں۔ کچھ جان سے مارے گئے اور درجنوں زخمی ہوئے اُن کے پیچھے زخمیوں کو سنگینیں گھونپنے کے لیے سُرخ فیتے آئے پھر اُن کی عقب میں تعزیری مشقت کی عام تقسیم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، جیسا کہ پہلے ایکی بسٹز میں، نور ایلسک میں اور وورکتا میں آزمایا جا چکا تھا، لوہے کی سلاخیں لے کر وارڈر داخل ہوئے اور ان سے پیٹ پیٹ کر زخمیوں کو ہلاک کر دیا (اس رات کیمپ ڈویژن نمبر ۳ میں اسپتال کے آپریشن والے کمرے میں قمقمے روشن ہو گئے اور اسپینی قیدی سرجن، فاسٹر اپنا کام

گرتا رہا۔)

سروس یارڈ پر تعزیری طاقتوں نے مستحکم قبضہ کر لیا تھا اور وہاں مشین گن والے تعینات کر دیے گئے تھے لیکن دوسرے کیمپ ڈویژن (چوروں نے اپنا کردار ادا کر دیا تھا۔ اب سیاسی قیدی اسٹیج پر آ گئے) نے سروس احاطے کے دروازے کے سامنے ایک رکاوٹ کھڑی کر دی دوسرے اور تیسرے کیمپ ڈویژنوں کو دیوار میں ایک نقب لگا کر جوڑ دیا گیا اور اب اُن میں کوئی اسیر تحفظ موجود نہ تھا۔

اور جو عورتوں کے کیمپ میں گھسنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اب اس طرف سے کٹ گئے تھے، اُن کا کیا ہوا؟ چور عورتوں سے متعلق جولا اُبالیانہ بے رُخی رکھتے ہیں، واقعات نے اُسے پیچھے دھکیل دیا۔ جب سروس یارڈ میں گولیوں کی آوازیں گونجنے لگیں تو وہ لوگ جو عورتوں کے کیمپ میں داخل ہو گئے تھے، حریص اور لٹیرے ہونے کے بجائے مصیبت کے ساتھی بن گئے۔ عورتوں نے اُنہیں چھپا لیا۔ غیر مسلح فوجی انہیں گرفتار کرنے کے لیے آئے، پھر بندوق بردار آئے۔ عورتوں نے تلاشی لینے والوں کا راستہ روک لیا، غیر مسلح فوجیوں نے انہیں پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی تو اس کی مدافعت کرتی رہیں فوجیوں نے عورتوں کو گھونسوں سے مارا اور بندوق کے کندوں سے اُن کو ضرب لگائیں ان میں چند کو اس طرف جیل کی جانب گھسیٹا گیا (کسی کی عاقبت بینی کے نتیجے میں عورتوں کے کیمپ کے علاقے میں ہی ایک قید خانہ موجود تھا) اور کچھ پر گولی چلائی گئی۔

اپنے تعزیری دستے کی قوت کو کم پا کر کمانڈ والے عورتوں کے کیمپ میں کچھ "سیاہ پٹی" والوں کو کینگر میں موجود ایک تعمیری بٹالین کے فوجی لے آئے لیکن وہ اس قسم کے "فوجیوں کے وقار کے خلاف" کام میں ہاتھ بٹانے پر آمادہ نہیں ہوئے چنانچہ انہیں واپس بھیج دیا گیا۔

ساتھ ہی یہاں عورتوں کے کیمپ میں بہترین سیاسی بہانہ موجود تھا جو یہ جلاد اپنی صفائی میں اُوپر والے کے روبرو پیش کرنا چاہتے تھے۔ وہ بُدھو نہیں تھے انہوں نے اس قسم کی کوئی بات پڑھی تھی یا خود ہی سوچ لی تھی۔ دوشنبہ کو فوٹوگرافر کیمپ میں لائے گئے اور اپنے دو تین بند قیدیوں کی پوشاک پہنا کر وہاں پہنچا دیے گئے۔ ان بہروپیوں نے عورتوں کو ادھر اُدھر کھینچنا شروع کیا اور فوٹوگرافروں نے تصویریں کھینچ لیں بات صاف تھی کہ ان بے بس عورتوں کو اس قسم کی بدمعاشی سے بچانے کے لیے کیپٹن بیلیائیف کو گولی چلانی پڑی۔

دوشنبے کو صبح کے وقت رکاوٹ اور سروس یارڈ کے شکستہ پھاٹکوں کے دونوں طرف کشیدگی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ احاطے سے لاشیں ہٹائی نہ گئی تھیں۔ مشین گن والے اپنی گنیں لیے موجود تھے جو گیٹ کی طرف تنی ہوئی تھیں۔ آزاد کرائے گئے مردوں کے کیمپ میں وہ اپنے آپ کو مسلح کرنے کے لیے تختے اکھاڑ رہے تھے نیز تختوں اور چٹائیوں سے ڈھالیں بنا رہے تھے۔ قیدی رکاوٹ کی دوسری طرف سے قصائیوں پر چیخے اور جواب میں قصائی بھی چیخے۔ کچھ نہ کچھ ہونا ہی تھا، صورتحال بیحد خطرناک تھی۔ رکاوٹ پر لیتاؤ زیک پہلے خود حملہ کرنے کی بابت سوچ رہے تھے۔ کچھ کمزور افراد نے اپنی قمیص اتار دیں، رکاوٹ آئے اور اپنے سوکھے سینوں اور پسلیوں کی طرف اشارہ کرکے چیختے ہوئے مشین گن والوں نے کہا: "آؤ پھر چلاؤ گولیاں! اپنے والدین کو مار ڈالو، ختم کر دو ہمیں!"

دفعتاً ایک فوجی دوڑتا ہوا افسر کے لیے ایک پرچے کے ساتھ احاطے میں آیا۔ افسر نے لاشیں ہٹانے

کا حکم دیا اور سُرخ فیتے والے انہیں لے کر احاطے سے چلے گئے۔

پانچ منٹ تک رکاوٹ پر امن رہا اور بے یقینی کی سی کیفیت طاری رہی بعد ازاں پہلے زیکوں نے احتیاط کے ساتھ احاطے میں جھانک کر دیکھا، وہ خالی تھا صرف کچھ کالی جیل کی ٹوپیاں ادھر ادھر پڑی تھیں، مقتولین کی ٹوپیاں، جن پر نمبروں والی دھجیاں ٹنکی ہوئی تھیں۔

(انہیں بعد میں علم ہوا کہ احاطہ خالی کر دینے کی ہدایت قازق جمہوریہ کے وزیر داخلہ نے بھیجی تھی جو ابھی بذریعہ ہوائی جہاز الماتا سے پلٹا تھا۔ لاشوں کو لاری میں لاد کر اسٹیپی میں دفن کر دیا گیا تاکہ اگر بعد میں کوئی پوسٹ مارٹم کرانے کے لیے کہے تو اس کی گنجائش نہ رہے)

"ہرّا" کی آوازیں قطاروں میں گونجیں اور وہ احاطے میں آگے تک عورتوں کے کیمپ میں بھر گئے۔ انہوں نے بیچ کی ٹوٹی ہوئی دیوار کو اور توڑ کر راستہ چوڑا کر لیا بعد ازاں انہوں نے جیل گھر میں مقید عورتوں کو آزاد کیا اور سارا کیمپ متحد ہو گیا۔ تمام کا تمام خاص کیمپ کا علاقہ آزاد تھا۔ صرف نمبر ۱ ڈیویژن (کیمپ جیل) باقی رہ گیا۔

ہر برجی پر سُرخ فیتے والے چار فوجی تھے۔ توہین آمیز الفاظ انڈیلنے کے لیے کانوں کی کمی نہیں تھی۔ قیدی برجیوں کی طرف مُنہ کر کے کھڑے ہو گئے اور خوب چلّائے (غالباً عورتوں کی آواز بقیہ سے بلند تر تھی) "تم فاشسٹوں سے بدتر ہو! خون چوسنے والی جونکیں ہو۔۔۔ قاتل ہو!"

کیمپ میں دو ایک پادری باسانی مل گئے اور مُردہ گھر میں اُن کے لیے جو مارے گئے تھے، یا بعد میں اپنے زخموں کی تاب نہ لا کر جانبر نہ ہو سکے تھے، رکوئیم (مرنے والوں کی روح کو سکون پہنچانے کے لیے ایک مناجات) پڑھی گئی۔

ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ان آٹھ ہزار افراد کے دل کس کرب میں مبتلا تھے جو اتنے طویل عرصے تک اور کل سے پہلے تک غلامی کے احساس اور جذبۂ اخوت سے بالکل کورے تھے اور اب متحد ہو گئے تھے اور اپنے آپ کو آزاد کر چکے تھے۔ شاید مکمل طور پر تو نہیں لیکن کم از کم ان دیواروں کے مستطیل نما علاقے کے اندر اور چار گنا بڑھا دیے جانے والے پہریداروں کی نگاہوں کے سامنے! ایکی بسٹز میں مقفل جھونپڑیوں میں بستروں پر لیٹ کر کی جانے والی بھوک ہڑتال کے دوران بھی آزادی سے چھوتے ہوئے لمحات کا احساس ہوا تھا! اب یہ انقلاب فرودی تھا! اتنے عرصے تک پامال کردہ انسان کا برادرانہ جذبہ بالآخر اُبل پڑا تھا! ہم چوروں سے محبت کرتے تھے! اور چور ہم سے محبت کرتے تھے! (اس بات کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں! انہوں نے اپنے خون سے اس پر مہر ثبت کر دی تھی! انہوں نے اپنی روایات کو طاق پر رکھ دیا تھا!) یقیناً ہم عورتوں سے اور بھی زیادہ محبت کرتے تھے اور اب ہم اس طرح زندہ تھے جیسے انسان کو جینا چاہیئے۔ عورتیں ایک بار پھر ہمارے ساتھ تھیں اور وہ ہماری بہنیں تھیں اور ہمارے دُکھ درد کی ساتھی تھیں۔

کرۂ طعام میں پوسٹر لگے: حتی الامکان اچھی طرح مسلح ہو جاؤ اور فوجیوں پر یلغار کر دو! اُن میں سب سے زیادہ پُرجوش لوگوں نے اخبارات (دوسرا کوئی کاغذ وہاں دستیاب نہ تھا) کے ٹکڑوں پر سیاہ یا رنگین الفاظ میں جلدی جلدی اپنے نعرے گھسیٹ دیے "چیکسٹوں (فوجیوں) کا بھرتا بنا دو لڑکو!" "مخبروں کو موت چکھا کے چھوڑو!"

آپ جدھر نگاہ اُٹھاتے اُسی طرف جلسے اور مقررین! ہر شخص کے پاس اپنی تجاویز تھی۔ آؤ غور کرو۔ اب تمہیں سوچنے کی اجازت ہے۔ تمہارا ووٹ کون لے جاتا ہے؟ ہم کون کون سے مطالبات پیش کریں گے"؟ ہم چاہتے کیا ہیں؟ بیلیا نیف پر مقدمہ چلاؤ یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے! قاتلوں پر مقدمے چلاؤ! یہ بھی طے شدہ بات ہے۔ اور کیا؟ جھونپڑیاں مقفل نہیں کی جائیں گی۔ نمبر ہٹاؤ۔ لیکن اس کے آگے؟ اس کے آگے سب سے بھیانک چیز، وہ اصل سبب جس کی بنا پر انہوں نے یہ سارا سلسلہ شروع کیا، جو وہ واقعتاً چاہتے تھے ہم بلاشک آزادی چاہتے ہیں، صرف آزادی — لیکن یہ ہمیں کون دے سکتا ہے؟ وہ منصفین جنہوں نے ہمیں ماسکو میں سزائیں دی تھیں۔ جب تک ہماری شکایات اشپلاگ یا کاراگنڈلگ کے خلاف ہیں اس وقت تک وہ ہم سے بات کرتے رہیں گے لیکن اگر ہم نے ماسکو کے خلاف شکایت کرنی شروع کر دی تو ہم سب کو.... اسی اشپلپی میں دفن کر دیا جائے گا۔

اچھا تو — ہم کیا چاہتے ہیں؟ دیواروں میں سوراخ کرنا؟ بیابان میں فرار ہو جانا؟ .....

دوشنبہ کے آخری پہر میں کمانڈ صدر دفتر کا نمائندہ وفد کف درد ہن کیمپ میں آیا۔ نمائندہ وفد کا رویہ بہت اچھا تھا۔ انہوں نے قیدیوں کو سنگدلی کے ساتھ نہیں گھورا۔ اُن کے ساتھ ٹامی گنیں نہیں تھیں کوئی بھی اُنہیں دیکھ کر خونی بیریا کے گرگے نہیں کہہ سکتا تھا ہمارے فریق کو علم ہوا کہ ماسکو سے سپہ سالار آئے ہیں۔ گلاگ کے صدر دفتر سے بوچکوف اور ڈپٹی پروکیورٹر جنرل وادیلوف (انہوں نے بیریا کے زمانے میں بھی کام کیا تھا لیکن پرانے زخموں کو کیوں چھیڑا جائے؟) انہیں قیدیوں کے مطالبات کلیتاً قرینِ انصاف محسوس ہوئے! (ہماری تو سانس رُکنے لگی۔ قرینِ انصاف؟ تو ہم باغی نہیں ہیں؟ نہیں نہیں، وہ بالکل قرینِ انصاف ہیں!) "جن لوگوں نے گولیاں برسائی ہیں انہیں اس کے لیے جوابدہ ہونا پڑے گا!" "لیکن انہوں نے عورتوں پر کیوں ہاتھ اُٹھایا؟" "عورتوں کو مارا؟" نمائندہ وفد کو صدمہ ہوا! "یہ بات صحیح نہیں ہو سکتی"— آنا میخائیلووچ انہیں دکھانے کے لیے کئی عورتوں کو لے آیا جنہیں زدوکوب کیا گیا تھا۔ کمیشن بے حد متاثر ہوا: "ہم اس معاملے کی جانچ کریں گے" "درومت"! "جانور"! لیوما برشرسکایا جنرل پر چیخی۔ اور بھی آوازیں بلند ہوئیں "جھونپڑوں سے تالے ہٹاؤ"۔ "اب اُن پر تالے نہیں پڑیں گے"۔ "نمبر ہٹاؤ" "یقیناً نمبر ہٹا دیے جائیں گے" ایک جنرل نے جسے قیدیوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا (اور دوبارہ کبھی نہیں دیکھیں گے) یقین دہانی کی۔ "کیمپ علاقوں کے درمیان دیواروں میں آمد و رفت کے راستے برقرار رہنے چاہئیں"! اُن کے حوصلے بلند تر ہوتے جا رہے تھے۔ "ہمیں ایک دوسرے سے ملنے دیا جائے"۔ "ٹھیک ہے جی بھر کر ملو" جنرل نے رضامندی ظاہر کی "درمیانی راستے برقرار رہیں گے"۔ اچھی بات ہے بجا ہے! ہم اور کیا چاہتے ہیں؟ ہم فتحیاب ہو گئے ہیں! ہم جیت گئے ہیں! ہم نے صرف ایک آنت بھر پاکی لطف اندوز ہوئے، اپنا غیض و غضب نکالا اور ہم جیت گئے! اگرچہ ہم میں سے کچھ لوگ اپنے سروں کو جنبش دیتے ہیں" یہ فریب ہے، یہ سب دھوکا ہے" لیکن ہم اس پر یقین کرتے ہیں! ہم اپنے افسروں پر اعتماد کرتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ لوگ اتنے خراب نہیں ہیں! ہم یقین کرتے ہیں کہ اس حالت سے نکلنے کا ہمارے لیے یہ سب سے آسان طریقہ ہے...

—x—

پامال شدہ لوگ یہی کرسکتے ہیں کہ اُمید کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں ہر مایوسی کے بعد انہیں اُمید کو برقرار رکھنے کے لیے نئے اسباب تلاش کرنے چاہئیں۔

اس طرح منگل ۱۸ مئی کو کینگر کے تمام کیمپ ڈیویژن کام کرنے گئے ـــ انہیں اپنے مرحومین کے سلسلے میں صبر سے کام لینا پڑا ـــ

اس صبح سارا قصّہ اب بھی پُرامن طور پر ختم ہوجاتا لیکن کینگر میں جو اونچے کرنل لوگ جمع تھے وہ اس قسم کے انجام کو اپنی شکست سے تعبیر کرتے، وہ سنجیدگی کے ساتھ یہ تسلیم نہیں کرسکتے تھے کہ قیدیوں کا رویّہ صحیح تھا! وہ ریاستی حفاظتی پولس کے فوجیوں کو سخت سزا نہیں دے سکتے تھے۔ اُن کی موٹی عقل میں صرف ایک بات آئی! کیمپ ڈیویژن کی درمیانی دیواریں کافی مستحکم نہیں تھیں! انہیں اس کے چہار جانب آتشیں حصار قائم کرنا چاہیئے۔

اور اُس دن پُرجوش کمانڈروں نے ان لوگوں کو کام پر متعین کیا جو برسوں پہلے کام کی عادت ترک کر چکے تھے۔ افسروں اور وارڈروں نے ایرن زیب تن کیے، جو لوگ کرنیاں چلاسکتے تھے انہوں نے کرنیاں سنبھال لیں برچیوں سے فراغت یافتہ قیدیوں نے ٹھیلے چلائے اور اینٹ مسالہ ڈھونے لگے۔ کام سے سبکدوش فوجیوں نے، جو کیمپ کے آس پاس ہی مقیم تھے، کچی اینٹیں ڈھوکر اوپر پہنچائیں اور شام تک ٹوٹی ہوئی دیواروں کی اینٹوں سے مرمت کردی گئی۔ ٹوٹے ہوئے بلب بدل دیے گئے۔ دیواروں میں ممنوعہ مقامات پر نشانات لگا دیے گئے اور سروں پر پہریدار متعین کردیے گئے جنہیں گولی ماردینے کی ہدایت تھی۔

جب حکومت کے لیے ایک دن کا کام مکمل کرکے قیدیوں کے کالم کیمپ کو پلٹیں تو انہیں عجلت کے ساتھ کھانے کے لیے پہنچا دیا گیا تاکہ انہیں پہلے یہ علم نہ ہوسکے کہ کیا ہوچکا ہے اور انہیں آسانی منتقل کیا جاسکے۔ جنرل کی ہدایت پر جیلروں کو اس پہلی شام، گذشتہ دن کے وعدے کے بعد کھلی بے ایمانی کی اس شلم کو جیسے تیسے گزارنا تھا! بعد میں قیدی اس کے عادی ہوجائیں گے اور پُرانے ڈھرے پر آجائیں گے۔

لیکن رات شروع ہونے سے قبل اتوار کو سنائی دینے والی لمبی لمبی سیٹیوں کی تیکھی آوازوں سے کیمپ گونجنے لگا۔ بدمعاشی کے لیے مٹرگشتی کرتے ہوئے غنڈوں کی طرح دوسرا اور تیسرا کیمپ ڈیویژن ایک دوسرے کو بلا رہے تھے (چوروں کے اشتراک کا ایک اور فائدہ ان سیٹوں کی صورت میں نکلا تھا) وارڈر خائف ہوگئے اور اپنا کام چھوڑ کر کیمپ کے میدان سے بھاگ گئے صرف ایک افسر باقی رہ گیا۔ کوارٹر ماسٹر سروس کا ایک فرسٹ لیفٹننٹ اپنے کام کی تکمیل کے لیے پیچھے رہ گیا تھا چنانچہ اُسے صبح تک کے لیے قیدی بنا لیا گیا۔

کیمپ زیکوں کے قبضے میں تھا لیکن وہ منقسم تھے۔ برجیوں کے پہریدار اندرونی دیواروں کے پاس پہنچنے والے ہر آدمی پر مشین گنوں سے گولیاں برسا رہے تھے انہوں نے متعدد جانیں لے لیں اور بہتوں کو زخمی کردیا۔ ایک مرتبہ پھر زیکوں نے اپنی غلیلوں سے نشانے لگاکر تمام لیمپ توڑ دیے لیکن برجی والوں نے روشنی کے راکٹوں سے کیمپ کو روشن کرلیا۔ ایسی صورتحال میں دوسرے کیمپ ڈیویژن کوارٹر ماسٹر کو استعمال کرنے کی بات سوچی: انہوں نے اس کے شلوکے کی ایک پٹی پھاڑ کر میز کے ساتھ باندھ دیا۔

اور اُسے سرحد کے پاس والے قطعہ میں دھکیل آئے۔ وہ چیخ چیخ کر اپنے لوگوں سے کہہ رہا تھا "گولی مت چلانا یہ میں ہوں۔ یہ میں ہوں، کہیں گولی نہ چلا دینا —!"

انہوں نے کانٹے دار تار اور لمبے کھمبوں پر یلغار کی لیکن گولیاں برس رہی تھیں اس لیے فصیل کو توڑ کر نکل جانا یا اس پر چڑھنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ انہیں زمین میں سوراخ کرنے پڑے۔ ہمیشہ کی مانند اُن کے پاس کیمپ میں بیلچے نہیں تھے سوائے اُن معدودے چند کے جو آگ لگنے پر استعمال کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ باورچی خانے کے چاقوؤں اور ٹینوں سے کام لینا پڑا۔

مئی ۱۹۔۱۸ کی اس درمیانی رات کو انہوں نے تمام دیواروں کے نیچے سوراخ کر کے تمام ڈیویژنوں اور سروس یارڈ کو ایک کر لیا۔ اب برجیوں نے گولیاں چلانی بند کر دی تھیں اور سروس یارڈ میں اوزاروں کی کمی نہ تھی۔ شلنے پر نیچے لگانے والے کاریگروں کی دن بھر کی محنت اکارت گئی۔ رات کی تاریکی میں انہوں نے سرحد کی باڑیں توڑ ڈالیں، دیواروں میں راستے بنا لیے اور انہیں چوڑا کر لیا تاکہ وہ پھندے بن نہ جائیں (اگلے کچھ دنوں میں انہوں نے ان راستوں کو بیس میٹر چوڑا کر لیا)

اُسی رات انہوں نے چوتھے کیمپ ڈیویژن — جیل کے علاقے کے چہار جانب بھی دیواروں میں سے راستے بنا لیے۔ جیل پر پہرہ دینے والے وارڈر فرار ہو گئے، کچھ گارڈ ہاؤس کی طرف اور کچھ برجیوں پر جہاں اُن کے لیے سیڑھیاں لگا دی گئی تھیں۔ قیدیوں نے تفتیش کے کمرے مسمار کر دیے۔ سُرخ فوج کا سابق کرنل کیپٹن کزنیٹسوف (وہ فرنزی اکیڈمی کا گریجویٹ تھا اور اب جوان نہیں رہا تھا) خاتمۂ جنگ پر وہ جرمنی میں ایک رجمنٹ کا کمانڈر تھا اور اُس کا ایک ماتحت مغربی حصّے میں بھاگ گیا تھا اسی جرم میں اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ وہ آزاد کارکنوں کی معرفت باہر بھیجے جانے والے خطوط میں "مذموم تفصیلات" بھیجنے کے جرم میں جیل پہنچ گیا تھا) اور سابق فرسٹ لیفٹننٹ گلیب سلوچینکوف (وہ اسیر جنگ رہ چکا تھا اور کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بدبیو دماغ تھا) اگلی صبح بغاوت کی کمانڈ ہاتھ میں لینے کے لیے جیل سے چھڑائے جانے والوں میں شامل تھے۔

نئے قید خانے میں کینگر بستی کے کچھ باشندگان بھی تھے جو معمولی جرائم میں گرفتار کیے گئے تھے۔ پہلے انہیں گمان گزرا کہ ملک گیر بغاوت شروع ہو گئی ہے اور اپنی غیر متوقع آزادی سے وہ بےحد مسرور ہوئے لیکن انہیں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ بغاوت مختصر سی جگہ میں ہی ہو رہی ہے اور وہ معمولی مجرم ایمانداری کے ساتھ اپنے سنگین خول میں چلے گئے اور بغاوت کی پوری مدت میں پہریداروں کے بغیر قاعدے سے جیل میں رہے حالانکہ وہ کھانا کھانے کے لیے باغی زیکوں کے ساتھ کمرۂ طعام میں جاتے تھے۔

باغی زیک جنہوں نے پہلے تین مرتبہ اس بغاوت اور اس آزادی کو نامنظور کرنے کی کوشش کی تھی، انہیں معلوم نہ تھا کہ ایسے تحائف کا کیا کریں اور اُن کی خواہش کرنے کی بجائے اُن سے ڈرتے تھے لیکن ساحلِ سمندر پر تھپیڑے کھاتی ہوئی موجوں سے زیادہ تُندر کوئی طاقت انہیں اس بغاوت کے ساتھ بہا لے گئی تھی۔

وہ کر بھی کیا سکتے تھے؟ وعدوں پر بھروسہ کرتے؟ انہیں دوبارہ فریب دیا جائے گا جیسا کہ سابقہ الکان گلائی نے اتنے واضح طور پر ادوار ماضی میں بار بار ثابت کر دیا تھا۔ کیا وہ شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں؟ انہوں نے خمیدہ کمر کے ساتھ برسوں گزار دیے تھے لیکن اُن پر رحم نہیں کیا گیا۔ کیا آج وہ سپر انداز ہو جائیں اور آنکھ

دی ہوئی سزائیں قبول کر لیں ؟ آج یا آزادی کے ایک ماہ بعد اُن لوگوں کے ہاتھوں سزا پائیں جنکی عدالتیں مشینی انداز میں کام کرتی تھیں اگر مُربع صدی کی سزا دی جانی تھی تو وہ سب کو ملنی چاہیئے۔ کسی کو چھوڑنا نہیں چاہیے !

مفرور صرف ایک دن کی آزادی سے لُطف اندوز ہونے کے لیے فرار ہوتا ہے بالکل اسی طرح ان آٹھ ہزار آدمیوں نے بغاوت نہیں کی تھی، یوں سمجھیے کہ آزادی کے لیے فرار ہو گئے تھے اگرچہ زیادہ دیر تک اس سے لُطف اندوز نہیں ہو سکے۔ آٹھ ہزار آدمی جو غلام تھے، اچانک آزاد ہو گئے تھے اور اب اُن کا موقع تھا جینے کا! اکثر انتہائی سنجیدہ رہنے والے چہرے نرم ہو کر رحم آمیز تبسم سے منوّر ہو گئے بلکہ عورتوں نے مردوں کی طرف دیکھا اور مردوں نے اُن کے ہاتھ تھام لیے کچھ لوگ جنہوں نے خفیہ طور پر دانشمندانہ طریقے سے خط و کتابت کی تھی اب ایک دوسرے سے مل گئے تھے ؟ لتھوانیہ کی جن لڑکیوں کی شادیاں پادریوں نے دیوار کی دوسری طرف کرا دی تھیں انہوں نے اب اپنے جائز شوہروں کے پہلی بار دیدار کیے ۔ خدا نے روزِ ازل میں اُن کے جوڑے بنا کر انہیں زمین پر بھیج دیا تھا! زندگی میں پہلی مرتبہ کسی نے بھی عقیدتمندوں اور خدا پرستوں کو باجماعت عبادت کرنے سے منع نہیں کیا۔ غیر ملکیوں نے، جو مختلف کیمپوں میں بکھرے ہوئے تھے اب ایک دوسرے کو تلاش کر لیا اور اپنی اپنی زبانوں میں اس ایشیائی انقلاب کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا۔ کیمپ کی خوراک رسانی کا بندوبست اب قیدیوں کے ہاتھوں میں تھا۔ کسی نے بھی اُنہیں کام پر جانے اور گیارہ گھنٹے کی جان توڑ محنت کے لیے نہیں ہنکایا۔

جب ۱۹ مئی کی صبح ہوئی تو کیمپ اپنی نمبروں کی چندیاں پھاڑ کر پھینک چکا تھا ۔ بڑا جوش تھا اور کسی کو نیند نہیں آتی تھی۔ شکستہ لیمپوں والے کھمبوں کے تار کی باڑ سے ٹکے ہوئے تھے۔ اُن کے مدد کے بغیر بھی زیک تاروں کے نیچے اپنی کھودی ہوئی خندقوں کی راہ سے ایک زون سے دوسرے زون میں آزادانہ جا رہے تھے۔ ان میں سے بہتوں نے اپنے جیل سے باہر پہننے کے کپڑے گودام سے حاصل کر لیے اور بعض لڑکوں نے اپنے سروں پر فر کے ٹوپ لگائے۔ ابھی کڑھی ہوئی قمیصیں آجائیں گی اور وسط ایشیا کی بھڑکدار رنگین پوشاکیں اور پگڑیاں۔ سرمئی سیاہ رنگ والا کیمپ رنگوں کی برسات میں نہا جائے گا۔

اردلی جھونپڑوں میں جا کر ہمیں بڑے کمرۂ طعام میں یکجا ہونے کے لیے کہہ آئے تاکہ ہم افسروں سے گفتگو اور خود مختاری کے لیے کمیشن کا انتخاب کر سکیں۔ کمیشن نے ان الفاظ میں ملائمت اور تکلف کے ساتھ اپنا مدعا پیش کیا تھا۔

اُن کا خیال تھا کہ ہم کچھ ہی گھنٹوں کے لیے یہ انتخاب کریں گے لیکن قدرت کو منظور تھا کہ چالیس دن تک کینگر کیمپ کی خود مختاری قائم رہے۔

———×———

اگر یہ سب کچھ دو سال پہلے ظہور میں آتا تو خواہ اسی خوف کے تحت کہ "اُسے پتہ چل جائے گا" ٹیپلاگ کے افسران یہ دائمی احکام جاری کرنے میں لمحہ بھر بھی تکلف نہ کرتے "گولیوں کی کفایت مت کرو"! اور ان دیواروں کے درمیان اسیر تمام مجمع کو گولی مار دی جاتی۔ اگر چار ہزار آدمیوں کو یا آٹھ کے آٹھ ہزار کو ہلاک کرنا ضروری ہوتا تو انہیں ذرا بھی پروا نہ ہوتی کیونکہ وہ شاک پروف تھے۔

لیکن ہم ۱۹۵۴ء میں صورتحال کی سنگینی کے پیش نظر دمے نہیں کر سکے۔ وائیلوف کو بھی! بُرچکیف کو بھی،

یہ احساس ہو گیا کہ ماسکو میں نئی ہوا چل رہی ہے۔ پہلے ہی کیمپ میں بہت سے قیدیوں کو گولیوں سے ہلاک کیا جا چکا تھا اور وہ ابھی یہ غور کر رہے تھے کہ ان اموات کو قانونی شکل کیسے دی جائے اس لیے تاخیر کی گئی جس کا مطلب یہ تھا کہ باغیوں کو خود مختارانہ زندگی شروع کرنے کا موقع مل جائے۔

بغاوت کے پہلے ہی گھنٹے میں اس کی سیاسی سمت کا تعین کرنا تھا۔ زندہ رہیں یا نہ رہیں کیا روبوٹ پریس کی شاہ سرخیوں میں سادہ دلی کے ساتھ یہ پیغام درج کر دیا جائے" لڑکو! چیکا والوں کو مچھر تا بنا دو؟"

کیپٹن آئیوانووچ نے، جیل سے باہر نکل کر چارج لیتے ہی، خواہ حالات کی مجبوری کے تحت، خواہ اپنی فوجی مہارت کے ہاتھوں مجبور ہو کر یا دوستوں کے مشورے یا کسی اندرونی جذبے سے متاثر ہو کر، فی الفور اُن آرتھوڈاکس سوویٹ شہریوں کا طرزِ عمل اختیار کر لیا جن کی تعداد کیمپ میں زیادہ نہیں تھی اور عام طور پر پیچھے دھکیل دیے جاتے تھے" یہ سب لکھنا لکھانا (پوسٹروں کا) بند کر دو!" انقلاب دشمن حرکات کو بالکل بند کر دو، جو لوگ ہمارے کیمپ کے واقعات سے اپنا اُلو سیدھا کرنا چاہتے ہیں انہیں ناکام بنا دو۔" یہ فقرے اس نوٹس کا اقتباس ہیں جو کمیشن کے ایک اور ممبر اے۔ ایف۔ میکٹیف نے پیوٹیر آکوئیف کے گودام میں ایک بے تکلف مباحثے کے لیے لکھا تھا۔ آرتھوڈاکس لوگوں نے کزنیٹسوف کی باتوں کی سر ہلا کر تائید کی۔" ہاں اگر ہم یہ پوسٹر بند نہیں کرتے تو ہم سب کو لمبی لمبی سزائیں ہو جائیں گی۔"

رات کے ابتدائی پہر میں، جب وہ سب جھونپڑیوں میں ہوتے پھر اگلے دن صبح کمرۂ طعام میں ہونے والے اجتماع میں اور بعد میں بہت سے مواقع پر جب کبھی اُن لوگوں کے جوشیلے جذبات اور تلخ غصہ اُس کی نگاہ میں آتا، جن کی زندگیوں کو کچل کر اتنی گہری دلدل میں دبا دیا گیا تھا کہ وہ محسوس کرنے لگے کہ گنوانے کے لیے اُن کے پاس کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ کزنیٹسوف وقفہ کے بغیر ایک سانس میں یہ الفاظ دہراتا:

" سوویٹ نظریے سے دشمنی مول لینا ہماری موت کے مترادف ہو گا اگر سوویٹ مخالف نعروں کی تشہیر کریں گے تو ہمیں فی الفور کچل دیا جائے گا۔ وہ ہمیں تباہ کرنے کے لیے صرف حیلہ تلاش کر رہے ہیں اگر ہم اس قسم کے پوسٹر لگائیں گے تو اُن کی طرف سے ہم پر گولیوں کی بوچھار حق بجانب ثابت ہو گی۔ ہماری نجات وفاداری میں مضمر ہے۔ ہمیں ماسکو کے نمائندوں سے سوویٹ عوام کے شایانِ شان انداز میں گفتگو کرنی چاہیئے!

پھر قدرے بلند تر آواز میں!" ہم دو چار ورغلانے والوں کی غلط حرکتیں برداشت نہیں کریں گے!"

(لیکن جب وہ یہ تقریر کر رہا تھا تو تختوں پر پڑے ہوئے لوگ اونچی آواز میں ہوٹنگ کر رہے تھے۔ جو کچھ اُس نے کہا اُس کا بیشتر حصہ اُن کے دلوں کو نہیں چھو سکا)

جب کوئی گاڑی آپ کو غلط سمت میں لے جاتی ہے اور آپ چھلانگ لگا کر اُس سے اُترنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو آپ کو گاڑی کی رفتار کی سمت منہ کر کے اُترنا پڑتا ہے اُس کے مخالف سمت میں نہیں تاریخ کے بہاؤ کی مخالفت کرنا بھی اتنا ہی دشوار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ گھن کھائے ہوئے لوگ یہ کام اس طرح نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن کزنیٹسوف کے بیان کی معقولیت اُن کی سمجھ میں فوراً آ گئی اور اُس کی بات تسلیم کر لی گئی جلد ہی سارے کیمپ میں اس قسم کے نعرے لکھ کر لگا دیے گئے۔ یہ خاصے جلی الفاظ میں تیار کیے گئے تھے اور برجیوں نیز گارڈ ہاؤس سے بآسانی پڑھنے میں آ سکتے تھے۔

"سوویٹ آئین زندہ باد!"
"مرکزی کمیٹی کی مجلسِ صدارت، زندہ باد!"
"سوویٹ حکومت زندہ باد!"
"مرکزی کمیٹی اپنا ایک نمائندہ بھیجے اور ہمارے معاملات پر نظر ثانی کرے!"
"قاتل بیریا کے مقلدین پر لعنت ہو!"
"اسٹیپلاگ کے افسران کی بیویوں سے! کیا تمہیں قاتلوں کی بیویاں ہونے پر شرم نہیں آتی؟"

اگرچہ کینگر میں اکثریت پر یہ حقیقت روشن تھی کہ قریب و دُور، جنگلی انصاف کے لاکھوں معاملات اسی آئین کی دھندلی روشنی میں انجام پذیر ہوئے تھے اور انہیں اراکین پر مشتمل پولٹ بیورو نے اُن کی منظوری دی تھی پھر بھی وہ یہی کر سکے کہ اس آئین کو اور اس پولٹ بیورو کو "زندہ باد" لکھ دیں۔ اپنے نعرے دہرانے پڑھنے کے بعد اب باغی تبدیلی محسوس کرتے تھے کہ ہم ٹھوس آئینی بنیادوں پر کھڑے ہیں اور اُن کی تشویش کم ہو گئی اُن کی تحریک یاس انگیز نہ تھی۔

کرۂ طعام میں جہاں ابھی انتخابات ہوئے تھے، ایک جھنڈا نصب کیا گیا جو ساری بستی سے نظر آتا تھا اور کافی دنوں تک وہاں لہراتا رہا۔ یہ سفید پرچم تھا جس پر سیاہ حاشیہ بنایا گیا تھا اور درمیان میں سُرخ اسپتالی کراس تھا۔ بین الاقوامی بحری اشاروں کے مطابق اس کا مطلب تھا:

"جہاز خطرے میں ہے! بچے اور عورتیں جہاز پر ہیں۔"

بارہ آدمیوں کو کمیشن کے لیے منتخب کیا گیا جس کا صدر کزنیٹسوف تھا۔ کمیشن کے ممبروں نے الگ الگ ذمہ داریاں سنبھال لیں اور حسب ذیل شعبے بنائے گئے:

احتجاج اور پروپیگنڈہ (لتھوانی کونیکس کے ماتحت، جسے نوریلسک میں بغاوت کے بعد بطور سزا یہاں منتقل کیا گیا تھا)
خدمات اور نظم و نسق
خوراک
داخلی تحفظ (گلیب سلوچینکوف)
فوج
تکنیکی (غالباً اس کیمپ کی حکومت کا سب سے ممتاز شعبہ)

سابق میجر میخیئیف کو عہدیداروں کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی ذمہ داری تفویض ہوئی۔ کمیشن کے اراکین میں چوروں کا ایک سرغنہ بھی شامل تھا اور وہ بھی کسی شعبے کا انچارج تھا کچھ خواتین بھی تھیں (بظاہر شاخوزسکایا جو ماہر اقتصادیات اور پارٹی کی رُکن تھی، اس کے بال سفید ہو چکے تھے یہ سوپرون تھی اور کارپیتھیا کی ایک بزرگ استانی تھی، نیز بیبا برشد سکایا)

لیکن کیا بغاوت کے بانی مبانی اس کمیشن میں داخل ہوئے؟ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شریک نہیں تھے مرکز بطور خاص یوکرینی مرکز (تمام کیمپ میں روسیوں کی تعداد ایک چوتھائی سے زائد نہ تھی) علی الاعلان اپنی

مدد دیں سمشار رہا۔ ایک یوکرینی پارٹیزن میخائل کیلر، جو ۱۹۴۱ء سے قبل جرمنوں کے خلاف اور پھر سوویٹ
معنوں کے خلاف نبرد آزما رہا تھا اور جس نے کینگر میں ایک مخبر کو سر عام ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا، دیگر کارکنان
کی جانب سے نشستوں میں بطور آبزرویٹر شرکت کرتا تھا۔

کمیشن عورتوں کے کیمپ ڈویژن میں علی الاعلان کام کرتا تھا لیکن شعبۂ فوج اپنی کمانڈچوکی منتقل کر
کے کیمپ ڈویژن نمبر ۲ کے غسل خانے میں لے گیا۔ شعبہ جات نے کام کرنا شروع کر دیا ابتدائی کچھ ایام بطور
خاص تگ و دو کے تھے، اتنی بڑی منصوبہ بندی اور انتظامات اور دیکھ بھال کرنی تھی۔

سب سے پہلے انہیں اپنی حالت مستحکم کرنی تھی (بیخییف اس امکان کے تحت کہ انہیں کچلنے کے
لیے لازماً فوجی کارروائی کی جائی گی، کسی بھی قسم کی دفاعی تنظیم کا مخالف تھا لیکن سلوچنکوف اور کنوپکس
نے اصرار کیا) جہاں اندرونی دیواروں میں راستے چھوڑے اور صاف کیے گئے تھے، وہاں کچی اینٹوں کے بڑے
بڑے انبار ہو گئے تھے۔ انہوں نے ان اینٹوں کا استعمال نگرانی کے تمام مقامات پر رکاوٹیں کھڑی کرنے
کے لیے کیا یہ وہ مقامات تھے جو آمد و رفت کے لیے مخصوص تھے اور تا حال جیلروں کے قبضے میں تھے
اور ان دروازوں کو کبھی بھی کسی تعزیری قوت کے اندر داخل ہونے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ سروس
یارڈ میں کانٹے دار تاروں کے بہت سے بنڈل پڑے ہوئے تھے اس سے انہوں نے الجھانے والے جال
بنائے اور انہیں امکانی خدشے کے مقامات پر لگا دیا۔ انہوں نے اس قسم کے بورڈ بھی لگائے: "خطرہ! سرنگیں!"

"ٹیکنیکل شعبوں کے اولیں دانشمندانہ منصوبوں میں سے ایک تھا۔ شعبے کا کام بیحد راز میں رکھا
جاتا تھا۔ جس سروس یارڈ پر وہ قابض تھے اس میں انہوں نے ایک پوشیدہ مقام مخصوص کر دیا تھا۔ اور
اُس کے ایک دروازے پر ایک کاسۂ سر اور دوسرے پر ہڈیوں کی صلیب کا نشان بنا ہوا تھا، نیز اس
پر درج تھا "ہائی ٹنشن ـــ ..... ووولٹ!" محض ان معدودے چند افراد کو اندر داخل ہونے کی اجازت
تھی جو وہاں کام کرتے تھے۔ اس طرح قیدیوں کو بھی علم نہ ہوتا تھا کہ ٹیکنیکل شعبہ کس کام میں معروف ہے۔

بہت جلد یہ افواہ عام ہو گئی کہ یہ کیمیاوی نوعیت کے خفیہ ہتھیار تیار کر رہا ہے چونکہ زیک اور افسران
دونوں بخوبی واقف تھے کہ کیمپ میں کتنے با صلاحیت انجینئر موجود ہیں اس لیے اس قسم کا واہمہ آسانی
سے ذہن نشین ہو سکتا تھا کہ وہ لوگ کچھ بھی کرنے پر قادر ہیں کوئی ایسا ہتھیار بھی بنا سکتے ہیں جس کا کہ
ماسکو والوں نے تصور بھی نہ کیا ہو۔ جہاں تک دو چار معمولی سرنگیں بنانے کا سوال تھا، سروس یارڈ میں
موجود کیمیاوی اشیاء کے استعمال سے انہیں کون روک سکتا تھا۔ لہٰذا "خطرہ! سرنگیں!" والے بورڈوں
کو سنجیدگی سے دیکھا جاتا تھا۔

ایک اور ہتھیار تیار کیا گیا۔ ہر جھونپڑے میں داخل ہونے کے دروازے پر کانچ کے سفوف کا بکس
(نامی گرامی والوں کی آنکھوں میں جھونکنے کے لیے!)

گروہ بالکل ویسے ہی رہنے دیے گئے جیسے کہ وہ تھے اور جھونپڑوں کو ٹکڑیوں کا نام دیا گیا نیز
ان ٹکڑیوں کے کمانڈر متعین کیے گئے جو شعبۂ فوج کی نگرانی میں کام کریں گے۔ نگرانی اور پہرے کی
تمام ڈیوٹیوں کا انچارج میخائل کیلر کو بنایا گیا۔ کمزور رکاوٹ والے مقامات پر ایک احتیاط کے ساتھ

تیار کردہ فہرست کے مطابق پہریدار تعینات کر دیے گئے جن کی تعداد میں بڑھا دی جاتی تھی۔ عورتوں کی موجودگی میں مرد پیٹھ نہیں دکھائیں گے اور عام طور پر زیادہ جوش کا مظاہرہ کریں گے۔ مردوں کی اس نفسیاتی خصوصیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے عورتوں اور مردوں کے مخلوط لکڑی کے دستے بنائے گئے۔ کیمپ میں موجود بہت سی تشیجی خور عورتوں کے علاوہ وہاں بطور خاص لیکری کی لڑکیاں تھیں جن کی عورتوں میں اکثریت تھی، بے شمار دلیر عورتیں نکلیں!

اس مرتبہ مالکوں کی کرم فرمائی اور اجازت کا انتظار کیے بغیر انہوں نے کھڑکیوں کی سلاخیں خود اکھاڑنا شروع کر دیں۔ پہلے دو دنوں تک اس سے قبل جب افسروں نے کیمپ کی بجلی اور پانی بند کرنے کا ارادہ کیا، کارخانوں میں خراد مشینیں ابھی چل رہی تھیں چنانچہ انہوں نے کھڑکیوں کی ان سلاخوں کو گھس کر اور ان کی نوکیں تیز کر کے بہت سارے پائیک تیار کر لیے۔ ان ابتدائی ایام میں لوہار اور خراد کرنے والے بغیر آرام کیے ہوئے متواتر کام کرتے تھے اور اسلحہ سازی میں مصروف رہتے تھے۔ چاقو، تبر اور خمیدہ تلواریں جو چوروں میں بہت مقبول تھیں۔ ان کے دستوں پر وہ گھنگرو اور چمڑا باندھ دیتے تھے۔ تمام لوگوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں نظر آتی تھیں۔

پکیٹ رات کو پہرہ دیتے ہوئے پائیک اپنے کاندھوں پر رکھ لیتے تھے، عورتوں کا دستہ بھی جیسے شب گزاری کے لیے مردوں کے کیمپ میں کمرے دیے گئے تھے تاکہ حملہ ہو تو وہ حملہ آوروں سے مقابلہ کرنے کے لیے فوری طور پر باہر آ سکیں (سادہ لوحی کے تحت یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ وہ قصائی عورتوں پر وار کرنے میں شرم محسوس کریں گے) اس دستے میں بھی پائیکوں کی کھنکھناہٹ سنائی دیتی تھی۔

اگر کیمپ میں بغاوت کی سخت اور صاف و شفاف ہوا نہ چل رہی ہوتی تو یہ سب کچھ ناممکن ہوتا مذاق اڑانے والے یا عیاش طبع بدمعاش سارا منصوبہ چوپٹ کر دیتے۔ ہمارے عہد میں یہ پائیک بچوں کے کھلونے تھے لیکن جن لوگوں کے لیے جیل۔ ان کے پیچھے جیل اور آگے جیل تھی، ان کے لیے یہ کھیل نہیں تھا۔ پائیک کھلونے تھے لیکن قسمت کی طرف سے یہی ملا تھا اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کا پہلا موقع۔ اس انقلاب کے موسم بہار کی صاف ہوا میں، جس میں رکاوٹوں پر عورتوں کی موجودگی ایک ہتھیار بن گئی تھی، مردوں اور عورتوں نے نہایت متانت کے ساتھ برتاؤ کیا اور وہ بڑی تمکنت کے ساتھ اپنے پائیکوں کی نوکیں آسمان کی طرف بلند کر کے چلتے تھے۔

اگر ان ایام میں کسی نے گندی عیاشانہ تقریبات کی امیدیں وابستہ کی تھیں تو وہ نیلی ٹوپیوں والے افسران تھے۔ ان کی منطق یہ تھی کہ ایک ہفتے تک تنہا چھوڑ دیے جانے پر قیدی بدکرداری کا شکار ہو جائیں گے۔ آبادی کے باشندوں کے سامنے وہ یہ تصویر پیش کرتے تھے کہ قیدی جوانی کے مزے لوٹنے کے لیے باغی ہو رہے ہیں (ظاہر ہے کہ ان کی خوشحال زندگی میں اور کسی چیز کی کمی نہ تھی) ش

افسروں کو قوی امید تھی کہ چور عورتوں کے ساتھ بدکاری شروع کر دیں گے، کہ سیاسی قیدی درمیان میں آئیں گے اور قتل عام کا آغاز ہو جائے گا لیکن ایک بار پھر ایم۔ وی۔ ڈی کے ماہرین نفسیات کا اندازہ غلط نکلا! اور ہم بذات خود حیرت کر سکتے ہیں۔ تمام شہادتیں متفق ہیں کہ چوروں نے شریفانہ برتاؤ کیا

لیکن شریفانہ ہمارے الفاظ میں اُن کے اپنے الفاظ میں نہیں۔ ادھر سیاسی قیدیوں اور خواتین نے مل کر خود اپنے برتاؤ سے ثابت کیا کہ وہ چوروں کو اپنا رفیق سمجھتے ہیں اور اُن پر اعتماد کرتے ہیں۔ ان رویوں کے نیچے کیا تھا اس سے ہمیں یہاں کوئی واسطہ نہیں۔ شاید چور یہ فراموش نہیں کر سکے کہ اس پہلے اتوار کو اُن کے ساتھ کس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے تھے۔

اگر ہم کینگر کی بغاوت کے استحکام کا کوئی بھی ذکر کریں گے تو اس کا رمز اس یکجہتی میں ہی مضمر تھا۔

چوروں نے اشیائے خوردنی کو بھی خورد بُرد نہیں کیا۔ یہ بات بھی اُن کے لیے، جوان کے بفطرت آشنا ہیں، کم حیرت ناک نہیں تھی۔ اگرچہ گوداموں میں کئی مہینوں کے لیے کافی سامانِ رسد تھا لیکن کمیشن نے مناسب غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ روٹی اور دوسری کھانے کی چیزیں حسب سابق ہی فراہم کی جائیں۔ دیانت داری شہریوں کا عوامی اشیائے خوردنی میں سے اپنے حق سے زیادہ کھانے اور پھر اس بربادی کے لیے جوابدہ ہونے کا خوف! جیسے کہ قیدیوں کو اتنے برسوں تک بھوکا رکھنے کے لیے حکومت کی کوئی خطا نہیں تھی؛ دوسری طرف (جیسا کہ ہیمنیف بیان کرتا ہے) جب کیمپ کے باہر قلت ہوئی تو کیمپ کی انتظامیہ کے سپلائی ڈپارٹمنٹ نے قیدیوں سے کچھ سامانِ رسد فراہم کرنے کو کہا۔ کچھ پھل ذخیرے میں زیادہ بہتر کام کرنے والے آزاد مزدوروں) کے لیے موجود تھے اور زیچوں نے یہ انتظامیہ کے سپرد کر دیے۔

کیمپ کے محاسبوں نے اشیائے خورد و نوش سابقہ معیار کے مطابق ہی مہیا کیں، باورچیلے والوں نے اسے لے کر تیار کیا اور نئے انقلابی ماحول میں اس میں سے چوری نہیں کی نہ چوروں کا کوئی پیامبر یہ پیغام لایا کہ "لوگوں کے لیے ال لاؤ" نمبرداروں کو بھی حق سے زیادہ کھانا نہیں دیا گیا اور اچانک معلوم ہوا کہ کھانے کے لیے سامان وافر مقدار میں ہے۔

اگر چور چیزیں (پہلے دوسرے مقامات کی مسروقہ اشیاء) فروخت کرتے تھے تو وہ اب اپنی سابقہ روش کے مطابق انہیں فوراً واپس چھین لینے کے لیے نہیں آئے۔ "اب حالات کچھ دوسرے ہی ہیں" انہوں نے کہا۔

مقامی مزدوروں کے "سپلائی ڈپارٹمنٹ" کے اسٹال کیمپ کے اندر تجارت کرتے رہے کارکنوں نے خزانچی (ایک آزاد خاتون) کے تحفظ کی ضمانت دی۔ اُسے دو لڑکیوں کے ساتھ کیمپ میں آنے اور گھومنے کی اجازت تھی جہاں سے وہ فروخت کرنے والوں سے جمع شدہ آمدنی (واؤچروں کی شکل میں) وصول کرتی تھی (لیکن واؤچر جلد ہی ختم ہو گئے اور افسر نے نئے واؤچر کیمپ میں نہیں آنے دیے)

کیمپ کے لیے ضروری سامان میں سے تین چیزیں سپلائی افسروں کی تحویل میں رہیں، بجلی، پانی اور ادویات۔ بے شک ادویات کی فراہمی پر اُن کا اختیار نہیں تھا۔ جہاں تک دواؤں کا تعلق تھا انہوں نے کیمپ کو چالیس دنوں میں ایک بھی پاؤڈر یا آیوڈین کی ایک بوند بھی فراہم نہیں کی: بجلی انہوں نے دو یا تین دن بعد کاٹ دی صرف پانی کی سپلائی میں دخل اندازی نہیں کی۔

ٹکنیکل ڈپارٹمنٹ نے روشنی کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا اُن کا پہلا خیال تو یہ تھا کہ پتلے تاروں میں ہک لگا کر انہیں بیرونی کیبل کے اوپر، جو کیمپ کی دیوار کے بہت نزدیک سے گزرتا تھا

طاقت کے ساتھ پھینکا جائے اور اس طرح انہوں نے کچھ دنوں تک بجلی چُرائی لیکن ہُک ڈھونڈھ لیے گئے اور انہیں کاٹ دیا گیا لیکن اس دوران ٹیکنیکل شعبے کو ایک ہوائی چکی کا جائزہ لے کر اُسے چھوڑ دینے اور سروس یارڈ میں (ایسے مقام پر جو برجیوں کی عقابی نگاہوں اور نیچے پرواز کرنے والے طیاروں کی نظر میں نہ آسکے) ایک پن بجلی اسٹیشن قائم کرنے کی مہلت مل گئی۔ ایک موٹر کو' جو احاطے ہی میں تھی' جنریٹر میں تبدیل کر لیا گیا اور انہوں نے کیمپ کے ٹیلی فون ایکسچینج' اسٹاف کے صدر دفتر کو روشنی اور ریڈیو ٹرانسمیٹر کو بجلی کی فراہمی شروع کر دی (جھونپڑیوں کو لکڑی کی کھپچیاں جلا کر روشن کیا گیا) یہ بے مثال پن بجلی اسٹیشن بغاوت کی ابتدا سے آخری دن تک کام کرتا رہا۔

بغاوت کے بالکل ابتدائی ایام میں جنرل کیمپ میں اس طرح آتے تھے جیسے وہی اس کے مالک ہوں۔ ٹھیک ہے کہ کزنیٹسوف اُن کے رعب میں نہیں آتا جب پہلی گفتگو کا آغاز ہوا تو اس نے اپنے آدمیوں کو مردہ گھر سے لاشیں لانے کا حکم دیا اور زور سے کہا "ٹوپیاں اُتار دو!" زیکوں نے مرحومین کی تعظیم میں اپنے سر برہنہ کر لیے اور مجبوراً جنرلوں کو بھی اپنی نوکیلی ٹوپیاں اپنے شکاروں کے سامنے اُتارنی پڑیں لیکن اولیت گلاگ کے جنرل بیچکوف کے حصے میں آئی ایک کمیشن کے انتخاب کی منظوری دینے کے بعد ("آپ بیک وقت سب سے بات نہیں کر سکتے") اُس نے کہا کہ پہلے مصالحتی گفتگو کرنے والے یہ بتائیں کہ اُن کے معاملات کی تفتیش کیسے کی گئی تھی (اور کزنیٹسوف نے بالتفصیل اور شاید بے قراری کے ساتھ اپنی داستان پیش کی) اور پھر یہ اصرار کیا کہ قیدی کھڑے ہو کر بولیں۔ جب کسی نے کہا کہ "قیدیوں کی مانگ ہے کہ"... بیچکوف نے مؤثر انداز میں فوراً پلٹ کر کہا "قیدی مانگ نہیں کر سکتے' وہ صرف درخواست کر سکتے ہیں۔" اور "قیدیوں کی درخواست ہے" والا فارمولا ہی رائج ہو گیا۔

بیچکوف نے قیدیوں کی درخواست کے جواب میں اشتراکیت کی تعمیر' اقتصادی صورتحال میں بے مثال ترقی اور چینی انقلاب کی کامیابیوں پر ایک تقریر کی۔ وہ لاآبالیانہ انداز میں اصل موضوع سے گریز کر گیا۔۔۔ دماغوں میں وہ کھونٹیاں ٹھونکتا جس سے ہم کمزور اور مخبوط الحواس ہو جاتے ہیں۔ وہ کیمپ میں اس بات کی شہادتیں دیکھنے آیا تھا کہ آتش گیر اسلحہ کا استعمال کہاں تک مناسب ہوگا (کچھ عرصے بعد وہ اعلان کر دیں گے کہ دراصل کیمپ میں گولیاں چلی ہی نہیں' یہ تو غنڈوں بدمعاشوں کی اختراپردازی ہے' نہ کسی کو زدوکوب کیا گیا) اُس نے اس امر پر اظہار حیرت کیا کہ وہ اُس سے "عورتوں اور مرد قیدیوں کے الگ الگ قیامگاہوں میں رہنے کے احکامات" کی خلاف ورزی کرنے پر اصرار کر رہے ہیں (وہ اپنے ضابطوں کا تذکرہ یوں کرتے ہیں جیسے وہ روز ازل سے بنے ہیں اور یوم قیامت تک نافذ رہیں گے!)

کچھ عرصے بعد دوسرے اور بھی اہم جنرل ڈگلس طیارے سے آ گئے۔ ڈولگیخ (کہا جاتا ہے کہ اُس وقت وہ گلاگ کا سربراہ تھا) اور ییگوروف (سوویٹ یونین کے داخلی امور کا نائب وزیر) کھانے کے ہال میں ایک جلسہ کیا گیا اور تقریباً دو ہزار قیدی جمع ہوئے۔ کزنیٹسوف نے حکم دیا' "ازراہِ کرم خاموش رہیے۔ سب کھڑے ہو جائیں ہوشیار!" اور تنظیم کے ساتھ جنرلوں کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی جب کہ وہ خود اپنے نچلے عہدے کے مطابق ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ (سلوچینکوف نے ایک دوسرے قسم کا رویہ اختیار کیا جب ایک جنرل نے

برسبیل تذکرہ موجودہ دشمنوں کا ذکر کیا تو سلوچیکوف نے واضح اور بلند آواز میں جواب دیا۔۔۔ "آپ جیسے کتنے ہی افراد دشمن ثابت ہوئے ہیں؛ یاگوڈا عوام کا دشمن تھا، یزہوف عوام کا دشمن تھا، بیریا عوام کا دشمن تھا، ہمیں کیسے معلوم ہو کہ جنرل گرگلوف اُن سے بہتر ہے؟")

میکیئیف نے، جیسا کہ اُس کی یادداشتوں سے معلوم ہوتا ہے، ایک معاہدے کا مسودہ تیار کیا جس میں افسروں نے وعدہ کیا کہ وہ لوگوں کا تبادلہ دوسرے کیمپوں میں نہیں کریں گے یا دیگر ذرائع سے انتقام نہیں لیں گے اور پوری جانچ کرائیں گے اور زیکوں نے فوراً کام پر لوٹنا منظور کر لیا لیکن جب وہ اور اُس کے حمایتی جھونپڑوں میں گھوم گھوم کر اس مسودے کی منظوری کے لیے قیدیوں سے کہنے لگے تب اُن کا مذاق گنجے سر والے نابالغ کمیونسٹ" "سرکار کے دلال" "چیکا کے ایجنٹ" کہہ کر اُڑایا گیا اور اُنہیں معلوم ہوا کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان علیحدگی برقرار رکھنے پر زیک کسی بھی طرح رضامند نہ ہوں گے (میکیئیف نے غصے میں بھر کر اپنے مخالفین سے کہا، "صرف اس لیے کہ تمہارا ہاتھ کسی لڑکی کی چھاتیوں پر رہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ سوویٹ اقتدار ختم ہو چکا ہے؟ خواہ کچھ بھی ہو سوویٹ حکومت اپنے راستے پر گامزن رہے گی")

دن گزرتے گئے۔ وہ اپنی آنکھیں کیمپ کے میدان سے کبھی نہیں ہٹاتے تھے۔ برجیوں کے فوجیوں کی نگاہیں اور وارڈروں کی نظریں بھی (چونکہ وارڈر زیکوں کے چہروں سے واقف تھے اس لیے سمجھا جاتا تھا کہ وہ اُنہیں شناخت کر سکیں گے کہ کس نے کیا کیا ہے) اور ہوائی والوں کی نگاہیں بھی اُن پر شاید کیمرے تھے)۔ جنرلوں کو افسوس کے ساتھ یہ نتیجہ نکالنا پڑا کہ وہاں کوئی قتل عام نہیں ہوا۔ بڑے پیمانے پر قتل و غارتگری نہیں ہوئی، تشدد کی وارداتیں نہیں رونما ہوئیں، کہ کیمپ از خود ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہو گیا اور نہ یہاں مدافعت کے لیے مزید فوج کی ضرورت نہیں ہے۔

کیمپ مستقل مزاجی کے ساتھ ڈٹا رہا اور مصالحتی گفتگو کا رُخ بدل گیا۔ نیلے فیتے والے افراد الگ الگ ٹولیوں میں سمجھانے بجھانے کے لیے کیمپ میں آتے رہے۔ اُن سب کو اندر آنے کی اجازت دی گئی لیکن اُنہیں سفید جھنڈے لہرانے پڑتے تھے اور سروس یارڈ کے بیرونی پھاٹک (جو اب صدر پھاٹک تھا) نیز رکاوٹوں کی جگہ اُنہیں جامہ تلاشی دینی پڑتی تھی جس میں کچھ یوکرینی لڑکیاں جنرلوں کی جیبوں پر ہاتھ مار کر یہ دیکھتی تھیں کہ ان میں کوئی پستول یا دستی بم تو نہیں ہے۔ اس کے بدلے میں باغی اراکین اُن کی جسمانی حفاظت کی ضمانت دیتے تھے۔۔۔۔

انہوں نے جنرلوں کو، جہاں جہاں اجازت تھی (سروس یارڈ کے خفیہ علاقے کے آس پاس نہیں) گشت کرایا، انہیں قیدیوں سے بات چیت کرنے کا موقع دیا اور اُن کی سہولت کے لیے کیمپ ڈویژنوں میں بڑے بڑے جلسے کرائے۔ چمکدار پٹیوں والے افسر اس طرح اپنی نشستوں پر بیٹھے تھے جیسے پہلے بیٹھا کرتے تھے معلوم ہوتا تھا کہیں کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔

قیدیوں نے لاؤڈ اسپیکر نصب کر دیے تھے لیکن بولنا بہت مشکل تھا۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ جو بھی قیدی بولتا تھا وہ دراصل اپنی مستقبل کی سزا کا بندوبست کرتا تھا بلکہ اس باعث بھی کہ اپنی زندگی کے تجربات اور سچائی سے متعلق اپنے نظریات میں سفید بالوں اور سیاہ بالوں والے لوگوں میں بڑے اختلافات تھے۔

اور ایسا کوئی وسیلہ نہ تھا جس سے اُن بلبلی خوشحال لاشوں کے اُن چمکدار تربوز جیسے سروں کے اندر داخلہ مل سکے اور وہاں اُن کے باطن میں کچھ روشنی ڈالی جاسکے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ لینن گراڈ میں ایک معمر مزدور سے، جو کمیونسٹ تھا اور جس نے انقلاب میں حصہ لیا تھا، بیحد خفا ہو گئے تھے۔ اُس نے اُن سے پوچھا کہ کیا اس حالت میں اشتراکیت کے استحکام کی کوئی گنجائش ہے جب افسرانِ کیمپ کے کارخانوں کی پیداوار پر فربہ ہو گئے ہیں، جب وہ سپرٹنگ پلانٹ سے سیسہ سرقہ کروا لیتے ہیں اور چوری سے شکار کرنے کے لیے اُن کی گولیاں تیار کراتے ہیں، جب قیدیوں کو افسروں کی سبزی کے باغیچوں میں کھدائی کرنی پڑتی ہے، جب کیمپ کمانڈر کی آمد کے وقت غسلخانے میں قالین بچھائے جاتے ہیں اور اُن کے غسل کے دوران آرکسٹرا بجتا ہے۔

اس غیر منظم ہاؤ ہو کو ختم کرنے کے لیے بعض اوقات گفتگو نے بلند ترین سرکاری سطح پر براہِ راست مصالحتی بات چیت کی صورت اختیار کی۔ جون میں کسی تاریخ کو ایک لمبی ڈنر کی ٹیبل عورتوں کے کیمپ میں آراستہ کی گئی اور سنہرے فیتوں والے اُس کے ایک طرف بنچ پر بیٹھ گئے جب کہ وہ ٹامی گن والے جنہیں اُن کے ہمراہ اندر آنے کی اجازت دی گئی تھی باڈی گارڈوں کی مانند اُن کے پیچھے کھڑے تھے۔ میز کی دوسری طرف قیدی کمیشن کے اراکین بیٹھے اور اُن کے باڈی گارڈ بھی تھے جو بڑی تمکنت کے ساتھ تلواروں، پائیکوں اور غلیلوں سے لیس ہو کر وہاں ایستادہ تھے۔ پس منظر میں چپیں یوں سننے اور اُن پر چہ میگوئیاں کرنے کے لیے قیدیوں کی بھیڑ بھی جمع ہو گئی تھی (مہمانوں کے لیے ناشتے سے بھی پہلو تہی نہیں کی گئی تھی سروس یارڈ کے ہاٹ ہاؤسوں سے تازہ ککڑیاں اور باورچیخانے سے کواس (ایک قسم کی بیئر یا ہلکی شراب) فراہم کی گئی تھی۔ سنہرے فیتے والے بے تکلفی کے ساتھ ککڑیاں کتر رہے تھے)

باغی پہلے دو دنوں تک اپنے مطالبات (یا التماس) کے بارے میں متفق الرائے ہو گئے تھے اور اب انہوں نے بار بار مانگ کی:

- ایونجلسٹ کے قاتلوں کو سزا دی جائے۔
- سروس یارڈ میں اتوار کی رات کو ہونے والے نقصانات جانی کے لیے ذمہ دار افراد کو سزا دی جائے۔
- عورتوں کے ساتھ زیادتی کرنے والوں کو سزا دی جائے۔
- اُن ساتھیوں کو واپس لایا جائے جنہیں ہڑتال کرنے کے جرم میں غیر قانونی طور پر بند جیلوں میں بھیج دیا گیا ہے۔
- نمبروں کی پٹیاں، کھڑکیوں کی سلاخیں اور جھونپڑوں کے دروازوں کے قفل ہٹائے جائیں۔
- کیمپ ڈیویژنوں کے درمیان کی دیواریں دوبارہ نہ اُٹھائی جائیں۔
- آزاد مزدوروں کی طرح کام دن کے آٹھ گھنٹے ہونا چاہیے۔
- کام کی اُجرت بڑھائی جائے (اس میں آزاد مزدوروں کے ساتھ برابر کا کوئی سوال نہیں تھا)
- رشتے داروں سے مراسلت اور اُن کو ملاقات کے لیے اندر آنے پر کوئی پابندی نہ ہو۔
- قیدیوں کے معاملات پر نظر ثانی کی جائے۔

———×———

اگرچہ ان مطالبات میں غیر آئینی کوئی بات نہ تھی جس سے حکومت کی اساس کو خطرہ پیدا ہو (سچ پوچھیے تو بہت سے مطالبات تو سابقہ روایت کی تجدید کے لیے تھے) لیکن افسروں کے لیے ان میں سے چھوٹی سی چھوٹی مانگ کو بھی تسلیم کرنا ممکن تھا کیونکہ فوجی ٹوپی لگائے اور چھوٹے ترشے ہوئے بالوں اور موٹی گردنوں سے آراستہ یہ گنجی کھوپڑیاں فراموش کر بیٹھی تھیں کہ کسی غلطی یا خامی کو کیسے تسلیم کیا جاتا ہے اگر سچائی افسرانِ بالا کے خفیہ احکامات کے بجائے عام لوگوں کے ہونٹوں پر ظاہر ہو تو وہ اسے پہچان نہیں پاتے تھے اور اُس سے دُور بھاگتے تھے۔

پھر بھی آٹھ ہزار لوگوں کے حصار میں پڑے اور اڑے رہنے سے جنرلوں کے نام پر دھبّہ آتا تھا اور اس طرح ترقی کے امکانات ضائع ہوتے تھے اس لیے اُنہوں نے وعدے کیے۔ اُنہوں وعدہ کیا کہ تقریبًا تمام مطالبات تسلیم کر لیے جائیں گے انہوں نے (اپنی بات کو زیادہ لائقِ اعتماد بنانے کے لیے) کہا کہ عورتوں کے کیمپ کھلے چھوڑنا مشکل ہے اور یہ خلافِ ضابطہ ہے (وہ بھول گئے کہ اصلاحی مشقتی کیمپوں میں بیس سال سے اسی قسم کا انتظام ہے) لیکن وہ یعنی عورتیں خواہشمند ہوں تو ملاقات کے دن طے کر سکتی ہیں۔ یہ مانگ کہ (گولی چلانے کے حالات کی تفتیش والا) جانچ کمیشن آ کر کیمپ میں کارروائی کا آغاز کرے، جنرلوں نے غیر متوقع طور پر منظور کر لی (لیکن سلوچینکوف اُن کا عندیہ بھانپ گیا اور اس نے اس کا نام بھی سننے سے انکار کر دیا مخبر اپنے بیانات دیتے ہوئے کیمپ میں ہونے والے واقعات کے تمام راز افشا کر دیں گے۔) معاملات پر نظرِ ثانی؟ بلاشبہ، قیدیوں کے ہر کیس پر نظرِ ثانی کی جائے گی لیکن اس کے لیے زیکوں کو صبر و ضبط سے کام لینا ہوگا۔ ایک بات جس کے لیے کسی قسم کے صبر کی ضرورت نہیں تھی یہ کہ قیدیوں کو فوراً چلے جانا چاہیے کام کرنے کے لیے! کام کرنے کے لیے! کام کرنے کے لیے!

لیکن زیک اب تک اس چال کو سمجھ چکے تھے: انہیں کالموں میں بانٹ دینا، سنگین کی نوک پر انہیں زمین پر گرا دینا — اور سرغنوں کو گرفتار کرنا!

نہیں، انہوں نے اسٹیج سے اور میز پر بآوازِ بلند جواب دیا۔ نہیں! ہجوم سے آوازیں اُٹھیں اسٹیپلاگ کی انتظامیہ کی یہ اشتعال انگیز کارروائی ہے۔ ہمیں اسٹیپلاگ کے عہدیداروں پر اعتماد نہیں ہے! ہم ایم۔ وی۔ ڈی پر بھروسہ نہیں کرتے!

"ایم۔ وی۔ ڈی۔ پر بھی اعتماد نہیں کرتے"؟ حکومت کے خلاف یہ باغیانہ انداز دیکھ کر نائب وزیر کو پسینہ آ گیا۔ "تم میں ایم۔ وی۔ ڈی کے تئیں یہ نفرت کس نے پیدا کر دی ہے۔ بتاؤ؟"

ایک پیچیدہ معمّہ۔ "ہمارے پاس مرکزی کمیٹی کی مجلسِ صدارت کا کوئی ممبر بھیجیے! مجلسِ صدارت کا کوئی رُکن! اس کے بعد ہم آپ پر بھروسہ کر سکتے ہیں"! زیکوں نے چیخ کر کہا۔

"غور کر لو" جنرلوں نے خوف دلایا "اس طرح تم اپنا ہی نقصان کرو گے"!

اس پر کزنیٹسوف کھڑا ہو گیا اُس نے پرسکون انداز میں بچے تلے الفاظ استعمال کرتے ہوئے پر وقار لہجے میں کہا:

"اگر آپ لوگ اسلحہ کے ساتھ کیمپ میں داخل ہوئے" اُس نے تنبیہہ کی "تو یہ نہ بھولیے کہ یہاں موجود لوگوں میں سے نصف ایسے ہیں جنہوں نے برلن پر قبضہ کرنے کی مہم میں حصّہ لیا تھا، وہ آپ کے ہتھیاروں سے بھی نبرد آزما ہو سکتے ہیں۔"

کاپیتون کزنشوف! کینگر کی بغاوت پر مستقبل کا کوئی مورّخ لکھتے ہوئے ہمیں اس آدمی کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے میں معاونت کرے گا! اس کے کیا خیالات و نظریات تھے؟ وہ اپنی قید کے بارے میں کیا سوچتا تھا؟ اُس کے خیال میں اُس کی اپیل کس منزل تک پہنچی ہو گی؟ جب اُس نے نظرِ ثانی کی درخواست کی تھی اس وقت سے کتنے دن ہو گئے؟ اگر رہائی کا (اور میرا قیاس ہے کہ آبادکاری کا بھی) فرمان ماسکو سے بغاوت کے ایّام میں ہی آ گیا؟ باغی کیمپ کو اتنے اچھے قاعدے ضابطے میں رکھنے کے لیے اُس کا طنطنہ۔ کیا یہ ایک فوجی کی پیشہ وارانہ تمکنت کی نمائش تھی؟ کیا اُس نے اپنے آپ کو بغاوت کے بلند مقام پر اس لیے فائز کر لیا تھا کہ وہ اسے پسند آ گئی تھی (میں اس تجزیے کو درست نہیں سمجھتا) یا پھر اپنی قاعدانہ صلاحیتوں سے باخبر ہو کر اس نے اسے قابو میں رکھنے کا، سیلاب کو لگام دے کر اُسے مناسب راستے پر لگانے کے لیے اپنے تجربہ کار مستقل مزاج ساتھیوں کو اپنے مالکوں کے قدموں پر جھکا دینے کے لیے یہ قیادت سنبھال لی تھی؟ (میرا یہی خیال ہے) نشستوں اور مباحثوں میں اور کم اہمیت کے لوگوں کے درمیان تعزیری کارروائی کے انچارج لوگوں سے جو جی میں آئے کہنے اور اُن کی باتیں سُننے کے مواقع اُسے دستیاب تھے۔ مثال کے طور پر جون میں ایک موقع پر چالاک اور مکار ماکوسیان کو کمیشن کی جانب سے ایک پیغام دے کر کیمپ سے باہر بھیجا گیا۔ کیا ایسے مواقع پر کزنشوف اپنے مفادات کو پیشِ نظر رکھتا تھا؟ شاید نہیں۔ اُس کی حیثیت پُر وقار اور آزاد خیال انسان کی سی رہی ہو گی۔

دو باڈی گارڈ۔۔۔ لمبے چوڑے دو یوکرینی لڑکے۔۔۔ اپنی ٹوپیوں میں چاقو لگائے ہوئے ہر وقت کزنشوف کے ساتھ رہتے تھے۔

اُس کی حفاظت کے لیے؟ انتقام لینے کے لیے؟

(مرکیٹ کا دعویٰ ہے کہ بغاوت کے ایّام میں کزنشوف نے بھی ایک عارضی بیوی رکھ لی تھی جو یوکرینی قوم پرست عورت تھی)

گلیب سلوچینکوف تقریباً تیس برس کا تھا اس کا مطلب یہ ہے کہ جب، جرمنوں نے اُسے گرفتار کیا تھا اس وقت اس کی عمر تقریباً اُنیس سال کی رہی ہو گی۔ کزنشوف کی مانند وہ بھی اب اپنی پُرانی وردی زیب تن کر کے گھومتا تھا جو پہلے گودام میں جمع تھی اور سابق فوجی کا کردار بے حد دلچسپ کردار ادا کرتا تھا۔ اُس کے پیر میں خفیف سا لنگ تھا لیکن چلنے کے انداز میں چھپ جاتا تھا۔

مصالحتی گفت و شنید میں وہ اتنی باریک بینی سے کام لیتا تھا کہ بات کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا عہدیداران کا خیال تھا کہ تمام پُرانے "نابالغ مجرموں" کو کیمپ سے باہر بلا لیا جائے (اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے جیل بھیجے جانے والے لڑکے جن میں سے کچھ اب بیس اکیس سال کے ہو گئے تھے) اور انہیں رہا کر دیا جائے۔ ممکن ہے اس میں کوئی چال نہ رہی ہو۔۔۔ ان دنوں وہ اسی قسم کے قیدیوں کو ملک گیر

پیمانے پر رہا کر رہے تھے یا اُن کی سزاؤں میں تخفیف کر رہے تھے. سلوچینکوف کا جواب تھا:

"کیا آپ نے نابالغوں سے دریافت کیا ہے کہ وہ ایک کیمپ سے دوسرے میں منتقل ہونا چاہتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو منجدھار میں چھوڑ دینا چاہتے ہیں"؟ (کمیشن میں بھی اُس نے اصرار کیا کہ "یہ لڑکے ہمارے لیے پہریداری کرتے ہیں! انہیں ہم آپ کے سپرد نہیں کر سکتے!" سچ پوچھیے تو یہی وہ ناگفتنی سبب تھا جس کے تحت جنرل کینگر میں بغاوت کے زمانے میں ان لڑکوں کو رہا کرنا چاہتے تھے: اور جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے وہ انہیں کیمپ سے باہر کوٹھریوں میں بند کر دیتے) پھر بھی قانون پسند میکیٹیف پہلے کے لڑکوں کو "رہائی ٹریبونل" کے لیے پکڑتا رہا اور وہ شہادت دیتا ہے کہ جن ۴۰۹ افراد کو رہا کیا جا سکتا تھا ان میں سے وہ صرف تیرہ[۱۳] ایسے لڑکے جمع کر سکا جو وہاں سے جانے پر رضامند تھے. اگر ہم افسروں کے ساتھ مرکٹیف کی ہمدردی اور بغاوت کی مخالفت کی بات کو ملحوظ رکھیں تو اُس کی شہادت حیرتناک ہے: چار سو لڑکوں نے جو جوانی کی موج میں تھے اور جن میں سے بیشتر سیاسی مزاج کے نہ تھے' نہ صرف آزادی بلکہ غلامی سے نجات پانے سے بھی انکار کر دیا! اور یہ بدقسمت بغاوت کرنے والوں کے ساتھ ڈٹے رہے....

اس دھمکی پر کہ بغاوت کو فرو کرنے کے لیے فوج کا استعمال کیا جائے گا، سلوچینکوف نے جواب دیا؛ "انہیں اندر بھیجو! جتنی جی چاہے ٹامی گنیں روانہ کرو! ہم اُن کی آنکھوں میں کانچ کا سفوف جھونکیں گے اور اُن کی بندوقیں چھین لیں گے! ہم تمہارے کینگر کے فوجیوں کو مزا چکھا دیں گے! تمہارے ٹیڑھی ٹانگوں والے افسروں کا ہم کارا گنڈا تک پیچھا کریں گے' ہم تمہاری پشت پر سوار ہو کر کارا گنڈا جائیں گے! اور ایک مرتبہ وہاں پہنچ گئے تو ہمارے چاروں طرف دوست ہوں گے!"

اس کے بارے میں اور شہادتیں ہیں جو معتبر معلوم ہوتی ہیں" جو کبھی پیچھے ہٹے گا اُس کے سینے میں یہ ہوگا:" اپنا شکاری چاقو ہوا میں لہراتے ہوئے اُس نے ایک جھونپڑے میں اعلان کیا" جو بھی کیمپ کی حفاظت کے لیے باہر نہیں آتا وہ یہ چاقو کھائے گا" بالکل فوجی افسروں کا زمانۂ جنگ والا رویّہ.

صدیوں سے چلے آنے والے سرکاروں کے ضوابط کے مطابق نوزائیدہ کیمپ سرکار بھی ایک محکمۂ دفاع کے بغیر اپنے وجود کو برقرار رکھنے سے قاصر تھی اور سلوچینکوف اس محکمے کا سربراہ تھا (اور عورتوں کے علاقے میں واقع انسر تحفظ کے کمرے میں بیٹھتا تھا) چونکہ بیرونی طاقتوں پر فتح نہیں پائی جا سکتی تھی اس لیے سلوچینکوف نے سمجھ لیا تھا کہ اس کے عہدے کا مطلب ہے یقینی پھانسی. بغاوت کے دوران اس نے لوگوں سے کہا کہ افسروں نے مجھ سے خفیہ طور پر اصرار کیا ہے کہ میں فرقہ وارانہ فسادات کروا دوں (سنہری پٹیوں والے اس کی بڑی اُمید رکھتے تھے) اور اس طرح فوجی دستوں کے لیے کیمپ میں داخل ہونے کا ایک معقول حیلہ فراہم کروں. اس کے بدلے میں افسروں نے سلوچینکوف کی جان بخشی کا وعدہ کیا لیکن اس نے اُن کی تجویز ٹھکرا دی (دوسروں کے پاس کیا تجاویز بھجوائی گئی تھیں انہوں نے ہمیں نہیں بتایا) علاوہ ازیں جب کیمپ میں یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ اجتماعی طور پر یہودیوں کا قتل ہونے والا ہے تو سلوچینکوف نے تنبیہہ کی کہ افواہیں پھیلانے والوں میں تازیانے لگائے جائیں چنانچہ افواہ

سر د پڑ گئی۔

سلوچینکوف اور حامیانِ حکومت کے درمیان تصادم ناگزیر تھا اور یہ ہوا۔ یہ کہنا چاہیے کہ ان تمام برسوں میں سارے اسپیشل کیمپوں میں آرتھوڈاکس قدامت پسند یا کٹر عقیدے والے سوویٹ شہری ایک دوسرے سے مشورہ کیے بغیر مخبروں کے قتلِ عام کی' اپنے حقوق کے لیے نبرد آزما ہونے کی اور قیدیوں کی جد و جہد کی اتفاقِ رائے سے مذمت کرتے تھے۔ ضرورت نہیں کہ اس کا محرک مریضانہ جذبات کو قرار دیا جائے (اگرچہ کئی آرتھوڈاکس افسروں کے لیے کام کرتے کرتے تنگ آ چکے تھے) کیونکہ اس کی وضاحت ہم اُن کے نظریات و خیالات سے کر سکتے ہیں۔ وہ جبر و تشدد کی تمام شکلوں کو خواہ وہ وسیع پیمانے پر استعمال میں آ رہی ہوں' تسلیم کرتے تھے بشرطیکہ وہ اُوپر سے نازل ہوئی ہوں۔ وہ انہیں پرولتاریوں کی تانا شاہی کا ایک اظہار سمجھتے تھے۔ اس قسم کی ہنگامی اور اشتعال کے تحت کی جانے والی کارروائیوں کو بھی۔ اگر وہ نیچے سے شروع کی جائیں تو غنڈہ گردی کا نام دیا جاتا تھا اور بینڈرزم کو تو اور بھی مذموم سمجھا جاتا تھا (حکومت نوازوں میں آپ کو ایسا ایک فرد بھی نہیں ملے گا جو یہ تسلیم کرتا ہو کہ یوکرین کو روس سے الگ ہونے کا حق حاصل ہے کیونکہ یہ عمل بورژوائی قوم پرستی ہو گا) کٹورزانے کا غلام مزدور بننے سے انکار' اُن کا کھڑکیوں کی سلاخوں اور گولی مارنے کی وارداتوں پر غم و غصہ' بزدل کمیونسٹوں کو جو جیل میں تھے' بے حوصلہ اور بے ہمت بناتا تھا۔

دیگر مقامات کی مانند کینگر میں حکومت دوستوں یا بے عملوں کا ایک گروہ تھا (جیز کن' اپفیانوگ تلالائیفسکی اور پوشیدہ طور پر ادوئیف) لیکن زیادہ نام ہمارے پاس نہیں ہیں۔ ایک حیلہ ساز بھی تھا جو لس ہلنے سے اسپتال میں کئی سال گزار چکا تھا کہ اُس کے پاؤں میں شدید رعشہ ہے۔ جد و جہد کے دانشمندانہ طریقے جس کے ایک مثال پیش کی گئی' اپنانے کی اجازت مذکورہ گروہ میں عام تھی۔ خود کمیشن میں میکیئیف اُس کی روشن مثال تھا۔ وہ سب لوگ ابتدا سے برائی کر رہے تھے: "تم لوگوں کو یہ شروع ہی نہ کرنا چاہیے تھا"۔ جب دیواروں کے نیچے کے راستے بند کر دیے گئے تو انہوں نے کہا کہ وہاں سرنگیں بنانا ہی غلط تھا یہ سب کچھ صرف بینڈرسٹ غلاظت کا ایجاد کردہ ستم ہے اور اب صرف یہ کرنا چاہیے کہ جلد از جلد پیچھے ہٹ جائیں۔ (جو سولہ آدمی ہلاک ہوئے تھے وہ اُن کے کیمپ کے تو تھے نہیں اور ایونجلسٹ کا ماتم کرنا محض حماقت ہے) اور اُن کا تمام غصہ اور واہمات میکیئیف کے نوٹس سے اُبلے پڑتے ہیں جو کچھ اور جو کوئی نظر آ رہا ہے وہ سب برا ہے اور ہر طرف خطرات ہیں۔ یہ سب یا تو افسروں کی طرف سے دی جانے والی تازہ سزا کا حصہ ہے یا پھر بینڈرسٹوں کی بغلی چھری ہے۔ "وہ ہم سب کو اپنے لوہے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے خائف کرنا چاہتے ہیں اور ہمیں موت کے منہ میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔" میکیئیف کیمپ کی بغاوت کو جتنے میں بینڈرسٹوں کا ایک "خونی تماشا" ایک "حجۃ یا تحریک" "غیر پیشہ ورانہ ڈرامہ" اور ان سب سے زیادہ "شادی کی تقریب" کہتا ہے کہ اُس کی نگاہ میں قائدین کی توقعات اور مقاصد "عیاشی" کام چوری اور قیامت (احتساب کا دن) کو التوا میں ڈالنے کی کوشش کے مترادف تھے (جو حساب چکاتا ہو وہ اُسے خاموشی کے ساتھ منصفانہ تسلیم کر لیتا ہے)

یہ بیان چھٹی دہائی میں کیمپوں میں جاری تحریک آزادی سے بے اعتنائی برتنے والوں کا رویّہ بالکل صحیح انداز میں پیش کرتا ہے۔ جہاں میکیئیف بہت محتاط تھا اور اصل میں تو بغاوت کے قائدین میں سے تھا وہیں طالائی نسکی ایسی شکایات کھلے طور پر کرتا تھا اور سلوچینکوف کے شعبۂ تحفظِ داخلی نے اُسے باغیوں کے خلاف ہلچل کرنے پر کینگر قید خانے کی ایک کوٹھری میں بند کر دیا تھا!

ہاں واقعی ایسا ہوا تھا۔ بغاوت کرنے والوں نے جیل کے دروازے کھول دیے تھے لیکن اپنی ہی ایک جیل قائم کرنی پڑی۔ وہی قدیم، بہت قدیم طنزیہ کہانی۔ سچ ہے کہ اس میں مختلف وجوہ سے (عام طور پر افسروں کے ساتھ تعلقات کے باعث) صرف چار اشخاص قید کیے گئے تھے اور ان میں سے کسی کو بھی گولی نہیں ماری گئی تھی (اس کی جگہ انہیں بہترین چیلے تراش کر افسران کے سپرد کر دیا گیا تھا)

اس واقعے کو چھوڑ کر 'قید خانہ' چوتھی دہائی میں تعمیر کردہ ایک خصوصی تاریک اور بے رونق پُرانا مقام عام لوگوں کے دیکھنے کے لیے کھول دیا گیا اس میں بغیر کھڑکیوں کی تنہائی کی کوٹھریاں تھیں جن میں روشنی کے لیے صرف ایک چھوٹا سا جھروکہ تھا؛ بغیر پایوں کی چارپائی؛ سیمنٹ کے فرش پر محض لکڑی کے تختے جس کا مطلب ہے نیچے براہِ راست فرش پر؛ گھٹے کے راتب کھلانے جیسا ایک بدشکل مٹی کا برتن۔

اپنے ساتھی قیدیوں کو اس مقام کا دیدار کرانے کے لیے شعبۂ احتجاج نے انتظام کیا۔ یہ قیدی کبھی اس کے اندر نہیں رہے تھے اور نہ شاید کبھی رہیں گے۔ وہ باہر سے آنے والے جنرلوں کو اسے دکھلانے کے لیے لے گئے (جو کوئی خاص تاثر نہ لے سکے) انہوں نے یہ بھی کہا کہ بستی کے آزاد باشندوں میں سے تماش بینوں کو بھی اسے دیکھنے کا موقع دیا جائے۔ جب قیدی کام پر نہیں جا رہے تھے تو تعمیرگاہوں پر اُن کا بھی کوئی کام نہیں تھا۔ جنرلوں نے واقعی ایک پارٹی بھیج دی، عام مزدوروں کی تو نہیں البتہ کچھ چنیدہ ملازمین کی جنہیں غصّہ ہونے کا کوئی سبب نظر نہیں آیا۔

جواباً افسروں نے باہر روڈنیک (اسٹیپلاگ کے ڈویژن نمبر ا اور ۲) پر تفریح کے لیے لے جانے کی تجویز پیش کی چونکہ کیمپ میں پہنچنے والی افواہوں کے مطابق وہاں بھی فسادات کا آغاز ہو گیا تھا (حُسنِ اتفاق یہ تھا کہ اپنی اپنی مناسب وجوہ کے تحت غلام اور غلاموں کے آقا دونوں ہی "بغاوت" یا "انقلاب" جیسے الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے تھے اور اس کی جگہ وہ پس و پیش کے ساتھ "ہارس پلے" (بھونڈا کھیل) کا استعمال کرتے تھے) نمائندگان وہاں گئے اور دیکھ کر آئے کہ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسے پہلے تھا یعنی قیدی وہاں کام پر جا رہے تھے۔

اُن کی توقعات کا دارومدار بیشتر اس بات پر تھا کہ ہماری طرح کی احتجاجی ہڑتالیں جگہ جگہ پھیل جائیں۔ اب نمائندگان ایک احساسِ محرومی کے ساتھ واپس لوٹے۔

(دراصل افسران انہیں وہاں عین وقت پہ لے گئے تھے۔ روڈنیک میں یقیناً جوش و خروش تھا۔ قیدیوں نے آزاد کارکنوں کی زبانی کینگر کی بغاوت کے بارے میں انواع و اقسام کی سچی اور فرضی باتیں سُنی تھیں۔ اُسی مہینے (جون) میں ایسا ہوا کہ عدالتی نظرِثانی کے لیے پیش کردہ بہت سی اپیلیں بیک وقت نامنظور ہو گئیں پھر کوئی سرپھرا لڑکا ممنوعہ علاقے میں زخمی ہو گیا اور وہاں بھی ہڑتال کا آغاز ہو گیا۔ کیمپ ڈویژنوں کے

درمیانی پھاٹک توڑ ڈالے گئے اور قیدی مرکزی سڑک پر نکل آئے۔ برجیوں پر مشین گنیں نظر آنے لگیں۔ کسی نے ایک بورڈ پر سوویٹ مخالف نعرہ لکھ کر آویزاں کر دیا اور یہ تنظیمی نعرہ بھی اس میں شامل تھا،" آزادی یا موت"! لیکن اسے اتار دیا گیا اور اس کی جگہ جائز مطالبات کی فہرست اور یہ وعدہ بھی لکھا گیا کہ نانگیں پوری ہو جانے پر کام بند ہو جانے کی وجہ سے جو نقصان ہو رہا ہے اس کی تلافی بھی کر دی جائے گی۔ لاریاں گودام سے آٹا لینے آئیں اور قیدیوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ ہڑتال تقریباً ایک ہفتے تک چلی لیکن ہمیں اس بابت بہت صحیح معلومات نہیں ہیں بیان کردہ واقعات بھی تیسرے آدمی سے شنیدہ ہیں جو اس نے کسی اور سے سنے تھے اور غالباً اس میں حاشیہ آرائی کی گئی ہے)

ایسے ہفتے بھی آئے جن میں پوری جنگ ایک تشہیری جنگ کی شکل اختیار کر گئی۔ باہر کا ریڈیو کبھی خاموش نہیں ہوتا تھا کیمپ کے چہار جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آویزاں لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعے قیدیوں کو غلط اور صحیح معلومات فراہم کرتے ہوئے دو ایک ہلکے پھلکے بیزار کن ریکارڈ بجتے رہتے تھے جو کسی کے اعصاب کو کشیدہ کرنے کے لیے کافی تھے۔ ساتھ ہی چکنی چپڑی اپیلیں بھی کی جاتی تھیں:

ہر کھیت کی مینڈ پر جا رہی ہے ایک دوشیزہ
اس کی بل کھائی زلفیں مجھے بڑی اچھی لگتی ہیں۔

(اب بھی انہیں اس اعزاز کا مستحق بننے کے لیے، جو کوئی بڑا اعزاز نہیں تھا ـــــ یعنی ریکارڈ بجانا ـــــ انہیں بغاوت کرنی پڑی۔ اس قسم کی بکواس تو ان لوگوں کے لیے بھی نہیں بجائی جاتی جو گھٹنے ٹیک چکے ہوں) اس زمانے کے عمومی جذبات کے مطابق یہ ریکارڈ بے اثر بنانے (کسی آواز کو دبانے کے لیے اس سے بلند آواز پیدا کرو) کے وسیلے کے طور پر بھی استعمال ہو رہے تھے، یہ کیمپ سے پہرے داروں کے نام جاری کردہ نشریوں کی آوازوں کو دبا لیتے تھے۔

باہر کے ریڈیو پر وہ کبھی کبھی پوری تحریک کو رسوا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور زور دے کر یہ بات کہتے تھے کہ اس کا بندوبست محض بدکاری اور لوٹ مار کے لیے تیار کیا گیا ہے (خود کیمپ میں زیک اس بات پر ہنسا کرتے تھے لیکن آبادی کے آزاد شہری بھی خواہ مخواہ ان نشریوں کو سننے پر مجبور تھے۔ بلاشبہ غلاموں کے مالک دیگر کوئی وضاحت پیش کرنے کے لائق نہیں تھے۔ یہ اس بات کو تسلیم کرنے کے مترادف تھا کہ سارے ہنگامے کے ذریعے انصاف حاصل کرنے کی بات ان کی سمجھ سے باہر کی چیز تھی (وہ کہتے بھی تھے کہ ایک "گرگ باراں دیدہ" نے کشتی میں لے جانے کے دوران واٹر لائن (جس کے اوپر پانی آجانے سے کشتی کی غرقابی کا خطرہ رہتا ہے) کے نیچے سوراخ کر دیا اور کشتی تین سو زیکوں کے ساتھ غرق ہو گئی تھی۔ زور اس بات پر تھا کہ غریب زیک ہی جو تقریباً سب دفعہ ۵۸ والے تھے غرقاب ہوئے انہیں لے کر جانے والے فوجی نہیں ڈوبے (وہ خود کیسے بچ گیا اس کی وضاحت نہیں ہو سکی) یا پھر وہ کنشوف کو طعنے دیتے' آمر بتاتے کہ اس کی رہائی کا حکم آ گیا تھا لیکن اب روک دیا گیا ہے۔ اس کے بعد پھر اپیلیں شروع ہو جاتیں۔ کام۔ کام! مادرِ وطن تمہیں کسی معاوضے کے بغیر خوراک رسانی کس لیے کرتی ہے؟ کام بند کر کے تم حکومت کو سخت نقصان پہنچا رہے ہو (اس طرح فرض کر لیا جاتا تھا

کہ اُن لوگوں کے دل پسیج جائیں گے جو کنٹو رگا میں لامحدود مدت کے لیے مقید تھے) کوئلے سے لدی ہوئی مکمل گاڑیاں سائیڈنگ میں کھڑی ہیں انہیں اُتارنے والا کوئی نہیں ہے! (انہیں کھڑی رہنے دو! زیک ہنستے تھے ـــ تم اور جلد گھٹنے ٹیک دوگے! پھر بھی یہ بات اُنہیں بھی نہیں سوجھی کہ تمہیں اُنہیں خالی کرنے کی اتنی ہی پریشانی ہے تو سنہرے فیتے والے اُسے خود کیوں نہیں خالی کر لیتے)

لیکن ٹیکنیکل شعبہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا تھا۔ سروس یارڈ میں دو پورٹیبل فلم پروجیکٹر دستیاب ہوئے ان کے ایمپلی فائر لاؤڈ اسپیکر کے طور پر استعمال کیے گئے جو ظاہر ہے کہ اتنی کارکردگی نہ کر سکے جتنے کہ فریق ثانی کے لاؤڈ اسپیکر۔ انہیں علیحدہ بجلی اسٹیشن سے بجلی مہیا کی جاتی تھی (اس بات سے افسروں کو بڑی حیرت ہوتی تھی کہ کیمپ میں تا حال بجلی اور ریڈیو ہیں انہیں ڈر تھا کہ باغی ٹرانسمیٹر تیار کر لیں گے اور اپنی بغاوت کے بارے میں غیر ممالک کو خبریں نشر کرنے لگیں گے۔ اس قسم کی افواہیں بھی کیمپ میں اُڑائی گئی تھیں۔) کیمپ میں جلد ہی اپنے اناؤنسروں کا تقرر کر لیا گیا (ان میں سے ایک، سلاوا یا ریموفسکایا کے متعلق ہمیں علم ہے) پروگراموں میں تازہ خبریں اور معلوماتی فیچر (روزانہ ایک دیواری خبرنامہ بھی نکلتا تھا جس میں کارٹون بھی ہوتے تھے) شامل تھے۔ ایک پروگرام کا عنوان تھا "مگرمچھ کے آنسو" جس میں اُن عورتوں کی قسمت کے بارے میں حفاظتی پولیس کی تشویش کا مضحکہ اُڑایا جاتا تھا جنہیں خود انہوں نے مارا پیٹا تھا۔ پہرے پہ پہریدار فوجیوں کے لیے پروگرام ہوتے تھے علاوہ ازیں قیدی رات کو برجیوں کے نزدیک جا کر میگا فون (دستی لاؤڈ اسپیکر) کے ذریعے فوجیوں سے چیخ کر باتیں کہتے تھے۔

لیکن بجلی اتنی نہیں تھی کہ کینگر میں موجود واحد متوقع ہمدردوں کے لیے ـــ بستی کے آزاد شہریوں کے لیے بھی، جن میں بہت سے شہر بدر کیے ہوئے لوگ شامل تھے، پروگرام نشر کیے جا سکتے۔ بستی کے عہدیداران انہیں صرف ریڈیو کے وسیلے سے بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہے تھے بلکہ کسی ایسی جگہ جہاں قیدی نہ پہنچ سکتے تھے، ایسی افواہیں بھی پھیلائی گئیں کہ خون آشام غنڈے اور جنسی طور پر تشنہ طوائفیں (یہ بات عورتوں کے گلے بآسانی اُتر جاتی تھی) کیمپ کے مالک بن بیٹھے ہیں، کہ وہاں بے قصور افراد کو ایذائیں پہنچائی جا رہی ہیں اور بھٹیوں میں زندہ جلایا جا رہا ہے (ایسی صورت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ عہدیداران نے دخل اندازی کیوں نہیں کی؟)

قیدی ایک، دو یا تین کلو میٹر دور بیٹھے ہوئے مزدوروں کو دیوار کے پیچھے سے کیسے مخاطب کر سکتے تھے: "بھائیو! ہم صرف انصاف کے خواہاں ہیں، وہ کسی جرم کے بغیر ہمیں قتل کر رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ کُتوں سے بھی بُرا سلوک کیا جا رہا ہے۔ ہماری مانگیں یہ ہیں ....؟

ٹیکنیکل شعبے کے پاس چونکہ جدید سائنسی آلات فراہم کرنے کی گنجائش نہیں تھی اس لیے اس کے خیالات پیچھے مڑ کر عہد قدیم کی سائنس پر گئے۔ سگرٹ کے کاغذ سے (سروس یارڈ میں بہت سی چیزیں تھیں ہم اس کا ذکر پہلے کر چکے ہیں کئی سال تک اس سے وزیر کارگان کے افسروں کو ماسکو میں چلنے والی اپنی ذاتی دردی کی دوکان اور تمام اشیائے خوردنی کی ورکشاپ دستیاب ہوتی رہی) چپکا چپکا کر انہوں نے بڑا سا غبارہ بنایا جیسا کہ مونٹ گولفیئر برادران نے تیار کیا تھا۔ غبارے سے پرچوں کا ایک

بنڈل باندھ دیا گیا اور اس کے نیچے دہکتے ہوئے انگاروں کی ایک انگیٹھی رکھ دی گئی جس سے غبارے کے پیندے میں بنے ہوئے سوراخ سے اُس کے اندر گرم ہوا جمع ہو جائے۔ تماش بینوں کو مسرور کرتا ہوا (اگر قیدی بھی خوش ہوتے ہیں تو وہ بچوں کی طرح ہیں) وہ عجیب و غریب طیارہ نما ڈھانچہ بلند ہوا اور فضا میں تیرنے لگا لیکن افسوس! ہوا کی رفتار اُس کے اوپر بلند ہونے کی رفتار سے تیز تھی اور جس وقت وہ سرحدی باڑ کے اوپر پرواز کر رہا تھا تو نیچے بندھی ہوئی انگیٹھی ایک کانٹے دار تار سے اُلجھ گئی۔ گرم ہوا کی فراہمی رُک جانے کے باعث غبارہ گر گیا، اس میں آگ لگ گئی اور پرچے بھی جل گئے۔

اس ناکامی کے بعد اُنہوں نے غباروں کو دھوئیں سے پھُلانا شروع کیا۔ پیچھے سے ہوا چلنے پر وہ بہت اچھی پرواز کرتے تھے اور اُن پر جلی حروف میں لکھے ہوئے یہ نعرے بستی والوں کو صاف نظر آتے تھے:

"عورتوں اور بوڑھوں کو مار پیٹ سے بچاؤ!"

"ہم مجلسِ صدارت کے کسی رُکن سے ملنا چاہتے ہیں!"

پہرے دار فوجیوں نے غباروں پر گولیاں مارنی شروع کر دیں۔

بعد ازاں کچھ چینی قیدی ٹیکنیکل شعبے میں آئے اور انہوں نے پتنگیں بنانے کی تجویز پیش کی (وہ اس فن کے ماہر ہیں) انہیں کچھ پتنگیں ایک دوسرے کے ساتھ چپکانے اور اتنا دھاگا چھوڑتے جانے میں کامیابی ملی کہ وہ بستی کے اوپر پہنچ گئیں۔ ہر پتنگ کے ڈھانچے پر ایک کھٹکا لگا ہوا تھا جب پتنگ مطلوبہ مقام پر پہنچ جاتی تو اُس کھٹکے سے پرچوں کا بندھا ہوا بنڈل بکھر جاتا تھا۔ پتنگ اُڑانے والے ایک جھونپڑی کی چھت پر بیٹھے تھے اور یہ دیکھنے کے انتظار میں تھے کہ اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔ اگر پرچے کیمپ کے نزدیک برستے تو وارڈر انہیں اُٹھانے کے لیے جھپٹ پڑتے، اگر زیادہ دور گرتے تو موٹر سائیکل اور موٹر پر انہیں حاصل کرنے کے لیے پہنچا جاتا۔ جو کچھ بھی ہو، وہ آزاد شہریوں کو سچائی کی آزاد نظم پڑھنے سے باز رکھنے کی سعی کرتے (پرچوں کے آخر میں کینگر کے ہر شہری سے درخواست کی گئی تھی کہ جسے پرچہ ملے وہ اسے مرکزی کمیٹی کے پاس روانہ کر دے)

پتنگوں پر بھی گولیاں چلائی گئیں لیکن اُن میں سوراخ ہو جانے کے باوجود اتنا نقصان نہیں ہوتا تھا جتنا غباروں کو۔ دشمن کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ وارڈروں کے غول کو دوڑاتے رہنے کے مقابلے میں زیادہ اچھا ہے کہ ڈور اُلجھانے کے لیے مقابلے میں پتنگیں اُڑائی جائیں۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں پتنگوں کی جنگ! اور یہ سب کچھ ایک سچائی کو پھیلانے کے لیے! (شاید قارئین کو کینگر کے واقعات کے تناظر سے باخبر رکھنے میں اس طرح سہولت ہو گی کہ ہم ملحوظ رکھیں کہ بغاوت کے دنوں میں باہر کیا ہو رہا تھا؟ پیرے کوٹ کو امن کا اسٹالن پرائز عطا کیا گیا تھا۔ ایک اور ترقی پسند فرانسیسی، محض قلم کار، ہمارے ترقی پسند معاشرے میں گھل مل جانے کے لیے ماسکو آیا ہوا تھا۔ روس اور یوکرین کے اتحاد نو کی تیسری صد سالہ تقریب دھوم دھام سے منائی گئی تھی[۲۱] کو لال چوک میں ایک پُر وقار پریڈ ہوئی۔ یوکرینی سوویٹ اشتراکی جمہوریہ اور روسی سوویٹ اشتراکی جمہوریہ

کو لینن تمغے دیے گئے۔ ۶ جون کو ماسکو میں پوری ڈولگورو کی ایک یادگار کا افتتاح ۸ جون کو ایک ٹریڈ یونین کانگریس کے کام کا آغاز ہوا (لیکن وہاں کینگر کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا گیا) ۹ تاریخ کو حکومت نے ایک نیا قرض لینے کا اعلان کیا۔ بیس تاریخ فضائی فوج کا دن تھا اور ترشنی میں ایک شاندار پریڈ ہوئی تھی۔ ۱۹۵۴ء کے ان مہینوں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں نام نہاد ادبی مورچے پر زوردار نکتہ چینیاں ہوئیں۔ سرکوف، کوچیٹوف اور یرمیلوف نے بڑے سخت تنبیہی مضامین لکھے۔ کوچیٹوف نے تو یہاں دریافت کیا "ہم کس قسم کے زمانے میں عمر گزار رہے ہیں؟" اور کسی نے جواب نہ دیا کہ "جیل کیمپوں کی بغاوت کے زمانے میں!" اس زمانے میں بہت سے محش ڈراموں اور تصنیفات کو گالیاں دی گئیں اور گواٹیمالا میں امریکہ کو اپنے لیے مناسب جھٹکا برداشت کرنا پڑا)

بستی میں چیچین جلاوطن بھی مقیم تھے لیکن یہ اُمید نہ تھی کہ انہوں نے دوسری تینگیں بنائی ہوں گی۔ چیچین لوگوں پر ظلم کے ہاتھ مضبوط کرنے کا الزام آپ کبھی عائد نہیں کر سکتے۔ وہ کینگر کی بغاوت کا مطلب بخوبی سمجھتے تھے اور ایک مرتبہ ڈبل روٹی، بسکٹ وغیرہ کی گاڑی کیمپ کے پھاٹک تک لائے تھے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ فوجیوں نے اُنہیں وہاں سے بھگا دیا۔

(چیچینوں کے ایک سے زیادہ پہلو ہیں۔ جن لوگوں کے درمیان وہ رہتے ہیں، میں اپنے قازقستان کے تجربے کی روشنی میں کہہ رہا ہوں، اُنہیں اُن کے ساتھ گزر بسر کرنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے: وہ اکھڑ اور مغرور ہوتے ہیں اور اس بات کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے کہ وہ روسیوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی کینگر کے لوگوں نے آزادی اور جرات کا مظاہرہ کیا انہیں فی الفور چیچینوں کی حمایت حاصل ہو گئی۔ جب ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں مناسب عزت نہیں دی جا رہی ہے تو ہمیں خود سے دریافت کرنا چاہیے کہ کیا ہم اُسی طرح کا برتاؤ بھی کر رہے ہیں جیسا ہمیں کرنا چاہیئے؟)

اسی اثنا میں شعبۂ ٹیکنالوجی اپنا مشہور "خفیہ" ہتھیار تیار کر رہا تھا۔ میں اس کی تفصیل پیش کرتا ہوں۔ مویشیوں کی ناندوں کے لیے ورکشاپ میں جو کارنر بریکٹ بنائے گئے تھے اور ڈھلائی کے منتظر تھے اُن میں دیا سلائیوں سے کھرچ کر نکالی ہوئی گندھک اور کچھ کیلشیم کاربائیڈ کا مرکب بھرا گیا (دیا سلائی کی ڈبیہ ہر اس کمرے میں پہنچائی گئی تھی جس میں ...... اور لٹ والا دروازہ تھا!) جب گندھک کو آگ دکھائی گئی اور بریکٹ پھینکے گئے تو وہ شوں شوں کرنے لگے اور پھٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بکھر گئے۔

لیکن نہ تو اُن بے نصیب جی داروں کو نہ ہی غسلخانے میں مقیم فیلڈ اسٹاف کو فیصلہ کن جنگ کی گھڑی، مقام اور نوعیت متعین کرنی تھی۔ بغاوت شروع کرنے کے کوئی دو ہفتے کے بعد ایک ایسی رات، جس میں روشنی کی ہلکی سی رمق بھی نظر نہ آتی تھی، کیمپ کی دیواروں کے چاروں طرف کھڑ کھڑ کی آواز سنائی دی اس بار دیوار پر ضربیں لگانے والے لوگ مفرور قیدی نہیں تھے، اسے کانوائے کے فوجی خود مسمار کر رہے تھے کیمپ میں، ہلچل مچ گئی، قیدی اپنی تلواریں اور پائیک لے کر نکل پڑے کیونکہ اُن کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور وہ حملے کا خدشہ محسوس کر رہے تھے لیکن فوجیوں نے حملے میں پیش قدمی نہیں کی۔

صبح پتہ چلا کہ باہر سے غنیم نے دیوار کو اُن مقامات کے علاوہ جہاں سے وہ پہلے ہی ٹوٹی ہوئی تھی۔ تقریباً ایک درجن دوسری جگہوں سے بھی توڑ دیا تھا اور اُن پر رکاوٹیں لگا دی تھیں (راستوں کی دوسری جانب مشین گنیں نصب تھیں تاکہ زیک مجمع بنا کر وہاں نہ آسکیں) یہ دیواروں کے ٹوٹے ہوئے مقامات سے حملہ کرنے کے لیے ابتدائی اور لازمی عمل تھا اور جب کیمپ اپنی مدافعت کی تیاری میں تھا اس وقت وہ بے اطمینانی کے تحت سانپ کا سلگتا ہوا بل بنا ہوا تھا۔ باغی کارکنوں نے اندرونی دیواریں اور کچی اینٹوں کے بنے ہوئے آؤٹ ہاؤس گرانے کا فیصلہ کیا اور اپنے لیے ایک دوسری دائرہ نما دیوار بنانے کا تہیہ کیا جو اُن مقامات پر بطور خاص اینٹوں سے مضبوط کر دی جائے گی جو دیواروں کے ٹوٹنے کی وجہ سے غیر محفوظ ہو گئے تھے تاکہ مشین گنوں کی گولیوں سے حفاظت ہو سکے۔

دنیا کتنی تبدیل ہو گئی تھی۔ فوجی سرحدی دیوار مسمار کر رہے تھے اور قیدی اُس کی تعمیر نو میں مصروف تھے اور چور خلوصِ قلب کے ساتھ ان کے معاون تھے یہ غور کیے بغیر کہ ہم اپنا ہی ضابطہ اور اصول توڑ رہے ہیں۔

اب شکستہ دیوار کے مقابل فاضل مدافعتی چوکیاں قائم کرنا اور ہر جگہ پلٹن تعینات کرنا ناگزیر تھا تاکہ اگر رات کو خطرے کی گھنٹی بجے تو اُن کی حفاظت کے لیے اقدامات کیے جائیں خطرے کی اطلاع کے لیے نشانی یہ مقرر ہوئی کہ ریل گاڑی کے ایک ڈبے کی درمیانی دیوار پر ضرب لگاتے ہوئے حسب معمول سیٹیاں بجائی جائیں گی۔

زیکوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ پائیکوں سے مشین گنوں کا مقابلہ کرنے کی تیاری کی! جو لوگ اس خیال کو بے تکا سمجھ کر متذبذب تھے انہیں جلد ہی یہ عام اور قدرتی معلوم ہونے لگا۔

---×---

ایک حملہ دن کے وقت ہوا۔ ٹامی گن والوں کو اسٹیلاگ کی انتظامی عمارت کے چھجے کے مقابل ٹوٹی ہوئی دیوار پر متعین کیا گیا۔ عمارت اہم لوگوں سے کھچا کھچ بھری تھی جو فوجی ٹوپیاں لگائے تھے اور کچھ کے شانوں پر پبلک پراسیکیوٹر کے شعبے کی پٹیاں آویزاں تھیں اور ہاتھوں میں کیمرے یا مووی کیمرے لیے ہوئے تھے فوجیوں کو کوئی عجلت نہیں تھی وہ دیواروں سے صرف اتنی دُور آگے بڑھے کہ خطرے کی گھنٹی بجا دی جائے جس پر سوراخوں کی حفاظت پر تعینات باغی دستے دوڑ کر باہر آجائیں یہ لوگ اپنے ہاتھوں میں پائیک پتھر اور اینٹیں سنبھالے ہوئے تھے۔ پھر مووی کیمرے اور جیبی کیمرے اپنا کام کرنے لگے (اس احتیاط کے ساتھ کہ ٹامی گن والے تصویروں میں نظر نہ آئیں) ڈسپلن افسر، پراسیکیوٹر، پارٹی کے عہدیداران اور بقیہ سب کے سب، بلاشبہ ان میں سے ہر ایک پارٹی کارکن تھا۔ وہ پائیکوں سے مسلح جو شیلے وحشیوں کے حیرتناک منظر پر ہنس رہے تھے۔ کھا پی کر فربہ ہونے والے بے شرم عظیم انسان چھجے پر کھڑے ہو کر اپنے گرسنگی کے شکار لاغر اور پامال ساتھی شہریوں کا مضحکہ اڑا رہے تھے اور انہیں یہ سب کچھ ایک بڑا کھیل سا لگ رہا تھا۔

پھر وارڈر بھی چپکے چپکے ٹوٹی ہوئی دیواروں تک پہنچ گئے اور انہوں نے قیدیوں پر پھینک والے جال پھینکنے کی سعی کی جیسے وحشی جانوروں یا بدماش آدمی کا شکار کیا جاتا ہے۔ وہ کسی ریڈیو کے آدمی کو پکڑنے

کی فکر میں تھے۔

لیکن اب اُن کا خاص بھروسہ باغیوں کا ساتھ چھوڑ جانے والے بزدل ساتھیوں پر تھا۔ ریڈیو شور و غل پیدا کر رہا تھا۔ ہوش میں آؤ! دیوار کے سوراخوں کے ذریعے کیمپ سے نکل آؤ! ان مقامات پر ہم گولیاں نہیں چلائیں گے۔ جو اس طرف آجائیں گے اُن پر بغاوت کے جرم میں مقدمہ نہیں چلایا جائے گا۔

کیمپ کے ریڈیو سے کمیشن نے جواب دیا: جو کوئی ہمارا ساتھ چھوڑ کر جانا چاہتا ہے شوق سے بے کھٹکے چلا جائے، چاہتا ہو تو صدر پھاٹک سے جا سکتا ہے ہم کسی کو جبراً نہیں روکیں گے!

ایک شخص جس نے اس رعایت سے فائدہ اُٹھایا خود کمیشن کا ممبر تھا، سابق میجر میکیئیف جو خاص گارڈ ہاؤس تک اس طرح گیا جیسے اُسے کوئی کام ہو یعنی اس وجہ سے نہیں کہ وہ اُسے وہاں روک لیتے نہ اس وجہ سے کہ اُن کے پاس اس کی پیٹھ پر گولی مار دینے کے ذرائع موجود تھے بلکہ اس وجہ سے کہ اپنے رفیقوں کی نگاہوں کے سامنے اور اُن کی نفرت آگیں نگاہوں کے درمیان غداری کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے! اطلع تین ہفتوں تک وہ مکاری سے کام لیتا رہا تھا آخر ش وہ اپنی شکست خوردہ ذہنیت کی لگام کھلی چھوڑ سکتا تھا اور باغیوں پر آزادی طلب کرنے کے لیے، جو اُسے بذاتِ خود عزیز نہیں تھی، اظہارِ غضب کر سکتا تھا۔ اب افسروں کے عتاب سے مزید محفوظ رہنے کے لیے اُس نے سپر انداز ہو جانے کی اپیل کی اور جو زیادہ مستقل مزاجی کے ساتھ مورچہ لینا چاہتے تھے اُن کی مذمت کی۔ اس نشریے کی جو تفصیل اُس نے درج کی ہے اُس کے چند حصے اس طرح ہیں: "کسی نے فیصلہ کیا ہے کہ آزادی تلواروں اور پائیکوں سے جنگ کر کے حاصل کی جا سکتی ہے وہ ان لوگوں کو گولیاں کھانے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں جو لوہے کے ذرا ذرا سے ٹکڑے سنبھالنے پر آمادہ نہیں۔ ... ہمارے معاملات پر نظر ثانی کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی ہے جنرل صبر کے ساتھ ہم سے مصالحتی گفت و شنید کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن سلوچینکوف اس بات کو اُن کی کمزوری کی دلیل سمجھتا ہے۔ کمیشن غنڈہ گردی اور بد معاشی کے لیے ایک پردہ ہے ... سیاسی قیدیوں کے شایانِ شان انداز میں مصالحت کی گفتگو کرو اور احمقانہ مدافعت کرنے کی تیاری سے باز آجاؤ!"

دیواروں میں سوراخ کئی ہفتوں تک برقرار رہے۔ جب بغاوت جاری رہی یہ سوراخ دیوار میں تھے اور ان تمام ہفتوں میں تقریباً ایک درجن افراد کیمپ سے بھاگے۔

کیوں؟ یقیناً باقیماندہ لوگ بھی کامیابی کا یقین نہیں رکھتے تھے۔ کیا وہ مستقبل میں ملنے والی سزاؤں سے نہیں گھبراتے تھے؟ کیا وہ اپنے خاندانوں کی خاطر اپنی زندگیوں کو عزیز نہیں رکھتے تھے؟ ضرور رکھتے تھے! وہ منتشر تھے اور ان میں سے ہزاروں نے شاید دل ہی دل میں اس امکان پر غور کیا تھا۔ سابق نابالغ مجرموں کو دی جانے والی دعوت کا تو ایک قانونی جواز بھی موجود تھا لیکن اس خطۂ زمین پر معاشرتی درجۂ حرارت اتنا اونچا اُٹھ گیا تھا کہ اگر روحوں کو اندر سے نہ بدلا جائے گا، اُن کے گناہوں کو معاف نہ کیا جائے گا اور مسخ قوانین جو یہ کہتے ہیں "ہمیں زندگی صرف ایک بار ملتی ہے" کہ وجود پر شعور کا انحصار ہے اور کہ جب جان کے لالے پڑے ہوں تو ہر شخص بزدل ہو جاتا ہے، اس محصور مقام پر کچھ عرصے کے لیے ان قوانین کا اطلاق بند ہو گیا تھا۔ زندگی کی حفاظت کے لیے منطق کے اصول لوگوں کو بتاتے

تھے کہ یا تو سب اجتماعی طور پر خود سپردگی کر دیں یا فرداً فرداً فرار ہو جائیں لیکن نہ انہوں نے اپنے آپ کو سپرد کیا نہ وہ بھاگے۔ وہ اس اخلاقی سطح تک بلند ہو گئے تھے جس پر ایستادہ ہو کر پھانسی دینے والوں سے کہا جاتا ہے: تم شیطان مجسم بن سکتے ہو! آؤ ہم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دو ہمیں مار ڈالو!

اور یہ کارروائی جس کا اتنا خوبصورت منصوبہ تیار کیا گیا تھا تاکہ قیدی دیوار کے سوراخوں میں سے چوہوں کی طرح بکھر جائیں اور آخر میں سب سے زیادہ ضدی لوگ ہی بچیں جنہیں بعد میں کچل دینا سہل ہوگا، یہ کارروائی ناکام ہو گئی کیونکہ اسے سوچنے والوں کی اپنی ذہنیت چوہوں جیسی تھی۔

باغیوں کے دیواری اخبار میں ایک کانچ کے کیس میں رکھی ہوئی ہتھکڑی کا بچے کو دکھاتے ہوئے عورت کی تصویر — "وہ تمہارے باپ کو ایسی ہتھکڑیاں پہنایا کرتے تھے" — اور آگے ایک کارٹون تھا "آخری غدار! (دیوار کے سوراخ میں سے بھاگتی ہوئی سیاہ بلی!)"

کارٹونسٹ ہمیشہ ہنس سکتے ہیں لیکن کیمپ میں لوگوں کے پاس ہنسنے کا کوئی موضوع نہیں تھا۔ دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں ہفتہ گزر گیا! جو بات گلاگ کے قانون کے مطابق ایک گھنٹے بھی جاری نہیں رہ سکتی تھی وہ اتنی طویل مدت تک چل گئی کہ یقین نہیں کیا جا سکتا۔ سچ پوچھیے تو سخت اذیت ہوتی ہے۔ نصف مئی اور تقریباً پورا جون پہلے لوگ فتح کی خوشی میں آزادی، جلسوں اور منصوبوں میں مگن تھے پھر انہوں نے ان افواہوں پر بھروسہ کر لیا کہ روڈنیک میں بھی بغاوت ہو گئی ہے، شاید چربینورا سپاگ اور تمام اسٹیپلاگ اس کی تقلید کرے گا ذرا سی دیر میں کاراگنڈا میں بغاوت ہو جائے گی! تمام مجمع الجزائر پھٹ پڑے گا اور خاک ہو کر کرۂ ارض کے چہرے پر بکھر جائے گا! لیکن روڈنیک نے اپنے ہاتھ پشت پر باندھ لیے، سر خم کر لیا اور حسب سابق اپنی گیارہ گھنٹوں کی ڈیوٹیاں شروع کر دیں اور لوگ سلیکوسس مرض میں مبتلا ہوتے رہے۔ انہوں نے کینگر کا اور اپنا لحاظ ایک منٹ بھی نہیں کیا۔

جزیرہ کینگر کی کسی نے تائید نہیں کی۔ اب بیابان میں سفر کرنا ممکن نہیں تھا۔ گیریسن (حفاظتی فوج) کی تعداد بتدریج بڑھائی جا رہی ہے، اسٹیپی پر فوج خیموں میں پڑی ہوئی تھی۔ پورا کیمپ دیوار کے باہر کانٹے دار تاروں کی دوہری باڑ سے گھیر دیا گیا تھا۔ افق پر صرف ایک گلابی نقطہ تھا: خدا اور قادرِ مطلق (انہیں مالنکوف سے توقع تھی) انصاف کرنے آ رہا تھا۔ وہ شریف النفس ہے آئے گا اور حیرت کے ساتھ ہاتھ اوپر پھینکتے ہوئے کہے گا: "لیکن کیا یہ ان حالات میں رہ سکتے ہیں؟ اور تم نے ان کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟ قاتلوں پر مقدمات چلائے جائیں! چیچیف اور بیلیائیف کو گولی مار دو! بقیہ کو برخاست کر دو!... لیکن نقطہ بہت ہی چھوٹا تھا اور اتنا گلابی بھی نہیں تھا!

وہ معاف کیے جانے کی توقع نہ کر سکتے تھے۔ بس اتنا ہو سکتا تھا کہ آزادی کے ساتھ تھوڑی سی مدت گزاریں اور پھر اسٹیپلاگ کے انتقامی جذبے کا شکار بن جائیں۔

ایسے دل اکثر ملتے ہیں جو کشیدگی برداشت نہیں کر سکتے۔ کچھ افراد پہلے ہی اخلاقی طور پر کچلے جا چکے تھے اور جسمانی طور پر کچلے جانے کے جلد ہی شروع ہونے کا خطرہ انہیں کشمکش رنج کی اذیت میں مبتلا کیے ہوئے تھا کچھ نے خاموشی کے ساتھ یہ حساب لگایا کہ دراصل وہ غدر میں شامل نہیں تھے اور اگر احتیاط

سے کام لیں تو شمولیت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کچھ لوگ نئے شادی شدہ تھے (اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ انہوں نے باقاعدہ مذہبی رسوم کے مطابق شادی کی تھی مثلاً مغربی یوکرین کی ایک لڑکی اس کے بغیر شادی کرنے پر رضامند نہ تھی اور گلاگ کی کشادہ قلبی کے باعث وہاں ہر قسم کے مذہبی رہنما موجود تھے) ان نئے شادی شدہ لوگوں کے لیے شیریں اور تلخ ادوار اتنی عجلت کے ساتھ آ گئے تھے جن کا احساس عام آدمی اپنی سست رفتار زندگی میں کبھی نہیں کر سکتا۔ وہ ہر دن کو اپنا آخری دن اور انتقام میں ہونے والی تاخیر کو ہر صبح معبودِ حقیقی کی سوغات تصور کرتے تھے۔

خدا پرست لوگ ..... عبادت کرتے تھے اور کینگر کی بغاوت کا انجام خدا کے ہاتھوں میں سونپ کر حسبِ معمول سب سے زیادہ پرسکون انسان بن جاتے تھے۔ تمام مذاہب کی عبادتیں کھانے کے ہال میں متعینہ پروگرام کے مطابق ہوتی تھیں۔ جوہوواز وٹینیسز فرقے کے لوگ اپنے عقیدے پر کاربند رہنے کی آزادی محسوس کرتے تھے اور انہوں نے قلعہ بندی نیز پہرہ دینے سے انکار کر دیا۔ وہ گھٹنوں سر جوڑ کر خاموش بیٹھے رہتے تھے (اُن سے برتن دُھلوائے گئے) ایک ولی، اصلی یا نقلی، کیمپ کے تختوں پر کر اس کے نشانات لگاتے ہوئے قُربِ قیامت کی پیشینگوئی کرتا ہوا کیمپ میں گھوما کرتا تھا۔ اس کو سہولت یوں مل گئی کہ شدید سردی پڑنے لگی جیسے کہ قازقستان میں بعض اوقات گرمیوں میں ہوا کا رُخ بدلنے سے پڑتی ہے۔ اُس کے عقید تمند معمر عورتیں گرم کپڑوں کی کمی کے باعث کانپتی ہوئی زمین پر بیٹھ کر آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا لیتی تھیں اور نہ جانے کس غیبی امداد کی توقع کرتی تھیں؟

کچھ لوگ جانتے تھے کہ وہ قسمت پر تکیہ کر کے بیٹھے ہیں اور فوجیوں کی آمد میں بہت تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں۔ اُن کے تمام خیالات اور اعمال کا نقطۂ ارتکاز یہ تھا کہ کسی طرح کچھ اور ایام گزر جائیں یہ لوگ سب سے زیادہ مغموم نہیں تھے (سب سے زیادہ ملول وہ تھے جو کسی جھنجھٹ میں نہیں پڑتے تھے اور جو اس کے اختتام کی دعائیں مانگتے تھے)

لیکن جب یہ مختلف المزاج لوگ کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے جلسہ گاہ میں یکجا ہوتے تھے کہ خود سپردگی کر دیں یا ڈٹے رہیں تو پھر وہ سب اُس گرم آب وہوا میں پہنچ جاتے تھے جہاں اُن کی ذاتی رائیں تحلیل ہو جاتی تھیں اور اپنی ذات کے لیے بھی اُن کا وجود کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ علاوہ ازیں اپنے انتظار میں کھڑی ہوئی موت سے زیادہ ڈر انہیں اپنی توہین کا ہوتا تھا۔

"ساتھیو!" وجیہہ کزنشوف نے اعتماد کے ساتھ کہا، جیسے وہ بہت سے راز جانتا ہو جو قیدیوں کے موافق ہوں "ہمارے پاس مدافعت کی ناقابلِ شکست آتشیں قوت ہے اور دشمن کا نقصان ہمارے اپنے نقصان سے پچاس فیصد ہو گا"

مزید برآں اُس نے کہا، "ہماری تباہی بھی بیکار نہیں ثابت ہو گی!"

(اس کا یہ قول بالکل درست تھا۔ سماجی درجۂ حرارت سے وہ بھی متاثر ہوا تھا)

اور جب مدافعت کرتے رہنے کی موافقت اور مخالفت میں رائے شماری ہوئی تو کثرتِ رائے مدافعت میں تھی۔

اس وقت سلوچینکوف نے ایک نحس تنبیہہ کی: "بس اتنا یاد رکھو کہ اگر کوئی اس وقت ہمارے ساتھ رہنا چاہتا ہے تو بعد میں خودسپردگی کا ارادہ رکھنے والے کو ہم وہاں پہنچنے سے پانچ منٹ پہلے ہی صاف کر دیں گے!"

ایک دن بیرونی ریڈیو نے گلاگ کے نام ایک فوجی فرمان نشر کیا: کام کرنے سے انکار کرنے کی وجہ سے، تخریبی کارروائی کی وجہ سے، اس وجہ سے اور اُس وجہ سے، کینگر کیمپ توڑ دیا جائے گا اور تمام قیدیوں کو مگڈن بھیج دیا جائے گا (واضح تھا کہ گلاگ کے لیے زمین سکڑتی جا رہی تھی اور جو لوگ پہلے مگڈن بھیجے گئے تھے ــ وہ وہاں کس لیے تھے؟) کام پر جانے کا ایک آخری موقع....

ایک مرتبہ پھر اُن کا آخری موقع نکل گیا اور حالات پہلے کی طرح چلتے رہے۔

سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا پہلے سے چلا آرہا تھا اور ان آٹھ ہزار لوگوں کا خواب جیسا وجود جو آسمان کے درمیان معلق تھے، روزانہ کی باقاعدگی کے باعث اور زیادہ چونکانے والا اور غیر امکانی اور عجیب ہو گیا تھا۔ دھوبی خانے سے دُھلے ہوئے کپڑے ملتے تھے، بال تراشے جاتے تھے، کپڑوں اور جُوتوں کی مرمت کی جاتی تھی۔ تنازعات کے لیے مصالحتی عدالتیں بھی تھیں یہاں تک کہ... یہاں تک کہ آزاد ہونے کے لیے بھی ایک لائحہ عمل تھا۔

ہاں! بیرونی ریڈیو کبھی کبھار قیدیوں کو رہائی کے لیے صدائیں دیتا رہا! وہ یا تو کسی ایسے ملک کے باشندے ہوتے تھے جس نے اپنے شہری ایک جگہ جمع کرنے کا اختیار حاصل کر رکھا تھا یا پھر وہ لوگ تھے جن کی سزا ختم ہونے والی تھی (یا مبیّنہ طور پر ختم ہونے والی تھی؟) شاید انتظامیہ نے رستے کھلا اور وارڈروں کی مدد کے بغیر "آوازیں" جمع کرنے کا طریقہ اس شکل میں ایجاد کیا تھا؟ کمیشن نے اس پر غور کیا لیکن اس کی صداقت کو جانچنے کا ان کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا چنانچہ اُس نے اُن سب کو جانے کی اجازت دے دی۔

یہ صورتحال اتنے دنوں کیسے جاری رہی؟ افسران کو کس بات کا انتظار ہو گا؟ سامانِ خورد و نوش کے ختم ہو جانے کا؟ انہیں علم تھا کہ سامان کافی دنوں تک چلے گا۔ کیا وہ آبادی کی رائے عامّہ پر غور کر رہے تھے؟ اس کی انہیں ضرورت نہ تھی۔ کیا وہ اپنی غارتگرانہ تراکیب بہت احتیاط کے ساتھ تیار کر رہے تھے یہ کام وہ بہت جلد کر سکتے تھے (واقعی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے کاراگنڈا کے قرب و جوار میں کسی جگہ سے "مخصوص انتظامی" (یعنی تعزیری) ریجمینٹ طلب کی تھی) کیا وہ اعلیٰ ترین افسروں سے کارروائی کے لیے منظوری چاہتے تھے؟ کتنی بلند سطح سے؟ کچھ معلوم نہیں کہ کس تاریخ کو کس سطح پر فیصلہ کیا گیا تھا۔

کئی مواقع پر سروس یارڈ کا صدر پھاٹک اچانک کھلتا تھا، غالباً مدافعت کرنے والے فریقوں کی مستعدی کا جائزہ لینے کی غرض سے؟ پہرے پر تعینات قیدی خطرے کی گھنٹی بجا دیتا تھا اور دستے دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے اُمڈ پڑتے تھے لیکن کیمپ کے میدان میں کوئی داخل نہیں ہوتا تھا۔

مدافعت کرنے والوں کے پاس جو واحد فیلڈ انٹیلیجنس سروس تھی وہ جھونپڑوں کی چھتوں پہ

چوکنے بیٹھنے والے نگراں تھے اور وہ اپنے اندازے انہیں باتوں پر قائم کرتے تھے جو کچھ چھتوں سے ٹ کے پیچھے تک دکھائی دیتا تھا۔

وسط جون میں بستی میں بہت سارے ٹریکٹر آئے۔ وہ سرحدی باڑ کے آس پاس کام کر رہے تھے شاید کوئی چیز ہٹا رہے تھے پھر وہ رات میں بھی کام جاری رکھنے لگے۔ رات میں ٹریکٹروں کا یہ کام کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ شاید کوئی خطرے کی بات ہو اس خیال سے قیدیوں نے دیواروں کے شگافوں کے سامنے ایک اضافی اقدام تحفظ کے طور پر خندقیں کھودنی شروع کر دیں (ان خندقوں کی تصویریں اور اسکیچ ایک سراغرساں طیارے سے تیار کی گئیں)

غیر دوستانہ ماحول میں راتیں اور زیادہ تاریک معلوم ہونے لگیں۔

اس کے بعد اچانک توہم پرستوں کو شرمندہ کر دیا گیا۔ اور شکست سے خوف کھانے والوں کو اور اُن سب کو جنہوں نے کہا تھا کہ کوئی رحمدلی نہیں برتی جائے گی اور کہ بھیک مانگنے کی کوئی تُک نہیں ہے صرف آرتھوڈاکس قدامت پرست فتحیاب ہوئے۔ جون ۲۲ کو بیرونی ریڈیو نے اعلان کیا کہ قیدیوں کے مطالبات تسلیم کر لیے گئے ہیں! مرکزی کمیٹی کی مجلسِ صدارت کا ایک رُکن روانہ ہو چکا ہے!

وہ گلابی نقطہ، گلابی سورج، گلابی آسمان بن گیا! تو اُن تک دسترس ممکن ہے! تو ہمارے وطن میں بھی انصاف ہے! کچھ ہم جھکیں گے کچھ وہ جھکیں گے۔ اگر مصالحت میں رکاوٹ آتی ہے تو ہم نمبروں کی پٹیاں لگائیں گے اور کھڑکیوں کی سلاخیں قبول کر لیں گے، ہم سارے مطالبات سے دستبردار ہونے کی بات نہیں سوچ رہے تھے۔ تم کہتے ہو کہ وہ ہمیں دھوکا دے رہے ہیں؟ بھئی وہ ہم سے پہلے ہی کام پر آنے کا تقاضہ تو نہیں کر رہے ہیں!

جیسے کسی چھڑ کے لمس سے الیکٹرواسکوپ کی طاقت سلب ہو جاتی ہے اور مضطرب سنہرا ورق ملائمت کے ساتھ عالم استراحت میں چلا جاتا ہے اُسی طرح ریڈیو کے اعلان نے اُسے آخری ہفتے کا تشویشناک تناؤ کم کر دیا۔

اُن نفرت انگیز ٹریکٹروں نے بھی ۲۴ جون کی شام کو کچھ دیر کام کرنے کے بعد اپنا شور ختم کر دیا۔ بغاوت کی چالیسویں رات کو قیدی سکون کے ساتھ سو سکے۔ وہ شاید کل آ جائے گا۔ وہ شاید پہلے ہی آ چکا ہے بلکہ جون کی ان مختصر راتوں میں نیند پوری نہیں ہوتی اور علی الصبح آپ گہری نیند میں غرق ہوتے ہیں۔ وہ تیرہ سال پہلے کی ان گرمیوں جیسی صبح تھی۔

۲۵ جون، جمعہ کو علی الصبح روشنی کی شعلوں کے ساتھ پیراشوٹ خلا میں پھیل گئے۔ برجیوں سے مزید روشنی کے راکٹ بلند ہوئے اور چھتوں پر متعین پہریداروں کو آواز نکالنے سے پہلے ہی اسنپر گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا! پھر توپ کے گولوں کی آواز سنائی دی! طیارے کیمپ کے اُوپر چکر کاٹ کر دہشت پھیلانے لگے۔ مشہور ٹی ۳۴ ٹینکوں نے ٹریکٹروں کے شور کی آڑ میں چھپ کر مورچے سنبھال لیے تھے اور اب وہ ٹوٹی ہوئی دیواروں کے تمام ناکوں پر آگے بڑھے (لیکن انہیں سے ایک ٹینک خندق میں گر پڑا) کچھ ٹینک اپنے ٹریلوں پر کانٹے دار تاروں کے بنڈل کھینچ لائے جن سے وہ کیمپ ڈیپارٹمنٹوں کو فوراً

منتشر کر سکیں۔ دوسروں کے عقب میں ہلمٹ والے حملہ آور فوجی ٹامی گنوں کے ساتھ دوڑے (ٹامی گن والوں اور ٹینک ڈرائیوروں کو پہلے ہی ووڈکا پلادی گئی تھی۔ فوجی خواہ کتنے ہی ممتاز ہوں، شراب اندر پہنچ جائے تو نہتے اور سوئے ہوئے لوگوں کو تباہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے) پیش قدمی کرتے ہوئے فوجیوں کے ہمراہ واکی ٹاکی آپریٹر اندر آئے۔ جنرل ہلمٹ پوشوں کے ساتھ برجیوں کے اوپر چلے گئے اور وہاں سے سرچ لائٹوں کی دن جیسی روشنی میں (اور اس جلتی ہوئی برجی کی روشنی میں جسے زیکوں نے اپنے آتش گیر بموں سے پھونک دیا تھا) اپنے فرمان جاری کرنے لگے: "جھونپڑا نمبر ایک ــــ فلاں فلاں پر حملہ کرو! کڑشموف وہیں ہے!" وہ نگرانی کی چوکیوں میں نہیں چھپے جیسا کہ اکثر کیا کرتے تھے کیوں کہ کوئی گولی لگنے کا خطرہ نہیں تھا۔

دور افتادہ تعمیر گاہوں سے آزاد مزدور یہ تمام کارروائی دیکھ رہے تھے۔

کیمپ بیدار ہو گیا، سب فرطِ خوف سے حواس باختہ۔ کچھ وہیں رک گئے جن جھونپڑوں میں وہ تھے۔ محفوظ رہنے کا ایک ذریعہ سمجھ کر فرش پر لیٹے ہوئے چونکہ مدافعت ناسمجھی کی بات تھی۔ دیگر لوگوں نے انہیں اٹھانے اور مقابلے میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ کچھ دوسرے لوگ نبرد آزمائی اور موت کو جلد گلے لگانے کے لیے دوڑ کر سیدھے آگ کی قطاروں میں گھس گئے۔

تیسرے کیمپ ڈویژن نے مقابلہ کیا۔ اسی ڈویژن نے یہ سب شروع کیا تھا (اس میں خاص طور پر دفعہ ۵۸ والے تھے جن میں بینڈرسٹوں کی بہت بڑی تعداد شامل تھی) انہوں نے ٹامی گن والوں اور وارڈروں پر سنگباری کی اور شاید ٹینکوں پر گندھک کے بم بھی برسائے۔ کانچ کا سفوف کسی کو یاد نہیں آیا۔ ایک جھونپڑے سے دو بار حملے کیے گئے اور "ہرا" کے ساتھ یلغار ہوئی۔

ٹینک سامنے پڑنے والے ہر شخص کو کچلتے گئے۔ (لالا پرسین، جو کیف کی تھی، کچلی گئی۔ ٹینک اس کے پیٹ پر سے گزر گئے) ٹینک جھونپڑوں کے اگلے حصے تک آ پہنچے اور وہاں بھی لوگ دب کر مرے (جن میں اسٹونیا کی دو خواتین، انگریڈ کیفی اور مخلا پا بھی تھیں)۔ ٹینکوں نے جھونپڑوں کے آس پاس کے علاقے کو اپنی زد میں لے لیا اور جو لوگ کیریلا ٹینکوں سے بچنے کے لیے وہاں چھپے تھے انہیں روند دیا۔ سیمیول ریک اور اس کی محبوبہ نے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر اپنے آپ کو ٹینک کے نیچے ڈال دیا اور اس طرح ختم ہو گئے۔ ٹینکوں نے جھونپڑے کے تپلے تختے کی دیواریں مسمار کر دیں اور ان میں خالی گولے پھینکے۔ فینا ایپنسن کو اتنا یاد ہے کہ جیسے وہ کسی بھیانک خواب کے دوران ایک جھونپڑے کو گرتے ہوئے اور اس کے ملبے نیز زندہ اجسام پر سے ایک ٹینک کو ترچھا ہو کر گزرتے ہوئے دیکھ رہی ہو۔ عورتیں کود کر اور اچھل کر ٹینک کے راستے سے ہٹنے کی کوشش کرتی تھیں۔ ٹینک کے عقب میں ایک لاری آئی اور نیم عریاں عورتوں کو اس پر اچھال دیا گیا۔

توپوں میں ہوائی گولے تھے لیکن ٹامی گنوں سے بس حقیقی گولیوں کی بارش ہو رہی تھی اور سنگینیں بھی فولاد کی تھیں۔ عورتوں نے اپنے بدن مردوں کی آڑ میں چھپانے کی کوشش کی اور انہیں بھی سنگینیں بھونک دی گئیں۔ افسر تحفظ بلیانیف نے اپنے ہاتھوں سے دو درجن افراد کو قتل کیا۔ جب لڑائی ختم ہو گئی تو دیکھا گیا کہ وہ دشمن کے ہاتھوں میں چاقو پکڑا کر فوٹو گرافروں سے کہہ رہا تھا کہ مردہ فتنہ جو کی تصویر کھینچو۔ کیمپ کا ایک [illegible] سپردن اور ایک عمر رسیدہ وادی اپنے پھیپھڑوں پر آنے والے زخموں کی تاب نہ لا کر مر گئے۔ کچھ [illegible]

میں چھپ گئے تھے اور انہیں وہیں گولیوں سے بھون دیا گیا۔[۲۵]

کرنشوف کو، اپنی کمان کی چوکی پر جو فصلوں نے میں تھی، گرفتار کر لیا گیا اور اُسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا گیا۔ سلوچینکوف کے ہاتھ اُس کی پشت پر باندھ کر اُسے ہوا میں اُچھالا گیا اور زمین پر پٹک دیا گیا (یہ چوروں کا مرغوب داؤں) تھا۔

پھر گولیاں چلنے کی آوازیں بند ہو گئیں۔ چیخنے کی صدائیں آ رہی تھیں: "اپنے جھونپڑوں سے باہر آجاؤ، ہم گولی نہیں ماریں گے۔" گولیاں نہیں ماری گئیں ـــ انہوں نے صرف بندوقوں کے کُندوں سے قیدیوں کی مرمت کی۔

قیدیوں کے جتھے لے کر اُنہیں سنگا نوں کے درمیان سے اسٹیپی تک اور کینگر کے کانوائے فوجیوں کی قطاروں کے درمیان مارچ کرایا گیا۔ اُن کی جامہ تلاشیاں لی گئیں اور اپنے بازو پھیلا کر منہ کے بل زمین پر لیٹنے کو مجبور کیا گیا۔ جب وہ اس طرح صلیب پر چڑھے ہوئے تھے حفاظتی پولس کے اُڑن دستے اور وارڈر اُن کی شناخت کے لیے اور باہر کھینچنے کے لیے درمیان سے گزرے جن کو انہوں نے پہلے جہاز یا برجیوں سے دیکھا تھا (وہ سب اس عمل میں اتنے منہمک تھے کہ کسی کو اس دن کا 'پراودا' کھولنے کی مہلت نہیں لی۔ اس میں ایک مضمون تھا: ہماری مادرِ وطن کی زندگی کا ایک دن ـــ فولاد کے مزدوروں کی کامیابیاں شینوں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ فصلوں کی کٹائی۔ جو مورخین ہمارے وطن کے اُس دن کے کام کا جائزہ لیں گے انہیں بڑی سہولت ہو گی)

تجسس پسند افسراب سروس یارڈ کے اسرار کا جائزہ لے سکتے تھے، یہ دیکھ سکتے تھے کہ بجلی کہاں سے آئی تھی اور وہاں کون سے "خفیہ ہتھیار" تیار کیے گئے تھے۔

فاتح جنرل برجیوں سے نیچے اُترے اور ناشتے کے لیے چلے گئے۔ انہیں سے کسی کو بھی بغیر پہچانے ہوئے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جون کی اُس صبح اُن کو اور کسی چیز کی اشتہا نہیں رہ گئی تھی۔ انہوں نے جم کر شراب نوشی کی۔ نشے کا خمار اُن کے سروں میں نظریاتی آہنگ کو بالکل خراب نہ ہونے دے گا اور دلوں کے لیے اُنہیں غذا ملی وہ ہیچ کش سے فِٹ کرنے والی چیز (شراب) تھی۔

ہلاک ہونے والوں اور زخمیوں کی تعداد وہاں تقریباً چھ سو سمجھی جا رہی تھی لیکن کینگر ڈویژن کے پیداواری منصوبوں کے شعبے نے جو اعداد فراہم کیے اور یہ چند ماہ بعد فراہم کیے گئے، یہ تعداد سات سو سے بھی اوپر تھی۔[۲۶]

جب کیمپ کے اسپتال زخمیوں سے کھچا کھچ بھر گئے تو بقیہ کو قصبے میں لے گئے (آزاد مزدوروں کو اطلاع دی گئی کہ فوجیوں نے محض ہوائی فائر کیے تھے اور قیدیوں نے ہی ایک دوسرے کو مارا تھا)

بقیہ لوگوں سے قبریں کھدوانے کی خواہش فطری تھی لیکن خبر دُور دُور تک پھیل جانے کے خوف سے یہ کام فوجیوں نے کیا۔ انہوں نے تین سو لاشیں کیمپ کے ایک کونے میں دفن کر دیں اور باقی کو اسٹیپی میں کسی جگہ گاڑ دیا گیا!

۲۵ جون کو تمام دن قیدی دھوپ میں مُنہ کے بل اسٹیپی پر پڑے رہے (کئی دن سے گرمی بیحد سخت پڑ رہی تھی) اور کیمپ میں غیر مختتم تلاشیوں، توڑ پھوڑ کر دیکھنے اور ہلا کر ڈھونڈنے کا سلسلہ چل رہا تھا بعد ازاں

روٹی اور پانی اسٹیپی پر پہنچایا گیا۔ افسران کے پاس فہرستیں تیار تھیں۔ نام پکارا جاتا تھا اور آدمی زندہ نکلتا تھا تو اُس کے اندراج پر نشان لگا دیا جاتا تھا اور اُسے اپنی روٹی کا راشن مل جاتا تھا نیز اپنی فہرست کے مطابق وہ فوراً قیدیوں کو ٹولیوں میں منقسم کر دیتے تھے۔

کمیشن کے اراکین اور دیگر مشکوک لوگوں کو کیمپ جیل میں بند کر دیا گیا جس کی اب تفریح بازوں کے لیے ضرورت نہیں تھی ایک ہزار سے زائد افراد چُنے گئے جنہیں یا تو بند جیل میں رکھا جائے گا یا کولیما بھیج دیا جائے گا (ہمیشہ کی مانند یہ فہرستیں محض اندازے سے بنائی گئی تھیں جس کی وجہ سے بہت سے ایسے لوگ وہاں پہنچ گئے جنہوں نے بغاوت میں کوئی حصّہ نہیں لیا تھا)

میری خواہش ہے کہ لوگوں کو سکون پہنچانے والی یہ تصویر اُن کی روحوں کو سکون پہنچائے جن کی جھلک گزشتہ باب میں پیش کی گئی ہے۔ ہاتھ اوپر! دُور رہو! کسی کو بھی سیف ڈیپارٹمنٹ میں پناہ نہیں لینی پڑے گی اور تعزیری دستوں کو اب کبھی انتقام لینے کا خطرہ نہیں اُٹھانا پڑے گا!

۲۶ر جون کو قیدیوں سے تمام دن رکاوٹیں ہٹانے کا کام لیا گیا اور دیوار کے شگافوں میں اینٹیں لگوائی گئیں۔

۲۷ر جون کو انہیں کام پر لے جایا گیا۔ اب سائیڈنگ پر کھڑی ہوئی گاڑیوں کو مال اُتارنے والوں کا مزید انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

جن ٹینکوں نے کینگر کے قیدیوں کو روندا تھا وہ اپنی ہی قوت سے روڈنیک تک گئے اور وہاں دھیرے دھیرے چلائے گئے تاکہ زیک اُن کے دیدار کر لیں اور اپنے انجام کی فکر کر سکیں۔ . . .

باغی رہنماؤں پر ۱۹۵۵ء کے موسم سرما میں مقدمہ چلا جو ظاہر ہے خفیہ طور پر چلایا گیا اور سچ تو یہ ہے کہ اُس کے بارے میں ہمیں زیادہ کچھ معلوم نہیں ہے . . . کہتے ہیں کہ کزنشوف کو اپنے اوپر بے حد اعتماد تھا اور اُس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اُس کا رویّہ بے داغ رہا ہے اور اُن حالات میں اس سے بہتر رویّہ اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ کیا سزائیں دی گئیں۔ سلوچینکوف، میخائل کیلر اور کنوکیس کو غالباً گولی مار دی گئی۔ میں غالباً اس لیے کہہ رہا ہوں کہ انہیں یقیناً پہلے ہی گولی مار دی جاتی لیکن شاید ۱۹۵۵ء نے اُن کی قسمتوں کو نرم کر دیا ہو؟

کینگر میں اب پھر دیانتداری کے ساتھ محنت کرنے کی زندگی کے لیے ماحول ہموار کر دیا گیا تھا۔ افسران کل کے باغیوں میں سے زیادہ اور تیزی سے کام کرنے والوں کی ٹولیاں بنانے سے نہیں چُوکے۔ "اپنا کماؤ اور کھاؤ" والا طریقِ عمل پھلنے پھولنے لگا۔ کھانے کی دکانوں پر بھیڑ رہتی تھی، بیکار فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ وارڈر اور افسر پھر چپکے سے سروس یارڈ میں آکر اپنی ذاتی ضرورت کی اشیاء بنواتے تھے کوئی مچھلی پکڑنے کی ریل، کوئی پیسے رکھنے کا گلّا، یا کسی زنانہ ہینڈ بیگ کے ہینڈل درست کراتے تھے۔ باغی موچی اور درزی (لتھوانیا اور مغربی یوکرین کے باشندے) افسروں کے لیے ہلکے خوبصورت بُوٹ اور اُن کی بیویوں کے لیے پوشاکیں تیار کرتے تھے۔ جب سابق سیپریٹنگ پلانٹ پر کام کرنے والے زیکوں کو کیبل کا سیسہ الگ کر کے کیمپ میں پہنچانے کی بیگار کرنی پڑتی تھی تاکہ اُسے پگھلا کر گولیاں بنائی جا سکیں جس سے کامریڈ افسر بارہ سنگھوں کے شکار پر جا سکیں۔

اب تک یہ بدنظمی تمام مجمع الجزائر میں پھیل چکی تھی اور کینگر بھی پہنچ گئی تھی۔ کھڑکیوں پر سلاخیں پھر نہیں لگائی گئیں، جو نہ پڑوں پر قفل بھی نہیں پڑتے تھے۔ "دوثلث" پیرول پالیسی بھی شروع کی گئی اور دفعہ ۵۸ والوں کا دوبارہ اندراج ہوا جس کی پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی ہے۔ نیم مردہ لوگوں کو رہا کر دیا گیا۔

قبروں پر گھاس عام طور سے بہت گھنی اور سبز ہوتی ہے!

۱۹۵۶ء میں خود کیمپ کا علاقہ ہی ختم کر دیا گیا۔ مقامی باشندگان نے، جو کینگر میں بس جانے والے جلاوطن تھے، یہ معلوم کر لیا کہ وہ لوگ کہاں دفنائے گئے تھے ۔ اور وہ اُن کی قبروں پر چڑھانے کے لیے اسٹیپی سے ٹیولپ کے پھول لائے۔

جب بھی آپ ڈونگر کی کے پاس سے گزریں تو یاد رکھیں کہ اس کا افتتاح کینگر کی بغاوت کے دور میں ہوا تھا اور اسی لیے یہ ایک طرح سے کینگر کی ایک یادگار بن گیا ہے۔

حصّہ پنجم ختم ہوا۔

حصہ ششم

جلاوطنی

پہلا باب

آزادی کے ابتدائی برسوں میں جلاوطنی

بنی نوع انسان نے اغلباً جلاوطنی کی ایجاد پہلے اور جیل کی اس کے بعد کی۔ قبیلے سے خارج کردینا یقینی طور پر جلاوطنی تھی۔ ہم نے بہت جلد یہ سمجھ لیا تھا کہ اپنی جگہ سے، اپنے جانے پہچانے ماحول سے ربط منقطع ہوجانے پر انسان کے لیے زندہ رہنا کتنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اگر ہر طرف شاداب جنگلات بھی ہوں، مستقلاً برف سے ڈھکی رہنے والی سرزمین نہ ہو پھر بھی ہر چیز الٹی اور بے ڈھنگی ہوتی ہے۔ ہر چیز عارضی اور غیر حقیقی سی معلوم ہوتی ہے۔ دیگر معاملات کی مانند روسی شہنشاہیت میں بھی انہیں جلاوطنی کا پتہ لگنے میں دیر نہیں ہوئی۔ ۱۶۴۸ء کے ضابطۂ قوانین میں زار الیکسی میخائلووچ کے عہدِ حکومت میں اسے قانونی منظوری مل گئی تھی۔ لیکن اس سے قبل بھی سولہویں صدی کے اواخر میں لوگ قانونی منظوری کے بغیر بھی جلاوطن ہوتے آئے تھے۔ مثال کے طور پر، کارگوپول کے وہ نظروں سے گرے ہوئے لوگ، اور پھر اگلیچ کے وہ باشندگان جن کے سامنے زار دوچ دامیتری کا قتل ہوا تھا۔ ہمارے دیہی غیر آباد علاقے انھیں خوش آمدید کہتے تھے۔ سائبیریا پہلے ہی ہمارا تھا ۱۶۴۵ء تک وہاں جلاوطنوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ پیٹر نے یکمشت کئی سو لوگوں کو جلاوطن کیا۔ جیسا کہ ہم پہلے عرض کرچکے ہیں۔ ایلزبتھ نے سزائے موت کی جگہ سائبیریا میں مستقل جلاوطنی کا سلسلہ شروع کیا۔ اس وقت یہ لفظ بدنام ہوگیا؛ جلاوطنی کا مطلب آزاد بستی کی جگہ کٹورگا بھی ہوگیا۔ جو بہت مختلف چیز تھی۔ ۱۸۲۲ء میں اگزینڈر کے جلاوطنی سے متعلق ضوابط نے اس ناجائز استعمال کو قانونی جواز فراہم کیا۔ اسی وجہ سے انیسویں صدی کے قید بامشقت کے سزایافتگان کو جلاوطنوں میں شامل کرنا چاہیے۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں دو ہزار تا چھ ہزار افراد سال در سال جلاوطن کیے جاتے تھے۔ ۱۸۴۰ء سے انھوں نے آوارہ لوگوں (ہماری لغفیات میں بغیر فن پر کفالت کرنے والوں) کو بھی جلاوطن کرنا شروع کردیا اور اس طرح انھوں نے تقریباً دس ہزار آدمی نکال پھینکے۔ ۱۸۶۳ء میں سخالن کا ریگستانی جزیرہ، جو اصل سرزمین کے منقطع ہونے کی وجہ سے بڑا سہولت بخش تھا، پسند آگیا اور اسے جلاوطنی کے لیے خود کفیل بنا یا گیا۔ جس کی وجہ سے اس نظام کے وسائل میں خاصا اضافہ ہوگیا۔ انیسویں صدی میں بحیثیت مجموعی پانچ لاکھ افراد جلاوطن ہوئے اور صدی کے اختتام تک ایک وقت میں موجود جلاوطنوں کی تعداد تین لاکھ تھی۔[۱]

صدی کے اختتام تک جلاوطنی کا طریقہ مختلف پہلوؤں سے وسعت اختیار کرنے لگا۔ اس کے نرم زاویے بھی برآمد ہوئے: "دو صوبوں کے فاصلے تک جلاوطنی"۔ اور "غیر ممالک میں جلاوطنی بھی"۔ اسے اس وقت اتنی بیرحمانہ سزا تصور نہیں کیا جاتا تھا جیسی کہ اکتوبر کے بعد سمجھی جانے لگی۔ انتظامی جلاوطنی بھی رائج ہوگئی، جو عدلیہ کے ذریعہ جلاوطنوں کی کمی کی بخوبی تلافی کردیتی ہے لیکن بہر طور جلاوطنی کی تحت واضح اور متعین اعداد میں ظاہر

کی جاتی تھی حتیٰ کہ تاعمر جلاوطنی بھی در حقیقت عمر بھر جلاوطنی نہیں ہوتی تھی۔ چیخوف نے سخالن میں لکھا ہے کہ دس سال کی جلاوطنی گزارنے کے بعد (یا چھ برس کے بعد اگر اس کا رویہ ہر طرح اطمینان بخش رہا ہو — جو بڑا مبہم معیار ہے، لیکن چیخوف کا قول ہے کہ اس کا نفاذ بہت عام تھا) جلاوطن کا نام بحیثیت کسان کی حیثیت سے درج کر لیا جاتا تھا اور وہ اپنی جائے پیدائش کے علاوہ وطن کے ہر حصے میں جا سکتا تھا۔

عہدِ زار کے انیسویں صدی کے جلاوطنی نظام کی ایک خصوصیت، جو مسلمہ تھی اور ہر شخص کو فطری محسوس ہوتی تھی لیکن آج ہمیں حیرت انگیز نظر آتی ہے۔ یہ تھی کہ یہ نظام صرف افراد سے واسطہ رکھتا تھا خواہ اس کے بارے میں فیصلہ عدالت نے کیا ہو یا انتظامی سطح پر ہوا ہو لیکن ہر فرد کو علیحدہ سزا دی جاتی تھی، کسی اجتماع کے ایک رکن کی حیثیت سے نہیں۔۔۔

جلاوطنی میں معمولِ زندگی اور سختی کا معیار الگ الگ دہائیوں میں مختلف رہا ہے اور جلاوطنوں کی مختلف نسلیں ہمارے لیے مختلف شہادتیں چھوڑ گئی ہیں۔ ایک سفری جیل سے دوسری میں منتقل کیے جانے والے قیدیوں کو بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑتی تھیں۔ لیکن پی۔ ایف۔ یعقوبود یچ اور لیو مالشانی ہمیں مطلع کرتے ہیں کہ سیاسی قیدیوں کو بڑی سہولت کے ساتھ سفر کرایا جاتا تھا۔ ایف۔ کون یہ بھی بتاتا ہے کہ سیاسی قیدیوں کے ساتھ پہریدار فوجی عام قیدیوں کے روبرو بھی اچھا سلوک کرتے تھے اور اسی وجہ سے مجرمین، سیاسی قیدیوں کا احترام کرتے تھے۔ کئی پشتوں تک سائبیریا کی آبادی جلاوطنوں کی مخالف رہی۔ انھیں سب سے خراب زمینیں دی جاتی تھیں اور سب سے کم تنخواہ والی ملازمتوں پر رکھا جاتا تھا اور کاشتکار اپنی لڑکیوں کی شادیاں ان کے ساتھ نہیں کرتے تھے۔ اشیائے خوردنی اور کپڑوں کے لیے پریشانی، بدنام اور گرسنہ یہ لوگ گروہ بنا لیتے تھے اور چوریوں کے ذریعے زندگی بسر کرتے تھے اور اس طرح مقامی باشندوں کو اور زیادہ غیر مطمئن کر دیتے تھے لیکن ان میں سے کوئی بات بھی سیاسی قیدیوں پر منطبق نہیں ہوتی۔ جو گذشتہ دالی دہائی سے کثیر تعداد میں متواتر وہاں پہنچنے لگے تھے۔ ایف۔ کون پھر رقم طراز ہے کہ یاکوٹ لوگ محبت اور خلوص کے ساتھ سیاسی قیدیوں کا خیر مقدم کرتے تھے اور انھیں ڈاکٹر، استاد اور افسران کے ساتھ اپنی جہدِ حیات میں قانونی مشیر کی حیثیت دیتے تھے۔ جن حالات میں سیاسی قیدی رہتے تھے وہ بلاشبہ ایسے تھے کہ انھیں سے متعدد دانشوروں (ایسے دانشور جنھوں نے اپنے مطالعے کا آغاز ہی جلاوطنی کے زمانے میں کیا تھا) کے طبقے ابھر آئے۔ مخصوص علاقوں کے بارے میں ماہرانہ معلومات رکھنے والے، ایتھنوگرافر، ماہرینِ لسانیات[۳۶] سائنسدان، مبلغین وغیرہ۔ چیخوف کو سخالن میں سیاسی قیدی نظر نہیں آئے اور اس نے ان کی بابت کوئی بیان نہیں چھوڑا ہے[۳۷]۔ مثال کے طور پر جب ایف۔ کون (۱) کو ارکوٹسک میں جلاوطن کر دیا گیا تو اس نے ترقی پسند اخبار، ووستوچنوئے اوبوزرینی (مشرقی ریویو) میں کام کرنا شروع کیا جس میں پالوس پیپلز ول پارٹی (عوامی خواہشات کی پارٹی) کے حمایتی اور مارکسی (کراسن) سب لوگ لکھتے تھے۔ یہ سائبیریا کا کوئی معمولی شہر نہیں تھا بلکہ ایک صوبائی دارالسلطنت تھا جس میں جلاوطنوں[۳۸] سے متعلق قوانین کے مطابق سیاسی قیدیوں کو بھی بھیجا جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ بینک اور تجارتی فرموں میں اور تدریسی میدان میں کام کرتے ہوئے اور استقبالیہ جلسوں میں مقامی دانشوروں کے ساتھ شانہ بشانہ نظر آئے اور جلاوطنوں نے ارکٹسک کے اخبار اشیپنوئی کرئی کے مضامین میں دخل پانے کی صورت نکال لی۔

جبکہ اس قسم کے مضامین کو روس کی سخت سنسر شپ کہیں اشاعت کی اجازت نہ دیتی۔ ادمسک کے جلاوطن کراسنویرسک کے ہڑتالیوں کو بھی اپنا اخبار بھیجتے تھے۔ جلاوطنوں کی کاوشوں سے کراسنویرسک بھی پرجوش خیالات والا شہر بن گیا۔ مینوسنسک میں قیام کے دوران جو جلاوطن باعمل کارکن مریانوف میوزیم کے اردگرد جمع ہوگئے تھے انھیں بے حد عزت دی جاتی تھی اور وہ انتظامی امور میں دخل اندازی کرسکتے تھے کہ انھوں نے مفرورین کے لیے پناہ گاہیں اور سرائیں کسی دشواری کے بغیر قائم کرلیں (ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ ان دنوں فرار کتنا آسان تھا) بلکہ شہر میں دسیے ۱۹۰۵ء کمیٹی کی کارروائیوں پر بھی ان کا قابو تھا۔ اور اگر جیخوف یہ کہتا ہے کہ سخالن میں مجرمین کے لیے حکومت کی جانب سے "سہولیات" انتہائی ذلیل اور احمقانہ انداز میں دی گئی تھیں جس کی وجہ سے اسے "زرعی غلامی یا غلاموں کی حکومت" کہنا مناسب ہوگا تو یہ بات از ابتدا تا عہدِ زار، سیاسی جلاوطنوں کے بارے میں صادق نہیں ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل سے روس میں سیاسی مجرموں کے لیے انتظامیہ کی طرف سے جلاوطنی کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور اسے فضول، رسمی اور دقیانوسی طریقہ" سمجھا گیا جو اپنا ناکارہ پن ثابت کرچکا تھا۔ (دگھکوف) ۱۹۰۶ء میں اسٹولی پن نے اسے قطعی ختم کردینے کے لیے اقدامات کا آغاز کردیا تھا۔

ریڈشچیف کے تئیں جلاوطنی کا کیا مفہوم تھا؟ اوسٹ ایلسکی اوسٹوروت بستی میں اس نے ایک لکڑی کا دو منزلہ مکان (ستم ظریفی ہے کہ دس روبل میں) خریدا اور وہاں اپنے بچوں نیز منہ بولی بہن (سالی؟) کے ساتھ رہتا تھا جو اس کی بیوی کی حیثیت رکھتی تھی۔ کسی نے اس سے کام کرانے کی بات کا تصور تک نہ کیا، وہ جس طرح مناسب سمجھتا، اپنا وقت گزارتا تھا اور اسے اوسٹ ایلم سرکاری علاقے میں ہر جگہ گھومنے پھرنے کی آزادی حاصل تھی۔ میخائلوفسکوٹ میں پشکن کی جلاوطنی کا کیا مطلب تھا؟ یہ بات وہ لوگ بخوبی سمجھ سکتے ہیں جو وہاں سیر و تفریح کے سلسلے میں ہو آئے ہیں۔ بہت سے دوسرے لکھنے والوں اور عوامی رہنماؤں کی جلاوطنی کی زندگی اسی قسم کی تھی۔ ترگنیف کا اسپاسکوے لٹووینوو میں اکساکوف کا دارنو میں (جو اس کی اپنی پسند تھی) تروبیتسکوئی کے ساتھ نیز چیسک جیل میں اپنی بیوی کے ساتھ علیحدہ کوٹھری میں رہتا تھا (جہاں اس کے ایک لڑکا تولد ہوا) اور جب ۴ برسوں کے بعد بحیثیت جلاوطن اس کا تبادلہ ارکوٹسک کردیا گیا تو ان کے پاس بہت بڑا ذاتی مکان تھا۔ اپنی نجی بگھی تھی۔ پہریدار تھے اور بچوں کے لیے فرانسیسی اتالیق تھے (قانون شعور ابھی ابتدائی دور میں تھا اور عوام دشمنوں یا تمام املاک کی ضبطی" سے روشناس نہیں ہوا تھا) ہرزن کو نوفگورود میں جلاوطنی کے دوران گورنر کے دفتر (گوبیرنیا) میں ایک عہدہ مل گیا تھا۔ جس پر اعلیٰ افسر پولیس اسے رپورٹیں فراہم کرتا تھا۔

جلاوطنوں کے ساتھ ملائمت کا یہ برتاؤ صرف سماجی نقطۂ نگاہ سے ممتاز و مشہور لوگوں تک ہی محدود نہ تھا۔ بیسویں صدی میں بھی بہت سے انقلابیوں اور مخالفین خاص طور پر بولشیکوں کو یہی درجہ ملتا رہا جو خطرناک نہیں سمجھے جاتے تھے۔ اسٹالن جو چار مرتبہ جیل سے فرار ہوا تھا۔ پانچویں بار جلاوطن کردیا گیا تھا۔ دور افتادہ وولوگڈا میں۔ ولادیم پوڈ بفسکی حکومت کے خلاف سرکش انداز میں مضامین لکھنے پر جلاوطن کیا گیا تھا تا نوت سے ماہا لوف! کیسا ظلم ہے کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ جب وہاں پہنچا تو کسی نے اسے جبراً کام پر جانے کے لیے مجبور نہیں کیا۔[۱]

لیکن اس قسم کی جلاوطنی کو بھی، جو ہمیں نرم نظر آتی ہے، ایسی جلاوطنی جس میں فاقہ کشی کا کوئی خطرہ نہیں تھا، خود جلاوطن لوگ بعض اوقات سخت کہتے تھے۔ بہت سے انقلابی بتاتے ہیں کہ جیل سے ہٹ کر وہاں روٹی حرارت، پناہ اور اپنے "یونیورسٹیوں کے تنازعات" کے لیے کافی وقت مل جاتا تھا، کسی جلاوطنی کے مقام پر جانا بہت تکلیف دہ نظر آتا تھا جہاں آپ اجنبیوں کے درمیان تنہا ہوتے تھے اور غذا و مکان حاصل کرنے کے لیے آپ اپنی فراست پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ جہاں ان باتوں کے لیے فکر ہونے کی ضرورت نہ تھی وہاں لوگ (مثلاً ایف۔ کون) ہمیں مطلع کرتے ہیں کہ حالات مزید خراب تھے: "ہولناک تنہائی..... سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ لوگوں کو بے عمل کر دیا جاتا تھا؟ واقعتاً ان میں سے کچھ نے پڑھنا ترک کر کے پیسہ کمانا تجارت کرنا شروع کر دیا تھا اور کچھ مایوسی کے عالم میں شراب نوش ہو گئے۔

لیکن یہ بے عملی ممکن کس طرح ہوئی؟ آخر مقامی باشندگان کیا اس کی شکایت نہ کرتے تھے کیونکہ ان میں خوش نصیب لوگ ہی شام کو اپنی کمر سیدھی کر سکتے تھے اس طرح بات کو صحیح طور پر کہا جائے تو جلاوطنوں کو جو تکلیف تھی وہ جگہ کی تبدیلی اور ڈھرے کی زندگی کے منتشر ہو کر اپنی جڑوں سے ہٹنے اور دیگر لوگوں کے ساتھ تعلقات کے منقطع ہونے کی وجہ سے ہوتی تھی۔

صحافی نکولائی نادیژدمن صرف دو برس میں حریت پسندی کے شوق سے باز آگیا اور بادشاہ کا وفادار خادم بن گیا۔ جنگلی اور وحشی مینشکوف نے جسے ۱۷۲۷ء میں بیریازوف جلاوطن کر دیا گیا تھا، وہاں ایک چرچ قائم کیا، مقامی باشندوں کو اس دنیا کی بے معنویت پر نصیحتیں کیں، اپنی ڈاڑھی بڑھالی، کسانوں کا لبادہ پہن کر ہر جگہ گھومتا رہا اور دو سال کے اندر مر گیا۔ ہم سوچتے رہ جاتے ہیں کہ آخر ڈشچیف کو اپنی جلاوطنی کے مقام پر اتنی ناقابل برداشت، روحانی کوفت پہنچانے والی کون سی بات نظر آئی تھی؟ پھر کبھی جب وہ سر دل پلٹ کر آیا تو اس درجہ خوفزدہ ہوا کہ خودکشی کر لی اس طرح پشکن نے میخائلوفسکوئے گاؤں سے، جو زمین پر ایک بہشت کی مانند تھا اور آدمی وہاں روزِ ابد تک رہنے کی آرزو کر سکتا تھا، ژوکوفسکی کو لکھا: "مجھے بچا لو (یعنی جلاوطنی سے۔ ایف۔ سیلین)، خواہ اس کی بجائے مجھے سولوفسکی کے قلعے میں یا معبدگاہ میں مقید کر دیا جائے!" اور یہ محض زبانی جمع خرچ ہی نہ تھا کیوں کہ اس نے گورنر کو بھی تحریری درخواست بھیجی تھی کہ اس کی جلاوطنی کو جیل کی قید میں تبدیل کر دیا جائے۔

ہمیں، جن کو معلوم ہے کہ سولوفسکی کس طرح کی جگہ ہے شاید یہ بات پوری طرح سمجھ میں نہ آئے۔ کس عجیب و غریب جذبے، مایوسی اور سادہ لوحی کے کس اتفاق کی وجہ سے وہ ظلم رسیدہ شاعر میخائلوفسکوئے چھوڑ کر جزیرۂ سولونکی کی قید کے لیے درخواست کر رہا تھا؟.....

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ جلاوطنی کی، صرف اپنی جگہ سے منتقل کیے جانے کی، آپ کو پابست بیٹھے رہنے کی دھمکی ہی ایک خاموش قوت ہے، ایسی قوت جسے قرونِ اولیٰ کے حکمراں بھی پہچانتے تھے اور جسے اووڈ نے بہت پہلے آزما لیا تھا

کھو کھلا پن سب سے بے یقین ہالیس زندگی جسے زندگی کہا ہی نہیں جا سکتا۔

ہمارا جو شاندار انقلاب، ظلم کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے آیا تھا، اس کے حربوں کی فہرست میں جلاوطنی بھی شامل تھی، کہیں چوتھے نمبر پر!

لیکن انقلاب ابھی مشکل سے دو قدم چلا تھا اور اس کے پاؤں ابھی لغزش ہی کر رہے تھے وہ اپنی طفولیت کے دور ہی میں تھا کہ اس نے محسوس کر لیا کہ جلاوطنی کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ روس میں جلاوطنی تقریباً ایک سال یا شاید تین سال تک رائج نہیں رہی لیکن کچھ ہی عرصے بعد جسے اب ملک بدری کہتے ہیں —— ناپسندیدہ عناصر کا اخراج —— اس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں ایک قومی ہیرو کے، جو بعدازاں سوویٹ یونین کا مارشل بنا، وہ الفاظ بعینہٖ پیش کر رہا ہوں جو اس نے صوبہ تانبوف میں ۱۹۲۱ء کے آس پاس کہے تھے: "ڈاکوؤں (یعنی پارٹیزنوں — الف سین) کے خاندانوں کی وسیع پیمانے پر جلاوطنی کنسنٹریشن کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ وسیع و عریض کنسنٹریشن کیمپ (نظربندی کیمپ) بنائے گئے تھے جن میں ان خاندانوں کو عبوری مدت میں بند رکھا جا سکے" (الفاظ کو خط کشیدہ میں نے کیا ہے۔ الف سین)۔[۵]

صرف اس وجہ سے جنگی کیمونزم* کے اختتام سے پہلے تک ایک باقاعدہ جلاوطنی کا طریق عمل شروع کرنے میں تاخیر ہوتی رہی کہ لوگوں کو دوسرے مقامات پر منتقل کرنے، راستے میں ان پر پہرہ دینے کے مقابلے میں ان کو گولی مار دینے میں سہولت ہوتی تھی۔ اس کے کچھ عرصے بعد ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو وزارت داخلہ کے تحت، سماجی اعتبار سے خطرناک افراد اور سوویٹ مخالف پارٹیاں یعنی بولشویکوں کے علاوہ دیگر تمام پارٹیوں کے اراکین سے نمٹنے کے لیے ایک مستقل جلاوطنی کمیشن قائم کر دیا گیا۔ جس کے لیے بجٹ میں تین برس تک بندوبست کیا گیا۔[۶] اس طرح تیری دہائی کی ابتدا میں بھی جلاوطنی ایک معروف اور باقاعدہ کام کرنے والا ادارہ رہی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مجرموں کے لیے سزا کے طور پر جلاوطنی کا احیاء نہیں کیا گیا، اصلاحی مشقتی کیمپوں کی ایجاد پہلے ہی ہو چکی تھی اور یہ ان لوگوں کو نگل چکے تھے اس کے برعکس سیاسی جلاوطنی پہلے سے زیادہ سہولت بخش بن گئی، مخالف اخبارات کی عدم موجودگی میں اب جلاوطنی کی خبریں شائع نہیں ہوتی تھیں اور جلاوطنوں کے اقربا اور ان کے قریبی احباب کو جنگی کیمونزم کی گولی سے اڑانے کی پالیسی کے بعد عجلت یا غصے کے عالم میں نہ دی جانے والی تین سال کی جلاوطنی کی سزا ایک جذباتی —— تربیت کا وسیلہ قسم کی چیز نظر آتی تھی۔

لیکن اس نرم اور ہلکی سی جلاوطنی کے بعد لوگ اپنی جائے پیدائش پر واپس نہیں آتے تھے۔ اگر وہ پلٹتے بھی تھے تو انھیں جلد ہی پھر گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ جو ایک بار گرفت میں آ گئے وہ مجمع الجزائر کے چہار طرف دائرے میں طواف کرتے رہتے تھے اور آخری قوس کا خاتمہ ہمیشہ کسی خندق میں ہوتا تھا۔

چونکہ لوگ اس درجہ لاپروا ہیں کہ دوسروں کی بات پر فوراً یقین کر لیتے ہیں، اس لیے حکومت کا عندیہ اُن کی سمجھ میں رفتہ رفتہ ہی آ سکا۔ بات صرف یہ تھی کہ حکومت ابھی اتنی مستحکم نہیں ہوئی تھی کہ تمام ناپسندیدہ لوگوں کو ایک ساتھ جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ اس لیے فی الحال انھیں ابھی زندگی سے نہیں بلکہ صرف اپنے ساتھیوں کے حافظے سے دور کیا جا رہا تھا۔

جلاوطنی کے دوبارہ اجراء میں مزید سہولت اس وجہ سے بھی ہوئی کہ پرانے ذرائع آمد ورفت ابھی ضائع اور سڑکیں بند نہیں ہوئی تھیں یا تباہ نہیں ہوئی تھیں جبکہ سائبیریا میں آرکیول کے نزدیک دولوگڈا کے قرب وجوار میں جلاوطنی کے مقامات ذرا بھی تبدیل نہیں ہوئے تھے اور انھیں بھی قطعی حیرت نہیں ہوتی (تعمیرِ حکومت والا نقطۂ نظر یہیں نہیں رک جاتا؛ کرۂ ارض کے چھوٹے حصے پر انگلی گھماتے ہوئے وہ طویل و عریض قازقستان پر اس کے جمہوری یونین میں شامل ہوتے ہی پہنچ گیا، جو اپنی لمبائی چوڑائی کی وسعت کے اعتبار سے جلاوطنی کے لیے نہایت مناسب ہوگا اور یوں تو خود سائبیریا میں بہت سے ایسے مقامات جو خدا کو ناپسند تھے، تلاش کیے جانے کے منتظر تھے!)

لیکن جلاوطنی کے طریق کار میں ایک خامی تاحال باقی تھی۔ جلاوطنوں کا دوسروں کی کمائی پہ زندگی بسر کرنے کا رویہ، جو یہ سوچتے تھے کہ ان کی کفالت حکومت پر فرض ہے۔ زارشاہی حکومت یہ جرات نہ کر سکی کہ قومی پیداوار بڑھانے کے لیے جلاوطنوں کو مجبور کرنے کی کوشش کرے اور پیشہ ور انقلابی کام کرنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ یاکوشیا میں ایک جلاوطن کو پندرہ دلیسیاٹین زمین (جتنی کہ اس دور میں ایک کولخوزکن کے پاس ہوتی تھی اس سے ۶۵ گنا) حاصل کرنے کا حق تھا۔ اگر انقلابی زراعت کے کام میں ہاتھ ڈالتے تھے تو یاکوٹ لوگ جنھیں زمینوں سے بڑی انسیت تھی۔" ان سے وہ زمین خرید لیتے تھے: اسے پٹے پر دے کر فصلوں اور گھوڑوں کے توسط سے اس کا پیسہ ادا کرتے تھے اس طرح انقلابی خالی ہاتھ آتا تھا اور فوراً یاکوٹوں کا مہاجن بن جاتا تھا مزید برآں زارشاہی حکومت اپنے جلاوطن سیاسی، حتیٰ لینین کو بارہ روبل ماہانہ گزر بسر کے لیے اور ۲۲ روبل سالانہ لباس کا وثیقہ ادا کرتی تھی۔ لیپے شنسکی نے لکھا ہے[۵] کہ لینن بھی بارہ روبل ماہانہ وصول کرتا تھا (اور وصول کرنے سے انکار نہیں کرتا تھا) جبکہ خود لیپے شنسکی کو ۱۶ روبل ملتے تھے کیوں کہ وہ محض جلاوطن نہیں تھا۔ بلکہ ایک جلاوطن سرکاری کارکن تھا اب ایف۔ کون ہمیں مطلع کرتا ہے کہ یہ رقم بہت ہی کم تھی لیکن ہمیں معلوم ہے کہ سائبیریا میں قیمتیں، روس کی قیمتوں کی بہ نسبت نصف یا ایک ثلث تھیں اور اس طرح جلاوطنوں کے لیے حکومت کا گزارہ الاؤنس دراصل ضرورت سے زیادہ سخاوت کی مثال تھا۔ اس کی وجہ سے مثال کے طور پر لینین پورے تین سال تک انقلاب کے اصولوں کا مطالعہ آرام کے ساتھ کرنے کے قابل ہو سکا اور اسے اس بات کی ذرا بھی فکر نہیں کرنی پڑی کہ ضروریات زندگی کہاں سے پوری ہوں گی۔ مارتوف نے لکھا ہے کہ میں اپنے مالک مکان کو پورے کھانے اور کرائے مکان کے طور پر پانچ روبل دیتا تھا اور بقیہ رقم کتابوں پر صرف کرتا تھا یا فرار ہونے کے لیے محفوظ رکھتا تھا۔ انارکسٹ اے پی، اولانوفسکی کہتا ہے (کہ تروخان علاقے میں جہاں وہ اسٹالن کے ہمراہ تھا) جلاوطنی کے ایام میں مجھے عمر بھر میں پہلی مرتبہ پیسہ بچانے کی گنجائش نظر آئی۔ اس کا کچھ حصہ وہ ایک آزاد لڑکی کو، جس سے اس کی ملاقات راستے میں کسی مقام پر ہو گئی تھی بھیج دیتا تھا اور اسے پہلی بار کوکو کا ذائقہ چکھنے کی حیثیت نصیب ہوئی تھی۔ ہرن کا گوشت اور اسٹرزن مچھلی وہاں بغیر قیمت کے مل جاتی تھی اور ایک عمدہ پختہ مکان کی قیمت بارہ روبل (ایک مہینے کا گزارہ الاؤنس) جیسی تھی۔ کسی بھی سیاسی جلاوطن کو دیگر کسی چیز کی

ضرورت نہیں پیش آتی تھی اور تمام سرکاری ملازمتوں سے تعلق رکھنے والے جلاوطن لوگ رقوم کی صورت میں الاؤنس وصول کرتے تھے اور وہ اچھے کپڑے زیب تن کرتے تھے (وہ گرم کپڑوں میں آتے تھے)

یہ سچ ہے کہ جو جلاوطن عمر بھر کے لیے آباد ہوتے تھے (سوویٹ دور کا بائیسٹوو کی) انھیں نقد الاؤنس نہیں دیا جاتا تھا لیکن انھیں بھیڑ کی کھال کے کوٹ، پہننے کے تمام کپڑے اور بوٹ سرکاری خزانے سے مفت ملتے تھے۔ چیخوف نے بتایا ہے کہ سخالن میں آباد لوگوں کو بنیادی ضرورت کی چیزیں حکومت کی طرف سے اشیا کی شکل میں بغیر قیمت کے ملتی تھیں، مردوں کو دو یا تین برس کے لیے اور عورتوں کو اپنی سزا کی پوری مدت تک۔ اور کہ اس میں روزانہ چالیس زولوٹنک (یعنی دو سو گرام) گوشت اور تین پونڈ (یعنی ایک کلو دو سو گرام) ڈبل روٹی شامل تھی اتنا ہی جتنا کہ ہماری دور کشا کی کانوں میں اسٹنی نووائٹوں[*] کو معیار سے پچاس فی صد زیادہ پیدا کرنے پر ملتا ہے (یہ سچ ہے کہ چیخوف کے مطابق روٹی خراب آٹے کی بنی ہوئی اور نیم پختہ ہوتی تھی لیکن کیمپوں میں کہاں اس سے بہتر ہوتی ہے) انھیں بھیڑ کی کھال کا ایک کوٹ، ایک سوتی کوٹ اور کئی جوڑ جوتے سرکار کی جانب سے دیے جاتے تھے۔ زارشاہی حکومت کا ایک اور دستور یہ تھا کہ جلاوطنوں کو دانستہ ان کی اشیاء کی زیادہ قیمتیں دی جائیں تاکہ انھیں پیداوار بڑھانے کی تحریک ملے (چیخوف اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ سخالن کی نوآبادی سے روس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تھا اس کے برعکس خود روس اس کی کفالت کرتا تھا)

کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے سوویٹ سیاسی جلاوطنی کی پالیسی ایسی کمزور اساس پر کھڑی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ۱۹۲۸ء میں سرکاری ملازمین کی کل روس کانگریس نے محسوس کیا کہ یہ طریق عمل غیر تشفی بخش ہے اور درخواست کی کہ "دور افتادہ اور علیحدہ علیحدہ مقامات پر نوآبادیاں اور جلاوطنی کے مقامات تیار کیے جائیں اور غیر معینہ (یعنی لامحدود) مدت کی سزاؤں کا طریقہ رائج کیا جائے"[۱۱]۔ ۱۹۲۹ء انھوں نے جبری مشقت کی بات سے مربوط جلاوطنی کی پالیسی کو روز افزوں ترقی دینا شروع کیا[۱۲]۔

"جو کام نہ کرے گا وہ کھا بھی نہ سکے گا" یہ ہے اشتراکی اصول۔ اور سوویٹ جلاوطنی کی پالیسی اس اشتراکی اصول کی اساس پر ہی استوار کی جا سکتی تھی لیکن اشتراکیت پسند ہی وہ افراد تھے جو جلاوطنی کے دوران مفت کھانا کھانے کے عادی تھے چونکہ سوویٹ حکومت کو فوری طور پر اس روایت شکنی کا حوصلہ نہیں ہوا اس لیے اس کا خزانہ بھی جلاوطنوں کو گزارے کی رقوم دینے لگا۔ ان سب کو نہیں، انقلاب دشمنوں کو بھی نہیں بلکہ صرف (اشتراکی) پولٹوں (سیاسی جلاوطنوں) کو لیکن ان کی درجہ بندی کر کے: مثال کے طور پر ۱۹۲۷ء میں چمکینٹ میں ایس۔ آر اور ایس۔ ڈی[*] جلاوطنوں کو چھ روبل ماہانہ دیے جاتے تھے اور ٹراٹسکی پرستوں کو تیس روبل (آخر ش وہ اب بھی کامریڈ تھے "تا حال بولشویک تھے") اتنا ہی تھا کہ اب یہ زارشاہی کے روبل نہیں نہیں تھے، چھوٹے سے چھوٹے کمرے کا کرایہ دس روبل ماہانہ تھا اور بیس کوپک یومیہ سے صرف تھوڑا سا سامان ہی خریدا جا سکتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات سخت تر ہوتے گئے۔ ۱۹۳۲ء تک وہ "پولٹوں" کو چھ روبل ۲۵ کوپک ماہانہ دینے لگے لیکن اس سال جیسا کہ مجھے بذات خود اچھی طرح یاد ہے (راشن سے باہر) ایک کلوگرام نیم پختہ "بازاری" رائی کی روٹی تین روبل میں آتی تھی۔ اشتراکیوں کے لیے ایک چیز باقی رہ گئی تھی،

زبان کی تدریس نہیں، نظریاتی تخلیقات بھی نہیں بلکہ جان توڑ محنت' جو لوگ کام کرنے گئے۔ ان سے جی۔پی۔یو نے فی الفور یہ حقیر سا الاؤنس بھی چھین لیا جو انھیں اب تک ملتا رہا تھا۔

لیکن اگر وہ کام کرنے پر آمادہ تھے تو بھی جلاوطنوں کے لیے مزدوری کا لینا آسان کام نہیں تھا۔ تیسری دہائی کا اختتام ہمارے ملک میں وسیع بے روزگاری کے دور کی حیثیت سے ناقابلِ فراموش ہے۔ ملازمت حاصل کرنا انھیں لوگوں کا اختیارِ خصوصی تھا جن کا ریکارڈ اور ٹریڈ یونین کارڈ بالکل بے داغ ہو اور جلاوطن لوگ اپنی تعلیم اور تجربے کا حوالہ دے کر مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ ان کے سر پر مقامی پولس ہیڈ کوارٹرس کی تلوار بھی معلق رہتی تھی اس کی اجازت کے بغیر کوئی روزگار دینے والا کسی جلاوطن کو لینے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔ (سابق جلاوطن بھی اچھی ملازمت حاصل کرنے کی توقع نہ کرسکتا تھا۔ اس کے پاسپورٹ کا اندراج ایک رکاوٹ کا کام کرتا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں کازان میں، جیسا کہ پی۔ ایس ــــ وہ بتاتا ہے، بالکل مایوس ہو کر کچھ تعلیم یافتہ جلاوطنوں کا ایک گروہ سڑک مزدوری کا کام کرنے لگا۔ پولس ہیڈ کوارٹرس نے انھیں پھٹکارا: اس مظاہرے کا مطلب کیا ہے؟ لیکن دوسرا کام حاصل کرنے میں معاونت کسی نے نہیں کی اور گرگیوری۔ پی نے افسر تحفظ کو اسی کی زبان میں جواب دیا: "آپ کا ایک عمدہ سا مقدمہ آنے والا ہے نا؟ ہم اس میں خریدے ہوئے گواہ بن سکتے ہیں؟"

انھیں ہر لقمے کو دوبارہ گننا پڑتا تھا۔ اس عالم کو پہنچ گئی تھی روس کی سیاسی جلاوطنی کی پالیسی! بحث کرنے یا عقائد کے خلاف تردیدی مراسلے بھیجنے کا وقت نہیں رہ گیا تھا۔ جس ایک فکر سے وہ آزاد تھے وہ یہ تھی کہ بے مقصد تنہائی کو کیسے کاٹا جائے..... اب ان کی فکر کا ایک موضوع تھا، بھوکوں مرنے سے کیسے بچیں؟ اور مخبر بن کر اپنے آپ کو اخلاقی زوال سے کیسے بچائیں؟

صدہا سال پرانی غلامی سے بالآخر آزاد ہو جانے والے ملک میں ابتدائی سوویٹ کے زمانے میں سیاسی جلاوطنوں کا فخر اور آزادی پھوٹے ہوئے غبارے کی مانند ختم ہو گئے۔ یہ بات ثابت ہوئی کہ سابقہ حکومت نے سیاسی قیدیوں کی جو طاقت بدقت تسلیم کی تھی وہ محض قیاسی تھی۔ اس قوت کی ولادت اور پرورش ملک میں رائج رائے عامہ کی وجہ سے ہوئی تھی۔ ایک بار رائے عامہ کی جگہ منظم رائے کے نفاذ کے بعد تردیدی مراسلوں اور حقوق کا غوغا مچانے پر بھی جلاوطنوں کو عالمِ بے بسی میں احمق اور بھٹکے ہوئے جی۔پی۔یو کے لوگوں اور خفیہ غیر انسانی احکامات کے نشانہ کا شکار ہونا پڑا (دودیرزنسکی اس وقت تک بقیدِ حیات تھا اور ان میں سے پہلے حکم پر اس نے ہاتھ لگایا تھا) ایک بھی گھر گھراتی ہوئی آواز گھٹے ہوئے گلے سے بلند ہونے والا ایک بھی لفظ جو آزاد لوگوں کو آپ کے وجود کی یاد دلاتا ہو، اب ممکن نہ تھا۔ اگر کوئی جلاوطن مزدور اپنی قدیم فیکٹری کو کوئی خط بھیجتا تو پڑھنے والا مزدور (جیسا کہ واسیلی کرتو ویچ بگیوشن نے لینن گراد میں کیا تھا) اپنے آپ کو فی الفور جلاوطن قرار دے لیتا تھا۔ اب جلاوطنوں کے نقد بھتے، وسائلِ زندگی ہی نہیں ختم ہو گئے تھے بلکہ تمام اختیارات بھی ختم ہو گئے جی۔یو۔پی ان کی جلاوطنی کی مدت میں اضافہ کرانے کے لیے، انہیں گرفتار کرنے کے لیے یا انھیں کسی اور جگہ پہنچانے کے لیے اس زمانے سے کہیں زیادہ آسانی محسوس کرتا تھا جب وہ آزاد سمجھے جاتے تھے۔ ان سے بے تکلف انسانوں کی بجائے کٹھ پتلیوں جیسا برتاؤ کیا جا سکتا تھا، انھیں اس قسم کے وسائل سے لرزہ براندام کر دینا بہت آسان تھا جیسے کبھی چکینسٹ ہی استعمال کیے جاتے تھے: یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ جلاوطنوں کی بستی جو بیس گھنٹے کے اندر ختم

کردی جائے گی۔ ان چوبیس گھنٹوں میں جلا وطنوں کو یہ کام کرنے تھے، اگر وہ کوئی کام کر رہے ہوں تو اسے سبکدوش ہونا، اپنے مکان گرانا، اپنی گھریلو چیزوں کو ٹھکانے لگانا، سفر کے لیے تیاری مکمل کرنا اور ایک مقررہ وقت پر روانہ ہو جانا۔ یہ کام حکومت کی نگرانی میں قیدی بن کر سفر کرنے کی بہ نسبت آسان نہیں تھا! نہ ہی جلا وطن کا مستقبل اس قیدی کے مقابلے میں زیادہ روشن تھا۔

لیکن ذرا دیر کے لیے عوام کی خاموشی اور جی۔ پی۔ یو کے بھاری دباؤ کو فراموش کر دیجیے۔ یہ جلا وطن خود کس قسم کے تھے؟ یہ پارٹی کے اراکین کہلاتے تھے لیکن پارٹیاں کہاں تھیں، میں کیڈٹوں (روسی لبرل لوگوں) کی بات نہیں سوچ رہا ہوں۔ کیڈٹ کوئی باقی ہی نہ رہا تھا، ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا —— بلکہ یہ پوچھ رہا ہوں کہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک برائے نام ایس۔ آر یا مینشویک ہونے کا مطلب کیا تھا؟ ملک میں کہیں بھی ان ناموں سے منسوب کوئی باعمل گروہ نہیں تھے۔ بہت دنوں سے انقلاب کے وقت سے ہی، دس طوفانی سالوں میں ان کے پروگرام کی دوبارہ جانچ نہیں کی گئی تھی اور اگر یہ پارٹیاں دفعتاً زمین سے برآمد ہو جائیں تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ جو کچھ ہو چکا ہے اس کا وہ کیا تجزیہ کریں گے اور آگے کے لیے کیا تجویزیں پیش کریں گے اب کافی مدت سے سب اخبارات نے ان کا تذکرہ فعل ماضی کے ساتھ کیا تھا اور باقی ماندہ ممبران اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ رہتے تھے، ملازمتیں کرتے تھے اور اب اپنی پارٹیوں کے بارے میں کچھ بھی نہ سوچتے تھے۔ لیکن جی۔ پی۔ یو کی "...." میں ایک بار درج ہو جانے والے نام مٹنے والے نہیں ہوتے تھے۔ رات میں جاری کردہ ایک اشارے پر ان بکھرے ہوئے خرگوشوں کو ان کے بلوں سے پکڑ لیا گیا۔ اور سفری جیلوں سے گزر کر، مثال کے طور پر بخارا پہنچا دیا گیا!

اس طرح آئی۔ وی۔ اسٹولیا روف ملک کے کونے کونے سے اکٹھے کیے والے آر۔ ایس اور ایس ڈی کے ان لوگوں سے ملنے کے لیے ۱۹۳۰ء میں پہنچا جنھیں بڑھاپے نے لیا تھا۔ یہ جس زندگی کے عادی تھے اُس سے ایک جھٹکے میں الگ کر دیے گئے تھے اور ان کے پاس موجودہ سیاسی صورتحال کا جائزہ لینے، اس پر بحث کرنے اور اس قیاس آرائی کے لیے اس کے سوا اور کچھ نہیں رہ گیا تھا کہ تاریخ کس راہ پر گامزن ہوتی اگر صرف..... اور اگر صرف.....

اس طرح ان کے دشمنوں نے ان سے ایک سیاسی پارٹی ہی نہیں چھین لی بلکہ ایک خطرے کا نشان بھی گرا دیا!

تیسری دہائی کے جلا وطن بتاتے ہیں کہ اس زمانے میں واحد زندہ اور باعمل پارٹی زیونسٹ اشتراکی پارٹی تھی جس کی جاندار نوجوان تنظیم ہیشومر اور اس کی قانونی "ہیہالوٹز" تنظیم تھی جو کریمیا میں یہودی زرعی کمیون کے قیام کے لیے قائم کی گئی تھی۔ ۱۹۲۶ء میں تمام مرکزی کمیٹی کو جیل میں ڈال دیا گیا اور ۱۹۲۷ء میں پندرہ سولہ سالہ اور اس سے بھی کمسن ہمیشہ مسرور رہنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کو کریمیا سے پکڑ کر جلا وطن کر دیا گیا۔ انھیں ٹرٹوکل اور دیگر سخت مقامات میں بھیجا گیا۔ یہ واقعی ایک پارٹی تھی۔ پختہ اتحاد، مستقل مزاجی کی حامل اور یہ نظریہ رکھنے والی کہ وہ حق بجانب ہے لیکن ایک مقصد ایسا نہ تھا جس پر سب اتفاق رائے کر سکتے مقصد ذاتی اور امتیازی تھا۔ اپنے ذاتی فلسطین میں، ایک قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا۔ کمیونسٹ

پارٹی جس نے اپنی مرضی سے اپنے مادرِ وطن کا خیال ترک دیا تھا۔ دوسروں میں تنگ نظر قوم پرستی کو برداشت نہ کر سکتی تھی۔[141]

جلا وطنی کی چوتھی دہائی شروع ہونے سے پہلے تک باہمی امداد کا طریقہ چلتا تھا اس طرح چمکنیت میں، جہاں کام ملنا سہل تھا، ایس۔ آر۔ ایس۔ ڈی اور انارکسٹ جلا وطنوں نے پارٹی کے "شمال والے بے روزگار ساتھیوں کی مدد کی غرض سے خفیہ طور پر امداد باہمی فنڈ قائم کیا تھا۔ کھانا پکانے اور بچوں کی نگہداشت کے لیے برادریوں نے انتظام کیے اور اس کے ساتھ ہی لازماً ہونے والی تقاریب اور اجتماعوں۔ مصارف بھی برادری والے مل کر برداشت کرتے تھے وہاں جلا وطنی کے عالم میں (انقلاب اکتوبر کی سالگرہ منانے سے علی الاعلان انکار کرتے ہوئے) یوم مئی وہ سب اکٹھا ہو کر مناتے تھے۔ لیکن جب چوتھی دہائی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی تو یہ سب کچھ ندارد ہو گیا ہر جگہ پولس کی عقابی نظر مل کر بیٹھنے والوں پر لگی رہتی تھی۔ قیدی اس خوف سے ایک دوسرے سے دور رہنے کی کوشش کرتے تھے کہ کہیں این۔ کے۔ وی۔ ڈی۔ ان پر تنظیم بنانے کا شبہ نہ کرنے لگے اور انھیں کسی نئے الزام کے تحت گرفتار نہ کرلے" (یہ تو ان کے ساتھ ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا) اس طرح وہ حکومت کے طے کردہ دائرے میں ہی ایک دوسری قسم کی خود ساختہ جلا وطنی، احساسِ تنہائی میں پہنچ جاتے تھے (فی الحال اسٹالن ان کے لیے یہی چاہتا تھا)

مقامی آبادی کی مخالفت کے باعث جلا وطن لوگ مزید کمزور پڑ گئے مقامی لوگوں کو جلا وطنوں سے دوستانہ تعلقات رکھنے پر پریشان کیا جاتا تھا اور اس جرم پر لوگوں کو خود جلا وطن کر دیا جاتا تھا اور نابالغوں کو کوسوموں سے خارج کر دیا جاتا تھا۔

ان کی حیثیت اس وجہ سے مزید کمزور ہو گئی کہ پارٹیوں کے مابین غیر دوستانہ تعلقات جو سوویٹ دور میں پیدا ہو گئے تھے۔ تیسری دہائی کے وسط سے شدت پکڑ گئے اور بہت سے ٹراٹسکی نواز جو اپنے سوا کسی دوسرے کو سیاسی قیدی نہیں تسلیم کرتے تھے، جلا وطن ہو کر آئے۔

لیکن تیسری دہائی میں صرف اشتراکیوں کو ہی جلا وطن نہیں کیا گیا: دراصل بیشتر جلا وطن (اور یہ بات ہم آنے والے سال میں زیادہ صحیح ثابت ہو رہی تھی) قطعاً اشتراکی نہیں تھے۔ کسی پارٹی سے تعلق نہ رکھنے والے دانش ور، باطنی اعتبار سے وہ آزاد لوگ جن کی وجہ سے نئی حکومت کو مستحکم ہونے میں دشواری پیش آرہی تھی، کثیر تعداد میں آئے اور بیشتر دلوگوں میں سے (یعنی انقلاب سے پہلے والے نظام حکومت سے متعلق لوگ) ایسے افراد بھی آئے جو خانہ جنگی کی دست برد میں نہیں آئے تھے اور نوجوان لڑکے بھی آئے: کسی قسم کا ناچ گانا کرنے کے جرم میں۔[15] اور روحانیت میں عقیدہ رکھنے والے آئے۔ توہم پرست آئے پادری آئے ابتدا میں انھیں مذہبی رسوم ادا کرنے کا حق تھا اور محض خدا پرست یا عیسائی ہونے کے جرم میں، یا اسے روسی الفاظ میں کہا جائے تو کرسٹلنے (دہقان) آئے۔

وہ سب اس حفاظتی پولس کے زیرِ نگران آ گئے اور ایک دوسرے سے منقطع کر دیے گئے اور شل پڑ گئے۔

ملک کے عوام کی بے حسی کی وجہ سے ہر طرح کی طاقت سے محروم ان جلا وطنوں میں فرار کی خواہش بھی معدوم ہو گئی۔ زار شاہی عہد میں جلا وطنوں کے لیے فرار ہو جانا ایک پُر لطف کھیل تھا۔ اسٹالن کے

پانچ بار یا نوگنی کے چھ مرتبہ فرار ہونے کی بات پر ذرا غور کیجیے۔ ان کے سر پر گولی کا یا کنٹورگا کا کوئی خطرہ نہیں منڈلاتا تھا بلکہ صرف یہ خطرہ تھا کہ راستہ بدل دینے والے سفر کے بعد اپنی جلاوطنی کے پرانے مقام پر کس طرح آباد ہو سکیں گے۔ لیکن ایم۔ وی۔ ڈی نے جو بیش از بیش بیہودہ اور ظالم ہوتی جا رہی تھی۔ تیسری دہائی کے وسط سے اس پارٹی کے جلاوطنوں پر اجتماعی ذمہ داری عائد کر دی۔ اگر تم میں کوئی فرد فرار ہوا تو تمہاری پوری برادری کو اس کے لیے جوابدہی کرنی پڑے گی! اب تک ماحول میں اتنا حبس ہو گیا تھا، دباؤ اتنا شدید ہو گیا تھا کہ اشتراکیوں نے، جو کچھ ہی دن پہلے تک اتنے مغرور اور ناقابلِ شکست ہو رہے تھے، یہ ذمہ داری تسلیم کر لی! انھوں نے پارٹی کی تجاویز میں بذاتِ خود انھیں فرار ہونے سے باز رکھا!

یوں بھی وہ کہاں فرار ہو سکتے تھے؟ کیا کوئی ایسی برادری تھی جس کے پاس وہ فرار کے بعد پناہ لے سکتے تھے؟

نظریاتی دلائل تیار کرنے والے ماہرین نے اس فیصلے کی بنیادیں ہوشیاری سے تیار کر دیں: یہ فرار کے لیے مناسب وقت نہیں ہے، ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔ اصل میں یہ ذرا سی بھی جد و جہد کرنے کے لیے "مناسب وقت نہیں تھا۔" انھیں اس کے لیے بھی انتظار کرنا ہوگا، چوتھی دہائی کے آغاز میں۔ این۔ دائی وینڈ ٹیلیسٹم نے لکھا ہے کہ چیرڈنسک کے اشتراکی جلاوطنوں نے مدافعت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس وقت بھی، جب انھوں نے محسوس کر لیا کہ ان کی تباہی لازمی ہے۔ ان کی واحد توقع یہ تھی کہ ان کی جلاوطنی کی مدت میں اضافہ ہو جائے گا۔ اور جب تک انھیں حراست میں نہیں لیا جاتا انھیں پھر وہیں آباد ہونے کی اجازت مل جائے گی۔ اس طرح ان کی قدرے سہولت سے بسر ہونے والی زندگی تباہ نہ ہوگی۔ ان کا واحد اخلاقی مطمحِ نظر، تباہی کو سامنے دیکھنے کے باوجود یہ تھا کہ اپنا انسانی وقار برقرار رکھ سکیں۔

کنٹورگا کے بعد، جہاں ہم روندے ہوئے اور تنہا فرد سے تبدیل ہو کر ایک طاقتور کل میں متشکل ہو گئے تھے، یہ جان کر ہمیں عجیب سا احساس ہوتا ہے کہ یہ اشتراکی، جو کسی زمانے میں ایک عظیم کل تھے، ریزہ ریزہ ہو کر مجبور اکائیوں میں بٹ گئے تھے پھر گزشتہ دو دہائیوں میں سماجی جانداروں کی شکل میں ہماری زندگی بتدریج وسعت اختیار کرتی رہی ہے۔ پھول کر بڑھ رہی ہے۔ ہم سانس اندر لے رہے ہیں۔ اس وقت یہ بتدریج سکڑ رہی ہے، ہم سانس باہر نکال رہے تھے!

اس لیے ہمارے دور کا اس زمانے کے بارے میں فیصلہ کرنا بھونڈا سا لگتا ہے۔

علاوہ ازیں جلاوطنوں کے ساتھ سلوک میں سختی کی متعدد مختلف سطحیں تھیں اور اس کی وجہ سے بھی انہیں نفاق پیدا ہوتے اور کمزوری آتی تھی۔ شناختی کارڈوں کی تجدید کرنے کے درمیانی وقفے بھی الگ تھے (کچھ کی تجدید ہر ماہ کی جاتی تھی اور اس کی خانہ پری تکلیف دہ تساہل کے ساتھ کی جاتی تھی) اگر سب سے نچلے طبقے میں پہنچ جانے کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوں تو بات علیحدہ ہے ورنہ آپ کو ضابطوں کی تعمیل کرنی پڑے گی۔

جلاوطنی کا پہلا دور چوتھی دہائی کی ابتدا سے پہلے تک جاری رہا یہ۔ جلاوطنی نہ تھی بلکہ "اپنی مرضی کی سکونت تھی..... بشرطیکہ....." اس عالم میں سزا یافتہ شخص (مینوسنک یا — بشرطیکہ) کسی خاص جگہ پر بسنے کی ہدایت نہیں کی جاتی تھی بلکہ اسے کسی بھی شہر کا انتخاب کرنے کی آزادی حاصل ہوتی تھی کہ شہروں کے علاوہ ایکبار جگہ کا انتخاب کر لینے کے بعد وہ ان تین سالوں کے لیے اس مقام تک محدود ہو جاتا تھا۔ "بشرطیکہ" کو جی۔ پی۔ یو کے پاس باقاعدگی سے حاضری نہیں دینی پڑتی تھی۔ لیکن اسے اس علاقے سے باہر جانے کا اختیار نہیں تھا۔ وسیع بے روزگاری کے دوران، روزگار دفتر "بشرطیکہ" کو کام نہیں دیتے تھے لیکن اگر وہ کسی ترکیب سے کام حاصل کر لیتا تھا تو مالکوں پر اسے برخاست کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جاتا تھا۔

"بشرطیکہ" اس خطرناک کیڑے کو اور نیچے لاتا تھا اور اگر گردن ڈال کر مناسب انداز میں گرفتاری کے لیے اپنی باری کا انتظار کیا کرتا تھا۔

پھر بھی لوگ ابھی ایک ایسے ترقی پسند نظام کی آمد میں عقیدہ رکھتے تھے جو شہریوں کو جلاوطن نہ کر سکے گا اور نہ کرنے کی ضرورت محسوس کرے گا۔ انہیں ایک عام معافی کی توقع تھی بطور خاص ان دنوں جب اکتوبر کی شاندار سالانہ تقریبوں کے دن قریب آتے تھے۔

عام معافی کا اعلان ہوا..... عام معافی نے دھکا لگایا۔ انھوں نے جلاوطنی کی مدت میں چوتھائی کی کمی (تین سال کی سزا میں نو ماہ کی تخفیف) کرنی شروع کی اور وہ سب کے لیے نہیں! لیکن تین سال تک ایک سیاسی اعتبار سے الگ کرنے والی جیل میں اس کے بعد پھر اگلے تین برس جلاوطنی میں رکھنے کا بندوبست کیا گیا۔ جس کے باعث جلاوطنی کی تین ماہ کی تخفیف کا اعلان کرنے والی معافی نے زندگی کو زیادہ خوشگوار بنانے میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

اس وقت تک اگلا مقدمے کا زمانہ آجائے گا۔ انارکسٹ دامیتری۔ وینو ڈسٹوف کو ٹوبوٹسک میں اس کی جلاوطنی کے آخری ایام میں (۱۹۳۷ء) گرفتار کر لیا گیا اور اس پر عائد کردہ الزام غیر مبہم اور واضح تھا۔ "قرضوں کے بارے میں افواہیں پھیلانا۔" افواہوں سے ان کی مراد کیا تھی؟ جب کہ قرض ہر سال اسی بے خوفی کے ساتھ آتے ہیں جیسے مئی میں پھول!)" اور سوویٹ حکومت سے بے اطمینانی" (جلاوطن کو یقیناً اپنی حالت پر اطمینان ہونا چاہیے!) اور ان بھونڈے جرائم کے لیے بعد ازاں اس کا کیا حشر! اسے بہتر گھنٹوں کے اندر گولی مار دینے کی سزا دی گئی جس کے خلاف اپیل کرنے کا اسے حق نہیں دیا گیا! (ان کی زندہ بچ جانے والی بیٹی کا لنیا کا مختصر تذکرہ اس کتاب میں پہلے کیا جا چکا ہے۔)

ہم نے دیکھ لیا ہے کہ نئی حاصل شدہ آزادی کے ابتدائی برسوں میں جلاوطنی کا کیا مطلب تھا اور یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ ہر طرح بچ کر نکل بھاگنے کا واحد راستہ کون سا تھا۔ جلاوطنی مطلع میں روانہ کی جانے والی نشان زد بھیڑوں کو رکھنے کا عارضی مسکن تھا۔ سوویٹ دور کے ابتدائی برسوں میں جلاوطنوں کو بسانا مقصود نہیں تھا بلکہ منتظر رکھنا تھا، دوسری دنیا کے پروانۂ راہ داری کے لیے! جاہلانہ لوگ بھی تھے۔ "پیشرو" لوگ اور کچھ سادہ لوح کسان بھی۔ تیسری دہائی میں ہی انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمارا کیا حشر ہونے والا ہے اور جب وہ اپنی پہلی تین سال کی میعاد کے اختتام پر پہنچے تو وہ وہیں آباد ہو گئے جہاں

مثال کے طور پر آرکینجل میں ــــ کہ مبادا دوسری جگہ کوئی آفت نازل ہو۔ بعض اوقات اس عمل سے انھیں اپنی گردن بچالے جانے میں مدد ملی۔

ہمارے دور میں جلاوطنی کچھ اس نوع کی چیز بن گئی تھی۔ اب یہ ششکوف کا سکون اور خاموشی یا ٹروخان کا کوکو نوشی نہیں رہی ہے۔

آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ ہمیں اوڈ کی گھر کی یاد سے کہیں زیادہ بھاری بوجھ اٹھانے پڑیں گے۔

دوسرا باب

کسانوں کا طاعون

اس باب کا موضوع ایک معمولی معاملہ ہے۔ ڈیڑھ کروڑ انسان ڈیڑھ کروڑ زندگیاں۔ یقیناً وہ تعلیم یافتہ لوگ نہیں تھے۔ وہ وائلن بجانا نہیں جانتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ میٹر ہولڈ کون تھا یا ایٹمی سائنس کا عالم ہونا بڑی دلچسپ چیز ہے۔

پہلی عالمگیر جنگ میں ہمارے کل تیس لاکھ آدمی مارے گئے تھے۔ دوسری میں دو کروڑ کھیت رہے (یہ خروشچیف کا قول ہے۔ اسٹالن کے مطابق یہ تعداد محض ستر لاکھ تھی۔ کیا نکیتا بہت فراخدل ہو رہا تھا! یا پھر جوزف اپنی راج دھانی کے بارے میں صحیح اطلاعات نہیں رکھتا تھا؟) وہ تمام تعزیتی نظمیں! وہ تمام ستون اور ابدی روشنیاں! اور ناولیں اور مرثیے! مکمل رُبع صدی تک سوویٹ ادب اسی لہو کے نشے میں رہا۔

لیکن اس بے زبان، غدارانہ طاعون کے بارے میں کوئی تصنیف نہیں ہے جس نے ہمارے ڈیڑھ کروڑ کسانوں کو فاقہ کشی میں مبتلا کر دیا، اپنے شکار چن کر روسی عوام کی ریڑھ اور بنیادی سہارے کو غارت کر دیا۔ ان لوگوں کے لیے کوئی بگل ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز نہیں کرتا۔ وہ اپنی چرمراتی ہوئی گاڑیوں میں بیٹھ کر جان دینے کے لیے جہاں گئے تھے وہاں چوراہوں پر کوئی روایتی تین پتھروں والا یادگاری ستون نہیں ہے ہمارے نفیس انسانیت پرست جو آج کی بے انصافیوں پر اتنی جلد آہ و بکا شروع کر دیتے ہیں اس زمانے میں محض سروں کو جنبش دیا کرتے تھے "تائیدی انداز میں۔ بالکل درست ہے۔ وہ اسی لائق تو تھے!

یہ مکمل روداد اس طرح پوشیدہ رکھی گئی، ہر داغ اتنی احتیاط کے ساتھ کھرچ کر مٹا دیا گیا، ہر چہ میگوئی اتنی تیزی کے ساتھ دبا دی گئی کہ جہاں آج مجھے کیمپوں کے بارے میں مواد فراہم کرنے والے لوگوں کی کرم فرمائیوں کے لیے معذرت خواہی کرنی پڑتی ہے ـــــ "اور زیادہ نہیں دوستو! میرے پاس ایسے واقعات کے انبار ہیں، سمجھ میں نہیں آتا انھیں کیسے استعمال کروں!" اس کے برعکس اپنے گھروں سے نکالے جانے والے کسانوں کے بارے میں کوئی آدمی بھی کوئی مواد نہیں فراہم کرتا ـــــ وہ کون آدمی ہے جو ہمیں ان کے بارے میں بتا سکتا ہے؟ وہ کہاں ہے؟

میں بخوبی جانتا ہوں کہ اس موضوع پر جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایک باب نہیں، کسی فردِ واحد کی لکھی ہوئی ایک کتاب بھی نہیں ہے اور میں ایک باب کے لیے بھی ہر اعتبار سے ثابت کرنے والے مواد یکجا نہیں کر سکا۔

پھر بھی میں بسم اللہ کروں گا ـــــ اپنا باب اس سنگِ میل کی صورت میں لکھوں گا۔ جس سے اس جگہ کی طرف اشارہ مل سکے جہاں مستقبل کے مسیحا کی معبدگاہ کسی دن تعمیر کی جائے گی۔

یہ سب شروع کہاں سے ہوا؟ اس تعریف سے کسان طبقہ پیٹی بورژوا ہے؟ (اور ان لوگوں کی نگاہ میں کون پیٹی بورژوا نہیں ہے؟ اپنی حیرت انگیز صاف ستھری اسکیم میں فیکٹری مزدوروں کے علاوہ (لیکن صناعوں کو نہیں) اور بڑے بڑے تاجروں کے استثناء کے ساتھ بقیہ سب، سارے کے سارے کسان، دفتر کے کارکن، اداکار، ہوا باز، پروفیسر، طلباء، ڈاکٹر، "پیٹی بورژوا" کے سوا اور کچھ نہیں ہیں) یا کچھ لوگوں کو لوٹنے اور دوسروں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے بلند منصبوں پر فائز لوگوں کے ہاتھوں تیار کردہ ایک مجرمانہ منصوبے سے اس کا آغاز ہوا؟

کورونیسکو نے ۱۹۲۱ء میں گورکی کو اس کے انتقال اور بیرونی ممالک کو اپنی ہجرت کے عین پہلے جو آخری خط لکھے تھے ان سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کسان طبقے پر یہ شیطانی حملہ اس وقت بھی شروع ہو چکا تھا اور تقریباً وہی شکل اختیار کر رہا تھا جو ۱۹۳۰ء میں اختیار کی۔

لیکن ابھی ان کی طاقت ان کی بے شرمی کی ٹکر کی نہ تھی اس لیے وہ پسپا ہو گئے۔

بہر حال منصوبہ ان کے ذہن میں محفوظ رہا تیسری دہائی کے دوران وہ مسلسل دھمکاتے اور کچوکے دیتے رہے، طعنہ زنی کرتے رہے "قلاق ــــ!" "قلاق!" شہری باشندوں کے ذہنوں میں یہ خیال مستحکم ہوتا رہا کہ ایک ہی دنیا میں قلاقوں کے ساتھ گزر کرنا ممکن نہیں ہے۔

جہاں تک ہم فیصلہ کر سکتے ہیں، کسانوں کے غارت گر طاعون کا آغاز ۱۹۲۹ء میں ہوا ــــ قاتلانہ فہرستوں کی تدوین، ضبطیاں، ملک بدری لیکن ۱۹۳۰ء کی ابتدا میں ہی (جب ریہرسل مکمل ہو گئی اور ضروری انتظامات کر لیے گئے) عوام کو جانکاری دی گئی کہ کیا کچھ ہو رہا تھا ــــ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ۵ جنوری کے فیصلے میں (" پارٹی کو قلاقوں کی استحصالی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرنے کی پالیسی ترک کر کے قلاق طبقے کو ختم کر دینے کی پالیسی اختیار کرنی چاہیے" اور کولخوزوں میں قلاقوں کے داخل ہونے پر فوری..... پابندی لگا دی گئی کیا کوئی اس بات کی معقول توجیہہ پیش کرنے کی زحمت گوارا کرے گا؟)

فرض سمجھ کر تائید کرنے والی سوویتوں کی مرکزی مجلس ہائے منتظمہ اور عوامی کمیسار بورڈ بھی مرکزی کمیٹی سے پیچھے نہ رہے اور یکم فروری ۱۹۳۰ء کو انھوں نے پارٹی کی خواہش کو قانونی حیثیت عطا کر دی صوبائی منتظمہ کمیٹیوں سے کہا گیا کہ وہ "قلاقوں کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے سارے ضروری وسائل اختیار کریں۔ جن میں قلاقوں کی املاک ضبط کر لینا اور انھیں کچھ علاقوں اور صوبوں کی حدود سے باہر کے مقامات پر بھیجنا (واقعتاً کوئی دوسرا طریقہ استعمال ہی نہیں کیا گیا) بھی شامل ہے۔"

صرف ان آخری الفاظ میں قصائی کو شرم محسوس ہوئی تھی اس نے یہ طے کر دیا کہ کن کن سرحدوں سے لیکن یہ نہیں کہا کہ کن سرحدوں تک! اگر آپ پوری طرح دھیان نہ دیں تو آپ اس کا یہ مطلب نکال سکتے ہیں کہ اسی بستی کے آس پاس تیس کلومیٹر دور۔

آواں گارد اصول کے مطابق جہاں تک مجھے علم ہے ایسا کوئی آدمی نہیں تھا جو قلاقوں کا ہمنوا ہو لیکن جیسے ہی پارٹی نے کاشت کی مشین پر اپنا ہاتھ رکھا ظاہر تھا کہ اس کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ زبان کی کیا قیمت ہے: ایک پوری کا "چندہ" مہم کا اعلان کیا گیا۔ نوجوان ہراول دستہ کمزور حکومت کے

لیے کسانوں سے بوریاں جمع کرنے کے لیے جھونپڑی لگالو۔ آپ ایک بوری نہیں دے سکتے چونکہ اپنا زندگی بخش لہو دینا (ظاہر ہے دکان دکانیں خالی تھیں) اور اب آپ قلاقوں کے پٹھو ہو گئے۔ ملک بدری کے مستحق۔

اس قسم کے الفاظ تمام سوویٹ روس میں گونج رہے تھے جہاں اس کی ناک میں ابھی خون کی بو معدوم نہیں ہوئی تھی۔ الفاظ جاری کر دیے گئے۔ ہر چند کہ ان کا مفہوم کچھ بھی نہیں تھا لیکن وہ آسانی سے حفظ ہو جاتے تھے، وہ معاملے کو سہل بنا دیتے تھے اور سوچنے کی ضرورت کو ختم کر دیتے تھے۔ خانہ جنگی کا جنگلی قانون (ایک کے بدلے دس! ایک کے بدلے سو!) پھر نافذ کر دیا گیا۔ میرے خیال میں یہ غیر روسی قانون ہے اس قسم کی کوئی چیز آپ کو روس کی تاریخ میں نظر نہیں آئے گی! ہر باعمل کارکن (عام طور سے اس کا مطلب ہوتا ہے شیخی خور بدکار یا مفت خور: اے۔ وائی۔ اولینسیو فی ہی ایسا واحد شخص نہیں ہے جو یہ بتاتا ہو کہ "چور اور شرابی" قلاقوں کی صفائی کی مہم کے سربراہ تھے) ـــــ مدافعت میں مارے جانے والے ہر باعمل کارکن کے بدلے میں سینکڑوں نہایت جفاکش دیانتدار سلیم الطبع کسان، وہ لوگ جو روسی قوم کی کشتی کو ڈگمگانے سے محفوظ رکھتے، ختم کر دیے گئے۔

غضبناک چیخیں! یہ کیا ہے؟ تم کیا کہتے ہو؟ خون چوسنے والوں کے ساتھ اور کیا کیا جائے! جنہوں نے اپنے ہمسایوں کا لہو پی کر انھیں لاغر کر دیا؟ "اپنا قرض لو ـــ اور مجھے اپنی کھال سے ادا کرو"

میرا خیال ہے خون چوسنے والے پوری تعداد کا بہت معمولی سا حصہ تھے (لیکن ان میں سبھی خون چوسنے والے تھے؟) اور ہم دریافت کر سکتے ہیں کیا وہ پیدائشی خون چوسنے والے تھے؟ کیا وہ سرتاقدم خون ہی چوسنے والے تھے؟ یا یہ بات تھی کہ تمام کی تمام دولت ـــ ساری قوت و اقتدار کل انسانوں کو پست کرتے ہیں؟ کتنا اچھا ہوتا اگر بنی نوع انسان کو یا ایک معاشرتی نظام کو "پاک کر دینا" اتنا آسان ہوتا! لیکن اگر انہوں نے باریک دندانے والی آہنی کنگھی سے کسان طبقے میں سنگدل خون چوسنے والوں کو "صاف" کر دیا تھا اور اس کا رخیر پر ڈیڑھ کروڑ آدمیوں کو بخوشی بھینٹ چڑھا دیا تھا ـــ تو پھر وہ سارے بدمعاش، موٹی توند والے مکار کہاں سے آ گئے ہیں جو آج اجتماعی کاشت میں شامل گاؤں (اور ضلع پارٹی کمیٹیوں کی صدارتیں کرتے ہیں؟ ضعیف اور بے سہارا عورتوں کے اور تمام مجبوروں کے وہ بیدرد ایذا دہندگان؟ قلاق صفائی کے ایام میں اس زہریلے پودے کی جڑیں کس طرح محفوظ رہ گئیں؟ بلاشبہ 'خدا تمہارا بھلا کرے' وہ باعمل کارکنان میں سے ہی تو نہیں پیدا ہو گئے؟.....

جو جونکوں کی لوٹ مار پر پروان چڑھے وہ کسان طبقے کو نہ بھائی کی حیثیت سے دیکھ سکتا تھا نہ کاشتکار کی حیثیت سے بلکہ ڈاکو کی مانند قرضہ دیا جا سکتا تھا اور لاکھوں محنت کش کاشتکاروں کو مار مار کر بیابانوں میں پہنچا دیا گیا کھر دیے ہاتھوں سے زمین جوتنے والے، وہی لوگ جنہوں نے زمین پانے کے لیے سوویٹ حکومت قائم کی تھی اور اسے حاصل کر لینے کے بعد اس پر اپنی گرفت سخت کر دی تھی (زمین اس کی ہے جو اس پر محنت کرتا ہے)

"خون چوسنے والے" الفاظ کی گونج اس وقت ختم ہو جاتی ہے ـــ جو زبان انھیں استعمال کرتی ہے وہ لکڑی کے کھونٹے پر ضرب لگاتی ہے، جب یہ یاد کرتے ہیں کہ انھوں نے خوبان میں چند گاؤں کا، مثلاً اور دیپکا یا کا کس مکمل طور پر صفایا کیا تھا انھوں نے وہاں کے ایک ایک جاندار کو، بچے سے لے کر بوڑھے تک کو نکال کر باہر پھینک دیا تھا اور وہاں فوج سے سبکدوش ہونے والے فوجی آباد کر دیے گئے (جہاں ہم کو صاف

نظر آتا ہے کہ "طبقاتی نظریے" کا واقعتاً کیا مطلب تھا (یاد رکھیے کہ خوبان نے خانہ جنگی میں سفید لوگوں کی کوئی خاص مدد نہیں کی تھی اور سرخ لوگوں سے معاملات کرنے کی کوشش کی تھی ــــ پھر اچانک انھیں کہا جانے لگا۔ "خوبان کے غارت گر" ڈولنکا بستی، جو ایک خوشحال زرعی مرکز کی حیثیت سے پورے مجمع الجزائر میں معروف ہے ــــ یہ کہاں سے آئی؟ اس کے تمام باشندے جرمن تھے جنھیں "قلاق صفائی" کر کے ۱۹۲۹ء میں وہاں سے نکال دیا گیا تھا۔ کون کس کا استحصال کر رہا تھا یہ ایک راز ہی ہے!

قلاقوں کی صفائی کے پس پشت کار فرما اصول بچوں کی غارت گری میں بھی صاف پہنچانا جا سکتا ہے شرکاڈ یٹرٹیت کو لیجیے جو میلینے گاؤں (وولوغت کے نزدیک ریشیپنسکی کا زرعی) کا ہے۔ ۱۹۲۵ء میں جب اس کے باپ کی موت واقع ہوئی اس وقت وہ تیرہ سال کا تھا۔ لڑکیوں والے خاندان میں وہ تنہا لڑکا تھا اس کے باپ کی کھیتوں کا بندوبست کون کرتا؛ لڑکیوں اور ان کی ماں نے اسے کنبے کا سربراہ تسلیم کر لیا۔ محنت کش کسان اور اب بلوغت کی منزل میں پہنچ کر اس نے بڑد سس کے دوسرے بالغوں کے ساتھ کام کرنا شروع کیا۔ وہ اپنے جفاکش باپ کا لائق وارث تھا اور جب ۱۹۲۹ء آیا تو اس کے گودام اناج سے بھرے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ قلاق تھا! پورے کنبے کو باہر نکال دیا گیا؛

آدمونا سلوزبرگ کی ایک لڑکی سے ملاقات کی کہانی بڑی دردناک ہے۔ لڑکی کا نام تھویا تھا جسے ۱۹۳۶ء میں اس جرم پہ سزا دی گئی تھی کہ وہ بغیر اجازت کے اپنی جلاوطنی کی جگہ سے اپنے گاؤں سوٹیلو وڈویلو رٹروسلکے قریب ا دو ہزار کلو میٹر پیدل چلی آئی تھی! اس نوع کے کارناموں پر کھلاڑیوں کو تمغے دیے جاتے ہیں اسے اپنے والدین کے ساتھ ۱۹۲۹ء میں جلاوطن کیا گیا تھا جبکہ وہ چھوٹی سی اسکول کی طالبہ تھی اور اسے ہمیشہ کے لیے تعلیم سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس کی استانی اسے پیار سے "ہماری تھویا ــــ ننھی ایڈیسن" کہا کرتی تھی۔ بچی بہترین طالبہ ہی نہیں تھی بلکہ اس میں تخلیقی جوہر تھے اس نے ایک طرح کا ٹربائن ایجاد کیا تھا جو نالے سے چلایا جاتا تھا اور اسکول کے لیے دیگر چیزیں بنایا کرتی تھی۔ سات سال بعد اس کے دل میں ٹیس اٹھی کہ اپنے اسکول کی لکڑی کی دیواروں کا پھر دیدار کروں اور اس کام کے لیے "ننھی ایڈیسن" کو جیل پہنچا دیا گیا اور پھر ایک کیمپ میں بھیج دیا گیا۔

کیا انیسویں صدی میں کسی بچے پر ایسی افتاد پڑی تھی؟

ہر چکی والا قلاق صفائی کا مسلمہ امیدوار تھا اور پہیوں والے اور لوہار روسی گاؤں کے بہترین ٹکنیکل آدمی یا مستری کے سوا اور کیا تھے؟ ریازان علاقے کے چکی والے پردکوپ آئیوانووچ لکٹیونکن کا معاملہ لیجیے جیسے ہی وہ قلاق صفائی کا شکار ہوا ان لوگوں نے چکی کے پاٹوں کو سختی سے چلایا اور چکی جل کر خاکستر ہو گئی۔ جنگ کے بعد اسے معاف کر دیا گیا اور وہ اپنے پیدائشی گاؤں میں لوٹ آیا لیکن وہ اس بات کا اپنے دل میں کوئی جواز نہ پیدا کر سکا کہ وہاں کوئی چکی نہیں تھی۔ لکٹیونکن نے اجازت حاصل کی۔ پاٹ خود بنائے اور اس مقام پر چکی نصب کر دی (اس کی وہی جگہ ہو گی ضروری تھی!) اپنے منافع کے لیے نہیں بلکہ کولخوز کے لیے بلکہ اس لیے کہ اس کی عدم موجودگی میں آبادی نامکمل اور کم خوبصورت لگتی تھی۔

اب ذرا اس دوسرے گاؤں کے لوہار قلاق کو دیکھیے۔ اصل میں ہم اس کے باپ سے گفتگو کا آغاز کریں گے۔

جیسے کہ پرسنل ڈیپارٹمنٹ کرتے ہیں۔ اس کے باپ گونی ڈیٹی واسیلووچ نے ۲۵ سال وارسا گیریسن (حفاظتی فوج) میں کام کیا تھا اور اتنی کافی چاندی بنائی تھی کہ وہ ٹین کے بٹن بنا سکے! ۲۵ سالہ خدمت والے اس فوجی کو زمین کا ایک قطعہ دینے سے انکار کر دیا گیا۔ گیریسن کی ملازمت کے دوران اس کی شادی ایک فوجی کی لڑکی سے ہو گئی تھی اور فوج سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ اپنی بیوی کے گاؤں ضلع کرسنینسکی کے بارسکی قصبے میں آ گیا۔ گاؤں والوں نے اس کا خیر مقدم کیا اور اس نے اپنی بچائی ہوئی نصف رقم سے گاؤں کا ٹیکس بیباق کر دیا۔ بقیہ رقم سے اس نے ایک زمین کے مالک سے بل ٹھیکے پر لے لی لیکن اس کے چکر میں بقیہ آدھی رقم جلد ہی ضائع کر بیٹھا اس نے اپنی طویل کبر سنی کا زمانہ بھیڑیں چرا کر اور پہریداری کر کے گزارا۔ اس کی چھ لڑکیاں تھیں سب کی شادیاں اس نے غریب آدمیوں کے ساتھ کر دیں۔ بیٹا صرف ایک تھا جس کا نام ٹریفون تھا (ان کا خاندانی نام ٹوارڈیفسکی تھا) لڑکا ایک بساط خانے کی دکان پر کام کے لیے بٹھا دیا گیا لیکن وہ بھاگ کر بارسکی واپس آ گیا اور اسے مولچانوف خاندان میں، جن کی لوہار کی بھٹی (فورج) تھی روزگار مل گیا۔ ایک سال معاوضے کے بغیر مزدوری کرنے پر اور چار سال اپرنٹس کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد وہ خود لوہار بن گیا جگوریے گاؤں میں اس نے لکڑی کا مکان بنوایا اور شادی کر لی۔ اس کے ہاں سات بچے ہوئے (جن میں شاعر الگزینڈر بھی تھا) اس کام میں کسی دولت مند ہونے کا امکان نہیں ہوتا۔ سب سے بڑا لڑکا کونسٹنٹن اپنے باپ کی مدد کرتا تھا۔ صبح تک اگلی صبح تک اسمیٹنگ کرنے اور ہتھوڑا چلانے کے بعد وہ فولاد کی پانچ پرچھیاں تیار کر لیتے تھے۔ لیکن رودسلانی کے لوہار جن کے پاس پریس اور کرائے کے مزدور تھے۔ ان سے سستا بیچتے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں بھی ان کے پاس محض لکڑی کی بنی ہوئی بھٹی تھی، ایک گھوڑا تھا کبھی گائے اور بچھڑا ہوتا تھا کبھی وہ بھی نہیں۔ علاوہ ازیں ان کا بڑا سیب کے درخت تھے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کس قسم کے خون چوسنے والے تھے..... کاشتکاروں کی زمینوں کا رہن شدہ املاک بینک قسطوں پر فروخت کیا کرتا تھا۔ ٹریفون ٹوارڈوفسکی نے گیارہ ڈسیاٹن بیکار پڑی ہوئی زمین، جو غیر مزروعہ تھی، خرید لی تھی اور کسانوں کے مطابق طاعون اسے صاف کرنے میں خون پسینہ ایک کر رہا تھا اور زور لگا رہا تھا؛ وہ پانچ ڈیسیاٹن پر کاشت کرنے لگے تھے اور باقی زمین جھاڑیوں کے لیے چھوڑ دی گئی تھی۔ اجتماعی کاشت کرانے لگے تھے اور باقی زمین جھاڑیوں کے لیے چھوڑ دی گئی تھی۔ گاؤں میں پندرہ گھر تھے اور کسی پر تو ہاتھ ڈالنا ہی تھا۔ انھوں نے فورج کی آمدنی کو کافی بڑھا چڑھا کر درج کیا اور خاندان کے ذرائع آمدنی پر بھاری ٹیکس عائد کر دیا اور جب بروقت اس کی ادائیگی نہ ہو سکی؛ یہاں سے جانے کی تیاری کر لے! قلاق! کیفے!

اگر لکڑیوں کی کھوکھڑیوں کی، قطار میں کسی آدمی کا مکان ہے یا ایک منزلہ مکانوں کے درمیان دو منزلہ مکان ہو ـــ تو قلاق حاضر ہے! تیار ہو جا جمع فورا ہے! تجھے ساٹھ منٹ کی مہلت دی جاتی ہے! ان کی رائے میں روس کے کسی گاؤں میں کوئی اینٹوں کا مکان نہ ہونا چاہیے کوئی دو منزلہ مکان نہ ہونا چاہیے! دوبارہ پتھروں کے زمانے میں آ جاؤ! تمہیں آگ کے لیے چمنی کی کیا ضرورت ہے؟ یہ ہے ملک کی کایا پلٹ کرنے کا عظیم منصوبہ تاریخ نے اس کی مثال کبھی نہیں دیکھی۔

لیکن تا حال ہم سب سے اندرونی مادہ تک نہیں پہنچے اپنے کھاتے پیتے لوگوں کو کئی بار یونہی چھوڑ دیا جاتا تھا

بشرطیکہ وہ فالفور کولخوز میں شامل ہو جائیں جبکہ متذبذب غریب کسان درخواست نہ دینے کے جرم میں وہاں سے باہر نکال دیا جاتا تھا۔

یہ بہت اہم، انتہائی اہم بات ہے۔ اس تمام مہم کا اصل مقصد قلاقوں کی صفائی نہیں تھا بلکہ کسانوں کو بالجبر کولخوز میں شامل کرنا تھا۔ انھیں موت سے خوفزدہ کیے بغیر اس زمین کو واپس لینے اور اس پر زرعی غلاموں (سرفوں) کی مانند لگا دینے کی اور کوئی طریقہ نہیں تھا جو انقلاب نے انھیں عطا کی تھی۔

یہ ایک دوسری خانہ جنگی تھی، اس بار کسانوں کے خلاف یہ واقعی ایک اہم ترین موڑ تھا جیسا کہ مستعمل تھا اہم ترین توڑ تھا۔ البتہ ہمیں یہ کبھی نہیں بتایا جاتا تھا کہ اس نے کیا توڑا؟ اس نے اس کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی۔

نہیں ہم نے مارکسی حقیقت پسند مصنفوں کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ انھوں نے قلاق صفائی کا تذکرہ کیا ہے بے صد روانی سے تذکرہ کیا ہے اور اس کے رہنماؤں کے لیے جذبۂ عقیدت کا اظہار کیا ہے جیسے وہ غراتے ہوئے بھیڑیوں کے شکاری ہوں۔ لیکن گاؤں کی اس لمبی بگل کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ہر مکان تختوں سے بند کر دیا گیا ہے یا اس امر کا تذکرہ نہیں ملتا کہ آپ کس طرح چل کر گئے اور کسی کسان کے دروازے پر مردہ عورت کو گود میں بے جان بچہ لیے ہوئے پڑا پایا یا ایک بوڑھا آدمی اور ایک ضعیفہ سونے کی بنچ پر بیٹھے ہیں (بوڑھا چائے کی ایک دکان چلاتا تھا ظاہر ہے کہ خون آشام تھا، کون کہتا ہے کہ اگر گرم گرم چائے خوشی سے نوش کرتے ہیں؟) وہ اپنا ریوالور لہراتا ہے "اترو نیچے، تانبوف کے بھیڑیے!" بوڑھی عورت گھگھیانے لگتی ہے اور صدر انھیں مزید خوفزدہ کرنے کے لیے چھت پر گولی چلاتا ہے (کسان کی جھونپڑی میں فائر سے بڑا شور ہوتا ہے) یہ دونوں دولہا دلہن سفرِ موت کے منہ میں پہنچ گئے۔

اس طرح کی قلاق کی صفائی کا تذکرہ آپ کو بہت کم پڑھنے کو ملے گا۔ تمام قازقوں کو (ہم دریائے ڈان کے ایک ساحلی گاؤں میں ہیں) ایک جلسے میں بلایا گیا ہے اور وہاں مشین گنوں سے ان کا محاصرہ کر دیا گیا، گرفتار کر لیا گیا اور موٹروں میں بھر کر باہر نکال دیا گیا۔ بعد ازاں ان کی عورتوں کو وہاں سے باہر کر دینا بہت آسان تھا۔

ہم کتابوں اور فلموں میں بھی کھلیان اور زمین دوز گودام، خون آشام ذخیرہ اندوزوں کا جمع کیا ہوا انبار پڑا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ جو چیز وہ ہمیں نہیں دکھائیں گے وہ یہ ہے کہ تازندگی محنت کرنے کے بعد کتنا کم اثاثہ جمع ہو سکتا ہے، مویشی، برتن مالک کے لیے اپنی جان سے زیادہ عزیز چیزیں جنھیں ایک گریہ کناں کاشتکار عورت کو چھوڑ کر نکل جانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اگر کنبے کے کچھ افراد زندہ بچ رہتے ہیں اور ذہین تیز اتنی دھن والے ہیں کہ ماسکو کو اس بات پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ انھیں "درمیانی کسان" کی حیثیت سے دوبارہ آباد کر دیا جائے تو وہ واپس پلٹنے پر اپنی "درمیانی املاک" کی ایک کوڑی بھی نہیں پائیں گے۔ انھیں باعمل کارکن اور ان کی عورتیں صاف کر چکی ہوں گی)۔

جو چیز وہ ہماری نظروں سے دور رکھیں گے وہ چھوٹی چھوٹی گٹھڑیاں ہیں جنھیں ہمراہ لیکر سرکاری گاڑی پر سوار ہونے کی خاندان کو اجازت ملتی ہے۔

ہمیں یہ نہیں بتایا جائے گا کہ نوآموز ڈھکی کے مکان پر جب یہ بجری گھڑی نازل ہوئی تو وہاں نہ جمہ یا تھا

نہ روٹی ان کے ہمسائے نے کر ملنے ان کی جان بچائی۔ اس کے کئی بچے تھے اور وہ بذات خود کوئی خوشحال آدمی نہ تھا پھر بھی ان کے لیے توشہ سفر لے کر آیا۔

جو ذرا تیز عقل والے تھے وہ اس کاشتکاروں کے طاعون سے بچ کر شہروں میں بھاگ آئے اور کچھ لوگ ایک گھوڑا بھی ساتھ لے گئے۔ لیکن ان دنوں گھوڑا خریدنے والا کوئی نہ تھا۔ کسان کا گھوڑا اقلاق ہونے کی یقینی شہادت، کاشتکاروں کے طاعون کی مانند ہی ایک عذاب بن جاتا تھا اس کا مالک بازار میں گھوڑے کو کسی کھونٹے سے باندھ دیتا، اس کے منہ پر آخری بار تھپکی دیتا اور کسی کی توجہ مبذول ہونے سے قبل ہی رفو چکر ہو جاتا تھا۔

۱۹۲۹ -۱۹۳۰ء کے سال عام طور پر طاعون کے سال تصور کیے جاتے ہیں لیکن اس کا ہولناک تعفن پھیلا تو پر عرصے تک معلق رہا؛ خوبان میں ۱۹۳۲ء میں گیہوں اور رائی کا ایک ایک دانہ تھریشنگ مشین سے براہ راست سرکاری وصولی کے مرکز میں پہنچا دیا گیا اور جب اجتماعی کاشت کے کسانوں نے۔ جنھیں اپنی فصل کی کٹائی اور تھریشنگ کے راشن کے سوا کچھ نہیں دیا گیا تھا، یہ دیکھا گیا کہ گرم کھانا تو تھریشنگ کے ساتھ ہی ختم ہو گیا اور کہ اپنی محنت کا انھیں کوئی معاوضہ نہیں ملے گا تو گریہ وزاری کرتی ہوئی عورتوں کو چپ کرایا جا سکتا تھا؛ اس جگہ کتنے قلاق باقی رہ گئے ہیں؟ کیسے گاؤں سے باہر کر دیا جائے؟ اس کو پنکوفا کی شہادت سے ہم کولخوز کے ابتدائی ایام، قلاقوں سے آزاد دیہات کی کیفیت سے روشناس ہو سکتے ہیں؛ وہ بتاتی ہے کہ کچھ کسان عورتیں ۱۹۳۰ء میں سوکھی ہوئی روٹی کے ٹکڑوں کی پارسل بولوفسکی سے اپنے گاؤں کو بھیجا کرتی تھی۔

یہ روداد نموفی یافلووچ اونچکوف کی ہے جس کی پیدائش ۱۸۸۶ء میں ہوئی تھی اور جو فینجیفسکو علاقے کے کنکنوں گاؤں کا رہنے والا تھا (جو عظیم شاہراہ کے قریب لینن اسکوئے کورگی سے کچھ ہی فاصلے پر ہے) وہ جنگ جرمن میں لڑا اور خانہ جنگی میں لڑا۔ جب جنگ کا خاتمہ ہوا تو وہ سرکاری حکم کے تحت ملنے والی زمین پر لوٹ آیا اور شادی کر لی۔ وہ ہوشیار، تعلیم یافتہ، تجربکار، اور نہایت جفاکش تھا اس نے ذاتی طور پر پولیشیون کے علاج میں کچھ سہارا بہم پہنچائی اور پورے ضلع کی مدد کرتا تھا۔ محنت زیادہ کر کے اس نے ایک اچھا مکان بنوایا، ایک باغ لگوایا، ایک بچھیڑا پال پوس کر اسے عمدہ گھوڑا بنایا۔ لیکن این ای پی نے اسے بہکا دیا اور نموفی یافلووچ نے جلد بازی میں اس پر یقین کر لیا جیسے کہ اس نے زمین کے تعلق حکم پر یقین کر لیا تھا۔ اس نے ایک دوسرے کسان کے ساتھ شرکت میں ایک سستی سائنیر بنانے کا چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیا (اب کہ گاؤں میں چالیس سال سے سائسیز نہیں ہیں آپ اپنا سر کھجلاتے ہوئے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ اس میں ایسی کون سی برائی تھی) وہ خود سائسیز بناتے تھے اور کسی مزدور کو ملازم نہیں رکھتے تھے اور اپنا مال ایک سرکاری کوآپریٹیو ہی کے توسط سے فروخت کرتے تھے۔ انھوں نے ابھی دو سال ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۷ء تک ہی کام کیا تھا کہ ان سے بھاری ٹیکس طلب کیا گیا کیونکہ مبینہ طور پر وہ بہت کمائی کر رہے تھے (اس کام والے ٹیکس انسپکٹروں کا قیاس تھا لیکن گاؤں کے حاسد نکمے لوگوں نے، جو باعمل کارکن بننے کے سوا عملی طور پر کچھ بھی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، ٹیکس والوں کے کان بھرے تھے) اس پر ساجھے داروں نے کام بند کر دیا — ۱۹۲۹ء میں نموفی کولخوز میں سب سے پہلے شامل ہونے والوں میں تھا اور اپنے ساتھ وہ اپنا عمدہ گھوڑا، گائے اور تمام اوزار بھی لایا۔ مشترکہ زراعت میں وہ محنت۔ یہ کام کرتا تھا اور اس نے کولخوز کے لیے سستی گھوڑے بھی پالے۔ کولخوز ناکام ہونے لگا۔

اور بہت سے لوگ اس سے علیحدہ ہوگئے یا بھاگ گئے لیکن ٹھوفی کے پانچ بچے تھے اور وہ وہاں بندھا ہوا تھا۔ چونکہ ٹیکس انسپکٹر سابقہ تکرار کو بھولا نہیں تھا اور ٹھوفی اب بھی دولتمند تصور کیا جاتا تھا اس لیے بھی کہ اس نے مویشیوں کے علاج میں لوگوں کی معاونت کی تھی۔ اس لیے اب اس کے کولخوز میں شامل ہوجانے پر بھی انھوں نے اس سے ٹیکس کا تقاضا جاری رکھا جسے وہ پورا نہیں کرسکتا تھا۔ جب ادائیگی نہ ہوئی تو وہ اس کے مکان پر پہنچ گئے اور اس کے پہننے کے لیے کپڑے تک ضبط کرنے لگے۔ ایک مرتبہ اس کے گیارہ سالہ بیٹے نے کسی طرح تین ڈبے سامان کی فہرست بنانے والوں کی نظروں سے چھپا دیے لیکن دوسرے موقع پر انھیں بھی لے گئے جب وہ پھر اس کے سامان کی فہرست مرتب کرنے آئے تو اس مظلوم خاندان کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہا تھا اس لیے بے حیا ٹیکس انسپکٹر نے ربڑ کے پودے اور ان کے ٹب اپنے قبضے میں کر لیے۔ ٹھوفی اس بات کو برداشت نہ کرسکا اور اس نے ان کی آنکھوں کے سامنے ہی پودوں کو کلہاڑی سے ٹکڑے کردیا۔ اب ذرا اس کا نتیجہ دیکھیے: (۱) اس نے وہ املاک ضائع کردی جو اس کی نہیں اب سرکاری ہوچکی تھی۔ (۲) اس نے سوویٹ حکومت کے خلاف مظاہرہ کرتے ہوئے کلہاڑی کا استعمال کیا (۳) اس نے کولخوز طریق عمل کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔

اس وقت کلفکینوں گاؤں میں کولخوز کا طریقہ تیزی سے ناکام ہورہا تھا کسی کو بھی اس پر اعتماد نہ تھا یا کوئی بھی کام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آدھے کسان چھوڑ کر چلے گئے تھے اور اس وقت کسی کو عبرت کا نمونہ بنانے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ کار چیں ٹھوفی اور چنکوف، جو کولخوز کو ناکام کرنے کے لیے چالاکی سے اس میں شامل ہوگیا تھا لب گاؤں سوویٹ کے صدر ستوکوکوف کے فیصلے پر اسے قلاق قرار دے کر نکال دیا گیا یہ ۱۹۳۲ء تھا اور اجتماعی جلاوطنیاں بند ہوچکی تھیں اس لیے اس کی بیوی اور چھ بچوں کو (جن میں سے ایک شیرخوار تھا) جلاوطن نہیں کیا، انہیں صرف ان کے مکان سے نکال دیا گیا (ایک سال بعد وہ اپنے غریب ٹھوفی کے پاس پہنچ گئے ہا جو آرکٹیل میں تھا اوفچنکوف کے خاندان کے تمام افراد نے اسی برس کی عمر پائی تھی لیکن اس قسم کی زندگی کے بعد ٹھوفی تریپن سال میں ہی چل بسا) [۵]

۱۹۳۵ء میں بھی، شراب کے نشے میں چور کولخوز افسران الیٹر کے موقع پر غریب گاؤں گئے اور انھوں نے ان کسانوں سے، جو اب بھی ذاتی زمینوں پر کاشت کرتے تھے، ووڈکا کے لیے رقم طلب کی۔ ادا کرو ورنہ "ہم قلاق صفائی کے سلسلے میں تمہیں بھی نکال باہر کریں گے۔ ہم تمہیں جلاوطن کردیں گے" وہ واقعی کرسکتے تھے اگر تم خود کاشت کر رہے ہو۔ سارا عظیم توڑ اسی لیے تو تھا۔

خود سفر کا جو کسان کا مقدس سفر تھا، مارکسی حقیقت پسند قطعی ذکر نہیں کرتے۔ انھیں جہاز پر سوار کرادو اور دور ہٹادو۔ چلو قصہ ختم ہوا، داستان مکمل ہوگئی۔ تین بار تالیاں بجائیے مہربان!

انھیں گھوڑا گاڑیوں میں سوار کیا جاتا تھا۔ اگر خوش نصیبی سے انھیں گرم موسم میں سفر کرنے کا موقع ملا ہو لیکن ممکن ہے سخت پالے کے دوران انھیں سلیجوں پر بار کیا جائے۔ ہر عمر کے لڑکے، شیرخوار بچے تک فروری ۱۹۲۱ء میں جب سخت پالے کے دوران برفیلی ہوائیں چل رہی تھی، گاڑیوں کی لامحدود قطاروں کو چیخوف قصبے (ضلع میخو سیبرسک) سے لڑھکتی ہوئی جاتی تھی۔ ان کے دونوں طرف پہرے دار فوجی ہوا کرتے تھے

یہ گاڑیاں برف سے ڈھکی ہوئی اسٹیپی سے نکلتیں اور پھر اسی میں غائب ہو جاتی تھیں۔ گرمی حاصل کرنے کے لیے کسی کسان کی جھونپڑی میں جانے سے پہلے پہرے دار فوجیوں سے خصوصی اجازت حاصل کرنا ضروری تھا اور یہ اجازت بھی چند منٹوں کے لیے ہی ملتی تھی تاکہ گاڑیوں کے قافلے رواں رہ سکیں۔ (یہ جی۔پی۔یو کے بہرے دار فوجی۔ یہ ابھی بقیدِ حیات ہیں اور پنشن پاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں انھیں یہ سب یاد ہوگا یا شاید وہ ۔۔۔۔ یاد نہیں کر سکتے' وہ سب تاریک علاقے میں گم ہو جاتے ہیں اور ان ناقابلِ برداشت دلدلوں میں زندگی بسر کرتے ہیں بہت سے بچے تو اس اذیت ناک سفر کے دوران ہی لقمۂ اجل ہو گئے۔

یہ منصوبے کا بنیادی عنصر تھا۔ کسانوں کا بیج بالغوں سمیت ختم ہو جائے چونکہ پیرو ڈاب ہمیں بتایا تھا اور پیش قدمی کے اصولوں نے ہمیں سکھایا تھا کہ بیخ و بنیاد سے تباہ کیا جاتا ہے تاکہ بچے تک نہ باقی رہ پائیں ہٹلر تو محض طفلِ مکتب تھا لیکن وہ خوش نصیب تھا اس کے قاتلانہ کیمپوں نے اسے مشہور کر دیا تھا۔ جب کہ ہمارے کیمپوں سے کسی کو دلچسپی نہیں۔

کسانوں کو معلوم ہو گیا کہ ان کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے اور اگر انھیں خوش قسمتی سے آبادی والے علاقوں میں لے جایا گیا تو وہ نظر بچا کر چھوٹے بچوں کو جلتے جھوٹے بھی نہوں کہ کھڑکی [illegible] چپکے سے باہر نکال دیتے تھے۔ شاید رحم دل لوگ تم پر ترس کھائیں۔ دنیا میں بھیک مانگ کر گزر بسر [illegible] جان دینے کی بجائے یہ بہتر ہے!

(آرکیول ۱۹۳۳ اور ۱۹۳۲ء کے قحط کے زمانے میں نوآباد کسانوں کے بے سہارا بچوں کو اسکولوں میں مفت ملنے والی غذا اور کپڑوں سے واؤچر نہیں دیے جاتے تھے کیوں کہ دوسروں کو ضرورت تھی)

ڈان کے قازقوں کے قافلے میں سے جب "جلنے" میں گرفتار شدہ افراد کو ان کی بیویوں سے الگ کیے جانے لگا تو سفر کے دوران ایک عورت نے بچے کو جنم دیا ان کا راشن تھا روزانہ ایک گلاس پانی' اور تین سو گرام روٹی لیکن روزانہ نہیں! کیا وہاں کوئی طبی نگہداشت کرنے والا تھا؟ کیا یہ دریافت کرنے کی ضرورت ہے؟ ماں کو دودھ نہیں ملا اور بچہ راستے میں فوت ہو گیا وہ اسے کہاں دفن کرتے؟ "دو اسٹیشنوں کے درمیان" دو فوجی آئے چلتی ہوئی ریل گاڑی کا دروازہ کھولا اور ننھی سی لاش کو باہر پھینک دیا۔

(یہ گاڑی عظیم میگنیٹو گورسک مکان تعمیر کرنے کے منصوبے تک پہنچائی گئی اور وہاں ان کے شوہران کے ہمراہ مزدوری کرنے کے لیے پہنچا دیے گئے۔ کھدائی کرو' اپنی رہائش گاہ خود بناؤ میگنیٹو گورسک کے اور آگے سے ۔۔۔ ہمارے تخلیق کاروں نے اپنا فرض پورا کر دیا اور حقیقت نگاری کا کام مکمل ہو گیا!)

ٹوارڈوفسکی خاندان کو صرف پیلنا تک بذریعہ گاڑی پہنچایا گیا۔ خوش قسمتی سے اچھا مہینہ تھا وہاں انھیں مال گاڑی کے ڈبے میں لاد دیا گیا۔ ڈبوں پر تالے ڈال دیے گئے۔ فرش میں کوئی سوراخ یا برتن بھی نہ تھا کہ وہ حوائج ضروری سے فارغ ہو سکے۔ بھاگنے کی کوشش پر سزا اور قید کا خطرہ مول لے کر کونسٹینٹن ٹریوفووچ نے باورچیخانے کی چھری سے فرش میں سوراخ کیا۔ جبکہ ٹرین چلتے ہوئے بہت شور کر رہی تھی۔ کھلانے کا انتظام بہت سادہ تھا۔ ہر تین دن میں ایک بار بڑے اسٹیشن پر شوربے کے برتن لائے جاتے تھے۔ سچ ہے کہ انھیں نے صرف دس دن کا سفر (شمالی یورال کے ایک اسٹیشن سیالہ تک) کیا۔

وہاں تاحال سردیاں تھیں چنانچہ سیکڑوں سلیجوں سے سواری کا کام لیا گیا جو انھیں منجمد دریا کے اوپر سے جنگل میں لے گئیں۔ وہاں بیس ہتھیر چیرنے والوں کا ایک جھونپڑا ان کے سپرد کیا گیا لیکن آدمی پانچ سو سے زیادہ لائے گئے تھے اور شام ہو گئی تھی اس جگہ کا انچارج کومسومول پر مثین تھا۔ جس کا نام سوروکن تھا اس نے ان مقامات کی نشاندہی کر دی جہاں زمین میں میخیں گاڑنی تھیں، یہاں ایک سڑک ہوگی، وہاں مکانات ہوں گے۔ اس طرح پارچہ کی بستی وجود میں آئی

ایسی سنگدلی پر یقین نہیں آتا۔ سردیوں کی ایک شام کو باہر جنگل میں ان سے کہا گیا کہ "تم آگئے ہو منزل تک ۔۔۔!" کیا انسان واقعی ایسا برتاؤ کر سکتے ہیں؟ انھیں دن میں چلایا جاتا ہے اس لیے وہ رات کو پہنچتے ہیں ۔۔۔ بس اتنی سی بات ہے۔ لاکھوں آدمی اس طرح جنگل میں بیابان میں لے جا کر پھینک دیے گئے۔ بوڑھے، عورتیں، بچے اور ہر شخص۔ جزیرہ نما کولا (اپاٹیسٹی) میں وہ تاریک قطبی سردیوں اور برف سے ڈھکے ہوئے پتلے خیموں میں مقیم رہے لیکن کیا گرمیوں میں (۱۹۳۱ء) کی گرمیوں میں ۱۹۴۱ء کی نہیں، تاریخوں کو نہ الجھایئے) دو لگا جرمنوں کو ٹرینوں میں بھر کر کارگنڈا اسٹیپ کے پانی سے محروم علاقوں میں لے جانا ان کے پانی پر راشن لگانا، ان سے اپنے لیے کچے مکان تعمیر کرنے کو کہنا بہت زیادہ رحمدلانہ برتاؤ تھا! وہاں بھی سردیاں جلد ہی آنے والی تھیں (۱۹۳۲ء کے موسم بہار تک بچے اور بوڑھے ایک دوسرے سے پیچش میں مبتلا ہو کر خوراک کی کمی سے مر گئے تھے) خود کارا گنڈا میں اور میگنیٹو گورسک میں انھوں نے سبزیاں رکھنے کے گوداموں جیسے طویل اور نچلی چھت والے مشترک کچے مکانات تعمیر کیے۔ بحر سفید نہر پر نو وارد ین کو قیدیوں کی خالی کی ہوئی جھونپڑیاں مل گئیں انھیں خمکی کے بالکل قریب وو لگا نہر پہ کام کرنے کے لیے بھیجا گیا اور وہاں کیمپ کے قیام سے پیشتر ہی وہاں اتار دیا گیا ہائیڈروگرافک جائزہ مکمل ہوتے ہی زمین پہ ڈھیر کر دیا گیا۔ نیز حکم ملا کہ پھاوڑے چلانا اور ٹھیلے کھینچنا شروع کر دو (اخباروں نے نہر پہ مشین پہنچ جانے کی خبریں دیں) روٹی وہاں نہیں تھی۔ اپنی فرصت کے اوقات میں انھیں اپنے کچے مکان بنانے پڑتے تھے (آجکل تفریحی کشتیاں ماسکو کے شائقین کو اس مقام پہ لے جاتی ہیں اس کی تہہ میں ہڈیاں ہیں، اس کی سیمنٹ اور مسالے میں ہڈیاں ہیں)

جب ۱۹۲۹ء میں کسانوں کا طاعون پھیلا تو آرکھیل میں تمام چرچ بند کر دیے گئے انھیں ہر صورت بند ہونا تھا لیکن قلاق صفائی کے شکار ہونے والوں کو کہیں رکھنے کی حقیقی ضرورت نے انھیں جلد ہی بند کرا دیا۔ جلاوطن کسانوں کے بڑے بڑے سیلاب آرکھیل سے گزر رہے تھے اور پورا شہر کچھ عرصے کے لیے ایک بڑی سرائے کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ کئی منزلہ سونے کے تختے چرچوں میں بنا دیے گئے۔ لیکن گرم رکھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ انسانی مویشیوں کی مال گاڑی اسٹیشن پر خالی کی جاتی تھی اور چوروں نیز بھونکتے ہوئے کتوں کے درمیان سے پاسٹ (درختوں کی اندرونی چھال) کی چپلیں پہنے ہوئے لوگ غفلت کے عالم میں چرچ میں جاتے تھے اور تختوں کے بستر پہ سوتے تھے (ایس، جو اس وقت لڑکا ہی تھا ایک کسان کو کبھی نہیں بھول سکتا جو اپنی گردن میں ایک شیفٹ کی کمان ڈالے ہوئے چل رہا تھا۔ جب تک وہ فیصلہ کر سکے کہ بہتر صورت کیا ہوگی، اسے جلدی جلدی آگے بڑھا دیا گیا ایک اور شخص ہارون

اور گراموفون لیے ہوئے تھا۔ فوٹوگرافر لوگوں کے لیے ہولناکی ہے!...) پر ٹیلیشن چرچ میں ایک آٹھ خانوں والا تختہ جو دیوار میں نہیں جڑا تھا، رات کو گر پڑا اور کئی خاندان دب گئے۔ ان کی گریہ وزاری پر فوجی دوڑتے ہوئے جب تک پہنچے تھے
اس طرح وہ اس طاعون زدہ موسم سرما میں گزر کرتے رہے۔ وہ غسل نہیں کر سکتے تھے ان کے بدن زخموں سے سڑ رہے تھے۔ اسپاٹڈ فیور کی وبا پھیل گئی لوگ مر رہے تھے آرکینجل کے لوگوں کو سخت ہدایات کی گئیں کہ ان مخصوص نوآبادوں کو کوئی امداد نہ دیں (جلاوطن کسانوں کو اب اس نام سے یاد کیا جاتا تھا) مرتے ہوئے کسان شہر میں بھٹکتے تھے۔ لیکن کوئی آدمی اپنے گھر میں نہیں لے جا سکتا تھا؛ انھیں کھانا نہیں کھلا سکتا تھا۔ یا ان کے لیے باہر چائے نہیں لا سکتا تھا۔ ملیشیا ان مقامی باشندوں کو حراست میں لے لیتی تھی جو امداد کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ان کے پاسپورٹ ضبط کر لیتی تھی بھوک سے بدحال افراد ڈگمگاتے ہوں گے ٹھوکر کھاتے ہوں گے گھر جاتے ہوں گے اور لقمۂ اجل بن جاتے ہوں گے، لیکن لاشیں بھی کوئی نہیں اٹھا سکتا تھا (ملیشیا کے علاوہ سادہ کپڑوں میں پولیس ایسے ہمدردانہ افعال پر نظر رکھتی تھی) اسی زمانے میں بڑے شہروں سے، بازاروں سے، باغوں سے اور مویشی پالنے والے لوگ بھی پورے کے پورے گاؤں خالی کر کے جا رہے تھے (پھر وہی سوال ہے ــــ اس اصول کا کیا ہوا کہ وہ صرف استحصال کرنے والوں کو گرفتار کریں گے) خود آرکینجل کے باشندگان کو نکالے جانے کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا وہ ٹھہر کر کسی لاش پر نگاہ ڈالتے ہوئے بھی ڈرتے تھے (ایک لاش جی۔ پی۔ یو ہیڈکوارٹرس کے نزدیک پڑی تھی لیکن کوئی اسے اٹھانے والا نہ تھا)

انھیں ایک منظم طریقے پر دفنایا گیا ــ شعبۂ صفائی کے ذریعے تابوتوں کے بغیر مشترکہ قبروں میں جو لوگا اسٹریٹ پر پرانے شہر کے قبرستان کے نزدیک بالکل کھلی جگہ میں ان پر کوئی کتبے آویزاں نہیں کیے گئے تھے۔ یہ کیفیت اس وقت تھی جب ہل چلانے والے ابھی راستے میں ہی تھے۔ ان کے لیے لُنگا کی قصبے سے پہلے ایک بڑا کیمپ تھا جہاں ان میں سے کچھ کو عارضی لکڑی لادنے کا کام دیا گیا۔ لیکن ایک شخص نے ایک سلیپر پہ ترکیب سے خط لکھ کر راہ پر بھیج دیا (دیکھیا کسانوں کو تعلیم دینے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے!) ان کا سفر ابھی طویل تھا۔ اودیناہ پینگا تک اور ڈمونیا ندی کے اوپر ــــ

ہم کیمپ میں ایک مذاق کیا کرتے تھے، "وہ تمہیں سورج سے دور نہیں بھیج سکتے!" لیکن ان کسانوں کو اور بھی دور بھیج دیا گیا ایسے مقامات پر جہاں بہت عرصے تک شمع روشن کرنے کے لیے کوئی چھت ہی تھی۔

ان کسانوں کی حالت اس لحاظ سے پہلے کے اور بعد کے سب سوویت جلاوطنوں سے مختلف تھی کہ انھیں کسی آباد علاقے، کسی رہائش کے لیے بنائے جانے والے مقام پر نہیں بھیجا گیا بلکہ جنگلی جانوروں کی چراگاہوں میں بیابانوں میں، انسان کی ابتدائی زندگی میں پہنچا دیا گیا۔ نہیں اس سے بھی بدتر جگہ کیوں کہ بالکل ابتدائی دور میں بھی ہمارے آباؤ اجداد نے اپنی بستیوں کے لیے کم از کم وہ جگہیں منتخب کی تھیں جو پانی کے قریب تھیں وجہ یہ ہے کہ جب سے انسان وجود میں آیا ہے کسی نے بھی کسی دوسری جگہ اپنا مکان نہیں بنایا لیکن خصوصی بستیوں کے لیے چیکانے (کسانوں نے ہرگز نہیں کیونکہ انھیں انتخاب کا حق نہ تھا) چترلی، پہاڑی ڈھلانوں پر (پینگا ندی سے سو میٹر بلندی پر جہاں پانی کے لیے کھدائی کرنا ممکن نہیں اور زمین میں کم بھی نہیں آ سکتا۔ مقامات منتخب کیے خواہ تین یا چار کلومیٹر کے فاصلے پر سہولت بخش پانی والے گھاس کے میدان دستیاب ہوں۔ لیکن نہیں ہدایات

کے مطابق وہاں کوئی آباد نہیں ہو سکتا تھا۔ اس طرح لمبی گھاس کے قطعات بستی سے کافی فاصلے پر تھے اور گھاس ناؤ سے لانی پڑتی تھی۔ بعض اوقات تو آبادیوں کو براہ راست ممانعت کی جاتی تھی کہ وہ اناج کی فصلیں نہ بوئیں (وہ کیا بوئیں۔ یہ بھی پولس طے کرتی تھی!) ایک اور بات جو ہم شہر کے لوگ نہیں جانتے ــــ نامعلوم وقتوں سے مویشیوں کے رہنے کا کیا مطلب ہے؟ بغیر مویشیوں کے کسان کی زندگی صفر ہوتی ہے اس علاقے میں بہت دنوں سے ان کی قسمت ایسی رہی کہ وہ ہنہناتا، ڈکراتا، یا ممیاتا نہیں سن سکے، کبھی زین پر نہ بیٹھ سکے۔ کبھی دودھ نہ نکال سکے کبھی کوئی دیگچی نہ بھون سکے۔

سائبیریا میں دریائے چلم پر خوبان کے قازقوں کی بستی کے چہار طرف کانٹے دار تار لگا دیے گئے اور برجیاں بنا دی گئیں جیسے یہ کوئی جیل کیمپ ہو۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس بات کا مکمل بندوبست کر لیا گیا ہے کہ یہ گھناؤنے کام کرنے والے بدمعاش جلدی موت کے منہ میں چلے جائیں اور ہمارے وطن کو ان سے اور ان کی روٹی کی فراہمی سے چھٹکارا مل جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نوع کی بہت ساری خصوصی آبادیوں کا ایک ایک فرد مر کر ختم ہو گیا۔ پہلے جہاں آبادیاں تھیں وہاں حسنِ اتفاق پہنچنے والے راہگیر تھوڑا تھوڑا کر کے جھونپڑے کے بچے ہوئے حصے جلا رہے ہیں اور تھوکروں سے ان جھونپڑیوں کو نیست و نابود کر رہے ہیں۔

کسی چنگیز خاں نے اتنی بڑی تعداد میں کاشتکاروں کو غارت نہیں کیا۔ جتنی تعداد میں کمیونسٹ پارٹی کی رہنمائی میں سرکاری پولس وغیرہ کے ذریعے کاشتکار نیست و نابود کیے گئے۔

مثال کے طور پر وسیوگن کا المناک واقعہ یہ ہے۔ ۱۹۳۰ء میں دس ہزار کنبے (ان دنوں جس طرح کہ خاندان ہوتے تھے اس حساب سے ساٹھ تا ستر ہزار افراد) تومسک سے گزرے اور انھیں وہاں سے مزید آگے دھکیل دیا گیا پہلے پہل دریائے ٹوم کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ اگرچہ وہ موسم سرما تھا، پھر دریائے روب کے کنارے، پھر وسیوگن ندی کے بہاؤ کی مخالف سمت ـــ اب بھی برف کی سطح پر۔ راہ میں پڑنے والے گاؤں کے باشندگان کو بعد میں بارح دبچوں کی لاشیں یک جا کرنے کا حکم ہوا) وسیوگان اور ٹماٹ ندیوں کے بالائی علاقے میں دلدلی زمین کے درمیان پختہ اراضی کے قطعات پر وہ لوگ علیحدہ علیحدہ پھنسے ہوئے تھے۔ ان کے لیے کوئی سامان رسد یا اوزار نہیں چھوڑے گئے۔ سڑکیں ناقابل گزر تھیں اور بیرونی دنیا تک پہنچنے کی کوئی راہ نہیں تھی سوائے برسش وڈ کے دو راستوں کے ایک ٹولوکسک کی طرف جاتا تھا اور دوسرا دریائے روب کی جانب۔ دونوں راستوں پر تمام بیریر مشین گنوں سے مسلح تھے جو (موت کے کیمپ سے کسی کو باہر جانے نہیں دیتے تھے لوگ مکھیوں کی طرح مرنے لگے۔ بدحواسی میں لوگ بھاگ کر بیریر تک پہنچتے راستے کے لیے گڑگڑاتے اور انہیں گولیوں سے بھون دیے جاتے بہت عرصے بعد جب ندیوں کی برف پگھل گئی، تومسک انٹیگرل سوایوز (پروڈیوسر اینڈ کنزیومرس کو آپریٹیو) سے آئے اور زنک کی کشتیاں روانہ کی گئی۔ لیکن وسیوگان کے بہاؤ کے اوپر نہ جا سکیں۔ سامان رسد کا انچارج اور کو آپریٹیو سوسائٹی کا ایجنٹ اسٹیلاوف تھا اور یہ معلومات اسی کی فراہم کردہ ہیں)

وہ مر کر ختم ہو گئے صرف ایک آدمی!

ہمیں بتایا گیا ہے کہ اس معاملے کی کم از کم جانچ تو ہوئی تھی اور وہ ایک آدمی بھی گولی سے اڑا دیا گیا تھا۔

میں اسے کلیتاً باور نہیں کر پاتا۔ لیکن اگر ایسا ہو بھی تو ـــــ اوسط قابلِ قبول ہے۔ وہی اوسط جس سے ہم خانہ جنگی کے زمانے سے متعارف ہیں۔ ہمارے ایک کے لیے ـــــ تمہارے ایک ہزار! تمہارے ساٹھ ہزار کے لیے ـــــ ہمارا ایک۔ نئے معاشرے کی تشکیل کا اور کوئی راستہ نہیں ہے ـــــ

اور اس کے باوجود جلاوطن زندہ رہ گئے۔ ان کے حالات میں یہ ناقابلِ یقین معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ یقینی طور پر زندہ رہے۔

پارچہ کی بستی میں دن کا آغاز فدرین (کوی میبرین) جھڑیوں سے کرتے تھے۔ زندگی بھر کسان اپنے دن کا آغاز خود ہی کرتے رہے تھے لیکن اب انہیں شہتیر کے لیے درخت گرانے اور چیرنے کے لیے جھڑیوں سے ہانکا جاتا تھا انہیں لگاتار کئی ماہ تک گرم ہونے کا موقع نہ دے کر، آٹے کا راشن کم کرکے مالک ان سے اپنا قرض وصول کرتے تھے اور شام کو وہ اپنے مکانات بنانے کا کام کر سکتے تھے۔ ان کے کپڑے جسموں پر ہی تار تار ہو جاتے تھے اور وہ بوریوں کو اسکرٹ کی طرح پہنا کرتے تھے یا پھر سی کر انہیں کے پاجامے بنا لیتے تھے۔

اگر وہ سب کے سب مر کر ختم ہو گئے ہوتے تو ایسے کئی شہر جن کے نام آج ہم جانتے ہیں، وجود میں نہ ہوتے مثلاً ایگارکا کی تعمیر ۱۹۲۹ء کے بعد کس نے جاری رکھ کر مکمل کی؟ کیا شمالی قطبی شہتیروں کے ٹرسٹ نے؟ مجھے یقین نہیں۔ یا پھر شاید قلاق صفائی کا شکار ہونے والے کسانوں نے! وہ صفر سے نفی پچاس درجے حرارت میں خیموں میں مقیم رہے لیکن انہوں نے ۱۹۳۰ء میں ہی اس علاقے سے شہتیروں کی اولین فراہمی کو ممکن کر دکھایا تھا ــــ

سابق قلاق اپنی خصوصی بستیوں میں اس طرح رہا کرتے تھے جیسے زیک طویل ترین سزا والے کیمپوں میں رہتے تھے۔ اگرچہ یہاں سرحدی باڑ نہیں تھی لیکن عموماً ایک رائفل بردار آدمی بستی میں موجود رہتا تھا اور وہ ہی ہاں یا نہ کہتا تھا اسے اپنے ہی اختیارات سے اور کسی چیفیں جاں کے بغیر فسادی سمجھے جانے والے کسی بھی آدمی کو گولی مار دینے کا حق حاصل تھا۔

یہ خصوصی بستیاں شہری سہولیات کے اعتبار سے کس زمرے میں آتی تھیں۔ اس مجمع الجزائر کے ساتھ ان کے خون کے رشتے کس نوع کے تھے، یہ بات اس وقت جلد واضح ہو جائے گی۔ جب آپ اس اصول کو ملحوظ رکھیں جو باہم مربوط برتنوں میں بھرے ہوئے سیال پر منطبق ہوتا ہے۔ اگر دور کشا میں مزدوروں کی کمی محسوس کی جاتی تو مخصوص بستیوں کے لوگوں کا تبادلہ (بغیر کسی تازہ مقدمے کے، بغیر کسی نئے الزام تراشی کے) وہاں سے کیمپوں میں کر دیا جاتا تھا اور وہ تاروں کے پیچھے اسی طرح دب کر رہتے تھے جیسی آپ کی خواہش ہوا اور زیادہ تار کے پیچھے کام کرنے جاتے تھے، برتنوں کا دھلا ہوا پانی نوش کرتے تھے، بس یہ تھا کہ اس کا زاد لپنے پہریدار اور جھونپڑوں کا) خرچ اپنی مزدوری میں سے ادا کرتے تھے اور کسی کو بھی اس میں حیرت کی بات نظر نہیں آتی تھی مخصوص آبادیوں والے اپنے خاندانوں سے کٹ جاتے تھے اور ایک بستی سے دوسری بستی میں بھیجے جاتے تھے بالکل اسی طرح جیسے زیک ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ میں منتقل کیے جاتے تھے۔

ہمارا قانون جن لاقانونی باتوں کا شکار رہا ہے ان میں سے ایک سوویت یونین کی مرکزی مجلس عاملہ

نے ۳؍ جولائی ۱۹۳۱ء کو فیصلے کی صورت میں نافذ کی جس میں قلاقوں کو پانچ سال کے بعد شہری حقوق عطا کرنے کی اجازت تھی۔ اگر ـــ ذرا غور سے سنیے ـــ پولیس کی نگرانی والی کسی آبادی میں "وہ سماجی اعتبار سے مفید کاموں میں مصروف رہے ہوں اور انھوں نے سوویٹ حکومت کے تئیں اپنی وفاداری ثابت کر دی ہو" (کیسے کہ رائفل والے کے بستی کے منیجر کی یا افسر تحفظ کو اس کے کاموں میں معاونت کی ہو) لیکن یہ محض حماقت تھی۔ ایک حماقت سنک تھی اور ہر حالت میں جب پانچ برس مکمل ہو رہے تھے تو مجموعۂ تعزیرات سخت تر ہو رہا تھا۔

ایسا کوئی سال نہیں ہوتا تھا جس میں حالات کو پہلے کے مقابلے میں آسان کرنا ممکن ہو۔ پہلے تو کیروف کے قتل کے بعد کا زمانہ تھا۔ ۱۹۳۸ء، ۱۹۳۷ء پھر ۱۹۳۹ء سے یورپ میں جنگ ہو رہی تھی اور ۱۹۴۱ء میں ہماری اپنی جنگ چھڑ گئی۔ اس طرح ایک زیادہ محفوظ راستے سے ۱۹۳۷ء سے آگے نکل آیا، انھیں بد قسمت مبینہ قلاقوں اور ان کے بیٹوں میں سے بہت سے افراد کو خصوصی بستیوں سے منتخب کر لیا گیا اور دفعہ ۵۸ کے کسی جزو کی چٹ ان پر چسپاں کر دی گئی اور انھیں کیمپوں میں جھونک دیا گیا۔

یہ سچ ہے کہ جب دورانِ جنگ مورچے پر ناعاقبت اندیش روسی سورماؤں کی قلت تھی تو دوسروں کے ہمراہ قلاق کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ یقیناً وہ روسی اور بعد میں قلاق رہے ہوں گے! انھیں اپنی مقدس مادرِ وطن کی حفاظت کے لیے خصوصی بستیوں اور کیمپوں کو چھوڑ کر مورچوں پر جانے کی دعوت دی گئی۔

اور..... وہ گئے.....!

لیکن سبھی نہیں۔ ایک قلاق کے بیٹے ن ـ ر ـ کو جس کے ابتدائی زمانے کو میں نے "شورین" کے لیے استعمال کیا ہے لیکن جس کی بعد کی رودادِ حیات سنانے کی جرأت میں نہیں کر سکا، اپنی مادرِ وطن کی حفاظت کے لیے لڑنے کا موقع دیا گیا۔ جو ٹراٹسکی پسندوں اور کمیونسٹ قیدیوں کو نہیں دیا گیا خواہ انھیں جنگ پر جانے کی کیسی ہی شدید خواہش کیوں نہ رہی ہو۔ ایک لمحے کے تذبذب کے بغیر ن ـ .... و قیدی رجسٹریشن اور تقسیم کے صدر شعبہ کے پاس پہنچا ـــ "یہ تمھاری مادرِ وطن ہے تم ہی اس کی حفاظت کرو گے ـــ سنا گوبر کھانے والے! بزدل طاری کی کوئی مادرِ وطن نہیں ہوتی۔"

میرا خیال ہے یہ بعینہٖ مارکس کے الفاظ ہیں اور یقینی طور پر کیمپ کا ہر باشندہ اب بھی کسی بھی پرو ۔ ا تاری سے زیادہ مفلس، زیادہ ابتر اور کم حقوق کا حامل تھا لیکن کیمپ کے انتظامیہ، بد ـ نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا تھا اور اس نے رخ ـ و کو گولی مار دینے کی سزا سنائی وہ دو ہفتوں تک جیل میں پڑا رہا اور سزائے موت اس کے سر پر منڈلاتی رہی وہ ان سے متنفر تھا کہ رحم کی درخواست کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ آخر انھیں نے پہل کی اور اس کی سزا کی مدت میں دس سال کا اضافہ کر کے گولی کی سزا منسوخ کر دی۔

بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ انھوں نے سابق "قلاقوں" کو باہر ٹنڈرا یا بیابانی جنگل میں پہنچا دیا انھیں کھلا چھوڑ دیا گیا اور اپنے دل سے اس کا خیال بھی نکال دیا گیا۔ جب تم نے انھیں مرنے کے لیے وہاں پہنچا ہی دیا ہے تو پھر ان کا حساب کتاب رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہاں کوئی رائفل بردار بھی متعین نہیں کیا گیا۔ وہ جگہیں اتنی دور افتادہ اور دشوار گزار تھی۔ اب کہ پُراسرار ادراک کے حامل رہنماؤں نے انھیں برخاست کر دیا گیا تھا بغیر گھوڑوں کے بغیر ہلوں کے، بغیر مچھلی پکڑنے کی ڈوری کے، بغیر بندوقوں کے ـــ تو انسان کی اس جفاکش

اور مستقل مزاج قوم نے شاید دو ایک کلہاڑیوں اور بیلچوں کی مدد سے ایسے حالات میں بھی زندگی کے لیے مایوس کن جد و جہد کا آغاز کیا جو پتھر کے زمانے کے حالات سے کچھ خاص آسان نہ تھے اور اشتراکیت کے اقتصادی اصولوں کو نظر انداز کر کے ان میں سے چند بستیوں میں نہ صرف زندگی باقی رہی بلکہ خوش حال اور ترقی پذیر بھی ہو گئی۔

اس قسم کی ایک بستی میں جو دریائے ادب کے کنارے کہیں تھی۔ لیکن یہ جگہ اندرونی جھیل کے پاس تھی اور کسی بحری راستے پر بھی نہیں تھی۔ لو روف اپنے بچپن میں گیا تھا اور وہیں بڑا ہوا۔ وہ یہ کہانی سناتا ہے کہ قبل از جنگ ایک دن وہاں سے گزرتی ہوئی لانچ نے انھیں وہاں دیکھا اور رک گئی۔ لانچ میں سوار لوگ ضلع کے افسر ثابت ہوئے انھوں نے لو روف خاندان سے تفتیش کی۔ وہ کہاں سے آئے تھے اور کتنے عرصے پہلے! افسران ان کی دولت اور خوشحالی پر متحیر تھے کیوں کہ یہ حالات انھوں نے اپنے اشتراکیت زدہ علاقے میں کہیں نہیں دیکھی تھی۔ وہ چلے گئے۔ کچھ دن بعد ان کے با اختیار آدمی این۔ کے۔ وی۔ ڈی۔ کے سپاہیوں کے ساتھ آئے اور کاشتکاروں کے طاعون کے سال کی طرح ایک بار پھر انھیں حکم دیا گیا کہ جو کچھ انھوں نے اپنے لیے کمایا تھا وہ سب کچھ بستی کا آرام اور عیش ایک گھنٹے کے اندر چھوڑ کر باہر چلیں۔ چنانچہ انھیں دو ایک چھوٹی موٹی گٹھریوں کے سوا دیگر سب چیزوں سے محروم کر کے ٹنڈرا کی طرف اور بھی آگے بھیج دیا گیا۔

شاید تنہا یہی کہانی "قلاق" اور "قلاق صفائی" کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے کافی ہے!

اگر ان لوگوں کو آزادی سے جینے اور ترقی کرنے کا موقع دیا گیا ہوتا تو یہ سلوک ہوتا!

قدیم عقائد پرست (اولڈ بلیورس) — ہمیشہ کے لیے جلا وطن اور ہمیشہ کے لیے اذیت اٹھانے والے لوگ ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہوں نے تین صدی پہلے اقتدار کے دل میں اپنے تئیں بیدردی کا احساس پیدا کر دیا تھا! ۱۹۵۰ء میں پوڈ کامشانیا لوگنگا کی وسیع و عریض وادی پر ایک طیارہ پرواز کر رہا تھا۔ ہوابان نے ایک ایسی چیز دیکھی جس پر گزشتہ بیس سال میں کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ بیابان جنگل میں ایک نامعلوم بستی اس نے ان کی حالت کا اندازہ لگایا اور اس کی اطلاع آگے کر دی۔ بستی کافی دور جنگل میں تھی لیکن ایم۔ وی۔ ڈی کے لیے سب کچھ ممکن ہے اور نصف سال کی محنت کے بعد وہ وہاں جا پہنچے انھوں نے دیکھا کہ وہاں بیلوویو آباد تھے جو قدامت پرست تھے۔ جب عظیم اور پسندیدہ کاشتکار طاعون شروع ہوا تھا، میرا مطلب ہے اجتماعیت تو وہ اس نعمت سے منہ موڑ کر ٹیگا کے جنگلات میں فرار ہو گئے تھے پورا گاؤں کا گاؤں — وہ وہاں بس گئے اور کبھی باہر نہ نکلے صرف ان کا سرپنچ نمک، مچھلی کے شکار کے لیے سامان اور اوزاروں کے لیے تھوڑا سا لوہا لانے کے لیے باہر جاتا تھا۔ بقیہ تمام ضرورت کی چیزیں وہ اپنے لیے خود تیار کرنے لگے۔ پیسے کی جگہ سرپنچ خود کھالیں دے کر آتا تھا۔ جب وہ اپنا کام مکمل کر لیتا تو بازار سے کسی مفرور مجرم کی طرح چپکے سے کھسک جاتا تھا۔

اس طرح ان بیلوویو قدامت پرستوں نے اپنے لیے بیس سال کی زندگی کا بندوبست کر لیا! بیس برسوں تک کولخوز کی مصیبت کے بجائے جنگلی جانوروں کے درمیان آزادانہ (ن ک) زندگی کے بیس سال وہ سب گھر میں کاتے اور بنے ہوئے کپڑوں کی پوشاکیں اور گھر ہی میں تیار کردہ لمبے بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ اور تمام رنگ میز۔ بلا لحاظ صحت مند تھے۔

کولخوز سوسائٹی سے فرار ہونے والے۔ ان تمام نفرت انگیز مفروروں کو اب گرفتار کر لیا گیا اور ان پر

عائد کردہ الزام تھا..... اندازہ لگائیے کیا ہو سکتا ہے؟ بین الاقوامی بورژوا سے رابطہ؟ تخریب کاری؟ نہیں نہیں۔ دفعہ ۵۸ سوویٹ دشمن بغاوت (!؟!؟) اور ۵۸/۱۱ مخالف تنظیم ان میں سے اکثر بعد ازاں اسپلاگ کے کریز گل گروپ میں آگئے تھے اسی وجہ سے میں انکے بارے میں معلومات لکھتا ہوں)

۱۹۴۶ء میں کچھ اور قدامت پرستوں کو ہمارے دلاور فوجیوں نے جنگلی صوبے میں بنے ہوئے ایک ویران معبد میں دھر دبایا (موڑ تاروں سے اور مادر وطن کی جنگ میں سیکھی ہوئی مہارت کی مدد سے) انہیں وہاں سے بے دخل کیا اور ینیئی سینیئی ندی پر کشتیوں (رلیفٹ) کے ذریعہ چلتا کر دیا اور وہ اب بھی قیدی تھے اور اب بھی ناپسندیدہ تھے، جیسے پیٹر کے دور میں تھے ویسے ہی اسٹالن کے عہد اقتدار میں تھے۔ وہ کشتیوں سے ینیئی سینیئی کے پانی میں کود پڑے جہاں ہمارے ٹامی گن والے نے ان کا خاتمہ کر دیا۔

سوویٹ سپاہ کے مجاہدو ! اپنی جنگی تربیت کو بے تکان مستحکم کرتے رہو۔

نہیں وہ کم بخت طبقہ پوری طرح ختم نہیں ہوا۔ جلاوطنی میں ان کے ہاں زیادہ اولادیں ہوئیں اور وہ بھی خاندانی مجبوریوں کی وجہ سے انھیں بستیوں سے متعلق تھے۔ (بیٹا باپ کے اعمال کے لیے جوابدہ نہیں ہوتا' ملحوظ رکھیے) اگر کوئی باہر کی لڑکی مخصوص بستی کے کسی لڑکے سے شادی کرے تو وہ غلام (فتنے) میں گنی جاتی تھی اور اپنے شہری حقوق سے محروم ہو جاتی تھی۔ اگر کوئی آدمی ان میں سے کسی سے شادی کرے تو وہ خود جلاوطن بن جاتا تھا۔ اگر کوئی لڑکی اپنے باپ سے ملاقات کو آئے تو وہ اسے قبل ازیں حراست میں نہ لینے کی غلطی کو درست کر لیتے اور اسے خصوصی آباد ہونے والوں کی فہرست میں ڈال دیتے۔ ان نو واردوں سے وہ کمی پوری ہو جاتی جو بسنے والوں کو کیمپوں میں بھیجنے سے پیدا ہو جاتی تھی)۔

خصوصی آباد ہونے والے کاراگنڈا میں اور اس کے آس پاس کافی نظر آتے تھے۔ وہاں ان کی تعداد کافی تھی۔ وہ مستقل طور پر کاراگنڈا کی کانوں سے متعلق تھے۔ اور ان کے بیشتر دادا رائٹائی اور یورال کی فیکٹریوں سے متعلق رہے تھے" کان کے مالک ان سے حسب مرضی سخت سے سخت کام لینے کے لیے آزاد تھے اور معاوضہ جتنا کم چاہتے دے سکتے تھے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ وہ زرعی کیمپ ڈویژنوں سے بڑا حصہ رکھتے تھے۔

چھٹی دہائی سے قبل اور کچھ مقامات پر اسٹالن کی موت سے پہلے تک خصوصی بسنے والوں کے پاس کوئی پاسپورٹ نہیں ہوتے تھے۔ جنگ کی ابتدا ہونے پر ہی ایذا رسیدہ جلاوطنوں کو قطبی مزدوری کی شرح ملنے لگی۔

لیکن اب وہ کسان طاعون اور جلاوطنی کے بیس سال بعد بھی زندہ ہیں۔ اب کے وہ بالآخر پولیس کی نگرانی سے آزاد ہیں' اب کے وہ عزت کے ساتھ اپنے سوویٹ پاسپورٹ رکھتے ہیں' اس وقت وہ اپنے باطن میں اور رویے سے کون ہیں اور کیا ہیں؟ وہ سوویٹ شہریوں کے سوا جنھیں اچھے حالات کی ضمانت حاصل ہے اور کیا ہوں گے؟ بالکل اسی طرح' جیسے وہ' جنھیں مزدوروں کی اینیمیوں نے' ٹریڈ یونین کے بابوں نے اور سوویٹ افواج کے بے خدمات نے ایک ساتھ پروان چڑھایا تھا۔ وہ تقریباً مردانہ وار اپنی چال چلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور ٹیلیویژن کے پردے پر نظر آنے والے ہر عکس کے ساتھ تائید میں سروں کو جنبش دیتے ہیں۔ مرفہ الحال کے

وقت وہ جنوبی افریقہ کی جمہوریت کو مغلظات سے نوازتے ہیں یا کیوبا کی مدد کے لیے اپنے کوپک چندے میں دیتے ہیں
اس لیے آؤ، اس خونخوار قصائی کے روبرو ہم بھی خوف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے سر خم کر لیں
اور جو ذہنی معمہ اس نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس کے سامنے اپنے کندھے جھکا لیں کیا آخر ش اُس کا انسانی
قلوب کو پڑھنے کی صلاحیت رکھنے والے کا لہو اور کیچڑ کے ہولناک مرکب کو ملنا اور برہا برس تک مسلے رہنا
مناسب عمل تھا۔

ہاں۔ اخلاقی اعتبار سے درست تھا کسی کو اس سے حسد نہیں! عام لوگ کہتے ہیں کہ اس کے زمانے
میں "خرد مچیف سے بہتر حالات" تھے کیوں اپریل فول کے دن، سال بہ سال، سگریٹیں ایک ایک کوپک میں
اور فینسی چیزیں دس کوپک میں ملا کرتی تھیں۔ توصیف اور نغمات اس کے کانوں میں اس کی موت کے دن تک
گونجتے تھے اور آج بھی ہیں اس کی مذمت کرنے کی آزادی نہیں ہے۔ نہ صرف کوئی سنسر آپ کا قلم روک دیگا
بلکہ کسی دکان پر ایستادہ یا ٹرین میں بیٹھا ہوا کوئی بھی شخص آپ کے لبوں پر آنے والے مذموم الفاظ کو فوراً
بند کرا دے گا۔

ہم عظیم سیاہ کارنامے انجام دینے والوں کی تعظیم کرتے ہیں ہم عظیم قاتلوں کی پرستش کرتے ہیں۔
اور سیاسی اعتبار سے اس کا عمل اور بھی اچھا تھا۔ یہ خون کا مرکب فرمانبردار کو لوزدوں کے لیے سمنٹ
کا کام دیتا تھا۔ کوئی بات نہیں اگر رُبع صدی کے اندر وہ گاؤں ریگستان بن جائے گا اور لوگ اخلاقی
اعتبار سے صفر بن جائیں گے۔ کوئی بات نہیں ہمارے راکٹ خلا میں پرواز کرتے ہوں گے اور ہوشیار
مغربی ممالک ہماری خوشامد میں لگے ہوں گے اور ہماری کامیابیوں اور ہماری قوت کے سامنے سر جھکاتے
رہیں گے۔

تیسرا باب

جلاوطنوں کی تعداد بڑھی

صرف کسانوں کو اتنی ہولناکی کے ساتھ ایسے بیابانوں میں اتنے واضح قاتلانہ ارادے سے جلاوطن کیا گیا تھا: کسی اور کو اس سے قبل اس طرح نہیں نکالا گیا نہ مستقبل میں نکالا جائے گا۔ پھر بھی ایک دوسرے معنی میں اور اپنے ہی دائمی طریقے سے جلاوطنوں کی دنیا سال بہ سال زیادہ گھنی اور تاریک تر ہوتی گئی۔ اور زیادہ لوگ جلاوطن کیے گئے انہیں اور بھی کم جگہ میں آباد کیا گیا، قوانین سخت ترین بنا دیے گئے۔

ہم موٹے طور پر مندرجہ ذیل ٹائم ٹیبل پیش کر سکتے ہیں۔ تیسری دہائی میں جلاوطنی ایک نوع کی عبوری حالت میں تھی، کسی کیمپ میں مقید رکھنے سے پہلے ایک راستے کا پڑاؤ تھا۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جن کا چھٹکارہ صرف جلاوطنی سے ہو گیا ہو۔ تقریباً سبھی کو بعد ازاں کیمپوں میں دھکیل دیا گیا۔

چوتھی دہائی کے وسط خاص طور پر بیریا کے زمانے سے، غالباً اس وجہ سے کہ جلاوطنی کی دنیا میں آبادی بڑھ گئی تھی (ذرا غور کیجیے کہ تنہا لینن گراڈ نے ہی اس میں کتنا اضافہ کیا تھا!) اسے پابندی اور علیحدگی میں رکھنے کے ایک ہر طرح مکمل، تشفی بخش طریقے کو ایک آزادانہ افادیت حاصل ہو گئی تھی۔ جنگ اور جنگ کے بعد کے دور میں جلاوطنی کا طریقہ کیمپوں کے ساتھ ساتھ وسعت اور اہمیت کے اعتبار سے روز افزوں ترقی کرتا گیا۔ اس میں جو تنپرے اور سرحدی باڑ بنانے پر نگرانوں اور سپاہیوں پر کوئی حرف نہ آتا تھا اور اس کے وسیع دامن میں بڑے بڑے جتھوں کے لیے، بطور خاص اُن کے لیے جن میں بچے اور عورتیں بھی شریک ہوں، کافی جگہ تھی (تمام سفری جیلوں پر عورتوں اور بچوں کے لیے کوٹھڑیاں مستقل طور پر تیار رکھی جاتی تھیں اور یہ کبھی خالی نہیں رہتی تھیں۔)، جلاوطنی سے "خاص سرزمین" کے کسی بھی اہم علاقے کی فوری، لائق اعتماد اور مستقل صفائی کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ جلاوطنی کا طریقہ اتنی پختگی کے ساتھ مستحکم ہو گیا تھا کہ ۱۹۴۸ء سے اسے حکومت کا ایک اور کام بھی تفویض کر دیا گیا — کوڑے کرکٹ کے انبار یا نالیوں کے جوہڑ کا کام جہاں مجمع الجزائر کی بیکار چیزیں پہنچا دی جاتی تھیں تاکہ وہ پھر "خاص سرزمین" کا رُخ نہ کر سکیں۔ ۱۹۴۸ء کے موسم بہار میں یہ ہدایات کیمپوں تک پہنچا دی گئیں، معمولی مستثنیات سے ہٹ کر دفعہ ۵۸ کے تمام قیدیوں کو سزا کے اختتام پر جلاوطنی میں رہا کیا جانا تھا۔ بالفاظِ دیگر انہیں بے خیالی میں ایسے ملک پر بار نہیں بنانا تھا جو اُن کا نہیں تھا بلکہ ہر شخص کو کیمپ کے گارڈ ہاؤس سے پہرے میں لے جا کر کسی جلاوطن کالونی میں کمانڈنٹ کے دفتر میں منتقل کرنا ہوگا یعنی مچھلیوں کے ایک جال سے دوسرے جال تک۔ چونکہ جلاوطنی کے طریقے میں بہت باریک بینی سے منتخب کردہ تھوڑے سے علاقے ہی آتے تھے اس لیے یہ سب مل کر ایک دوسرا علیحدہ (اگرچہ باہم متصل)

ملک تشکیل کرتے تھے جو سوویت یونین اور مجمع الجزائر کے درمیان واقع تھا۔ ایک قسم کا صفائی معکوس کا مقام جسے پار کر کے آدمی مجمع الجزائر میں تو پہنچ سکتا تھا لیکن خاص سرزمین میں نہیں جا سکتا تھا۔

۱۹۴۵-۱۹۴۶ کے برسوں میں جلا وطن نو آبادیوں میں "آزاد کردہ" (قبضے میں آنے والے) علاقوں سے غیر معمولی انداز میں غیر متوقع کمک پہنچی اور ۱۹۴۹-۱۹۴۷ء میں مغربی جمہوریوں سے اور بھی لوگ آ گئے۔ یہ دھاریں مل کر جلا وطن کسانوں کے علاوہ پانچ لاکھ کی تعداد سے کہیں زیادہ ہو گئیں۔ زارشاہی روس میں جو اقوام کا جیل خانہ تھا، پوری انیسویں صدی میں ان پانچ لاکھ سے زیادہ قیدی کبھی نہیں رہے تھے۔

---x---

کن جرائم کے لیے ہمارے وطن میں چوتھی اور پانچویں دہائی میں جلا وطنی یا بیدخلی کی سزا مل سکتی تھی؟

(نوکرشاہی کو اس تفریق سے بڑا لطف حاصل ہوتا ہو گا کیونکہ یہ عمل میں نہیں آتا تھا لیکن اس ساری مدت میں اس کا تذکرہ بیچ بیچ میں ہوتا رہتا تھا۔ جب ایم آئی۔ بورڈوسکی نے، جسے اپنے مذہب کے لیے معتوب ہونا پڑا تھا، اس بات پر اظہارِ حیرت کیا کہ اُسے کسی مقدمے کے بغیر جلا وطن کر دیا گیا تو لیفٹیننٹ کرنل آئیوانوف نے ازراہِ عنایت وضاحت کی: مقدمہ نہ چلانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ جلا وطنی نہیں بے دخلی کا معاملہ ہے۔ ہم تمہیں ایسا شخص نہیں سمجھتے جس کا جرم ثابت ہو چکا ہے اور تمہیں رائے دہندگی کے حق سے بھی محروم نہیں کیا گیا ہے، چونکہ بہرطور یہی تو شہری آزادی کی سب سے بڑی علامت ہے)

سب سے عام جرائم بآسانی گنوائے جا سکتے ہیں:

۱۔ کسی مجرم فرقے سے تعلق رکھنا (اس کے لیے علیحدہ باب ملاحظہ فرمائیے)

۲۔ پہلے کیمپوں میں مقیم ہونا

۳۔ مجرم ماحول میں قیام کرنا (باغی لینن گراڈ یا ایسے علاقے جن میں پارٹیزن تحریک چل رہی تھی مثلاً مغربی یوکرین یا بالٹک ریاستیں)

---x---

اور پھر اس کتاب کی ابتدا میں گنوائی جانے والی اُن کی معاون ندیاں جلا وطنی کے طریقے میں بھی اور کیمپوں میں بھی اپنا ذخیرہ منتقل کرتی رہتی تھیں اور درمیان میں اپنا کچھ بوجھ جلا وطنی کے ساحل پر بھی پھینکتی رہتی تھیں یہ کون لوگ تھے؟ سب سے زیادہ تو ان میں کیمپوں میں سزا یافتگان کے خاندان تھے لیکن خاندان ہمیشہ نہیں لائے جاتے تھے اور ایسا بھی نہ تھا کہ قیدیوں کے خاندان ہی جلا وطنی میں آتے ہوں۔ جس طرح کسی سیال میں موجود دھاروں کی وضاحت کے لیے ہائیڈروڈائنامکس کے اصول کی واقفیت ضروری ہوتی ہے جس کے بغیر آپ بے حساب چکر کاٹتے ہوئے اور شور کرتے ہوئے پانی کو مایوسانہ تکتے رہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے، اسی قسم کی بات یہ ہے کہ ہمیں اُن بے شمار سیلابوں کا کوئی علم نہیں ہے جو مختلف ادوار میں کسی واضح سبب کے بغیر مختلف اقسام کے لوگوں کو کیمپوں کی بجائے جلا وطنی میں بھیجتے تھے۔ ہم تو محض یہ دیکھ سکتے ہیں کہ وہاں نو آبادوں کی عجیب و غریب آمیزش تھی۔ منچوریا سے آنے والے افراد، علیحدہ علیحدہ علاقوں سے آنے والی غیر ملکی رعایا (جلا وطنی میں بھی انہیں سوویٹ قانون کے مطابق اُن دیگر ساتھ رہنے والے جلا وطنوں سے

شادی کرنے کا حق نہیں جو جلاوطنی میں بھی سوویٹ رعایا تھے) کچھ کاکیشیا والے تھے (جن میں کسی کو یاد نہیں کہ ایک بھی جارجین ہو) اور وسط ایشیا کے لوگ جنہیں اسیر جنگ ہونے کے باعث دس سال تک کیمپ میں قیام کی عام سزا کے بجائے صرف چھ سال کی جلاوطنی کی سزا دی گئی تھی، اور کچھ سابق اسیرانِ جنگ بھی سائبیریا کے لوگ بھی، جو اپنے اپنے ضلعوں کو بھیج دیے گئے تھے اور وہاں آزاد افراد کی مانند رہتے تھے، انہیں ضلعوں پر حاضری نہیں دینی پڑتی تھی لیکن انہیں ضلع چھوڑنے کا اختیار نہیں تھا۔

ہم جلاوطنی کی مختلف اقسام اور حالات پر زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکتے کیونکہ اس ضمن میں ہماری معلومات کے ماخذ اِکا دُکا واقعات یا خطوط ہیں۔ اگر اے۔ ایم۔ آر ـــ وی نے مراسلہ نہ بھیجا ہوتا تو قاری کو مندرجہ ذیل واقعے کا علم نہ ہو سکتا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں دیاتکا کے ایک قریبی گاؤں میں اطلاع پہنچی کہ اس کے ایک کولخوز کسان کو زورن کو جو پیادہ فوج میں پرائیویٹ (ایک فوجی عہدہ) تھا یا تو کسی تعزیری یونٹ میں بھیج دیا گیا تھا یا پھر براہِ راست گولی مار دی گئی تھی۔ اُس کی بیوی کے پاس جس کے چھ بچے تھے (سب سے بڑا دس سال اور سب سے چھوٹا چھ ماہ کا تھا اور اُس کی دو کنواری بہنیں بھی جن کی عمریں پچاس برس کے آس پاس تھیں اس کے ساتھ ہی رہتی تھیں) فوراً قُرق امین آ گئے (قارئین! آپ اس کا مطلب پہلے ہی جانتے ہیں ـــ یہ جلادوں کا پیار کا نام ہے) اُنہوں نے کُنبے کو کوئی چیز فروخت کرنے کی مہلت نہ دی (اپنا مکان، گائے بھیڑیں، گھاس، لکڑی سب کچھ لیٹروں کے حق میں چھوڑنے پڑے) اُن نو کے نو افراد کو چھوٹی موٹی اشیا کے ساتھ ایک سلیج میں ڈال دیا گیا اور سخت پالے میں ساٹھ کلومیٹر دُور دیاتکا قصبے (کیروف) میں لے گئے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ راستے میں جم کیوں نہیں گئے۔ انہیں چھ ہفتوں تک کیروف کی سفری جیل میں رکھا گیا پھر اوختا کے نزدیک ایک چھوٹی سی پاٹری (مٹی کے برتن کا کارخانہ) میں منتقل کر دیا گیا۔ غیر شادی شدہ بہنوں نے کوڑے کرکٹ سے غذا تلاش کی، دونوں پاگل ہو گئیں اور مر گئیں۔ ماں اور بچے زندہ بچے کیونکہ مقامی لوگوں کی (سیاسی اعتبار سے بے شعور، وطن کے غیر وفادار، سچ پوچھیے تو سوویٹ دشمن) امداد مل گئی۔ جب لڑکے بڑے ہو گئے تو سب فوج میں چلے گئے اور کہا گیا کہ انہوں نے "اپنی فوجی اور سیاسی تربیت خصوصی قابلیت کے ساتھ مکمل کی"۔ اُن کی ماں اپنے آبائی گاؤں میں ۱۹۶۰ء میں پلٹ کر آئی اور جہاں کبھی اُن کا مکان تھا وہاں ایک شہتیر یا اینٹ بھی اُسے نہیں ملی۔

اس قسم کا ایک چھوٹا سا موتی یقیناً ہماری عظیم مادرِ وطن کی فتح کے ہار میں پرو دیا جا سکتا ہے؟ لیکن کوئی بھی اسے ہاتھ نہیں لگائے گا، یہ معمولی چیز نہیں ہے۔

آپ کس ہار میں پروئیں گے؟ کس جلاوطن فرقے میں شمار کریں گے ان فوجیوں کو جو مادرِ وطن کے لیے جنگ کرتے ہوئے اپاہج ہو گئے اور اسی جرم میں جلاوطن کر دیے گئے؟ ہم اُن کے بارے میں تقریباً بالکل لاعلم ہیں، سچ پوچھیے تو شاید کوئی بھی نہیں جانتا۔ لیکن اپنی یادداشت کو تازہ کیجیے۔ ایسے کتنے اپاہج، جن میں سے کچھ تا حال بوڑھے نہیں ہوئے، جنگ کے فوراً بعد بازاروں میں چائے خانوں اور مضافاتی ٹرینوں کے آس پاس رینگتے ہوئے نظر آتے تھے۔ بعد ازاں ان کی تعداد سرعت کے ساتھ دانشمندانہ طریقے سے کم کر دی گئی یہ بھی ایک لہر تھی، ایک مہم تھی۔ انہیں ایک شمالی جزیرے میں جلاوطن کر دیا گیا۔ اس وجہ سے جلاوطن کر دیا گیا

کہ وہ مادرِ وطن کی عزت کے لیے جنگ میں اپاہج بننے پر آمادہ ہو گئے تھے اور اس لیے کہ قوم کی صحت میں اضافہ ہو سکے جواب تک ہر قسم کی جسمانی پہلوانی اور گیند کے کھیلوں میں اتنی فتوحات حاصل کر چکا تھا۔ یہ بدقسمت جنگی سورما اپنے نامعلوم جزیرے پر قیدی کی حیثیت سے پڑے ہیں (بہت ہی کم خطوط چوری چھپے آ سکتے ہیں اور اُنہیں کی بنیاد پر ہمیں ان کا علم ہوا ہے) اور قدرتی طور پر انہیں بہت کم راشن ملتا ہے کیونکہ وہ اتنی زیادہ محنت نہیں کر سکتے کہ اُن کے ساتھ کشادہ قلبی کا سلوک کیا جا سکے۔

میرا خیال ہے وہ تا حال وہاں اپنے دن گزار رہے ہیں۔

عظیم پاکِی معکوس کے مقام (ہرگیٹری) پر سوویٹ یونین اور مجمع الجزائر کے مابین جلاوطنوں کی دنیا میں بڑے قصبے، چھوٹے قریے، بستیاں اور ہر طرح کے غیر آباد مقامات بھی تھے جلاوطنوں نے قصبات میں جانے کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی؛ اُن کا خیال تھا اور یہ درست ہی تھا کہ "ہم جیسوں کے لیے وہاں نسبتاً سہولت ہے"۔ بطور خاص کام کے اعتبار سے۔ اور کہ اُن کی زندگیاں عام لوگوں کی زندگی سے زیادہ مماثل ہوں گی۔

شاید جلاوطن دنیا کا مخصوص دارالسلطنت اور یقینی طور پر اس کا ایک موتی کاراگنڈا تھا۔ میں نے اس کا ایک جزو عام جلاوطنی کے اختتام سے کچھ پہلے ۱۹۵۵ء میں دیکھا تھا (پولس حکام نے، جو ایک جلاوطن تھا مجھے تھوڑی دیر کے لیے وہاں جانے کی اجازت دے دی تھی۔ میں شادی کرنے والا تھا، ایک دوسری جلاوطن سے!) اس وقت یہ ایک فاقہ کش شہر تھا اور اس میں داخلے کے مقام، ایک شکستہ اسٹیشن کی عمارت کے نزدیک — ٹرامیں اس کے بہت نزدیک سے نہ گزر سکتی تھیں (کیونکہ سطح زمین کے قریب جو کان کنی کی جا رہی تھی اُس کے دھنس جانے کا خطرہ تھا) اور ٹراموں کے موڑ کے ساتھ لگا ہوا ایک کچا علاقائی مکان تھا۔ اس کی دیوار دراڑ دار پر قائم تھی تا کہ گر نہ پڑے۔ شہر کے نئے حصے کے عین درمیان یک سنگی دیواروں پر پتھر کے ٹکڑوں سے یہ لفظ جڑے گئے تھے "(صنعت کے لیے) کوئلہ روٹی ہے" اور واقعی وہاں روزانہ دکانوں پر کالی روٹی فروخت ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے شہر میں جلاوطن کیے جانے میں لوگ سہولت محسوس کرتے تھے۔ کرنے کے لیے بھاری کام بھی تھا اور کچھ کام قدرے ہلکا بھی تھا، کھانے کی دکانیں تقریباً خالی تھیں اور اونچی قیمتوں کی وجہ سے بازار کی دکانیں رسائی سے پرے تھیں اس وقت شہر کے تین چوتھائی نہیں تو دو ثلث لوگوں کے پاس پاسپورٹ تھے اور انہیں پولس اسٹیشن پر حاضری دینی پڑتی تھی۔ وقتاً فوقتاً سابق زیک، بطور خاص ایکی بسٹز کے زیک سڑکوں پر میرا خیر مقدم کرتے۔ وہاں جلاوطن کیسی زندگی بسر کرتے تھے؟ کام میں وہ کمتر درجے کا آدمی تھا اور تنخواہ کم ہوتی تھی کیونکہ ہر ایک کے پاس گرفتاری، جیل اور کیمپ کے حادثات کے بعد اپنی صلاحیتیں ثابت کرنے کے وسائل نہیں تھے اور مدتِ ملازمت کی طوالت کے اعتبار سے کوئی سہولت ملنے کی توقع اور بھی کم ہوتی تھی یا شاید وہ سادہ لوح نیگرو لوگوں کی حیثیت میں تھے جنہیں سفید فاموں کے معیار پر اُجرت نہیں دی جاتی: اگر آپ ملازمت نہیں کرنا چاہتے تو آپ کی مرضی۔ پھر رہائشی فلیٹوں کی شدید قلت تھی۔ جلاوطن لوگ ہوا منڈلی کے بغیر گھٹتے ہوئے مکانوں، بغیر کھڑکی کے تاریک کمروں میں، چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں میں رہتے تھے اور بے تحاشہ زیادہ کرایہ دیتے تھے کیونکہ سب مکان نجی طور پر کرائے کے لیے اُٹھائے جاتے تھے۔ جو عورتیں اب جوان نہیں

رہ گئی تھیں. کیمپوں میں مُرجھا کر خشک ہوگئیں تھیں' جن کے دانت' دھات جیسے ہوگئے تھے' باہر جانے کے لیے پھٹی کریپ کے بلاؤز اور ایک جوڑا جوتوں کے خواب دیکھتی رہ جاتی تھیں.

پھر کاراگنڈا میں فاصلے طویل ہیں اور بہت سے لوگوں کو کام پر پہنچنے کے لیے لمبا راستہ طے کرنا پڑتا ہے. مرکز سے صنعتی بیرونی حصّے میں رینگتے ہوئے پہنچنے میں ٹرام کو پورا ایک گھنٹہ لگتا تھا. ٹرام میں میرے سامنے گندے اسکرٹ اور ٹوٹے ہوئے سینڈل پہنے مُرجھائی ہوئی سی ایک عورت بیٹھی تھی اُس کی گود میں ایک بچّہ تھا جس کو ایک نہایت گندا انگوٹ باندھا گیا تھا اور اُسے بیچ بیچ میں نیند آجاتی تھی' جیسے ہی اُس کے ہاتھ ڈھیلے پڑتے' بچّہ اُس کی گود سے ایک کنارے پر سرک جاتا تھا اور گرنے لگتا تھا. لوگ چیختے — "تو اسے گرا دے گی". وہ اُسے گرنے سے پہلے ہی سنبھال لیتی لیکن چند منٹوں کے بعد اُسے پھر نیند آجاتی. وہ رات کی شفٹ میں پانی کی ٹنکی پر کام کرتی تھی اور اُس نے جوتوں کی تلاش میں پُورا دن شہر میں بھٹکتے ہوئے گزار دیا تھا — اور جُوتے اُسے نہیں ملے!

یہ صورت تھی کاراگنڈا میں جلاوطنی کی.

جہاں تک میں سوچ سکتا ہوں. دزاکی میں نسبتاً سہولت تھی. قازقستان کے زرخیز جنوبی خطّے میں غذائی اشیاء سستی تھیں لیکن شہر جتنا چھوٹا تھا کام حاصل کرنا اُتنا ہی دشوار تھا.

چھوٹے قصبے ینی ییٹسک کو لیجیے. جب ۱۹۴۵ء میں جی. ایس. میٹرووچ کو کراسنویارسک عبوری جیل سے وہاں منتقل کیا جارہا تھا تو اُس نے اُس دستے کے ساتھ پہرے پر جانے والے لیفٹننٹ سے دریافت کیا کہ کیا وہاں کام ہوگا؟ "ضرور ہوگا" لیفٹننٹ نے مسرور لہجے میں جواب دیا۔ "اور کوئی رہائش کا مقام؟" — "ضرور" لیکن انہیں کمانڈ چوکی کے سپرد کرنے کے بعد پہریدار تھوڑا سا سامان ساتھ لے کر چلے گئے. نوواردوں کو تو دریا کے کنارے اُلٹی ہوئی کشتیوں کے نیچے یا بازار میں ادھر اُدھر سے کھلے ہوئے برآمدوں میں سونا پڑتا تھا. وہ روٹی نہیں خرید سکتے تھے' روٹی محض اُن کے ہاتھ فروخت کی جاتی تھی جن کا کوئی مستقل پتہ ہوتا تھا اور نئے آنے والے اپنے ناموں کا اندراج نہیں کرا سکتے تھے. رہائشی جگہ کے لیے پیسہ جمع کرنا پڑتا تھا. میٹرووچ نے' جو معذوری پنشن پانے کا مستحق تھا' اپنے ہی پیشے میں کام دینے کے لیے کہا (وہ مویشیوں کا ماہر تھا) چوکی کے کمانڈر نے جلدی سے سوچ سمجھ کر ضلع سوویٹ کے شعبۂ زراعت کو ٹیلی فون کیا "سنو! اگر تم مجھے ایک بوتل دو تو میں تمہیں ایک مویشیوں کا ماہر دے سکتا ہوں".

یہ جلاوطنی کا مقام تھا جہاں اس تنبیہہ سے کہ "تخریب کاری پر تمہیں دفعہ ۵۸/۱۴ ملے گی' ہم تمہیں واپس کیمپ میں بھیج دیں گے"، کوئی خوف نہیں کھاتا تھا. ینی سیئسک کے بارے میں دوسری جاننے کے لائق بات ۱۹۵۲ء کی ہے ایک دن جب وہ پولس میں حاضری دینے گئے تو بدحواس جلاوطن چوکی کے کمانڈر سے کہنے لگے کہ وہ انہیں گرفتار کرلے اور انہیں واپس کیمپ میں بھیج دے. تمام کے تمام آدمی — وہ اس جگہ اپنے لیے روٹی نہیں کما سکتے تھے. چوکی کمانڈر نے انہیں بھگا دیا. ایم. وی. ڈی کوئی روزگار دفتر نہیں ہے۔

ایک اور بھی شومیِٔ قسمت کا شکار مقام ہے — ٹاسیئینو' کراسنویارسک علاقے میں کنسک سے ۲۵۰ کلو میٹر. یہ مقام جرمن چیچینوں اور انگش کے لیے اور سابق زیکوں کی قیام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا.

یہ کوئی تازہ ایجاد کردہ مقام نہیں ہے۔ کھنڈالی گاؤں، جہاں پرانے وقتوں میں مجرموں کے لیے زنجیریں بنتی تھیں، قریب ہی ہے لیکن وہاں جو چیز نئی ہے وہ مٹی کے مکانات کا وہ سلسلہ ہے جن میں فرش بھی مٹی کے ہیں ۱۹۴۹ء میں دوبارہ ولنے تبدیلیوں کا ایک گروپ وہاں شام کے وقت لایا گیا۔ اور اُسے اسکول پر اُتارا گیا۔ کافی رات گئے نئے مزدوروں کا بندوبست کرنے کے لیے ایک کمیشن کی نشست ہوئی۔ ضلع ایم۔ وی۔ ڈی چوکی کا کمانڈر، نمبر کوآپریٹیو کا ایک نمائندہ اور کولخوزوں کے صدور۔ کمیشن کی کارروائی جب رفتہ رفتہ آگے بڑھی اس سے پہلے بوڑھے اور مریض لوگ، کیمپوں میں دس دس سال کی قید سے نیم جاں اور ان میں سے بیشتر خواتین ــــ ان لوگوں کو حکومت نے اپنی عقلمندانہ پالیسی کے تحت شہروں سے باہر رکھا تھا اور سخت ترین مقامات پر جنگلات کو قابو میں لانے کے لیے لا پھینکا تھا۔ کارخانے ایسے لوگوں کو کام پر رکھنا پسند نہیں کرتے تھے لیکن ایم۔ وی۔ ڈی نے اُن کے لیے کوئی دوسرا راستہ ہی نہ چھوڑا تھا۔ قریب المرگ ضعیفوں میں سب سے زیادہ مایوس کن ناپسندیدہ لوگ نمک کے کارخانے کے ذمے لگا دیے گئے۔ جس کا نمائندہ نشست میں تاخیر سے پہنچا تھا۔ نمک کا کارخانہ ٹرویٹسک گاؤں میں (یہ بھی جلاوطنی کا ایک پرانا مقام تھا۔ قدیم قدامت پرستوں کو الگزینڈر میخائیلووچ کے عہد حکومت میں وہاں ہانکا جاتا تھا) ادسولکا ندی پر تھا۔ بیسویں صدی کے وسط میں یہ تکنیک استعمال کی جا رہی تھی: فلٹروں میں نمکین پانی کا محلول پمپ کرنے کے لیے دائرے میں گھوڑے چلائے جاتے تھے اور بھاپ اُڑا کر نمک حاصل کیا جاتا تھا (آگ کے لیے لکڑی شہتیر بنانے والے کارخانے سے آتی تھی یہاں انہوں نے عورتوں کو معمور کیا) اس پارٹی میں ایک کامیاب اور مشہور بحری افسر باسٹو کار آگیا تھا، اُسے اپنے قدیم پیشے کے بہت قریب کا کام، پیکیٹوں میں نمک پیک کرنے کی خدمت تفویض ہوئی۔

کرلونا کا ایک ساٹھ سالہ مزدور کنیا زیف ٹاسیوو میں لایا گیا وہ کام کرنے کی عمر سے تجاوز کر چکا تھا اور اُسے بھیک مانگنی پڑتی تھی۔ بعض اوقات لوگ اُسے رات گزارنے کے لیے لے جاتے اور کبھی وہ سڑک پر سو جاتا تھا۔ بوڑھے لوگوں کے لیے قائم کردہ کبرسنوں کی قیام گاہ میں اُس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اور اسپتال میں اُسے بیک وقت زیادہ دنوں تک نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ موسم سرما میں ایک دن وہ ریکویٹم مزدور پارٹی کی مقامی کمیٹی، کی عمارت کے زینوں پر رینگتا ہوا اوپر چڑھ گیا اور سردی سے اکڑ کر مرگیا۔

ایک کیمپ سے جنگل میں جلاوطنی کی غرض سے لائے ہوئے زیک (بیس ڈگری کے پالے میں) کھلی لاریوں کے عقبی حصے میں تھوڑا سا کپڑا پہنے ہوئے، اور ان کے علاوہ اُن کے پاس گرم رہنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، گھسے ہوئے کینو اس کے جوتے پہنے ہوئے، جبکہ پہریدار فوجی بھیڑ کی کھال کے کوٹ اور فلیٹ کے بوٹوں سے آراستہ تھے) اپنے اعصاب پہ بھروسہ نہ کر سکے۔ کیا اُن کی رہائی کا اس سے زیادہ کوئی مطلب نہ تھا؟ کیمپ میں گرم کی ہوئی جھونپڑیاں تھیں اور یہاں اُن کے پاس مٹی کے مکانات تھے جو لکڑی چیرنے والے چھوڑ گئے تھے اور وہ گزشتہ سردیوں سے گرم نہیں ہوئے تھے۔ بجلی کے آرے کیمپوں میں بھی گھرگھراتے رہتے تھے اور یہاں بھی شور مچاتے رہتے ہیں۔ یہی آرے ہر دو جگہ معقول کا راشن کمانے کا واحد ذریعہ تھے۔

چونکہ نئے جلاوطنوں سے غلطیاں سرزد ہونے کا امکان تھا اور جب ۱۹۵۲ء میں تمبا نسٹر پرائزز کا ڈپٹی ڈائرکٹر لیبلبو ووچ یعنی سنٹی میں سخوبوزن ضلع میں کزنیسوو مقام خوب بن ٹھن کر پہنچا تو انہوں نے

اُس کے چمڑے کے اوور کوٹ اور لمبوترے سر کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور غلط الفاظ میں اُسے خوش آمدید کہا: "صبح بخیر، شہری سردار!"

لیٹنبروچ نے نفرت سے اپنے سر کو جنبش دی "نہیں! نہیں۔ یہ شہری شہری کیا لگا رکھا ہے۔ تمہیں مجھے کامریڈ کہنا چاہیے۔ اب تم قیدی نہیں ہو"

جلاوطن لوگ ایک کچے مکان میں جمع ہوئے تھے اور ڈپٹی ڈائرکٹر نے ایک لرزتی ہوئی تیل کی لالٹین کی دھندلی روشنی میں انہیں اس طرح لیکچر پلایا جیسے کوئی آدمی تابوت میں کیلیں جڑتا ہے!

"یہ نہ سمجھو کہ تم یہاں عارضی طور پر مقیم ہو۔ دراصل تمہیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے اس لیے جتنی جلد ممکن ہو سکے، کام پر لگ جاؤ! اگر تم خاندان والے ہو تو اپنے کنبے کو یہاں بلا لو، اگر نہیں ہے تو بلا توقف اپنے ہی لوگوں میں شادی کر لو، گھر بساؤ، بچے پیدا کرو۔ تمہیں مکان اور گائے کے لیے سرکاری امداد فراہم کی جائے گی کام کرو کامریڈ کام! ہمارے وطن کو ہمارے صبر کی ضرورت ہے۔"

اتنا کہہ کر کامریڈ اپنی کار پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

یہ بھی اُنہیں ایک خصوصی اختیار حاصل ہوا تھا کہ انہیں شادی کرنے کی چھوٹ دی گئی تھی۔ مثلاً یاگیڈ نوئے کے قریب کولیما پر آباد نہایت قلاش بستی میں، ریٹیز مطلع کرتا ہے، ایسی عورتیں موجود تھیں جنہیں خاص سرزمین پر جانے کی اجازت نہ تھی پھر بھی ایم وی۔ ڈی جلاوطنوں کو اُن سے شادی کرنے سے منع کرتی تھی کیونکہ اس طرح خاندانوں کو رہنے کی جگہ دینی پڑے گی۔

لیکن جلاوطنوں کو شادی نہ کرنے کی ایک رعایت بھی ہو سکتی تھی۔ شمالی قازقستان میں ۱۹۵۲-۱۹۵۰ء میں ایم۔ وی۔ ڈی کی کچھ چوکیوں نے نئے جلاوطنوں کی آمد پر اُنہیں اس شرط کا پابند بنانے کی کوشش کی کہ دو ہفتے کے اندر شادی کر لو ورنہ ہم تمہیں اندرونی علاقے کے ریگستان میں بھیج دیں گے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ جلاوطنی کے بہت سے مقامات پر کیمپ کا لفظ "جنرل ڈیوٹی" بالکل سیدھے معنوں میں مستعمل تھا مذاقاً نہیں۔ کیونکہ وہ یہاں مر کر بھی اُسی حیثیت میں تھے بالکل وہی حیثیت جو کیمپ میں تھی لازمی جان توڑ مشقت جو آدمی کی صحت غارت کر دیتی تھی اور گزر بسر کے لیے معقول اُجرت کا فقدان اور اگرچہ اب یہ سمجھا جاتا تھا کہ آزاد آدمیوں کی حیثیت سے جلاوطنوں کو کم گھنٹے کام کرنا پڑے گا۔ لیکن وہاں دو گھنٹے (رپٹ یا چرائی کے سکشن) تک چلنے اور دو واپس آنے میں۔ اس طرح اُن کے کام کا دن کیمپ کے پھیلنے پر ہی ہوتا تھا۔

ضعیف مزدور بیریزوفسکی نے جو تیسری دہائی میں ٹریڈ یونین کا لیڈر تھا اور جس نے ۱۹۳۸ء سے دس تھکا دینے والے برسوں کی جلاوطنی بھگتی تھی لیکن پھر ۱۹۴۹ء میں اُسے دس سال کیمپوں میں رہنے کی سزا دی گئی تھی، میرے سامنے آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنے کیمپ کے راشن کو بوسہ دیا اور مسرور ہو کر کہا کہ کیمپ میں وہ نہیں مرے گا کیونکہ یہاں اُسے خوراک ملنے کا حق حاصل ہے۔ جلاوطن کی حیثیت سے آپ جیب میں پیسے بھر کر بھی کسی دکان پر جائیں اور سیلف پر روٹی دیکھیں تو وہ بھی ڈھٹائی کے ساتھ آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہیں گے "روٹی نہیں ہے" اور کسی مقامی آدمی کے ہاتھ فروخت کر دیں گے جب کہ آپ منہ

تاکتے رہ جائیں گے۔ یہی حال ایندھن کا ہے۔

پئیر سبرگ کے بوڑھے مزدور ٹیسو لکو نے بھی (اور ان میں سے کسی کے بھی معاملے میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے) یہی جذبات ظاہر کیے۔ اُس نے (۱۹۵۱ء میں) کہا تھا کہ جلاوطنی کے بعد میں نے ایسا محسوس کیا جیسے کوئی ذی روح انسان پھر کسی سخت مشقت کے کیمپ میں ہے۔ وہ بارہ گھنٹے کام کرتا تھا اور واپس جھونپڑیوں میں چلا جاتا تھا جب کہ جلاوطنی میں آزاد آبادی کا کوئی بھی ایرا غیرا نتھو خیرا اُسے شام کو بھی اُس کے فرصت کے اوقات میں بغیر اُجرت ادا کیے کام کرنے کے لیے کہہ سکتا تھا (وہ کلرک تھا) یا اگر کسے اپنا ذاتی کام لینا ہو تو اُسے طلب کر سکتا تھا اور کوئی بھی جلاوطن حرفِ انکار لبوں تک لانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا کیونکہ اس طرح اُسے اگلے ہی دن برخاست کر دیے جانے کا خدشہ ہوتا تھا۔

"اُس سابق قیدی کے لیے زندگی پُرآسائش تھی جو جلاوطنی میں (پولس کا) "معتمد" بن جاتا تھا۔ میٹر ووچ کا صوبہ ژنجابول میں کوک ٹیریکا میں تبادلہ کر دیا گیا (وہاں نئی زندگی کا آغاز اس طرح ہوتا تھا: وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ خچروں کے ایک اصطبل میں مقیم تھا جس میں کوئی کھڑکی نہ تھی اور لید پڑی تھی۔ انہوں نے لید ایک دیوار کے کنارے لگا دی، اپنے سونے کے لیے ایک تختۂ خواب تیار کیا اور اُس پر چڑھ کر سو گئے) اُسے ضلع کے شعبۂ زراعت میں مویشیوں کے ماہر کا کام تفویض ہوا۔ اُس نے دیانتداری کے ساتھ فرائضِ منصبی انجام دینے کی کوشش کی اور ضلع پارٹی کے لیڈروں سے اُس کی ان بن ہو گئی۔ مقامی چھوٹے افسران کولخوز کے مویشیوں میں سے نئی بچے دینے والی گائیں لے لیا کرتے تھے اور اُن کی جگہ کم عمر بچھیا رکھ دیتے تھے۔ وہ میٹر ووچ سے توقع کرتے تھے کہ وہ دو سال کے مویشی کی عمر چار سال درج کر لے۔ جب اُسے احتیاط کے ساتھ جانوروں کو شمار کرنا شروع کیا تو دیکھا کہ پورے پورے ریوڑ ایسے تھے جو کولخوز کے نہیں تھے لیکن وہیں سے دانہ چارہ کھاتے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ ضلع پارٹی کمیٹی کے اوّل سکریٹری، ضلع سوویٹ کی مجلسِ منتظمہ کے صدر، مقامی ٹیکس دفتر کے سربراہ اور ملیشیا کے افسرِ اعلیٰ کی نجی املاک تھے (قازقستان میں اشتراکیت نے آرامدہ راستہ اختیار کیا تھا)۔ "انہیں فہرست میں مت درج کرو" اُنہوں نے اُسے حکم دیا لیکن اُس نے ان سب کا اندراج کر لیا۔ کسی جلاوطن اور سابق قیدی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو سوویٹ قانون کے تئیں اُس کا اصرار عجیب تھا اور اسی جوش میں اُس نے مجلسِ منتظمہ کے صدر کو ایک بھینے کی کھال کا بنا ہوا کپڑا غصب کر لینے پر مخالفت ظاہر کرنے کی جرأت کر ڈالی۔ اُسے برخاست کر دیا گیا ـــ اور یہ تو محض عداوتوں کا آغاز ہی تھا!

اس کے باوجود ضلعی مراکز جلاوطنوں کے لیے اتنے خراب مقامات نہیں ہیں۔ جلاوطنی کی اصل صعوبتیں وہاں شروع ہوتی ہیں جہاں آزاد بستی کا خاکہ تک نہیں ہے اور جو تہذیب کے دائرے سے خارج ہیں۔

لے۔ فشو لکو ہی ہمیں صوبۂ مغربی قازقستان میں جہانا ترتیس (حیاتِ نو) کی بات بتاتا ہے جہاں وہ ۱۹۴۷ء میں تھا۔ جلاوطنوں کی آمد سے قبل مشین اور ٹریکٹر اسٹیشن کے سیاسی شعبے نے مقامی لوگوں کو متنبہ کیا تھا اور انہیں سکھا پڑھا دیا تھا کہ ٹراٹسکی نواز اور انقلاب دشمن آنے والے ہیں۔ خوفزدہ مقامی افراد نووارد ین کو ایک چٹکی نمک تک دینے کے روادار نہ تھے کیونکہ انہیں خوف تھا کہ اس طرح انہیں عوام دشمنوں

کی مدد کے جرم میں پکڑ نہ لیا جائے۔ جنگ کے ایام میں جلاوطنوں کے پاس روٹی کے کارڈ نہیں تھے۔ ہمارے خبر رساں نے ایک کولخوز کے لوہار کے کارخانے میں آٹھ ماہ کام کیا تھا اور ایک پوڈ جئی کما لی تھی۔۔ جلاوطن اپنے معاوضے میں ملنے والے اناج کو تازق یادگار سے تیار کردہ چکی کے پاٹوں میں خود پیستے تھے۔ کچھ جلاوطن ایم۔ کے۔ دی۔ ڈی کے پاس گئے اور اُن سے کہا کہ یا تو ہمیں جیل بھیج دو ورنہ پھر ضلعی مرکز پر جانے کی اجازت دو (کوئی پوچھ سکتا ہے: "اور مقامی لوگوں کا کیا حال ہوتا ہے"؟ بھئی وہ اس کے عادی ہو چکے ہیں۔۔۔ اور اگر آپ کے پاس دو ایک بھیڑیں، بکری، گائے یا پُرٹ ہو، کچھ کرا کری ہو۔۔ تو اس سب سے مدد ملتی ہے)

کولخوز میں جلاوطنوں کی حالت ہمیشہ خستہ رہتی ہے نہ تو انہیں کپڑا دینے کا دستور ہے نہ کیمپ کا راشن ملتا ہے۔ کولخوز سے زیادہ خطرناک جلاوطنی کا کوئی مقام نہیں ہے۔ یہ ایک قسم کا علاقائی مقابلہ ہے: زندگی کہاں زیادہ سخت ہے کیمپ میں یا کولخوز میں؟

یہاں ہم کراسنو یارسک سفری جیل پر نئے جلاوطنوں کی ایک منڈی میں ہیں جن میں ایس۔ ایے۔ بینشٹنر بھی شامل ہے۔ خریدار نجار طلب کرتے ہیں اور جیل کے افسران جواب دیتے ہیں: ایک وکیل اور کیمسٹ (بینشٹنر) کو لے جاؤ ہم تمہارا مطلوبہ نجار بھی فراہم کریں گے۔ کچھ بوڑھی عورتیں وزن پورا کرنے کے لیے مزید جوڑ دی جاتی ہیں بعد ازاں اُن کو ہلکے پچیس ۲۵ ڈگری والے کہرے میں کھلی ہوئی لاریوں میں بیابان میں بہت دُور افتادہ ایک گاؤں میں منتقل کیا جاتا ہے جس میں تین درجن مکانات ہیں۔ وہاں کوئی وکیل کیا کرے گا اور کیمسٹ کا کیا مصرف ہے؟ اب کام چلانے کے لیے کچھ پیشگی ادا کی جا رہی ہے۔ ایک بوری آلو، کچھ پیاز، تھوڑا آٹا (بڑی سخاوت آمیز پیشگی ہے یہ!) پیسہ تمہیں آئندہ سال ملے گا اگر تم کما سکے۔ فی الحال تمہارا کام یہ ہے کہ برف کے ڈھیر کے نیچے سے ہینپ (بھنگ کا پودا) نکالو۔ شروع میں وہاں ایسے بورے بھی نہ تھے جن میں گھاس بھر کر بستر بنا لیا جائے۔ آپ کی پہلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کولخوز سے رہائی نصیب ہو! نہیں! ایسا نہیں کیا جا سکتا: کولخوز نے جیل کی انتظامیہ کو فی کس ۱۲۰ روبل ادا کیے ہیں (یہ ۱۹۵۲ء کی شرح ہے)

اگر آپ واپس کیمپ جا سکتے تو کتنا اچھا ہوتا!۔۔۔۔۔

لیکن اگر قاری یہ نتیجہ اخذ کرے کہ مشترکہ زراعت کے فارم کے بجائے سرکاری فارموں پر جلاوطن ہونا بہتر ہوتا ہے تو اُس کی غلطی ہوگی۔ سخوبوزم ضلع کے میینڈ یرلا قصبے کے سرکاری فارم کی بات لیجیے۔ یہ سچ ہے کہ وہاں جھونپڑوں کی قطاریں ہیں اور سرحدی باڑ نہیں ہے جس کی وجہ سے یہ کھلے جیل کیمپ کی طرح نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ سرکاری فارم ہے لیکن سکے وہاں معدوم ہیں اور رائج نہیں ہیں اس کے بدلے وہ بے معنی امداد لکھتے ہیں: نو روبل (استالن روبل) فی کس روزانہ۔ وہ یہ بھی درج کرتے ہیں کہ کس شخص نے کتنا دلیہ کھایا ہے اور کتنی رقم اُن کی مرزئی اور سر پر موجود چھت کے لیے وضع کرنی ہے۔ کٹوتی پہ کٹوتی کی جاتی ہے اور آخر کار ۔۔ حیرت ۔۔ جب آخری حساب لگایا جاتا ہے تو جلاوطن کے حصے میں کوئی اُجرت نہیں آتی بلکہ اس کے برخلاف وہ سرکاری فارم کا قرضدار پایا جاتا ہے۔ اے۔ استوٹک لکھتا ہے کہ اس فارم پہ بدحواس ہو کر دو افراد نے اپنی گردنوں میں پھانسی کے پھندے لگا لیے۔

(بذاتِ خود استوٹک نے جو طبعاً خواب دیکھنے والا تھا اشپلاگ میں انگلش سیکھنے کی اپنی ناکام

کوشش سے کچھ حاصل نہ کیا تھا۔[۳] جب اُس نے اپنی جلا وطنی کے مقام پر اچھی طرح نگاہ کی تو سوچا کہ وہ سوویٹ یونین کے ایک شہری کے آئینی حقوق کا استعمال کر کے.... تعلیم حاصل کرے گا چنانچہ اس نے کراسنویارسک جانے اور مطالعہ کرنے کے لیے رخصت کی درخواست گزاری اس گستاخانہ درخواست پر (جیسی کہ جلا وطنوں کی سرزمین پر پہلے کبھی نہیں دی گئی تھی) سرکاری فارم کے مینیجر نے (جو قبل ازیں ریکوم کا سکریٹری رہ چکا تھا) تردیدی فیصلے کے ساتھ ایک نوٹ بھی جڑ دیا: "مستقبل کے لیے سخت ممانعت۔ کبھی بھی اسٹونک کو مطالعہ کرنے کی رعایت نہ دی جائے"! اس کے باوجود اُسے ایک موقع مل گیا۔ کراسنویارسک کا سفری مرکز مختلف اضلاع سے جلا وطنوں میں سے نجار بھرتی کر رہا تھا۔ ہر چند کہ اسٹونک نجار نہیں تھا لیکن اس نے اس خدمت کے لیے خود کو پیش کیا، کراسنویارسک گیا جہاں وہ ایک ہوسٹل میں چوروں اور شرابیوں کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوا۔ اور طبی ادارے میں داخلے کے مقابلے میں کے امتحان میں بیٹھنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ یہ امتحان اُس نے اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ وہ کریڈنشل کمیشن تک پہنچ گیا، تاحال اُس کے کاغذات پر کسی نے عمیق نگاہ نہیں ڈالی تھی: "میں مورچے پر لڑ چکا ہوں"، اس نے انہیں بتایا" پھر واپس آیا اور... " اُس کا حلق خشک ہو گیا" اور کیا...؟" اسٹونک نے کہا" اور پھر مجھے جیل میں بھیج دیا گیا" کمیشن کے لوگ سنجیدہ ہو گئے" لیکن میں نے اپنی سزا مکمل کر لی ہے۔ اب میں آزاد ہوں! میں نے اچھے نمبر حاصل کیے ہیں"۔ اسٹونک کہتا رہا۔ منفول۔ اور یہ بیریا کے زوال کا سال تھا!)

فارم جتنی دُوری پر ہو، حالات اُسی نسبت سے خراب تر ہوتے تھے مقام جتنا بیابانی ہو جلا وطن کو اُتنے ہی کم اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ اے۔ ایف۔ میکیئیف نے کینگر سے متعلق اپنی یادداشتوں میں، جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے، اس داستان کا ذکر کیا ہے جو "ترگیٹی کے غلام" الیگزینڈر ولادیمیرووچ پولیاکوف نے سنائی تھی۔ یہ کیمپوں میں اُس کے دو قیاموں کی درمیانی مُدت میں ترگیٹی بیابان میں واقع ایک دُور افتادہ گھاس کے میدان میں جلا وطنی کی داستان ہے۔ وہاں کا واحد افسر کولخوز کا صدر، ایک قازق تھا۔ ایم۔ وی۔ ڈی بھی نگرانی کے لیے کبھی دورہ نہیں کرتی تھی۔ پولیاکوف کی اقامت گاہ وہ سائبان تھا جس میں بھیڑیں رہتی تھیں وہ بھوسے کی ایک توشک پر مقیم تھا۔ اُس کے فرائض۔ صدر کی چار بیویوں کی غلامی کرنا، اُن میں سے ہر ایک کو اس کے کام میں معاونت بہم پہنچانا، اور بعد ازاں اُن کے پاٹ بھی صاف کرنا۔ پولیاکوف اس زیادتی کو روک سکتا تھا؟ چراگاہ چھوڑ کر شکایت کرنے چلا جاتا؟ اس حقیقت کے علاوہ بھی کہ اس کے پاس گھوڑا نہیں تھا، اس کا مطلب ہوتا فرار کی کوشش اور بیس سال کا کٹور گا! وہاں ایک بھی روسی نہیں تھا۔ مہینوں کے بعد ایک روسی جو ٹیکس آفیسر تھا، وہاں آیا۔ پولیاکوف کی روداد سُن کر وہ متحیر رہ گیا اور اُس نے ضلعی مرکز کو تحریری شکایت روانہ کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ اس شکایت سے، جسے سوویٹ حکومت کے خلاف مذمتی مراسلہ تصور کیا گیا، پولیاکوف کو ایک مرتبہ پھر کیمپ کی سزا دی گئی اور وہ چھُٹی دہائی میں بخوشی کینگر میں اپنی عمر بسر کر رہا تھا۔ اس کے لیے وہاں کا قیام نسبتاً ایسا تھا جیسے اُسے رہا کر دیا گیا ہو۔

اور یہ بات یقینی نہیں ہے کہ "ترگیٹی کا غلام" تمام جلا وطنوں میں سب سے زیادہ بدبخت انسان رہا ہو تاہم یہ بات بے دھڑک انداز میں کہہ سکتے ہیں کہ کیمپ میں قید رہنے کے مقابلے میں جلا وطنی اس لحاظ سے

بہتر ہے کہ اس میں زندگی کو استحکام نصیب ہوتا ہے۔ یہ ایسی جگہ ہے جہاں آپ رہتے ہیں اور قیام رکھیں گے اور آپ کو کسی دوسری جگہ بھیجے جانے کا خدشہ نہیں رہتا۔ بھیجا جائے یا نہ بھیجا جائے لیکن آپ کو کسی مقام پر منتقل کرنے کا غیر تشریح طلب اور ناقابل تنسیخ پولیس کا حکم یا کسی مرکز کے غیر متوقع طور پر بند کر دیے جانے کا فرمان، یا کسی پورے ضلع کا جلاوطنوں کے لیے ممنوع قرار دے دینا ایسے خطرات ہیں جو ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔ ہمارے اطلاع دہندگان متعدد مقامات کے بے شمار برسوں پر مشتمل ایسے واقعات بیان کرتے ہیں۔ بطور خاص ایام جنگ میں، جب شعوری بیداری کا نعرہ عام تھا۔ تاشپاک ضلع کے جلاوطن بارہ گھنٹوں کے اندر تیار ہو جائیں۔ اور وزیمینسک چلے جائیں۔ آپ کے شکستہ مکانات، اس کی گرہستی اتنی قابل رحم ہونے کے باوجود آپ کے لیے بیش قیمتی ٹپکتی ہوئی چھت جس کی آپ نے حال ہی میں مرمت کی ہے۔ یہ سب چھوڑ دیجیے۔ اس کو فراموش کر دیجیے۔ کوئک مارچ۔ تنومند بھکاریو! اگر تم زندہ رہ گئے تو یہ سب چیزیں پھر اکٹھا کر لو گے!

اگرچہ زندگی اتنی آزاد اور آسان نظر آتی تھی (وہ کالم بنا کر مارچ نہیں کرتے تھے بلکہ ہر آدمی اپنی راہ چلتا تھا، وہ کام پر جانے کے لیے قطاریں نہیں بناتے تھے۔ وہ سلام کرنے کے لیے اپنی ٹوپیاں نہیں اتارتے تھے؛ انہیں راتوں میں مقفل نہیں کیا جاتا تھا) لیکن اس کے باوجود جلاوطنوں کے لیے ایک علیحدہ دستورالعمل تھا یہ قوانین کچھ مقامات پر دوسری جگہوں سے سخت تر ہوتے تھے لیکن یہ ۱۹۵۳ء سے قبل تک، جب عام پیمانے پر نرمی برتی جانے لگی، ہر جگہ اپنے وجود کا احساس دلاتے تھے۔

مثال کے طور پر بہت سے مقامات پر جلاوطنوں کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ شہری معاملات کے بارے میں مقامی سرکاری اداروں کو شکایات بھیج سکیں؛ یہ شکایتیں انہیں ایم۔ وی۔ ڈی کی کمانڈ چوکی کے توسط سے بھیجنی ہوں گی اور ایم۔ وی۔ ڈی ہی یہ طے کرتی تھی کہ شکایات کو آگے بڑھایا جائے یا وہیں دبا دیا جائے۔

جب ایم۔ وی۔ ڈی کا کوئی افسر کسی جلاوطن کو مخاطب کرتا تھا تو اُسے اپنا کام نامکمل چھوڑ کر بھاگنا پڑتا تھا اور حاضری دینی ہوتی تھی اگر آپ دنیا کے طور طریقے جانتے ہیں تو آپ سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کوئی بھی جلاوطن کسی چوکی افسر کی ذاتی (بلیک میل کرنے یا بالجبر استحصال کرنے والی) خواہش کو پورا کرنے سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

ایم۔ وی۔ ڈی کی کمانڈ چوکیوں کے افسروں کے عہدے اور اختیارات کیمپ کے افسروں سے کم نہ تھے سچ پوچھیے تو انہیں فکریں کم تھیں، کوئی محفوظ علاقہ نہیں، پہریداروں کی حاضری کا جھنجھٹ نہیں، مفروروں کا تعاقب کرنے کی ضرورت نہیں، قیدیوں کو پہرے میں کام پر پہنچانے کی ذمہ داری نہیں۔ لوگوں کے ایک ہجوم کو کھلانے اور پہنانے کا کوئی کام نہیں۔ اُن کے لیے اتنا کافی تھا کہ ہر ماہ دوبار نام کے سامنے نشان لگا دیا کریں اور وقتاً فوقتاً اُن کے خلاف کیس چلا دیا کریں جنہوں نے کسی قانون کی خلاف ورزی کی ہو جیسا کہ قانون متقاضی تھا۔ وہ اپنی مرضی کے مالک تھے، مست الوجود تھے، عیاش تھے (ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ کی تنخواہ دو ہزار روبل ماہانہ تھی) اور اسی کے مطابق بے فکر لوگ تھے۔

سوویٹ جلاوطنی کے مراکز سے بھاگ جانا جو اصلاً فرار ہونا کہلاتا ہے تقریباً عنقا تھا۔ کامیاب مفرور کو شہری آزادی کے اعتبار سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوتا تھا۔ مقامی آزاد عوام کو جو اس کے چاروں طرف

رہتے تھے۔ بالآخر وہی اختیارات تو حاصل ہوتے تھے جو اُسے خود حاصل تھے۔ یہ عہدِ زار نہیں تھا، جب جلاوطن فرار ہو کر غیر ممالک کو ہجرت کر جاتے تھے۔ علاوہ ازیں فرار ہونے کے جرم میں ملنے والی سزا بھی کوئی آسان بات نہیں تھی۔ مفرورین کے معاملات ایک اسپیشل بورڈ فیصل کرتا تھا۔ ۱۹۳۷ء سے قبل شدید ترین سزا پانچ سال کے لیے کیمپ کی قید اور ۱۹۳۷ء سے دس سال قید کی سزا دی جاتی تھی لیکن جنگ کے بعد ایک نیا قانون، غیر شائع شدہ لیکن سب پر روشن، ہمیشہ نافذ کیا جاتا تھا: کسی جلاوطنی کے مقام سے بھاگ جانے کی غیر معمولی خوناک اشام سزا دس سال کے لیے کٹور گا تھی!

ایم۔ وی۔ ڈی کی مقامی چوکیاں اس سلسلے میں اپنی اپنی تفسیر کرتی تھیں کہ کوئی عمل فرار کی کوشش ہے یا نہیں۔ اپنے اپنے لیے علیحدہ علیحدہ ممنوعہ خطوط کھینچ لیے گئے تھے جن سے جلاوطن کو تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ وہ طے کرتے تھے کہ ایندھن اکٹھا کرنے یا بیر چننے کے لیے جلاوطن جا سکتے ہیں یا نہیں؛ مثال کے طور پر اور ڈزونکلڈزنسکی کان کی بستی ٹکسیا میں یہ قاعدہ تھا کہ "پہاڑی علاقے کی طرف" اوپر جانا صرف ڈسپلن کے خلاف تھا جس کی سزا پانچ سال کیمپ کی قید تھی اور "پہاڑی علاقے سے نیچے کی طرف جانا (ریلوے لائن کی سمت) فرار کے مترادف تھا اور اس کی سزا بیس سال کا کٹور گا تھی۔ یہ ناقابل معافی نرمی بستی پر اتنی حاوی رہتی تھی کہ جب آرمینیا کے جلاوطن لوگوں کی ایک ٹولی کان کی انتظامیہ کی تانا شاہی سے پریشان ہو کر ضلعی مرکز پر شکایت کرنے گئی، قدرتی بات ہے کہ وہ لوگ اس کام کے لیے غیر حاضر رہنے کی اجازت ایم۔ وی۔ ڈی کی چوکی سے لے کر نہیں گئے تھے، تو انہیں فرار کی کوشش کے جرم میں صرف چھ سال کی سزا دی گئی۔

جنہیں فرار کی کوشش والے خانے میں رکھا جاتا تھا وہ بیشتر اسی قسم کی غلط انداز میں دیکھی جانے والی غیر حاضریاں ہوتی تھیں۔ یہ اور بوڑھے لوگوں کی بہت سی نئے انداز کی غلطیاں، جو ہمارے بربری نظام کے رموز سے ناآشنا تھے اور اپنے آپ کو اس کے مطابق نہیں ڈھال سکتے تھے۔

ایک یونانی عورت، جس کی عمر اسّی سال سے تجاوز کر چکی تھی، جنگ کے آخری ایام میں سیفروپول سے جلاوطن کر کے یورال پہاڑوں پر بھیج دی گئی۔ جب جنگ کا اختتام ہوا تو اس کا لڑکا سیفروپول واپس آیا اور وہ غالباً خاموشی کے ساتھ اُس کے ہمراہ رہنے کے لیے چلی گئی۔ ۱۹۴۹ء میں جب وہ ستاسی برس (!) کی ہو چکی تھی، اُسے گرفتار کر لیا گیا اور بیس سال کی سزائے بامشقت سنادی گئی (۲۰ + ۸۷ = ۹) اور اوزرلاگ بھیج دیا گیا۔ ایک دوسری ضعیفہ، وہ بھی یونانی تھی، ڈرزا بنزل صوبے میں مشہور تھی۔ جب یونانیوں کو خوبان سے باہر بھیجا گیا تو وہ اور اس کی جوان لڑکیاں پکڑی گئیں اور اُس کی تیسری لڑکی، جس نے ایک روسی سے شادی کر لی تھی، پیچھے رہ گئی۔ بڑھیا نے کچھ مدت گزاری پھر کچھ اور مدت جلاوطنی میں گزاری اور پھر اُس نے مرنے کے لیے اپنی بچھڑی ہوئی لڑکی کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ فرار تھا جس کی سزا اُسے بیس سال سزائے بامشقت کی صورت میں دی گئی تھی۔ کوکتیسز یک میں ایک ماہر علم الابدان تھا جس کا نام الگزینڈر آئیوانووچ بوگوسلوفسکی تھا۔ اُسے ۱۹۵۵ء کی "ایڈ نیا ئرعام معافی" سے فائدہ ہوا تھا لیکن مکمل نہیں۔ جلاوطنی کی مدت کا نفاذ جاری رہا اگرچہ اُسے منسوخ ہو جانا چاہیے تھا۔ اُس نے اپیلیں اور درخواستیں بھیجنی شروع کیں لیکن یہ طویل کام تھا اور اسی اثنا میں اُس کی ماں جو پرم میں تھی، اُس نے چودہ سال سے، جب وہ جنگ پر تھا اور جب سے اسیرانِ جنگ کے کیمپ میں

چلا گیا تھا، اپنی ماں کے دیدار نہیں کیے تھے ادھر ماں بتدریج نابینا ہوتی جارہی تھی اور آنکھوں کی روشنی مکمل طور پر کھو دینے سے پہلے اُسے دیکھنے کی آرزو مند تھی۔ سخت مشقت کی سزا پانے کا خطرہ مول لے کر بوگولوفسکی نے اُسے ملنے کے لیے جانے اور ایک ہفتے میں لوٹ آنے کا تہیہ کیا۔ اُس نے اپنے لیے ایک سرکاری دورے کا بندوبست کیا۔ وہ جنگل کے علاقے میں چراگاہ کے لیے زمین دیکھنے جائے گا" اور نووسیبرسک کے لیے ایک ٹرین میں سوار ہو گیا۔ ضلع میں کسی کی بھی توجہ اُس کی غیر حاضری کی طرف مبذول نہیں ہوئی لیکن نووسیبرسک میں ایک چوکنے ٹیکسی ڈرائیور نے اُس کی رپورٹ خفیہ پولیس میں کر دی جس نے اُسے کاغذات دکھانے کو کہا اور چونکہ کاغذات اُس کے پاس نہیں تھے اس لیے اُس نے صاف صاف سچ سچ بات کہہ دی۔ اُسے کولپشیریک "ہماری مٹی کی دیواروں والی جیل میں واپس بھیج دیا گیا اور ابھی اُس کی تفتیش چل ہی رہی تھی کہ اچانک فیصلہ آ گیا کہ اُسے جلا وطن نہ تصور کیا جائے۔ رہا ہوتے ہی وہ اپنی ماں کے پاس پہنچا لیکن تب بہت دیر ہو چکی تھی!

سوویٹ جلا وطنی کے نظام کا ہم بالکل نامکمل خاکہ پیش کریں گے اگر یہ نہ بتائیں کہ جس جس جیل میں جلا وطن بھیجے جاتے تھے اس میں ایک شعبۂ کارروائی چوبیس۲۴ گھنٹے نگرانی رکھتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جلا وطنوں سے جواب طلب کرتا تھا، مخبر بھرتی کرتا تھا، مذمتی بیانات یکجا کرتا تھا اور ان سب کا استعمال لوگوں کو نئی سزائیں دینے میں کرتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ وقت کبھی دُور نہیں ہوتا تھا جب الگ الگ بکھرا ہوا جلا وطن اپنی سپاٹ اور بدمزہ زندگی کو چھوڑ کر کیمپوں کی چہل پہل اور ہجوم میں پہنچ جائے گا۔ ایک دوسری سزا کا اضافہ: دوبارہ تفتیش اور ایک نئی سزا۔ اکثر لوگوں کے لیے جلا وطنی کا اختتام یہیں پر ہوتا تھا۔

اگر پیوتر روکنسے ۱۹۲۲ میں رجعت پسندانہ بورژوا اسٹوانین فوج سے نہ فرار ہوتا اور آزاد سوویٹ یونین میں نہ آ گیا ہوتا، اگر اُسے ابھی لتھوانیا میں ہی مقیم اپنے اعزا کے ساتھ (جن کو کوئی نقصان نہیں پہنچا) خط و کتابت کرنے پر ۱۹۳۴ء میں قازقستان میں جلا وطن نہ کیا گیا ہوتا اور وہ پھر بھی ہمت نہ ہارتا اگر اُس نے جلا وطنی کے عالم میں آیا گز اڈپو پر انجن ڈرائیور کی حیثیت سے جان لیوا محنت نہ کی ہوتی اور استرخانی وقار کا حامل نہ ہوتا۔ ۳ر دسمبر ۱۹۳۷ء کو ڈپو پر یہ پوسٹر نہ چسپاں کیے جاتے: "کامریڈ وکنسے کو اپنا نمونہ قرار دو"! اور ۴ر دسمبر کو کامریڈ وکنسے "سزائیں اضافے کی وجہ سے" جیل نہ بھیج دیا گیا ہوتا جہاں سے وہ کبھی واپس نہ پلٹا!

کیمپوں کی مانند جلا وطنی میں بھی "اوپر والوں" کو یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ شعبۂ کارروائی خوابیدہ کبھی نہیں رہتا "نکل بیچ میں دوبارہ سزا دی جاتی رہتی تھی۔ دیگر مقامات کی طرح وہاں بھی پیچیدہ طریقے استعمال کیے جاتے تھے تاکہ قیدی اپنے حشر سے جلد آگاہ ہو جائے اور مکمل طور پر پسپائی قبول کرے (فشولکو کو یورالسک میں ۱۹۳۷ء میں ۴۲ دن کے لیے جیل میں رکھا گیا تھا اور اُس کے چھ دانت توڑ دیے گئے تھے) لیکن کچھ خصوصی ادوار بھی ہوتے تھے مثلاً ۱۹۴۸ء میں جب جلا وطنی کے سب مقامات پر باریک جال پھینکا جاتا تھا اور یا تو تمام جلا وطنوں کو کیمپوں میں پہنچانے کے لیے پکڑ لیا جاتا تھا جیسا کہ وورکُتا میں (وورکُتا صنعتی مرکز بنتا جا رہا ہے اور کامریڈ اسٹالن نے اس کی صفائی کرنے کا حکم دیا ہے) یا پھر کچھ دیگر مقامات میں تمام مرد جلا وطن گرفتار کر لیے جاتے تھے۔

لیکن اُن کے لیے بھی جو سزائیں اضافہ کرکے جیل پہنچائے گئے "جلا وطنی کا خاتمہ" ایک مبہم تصور تھا۔ اس طرح کر لیا پڑ جہاں کسی کیمپ سے "رہائی" کا مطلب یہی تھا کہ آپ کیمپ کے گارڈ ہاؤس کی نگرانی سے ہٹ کر

اسپیشل ایم۔ وی۔ ڈی کی چوکی کی نگرانی میں آجاتے ہیں، ٹھیک ٹھیک کہا جائے تو "جلاوطنی کا خاتمہ" نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں، کیونکہ اس علاقے سے نکلنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ جو لوگ کسی طرح نکل جاتے تھے اور اس تھوڑی سی مدت کے لیے خاص سرزمین میں پہنچ جاتے تھے جن کی اُن کو اجازت تھی، وہ اغلباً اپنی قسمت کو روتے رہتے تھے کیونکہ سرزمین خاص پر انہیں کیمپوں میں از سرِ نو قید رکھنے کی سزا دے دی جاتی تھی۔

جلاوطنی کا آسمان شعبۂ کارروائی کے بغیر ہی کافی دھندلا تھا لیکن اس کے سائے سے تو وہ درمیان میں بہت ہی سیاہ پڑ جاتا تھا۔ خفیہ پولس کی نگاہوں کے سامنے مخبروں کی مہربانی پر انحصار کرتے ہوئے اپنے بچوں کی خاطر روٹی کمانے کی جدوجہد کے درمیان لبِ گور پہنچانے والی مشقت کرتا ہوا۔ جلاوطن آدمی بہت الگ تھلگ زندگی، کسی خوفزدہ سنیاسی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ طول طویل دوستانہ گفتگوئیں، گزری ہوئی باتوں پر اپنے قصور تسلیم کرنا، جو جیلوں اور کیمپوں میں عام ہوتی ہیں، ان لوگوں میں کبھی نہیں ہوتی تھیں۔

اسی باعث جلاوطنی کے بارے میں اطلاعات فراہم کرنے میں دشواری ہے۔

سوویٹ جلاوطنی کے نظام نے فوٹو گرافوں کے سلسلے میں بھی تقریباً کچھ باقی نہیں رہنے دیا ہے۔ جو فوٹو لیے جاتے تھے وہ صرف کاغذات کے فوٹو ہوتے تھے۔ عملی شعبوں اور اسپیشل سکشنوں کے لیے۔ اگر جلاوطنی کا کوئی گروہ اپنا گروپ کھنچوا لیتا .... اس کا کیا مطلب ہو سکتا تھا؟ اس کا یقینی طور پر یہ مطلب ہوگا کہ حفاظتی عہدیداران کی جانب سے فوری مذمت کی جائے گی۔ اچھا، تو تم ہو ہماری مقامی زمین دوز سوویٹ دشمن تنظیم! وہ اس فوٹو کو تمام گروہ کی گرفتاری کے لیے استعمال کریں گے۔

ہمارے دَور کے جلاوطنی کے اُس قسم کے خوشباش فوٹو گروپ نہیں ہیں: آپ جانتے ہیں کس قسم کے! بائیں سے میرا اولیا نوف، دائیں طرف دوسرا کریز ژنوفسکی۔ تمام لوگ خوب تندرست اور عمدہ کپڑوں میں ملبوس محنت اور حالات کے اثر سے بے خبر، سب کے خط قرینے سے ترشے ہوئے، ہر کلاہ عمدہ فر کی۔

وہ، میرے بچّو! بڑے تاریک زمانے تھے .....

چوتھا باب

جلاوطن نسلیں

مورخین ہماری غلطیوں کو درست کر سکتے ہیں لیکن انیسویں صدی یا اٹھارویں یا سترھویں صدی کی ایسی کوئی مثال، عام آدمی کے حافظے پر نقش نہیں ہے جس میں پوری کی پوری نسل کو بالجبر دوسری جگہ لے جا کر آباد کیا گیا ہو۔ نوآبادیاں فتح کی گئی ہیں، مغربی سمندر کے جزیروں میں، افریقہ میں، ایشیا میں، کاکیشش میں، فاتحین نے مقامی آبادی پر اپنا اقتدار جما لیا، لیکن کسی بھی طرح نوآبادی قائم کرنے والوں کے نیم پختہ ذہنوں میں یہ خیال نہیں آیا کہ اس ملک کے باشندوں کا ان زمین سے تعلق منقطع کر دیا جائے جو عہد قدیم سے ان کے آباؤ اجداد کی مادر وطن ہے۔ صرف امریکہ کے کھیتوں کے لیے نیگرو لوگوں کی درآمد میں شاید اس کی تھوڑی سی جھلک نظر آتی ہے لیکن یہاں کوئی ترقی یافتہ سرکاری پالیسی کام نہیں کر رہی تھی صرف فرداً فرداً کم عیسائی بردہ فروش مصروف عمل تھے۔ جن کے دلوں میں بڑے بھاری منافع کی لالچ کی آگ دہک رہی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ نیگرو لوگوں کو گھیر کر پکڑنے، اچھالنے، فروخت کے لیے کہیں ایک غلام اور کہیں درجنوں کے لیے اتنی تیزی سے جھپٹ پڑے تھے۔

صرف بیسویں صدی کی آمد پر جس کے ساتھ تمام متمدن اقوام نے اپنی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں صرف اس دور میں جب ایک نادر بچے اصول کی بدولت قومی سوال اپنے ارتقا کے بام عروج پر پہنچ گیا تھا اس سوال پر اقتدار اعلیٰ ۴۸ گھنٹوں کے اندر، ۲۴ گھنٹوں کے اندر ڈیڑھ گھنٹے کے اندر بھی جلاوطن کر دینے والی نسلوں کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے کا اختیار کل حاصل کر چکا۔

یقیناً اس عظیم ترین پر بھی یہ حل دفعتاً منکشف نہیں ہو گیا ایک مرتبہ اس نے بے احتیاطی میں یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ سوویٹ یونین میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی اور نہ کبھی ملے گی جس میں کوئی فرد اپنے نسلی امتیاز کی بنا پر صعوبت کا شکار ہو سکے۔ تیسری دہائی میں ان تمام اقلیتوں کی زبانوں کو فروغ دیا جاتا تھا، کریمیا میں ہمیشہ یہ کہا جاتا تھا کہ یہ تاتار ہے، تاتارستان اور تاتار کے سوا اور کچھ نہیں ہے؛ اس کے نزدیک تبھی تک عربی سے اور تمام علامات یہ تاتاری تھیں۔

بعد ازاں پتہ چلا تھا...... سب ایک غلطی تھی۔

جب اس عظیم کمانڈر نے جلاوطن کسانوں کو دبانے کی خواہش پوری کر لی تب بھی وہ ذرا یہ محسوس نہ کر سکا کہ یہ طریقہ کتنی سہولت کے ساتھ اقوام یا نسلوں پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔ اس کے صاحب اقتدار بھائی ہٹلر کا یہودیوں اور خانہ بدوشوں کی غارتگری کا تجربہ بعد میں ہوا۔ جبکہ دوسری عالمگیر جنگ پہلے ہی چھڑ چکی تھی، لیکن بابا اسٹالن نے اس سوال کا پہلے ہی خود کر لیا تھا۔

کسانوں کے طاعون کے بعد اور نسلوں کی جلاوطنی سے قبل، جلاوطنی کے مقامات کا موازنہ کیمپوں سے نہیں

کیا جاسکتا تھا اگرچہ اس نے لاکھوں کو یہاں سے وہاں پہنچا دیا لیکن یہ اتنا شاندار اور کثیر تعداد میں لوگوں سے متعلق کام نہیں تھا کہ تاریخ کی شاہراہ اس کے درمیان سے گزرتی۔ کچھ جلاوطن نوآباد ہونے والے تھے (جنھیں عدالتوں نے سزائیں دی تھیں) اور کچھ انتظامی جلاوطن تھے (جن پر مقدمات نہیں چلائے گئے تھے) لیکن ان دونوں صفوں میں ایسے افراد تھے جن کے ناموں کا اندراج علیحدہ علیحدہ کیا گیا تھا۔ ہر فرد کا اپنا نام، سنہ پیدائش، الزامات کی دفعات چہرے کی سامنے اور پہلو سے لی ہوئی تصویریں وغیرہ ریکارڈ میں تھیں اور صرف آرگن (شعبۂ تحفظ) ہی جو حیرت انگیز تحمل کا مالک تھا اور ہمہ وقت کام کے لیے مستعد رہتا تھا۔ ریت کے ان ریزوں سے رشتہ بن سکتا تھا۔ اتنے بہت سے کنبوں کے ملبے سے اپنے ہر ضلع میں ایک مستحکم بستی بنا سکتا تھا۔

جلاوطنی کے کام میں اس وقت بے تحاشا اضافہ ہوا، جب انھیں پہلے خصوصی نوآبادوں کو جلاوطنی میں ہانک دینے سے فرصت نصیب ہوئی۔ اولیں دو الفاظ (جلاوطن نوآباد اور انتظامی جلاوطن) زار کے عہد سے مروّج تھے لیکن اسپیٹس پریسیلینٹس (خصوصی نوآباد) بالکل سوویٹ کا ایجاد کردہ ہمارا اپنا لفظ تھا۔ اسپیٹس یعنی مخصوص سے شعبۂ خصوصی کام، خصوصی نظام مراسلت، خصوصی راشن، خصوصی صحت گاہ) عظیم توڑ کے دور میں انھوں نے قلاق صفائی کا شکار ہونے والوں کو ’خصوصی نوآباد‘ کا لقب عطا کیا اور اس طرح بہت لچک اور استعداد پیدا ہو گئی اور حیثیت مستحکم ہو گئی۔ اس طرح اپیل کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی کیوں کہ صرف قلاقوں کی ہی صفائی نہیں کی گئی تھی۔ انھیں خصوصی نوآباد لوگ کہہ کر پکارو اور کوئی بھی اس کی تعریف کی گرفت سے نکل کر آزاد نہ رہ سکے گا۔

بعد ازاں عظیم بابا نے فرمان جاری کیا کہ اس لفظ کا اطلاق فرقوں اور نسلوں پر بھی کیا جائے۔

وہ عظیم ترین بھی اپنی ایجاد کی اہمیت سے رفتہ رفتہ روشناس ہو گیا۔ اس کا پہلا تجربہ بے حد احتیاط کے ساتھ کیا گیا تھا، ۱۹۳۷ء میں ہزارہا مشتبہ کوریا والوں کو — ان کے دل میں خالخن گول تھا، جاپانی شہنشاہیت پسندوں سے وہ نبرد آزما تھے — ایسے آڑے ترچھے دشمنوں اور عقیدت پسندوں پر کیا اعتماد کیا جاسکتا تھا — ! مفلوج بوڑھوں سے لے کر شیرخوار بچوں تک، کچھ بھکاریوں جیسے سامان کے ساتھ انھیں تیزی اور خاموشی کے ساتھ دور افتادہ مشرق سے قازقستان منتقل کر دیا گیا۔ اتنی سرعت کے ساتھ کہ انھیں اپنی اولین سردیاں خام اینٹوں کے بنے ہوئے کھڑکیوں سے عاری (اتنا بہت سارا کانچ کہاں سے آتا!) مکانات میں بسر کیں اور ایسی خاموشی کے ساتھ کہ ہمسایہ قازقوں کے علاوہ کسی کو ان کی نوآبادکاری کی بھنک تک نہ مل سکی۔ کسی بھی اہم شخصیت نے اس بارے میں ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا۔ کسی غیر ملکی اخبار نویس نے چوں تک نہیں کی: (اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ تمام اخبارات کا نظام کس لیے پرعمل تاریوں کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے!)

اسے یہ کام مرغوب ہوا اور اس نے اسے یاد رکھا۔ ۱۹۴۰ء میں انقلاب کے گہوارے لینن گراڈ کے بیرونی حصوں پر یہی طریقہ اپنایا گیا لیکن اس بار جلاوطنوں کو رات کے وقت سنگین کی نوک پر نہیں لے گئے۔ اس کے بجائے اسے (نئی مفتوحہ) کریلو فینیش جمہوریہ کو ”فتح آثار رخصت“ کا نام دیا گیا۔ بھری دوپہر میں سرخ پرچم لہرا رہے تھے اور بینڈ کے دھن بج رہے تھے اور لینن گراڈ کے فن لینڈ اور اسٹونیا کے باشندے اپنی نئی سرزمین پر آباد ہونے کے لیے روانہ کر دیے گئے۔ جب وہ ادب کے ساتھ کچھ دور منتقل کیے جاچکے (ریل سے۔ اہم نہیں) بتلانا ہے کہ تقریباً چھ سو افراد

پر مشتمل ایک جتھے کا کیا حشر ہوا) تو ان سب سے ان کے پاسپورٹ حاصل کر لیے گئے، ان پر پہریدار تعینات کر دیے گیے اور انھیں آگے بڑھایا گیا۔ پہلے سرخ جیل گاڑیوں میں اور پھر کشتیوں کے ذریعہ۔ ان کی منزل کریلیا کے اندرونی حصے میں تھی اور اس کے بندرگاہ پر انھیں چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں منقسم کر دیا گیا اور اجتماعی کھیتوں کی قوت میں اضافہ کرنے کے لیے بھیج دیا گیا اور یہ بہر لحاظ آزاد شہری جنھیں ابھی "فتح آثار رخصت" ملی تھی جھک گئے ان میں سے صرف چھبیس افراد نے جن میں ہمارا داستان گو بھی تھا، جانے سے انکار کر دیا۔ مزید برآں وہ اپنے پاسپورٹ واپس کرنے پر رضامند نہ ہوئے۔ سوویٹ طاقت کا ایک نمائندہ اس موقعہ پر کریلو۔ فنش جمہوریہ کے عوامی کمیسار بورڈ کی صورت میں وہاں پہنچ گیا اور اس نے وہاں پہنچ گیا اور اس نے وہاں وارننگ دی" تمھیں پریشانی میں مبتلا ہونے پڑے گا۔" کیا تم ہم پر مشین گنیں استعمال کروگے؟" انھوں نے جواباً چیخ کر کہا" گدھو! بہت سی مشین گنیں کیوں؟ وہ وہاں پہریداروں کے حصار میں یکجا تھے ایک ہی مشین گن ان کے لیے کافی تھی (اور کوئی بھی فن لینڈ کے ان ۲۶ افراد کے لیے نکلیں نہ کہنا۔) "لیکن ایک عجیب ذہنی کمزوری، تساہل یا ذمہ داری قبول کرنے سے گریز کے باعث یہ دانشمندانہ اقدام نہیں کیا گیا اور انھیں علیحدہ علیحدہ کرنے کی غرض سے کہا گیا کہ وہ افسر تحفظ کے سامنے ایک ایک کرکے حاضر ہوں لیکن تمام ۲۶ افراد ایک ساتھ پیش ہوئے اور ان کی احمقانہ ضد اور حوصلے کی فتح ہوئی! انھیں اپنے پاسپورٹ رکھنے کی اجازت دی گئی اور محاصرہ ہٹا لیا گیا۔ اس طرح انھوں نے اجتماعی کاشت کرنے والوں یا جلاوطنوں تک کرنے کے خلاف مدافعت کی لیکن ان کا معاملہ ایک استثنائی صورت تھی۔ زیادہ تر لوگوں نے اپنی پاسپورٹ دے دیے۔

یہ صرف تجرباتی اقدامات تھے۔ جولائی ۱۹۴۱ء میں جا کر اس طریق عمل کو پوری طاقت کے ساتھ آزمانے کا وقت آیا۔ وولگا جرمنوں کی خود مختاری اور بلاشبہ غدار جمہوریہ (جس کے دو دارالسلطنت اینجلس اور مارکس اشاڈ تھے) کو ختم کرنا تھا اور اس کی آبادی چند ہی دنوں میں دور افتادہ مشرق کی طرف لے جا کر پھینک دی گئی۔ یہاں پہلی مرتبہ پوری کی پوری نسل کو جلاوطن کرنے کی آتش فشاں پالیسی اپنی اصل صورت میں نافذ کی گئی اور اگر ایک معیار ۔۔۔ قوم کے معیار ۔۔۔ پر پرکھیں تو یہ کتنی آسان اور کتنی کارگر ثابت ہوئی، اس میں تمام افراد کی تفتیش اور فرداً فرداً احکامات جاری کرنے کے بجائے پوری کی پوری قوم کو بیک وقت ایک ہی فرمان کے تحت نمٹا دیا گیا۔ جہاں تک روس کے دیگر حصوں میں گرفتار شدہ جرمنوں اور ایک ایک کو پکڑ لیا گیا تھا) کا تعلق ہے۔ مقامی ایم ۔ کے وی ۔ ڈی کے افسران کو یہ فیصلہ کرنے کے لیے کسی اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہیں تھی کہ کوئی شخص دشمن تھا یا نہیں اگر اس کا نام جرمن ہے تو اسے گرفتار کر لو۔

یہ پالیسی مسلمہ اور خامیوں سے مبرا ہو گئی تھی اور آئندہ کسی بھی قوم پر غدار کہہ کر انگلی اٹھا دی جائے تو اپنا خون آشام پنجہ اس پر گاڑ سکتی تھی اور ہر مرتبہ زیادہ چالاکی اور آخر ش تیزی کے ساتھ چیچین۔ انگش، کاراچائی، بلغار کالمیک، کرد، کریمیا کے تاتار کاکیشین یونانی۔ جس بات نے اس طریق کار کو زیادہ کارآمد بنایا وہ یہ تھی کہ بجائے عوام کا فیصلہ کسی مخصوص قوم کو لفظی الٹ پھیر کی کارروائیوں کے ذریعے باور کرانے کے بجائے فوجی کارروائی کے ذریعے بتایا جاتا تھا جو جدید موٹروں سے لیس بری فوج کے ذریعے کی جاتی تھی۔ مسلح ڈویژن معتوب قوم کی آبادی میں رات کو گھس جاتے تھے اور ناکوں پر تعینات ہو جاتے تھے۔ مجرم قوم بیدار ہوتی اور پوری آبادی کو مشین گنوں اور خودکار رائفلوں کے محاصرے میں پاتی اور انھیں بارہ گھنٹوں کی مہلت دی جاتی لیکن یہ موٹروں سے

نیس بری افواج کے لیے) دستوں کے پہیے گھومنے سے روکنے کے لیے کافی وقت ہے اور کریمیا میں بعض اوقات صرف دو یا ڈیڑھ گھنٹے کا وقت بھی دیا گیا جس میں آدمی جو کچھ ہاتھوں میں اٹھا کر لے جا سکتا ہے لے کر تیار ہو جائے۔ بعدازاں ہر ایک کو ایک لاری کے عقبی حصے میں پالتی مار کر قیدی کی طرح بٹھا دیا جاتا (بوڑھی عورتیں، بچوں والیاں، اور چھاتیوں سے لگے ہوئے ان کے شیرخوار بچے: سب کے سب بیٹھ جاؤ، تم نے حکم سن لیا ہے؟) اور لاریاں پہرے میں ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو جاتی ہیں۔ وہاں سے جیل گاڑیاں انھیں ایک نئے مقام تک پہنچاتی ہیں اور اس کے آگے بھی انھیں دونگ کے علاقوں کی مانند مزید سفر کرنا پڑ سکتا ہے (جیسے کریمیا کے تاتار دریائے اونزا کی چرمصلک طرف گئے تھے۔ ان کے لیے ان شمالی دلدلوں سے بہتر اور کون سی جگہ ہو سکتی تھی؟) کشتیاں کھینچتے ہوئے، جن پر سفید ریش بوڑھے ساکت بیٹھے ہیں، ۵۰ تا ۲۰۰ کلو میٹر بہاؤ کے خلاف (ٹرولو گریغو سے اوپر) گھنے جنگلوں میں!

ہوائی جہازوں یا پہاڑوں کی بلند چوٹیوں سے شاید یہ شاندار منظر رہا ہوگا۔ پورا کریمیا جزیرہ نما (جو اپریل ۱۹۴۴ء میں نیا نیا آزاد کرایا گیا تھا۔) انجنوں کی ہاہا ہی سے گونج رہا تھا اور موٹروں سے لیس سینکڑوں کالم آڑی ترچھی راہوں پر ان کے ہمراہ سانپ کی طرح رینگ رہے تھے۔ پودے ابھی پھولوں سے لدے تھے تاتار عورتیں ہاٹ ہاؤسوں سے نکل کر باغیچے کی کیاریوں میں لگانے کے لیے موسم بہار کی فصل کے لیے پیاز کے بکس اٹھا کر لا رہی تھیں۔ تمباکو کی نگہداشت ہو رہی تھی (اور یہ سب وہیں ختم ہو گیا۔ آئندہ کئی برسوں تک تمباکو کریمیا سے ناپید ہو گیا!) موٹروں سے لیس کالم پوری آبادی تک نہیں گئے بلکہ چوراہے پر ہی کھڑے رہے اور فوجیوں کے اسپیشل دستوں نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ انھیں حکم تھا کہ باشندوں کو تیاری کے لیے ڈیڑھ گھنٹے کی مہلت دی لیکن سیاسی افسروں نے کہیں کہیں ہمیں تخفیف کر کے چالیس منٹ کر دیے تاکہ کام ازجلد ازجلد نمٹ جائے اور جمع ہونے کے مقام پر بہ سرعت پہنچ جائیں تاکہ قیمتی اشیاء ٹاسک فورس کے دستوں کے گاؤں میں ہی پڑی رہ جائیں مدافعت میں ہر بستی۔ جیسے نیوکٹ۔ جھیل کے نزدیک اوزنباش والے اسے نذر آتش کر جاتے تھے۔ موٹروں سے لیس کالم تاتاروں کو اسٹیشن لے گئے اور وہاں وہ اپنی گاڑیوں میں کئی دن انتظار کرتے ہوئے چلتے رہے، گریہ و بکا کرتے رہتے اور پرسوز الوداعی نغمے گاتے رہتے۔

سلیقہ اور ہمواری پوری کی پوری نسل کو ایک ساتھ جلاوطن کرنے کا یہ فائدہ ہے کوئی اسپیشل کیس نہیں، کوئی استثنا نہیں کوئی انفرادی مخالفت نہیں! وہ سب خاموشی سے چلے جاتے ہیں کیوں کہ اس میں وہ سب ساتھ میں ہر عمر اور ہر جنس کے لوگ جاتے ہیں اور اس پر کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے جو ابھی بطن مادر میں ہیں وہ بھی جاتے ہیں اور اسی فرمان کے تحت وہ تولد ہونے سے پہلے ہی جلاوطن ہو جاتے ہیں۔ ہاں وہ بچے بھی ابھی ماں کے پیٹ ہی میں نہیں آئے جلاوطن ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا نصیب یہی ہے کہ اس فرمان کی اندھا دھند تعمیل کے نیچے بطن مادر میں آئیں اور اپنی تاریخ پیدائش ہی سے تعزیری قانون کی اس تھکا دینے والے دقیانوسی دفعہ ۲۵ کا ہدف بن جائیں خواہ یہ دفعہ کچھ کہتی ہو (سولہ برس سے کم عمر کے افراد کو جلاوطنی کی سزا نہیں دی جا سکتی) جب وہ اپنے سر پرستوں میں نکالیں گے اس وقت سے "خصوصی نوآباد" ہوں گے۔ مستقل جلاوطن ان کی بلوغت کے دن ان کی سولہویں سالگرہ کی ایک ہی خصوصیت ہوگی کہ اس دن وہ ایم۔ وی۔ ڈی کی چوکی پر باقاعدہ حاضری دینے کے لیے پہلی مرتبہ جائیں گے۔

جلاوطن اپنے پیچھے جو کچھ چھوڑ گئے" اپنے مکان، غیر منقول اثاثہ، سال گرم کپڑے لتے جو بے ترتیب پڑے ہوتے ہیں

وہ گھر جسے دس یا بیس پشتوں نے مل کر آراستہ کیا تھا۔ تعزیری شعبوں کے ایجنٹوں کو کسی لیت و لعل کے بغیر مل جاتا ہے کچھ حصّہ حکومت کو کچھ ہمسایوں کو نسبتاً خوش قسمت قوم سے متعلق ہیں۔ کوئی آدمی بھی کسی کھانے فرنیچر یا برتنوں کی گمشدگی کے سلسلے میں یہ شکایت لکھ کر پہنچانے والا نہیں ہے۔

ایک آخری چیز نے ہمواری کے اصول کو بے عیب بنا دیا ہے اسے تکمیل کی آخری منزل کی بلندی پر پہنچا دیا ہے خفیہ حکام نے ان بکاوہ اقوام کے لیے موجود کمیونسٹ پارٹی کے ممبران کو بھی نہیں بخشا۔ اس لیے پارٹی کے کارڈ کو جانچنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ایک اور آرام ملا۔ اس کے علاوہ کمیونسٹوں سے دوسرے کی بہ نسبت ان کے نئے جلاوطنی کے مقام پر دوگنا کام کرایا جا سکتا ہے اور اس طرح ہر شخص کی تشفی ہو جائے گی۔

یکسانیت کے اصول میں صرف ایک دراڑ تھی جو جلے جلے یا غیر اقوام میں شادیوں کی وجہ سے پڑ گئی تھی (ہماری اشتراکی حکومت بے وجہ تو ہمیشہ ان کی مخالفت نہیں کرتی رہی؛ جب جرمنوں کو اور بعد ازاں یونانیوں کو جلاوطنوں کیا گیا تو دوسری اقوام سے تعلق رکھنے والی ان کی بیویوں کو ساتھ نہیں بھیجا گیا لیکن اس سے بڑی گڑبڑ پیدا ہوئی اور جو مقامات جراثیم سے پاک تصور کیے جا رہے تھے۔ ان میں متعدی امراض کی علامات باقی رہ گئیں (ان بوڑھی یونانی خواتین کی مانند جو واپس اپنے بچوں کے پاس مرنے کے لیے آئی تھیں)

جلاوطن اقوام کو کہاں بھجوایا گیا؟ قازقستان بہت پسند کیا گیا اور وہاں عام جلاوطنوں کے ساتھ آمیز ہو کر وہ جمہوریہ کی نصف سے زائد آبادی پر مشتمل تھے جس کی وجہ سے اسے تو ـــــ زیکستان کا نام دیا جانا زیادہ بہتر تھا لیکن وسط ایشیا میں سائبیریا (جہاں بہت سے کالمائیک یینی سینی کے کنارے موت کے گھاٹ اتر گئے تھے) شمالی یورال اور سوویٹ یونین کے شمالی یورپی علاقوں کو بھی مناسب حصہ دیا گیا۔

ہم بالٹک ریاستوں کی جلاوطنی کو "اقوام کی جلاوطنی" کہیں یا نہ کہیں ان میں ظاہری مماثلت نظر نہیں آتی بالٹک والوں کو ایک ساتھ جلاوطن نہیں کیا گیا تھا۔ نسلی اعتبار سے وہ اپنے موروثی مکانات میں ہی مقیم نظر آتے تھے (ان سب کو وہاں سے ہٹا دینا کتنا اچھا ہوتا۔ لیکن وہ یورپ کے بے حد نزدیک تھے۔ لیکن ان کی تعداد کم کر دی گئی اور ان کے بہتر لوگوں کو ہٹا دیا گیا۔

صفائی کا کام جلد ہی شروع ہو گیا۔ ۱۹۴۰ء ہی میں جب ہماری افواج وہاں داخل ہوئیں اور جب ان بے حد مسرور لوگوں نے اتفاق رائے سے سوویٹ یونین میں شامل ہونے کے حق میں ووٹ دیا اس سے بھی پہلے صفائی چھانٹنے والے افسران کی آمد کے ساتھ شروع ہو گئی تھی۔ ہمیں یہ قیاس لگانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ ان نئی ریاستوں کے لیے ہم وطن افسران کی پہلی (اور آخری) نسل کا کیا مطلب ہوگا؟ وہ نہ تو بالٹک کے زاہدین تھے نہ کورمغز نکمے لوگ۔ بلکہ اس قوم کے سب سے سنجیدہ ذمہ دار ترین اور پرجوش عناصر تھے جب وہ طالب علم تھے اس وقت انھوں نے ناروے کی برفباری میں نوزائیدہ ملک کی اپنی تا حال طفلانہ نظر آنے والے چہروں کے ساتھ حفاظت کرنی سیکھ لی تھی اور اب یہ تمام قیمتی تجربات درانتی کے ایک ہاتھ سے کاٹ کر پھینک دیے گئے۔ یہ رائے عامہ کو ہموار کرنے کا بڑا اہم وسیلہ تھا۔ نسخہ یقیناً آزمودہ تھا۔ کیا یہی عمل ٹھیک سوویٹ یونین میں نہیں برتا گیا تھا؛ خاموشی اور سرعت کے ساتھ انھیں نیست و نابود کر دو جو مخالفت کی قیادت کر سکتے ہیں۔ اور انھیں ختم کر دو جو اپنے خیالات اپنی تحریروں اپنی کتابوں سے جذبۂ مخالفت کو ہوا دے سکتے ہیں ـــــ اور ایسا محسوس ہوگا کہ تمام قوم بھولا ہے

اور اپنے مقام پر ہے جبکہ قوم ہو گی ہی نہیں۔ سزا بھگتنے والا بہت سے کچھ مدت تک صحت مند دانتوں جیسا ہی نظر آتا ہے۔

لیکن بالٹک ریاستوں کے لیے ۱۹۴۰ء میں یہ جلاوطنی نہیں تھی بلکہ کیمپ تھے یا کچھ لوگوں کے لیے سنگین دیواروں والی جیل میں گولی مار دینے کی سزا تھی پھر ۱۹۴۱ء میں جب سوویٹ سپاہ پسپا ہوئی تو انھوں نے جتنے کھاتے پیتے با اثر اور اہم افراد تھے ان میں سے جتنے بھی ہاتھ آسکے گرفتار کر لیے گئے اور انھیں قیدیوں کے ریوڑ کی طرح ساتھ لے گئے اور مجمع الجزائر کی فتح شدہ زمین پر غلاظت کی طرح ڈال دیا (گرفتاریاں ہمیشہ رات میں کی جاتی تھیں۔ تمام خاندان کے لیے کل ملا کر سو کلو گرام سامان لے جانے کی اجازت تھی اور خاندان کے سربراہوں کو گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے قید اور نیست و نابود کرنے کے لیے الگ کر دیا گیا) اس کے بعد بالٹک ریاستوں کو (برلن گراڈ ریڈیو پر) تمام مدت جنگ میں سخت ترین سزا اور انتقام لینے کی دھمکی دی گئی۔ جب ۱۹۴۴ء میں وہ فاتح کی حیثیت سے پلٹے تو انھوں نے اپنی دھمکیوں کو عملی شکل دی اور لوگوں کو مویشی خانوں میں قید کر دیا لیکن یہ بھی مکمل نسل کی جلاوطنی نہیں تھی۔

جلاوطنی کی خاص وبا بالٹک ریاستوں پر ۱۹۴۸ء میں نازل ہوئی (سخت جان لتھوانیا والوں پر ۱۹۴۹ء میں تینوں ریاستوں میں) اور ۱۹۵۱ء میں (پھر لتھوانیا والوں پر) انھیں برسوں میں مغربی یوکرین کا بھی صفایا کیا جا رہا تھا اور وہاں بھی آخری بے دخلیاں ۱۹۵۱ء میں کی گئیں۔

کیا جنرلیسمو ۱۹۵۳ء میں کسی قوم کو جلاوطن کرنے کی تیاری کر رہا تھا؟ شاید یہودیوں کو؟ ان کے علاوہ اور کن لوگوں کو؟ شاید دائیں کنارے کے تمام یوکرین کو ہمیں کبھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ وہ عظیم منصوبہ کیا تھا۔ مثلاً مجھے شبہ ہے کہ اسٹالن پورے فن لینڈ کو جلاوطن کر کے چینی سرحد کے بیابان میں بھیج دینے کی بے پناہ تشنگی میں مبتلا تھا لیکن نہ تو ۱۹۴۸ء میں اور نہ ہی ۱۹۴۹ء میں لفنو کی تختہ پلٹنے کی سازش) تقدیر نے اس کا ساتھ دیا ورنہ وہ سرب کے لوگوں کے لیے مناسب مقام مثلاً یورال کے اس پار — یا پیلوپونیز کے یونانیوں کے لیے مناسب مقام ضرور تلاش کر لیتا۔ پیش قدمی کے اصول کا یہ چوتھا ستون اگر دس برس مزید ایستادہ رہتا تو ہم یوریشیا کے غیر نسلی نقشے کو پہچان بھی نہ سکتے اس لیے اقوام کی واپسی کی ہجرتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا۔

ہر جلاوطن قوم کے لیے کسی دن ایک عظیم رزمیہ لکھا جائے گا۔ اپنے آبائی وطن سے اس کا انقطاع اور سائبیریا میں اس کی تباہی کے لیے خود وہ اقوام ہی جن حالات سے گزری ہیں ان کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کر سکتی ہے ہمارے پاس ان کی جانب سے بولنے کے لیے مناسب الفاظ نہیں ہیں اور ہمیں ان کی راہ کا کانٹا نہیں بننا چاہیے۔

قارئین کو یہ سمجھانے میں مدد دینے کے لیے کہ یہ اب بھی انھیں جلاوطنوں کی سرزمین ہے جس پر وہ پہلے آئے تھے اس مجمع الجزائر سے متصل وہ مسموم مقام ہے آئیے بالٹک اقوام کی جلاوطنی کے بارے میں قدرے اور غور کریں۔

بالٹکوں کی جلاوطنی عوام کی ناقابل تسخیر منشا کے خلاف نہیں بلکہ خالصتاً اور صریحاً اس کی تکمیل کی خاطر عمل میں لائی گئی تھی۔ تینوں جمہوریتوں میں سے ہر ایک میں اس کی اپنی مجلس وزارت نے کہ جس نے یہ فیصلہ کیا تھا (اسٹونیا میں یہ فیصلہ ۲۵ نومبر ۱۹۴۸ء کو کیا گیا تھا) کہ ان کے ہم وطنوں کے کچھ مخصوص زمروں کو حسب قاعدہ اور ہمیشہ کے لیے سائبیریا میں جلاوطن کر دیا جائے مزید برآں یہ کہ ہمیشہ کے لیے تاکہ وہ پھر کبھی اپنے آبائی وطن کو نہ لوٹ سکیں (اس میں

ہمیں دونوں باتیں، بالکل یہ کہ ہمیشہ کے لیے تاکہ وہ پھر کبھی اپنے آبائی وطن کو نہ لوٹ سکیں اس میں ہمیں دونوں باتیں بالکل حکومت کی آزادی اور وہ جبلاہٹ جب تک ان کے نکمے اور بدطینت ہم وطنوں نے انھیں پہنچا دیا تھا واضح طور پر الگ نظر آتی ہیں) وہ فرقے یہ تھے (الف) ان افراد کے کنبے جو پہلے سزا کے مستحق سمجھے گئے تھے (یہ کافی نہ تھا کہ ان کے باپ کیمپ کی جیلوں میں مر رہے تھے، ان کے خاندان کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑنا ہوگا (ب) خوشحال کسان (اس طرح بالکل بیلسو میں اب اجتماعیت کی ناگزیر پالیسی پر جلد عملدرآمد ہو سکے گا) اور ان کے خاندانوں کے تمام افراد (ریگا میں زیر تعلیم طلبہ اور طالب علموں ان کے والدین اسی رات کو گرفتار کر لیے گئے (ج) جو کسی بھی اعتبار سے کچھ ممتاز نظر آتے تھے، از خود باشعور تھے لیکن پھر بھی کسی طرح ۱۹۴۱ء - ۱۹۴۰ء میں گرفت سے بچ نکلے تھے (د) جو کنبے حکومت کے مخالف تھے لیکن جلد ہی اسکینڈینیویا کو فرار نہ ہو سکے تھے یا مقامی باعمل کارکنوں کو شخصی طور پر ناپسند تھے۔

ہماری عظیم اشتراکی مادر وطن کے وقار کو مجروح ہونے سے محفوظ رکھنے کے لیے اور ہمارے مغربی دشمنوں کو خوش نہ کرنے کے لیے یہ احکامات اخباروں میں شائع نہیں کیے گئے، جمہوریوں میں نافذ نہیں کیے گئے خود جلاوطنوں کو کبھی بے دخلی کے وقت ظاہر نہیں کیا گیا بلکہ سائبیریا میں ایم سی۔ڈی کی چوکیوں پر پہنچنے کے بعد ہی بتایا گیا۔

کوریا کے باشندوں یا کریمیا کے تاتاروں کی بھی جلاوطنی کے بعد جو مدت گزری تھی ان میں ایسی کارروائیوں کا اطلاق اتفاقی یافتہ ہو گیا تھا، حاصل شدہ بیش قیمت تجربے کی روشنی اتنی دور دور تک پھیل گئی تھی اور ہر طرح عادی ہو گئی تھی کہ اب وہ دنوں میں یا گھنٹوں میں بھی نہیں، منٹوں میں شمار کرتے تھے۔ مشق سے معلوم ہوا کہ رات میں دروازے پر ہونے والی پہلی دستک اور اپنی دہلیز پر مالک مکان کے قدموں کی آخری چاپ کے درمیان تاریکی میں چل کر لاری تک پہنچنے کے لیے بیس یا تیس منٹ کی پہلی مہلت کافی تھی۔ ان تھوڑے منٹوں میں، بیدار ہونے والے خاندان کو کپڑے پہننے کے لیے، یہ خبر ذہن نشین کرنے کے لیے کہ انھیں عمر بھر کے لیے جلاوطن کیا جا رہا ہے۔ اس مفہوم کے ایک کاغذ پر دستخط کرنے کے لیے کہ وہ اپنی املاک کے تمام حقوق سے دستبردار ہو رہے ہیں، اپنی بوڑھی بیویوں اور بچوں کو جمع کرنے کے لیے، اپنی گٹھریاں سمیٹنے کے لیے اور حکم ملتے ہی گھروں سے روانہ ہو جانے کے لیے کافی مہلت مل جاتی تھی (پیچھے چھوڑی ہوئی املاک کا تصفیہ بڑے قاعدے سے کیا جاتا تھا۔ پہریدار فوجیوں کی روانگی کے بعد ٹیکس آفس کے کارکن ضبط شدہ اشیا کی ایک فہرست تیار کرتے تھے جو بعد ازاں حکومت کے مفاد میں کمیشن کی دکان پر فروخت ہوتی تھیں۔ اگر وہ کچھ اشیا اپنے کوٹوں میں چھپا لیتے تھے اور دیگر چیزیں صاف کر دیتے تھے" تو ہمیں ان کی مذمت کرنے کا کیا حق ہے!!

لیکن انہیں یہ سب کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ صرف یہ لازمی تھا کہ کمیشن کی دکانوں سے ایک ادائی رسید حاصل کر لیں اور عوامی طاقت کا کوئی بھی نمائندہ قانونی طور پر وہ چیز اپنے گھر لے جا سکتا ہے جو اس نے مفت میں خریدی تھی۔

کوئی بھی ان بیس یا تیس منٹوں میں صاف صاف کیسے سوچ سکتا ہے؟ وہ کس طرح یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ اپنے ہمراہ کن چیزوں کو لے جانا سب سے زیادہ مفید ہوگا؟ ایک لیفٹیننٹ نے جو ایک کنبے (پچھتر سالہ دادی، پچاس سالہ ماں، اٹھارہ سالہ بیٹی اور بیس سالہ بیٹا) کو بے دخل کر رہا تھا انھیں صلاح دی کہ "تم جو چاہو کرو لیکن اپنی سلائی کی مشین ساتھ رکھ لو!" بتائیے کسی نے کبھی یہ بات سوچی ہوگی! لیکن بعد میں اسی مشین کے سہارے خاندان کی شکم پری کا بندوبست ہوا جبکہ اس کے بغیر وہ بھوکے مر جاتے۔

لیکن بعض مرتبہ کارروائی کی سرعت رفتار شکار ہونے والوں کے لیے کارآمد بھی ثابت ہوتی تھی ایک گردباد آیا اور چلا گیا۔ خاصی احتیاط سے جھاڑ دینے کے بعد بھی دھبے رہ جاتے ہیں۔ اگر کوئی عورت کسی طرح تین دن تک ٹھہری رہی، راتیں گھر سے باہر گزارتی رہیں اور بعدازاں ٹیکس آفس پہنچ کر اس نے اپنے مکان کی سیل ہٹانے کے لیے کہا تو بعض اوقات وہ ہٹا دیتے تھے۔ ٹھیک ہے کم بخت! اور رہو وہاں اگلی بار تک!

مویشیوں کے چھوٹے چھوٹے ڈبوں میں جو آٹھ گھوڑے۔ بتیس فوجی یا چالیس قیدی لے جانے کے لیے بنائے گئے تھے وہ پچاس یا اس سے زائد لوگوں کے جلاوطن کو لے گئے وہ اتنی عجلت میں تھے کہ مویشیوں کے ڈبوں پر اپنا سامان نہیں چڑھا سکے اور فرش میں سوراخ کر لینے کی اجازت بھی انھیں جلد نہیں مل سکی۔ وہ پرانی بالٹی، جس میں جلاوطن حوائج ضروری سے فارغ ہوتے تھے جلد ہی لبریز ہو گئی اور اس کے بہنے اور چھلکنے سے غلاظت سامان تک آنے لگی پہلے ہی منٹ سے ان چوپایوں کے دودھ پلانے والے جانوروں کو یہ بھول جانے پر مجبور کیا گیا کہ مرد اور عورت مختلف جنسوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ڈیڑھ دن تک کھانے پانی کے بغیر بند رکھے گئے ایک بچہ مر گیا (لیکن یقیناً ہم نے سب کچھ قبل ازوقت پڑھا تھا پڑھا تھا! دو ابواب پہلے کی بات — کچھ بھی تو تبدیل نہیں ہوا ہے .....) وہ جلیبئے اسٹیشن پر بہت دیر تک ٹھہرے رہے، لوگ باہر ادھر ادھر دوڑتے رہے۔ ڈبے کے کناروں کو تھپتھپاتے رہے اعزا اور احباب کے نام لے کر پوچھتے رہے ان میں سے کسی کسی کو کھانے اور آرام کی اشیا دینے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ ان لوگوں کو دور بھگا دیا گیا اور ادھر ڈبے میں مقید وہ لوگ بھوکے پڑے رہے اور سائبیریا اپنے بے کروں والے مہمانوں کا انتظار کرتا رہا۔

افسران نے سفر میں روٹی تقسیم کرنا شروع کیا اور کچھ اسٹیشنوں پر شوربا بھی۔ تمام ٹرینوں کو طویل سفر طے کرنا تھا۔ نووسیبرسک اور کوٹسک کراسنویارسک صوبوں تک پہنچنا تھا۔ ۵۲ ڈبوں میں بھرے ہوئے اسٹونیا والوں کی منزل صرف باراننک تھی۔ آجنک پہنچنے والے جلاوطنوں کو چودہ دنوں کا راستہ طے کرنا تھا۔

ایسی پریشان کن ساعت میں لوگوں کو کون سی چیز زندہ رکھ سکتی ہے؟ وہ امید عقیدت سے نہیں نفرت سے پیدا ہوتی ہے: ان کا انجام نزدیک ہے! اس سال جنگ چھڑ جائے گی اور موسم سرما میں ہم گھروں کو چلے جائیں گے

جب مغربی دنیا یا مشرقی دنیا نے ایسے حالات کا تجربہ نہیں کیا اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس وقت مقید لوگوں کے جذبات کو سمجھ سکے گا، ان سے ہمدردی رکھے گا، یا شاید ان لوگوں کے اس وقت کے موڈ کو معاف کر سکے گا میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہم لوگوں سے کبھی ان برسوں ۱۹۵۰ - ۱۹۴۹ء میں یہی خیالات تھے یہی آرزوئیں تھیں یہ وہ سال تھے جن میں اس طریق عمل کی بے اصلی۔ اس کی پچیس سالہ سزائیں اور مجمع الجزائر کی طرف واپسی کا سفر ایک نئے آتش فشانی سطح پر پہنچ گیا تھا اور اشتعال ناقابل برداشت ہو گیا تھا کہ اس کے علاوہ کوئی جواز پیش کرنے سے قاصر تھے (ہم اسے عمومی انداز میں پیش کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی حکومت غیر اخلاقی ہے اس کی رعایا اس کے تئیں تمام ذمہ داریوں سے مبرا ہے) ان کی زندگیوں کو وحشیانہ انداز میں مجروح و پامال کر کے ہی آپ لکھو کھا افراد کو، جو کوٹھڑیوں، جیل کی موٹروں، جیل گاڑیوں میں مقید تھے۔ یہ تمنا کرنے پر مجبور کر رہے تھے کہ تباہ کن ایٹمی جنگ چھڑ جائے کیوں کہ وہی ہماری نجات کا واحد ذریعہ ہے۔

لیکن کوئی اشکبار نہ ہوا — کوئی بھی نہیں — نفرت کی آنکھیں خشک ہوتی ہیں۔

اسٹونیا والے مسافر جس چیز کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ وہ یہ تھی کہ سائبیریا کے لوگوں سے

ہم کس قسم کے خیر مقدم کی توقع کر سکتے ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں سائبیریا والوں نے جلا وطن بالٹک والوں سے کپڑے چھین کر انھیں برہنہ کر دیا تھا اور انھیں دھمکایا تھا کہ اپنا تمام سامان ان کے سپرد کر دیں۔ ایک مرتبہ کوٹ کے معاوضے میں نصف بالٹی آلو دیے تھے (ہم سب کے پاس ان ایام میں یقینی طور پر اتنا کپڑا تھا کہ بالٹک والے بچے بورژوا دکھائی دیتے تھے!)

اب ۱۹۴۹ء میں سائبیریا میں یہ خبر عام کی گئی کہ جنھیں باہر کیا جا رہا ہے وہ لاعلاج قلاق ہیں لیکن قلاق اپنے مویشیوں والے ڈبوں سے پھٹے پرانے چیتھڑے پہنے ہوئے اور اپنی قوت برداشت کی آخری حد کو پہنچی ہوئی حالت میں اتارے گئے۔ طبی معائنوں میں روسی نرسیں یہ دیکھ کر ششدر رہ گئیں کہ وہ عورتیں اتنی لاچار تھیں کہ ان کے پاس اپنے شیر خوار بچوں کے لیے بھی کوئی صاف کپڑا نہ تھا۔ نووارد بین کو ان کولخوزوں میں بھیجا گیا جن میں آدمیوں کی قلت تھی اور وہاں اشتراکیت زدہ دہقان عورتیں اپنے افسروں کی نگاہ بچا کر وہ سب چیزیں لے آئیں جو ان کے پاس فاضل تھیں۔ کوئی نصف لیٹر دودھ لائی کوئی میٹھے چقندر سے تیار کردہ گریڈل کیک لائی اور کوئی خراب قسم کا آٹا لائی

انجام کار اسٹونیا کی عورتوں کو انکسار ہونا ہی پڑا۔

لیکن وہاں بلاشبہ دوسرے لوگ 'کوسوموں کے باعمل ممبران بھی تھے انھیں اس فاشسٹ غلاظت کی آمد بہت بری لگی ("انھیں تم سب کو غرقاب کر دینا چاہیے تھا!" یہ لوگ چیختے تھے) اور ان کی اس ملک کے لیے کام کرنے کی ناآمادگی پر جس نے انھیں بورژوا غلامی سے نجات دلائی تھی' — محسن کش! — وہ بے حد ناخوش تھے۔ ان کوسوموں کو ان جلا وطنوں اور ان کے کام کی دیکھ بھال پر مامور کیا گیا تھا اور انھیں وارننگ دی گئی تھی پہلی گولی چلتے ہی وہ لوگوں کو پکڑنا شروع کر دیں۔

اچانک اسٹیشن پر ایک دلچسپ گھپلا ہو گیا۔ ضلع بریوسی کے افسران نے لانے والوں سے دس جلا وطن ڈبے خریدے — یہ پانچ سو افراد تھے جو جدید لائے چلم پر واقع ان کے اجتماعی فارم پر کام کریں گے اور انھیں بہ سرعت ۵۰ کلو میٹر شمال کی طرف پہنچا دیا گیا۔ در اصل وہ ناکاسیا کے سلا النسک کان کی انتظامیہ کے لیے تعینات کیے گئے تھے (لیکن یقیناً انھیں یہ بات معلوم نہیں تھی) کان کے مخبر اپنی ٹولی کے منتظر تھے لیکن وہ ٹولی اجتماعی فارموں کے چہار جانب منتشر کر دی گئی تھی جن میں کسانوں کو کام کے ایک دن کا معاوضہ ۲۰۰ گرام اناج ادا کیا جاتا تھا۔ اس موسم بہار تک بہ مشکل اناج تھا نہ آلو تھے۔ گاؤں بھوکے مویشیوں کی طرح ڈکرانے کی آوازوں سے گونج رہے تھے اور گائیں آدھے سڑے ہوئے بھوسے پر پاگلوں کی طرح ٹوٹ پڑتی تھیں۔ اس لیے ان اجتماعی فارموں نے نووارد بین کو، جو ایک کلوگرام آٹا فی کس فی ہفتہ فراہم کیا تو وہ کسی کرم کی بنا پر یا جلا وطنوں پر سختی کرنے کی نیت سے نہیں دیا تھا — یہ نہایت قابل عزت پیشکش تھی جو ان کی مستقبل کی آمدنی کے تقریباً برابر تھی۔ اسٹونیا والوں کے لیے اپنے وطن کی بہ نسبت یہ ایک بڑی تبدیلی تھی۔ (در اصل ایک قریبی بستی پولسوئے میں اناج سے بھرے ہوئے بڑے گودام تھے۔ سال بہ سال اناج کا ذخیرہ بڑھتا جا رہا تھا کیوں کہ کسی نے جلا وطنوں کو وہاں بھیجنے کا بندوبست نہیں کیا تھا۔ لیکن اب یہ سرکاری اناج تھا اور کولخوز کا اس پر کوئی حق نہ تھا۔ چہار جانب لوگ مر رہے تھے لیکن ان گوداموں سے انھیں کوئی اناج نہیں دیا گیا۔ کیوں کہ یہ سرکاری تھا۔ ایک موقع پر کولخوز کے صدر ہانکوف نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کولخوز کے ہر رکن کو جو تا حال بقید حیات ہو، پانچ کلوگرام فی کس کے حساب سے اناج تقسیم کر دیا — اور نتیجے میں اسے کیمپ کی سزا دی گئی — اناج سرکاری ملکیت تھا اور کولخوز کی مصیبتیں

ان کا ذاتی معاملہ تھیں اور ان پر توجہ دینے کی گنجائش یہاں بالکل نہیں تھی۔

چیم پر اسٹونیا والے بیزاری سے سالہا گزر بسر کرتے تھے اور ایک حیرت انگیز نئے قانون میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چودی کو یا مردا وہ یہ سوچنے لگے تھے کہ انھیں دائمی طور پر وہاں رہنا ہے لیکن دفعتاً ان سب کو گھیر کر خاکاسیا کے سارالنسک ضلع میں پہنچا دیا گیا۔ (ملکوں نے اپنی گمشدہ ٹولی کو تلاش کر لیا تھا وہاں اصلی خاکاسیا کے باشندے نظر ہی نہ آتے تھے ہر بستی جلاوطن بستی تھی اور ہر ایک پی ایم۔ وی۔ ڈی کی ایک چوکی تھی وہاں سونے کی کانیں تھیں۔ نئے شیفٹ لگائے جا رہے تھے ہر جگہ سکوسس مرض عام تھا۔ سچ پوچھو تو یہ وسیع علاقہ اسی حد تک خاکاسیا یا کراسنویارسک کا حصہ نہیں تھا۔ جتنا خاکزولوٹو (خاکاسیا سونے کی کان کا ٹرسٹ) یا ینی سیئیزروف (ینی سیئی ڈیولپمنٹ اتھارٹی) کی املاک تھا۔ یہ ضلع سوویٹوں اور ضلع کے سکریٹری کی ملکیت نہیں تھے۔ بلکہ ایم وی ڈی کے جنرلوں کے ماتحت تھے اور ضلع کی پارٹی کمیٹیوں کے سکریٹری مقامی ایم۔ وی۔ ڈی کے کمانڈروں کو سلامی دیا کرتے تھے)

لیکن جو لوگ کانوں پر متعین کئے گئے تھے انھوں نے ہی سب سے زیادہ صعوبتوں کا سامنا نہیں کیا۔ ان سے بھی بدتر حالت میں وہ لوگ تھے جو "پراسپکٹنگ آرٹیلس" میں بھرتی کیے گئے تھے پراسپکٹر— اس لفظ میں ایک رومانی آہنگ ہے یہ اس طرح جھلملاتا ہے جیسے اس پر ہلکا ہلکا سونا چھڑک دیا گیا ہو۔ لیکن آپ کے ذہن میں جو بھی خیال آئے ہمارے وطن میں اس کی بھونڈی تفسیر کی جاتی ہے۔ مخصوص آباد ہونے والوں کو ان مزدور یونینوں میں شامل ہونے پر مجبور کیا گیا کیوں کہ وہ مخالفت کرنے کی جرأت نہ رکھتے تھے۔ انھیں ان کانوں میں کام کرنے کے لیے کہا گیا۔ جنھیں حکومت نے بے سود سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ اب ان کانوں میں حفاظت کے کوئی اقدامات نہیں کیے گئے اور بیچ بیچ میں پانی یوں ٹپکنے لگتا تھا جیسے زوردار بارش ہو رہی ہو خواہ آپ کتنی ہی محنت کریں لیکن ثمرہ بہت کم حاصل ہوتا تھا۔ اور اچھا اجرت کا نا مشکل تھا۔ ان تقریب [illegible] لوگوں کو سونے کے وہ باقی ماندہ ذرات چھانٹ کر باہر نکالنے کو بھیجا گیا۔ جنھیں حکومت بجلی کے تحت چھوڑ نہیں رہی تھی۔ یہ ٹولیاں کان کی انتظامیہ کے [illegible] شعبے کے تحت آتی تھی جو کسی بات پر توجہ نہیں دیتی تھی۔ کوئی اپنی ذمہ داری قبول نہیں کرتا تھا سوائے اس کے کہ [illegible] ہاتھ میں تھما کر بالجبر اس کی تکمیل پر مجبور کرے۔

مزدور یونین حکومت سے "آزاد" نہیں تھی۔ بلکہ صرف اس کے قانون ساز امور سے آزاد تھیں۔ انہیں ٹھیکہ کے ساتھ رخصت کا حق نہیں تھا۔ نہ عام طور پر آزادی خیال حاصل تھی (جو کیمپوں میں زکیوں تک کو حاصل تھی) کیوں کہ کسی بھی پیشے کو "[illegible]" کماہ مشتہر کیا جا سکتا تھا جس میں کوئی [illegible] تعطیل نہ ہوتی حکومت کے اختیارات کی حفاظت کی جاتی تھی۔ جو شخص کام پر نہیں آتا تھا اس پر مقدمہ چلتا تھا۔ ہر دو ماہ میں ایک مرتبہ ایک عوامی جج آتا تھا اور کئی جلاوطنوں کو چھبیس فی صد لازمی مزدوری کی سزا دے جاتا تھا— ہمیشہ بیسیوں چیلے موجود ہوتے تھے۔ یہ "پراسپکٹر" تین چار "سونے" کے روبل (۲۰۰–۱۵۰ اسٹالن روبل) فی ماہ کما لیتے تھے۔

کوبیرف کے قریب کچھ کانوں پر جلاوطنوں کو اجرت پیسے کی شکل میں نہیں بلکہ واڈکا کی صورت میں ادا کی جاتی تھی۔ سچ پوچھیے تو انھیں عام سوویٹ کرنسی کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جب وہ کسی بھی حال میں ادھر ادھر کہیں جا نہیں سکتے تھے اور کام پر چلنے والی دکان واڈکا ہی قبول کرتی تھی۔

اس کتاب میں کسی دوسرے مقام پر ہم نے سرف دستور کے زمانے میں کیمپوں کے قیدیوں اور کسانوں کے حالات کا موازنہ نہ کیا ہے لیکن اگر ہم اپنی روسی تاریخ کو یاد رکھیں تو معلوم ہوگا کہ سب سے بدتر حالات کسانوں سے نہیں بلکہ کارخانوں سے متعلق مزدوروں کے تھے۔ بعض کان کی دکان پر صرف کیے جانے کے قابل ان واؤچروں سے اتنائی کی سونے کی کانوں اور فیکٹریوں کی یاد ہمارے حافظے میں تازہ ہو جاتی ہے۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدیوں میں ان کارخانوں میں متعین کان کن دانستہ کوئی جرم کر لیتے تھے تاکہ انھیں کٹورگا بھیج دیا جائے جہاں زندگی بسر کرنا نسبتاً آسان تھا۔ گزشتہ صدی کے اختتام پر اتنائی کے کان کنوں کو "اتوار کے دن بھی کام پر جانے سے انکار کرنے کا حق نہیں تھا (!) وہ جرمانے ادا کرتے تھے (ملاحظہ ہو لازمی مزدوری کا طریق عمل) اور دکانوں پر گھٹیا قسم کی اشیائے خوردنی، خراب مشروب کم تول کر دی جاتی تھیں۔ سونے کی کان کے مالکوں کی آمدنی کا خاص ذریعہ یہ دکانیں تھیں۔ بدسلیقگی کے ساتھ کی جانے والی سونے کی کھدائی نہیں" یا جدید لفظیات میں مالکان کی جگہ اسے ٹرسٹ کہا جائے گا۔[۶]

عجیب بات ہے کہ اس مجمع الجزائر میں ہر چیز اپنی اصلیت سے اتنی عاری ہے.....!

۱۹۵۲ء میں ن۔ س۔ جو ایک نحیف الجثہ خاتون تھیں، سخت پالے میں کام پر نہیں گئیں کیونکہ اس کے پاس فلیٹ کے بوٹ نہیں تھے۔ اس جرم پر لکڑی کے کام والی مزدور یونین نے اسے تین ماہ کے لیے شہتیروں کی ڈھلائی پر لگا دیا، اب بھی بغیر فلیٹ کے جوتوں کے ــــ زچگی سے تین ماہ قبل اسے شہتیر اٹھانے کی بہ نسبت کوئی ہلکا کام دے دیا جائے اور جواب یہ تھا: اگر تمھیں کام کی ضرورت نہ ہو تو چھوڑ دو۔ پھر ایک اناڑی لیڈی ڈاکٹر نے اس کی زچگی کا وقت ایک ماہ بعد بتا دیا اور اس طرح بچے کی ولادت سے صرف دو تین دن پہلے ہی اسے رخصت عطا کی گئی۔ ایم۔ سی۔ ڈی کے جنگل میں آپ بحث کر کے کسی منزل پر نہیں پہنچ سکتے.

لیکن زندگی وہاں مکمل طور پر غارت نہیں ہوئی تھی۔ مکمل غارت گری تو ان خصوصی نو آبادوں کے لیے محفوظ رکھی گئی تھی جنھیں اجتماعی فارموں پر بھیجا گیا تھا۔ عہد حاضر میں ایسے لوگ ہیں جو یہ دلیل پیش کرتے ہیں (اور یہ کوئی احمقانہ دلیل نہیں ہے) کہ کیمپوں کی بہ نسبت زندگی کولخوزوں میں زیادہ آرام دہ تھی لیکن ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر کولخوز اور کیمپ کو ملا کر ایک کر دیا جائے تو کیا حالت ہوگی؟ اصل میں کولخوزیں نو آباد جلاوطنوں کی کیفیت یہی تھی۔ اس اعتبار سے وہ کولخوز تھا کہ وہاں باقاعدہ راشن نہیں ملتا تھا۔ صرف تخم ریزی کے زمانے میں وہ سات سو گرام یومیہ دیتے تھے اور یہ بھی آدھا سڑا ہوا، ریت ملا ہوا اور مٹیلے رنگ کا (ظاہر ہے گوداموں کے فرش سے سمیٹا ہوا) ہوتا تھا۔ اس اعتبار سے یہ ایک جیل کیمپ تھا کہ نو آبادوں کو نظربندی کی کوٹھریوں میں رکھا جا سکتا تھا اگر کوئی فورمین اپنی ٹولی کے کسی جلاوطن کے بارے میں شکایت کر دے تو کولخوز کے منتظمین ایم۔ سی۔ ڈی کی چوکی پر کوئی ٹیلیفون کر دیتے تھے اور ایم۔ وی۔ ڈی اس شخص کو بند کر دیتی تھی۔ فاضل آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ آپ کسی بھی طرح اپنا پیٹ نہیں بھر سکتے تھے۔ کولخوزیں کام سے پہلے برس کے لیے ماریا سومبرگ کو ہر کام کے دن کا ۴۰ گرام اناج (ایک چھوٹی سی چڑیا بھی سڑک کے کنارے اس سے زیادہ دانہ چگ لیتی ہے) اور پندرہ اشالن کوپک (ڈیڑھ خروشچیف کوپک) ملتے تھے۔ اپنے پورے سال کی کمائی سے اس نے اپنے لیے ایک ... المونیم کا کٹورا خریدا تھا!

آپ دریافت کر سکتے ہیں کہ پھر آخر وہ کیا کھا کر زندہ رہتے تھے؟ کیا بالٹک ریاستوں سے موصول ہونے والے پارسلوں پر سان کی نسل کو جلا وطن کر دیا گیا تھا، لیکن پوری قوم کو نہیں۔
لیکن کالماشیکوں کو پارسل کون بھجواتا تھا؟ یا کریمیا کے تاتاریوں کو؟
ان کی قبروں پر جا کر انھیں سے دریافت کرو۔

خدا معلوم یہ فیصلہ بھی ان کی اپنی ہی بالٹک حکومتوں نے کیا تھا یا سائبیریا کی پاکیزگی کا مظہر تھا لیکن بالٹک کے جلاوطنوں کے متعلق خصوصی احکامات کی تکمیل ۱۹۵۳ء سے قبل تک، یا بلٹے عوام کی وفات سے قبل تک ہوتی رہی۔ ان کے لیے سخت ترین کام ہی تجویز کیے جاتے تھے! پھاوڑا، بیلچہ اور آرہ۔ "تم یہاں اصلی آدمی بننے کے لیے آئے ہو!" اگر کوئی انتظامی شعبہ کسی شخص کو ترقی دے دیتا تو ایم۔ وی۔ ڈی کی چوکی مداخلت کرتی اور اسے عمومی کام (جنرل ڈیوٹی) کے لیے ہٹا دیتی تھی۔ وہ خصوصی نو آبادوں کو کان کی انتظامیہ کے مہمان خانے کے باغیچوں میں کھدائی وغیرہ تک اس ڈر سے نہیں کرنے دیتے تھے کہ کہیں اسٹاخانو وائٹ جو وہاں افزائش صحت کے لیے مقیم تھے، ناراض نہ ہو جائیں۔ ایم۔ وی۔ ڈی کی چوکی کے کمانڈر نے ایم۔ سومبرگ کو گائے کے بچھڑوں وغیرہ کی نگہداشت کے کام سے بھی برخواست کرا دیا۔ "تمھیں یہاں موسم گرما کی تعطیلات گزارنے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہے۔ جاؤ اور گھاس کا ذخیرہ لگاؤ!" صدر کو اسے متعین کرنے میں بڑی دشواری ہوئی (سومبرگ نے گائے کے بچوں کو برڈسیلوسس بیماری سے نجات دلائی تھی۔ اس کو سائبیریا کے مویشیوں سے بڑی انصیت ہو گئی تھی جو اسٹونیا کے جانوروں سے زیادہ شائستہ نظر آتے تھے اور گائیں جنھیں محبت بہت مشکل سے ملتی تھی، اس کے ہاتھ چاٹا کرتی تھی)

اناج فوری طور پر سرعت کے ساتھ کشتیوں میں لادنا پڑتا تھا اور مخصوص نو آباد لوگ کنارے پر (کچلم) متواتر چھتیس گھنٹے کسی انعام یا معاوضے کے بغیر کام کرتے تھے۔ اس پورے عرصے میں کھانے کے لیے دو بار بیس بیس منٹ کی مہلت دی جاتی تھی اور تین گھنٹے کے لیے آرام کرنے کی اجازت ملتی تھی: "یا تو تم یہ کام پورا کرو ورنہ ہم تمھیں اور زیادہ شمالی خطے میں بھیج دیں گے"۔ اگر کوئی معمر شخص بورے کے بوجھ سے گر پڑتا تو کوسومول کے اراکین خود ٹھوکریں مار مار کر اُسے اٹھا دیتے تھے۔

نو آباد لوگوں کو ہفتہ وار حاضری لگوانی پڑتی تھی۔ تم کہتے ہو ایم۔ وی۔ ڈی کی چوکی کئی کلو میٹر کے فاصلے پر ہے اور بڑھی خاتون کی عمر اسی برس ہے؟ گھوڑا منگالو اور اس کو اس پر سوار کر کے لے جاؤ! جب وہ حاضری دینے جاتے تھے اس وقت انھیں یاد دہانی کرائی جاتی تھی کہ فرار کی سعی کا مطلب ہے بیس سال کی شدید مشقت کی سزا۔ افسر تحفظ کا کمرہ متصل ہے۔ جلاوطنوں کو وہاں بھی طلب کیا جاتا ہے۔ زیادہ اچھے کام کی لالچ دی جاتی ہے اور وہ اس کی اکلوتی لڑکی اس کے خاندان سے الگ کر کے قطبی علاقے میں بھیجنے کی دھمکی دیتا ہے۔

کیا کوئی ایسی بات ہے جو وہ نہیں کر سکتے؟ ایسی کون سی حدِ فاصل ہے جس سے تجاوز کرنے کو ان کا ضمیر روکتا ہے؟.....

وہ جلاوطنوں کو کام سونپا کرتے تھے۔ فلاں فلاں پر نگاہ رکھو۔ ایسی شہادتیں فراہم کرو جن سے فلاں فلاں کو جیل میں ڈالا جا سکے۔

اگر چوکی کا کوئی معمولی سارجنٹ بھی جھونپڑے میں داخل ہو تو سب جلاوطنوں کو بوڑھی عورتوں کو بھی کھڑا ہونا اور اس وقت تک کھڑے رہنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا جب تک ان سے بیٹھنے کو نہ کہہ دیا جائے۔

مجھے امید ہے کہ قارئین نے میرے بیانات کا غلط مفہوم اخذ نہیں کیا ہوگا کہ جلاوطنوں کو ان کے شہری حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا.....

نہیں، نہیں۔ ان کے شہری حقوق کلیتاً محفوظ تھے۔ انھیں دیسے، مساوی خفیہ اور براہ راست انتخابات میں حصہ لینے کے اختیار سے محروم نہیں کیا گیا ہے وہ اعلیٰ ترین، پروقار لمحہ، جب آپ فہرست کے باقیماندہ تمام امیدواروں کے نام کاٹ دیتے ہیں اور صرف اپنا پسندیدہ نام رہنے دیتے ہیں — بعد امرار یہ حق ان کے لیے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ نہ ہی سرکاری قرضوں میں روپیہ لگانے پر کوئی پابندی تھی — (یاد کیجیے کہ کیمپ میں کمیونسٹ ڈیاکوف نے کتنی ذہنی اذیت برداشت کی تھی!) جب کہ کولخوز کے آزاد ممبر مغلظات سناتے اور گلہ کرتے ہوئے بڑی بددلی کے ساتھ پچاس روبل ادا کرتے تھے تو اسلونیا والوں سے جبراً چار چار سو روبل کھینچے جاتے تھے — تم سب دولت مند ہو، اگر کوئی دستخط نہیں کرے گا تو ہم اسے اپنے پارسل وصول نہ کرنے دیں گے اور اسے مزید شمال میں بھیج دیا جائے گا۔"

وہ ایسا بھی کرتے تھے۔ انھیں روکنے والا کون تھا۔

وہی تمام بیزار کن چیزیں! بار بار بس وہی ایک بات! اس باب چھ کی ابتدا میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم کسی نئی بات کا ذکر کریں گے: کیمپ کی نہیں؛ جلاوطن لوگوں کی اور اس باب میں نئی باتیں شروع ہوئیں: اب ہمارا موضوع انتظامی جلاوطنی نہیں ہے بلکہ مخصوص نوآباد لوگ ہیں۔

پھر بھی ہم جہاں سے چلے تھے وہیں واپس آگئے ہیں۔

کیا ہمیں دیگر، ان سے مختلف جلاوطن نوآبادیوں کی داستان ضرور سنانی ہوگی؟ دوسرے مقامات کی دوسرے زمانوں کی؟ دیگر جلاوطن نسلوں کے افراد کی؟ اور اگر سنانی ہوگی تو کتنی..... کتنی..... کتنی بار اپنی بات دہرانی ہوگی؟

اور اگر سنانی ہی ہے تو کون سی؟

مختلف اقوام کے جلاوطنوں کے ہجوم میں، جو ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ ہوگئے تھے۔ لیکن پھر بھی ایک دوسرے کو صاف نظر آتے تھے، اپنی اپنی مختلف نسلی خصوصیات، زندگی کی علیحدہ علیحدہ رسمیں، خاص پسند و ناپسند اور رجحانات نظر آتے ہیں۔

جرمن بہت زیادہ جفاکش تھے۔ انھوں نے دوسروں کی بہ نسبت اپنے آپ کو زیادہ مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی سابقہ زندگی سے منقطع کر لیا تھا اور وولگا نیز مانیخ پر ان کی مادر وطن باقی بھی کس حال میں تھی؟) جس طرح انھوں نے ایک بار کیتھرائن کی عطا کردہ زرخیز زمینوں میں اپنی جڑیں پیوست کر لی تھیں اسی طرح اب انھوں نے اسٹالن کی بخشی ہوئی سخت اور بنجر زمین میں اپنی جڑیں جما لیں اور اپنی جلاوطنی کو اسی نئی سرزمین

پر اپنا گھر تصور کر کے اس میں مگن ہو گئے۔ انھوں نے عارضی طور پر نہیں۔ آئندہ ملنے والی عام معافی تک کے لیے نہیں، ہزار کی اوّلیں عام معافی کے اعلان تک نہیں بلکہ مستقل طور پر آباد ہونا شروع کیا۔ ۱۹۴۱ء میں انھیں بغیر کسی ڈنڈے اور بغیر کسی تازیانے کے جلاوطن کیا گیا لیکن وہ عمدہ کسان تھے اور ناقابلِ شکست تھے چنانچہ کسی قنوطیت کا شکار نہیں ہوئے اور اس مقام جس حد تک عقلمندی سے اور جن جن وسائل سے ممکن تھا اس حد تک مناسب کاموں میں لگ گئے کیا دنیا میں ایسا کوئی بیابان ہے جسے جرمن لوگ زرخیز زمینوں میں تبدیل نہیں کر سکتے! قدیم زمانے میں روسی لوگ یہ بات فضول نہیں کہا کرتے تھے کہ "جرمن تو بید کے پودے کی مانند ہوتا ہے اسے کہیں بھی لگا دو، اپنی جڑیں مستحکم کرے گا" کانوں میں، مشین اور ٹریکٹر اسٹیشن پر، سرکاری فارموں میں خواہ جدھر جائیے افسران جرمنوں کی توصیف میں رطب اللسان نظر آتے تھے۔ ان کے پاس وہاں ان سے بہتر کام کرنے والے نہیں آئے۔ چھٹی دہائی تک جرمنوں کے پاس دیگر جلاوطنوں اور مقامی اشخاص کی بہ نسبت سب سے زیادہ مضبوط، بڑے اور صاف ستھرے مکانات، عمدہ سؤر اور بہترین دودھ دینے والی گائیں ہو گئیں۔ ان کی لڑکیوں کے جوان ہونے پر انھیں دلہن بنانے کے لیے لوگوں کی بھیڑ تیار کھڑی رہتی تھی جو محض اس لیے نہیں ہوتی تھی کہ ان کے والدین متمول تھے بلکہ اس لیے کہ — کیمپوں کے قرب و جوار کی ارذل دنیا میں — وہ پاکباز اور کردار کی نیک ہوتی تھیں۔

یونانیوں نے بھی اپنا کام جوش اور امنگ کے ساتھ قبول کر لیا اگرچہ انھوں نے خوبان کے خواب دیکھنے کبھی بند نہیں کیے لیکن وہ اس نئی جگہ میں بھی محنت کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے جرمنوں کے مقابلے میں ان کے مکانات چھوٹے تھے لیکن گایوں کی تعداد اور اپنے باغیچوں کی خوشحالی کے اعتبار سے وہ جلد ہی ان کے ہم سر ہو گئے۔ قازقستان کے چھوٹے چھوٹے بازاروں میں یونانیوں کا ہی کریم، پنیر، مکھن اور سبزیاں بہترین ہوتی تھیں۔

کوریا کے لوگ قازقستان میں اور بھی خوشحال ہو گئے۔ لیکن انھیں دوسرے دوسروں سے پہلے جلاوطن کیا گیا تھا اور چھٹی دہائی تک سرفوں والی حیثیت یا غلاموں کی حالت سے بہت کچھ مفر پا گئے تھے اور انھیں اب حاضری نہیں دینی پڑتی تھی، ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں سفر کرنے کی آزادی حاصل تھی بشرطیکہ وہ جمہوریہ کی سرحد سے آگے نہ جائیں۔ وہ مکانات کی تعمیر یا کاشت کے معاملات میں زیادہ مہارت نہ رکھتے تھے (ان کے گھر اور کھیتوں کے مکان اس وقت تک غیر آرام دہ اور پرانے قسم کے تھے جب تک ان کی نوجوان نسل یورپی رنگ میں نہیں ڈھل گئی) لیکن انھوں نے تعلیم کی طرف خاص توجہ دی اور جلد ہی قازقستان کے تعلیمی اداروں کو پُر کر دیا (زمانۂ جنگ میں کسی نے ان کی راہ میں اڑچن نہیں پیدا کی) اور جمہوریہ میں تعلیمی معیار کی علامت بن گئے۔

دوسری قومیں، جو دل ہی دل میں واپسی کے خواب دیکھا کرتی تھیں، اتنی یکسوئی کے ساتھ موجودہ زمانے میں جہدِ حیات میں شامل نہیں ہو سکیں لیکن عام طور پر انھوں نے نظم و نسق کو برقرار رکھا اور ایم۔ وی۔ ڈی کو کسی خاص پریشانی میں مبتلا نہیں کیا۔

کالمائیک یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکے اور دل برداشتہ ہو کر مر گئے (لیکن اس معاملے میں میں اپنی ذاتی معلومات کے تحت کچھ نہیں کہہ سکتا۔)

لیکن ایک قوم ایسی تھی جس نے گردن ڈال کر جینا منظور نہیں کیا اور شکست کی ذہنی عادتیں قبول نہ کر سکی۔

یہ ان میں کسی باغیانہ خیال رکھنے والے فردِ مخصوص کی نہیں بلکہ پوری قوم کی، ہر ایک فرد کی بات تھی یہ چیچن لوگ تھے۔

ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ انھوں نے کیمپوں کے مفرورین کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا اور کس طرح دو یز کازگان میں جلاوطن اقوام میں وہ تنہا ایسی قوم تھے جس نے کینگر کی بغاوت کی معاونت کی کوشش کی تھی۔

میں کہنا چاہوں گا کہ سارے خصوصی نو آبادوں میں صرف چیچنوں نے ہی جذباتی اعتبار سے اپنے آپ کو زیک ثابت کیا تھا۔ انھیں فریب دے کر بالجبر اپنے گھروں سے ہٹا دیا گیا تھا اور اسی دن سے وہ کسی بات پر یقین نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے لیے ساکلی — نیچی، تاریک، خراب جھونپڑیاں — بنائیں جو ایسی معلوم ہوتی تھیں کہ ایک ٹھوکر سے کوئی بھی نیچے گرا سکتا تھا۔ جلاوطنی میں ان کی کاشت بھی ایسی ہی تھی تمام کی تمام صرف ایک دن، ایک ماہ، ایک سال کے لیے۔ باقی کچھ نہیں۔ کوئی ذخیرہ نہیں، مستقبل کا کوئی خیال نہیں۔ وہ اچھا کھاتے پیتے تھے اور جوان افراد اچھے کپڑے پہنتے تھے۔ سال پر سال گزرتے چلے گئے لیکن ان کی املاک اتنی ہی محدود رہی جتنی پہلے تھی چیچنوں نے کبھی انھیں خوش کرنے کی کوشش نہیں کی، افسروں سے روابط استوار کرنے کی خواہش نہیں کی ان کا رویہ ہمیشہ بانکپن کا رہا بلکہ سچ پوچھیے تو معاندانہ رہا۔ وہ تعلیم سے تعلقِ عام قوانین اور سرکاری نصاب کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اپنے آپ کو بدکرداروں سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی چھوٹی بچیوں کو اسکول نہیں بھیجتے تھے نہ اپنے تمام لڑکوں کو ہی بھیجتے تھے۔ وہ اپنی عورتوں کو کولخوزوں میں کام نہیں کرنے دیتے تھے نہ وہ خود کولخوزیں میں غلامی کرنا پسند کرتے تھے۔ جب بھی ممکن ہوتا وہ اپنے لیے بطور ڈرائیور ملازمت حاصل کر لیتے تھے۔ کسی انجن کی دیکھ بھال کرنا انھیں چھوٹا کام نہیں لگتا تھا۔ ناہموار زمین میں گھڑ سواری کی خواہش کی تسکین کے لیے وہ مسلسل موٹر چلاتے رہنے میں مسرت محسوس کرتے تھے اور موٹروں میں چوری کرنے کے لیے جذبے کو جو ڈرائیوروں میں عام ہوتا ہے تسکین پہنچاتے تھے۔ لیکن یہ آخری تشنگی وہ براہِ راست بھی پوری کر لیتے تھے "ہمیں لوٹا گیا ہے"۔ "ہمیں بے دخل کر دیا گیا ہے"۔ یہ احساسات انھوں نے قازقستان کی پُرامن دیانتدارانہ مخمور زندگی میں عام کر دیے۔ وہ کسی مویشی کو ہنکالے جانے، مکان لوٹ لینے یا بعض اوقات اپنی پسندیدہ چیز زبردستی چھین لینے پر بھی قدرت رکھتے تھے جہاں تک ان کا تعلق تھا، مقامی باشندگان اور وہ جلاوطن جنھوں نے بآسانی سر تسلیم خم کر دیا کم و بیش اسی تھیلی کے چٹے بٹے تھے جس کے افسر لوگ تھے۔ وہ صرف باغیوں کا احترام کرتے تھے اور یہ ایک غیر معمولی بات ہے ان سے ہر شخص خائف تھا وہ جس روش پر گامزن تھے اس سے باز رکھنا کسی کے لیے ممکن نہ تھا۔ جو حکومت تیس سال سے ملک پر حکمراں تھی وہ انھیں اپنے قانون کے احترام پر مجبور نہیں کر سکی۔

یہ سب ہوا کیسے؟ ایک واقعہ سنیے جس میں شاید سارے اسباب کا نچوڑ نظر آ جائے گا۔ جب میں کوکتیریک اسکول میں زیرِ تعلیم تھا اس وقت وہاں ایک طالب علم لڑکا عبدل خدائیف تھا۔ اس کے لیے کوئی کشش پیدا نہیں ہوتی تھی نہ وہ ایسا چاہتا تھا وہ اپنے آپ کو خوش بنانے کے لیے منکسر بننے سے ڈرتا تھا اور ہمیشہ ظاہری طور پر سرد مزاج رہا کرتا تھا وہ بے حد تیز تھا اور بعض اوقات سنگدل بھی ہو جاتا تھا لیکن اس کے صاف اور حقیقت پسند ذہن کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ریاضی اور طبیعیات کے مضامین میں وہ کبھی اپنے ساتھیوں کی طرح بالائی سطح پر نہیں رہ جاتا تھا بلکہ گہرائی میں جاتا تھا۔ سوالات کرتا تھا۔ سلسلے کی تہہ پانے کے لیے ان تھک جستجو کرتا تھا نو آبادوں کے تمام بچوں کی طرح وہ بھی لازماً اسکول کی مبینہ ثقافتی سرگرمیوں میں پہلے پہل زنانہ تنظیم پھر کوسومول، پھر

اسکولی کمیٹیاں، دیواری اخبار، کردار کی تربیت کا کورس، سیاسی مباحثے کی انجمن — یہ تعلیم کی وہ اخلاقی قیمت تھی جسے چیچین اتنی بد دلی کے ساتھ ادا کرتے تھے۔

عبدل اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتا تھا اس کا کوئی بھی قریبی عزیز زندہ نہیں بچا تھا سوائے عبدل کے بڑے بھائی کے جو بہت پہلے جرائم کی راہ پر نکل گیا تھا۔ چوری اور قتل کے جرم میں ایک سے زائد مرتبہ جیل اور کیمپ کی سزا بھگت چکا تھا لیکن ہمیشہ یا تو کسی عام معافی کے تحت یا اچھے رویے کی وجہ سے سزا میں کی جانے والی تخفیف کے باعث قبل از میعاد باہر آ گیا تھا۔ ایک دن وہ کوکٹیریک آیا، دو دن تک سانس لیے بغیر شراب پیتا رہا۔ ایک مقامی چیچین سے لڑ پڑا اور چاقو چھین کر اس پر جھپٹا۔ ایک معمر چیچین خاتون نے، جس کا ان دونوں سے کوئی واسطہ نہیں تھا ان کے بیچ میں پڑ کر اور اپنی دونوں بانہیں پھیلا کر اسے روک لیا اگر وہ چیچینوں کے دستور پر عمل کرتا تو اپنا چاقو نیچے ڈال کر دشمن کا پیچھا چھوڑ دیتا لیکن اب وہ پہلے چور تھا اور بعد میں چیچین، چنانچہ اس نے چاقو نیچے کر کے بے قصور عورت پر جان لیوا وار کیا۔ اب اس کے مخمور ذہن میں خیال پیدا ہوا کہ چیچین قوانین کے مطابق اس کا کیا حشر ہوگا! وہ بھاگ کر ایم۔وی۔ڈی کی چوکی پر پہنچ گیا اور وہاں ارتکاب قتل کا اقبال کر لیا اور انھوں نے اسے بخوشی جیل بھیج دیا۔

اسے تو ایک پناہ گاہ مل گئی لیکن اس کا برادر خورد، عبدل، معمر ماں اور برادری کا ایک بوڑھا چیچین، عبدل کا چچا بے یار و مددگار رہ گئے۔ قتل کی اطلاع کوکٹیریک کی چیچین برادری کو فوراً ہو گئی اور خدائیف خاندان کے تینوں افراد اپنے مکان میں اکٹھے ہو گئے، انھوں نے کھانے کا سامان، اور پانی جمع کیا، کھڑکی بالکل بند کر لی، دروازے پر میخیں ٹھونک دی گئیں اور اس چھوٹے قلعے میں وہ چپ چاپ دبک گئے۔ مقتولہ خاتون کے بھتیجوں کو اب خدائیف خاندان کے کسی رکن کا قتل کر کے انتقام لینا تھا۔ جب تک ان کے خون کے بدلے میں خدائیف خون نہیں بہے گا وہ انسان کہلانے کے مستحق نہیں ہوں گے۔

چنانچہ خدائیف خاندان کے مکان کا محاصرہ کر لیا گیا۔ عبدل اسکول نہیں جاتا تھا تمام کوکٹیریک اور پورا اسکول اس کا سبب جانتا تھا۔ ہمارے اسکول کے ایک اونچی جماعت کے طالب علم زینا کو کومسومول کا ایک ذہین و ہونہار متعلم کو کسی بھی وقت چاقو سے قتل کر دیے جانے کا خطرہ درپیش تھا شاید اسی وقت جب گھنٹی بج رہی ہے اور دیگر طلبا اپنی اپنی ڈیسک پر بیٹھنے جا رہے ہیں، شاید اسی وقت جب ادب کا استاد اشتراکی انسان دوستی کے بارے میں سمجھا رہا ہے ہر شخص جانتا تھا کسی کو بھی لمحہ بھر کے لیے یہ بات فراموش نہ ہوتی تھی۔ کلاسوں کے درمیانی وقفوں میں وہ اور کسی موضوع پر گفتگو نہ کرتے تھے اور ایک دوسرے کو دیکھنے میں ندامت کا احساس کرتے تھے۔ نہ تو اسکول پارٹی کی تنظیم، نہ کومسومول، نہ ڈائرکٹر آف اسٹڈیز نہ ہیڈ ماسٹر، نہ ضلع شعبۂ تعلیم کوئی بھی خدائیف کو بچانے کے لیے نہیں گیا۔ چیچین علاقے میں، جو بھڑوں کے چھتے کی طرح بھنبھنا رہا تھا اس کے محصور مکان کے نزدیک بھی کوئی نہیں گیا اور یہ صرف انھیں کی بات نہیں تھی۔ خونی انتقام کی پہلی چنگاری پر ہی ضلع پارٹی کمیٹی، ضلع سوویٹ کی مجلس انتظامیہ، ایم وی ڈی کی چوکی اور اپنے کچی اینٹوں کے کمرے میں بیٹھا ملیشیا، جو تمام کے تمام اب تک ہمارے لیے اتنے بھیانک تھے، بزدلوں کی طرح بے عمل ہو گئے۔ ایک وحشی اور فرسودہ قانون اپنی چنگاریاں ان پر چھوڑ رہا تھا — اور اچانک کوکٹیریک سے سوویٹ اقتدار اٹھا لیا گیا تھا۔ فوجی ہاتھ صوبے کے دارالسلطنت ورزا مبول سے سرعت کے ساتھ وہاں پہنچا کیونکہ تین دن گزرنے کے باوجود کسی

ہوائی جہاز سے فوجی نہیں اترے، کوئی سخت ہدایت نہیں آئی سوائے اس ایک فرمان کے کہ تمام تعزیری اداروں میں جیلوں کی حفاظت کی جائے۔ اس سے چیچینوں کو اور ہمیں بھی اس دنیا کی حقیقی طاقت اور طاقت کے التباس میں تمیز کرنے میں بے حد معاونت ملتی ہے۔

بزرگ چیچینوں نے بڑی دانشمندی کا اظہار کیا۔ وہ پہلے ایم۔ وی۔ ڈی گئے اور ان سے کہا کہ بڑے خدائشیف کو ابتدائی کارروائی کے بعد دی جانے والی سزا کے لیے ہمارے سپرد کر دو۔ ایم۔ وی۔ ڈی نے گھبرا کر انکار کر دیا۔ وہ دوسری مرتبہ ایم۔ وی۔ ڈی پر آئے اور ان سے کہا کہ خدائشیف پر کھلے عام مقدمہ چلا کر عوام کے سامنے گولی مار دی جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو انھوں نے وعدہ کیا کہ خدائشیف خاندان کے خلاف انتقام کا معاملہ ختم ہو جائے گا۔ اس سے زیادہ معقول اور کوئی صلح نہیں سوچی جا سکتی تھی لیکن خون خواریوں پر بھی غور کیجیے۔ کھلی عدالت میں مقدمہ! جان سے مار دینے کا پیشگی وعدہ اور وہ بھی علی الاعلان۔ بالآخر خدائشیف سیاسی قیدی نہیں تھا وہ تو چور تھا۔ ایک "طبقاتی دوست"۔ دفعہ ۵۸ والے کے حقوق پامال کیے جا سکتے ہیں لیکن بے شمار قتل کرنے والے کے نہیں۔ ایم۔ وی۔ ڈی نے معاملہ ضلع کو بڑھایا اور درخواست رد کر دی گئی ___ "ایسی حالت میں" بزرگوں نے مطلع کیا ___ "سمجھو خدائشیف ایک گھنٹے کے اندر مار دیا جائے گا!" ایم۔ وی۔ ڈی کی نوکر شاہی نے اپنے شانے اچکائے۔ یہ ہمارا کام نہیں ہے۔ ان کا کام ان جرائم کے بارے میں پریشان ہونا نہیں ہے جو تاحال سرزد نہ ہوئے!

لیکن بیسویں صدی کا ہلکا سا شعور بیدار ہوا۔ ایم۔ وی۔ ڈی کا میں نہیں ___ اوہ نہیں ___ بلکہ ان سنگدل معمر چیچینوں کے دلوں میں ___ تمام باتوں کے باوجود انھوں نے مقتولہ کے اعزا کو انتقام لینے سے منع کر دیا! انھوں نے الما اتا کو ایک تار روانہ کیا۔ کچھ دوسرے بزرگ لوگ، ایسے بزرگ جن کا تمام بستی احترام کرتی تھی، جلد از جلد وہاں پہنچے۔ انھوں نے بزرگوں کی ایک مجلس مشاورت طلب کی جس نے خدائشیف کو مجرم قرار دیا اور سزائے موت تجویز کی وہ جب اور جس جگہ بھی کسی چیچین کے چاقو کی زد پر آئے! دیگر خدائشیفوں کو مجلس میں طلب کیا گیا اور کہا گیا "اطمینان سے رہو، کوئی بھی تمہیں ہاتھ نہیں لگائے گا۔"

اب عبدل نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور اسکول چلا گیا۔ وہاں پارٹی کے منتظمین اور کوسومول کی عیارانہ مسکراہٹیں اس کے سامنے آئیں۔ اپنی واپسی کے بعد سے وہ اشتراکی کمیونسٹ ضمیر کے توصیفی اسباق میں اور سیاسی تربیت کی کلاسوں میں لکچر سنا کرتا تھا لیکن ان میں اس پریشان کن حادثے کا کوئی ذکر نہ ہوتا تھا۔ عبدل کے سنجیدہ چہرے پر کوئی بھی عضلہ حرکت نہیں کرتا تھا۔ اس نے از سر نو یہ بات سیکھ لی تھی کہ دنیا میں سب سے بڑی طاقت انتقام کی طاقت ہے۔

ہم یورپی لوگ گھر پر بھی اور اسکول میں بھی اس جنگلی قانون، اس بربریت آمیز اور خون آشام حرکت کے بارے میں اعلیٰ درجے کی نفرت کی باتیں پڑھتے اور کہتے ہیں لیکن شاید انجام کار یہ جنگلی پن اتنا بے دلیل نہیں ہے یہ پہاڑی نسلوں کو کمزور نہیں بننے دیتا۔ انھیں قوی بناتا ہے۔ بدلے کے قانون کا شکار اتنے زیادہ لوگ نہیں ہوتے۔ لیکن چاروں جانب سب کے اوپر اس کا خوف کتنا با اثر ہوتا ہے! اس قانون کو ملحوظ رکھنے پر کوئی بھی پہاڑی کسی دوسرے کو آسانی سے بے عزت نہیں کرے گا۔ جیسے ہم شراب پی کر ایک دوسرے کی توہین کرتے ہیں کیونکہ ہمیں اپنے اوپر قابو نہیں رہ جاتا۔ یا پھر ہم صرف بونچا لالا یا لیانہ مستی میں رہتے ہیں۔ کوئی غیر چیچین ہے

جھگڑا مول لینے سے گریز کرے گا، اسے چور یا غنڈہ نہیں کہے گا، اس پر قطار توڑنے کا الزام نہیں لگائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ جواب الفاظ سے یا گولی سے نہیں دیا جائے گا بلکہ پسلیوں میں ایک چاقو گھونپ کر دیا جائے گا۔ اور اگر آپ خود بھی چاقو سنبھال لیں (لیکن آپ کے پاس چاقو ہوگا ہی نہیں — آپ مہذب ہو چکے ہیں نا!) تب بھی آپ وار کا جواب وار سے نہیں دے سکتے ورنہ آپ کا پورا خاندان چاقو سے ختم کر دیا جائے گا! چیچین لوگ قازق علاقے میں آنکھوں میں گستاخانہ انداز لیے ہوئے، دوسروں کو دھکا دے کر ہٹاتے ہوئے چلتے ہیں۔ اور "زمین کے آقا" غیر مالک کی حیثیت سے احترام کے ساتھ انھیں راستہ دے دیتے ہیں۔ انتقام کا قانون خوف کا ایک قوی دائرہ پیدا کرتا ہے اور اس طرح اس قانون سے پہاڑی علاقے کے تھوڑے سے افراد طاقتور بن جاتے ہیں۔

"اپنے ہمسایوں کو زدوکوب کرو تاکہ اجنبی لوگ تم سے خائف رہا کریں!" بہت قدیم دور میں پہاڑی لوگوں کے آباء و اجداد کے پاس اپنی قوم کو متحد رکھنے کے لیے اس سے مضبوط اور کوئی ڈور نہیں ہو سکتی تھی۔ کیا سوشلسٹ حکومت انھیں اس سے بہتر کوئی چیز پیش کر سکی ہے؟

پانچواں باب

سزا کا اختتام

جیل اور جیل کیمپوں کے آٹھ برسوں میں میں نے کسی بھی جلاوطنی کا تجربہ رکھنے والے فرد کو اس کی تعریف میں ایک لفظ بھی کہتے ہوئے نہیں سنا تھا لیکن تفتیش کے دنوں میں اور راستے میں سفری جیل کے ابتدائی ایام سے ہی، محض اس وجہ سے کہ کوٹھری کے چھ سپاٹ پتھروں کی چھتیں اسے بھینچتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں، قیدی کے دل میں جلاوطنی کا خیال کسی نادیدہ روشنی کی مانند، لرزیدہ چمکدار ہیولے کی طرح منور ہوتا ہے اور اپنے تاریک چبوترے پر دراز قیدیوں کے لاغر سینے بڑی آرزومندی کے ساتھ آہیں بھرتے ہیں، "کتنا اچھا ہو اگر وہ مجھے جلاوطنی کی سزا دے دیں۔!"

میں بھی اس عوامی بیماری سے آزاد نہیں تھا بلکہ جلاوطنی کی آرزو نے مجھے اور کسی بھی خیال کی بہ نسبت زیادہ سختی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ آئیروسلم کی چکنی مٹی کے گڑھے پر میں نے قریبی گاؤں میں مرغوں کو بانگ دیتے ہوئے سنا اور جلاوطنی کا خواب دیکھا۔ کلوگا روڈ پر جائے تفتیش کی چھت پر سے میں نے اجنبی دارالسلطنت کی مستحکم وسعت دیکھی اور خلوصِ قلب کے ساتھ دعا مانگی کہ مجھے یہاں سے جتنی دور بھی چاہو لیکن جلاوطنی کے مقام پر پہنچا دو! میں نے سپریم سوویٹ کو ایک اپیل بھیجنے کی سادہ لوحی بھی برتی کہ میری آٹھ برسوں کی کیمپ کی سزا کو تاحیات جلاوطنی میں تبدیل کر دیا جائے۔ خواہ جلاوطنی کا مقام کتنا ہی دور افتادہ اور جنگلی کیوں نہ ہو۔ جواب میں انھیں سانپ سونگھ گیا (تاحال میں نے تجربہ نہیں کیا تھا کہ تاحیات جلاوطنی میرا ہمیشہ انتظار کرے گی، لیکن یہ کیمپ کے بعد نصیب ہو گی اس کے بدلے میں نہیں)

۱۹۵۲ء میں ایکی بسطز کے "روسی کیمپ ڈویژن" سے، جس میں تین ہزار قیدی تھے ایک درجن کو "رہا" کر دیا گیا۔ اس وقت یہ بڑی حیرت ناک بات معلوم ہو رہی تھی۔ ۵۸ والوں کو گیٹ سے باہر جانے کی اجازت ملی! ایکی بسطز میں تین سال کی زندگی میں کسی ایک آدمی کو بھی رہائی نصیب نہیں ہوئی تھی نہ کسی کی سزا مکمل ہوئی تھی۔ ظاہر تھا کہ جو معدودے چند افراد وہ دن دیکھنے کے لیے باقی رہ گئے تھے۔ ان میں سے پہلی جنگ کے زمانے والے دس سال کے سزا یافتگان کی میعاد اب مکمل ہوئی تھی۔

ہم نے بے صبری کے ساتھ ان کے مکتوبات کا انتظار کیا۔ دو ایک خط براہِ راست یا بالواسطہ موصول ہوئے اور ہمیں پتہ چلا کہ ان میں سے تقریباً سبھی کو کیمپ سے جلاوطنی کے مقامات پر پہنچا دیا گیا تھا ہر چند کہ ان کی سزاؤں میں جلاوطنی شامل نہ تھی لیکن اس پر کسی کو تعجب نہ ہوا۔ ہمارے جیلروں کو اور ہمیں واضح طور پر معلوم تھا کہ انصاف سزا کی میعاد، رسمی کاغذات وغیرہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ سوال یہ تھا کہ جب ایک بار ہمیں دشمن تسلیم کر لیا گیا تو حکومت اس کے بعد ہمیشہ ڈنڈے کے زور سے ہمیں قابو میں رکھے گی

پامال کرے گی اور ہمارا خون چوسے گی ــــ تاوقتیکہ ہم مر نہ جائیں۔ اور ہمیں اس کی ایسی عادت پڑی ہوئی تھی کہ یہ مصائب ہمارا جزوِ بدن بن گئے تھے۔ چنانچہ دوسری کوئی صورت نہ حکومت کو مناسب معلوم ہوتی تھی نہ ہمیں۔

اسٹالن کے آخری ایام میں جلاوطنوں کی صورتِ حال تشویش کا باعث نہیں تھی بلکہ برائے نام رہائی حاصل کرنے والوں کا حشر تشویشناک تھا اُن کا جو بظاہر تو حفاظت کے ساتھ کیمپ کے دروازے سے باہر نکل گئے تھے اور جن کی اب کوئی نگرانی نہیں کی جاتی تھی۔ جن کے بارے میں لگتا تھا کہ ان پر سے ایم۔ وی۔ ڈی کا محافظ سرخ بازو ہٹ گیا تھا۔ جلاوطنی، جسے صاحبانِ اقتدار لاابالی انداز میں سزا کی ایک اور صورت تصور کرتے تھے۔ قیدی کی غیر ذمہ دارانہ عمر قید کی توسیع تھی۔ مقدر کے سہارے زندگی بسر کرنا جسے وہ اتنی محفوظ خیال کرتا تھا۔ جلاوطنی کے باعث ہمیں اپنی رہائش کے لیے کسی مقام کی تلاش کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی اور اس طرح ہم پریشان کن غیر یقینی کی کیفیت نیز خامیوں سے بچ گئے۔ انھوں نے ہمیں جس مقام پر بھیجا تھا اس کے علاوہ اور کوئی مقام ٹھیک نہیں ہوتا۔ پورے سوویٹ یونین میں وہی ایک مقام واحد تھا جہاں کوئی ہمیں دخل انداز کہہ کر ہماری مذمت نہیں کرسکتا تھا۔ وہیں ہمارے لیے تین مربع ارشن زمین* حاصل کرنے کا یقینی اور آئینی حق تھا اور اگر آپ کیمپ سے رہائی کے وقت میری طرح دنیا میں تنہا ہوں جس کا کوئی کہیں بھی انتظار نہ کر رہا ہو تو شاید جلاوطنی ہی ایک ایسا مقام تھی جہاں آپ کو کوئی ہم نفس مل سکتا تھا۔

ــــ ❖ ــــ

ہمارے آقا، لوگوں کو گرفتار کرنے میں بے حد مستعد ہیں۔ لیکن انھیں رہا کرنے کے معاملے میں اتنے مستعد نہیں ہیں اگر کسی جمہوریت پسند یونانی یا اشتراکی ترک کو اس کی سزا سے ایک دن بھی زیادہ جیل میں رکھا گیا ہوتا تو دنیا بھر کے اخبارات کو طیش آجاتا مجھے خوشی تھی کہ میں جیل میں کچھ ہی فاضل دنوں کے لیے مقید رہا تھا اور پھر رہا کر دیا گیا؟ نہیں ــــ بعد ازاں میں نگرانی میں زیرِ سفر رہا اور انھوں نے مجھے اس وقت، جو میرا اپنا تھا ایک ماہ تک عالمِ سیاحت میں رکھا۔

پھر بھی جب ہم پہرے میں جیل سے روانہ ہوئے تب بھی ہم اتنے محتاط تھے کہ جیل کے آخری توہمات کا انتظار کریں: کسی بھی حال میں اپنی آخری جیل کی طرف پلٹ کر دیکھنا غلط ہوگا (ورنہ تم واپس آؤگے) اور اپنے چمچ کے ساتھ ٹھیک سلوک کرنا ہوگا (لیکن ٹھیک سلوک کیا تھا؟ کچھ نے کہا اسے ساتھ لے جاؤ ورنہ اس کے لیے پھر پلٹنا پڑے گا، دوسروں نے کہا اسے جیل والوں کے منہ پر پھینک دو ورنہ وہ تمہارے پیچھے پڑے رہیں گے۔ میں نے اپنا چمچ فاؤنڈری میں خود ڈھالا تھا۔ چنانچہ لے کے ساتھ لے گیا!)

سفری جیلیں پھر چلنے لگیں ــــ پاولوڈار، اومسک، نووسیبرک۔ ہر چند کہ ہماری سزائیں مکمل ہو چکی تھیں لیکن انھوں نے ہماری جامہ تلاشی لی اور ممنوعہ اشیا ہم سے چھین لیں؛ ہمیں چھوٹی چھوٹی پُرہجوم کوٹھریوں میں جیل کی موٹروں میں، اسٹولی پن ریل ڈبوں میں مویشیوں کی طرح بھر دیا گیا اور وہاں ہمیں مجرموں کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ پہرے دار گئے حسبِ سابق ہم پر غرّاتے [illegible] ہاتھ سامنے رکھو" سب کچھ بعینہ پہلے کی طرح۔

پھر اومسک کی سفری جیل میں ایک اچھی فطرت والے وارڈن نے ہماری فائلوں سے ہمارے نام پکارے

اور ایک نسٹر سے آنے والے ہم پانچ افراد سے کہا: "تمہاری طرف سے کون سا دیوتا کام کر رہا ہے؟ ـــ کیوں؟ ہمیں کہاں جانا ہوگا؟" ہم ہمہ تن گوش تھے ظاہر تھا کہ کوئی اچھی جگہ ہوگی ـــ "جنوب کی طرف!" وارڈر نے اظہار حیرت کرتے ہوئے جواب دیا۔

نوفوبیرسک سے ہمیں سیچ مچ جنوب کی طرف موڑ دیا گیا۔ ہم اس جگہ جا رہے تھے جو کچھ گرم تھی۔ جہاں چاول تھا' جہاں سیب اور انگور تھے۔ اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ یقیناً سوویٹ یونین میں ہی کا مریڈ بیریا ہمارے لیے اس سے بدتر جگہ تلاش کر سکتا تھا؟ کیا جلاوطنی صرف اس نوعیت کی بات ہو سکتی ہے؟ (میرے ذہن میں پہلے ہی ایک منصوبہ تھا جو میں نے کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا کہ میں نظموں کا ایک سلسلہ شروع کروں گا جس کا عنوان ہوگا "جلاوطنی کے حسن پر چند اشعار")

درزانبول اسٹیشن پر ہمیں حسب سابق سخت انداز میں اسٹولی پن ڈبے سے ہٹا دیا گیا۔ پہریدار سپاہیوں کے جیتے جاگتے کوریڈور سے ہمیں ایک لاری پر سوار کر دیا گیا اور اس کے ننگے فرش پر بٹھا دیا گیا جیسے کہ اب اپنی سزا پوری کر لینے کے بعد ہم فرار ہو جائیں گے۔ نصف شب گزر چکی تھی اور دھندلے چاند کی روشنی ہی اس تاریک راستے کو ہماری نگاہوں پر عیاں کر رہی تھی جس پر ہم سفر کر رہے تھے۔ یہ روشنی یہ دیکھنے کے لیے کافی تھی کہ یہ واقعی ایک چوڑی سڑک ہے۔ لمبا رڈی چناروں کی! اس طرح یہ جلاوطنی تھی۔ ہم تقریباً کریمیا میں ہوں گے۔ فروری کا آخری دور تھا اور ارتش پر' جہاں سے ہم آئے تھے' بے حد سردی تھی لیکن یہاں بسنتی ہوا ہمارا استقبال کر رہی تھی۔

وہ ہمیں جیل میں لے گئے اور وہاں ہمیں رائج العام جامہ تلاشی اور غسل کے بغیر ہی داخل کر لیا گیا کم بخت دیواروں کی سختی کچھ کم ہونے لگی تھی۔ صبح ملاک سپرنٹنڈنٹ نے دروازے کا تالا کھولا اور تقریباً سرگوشی میں کہا "باہر آؤ اور اپنا تمام سامان ساتھ لاؤ!"

شیطان اپنے پنجے ڈھیلے کر رہا تھا۔

باہر نکل کر ہم بہار کی ایک گلابی صبح کی آغوش میں پہنچ گئے۔ موسم گرما کی روشنی جیل کی اینٹ کی دیواروں کو حرارت بخش رہی تھی۔ یارڈ کے وسط میں ایک لاری ہماری منتظر تھی اور دو زیک' جو ہماری پارٹی میں جانے والے تھے' پہلے ہی اس میں بیٹھے تھے۔ یہ گہری سانسیں لینے کا' چہار سمت نگاہ ڈالنے کا' اس لمحے کی بیکرانی میں اپنے وجود کو سرابور کر لینے کا وقت تھا۔ لیکن ہم متعارف ہونے کا موقع یونہی ضائع کرنے والے نہ تھے ہمارے نئے ساتھیوں میں سے ایک چھریرے بدن کا سپید بالوں والا کافی بڑا آب نگاہوں سے ہمیں دیکھتے ہوئے' اپنے مڑے تڑے سامان پر اس شان کے ساتھ بیٹھا تھا جیسے زار ابھی سفیروں کو ملاقات کا شرف بخشنے والا ہو۔ آپ سوچ سکتے تھے کہ وہ بہرا یا غیر ملکی ہے اور ایک دوسرے کی زبان جاننے کی کوئی توقع نہیں۔ جیسے ہی میں لاری میں سوار ہوا میں نے اس کے ساتھ گفتگو کرنے کا تہیہ کر لیا ـــ اور اس نے بے عیب روسی زبان میں پرسکون آواز میں اپنا تعارف پیش کیا: "میں ولاڈیمیر الیگزنڈرووچ واسلئیف ہوں!"

اور ہم دونوں کے درمیان ہمدردی کے ایک شرر کا لیں دین ہوا۔ دل پہچان لیتا ہے کہ کون دوست ہے اور کون دوست نہیں ہے۔ وہ دوست تھا۔ جیل میں لوگوں کے بارے میں جلد نتیجہ نکالنا ہوتا ہے۔ کیوں آپ جانتے ہیں کہ ایک منٹ میں ہی آپ کو جدا کر دیا جائے گا۔ نہیں۔ اب ہم یقیناً جیل میں نہیں تھے لیکن پھر بھی.....

انجن کی آواز نے بلند لہجے میں، میں نے اس سے تبادلۂ خیال کیا اور یہ لحاظ نہیں کیا کہ لاری جیل کی پختہ چکنی سڑک سے پتھروں کی بنی ہوئی راہ پر آگئی تھی اور یہ بھی فراموش کر چکا تھا کہ مجھے اپنی آخری جیل کو پلٹ کر نہیں دیکھنا ہے (ابھی اور کتنی آخری جیلیں ہوں گی) اس بیرونی دنیا پر ایک نظر بھی نہیں ڈالی جس میں ہم سفر کر رہے تھے —— اور جلد ہی ہم ایک صوبائی ایم۔ وی۔ ڈی کی چوکی کے دیہی اندرونی احاطے میں پلٹ آئے۔ اور ایک بار پھر ہم پر اسے چھوڑ کر باہر نہ جانے کی پابندی عائد کر دی گئی۔

ایک منٹ تو آپ کو ولاڈیمیر الیگزینڈروچ نوّے سال کا لگتا، اس کی آنکھیں وقت سے آگے دیکھ رہی تھی اس کے تیکھے نقوش، اس کا سفید بالوں والا گچھا، سب ایک ہی بات کہہ رہے تھے۔ دراصل وہ "بہتر" کا تھا۔ وہ قدیم ترین روسی انجینئروں میں سے تھا جو تاحال بقیدِ حیات تھے۔ ہمارے "روسی انجینئروں کی یونین" میں وہ سب سے ممتاز ہائیڈرو الیکٹریشن اور ماہرین آب میں سے تھا (یہ یونین کیا چیز تھی؟ میں نے قبل ازیں اس کا نام کبھی نہ سنا تھا۔ یہ اعلیٰ ترین ٹیکنیکل افراد کی قائم کردہ اعلیٰ اختیارات کی حامل عوامی یونین تھی۔ شاید وہ مستقبل میں سو برس کی زقندوں میں سے ایک تھی جو روس نے اس صدی کے اوائل میں کئی مرتبہ لگائیں لیکن سب کی سب ناکام ہو گئیں) واسیلئیف اس کا اہم رکن تھا اور اب وہ بڑے پرسکون اور مطمئن انداز میں بتاتا تھا کہ کس طرح "ہم نے یہ نمائش کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ مجور خشک لکڑیوں سے پیدا کیے جا سکتے ہیں!"

اسی وجہ سے تو ان کی تنظیم شکست کر دی گئی۔

نصف صدی قبل اس نے پاپیادہ یا گھوڑے پر سینیر میں ترے علاقے کا چپہ چپہ چھان مارا تھا، جس پر اب ہم سفر کر رہے تھے۔ بہت پہلے، پہلی عالمگیر جنگ سے بھی پہلے اس نے منصوبے بنائے تھے جس میں جو ئینک وادی کو سیلاب سے پُر کرنے، ناریین آبشار کی تعمیر اور چوٹیلی پہاڑوں میں سے ایک سرنگ گزارنے کا بندوبست شامل تھا اور پہلی عالمی جنگ سے پہلے ہی اس نے ان پر عملدرآمد شروع کر دیا تھا اس نے بیرونی ممالک کو بجلی کی چھ کھدائی مشینوں کے آرڈر دیے تھے اور ۱۹۱۲ء میں ہی انھیں دنیا کے اس حصے میں کام پر لگا دیا گیا تھا (وہ چھ کی چھ مشینیں انقلاب کے بعد بھی موجود رہیں اور چوتھی دہائی میں چیرچک اسٹرائی میں انھیں ایک نئی سوویٹ ایجاد کہہ کر پیش کر دیا گیا) "تخریبی سرگرمیوں" کے الزام میں پندرہ سال کی سزا کاٹنے کے بعد (آخری تین سال وہ خفیہ یورالسک کی قید تنہائی میں) اسے ایک خصوصی رعایت حاصل ہوئی تھی۔ سمبیرنجی میں اس جگہ اپنا جلاوطنی کا دور گزارنے اور مرنے کی اجازت، جہاں اس نے اپنی زندگی کا سفر شروع کیا تھا (یہ عنایت بھی اس پر نہ کی گئی ہوتی اگر بیریا اسے تیسری دہائی سے نہ جانتا ہوتا، جب انجینئر واسیلئیف نے کارشمس ندی کا پانی تین جمہوریوں تک پہنچایا تھا۔)

اور اسی وجہ سے وہ اب اسفنکس (دو منہ والے شیر) کی طرح ایک لاری کے عقبی حصے میں ایک بورے پر براجمان اپنے تصورات میں غرق تھا۔ اس کے لیے یہ اس کی آزادی کا پہلا دن ہی نہیں تھا بلکہ اپنے عہدِ شباب کی سرزمین، اپنی ترغیب دہندہ سرزمین پر واپسی کا سفر تھا۔ نہیں اگر یادگاریں تمام راستے میں بنی ہوں تو انسانی زندگی کا دائرہ اتنا تنگ نہیں معلوم ہوتا۔

ایک چھوٹو پیٹر ہی واسیلئیف کی بیٹی ماسکو میں ادبائے ہم افسانوں کی نمائشی کھڑکی سے "ٹروڈ"

(ٹریڈ یونین اخبار) پر ایک نگاہ ڈالنے کے لیے ٹھیری۔ کسی حوصلہ مند نامہ نگار نے چولمک وادی میں اپنے سفر کا ولولہ خیز بیان شائع کیا تھا جس میں تخلیقی صلاحیتوں کے حامل بوانتویکوں نے آبپاشی کرکے اسے نئی زندگی عطا کی تھی۔ ناریں آب کا بھی ذکر کیا گیا تھا۔ شاندار ہائیڈرٹیکنیکل اداروں، آلات اور خوش حال اشتراکی کسانوں کا ذکر بھی مضمون میں شامل تھا۔ اور دفعتاً کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی ہوگی۔ اس نے بات ان الفاظ پر ختم کی "لیکن معدودے چند افراد ہی واقف ہیں کہ اس تلب ماہیت، عظیم روسی انجینئر واسیلئیف کے خوابوں کی تعبیر ہے جسے گزشتہ نوکرشاہی روس میں کوئی امداد نہیں مل سکی تھی۔" کتنے افسوس کا مقام ہے کہ وہ ولولہ خیز نوجوان اپنے شاندار خیالات کی فتح دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہا؟ اخبار کی وہ قیمتی سطور دھندلی پڑ گئیں، آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔ واسلئیف کی بیٹی نے اخبار کو اس کے کیس سے نوچ لیا، اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی جبکہ ملیشیا کا ایک سپاہی اسے پیچھے سے سیٹی بجا کر بلاتا رہا۔

ادھر یہ سب ہو رہا تھا اور ادھر وہ "پرجوش نوجوان" ورخنے یورالسک کی قید تنہائی میں سیلن بھری کوٹھری میں بیٹھا تھا۔ روماٹزم یا ایسے ہی کسی مرض سے اس کی پشت خمیدہ ہو گئی تھی اور اب وہ اپنی ریڑھ کی ہڈی سیدھی نہیں کر سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے کوٹھری میں وہ تنہا نہیں تھا۔ بلکہ اس میں کچھ سویڈن کے باشندے اور دیگر لوگ بھی تھے جنھوں نے اس کی ریڑھ کی تکلیف کا علاج مالش سے کیا۔

سویڈن والے جیلوں میں عام طور پر نظر نہیں آتے۔ مجھے یاد ہے کہ میں بھی ان میں سے ایک کے ساتھ رہ چکا تھا۔ اس کا نام ایرک تھا۔

"ایرک ارووڈ اینڈرسن؟" واسیلئیف نے جلدی سے ٹوکتے ہوئے دریافت کیا (وہ بولنے اور چلنے میں بڑی تیزی برتتا تھا)

بے شک، یہی بات تھی۔ ارووڈ نے ہی مالش کے ذریعے اس کا مرض دور کیا تھا! یہ مجمع الجزائر کی ایک یادگار ہے بطور کلمۂ رخصت کے، کہ آخر دنیا چھوٹی سی رہ گئی ہے۔ تین سال قبل وہ ارووڈ کو نہیں لے گئے تھے۔ یورالسک قید تنہائی میں ـــ اور کسی نہ کسی طرح نہ تو نا لوڈ (ناریتھا ایٹلانٹک ٹریٹی آرگنائزیشن) اور نہ اس کے کروڑپتی والد نے اپنے نور چشم کو بچانے کے لیے کوئی خاص کوشش کی تھی۔

اس اثنا میں انھوں نے ہمیں صوبائی کمانڈ میں طلب کرنا شروع کر دیا تھا جو اس وقت ایم۔ وی۔ ڈی پارٹی میں تھا اور اس میں کرنل، ایک میجر اور سیکنڈ لیفٹننٹ تھے جو ڈزانوں او بالسٹ میں، تمام جلاد وطنوں کے انچارج تھے لیکن کرنل تک ہماری رسائی نہ ہوتی اور میجر صرف ہمارے چہروں پر نظر ڈالتا تھا۔ جیسے وہ اخبار کی شاہ سرخیاں ہوں اور لیفٹننٹوں نے ہماری باہمی ملاقی کے کام میں اپنی خوش خلقی کی مہارت کا مظاہرہ کیا۔

میرے کیمپ کے تجربے نے پسلی میں اچانک تیزی سے چبھو دی۔ دیکھو بھئی! ان چند ہی منٹوں میں تمہارے مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ اب وقت ضائع نہ کرو! مطالبہ کرو، اصرار کرو، احتجاج کا مظاہرہ کرو، اپنے دماغ پر زور دو، اپنی پوری صلاحیتیں صرف کرو، کوئی سبب، کوئی بھی حیلہ تراش لو کہ تمہارے لیے کس وجہ سے سوبے کے صدر مقام میں ہی قیام کرنا لازمی ہے یا سب سے قریبی اور سہولت بخش ضلع میں رہنا ضروری ہے۔ لیکن پوچھئے تو ایک مناسب سبب موجود بھی تھا اگرچہ میں اسے نہیں جانتا تھا۔ مجھ میں دو سال

سے، کیمپ میں میرے نامکمل آپریشن کے بعد سے افزائش مرض کے آثار پیدا ہو رہے تھے)

نہیں..... اب میں وہ آدمی نہیں تھا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ اب میں وہ آدمی تھا جو اپنی سزا کے آغاز میں تھا ایک نوع کی ترغیب آمیز بے حسی میں مجھ میں پیدا ہو گئی تھی اور میں نے اپنے آپ کو بخوشی اس کے ہاتھوں میں دے دیا تھا۔ مجھے اپنے بدنصیب کیمپ کے تجربے کا فائدہ نہ اٹھانے سے مسرت کا احساس ہوا۔ مجھے کوئی تحقیر آمیز اور افلاس زدہ بہانہ تراشنے کے خیال سے بھی گھن آتی تھی۔ کسی آدمی کو مستقبل کا علم نہیں۔ اچھی سے اچھی جگہ پر بھی بڑی سے بڑی مصیبت آسکتی ہے اور بڑی سے بڑی جگہ پر بھی بڑے سے بڑا عیش میسر آسکتا ہے۔ جو بھی ہو، مجھے سوال پوچھنے اور یہ معلوم کرنے کا وقت بھی نہ ملا تھا کہ صوبے میں کون کون سے اضلاع اچھے ہیں اور کون سے مقامات خراب ہیں کیوں کہ میں بوڑھے انجینئر کے مستقبل کے بارے میں وسوسوں میں مبتلا رہا تھا۔

اس کے کاغذات میں کچھ رعایت والی بات تھی کیوں کہ انھوں نے اسے اپنے ہی دو پیروں پر چل کر شہر چلے جانے کی اجازت دے دی۔ صوبے کے شعبۂ آبپاشی و تعمیر کے دفتر میں جا کر کام تلاش کرنے کی اسے اجازت مل گئی۔ بقیہ ہم سب کے لیے صرف ایک منزل تھی ——— کو کیٹریک ضلع۔ یہ صوبے کے شمال میں، جہاں صوبے کا بے جان بیٹ پاک ڈالہ شروع ہوتا ہے وہاں ایک ریگستانی قطعہ ہے جو قازقستان کے پورے وسطی حصے پر محیط ہے۔ جن انگوروں کے ہم خواب دیکھ رہے تھے ان کے بارے میں اتنا ہی کافی ہو گا.....

کھُردُرے بھورے کاغذ کا ایک مطبوعہ فارم ہم سب کے سامنے دستخط کے لیے رکھا گیا۔ فارموں پر بد خطی کے ساتھ ہر ایک کا نام درج تھا اور تاریخ کی مہر ثبت تھی۔

اس نوع کی کسی چیز سے میرا سابقہ کہاں پڑا تھا؟ بے شک، جب انھوں نے مجھے خصوصی بورڈ کے فیصلے کی اطلاع دی تھی اس وقت بھی مجھے اس کے علاوہ اور کچھ کرنے کو نہیں کہا گیا تھا کہ قلم اٹھاؤ اور اس پر دستخط کرو۔ فرق اتنا ہی تھا کہ اس وقت وہ ماسکو کا چکنا کاغذ تھا لیکن قلم اور سیاہی یکساں طور پر سستے اور بھدّے تھے۔

مجھے اس دن کس بات کی اطلاع دی گئی تھی؟ کہ میں اس میں مذکورہ شخص، مستقل طور پر فلاں فلاں ضلع میں۔ ایم۔ جی۔ بی کی کھلی نگرانی میں (وہی قدیم زارشاہی لفظیات) جلا وطن کیا گیا ہوں، اور ضلع کی سرحدوں سے باہر اجازت کے بغیر جانے پر مجھے سپریم سوویٹ کی مجلس صدارت کے احکام کے مطابق ملزم سمجھا جائے گا جس میں بیس سال کی قید با مشقت دی جا سکتی ہے۔

اس میں کہنے کو کیا رہ جاتا ہے؟ یہ سب کچھ اندر مدن قانون تھا۔ یہاں ہمارے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ ہم نے تیزی کے ساتھ دستخط کر دیے۔ [ه]

دفعہ ۳۵ میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ کسی کو بھی عدالت کے مخصوص فیصلے کے بغیر جلا وطن نہیں کر سکتے یا کم از کم کسی خصوصی بورڈ کے حکم کے بغیر! لیکن یہ تو اسپیشل بورڈ بھی نہیں تھا۔ یہ تو صرف ڈیوٹی پہ تعینات لیفٹننٹ تھا جس نے ہمارے لیے مستقل جلا وطنی مقرر کر دی۔

ایک خود کلامی کی کیفیت میرے اندر پیدا ہو گئی۔ مجھے تسلیم ہے یہ طویل خود کلامی تھی۔
محض کاغذ، ہتھوڑے کی سی سرعت کے ساتھ۔

رٹریڈ یونین اخبار) پر ایک نگاہ ڈالنے کے لیے ٹھیری۔ کسی حوصلہ مند نامہ نگار نے چولنک وادی میں اپنے سفر کا ولولہ خیز بیان شائع کیا تھا جس میں تخلیقی صلاحیتوں کے حامل نوجوانوں نے آبپاشی کرکے اسے نئی زندگی عطا کی تھی۔ ناریں آبشار کا بھی ذکر کیا گیا تھا۔ شاندار ہائیڈرو ٹیکنیکل اداروں، آلات اور خوش حال اشتراکی کسانوں کا ذکر بھی مضمون میں شامل تھا۔ اور دفعتاً کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی ہوگی۔ اس نے بات ان الفاظ پر ختم کی "لیکن معدودے چند افراد ہی واقف ہیں کہ اس مطلب ماہیت، عظیم روسی انجینئر واسیلئیف کے خوابوں کی تعبیر ہے جسے گزشتہ نوکر شاہی روس میں کوئی امداد نہیں ملی تھی۔"[1] کتنے افسوس کا مقام ہے کہ وہ ولولہ خیز نوجوان اپنے شاندار خیالات کی فتح دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہا؟ اخبار کی وہ قیمتی سطور دھندلی پڑ گئیں، آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔ واسلئیف کی بیٹی نے اخبار کو اس کے کیس سے نوچ لیا، اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی جبکہ ملیشیا کا ایک سپاہی اسے پیچھے سے سیٹی بجا کر بلاتا رہا۔

ادھر یہ سب ہو رہا تھا اور ادھر وہ "پرجوش نوجوان" درخنے یورال سک کی قید تنہائی میں سیلن بھری کوٹھری میں بیٹھا تھا۔ روماٹزم یا ایسے ہی کسی مرض سے اس کی پشت خمیدہ ہو گئی تھی اور اب وہ اپنی ریڑھ کی ہڈی سیدھی نہیں کر سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے کوٹھری میں وہ تنہا نہیں تھا۔ بلکہ اس میں کچھ سویڈن کے باشندے اور دیگر لوگ بھی تھے جنھوں نے اس کی ریڑھ کی تکلیف کا علاج مالش سے کیا۔

سویڈن والے جیلوں میں عام طور پر نظر نہیں آتے۔ مجھے یاد ہے کہ میں بھی ان میں سے ایک کے ساتھ رہ چکا تھا۔ اس کا نام ایرک تھا۔

"ایرک ارووڈ اینڈرسن؟" واسیلئیف نے جلدی سے ٹوکتے ہوئے دریافت کیا (وہ بولنے اور چلنے میں بڑی تیزی برتتا تھا)

بے شک، یہی بات تھی۔ ارووڈ نے ہی مالش کے ذریعے اس کا مرض دور کیا تھا! یہ مجمع الجزائر کی ایک یادگار ہے بطور رکلنڑ رخصت کے، کہ آخر دنیا چھوٹی سی رہ گئی ہے۔ تین سال قبل وہ ارووڈ کو نہیں لے گئے تھے۔ یورال سک قید تنہائی میں ـــ اور کسی نہ کسی طرح نہ تو نالوڈ (نارتھ اٹلانٹک ٹریٹی آرگنائزیشن) نے نہ اس کے کروڑ پتی والد نے اپنے نور چشم کو بچانے کے لیے کوئی خاص کوشش کی تھی۔[2]

اس اثنا میں انھوں نے ہمیں صوبائی کمانڈ میں طلب کرنا شروع کر دیا تھا جو اس وقت ایم۔ وی۔ ڈی بارنہ ہا میں تھا اور اس میں کرنل، ایک میجر اور ٹو لیفٹننٹ تھے جو ڈزانبول اوبلاسٹ میں تمام جلاوطنوں کے انچارج تھے لیکن کرنل تک ہماری رسائی نہ ہوئی اور میجر صرف ہمارے چہروں پر نظر ڈالتا تھا۔ جیسے وہ اخبار کی شہ سرخیاں ہوں اور لیفٹننٹوں نے ہمارے ساتھ ملاقاتوں کے کام میں اپنی خوش خلقی کی مہارت کا مظاہرہ کیا۔

میرے کیمپ کے تجربے نے پسلی میں اپنی رانی تیزی سے چھوڑ دی۔ دیکھو بھئی! ان چند ہی منٹوں میں تمہارے پورے مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ اب وقت ضائع نہ کرو! مطالبہ کرو، اصرار کرو، احتجاج کا مظاہرہ کرو اپنے دماغ پر زور دو، اپنی پوری صلاحیتیں صرف کر دو، کوئی سبب، کوئی بھی حیلہ تراش لو کہ تمہارے لیے کس وجہ سے صوبے کے صدر مقام میں ہی قیام کرنا لازمی ہے یا سب سے قریبی اور سہولت بخش ضلع میں رہنا ضروری ہے۔ (رہتے ہو پہنچ تو ایک مناسب سبب تو موجود بھی تھا اگرچہ میں اسے نہیں جانتا تھا۔ مجھ میں دو سال

سے، کیمپ میں میرے نامکمل آپریشن کے بعد سے افزائشِ مرض کے آثار پیدا ہو رہے تھے)

نہیں..... اب میں وہ آدمی نہیں تھا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ اب میں وہ آدمی تھا جو اپنی سزا کے آغاز میں تھا ایک نوع کی ترغیب آمیز بے حسی میں مجھ میں پیدا ہو گئی تھی اور میں نے اپنے آپ کو بخوشی اس کے ہاتھوں میں دے دیا تھا۔ مجھے اپنے بدنصیب کیمپ کے تجربے کا فائدہ نہ اٹھانے سے مسرت کا احساس ہوا۔ مجھے کوئی تحقیر آمیز اور افلاس زدہ بہانہ تراشنے کے خیال سے کبھی گھن آتی تھی۔ کسی آدمی کو مستقبل کا علم نہیں۔ اچھی سے اچھی جگہ پر بھی بڑی سے بڑی مصیبت آسکتی ہے اور بڑی سے بڑی جگہ پر بھی بڑے سے بڑا عیش میسر آسکتا ہے۔ جو بھی ہو، مجھے سوال پوچھنے اور یہ معلوم کرنے کا وقت بھی نہ ملا تھا کہ صوبے میں کون کون سے اضلاع اچھے ہیں اور کون سے مقامات خراب ہیں کیوں کہ میں بوڑھے انجینئر کے مستقبل کے بارے میں وسوسوں میں مبتلا رہا تھا۔

اس کے کاغذات میں کچھ رعایت والی بات تھی کیوں کہ انھوں نے لے اپنے ہی دو پیروں پر چل کر شہر چلے جانے کی اجازت دے دی، صوبے کے شعبۂ آبپاشی و تعمیر کے دفتر میں جا کر کام تلاش کرنے کی لے اجازت مل گئی۔ بقیہ ہم سب کے لیے صرف ایک منزل تھی ـــــ کوکیریٹک ضلع۔ یہ صوبے کے شمال میں، جہاں صوبے کا بے جان بیٹ پاک ڈالہ شروع ہوتا ہے وہاں ایک ریگستانی قطعہ ہے جو قازقستان کے پورے وسطی حصے پر محیط ہے۔ جن انگوروں کے ہم خواب دیکھ رہے تھے ان کے بارے میں اتنا ہی کافی ہو گا.....

کھر دُرے بھورے کاغذ کا ایک مطبوعہ فارم ہم سب کے سامنے دستخط کے لیے رکھا گیا۔ فارموں پر بد خطی کے ساتھ ہر ایک کا نام درج تھا اور تاریخ کی مہر ثبت تھی۔

اس نوع کی کسی چیز سے میرا سابقہ کہاں پڑا تھا؟ بے شک، جب انھوں نے مجھے خصوصی بورڈ کے فیصلے کی اطلاع دی تھی اس وقت بھی مجھے اس کے علاوہ اور کچھ کرنے کو نہیں کہا گیا تھا کہ قلم اٹھاؤ اور اس پر دستخط کرو۔ فرق اتنا ہی تھا کہ اس وقت وہ ماسکو کا چکنا کاغذ تھا لیکن قلم اور سیاہی یکساں طور پر سستے اور بھدے تھے۔

مجھے اس دن کس بات کی اطلاع دی گئی تھی؟ کہ میں اس میں مذکورہ شخص، مستقل طور پر فلاں فلاں ضلع میں۔ ایم۔ جی۔ بی کی کھلی نگرانی میں (وہی قدیم زارشاہی لفظیات) جلا وطن کیا گیا ہوں اور ضلع کی سرحدوں سے باہر اجازت کے بغیر جانے پر مجھے سپریم سوویٹ کی مجلس صدارت کے احکام کے مطابق ملزم سمجھا جائے گا جس میں بیس سال کی قید بامشقت دی جا سکتی ہے۔

اس میں کہنے کو کیا رہ جاتا ہے؟ یہ سب کچھ اندرونِ قانون تھا۔ یہاں ہمارے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ ہم نے تیزی کے ساتھ دستخط کر دیئے۔

دفعہ ۳۵ میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ کسی کو بھی عدالت کے مخصوص فیصلے کے بغیر جلا وطن نہیں کر سکتے یا کم از کم کسی خصوصی بورڈ کے حکم کے بغیر! لیکن یہ تو اسپیشل بورڈ بھی نہیں تھا۔ یہ تو صرف ڈیوٹی پر تعینات لیفٹننٹ تھا جس نے ہمارے لیے مستقل جلاوطنی مقرر کر دی۔

ایک خود کلامی کی کیفیت میرے اندر پیدا ہو گئی۔ مجھے تسلیم ہے یہ طویل خود کلامی تھی۔

محض کاغذ، ہتھوڑے کی سی سرعت کے ساتھ۔

یہ مستقبل کی مسرتوں کے نازک خوابوں کو چکنا چور کر دیتا ہے۔
میں نے پڑھا: ہمیشہ کے لیے جلا وطن،
سپانگ پر ایم۔جی کا پہرہ ہوا کرے گا۔
پھر بھی میں نے اطمینان سے دستخط کر دیے۔
میرا دل ہلکا ہو گیا۔
آلپس، بالسلٹس یا آسمان کی مانند۔
ستاروں کی طرح (نہیں، تمہارے شانے پر ٹکے ہوئے ستاروں کی طرح چمکدار نہیں)
اے قابلِ رشک نصیب، میں مستقل ہوں۔
لیکن سوچتا ہوں کیا واقعی۔ یہ ہر لفظ سچا ہوگا!
کیا واقعی ایم۔جی۔بی مستقل ہو سکتی ہے؟

جب ولاڈیمیر انگیژنیڈر روپع شہر سے لوٹا تو میں نے اسے اپنا نغمہ سنایا اور ہم ہنسے۔ بچوں کی طرح قیدیوں کی طرح، معصوم لوگوں کی طرح خندہ زن ہوئے۔ ولاڈیمیر کی ہنسی نہایت بے لوث تھی۔ کے۔ آئی اسڑاخودیچ کی ہنسی کی مانند۔ اصل میں ان دونوں میں ایک ظاہری مماثلت تھی۔ وہ دونوں ہی ذہنی زندگی گزارنے میں اتنی گہرائی تک جا پہنچے تھے کہ اب کوئی بھی جسمانی تکلیف ان کے ذہنی توازن کو خراب نہیں کر سکتی تھی۔

یہ بات نہیں تھی کہ اب بھی ہنسنے کے لیے اس کے پاس وجوہات ہوں۔ انھوں نے ایک غلطی کی تھی۔ جس کی ان سے توقع بھی تھی۔ اور اسے یقینی طور پر غلط جگہ کے لیے جلا وطن کر دیا گیا تھا صرف فرد نزے جا کر اسے وادی چو نسک میں کام دیا جا سکتا تھا۔ جہاں اس کے گزشتہ کارناموں کے مقامات تھے! یہاں ہائیڈرولک انجینئرنگ اتھارٹی کا تعلق صرف آبپاشی کی نہروں سے تھا۔ اس کا سربراہ ایک مغرور اور نیم تعلیم یافتہ قازق تھا جس نے ازراہ کرم چو ٹیک طریق آبپاشی کے موجد کو اپنے دفتر میں دروازے پر ایستادہ رہنے کی اجازت دے دی۔ علاقائی پارٹی ہیڈ کوارٹر کو ٹیلی فون کیا اور ولاڈیمیر کو جونیر ہائیڈرو الیکٹرک انجینئر کے منصب پر فائز کرنے پر رضامند ہو گیا جیسے کہ وہ ابھی ابھی ٹیکنیکل اسکول کا امتحان پاس کر کے آنے والی کوئی کمسن لڑکی ہو۔ لیکن فرونزے وہ نہیں جا سکتا تھا کیوں کہ اس کا تعلق دوسری جمہوریہ سے تھا۔ کیا ہم روس کی پوری تاریخ صرف ایک فقرے میں ادا کر سکتے ہیں؟ وہ حبس دم میں مبتلا کر دینے والے حالات کی سرزمین ہے!

پھر بھی بوڑھا آدمی اپنے ہاتھ ملتا ہے، سائنسداں اس کے نام سے واقف ہیں۔ شاید وہ اس کا تبادلہ کرا دیں۔ وہ بھی اس دستاویز پر دستخط کر دیتا ہے جس پر طبع ہے کہ اسے مستقل طور پر جلا وطن کیا جا رہا ہے اور کہ اگر وہ فرار ہوا تو اسے ترانوے سال کی عمر تک قید با مشقت کی سزا دی جائے گی۔ میں اس کا سامان سپانگ تک پہنچاتا ہوں۔ مجھے اس حدِ فاصل کو پار کرنے کی ممانعت ہے اب وہ کوئی ایسا رحم دل آدمی تلاش کرے گا جو اسے کسی کمرے کا ایک گوشہ کرائے پر دے دے اور وہ ماسکو سے اپنی عمر رسیدہ بیوی کو بلانے کی دھمکی دیتا ہے۔ اس کے بچے؟...... اس کے بچے نہیں آئیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ

ہم ماسکو کے اپنے فلیٹ نہیں چھوڑ سکتے۔ کوئی اور عزیز؟ اس کا ایک بھائی ہے۔ لیکن اس کے بھائی کا مقدر بہت ہی خراب رہا ہے۔ وہ تاریخ داں ہے جس نے انقلاب اکتوبر کا غلط مفہوم اخذ کیا ہے، اپنا وطن ترک کر دیا اور اب بدنصیب کولمبیا یونیورسٹی میں بائزنٹائن مطالعات کے صدر شعبہ کی کرسی سنبھالے بیٹھا ہے۔ ہم پھر ہنستے ہیں۔ اس کے بھائی کی درگت پر احساسِ تاسف کرتے ہیں اور الوداع کہتے ہوئے بغل گیر ہوتے ہیں۔ ایک اور ممتاز ہستی میرے نزدیک روشنی بکھیر کر ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گئی۔

ہم باقیماندہ لوگوں کو کسی وجہ سے کئی دن تک ایک چھوٹے سے کمرے میں رکھا گیا۔ جس میں ہم ایک کھردرے ٹوٹے ہوئے فرش پر ایک دوسرے سے لپٹ کر سوتے تھے اور وہاں ہمارے پاؤں پھیلانے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ یہاں مجھے وہ کوٹھری یاد آ گئی جس میں میں نے آٹھ سال پہلے اپنی سزا کا آغاز کیا تھا۔ ہم اب ضمنی قیدی تھے اور رات کو ہمیں بند کر دیا جاتا تھا۔ اور ہم سے کہا جاتا تھا کہ اگر چاہیں تو رفع حاجت کے لیے بالٹی اندر رکھ لیں۔ اس میں جیل سے اتنا ہی فرق تھا کہ ان تھوڑے سے دنوں میں کھانا اب ہمیں مفت نہیں دیا جاتا تھا۔ بلکہ ہمیں بازار سے آنے والی اشیائے خوردنی کی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی!

تیسرے دن ایک باقاعدہ پہرے دار پارٹی، جس کے پاس کاربائنیں (ایک قسم کی بندوق) تھیں، آ پہنچی۔ اس نے ہم سے سفر خرچ اور راشن کے لیے دستخط کرائے اور ہمیں سفر خرچ کے طور پر ملنے والی رقم فوراً واپس لے لی (کہا گیا کہ ٹکٹ خریدنے ہیں۔ لیکن دراصل انھوں نے ٹرین کے کنڈکٹروں کو دھمکایا کہ ہمیں مفت سفر کرنے دیں اور پیسہ اپنی جیبوں میں ڈال لیا۔ یہ سمجھ کر کہ یہ ان کی کمائی ہے) ہمیں اپنے سامان کے ساتھ دو دو کی قطاروں میں کھڑا کیا گیا اور ہمیں ایک مرتبہ پھر چار رور کی قطاروں کے درمیان سے اسٹیشن لے گئے۔ ہمیں اپنے بھراؤ دار کپڑوں میں سردی محسوس ہو رہی تھی لیکن ہم خوش تھے کہ جنوب میں تھے دیگر لوگوں کے خیالات مختلف ہو سکتے ہیں لیکن قیدیوں اور جلاوطنوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت شدید ترین سردی ہوتی ہے۔

تمام دن ہمیں آہستہ آہستہ اس سمت لے جایا گیا۔ جب سے ہم آئے تھے بلھرچو کے اسٹیشن سے ہمیں دس کلومیٹر کا فاصلہ تیزی کے ساتھ پیدل طے کرنا پڑا۔ اپنے بوروں اور صندوقوں کی وجہ سے ہمیں بے حد پسینہ آتا تھا۔ ہم بوجھ سنبھال نہ پاتے تھے، ٹھوکریں کھاتے تھے لیکن پھر ہم انھیں آگے کھینچے لیے جاتے تھے۔ ہماری نحیف و لاغر نیم جاں بدن کیمپ کے گارڈ ہاؤس سے ادھر ساتھ آنے والے ایک ایک چیتھڑے کے لیے شکر گزار ہوں گے۔ میں نے بھراؤ والی دو جیکٹیں پہن رکھی تھیں (ایک یہ نہ اتنا ک چیکنگ کے دوران پار کر دی تھی) اور ساتھ ہی اپنے عرصے سے تکلیف اٹھانے والے فوجی گریٹ کوٹ بھی، جو خندقوں اور کیمپ کی مٹی سے تار تار ہو گیا تھا، پہن رکھا تھا ــ اس بدرنگ اور غلیظ پرانی چیز کو سیلاب میں کس طرح پھینک سکتا تھا۔

دن قریب الختم تھا اور ہم اپنی منزل پر نہیں پہنچے تھے ایک ہی مطلب تھا اس کا، ایک اور رات نوفرزڈنیک کی جیل میں بسر ہو گی۔ ہم اتنے عرصے سے رہا ہو چکے تھے پھر بھی ہم ایک سے دوسری جیل میں بھٹک رہے تھے۔ کوٹھری، ننگا فرش، جھانکنے کا سوراخ، بالٹی کا استعمال، ہاتھ پشت پر، بے مزہ ہمارا گرم پانی۔ صرف ایک چیز انھوں نے بند کر دی، وہ تھا ہمارا راشن، کیوں کہ اب ہم آزاد آدمی تھے۔

صبح انھوں نے ایک لاری بھیجی اور دو ہی پہرے والے، ایک رات بیرکوں سے باہر رہ چکنے کے بعد وہ ہمیں

پھر پہنچے آئے۔ اسٹیپی اور اندر ساٹھ کلو میٹر جانا ہے۔ ہم دلدلی گڑھوں میں پھنس گئے اور لاری سے کود پڑے (زنیک ہوتے تو یہ کام ہم کبھی نہ کرتے!) تاکہ سانس لیں اور لاری کو دلدل سے باہر نکالیں اور یہ مہم جیسا سفر مکمل کریں اور جلد از جلد مستقل جلاوطنی میں پہنچ جائیں۔ پہرہ دار سپاہی نصف دائرہ بنا کر کھڑے تھے اور ہماری نگرانی کر رہے تھے۔

اسٹیپی ایک ایک کلو میٹر کر کے تیزی سے گزرتی گئی۔ داہنی طرف، بائیں جانب، جہاں تک نگاہ جاتی تھی وہاں تک سخت سرمئی ناقابلِ خوردنی گھاس کے سوا کچھ بھی نہ تھا اور کہیں کہیں درختوں کے درمیان کوئی خستہ حال قازق گاؤں نظر آجاتا تھا۔ کافی دُور، چناروں کی چوٹیوں پر (کوکٹیریک کا مطلب ہے "سبز جہاز") ہمارے سامنے اسٹیپی کے موڑ نظر آئے

ہم آپہنچے تھے! لاری چیچین اور قازق لوگوں کے کچے جھونپڑوں کے درمیان سے گزر کر رہی تھی اور غضبناک کُتے بھونکتے ہوئے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ سیدھے سادے خچر، جو چھوٹی چھوٹی گاڑیوں میں جُتے تھے، ہمارے لیے راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ ایک احاطے سے ایک اونٹ نے آہستہ آہستہ بڑے لاابالی انداز میں ہماری طرف دیکھنے کے لیے گردن گھمائی۔ مرد بھی تھے لیکن ہماری توجہ کا مرکز عورتیں تھیں۔ وہ اجنبی، متعجب، خواتین؛ وہ دروازے پر سانولی سلونی دوشیزہ ایستادہ ہے جو اپنی آنکھوں پر ہاتھ سے سایہ کر کے ہماری لاری کو گزرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ان تین کو دیکھو جو پھول دار سرخ پوشاک میں ملبوس ایک ساتھ چل رہی ہیں۔ ان میں سے ایک بھی ردی نہیں ہے۔ "سب ٹھیک ہے، بہرصورت ہم اپنے لیے بیویاں تلاش کر لیں گے۔" یہ پُرمسرت نعرہ چالیس سالہ بحری کپتان وی۔ آئی۔ واسیلینکو نے بلند کیا تھا جو اپنی بستر میں لانڈری کا انچارج بن کر بے فکری کی زندگی گزار چکا تھا اور اب آزاد ہو کر اپنے سکڑے ہوئے پر پھیلانے اور کوئی جہاز تلاش کرنے جا رہا تھا۔

ضلعی گودام، چائے خانہ، کلینک، سوویٹ دفتر، سلیٹ کی چھت والا ضلع پارٹی ہیڈکوارٹرس، چھپر والا ثقافتی گھر سب گزرتے گئے۔ ہماری لاری ایم۔ وی۔ ڈی، ایم، جی، بی، بلڈنگس کے نزدیک رُک گئی۔ غبار میں اٹے ہوئے ہم سب نیچے کود دے، سامنے والے احاطے میں گئے اور عام سڑک کے راہگیروں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے جسموں کو کمر تک پانی سے دھویا۔

ایم۔ جی۔ بی کے عین مقابل سڑک کی دوسری جانب ایک انوکھی عمارت ایستادہ تھی ایک منزلہ لیکن کافی بلند، چار ڈوریک ستون وقار کے ساتھ ایک شاندار پورٹیکو کو سنبھالے ہوئے تھے۔ ستونوں کے پیروں کے پاس دو زینے تھے جن پر چکنے پتھر جڑے ہوئے تھے اور ان سب کے اوپر ـــــ سیاہ کی ہوئی پھونس کی چھت تھی۔ میرے دل کی دھڑکن تیز چلنے سے باز نہ رکھی جا سکی۔ یہ اسکول تھا دس سالہ اسکول۔ زور سے مت دھڑک، ٹھہر جا کمبخت! وہ اسکول تیرے لیے نہیں ہے!

بڑی سڑک پار کر کے جادوئی پھاٹک کی طرف ایک لڑکی چلی جا رہی ہے۔ صاف ستھری پوشاک میں ایک چھوٹی تقریباً معدوم کر دالی، جیکٹ میں ملبوس۔ یقیناً وہ ہوا پر چل رہی ہے! وہ ایک استانی ہے! وہ اتنی کم سن ہے کسی ادارے کی گریجویٹ نہیں ہو سکتی۔ وہ کسی سات سالہ اسکول اور پھر اساتذہ کے تربیتی کالج کی پڑھی ہوئی ہوگی مجھے اس پر کتنا رشک آرہا ہے۔ اس کے اور مجھ جیسے ایک معمولی مزدور کے درمیان کتنا فاصلہ ہے ہم علیحدہ علیحدہ علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور میں اس کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈال کر چلنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

اسی درمیان کوئی نوواردوں کو اپنے پُرسکون آفس میں یکے بعد دیگرے طلب کر رہا تھا اور ان کے ساتھ مصروف تھا۔ بتائیے کون ہوگا وہ؟ ظاہر ہے وہ خفیہ پولس کا افسر ہے۔ وہ آپ کو جلاوطنوں کے ملک میں بھی ملتا ہے۔ وہاں بھی وہ خاص کردار ادا کرتا ہے۔

پہلی مڈبھیڑ بے حد اہم ہے: ہمیں صرف ایک ماہ نہیں بلکہ مستقل طور پر اس کے ساتھ چوہے بلّی کا کھیل کھیلنا ہے۔ اب میں اس کی دہلیز پار کروں گا اور ہم احتیاط کے ساتھ ایک دوسرے پر نظر ڈالیں گے۔ وہ بہت کچی عمر کا قازق ہے اور ملائم تکلّف کا نقاب ڈالے ہوئے ہے۔ اور میں اناڑی پن کا۔ ہم دونوں کو معلوم ہے کہ ہمارے بے مقصد فقرے مثلاً "ایک کاغذ لے لو" اور "کیا یہاں کوئی قلم ہوگا لکھنے کے لیے؟" ایک ذہنی جنگ کی ابتدا ہیں۔ لیکن میرے لیے یہ نمائش بے حد اہم ہے کہ مجھے ذرّہ برابر عزتِ نفس کا پاس نہیں۔ یہ بات از خود ظاہر ہونی چاہیے کہ ہمیشہ سے میں وہی کھلے ذہن والا سادہ لوح انسان ہوں۔ "دیکھو بھورے شیطان! یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ اس آدمی کے لیے کسی خاص نگرانی کی ضرورت نہیں ہے، وہ یہاں پرسکون زندگی بسر کرنے کے لیے آیا ہے۔ قید کی زندگی نے اسے کچھ سکھایا ہے۔"

یہ مجھے کیا بھرنا ہے؟ یقیناً یہ ایک سوالنامہ ہے اور ایک دائرۂ حیات۔ اس سے ایک نئی فائل کھلے گی جو میز پر تیار پڑی رہے گی۔ بعد میں میرے خلاف سنائے ہوئے تمام قصّے کہانیاں اس میں جمع ہوتی رہیں گی اور جیسے ہی کسی نئے کیس کا دھندلا سا خاکہ موٹے طور پر کھینچا جا سکے گا اور خاص سرزمین سے کچھ مزید لوگوں کو اندر کر دینے کا اشارہ موصول ہوگا، وہ مجھے جیل میں ڈال دیں گے (بالکل یہیں پر عقبی احاطے میں ایک کچی اینٹوں کا جیل گھر ہے!) اور میرے لیے دس سال کی نئی سزا کا بندوبست کر لیں گے۔

میں ابتدائی کاغذات سونپ دیتا ہوں، خفیہ پولس کا افسر انھیں پڑھتا ہے اور اپنے لوز لیف فولڈر میں فائل کر لیتا ہے۔

"کیا مجھے بتا سکیں گے کہ ضلع کا شعبۂ تعلیم کس مقام پر ہے؟" میں اچانک اس سے منکسرانہ اور عام انداز میں سوال کرتا ہوں اور وہ نرمی کے ساتھ مجھے بتاتا ہے۔ اس کی بھنویں حیرت سے ایکدم اوپر نہیں چڑھ جاتیں۔ اس سے میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ میں جا سکتا ہوں اور کام کے لیے دریافت کر سکتا ہوں۔ اس پر ایم۔ جی۔ بی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ پہلے قیدی کے طور پر میں نے بے شک اس سے براہِ راست یہ دریافت کر کے اپنے آپ کو شک نہیں کیا کہ کیا مجھے کسی تدریسی ادارے میں کام کرنے کی اجازت ہے۔

"کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ مجھے وہاں پہرے کے بغیر جانے کی اجازت کب ہوگی؟"

وہ لپنے شانے اُچکاتا ہے۔

"صرف آج کے لیے، حبیب نہیں..... بہتر ہوگا کہ تم گیٹ سے زیادہ دور نہ جاؤ۔ لیکن ضرورت ہو تو تم جا سکتے ہو۔"

اور میں چل دیا! میں سوچتا ہوں کہ کیا ہر شخص اس عظیم "آزاد" لفظ کا مطلب سمجھتا ہے۔ میں تنہا چلا جا رہا ہوں۔ کوئی خودکار رائفل مجھے دھمکیاں نہیں دے رہی ہے۔ نہ آزو بازو سے نہ عقب سے۔ میں پیچھے دیکھتا ہوں، وہاں کوئی نہیں ہے۔ اگر میں چاہوں تو داہنی طرف جا سکتا ہوں یا اسکول کی باڑ سے آگے بڑھ سکتا ہوں۔ جہاں ایک بہت بڑا سعد

کسی گندے تالاب میں کیچڑ کھود رہا ہے اور اگر میں چاہوں تو بائیں جانب جا سکتا ہوں، جہاں ضلع کے شعبۂ تعلیم کے مقابل مرغیاں پھدک رہی ہیں اور چونچیں چلا رہی ہیں۔

میں وہ دو سو میٹر طے کر کے شعبے تک پہنچتا ہوں اور میری ریڑھ، جو ہمیشہ کے لیے خمیدہ سی محسوس ہوتی تھی، پہلے ہی ذرا سی سیدھی ہو گئی ہے، میرا طور طریقہ پہلے ہی کچھ پُرسکون ہو گیا ہے۔ ان دو سو میٹر کے درمیان میں اگلی، بالائی شہری تہذیب کی سطح تک پہنچ گیا ہوں۔

میں اندر جاتا ہوں اپنے مورچے کے وقت کا ایک پرانا اونی شوینک اور اپنی پرانی، بہت ہی پرانی پتلون میں ملبوس، میرے جوتے کیمپ والے، سؤر کی کھال کے ہیں اور میرے پیٹ کے لٹکے ہوئے حصے مکمل طور پر ان میں چھپے نہیں ہیں۔

دو فربہ قازق وہاں براجمان ہیں، ان کی نیم پلیٹوں کے مطابق وہ ضلع کے شعبۂ تعلیم کے انسپکٹر ہیں۔

"میں اسکول میں کوئی کام چاہتا ہوں" میں کہتا ہوں۔ میری خود اعتمادی میں اضافہ ہو رہا ہے اور میں کچھ لاپرواہی کے ساتھ بول رہا ہوں جیسے کہ میں نے پانی کے برتن کے بارے میں سوال کیا ہو!

وہ اپنے کان کھڑے کر لیتے ہیں۔ آخر اس ریگستان کے کسی قازق گاؤں میں نوکری کی تلاش میں اساتذہ ہر آدھے گھنٹے بعد تو نہیں آ نکلتے اور اگرچہ کوکیریچیک ضلع کا رقبہ بلجیم سے زیادہ ہے لیکن وہ سات سال کی تعلیم حاصل کرنے والے ہر آدمی کو شکل سے پہچان لیتے ہیں۔

"تمہاری تعلیم کہاں تک ہے؟" وہ صاف ستھری روسی زبان میں پوچھتے ہیں۔

"یونیورسٹی میں فزکس اور ریاضی پڑھی ہے۔"

وہ چونک پڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو تکتے ہیں، پھر تیزی سے قازق زبان میں گفتگو کرنے لگتے ہیں۔

"اور تم آئے کہاں سے ہو؟"

جیسے یہ کوئی راز ہو۔ مجھے یہ بات انھیں سمجھانی پڑتی ہے کہ کس قسم کا بدھو یہاں ملازمت کی تلاش میں آئیگا اور وہ بھی مارچ میں!

"میں ایک ہی گھنٹہ پہلے یہاں آیا ہوں۔ میں ایک جلاوطن ہوں۔"

انھوں نے ایسا رخ اختیار کیا جیسے پہلے سے یہ بات جانتے ہوں اور یکے بعد دیگرے ڈائرکٹر کے کمرے میں چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ ٹائپسٹ جو تقریباً ایک پچاس سالہ روسی عورت تھی، مجھے دیکھ رہی ہے۔ فوراً ہمدردی کی ایک چنگاری — ہم وطن تھے۔ وہ بھی مجمع الجزائر سے آئی تھی! اس کا گھر کہاں تھا، اسے کیوں ہٹایا گیا تھا، کس سال؟ نادیزدا نکولائیفینا نووچرکاسک کے ایک کوسیک خاندان کی بیٹی، ۱۹۴۳ء میں گرفتار ہوئی تھی، معمولی ٹائپسٹ تھی لیکن محکمہ پولس نے اس سے یہ تسلیم کرانے کے لیے اپنے تمام حربے استعمال کیے تھے کہ وہ کسی نامعلوم دہشت پسند تنظیم کی رکن تھی۔ وہ دس سال گزار چکی تھی اور جلاوطنی کی زندگی گزار رہی تھی۔

اپنی آواز دبا کر ڈائرکٹر کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے، جو کھلا تھا، اس نے اختصار کے ساتھ مجھے بتایا: دس سالہ اسکول دو ہیں اور متعدد سات سالہ اسکول ہیں۔ ضلع میں ریاضی کے استاد کی سخت ضرورت ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ کوئی نہیں ہے۔ یہاں کسی نے فزکس کے ماہر کو اتنے قریب سے نہیں دیکھا کہ معلوم ہو سکے وہ کیسا جانور ہوتا ہے۔ اندر دفتر میں گھنٹی بجی۔ اپنے تھلتھلے بدن کے باوجود ٹائپسٹ تیزی سے اٹھی اور پھرتی کے ساتھ اندر چلی گئی۔

خدمت کے لیے ہر طرح مستعد، پلٹ کر اس نے مجھے بلند سرکاری آواز میں پکارا۔

میز پر ایک سُرخ کپڑا بچھا ہوا تھا۔ دونوں انسپکٹر آرام کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھے تھے۔ ایک بڑی آرام کرسی پر اشالن کی ایک تصویر کے نیچے ڈائرکٹر بیٹھی ہوئی تھی، ایک قازق خاتون، پستہ قامت، بھرا بھرا جسم، دل کش اور اس کے انداز سے کچھ بلّی اور قدرے سانپ کی سی جھلک ملتی تھی۔ اشالن اپنے فریم سے مجھ پر ظالمانہ ہنسی ہنس رہا تھا۔

انھوں نے مجھے دروازے کے پاس دور بٹھایا اتنا فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے جیسے وہ کسی قیدی سے پوچھتا چھ کر رہے ہوں اور ایک دشوار گزار بے مقصد گفتگو چھیڑ دی جو بے حد مختصر ہوتی، اگر وہ مجھ سے دو تین جملے کہنے کے بعد آپس میں قازق زبان میں دس دس منٹ کے مباحثے نہ شروع کر دیتے۔ جبکہ میں محبوط الحواس سا بیٹھا رہتا۔ انھوں نے مجھ سے بالتفصیل معلوم کیا کہ میں کہاں درس دیتا تھا اور کب، اور اپنے اس خدشے کا اظہار کیا کہ شاید میں اپنا موضوع یا اسے پڑھانے کا طریقہ بھول گیا ہوں۔ پھر طول طویل حیلہ سازی کے چھاپے شمار آہیں بھرنے کے بعد کہ کوئی بھی خالی جگہ نہیں ہے کہ ضلع کے اسکول ریاضی دانوں اور فزکس کے اساتذہ سے بھرے پڑے ہیں کہ کسی طرح نصف تنخواہ بھی نکالنی مشکل ہے، بچوں کو پرورش کرنا اس دور میں بڑا ذمہ دارانہ فعل ہے، وہ اصل اہم بات پر آئے۔ میں نے ایسا کون سا کام کیا تھا جس کی بنا پر مجھے جیل جانا پڑا؟ واقعتاً میں نے کون سا جرم کیا تھا؟ سنہولی بلّی نے اپنی شریر آنکھیں کچھ جاننے کے اشتیاق میں اوپر چڑھائیں جیسے میرے جرم کی سُرخ چمک پہلے ہی اسے تکلیف پہنچاتی ہوئی اس کے بالشویک چہرے سے ٹکرا رہی ہو۔ میں نے اس کے سر پر ابلیس کا منحوس سا چہرہ دیکھا جس نے میری ساری زندگی غارت کر دی تھی۔ جب اس کی تقدیر مجھے ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہی تھی تو میں نے ان لوگوں کو اپنے بارے میں کیا بتا سکتا تھا؟

میں نے ان ماہرِ تعلیم کو خوفزدہ کرنے کے لیے جیل کی ایک ترکیب استعمال کی، جو کچھ آپ مجھ سے دریافت کر رہے ہیں وہ ایک سرکاری راز ہے اور اسے منکشف کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ بغیر مزید وقت ضائع کیے میں جو بات جاننا چاہتا تھا وہ یہ تھی کہ وہ مجھے رکھیں گے یا نہیں؟

قازق زبان میں مباحثہ طویل تر ہوتا گیا کون اتنا دلیر ہوگا کہ حکومت کے مجرم کو اپنی ذمہ داری پر ملازمت دیدے لیکن انھوں نے ایک راستہ نکال لیا، مجھ سے میرے خصوصی موضوعات لکھوائے اور ایک سوانح کی دو نقلیں، پُر کرائیں یہاں بھی وہی شروع ہو گیا! کاغذ پر کچھ بھی لکھ دو۔ یقیناً ابھی ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ میں نے فارم پُر کیے تھے۔ میں نے ان کے اندراجات دوبارہ پُر کیے اور ایم، جی، پی چلا آیا۔

میں نے وہاں احاطے میں چکر لگائے اور اندر بنی ہوئی بے ڈھنگی جیل دیکھی، دیکھا کہ کس طرح انھوں نے بڑوں کی نقل کرتے ہوئے کچی دیوار میں ایک کھڑکی، جو پارسلوں کے لیے تھی، غیر ضروری ہونے پر بھی وہاں جڑ دی تھی اگرچہ وہ اتنی نیچی تھی کہ اس کے اوپر سے ٹوکریاں اِدھر اُدھر منتقل کی جا سکتی تھیں، لیکن بھائی! کیا آپ ایسی کوئی ایم۔جی۔پی کی چوکی بنا سکتے ہیں جس میں پارسلوں کے لیے کھڑکی نہ ہو! میں نے ان کے احاطے میں چاروں طرف کا جائزہ لیا اور ایسا محسوس کیا جیسے، وہاں نشے میں وحشت ضلعی شعبۂ تعلیم سے کہیں زیادہ آزادی کے ساتھ سانس لے سکتا ہوں۔ وہاں سے ایم۔جی۔پی ایسا پُراسرار تھا کہ اس کے بارے میں سوچ کر انسپکٹروں کا خون خشک ہو جاتا تھا! لیکن یہاں پہنچ کر میں سکون محسوس کر رہا تھا کہ میں اپنی ہی وزارت میں تھا! تین احمق کمانڈنٹ رجن میں سے دو افسر تھے، دراصل مجھ پر ہی نگاہ رکھنے کے لیے تھے۔ ہم ان کے لیے گھی چپڑی روٹیاں تھے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔

وہ آرام طلب لوگ تھے اور انھوں نے مجھے حوالات کے بدلے باہر احاطے میں خشک گھاس پر رات بسر کرنے کی اجازت دے دی۔

ایک رات کھلے آسمان کے نیچے! ہم بھول ہی گئے تھے کہ یہ کیسی ہوتی ہے..... وہاں ہمیشہ قفل اور سلاخیں ہوتی تھیں، ہر طرف دیواریں اور چھتیں تھیں، مجھے نیند کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ میں جیل کے سروس وارڈ کے گرد چلتا رہا، چلتا رہا۔ وہ زرم خنک روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ ایک کھلی ہوئی گاڑی وہیں چھوڑ دی گئی تھی، ایک کنواں، ایک پانی کی ناند، گھاس کا ایک چھوٹا انبار، اردگرد کھلے ہوئے سائبان میں گھوڑوں کی سیاہ پرچھائیاں ـــــ یہ سب اتنا پرسکون، اتنا قدیم، ایم۔وی۔ڈی کی بے رحم چھاپ سے اتنی دور تھا۔ ابھی تین مارچ ہی تھی لیکن رات کی ہوا میں تیکھی سردی بالکل نہیں تھی۔ ہوا اب بھی ویسی ہی گرم تھی جیسی دن میں تھی۔ بار بار کوکیٹرک پھیلے ہوئے شہر سے لمبی تان کے ساتھ گدھوں کی ڈھینچوں، ڈھینچوں، سنائی دیتی تھی جو گدھیوں میں اپنی محبت اور ان کے جسموں سے امڈتی ہوئی بے پناہ خواہش کو بیدار کرتی تھی۔ شاید ان میں سے ڈھینچوں کی کچھ آوازیں گدھیوں کی طرف سے جواباً بلند ہو رہی تھیں۔ مجھے دونوں میں تمیز کرنا دشوار ہو رہا تھا لیکن وہ زوردار گہری بلبلاہٹیں غالباً اونٹوں کی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میرے پاس بھی آوازیں ہوتیں تو میں بھی چاند کی طرف دیکھ کر چیخنے لگتا۔ یہاں میں سانس لے سکوں گا، میں چاروں طرف گھوم سکوں گا!

ظاہر ہے کہ مجھے فارموں کے اس کاغذی پردے کو پار کرنا ہوگا! اپنے چہار جانب تنہائی ہوئی اس رات میں، میں نے اپنے آپ کو ان بزدل نوکرشاہوں سے بلند تصور کیا۔ پڑھاتا! دوبارہ اپنے آپ کو انسان محسوس کرنا۔ کلاس روم میں داخل ہونا اور اپنی جلتی ہوئی آنکھیں بچکانا چہروں پر ڈالنا۔ میری انگلی ایک نقشے کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہ سب سانسیں روک لیتے ہیں! ثابت کرنا ہے، تشکیل، ثبوت۔ وہ سب دوبارہ کھل کر سانس لیتے ہیں۔

میں سو نہیں پاتا۔ چاندنی میں چلتا ہوں، چلتا جاتا ہوں، چلتا ہی جاتا ہوں۔ گدھے اپنے گیت گا رہے ہیں، اونٹ نغمہ سرائی کر رہے ہیں۔ میرا ریشہ ریشہ گا رہا ہے: میں آزاد ہوں، میں آزاد ہوں!

آخرش دائیں بائیں کھلے ہوئے سائبان کے نیچے اپنے ساتھیوں کے پاس کچھ گھاس کے اوپر دراز ہو جاتا ہوں ہم سے دو قدم آگے گھوڑے اپنی ناندوں کے سامنے کھڑے ہوئے سکون کے ساتھ گھاس چبا رہے ہیں۔ بے شک ہماری آزادی کی اس پہلی رات کو اس سے زیادہ شیریں، اس سے زیادہ دوستانہ صدائیں نہیں ہو سکتی تھیں۔

اے زرم مزاج بے ضرر جاندارو! چرتے رہو!

اگلے دن ہمیں ذاتی مکانوں میں منتقل ہونے کی اجازت مل گئی میں نے اپنی جیب کے لحاظ سے ایک مرغی خانہ تلاش کر لیا جس میں ایک ہی دھندلی کھڑکی تھی اور چھت اتنی نیچی تھی کہ اس کے بلند سے بلند سطحی مقام پر میں سیدھا نہیں کھڑا ہو سکتا تھا۔ جلاوطنی کا خواب دیکھتے ہوئے میں نے ایک بار جیل میں لکھا تھا، "مجھے نیچی چھت والا جھونپڑا دے دو۔ پھر بھی اپنا سر سیدھا نہ کر سکنا زیادہ مسرت بخش عمل نہیں تھا لیکن یہ چھوٹا سا

گھر میرا اپنا تھا! فرش کچا تھا۔ میں نے کیمپ کی اپنی بھراؤ جیکٹ اس پر رکھ دی اور یہ میرا بستر تھا! لیکن ایک جلاوطن انجینئر الیگزینڈر کلیمینٹوویچ زدانیوکیوچ نے جو پہلے بومین انسٹیٹیوٹ میں استاد تھا، مجھے کچھ لکڑی کی پیٹیاں فوڑا استعمال دے دیں جن پر میں کسی طرح آرام سے لیٹ گیا۔ ابھی میرے پاس کوئی تیل کا لیمپ نہیں تھا۔ میرے پاس کچھ بھی نہ تھا جلاوطن کو اپنی ضرورت کی ہر چیز منتخب کر کے خریدنی ہوگی جیسے وہ ابھی خلا سے زمین پر وارد ہوا ہو۔ لیکن مجھے اس کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ ان تمام برسوں میں اپنی کوٹھریوں اور اپنے جھونپڑوں میں سرکاری بجلی نے ہماری روح کو خشک کر دیا تھا اور اب تاریکی ہی میں بے حد سکون ملتا تھا۔ تاریکی بھی آزادی کا ایک جزو ہو سکتی ہے! تاریکی اور سکوت میں (شہر کے چوراہے سے لاؤڈ اسپیکر کی آواز مجھ تک پہنچی ہوتی۔ لیکن یہ کوکٹیرک تھا اور لاؤڈ اسپیکر تین یوم سے خراب پڑا تھا) میں بس اپنی پیٹیوں پر پڑا رہا اور موج مناتا رہا۔

میں اور کیا آرزو کر سکتا تھا!

لیکن چھ مارچ کی صبح میری خواہشات کے اعتبار سے سب سے بہترین ثابت ہوئی! میری سن رسیدہ مکان مالکن چاڈونا نے جو نوفوگوروڈ سے بے دخل کی گئی تھی، سرگوشی میں کہا کیوں کہ وہ یہ بات بلند آواز میں کہنے کی جرأت نہ کر سکی "چاؤ اور ریڈیو سنو! جو کچھ میں نے ابھی سنا ہے لسے زبان پر لاتے ہوئے بھی خوف آتا ہے"۔

مجھے اس کی بات پر عمل کرنے کی ترغیب ملی: میں بڑے چوک تک گیا۔ شاید دو سو افراد کا مجمع۔ کوکٹیرک کے اعتبار سے یہ خاصی بھیڑ تھی — لاؤڈ اسپیکر والے کھمبے کے پاس اور بیزار کن آسمان کے نیچے لوگ ایستادہ تھے بھیڑ میں بہت سے قازق تھے بیشتر عمر رسیدہ افراد ان کے گنجے سر برہنہ تھے اور انھوں نے اپنے سرخ بھورے مسکاٹ فر کے ٹوپ اپنے ہاتھوں میں لے رکھے تھے۔ وہ غم و آلام کے مارے ہوئے تھے نوجوانوں کو کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ دو تین ٹریکٹر ڈرائیوروں نے اپنی ٹوپیاں نہیں اتاری تھیں۔ میں بھی نہیں اتاروں گا۔ اس سے پیشتر کہ مجھے معلوم ہوتا معاملہ کیا ہے (وہ اپنے لہجے میں ڈرامائیت پیدا کر کے بول رہا تھا) میں سمجھ گیا۔

یہ وہ لمحہ تھا جس کا میں اور میرے دوست اپنی طالب علمی کے زمانے سے انتظار کر رہے تھے۔ وہ دن جس کے لیے گلاگ کا ہر زیک (سوائے آرتھوڈاکس کمیونسٹوں کے) دعائیں مانگتا تھا! وہ مر گیا۔ ایشیائی ڈکٹیٹر مر گیا! ولین اینٹھ کر مر گیا ہے! اسپیشل کیمپ میں کس طرح کھل کر خوشیاں منائی جا رہی ہوں گی۔ لیکن جہاں میں تھا وہاں روسی لڑکیاں، اسکول کی استانیاں سسکیاں لے لے کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہی تھیں: "اب ہمارا کیا ہوگا؟ ان کا پیارا باپ چل بسا تھا۔ میں چوراہے کے اس طرف سے چیخ کر ان پر برسنا چاہتا تھا: "اب تمہارا کچھ نہیں ہوگا! تمہارے والدین کو گولی کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا! تمہارے ہونے والے شوہروں کو جیلوں میں نہیں بھرا جائے گا! اور تم پر کبھی یہ داغ نہیں لگے گا کہ تم قیدیوں کی رشتہ دار ہو"۔

میں وہیں لاؤڈ اسپیکر کے پاس اظہارِ مسرت کر سکتا تھا۔ میں ایک وحشی رقص بھی کر سکتا تھا۔ لیکن افسوس تاریخ کی ندیاں آہستگی کے ساتھ بہتی ہیں۔ میرے چہرے نے جو تمام واقعہ کا سامنا کرنا سیکھ چکا تھا، مغموم انداز اختیار کر لیا۔ فی الحال مجھے نمائش کرنی چاہیے۔ پہلے کی طرح نمائش کرتے رہنا چاہیے۔

پھر بھی میری جلاوطنی بہترین ساعت سے شروع ہوئی تھی!
ایک مرتبہ پھر ایک پورا دن نظم لکھنے میں گزر گیا۔ "پانچویں مارچ"

دس دن بیت گئے ــــ اور مقابلے پر آنے والے نوابوں نے اقتدار کے لیے جنگ کرتے ہوئے
اور ایک دوسرے کو خوف سے دیکھتے ہوئے ایم، جی، بی کو بالکل ہی ختم کر دیا! اس طرح میرا یہ گمان
صحیح تھا کہ کیا ایم۔جی۔بی ہمیشہ کے لیے ہے یا
بے انصافی ــــ عدم مساوات اور غلامی کو چھوڑ دیں ــــ تو کیا ہمارے اس جہان میں
کوئی بھی شے ابدی ہو سکتی ہے۔

چھٹا باب

جلاوطنی کی پُرلطف زندگی

۱۔ سائیکل کی کیلیں	۔۔۔۔۔	½ کلو
۲۔ غلیلیں	۔۔۔۔۔	۵
۳۔ ایش ٹرے	۔۔۔۔۔	۲
۴۔ گلاس	۔۔۔۔۔	۱۰
۵۔ فنسل کیس بچگانہ	۔۔۔۔۔	۱
۶۔ گلوب	۔۔۔۔۔	۱
۷۔ دیاسلائی	۔۔۔۔۔	۵۰ ڈبی
۸۔ "ٹیبل" لیمپ	۔۔۔۔۔	۲
۹۔ ٹوتھ پیسٹ	۔۔۔۔۔	۸
۱۰۔ جنجر بریڈ (ایک طرح کا کیک)	۔۔۔۔۔	۴۲ کلو
۱۱۔ ووڈکا	۔۔۔۔۔	۵۶ ادھے

یہ فہرست قصبہ ایڈارلی کے جنرل اسٹور میں موجود اسٹاک کی ہے جن کی قیمتیں تبدیل کی جانی ہیں۔ کوکنٹریک ڈسٹرکٹ کنزیومرس کوآپریٹیو ارلے ٹوپنچے نے یہ فہرست تیار کی تھی اور اب میں ایک کیلکولیٹنگ مشین کے بٹن دبا کر کچھ اشیاء کی قیمتیں ۵۔۷ فی صد اور کچھ کی ۵۔۱۰ فی صد کم کر رہا ہوں۔ قیمتوں میں بری طرح کمی آرہی تھی اور توقع تھی کہ "فنسل کیس" اور "گلوب" نیا تعلیمی سال شروع ہونے سے پہلے فروخت ہو جائیں گے اور کیلیں سائیکلوں میں اپنی جگہ پہنچ جائیں گی۔ صرف "جنجر بریڈ" کا بھاری ذخیرہ جو غالباً جنگ کے پہلے سے چلا آرہا ہے، ناقابل فروخت اشیاء کی فہرست میں نیچے چلتا جا رہا ہے جہاں تک ووڈکا کا سوال ہے، اگر قیمت کچھ اور بھی چڑھ گئی۔ تب بھی یوم مئی تک مال نہیں بچے گا۔

قیمتوں میں گراوٹ سے، جو اسٹالن کے دور کے دستور کے مطابق یکم اپریل سے قبل آیا کرتی تھی، اور اسی تاریخ تک مزدوروں کو کروڑوں روبل کا منافع ہوتا تھا (پورا منافع پہلے ہی حساب لگا کر شائع کر دیا جاتا تھا) مجھے بہت نقصان ہوا۔

اس وقت تک میں عالم جلاوطنی میں ایک ماہ مکمل کر چکا تھا اور وہ تمام رقم خرچ کر چکا تھا جو میں نے دوریہ کاندگان میں "اپنے لیے کماؤ" فاؤنڈری میں کمائی تھی۔ ایک "نیا آدمی"، جو گلاگ کے بیسیوں سے اپنی عمر پوری کر رہا تھا اور باقاعدگی کے ساتھ ضلع کے محکمۂ تعلیم میں حاضری دے کر یہ کوشش کر رہا تھا اور پتہ لگا رہا تھا کہ

وہ مجھے رکھیں گے یا نہیں؟ لیکن سانپ جیسی ڈائرکٹر نے مجھے ملاقات کے لیے بلانا بند کر دیا تھا اور دو دزبانداِم انسپکٹروں کو مجھ پر غرّانے کی فرصت نہیں تھی اور مہینے کے آخر میں مجھے صوبائی محکمۂ تعلیم کی ایک ہدایت دکھائی گئی جس کے مطابق ضلع کوکیٹربک کے تمام اسکولوں میں ریاضی کے اساتذہ پوری تعداد میں متعین تھے اور مجھے کام ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اس دوران میں ایک ڈرامہ لکھ رہا تھا (دسمبر کے بغیر دسمبری) اب مجھے صبح و شام جامہ تلاشی نہیں دینی پڑتی تھی اور تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد اپنی تحریر شدہ چیزوں کو تلف کرنے کی ضرورت نہیں تھی جیسی کہ پہلے ہوا کرتی تھی۔ میرے پاس اور کوئی شغل نہ تھا اور کیمپ کے بعد سے مجھے یہی بات پسند تھی۔ دن میں ایکبار "چائے خانے" جاتا تھا اور دو روبل میں کچھ گرم شوربا نوش کرتا تھا۔ دہی پتلا شوربا جو وہ مقامی جیل میں قیدیوں کے لیے بالٹیاں بھر بھر کر بھیجا کرتے تھے۔ موٹی سیاہ ڈبل روٹی مقامی دکان پر کھلی فروخت ہوا کرتی تھی۔ میں نے آلو اور سؤر کی چربی کا ڈبہ بھی خریدا تھا۔ میں بذاتِ خود جھاڑیوں سے ایک گٹھا خشک لکڑیاں جمع کر لایا جس سے اگر چاہوں تو پکانے کے لیے چولہا روشن کر سکتا تھا میری مسرتوں کی تکمیل ہونے ہی والی تھی اور میں نے دل میں سوچا: اگر وہ مجھے ملازمت نہیں دیتے تو نہ دیں، جب تک میرے پاس پیسہ ہے اس وقت تک اپنا ڈرامہ قلمبند کرتا رہوں گا۔ اتنی آزادی شاید پھر مجھے کبھی میسر نہ آئے!

اس وقت کبھی مجھے اس امر کا ذرا بھی گمان نہ تھا، تین کمانڈنٹوں میں سے ایک نے سڑک پر میری طرف انگلی ٹیڑھی کی۔ وہ مجھے "رائے پو" لے گیا، ڈائرکٹر کے دفتر میں۔ ڈائرکٹر فارق تھا، ایسا گول مول جیسے توپ کا گولہ۔ کمانڈنٹ نے پروقار انداز میں زور سے کہا — "ریاضی داں"۔

یہ کیسا معجزہ تھا؟ کسی نے مجھ سے دریافت نہیں کیا کہ میں اندر کیوں آیا؟ کسی نے مجھے فارم اور کوائف زندگی بھرنے کے لیے نہیں دیے! فی الفور اس کی سکریٹری پردۂ فلم کے لائق حسین ایک یونانی لڑکی نے ایک انگلی سے ایک حکم ٹائپ کر دیا جس کے تحت مجھے ۔ ۵۴ روبل ماہانہ تنخواہ پر پلاننگ آفیسر مقرر کیا تھا۔ اسی دن دو اور بے روزگار جلا وطنوں کو آتے ہی غیر رسمی طریقے سے "رائے پو" میں ملازمت دیدی گئی۔ انھیں فرصت کے وقت پڑھنے کے لائق کوئی فارم پُر نہیں کرنے پڑے۔ ان میں ایک تھا بحری جہاز کا کپتان واسیلنکو اور ایک دوسرا آدمی جسے میں تاحال نہیں جانتا تھا۔ بہت ہی کم گو، گریگوری سیموئلو دیچ۔ م۔ ز۔ واسیلنکو پہلے ہی دریائے چو (جسے گرمی کے مہینوں میں گائیں پار کر لیتی تھیں) کو مزید گہرا کر کے ایک موٹر بوٹ سروس شروع کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے کمانڈ پوسٹ سے کہا تھا کہ اسے وہاں جاکر بہاؤ کے راستے کا معائنہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ ٹریننگ رگ اُڈ فارسش) اور نیویگیشن اسکول میں اس کا ہم جماعت کیپٹن مین اس وقت "ادب" کو قطب جنوبی کی سیاحت کے لیے تیار کر رہا تھا — لیکن واسیلنکو کو اسٹور کیپر کی حیثیت سے رائے پو میں بھیجدیا گیا۔

لیکن ہم تینوں کی ضرورت منصوبہ تیار کرنے والوں، اسٹور کیپروں یا لیبر کلرکوں کی حیثیت سے نہیں تھی ہم تینوں کو ایک ہنگامی نوعیت کے کام پر لگا دیا گیا۔ اشیا کی قیمتیں از سرِ نو متعین کرنے کے لیے۔ ۳۱ مارچ اور یکم اپریل کی درمیانی شب میں سال کی تبدیلی کی وقت رائے پو کو ناامیدانہ ٹھوکریں کھانی پڑتی تھیں اور وہاں کام

کرنے والے کافی نہ تھے نہ کبھی ہو سکتے تھے۔ انھیں تمام اشیا کی فہرست تیار کرنی پڑتی تھی (اور تمام سرقہ کرنے والے سیلز مینوں وغیرہ کا بھانڈا پھوٹتا تھا۔ ہرچند کہ اس کے لیے ان پر مقدمات نہیں چلتے تھے) اُن چیزوں کی نئی قیمتوں کو طے کرنا، اور اگلے ہی روز سے نئی قیمتوں کے مطابق فروخت شروع کر دینا۔ جو محنت کشوں کے بے حد موافق ہوتی تھیں۔ لیکن ہمارے ریگستانی ضلع میں تمام ریلوے لائنوں اور شاہراہوں کی مجموعی طوالت ـــــ صفر کلومیٹر تھی اور دور افتادہ بیابانوں میں بنی ہوئی دکانیں بسا اوقات ان قیمتوں کو جو مزدوری کرنے والے کے لیے اتنی منفعت بخش تھی، یکم مئی سے بیشتر عمل میں نہیں لاتے تھے۔ مکمل ایک ماہ تک تمام دکانیں بکری بالکل بند رکھتی تھیں جبکہ فہرستوں کے حساب کی تصدیق اور توثیق رائے پور کی جانب سے ہوتی تھی اور تازہ فہرستیں اونٹوں کے ذریعے روانہ کی جاتی تھیں لیکن خود ضلع سینٹر میں، یوم مئی سے عین پہلے کاروبار کسی طرح بند نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جب ہم رائے پور میں پہنچے تو وہاں پندرہ افراد ـــ مستقل اور غیر مستقل کارکن پہلے ہی اس کام میں مصروف تھے۔ ہر ڈیسک پر رف کاغذ پر قلمبند کردہ فہرستیں جمع تھیں اور ابکیوں کی کٹ کٹ کے علاوہ کچھ سنائی نہ دیتا تھا جن پر کلرک ماہرین ضرب و تقسیم دونوں کر رہے تھے اور تاجروں کی مانند مغلظات کا لین دین بھی چل رہا تھا۔ انھوں نے ہمیں فوراً کام پر لگا دیا۔ میں جلد ہی کاغذ پر ضرب و تقسیم کے عمل سے بیزار ہو گیا اور میں نے ایک کیلکولیٹنگ مشین طلب کی۔ رائے پور میں یہ مشین ایک بھی نہ تھی اور ہو بھی تو وہاں اس کا استعمال کوئی نہ جانتا تھا۔ لیکن کسی نے ضلع کے دفتر اعداد و شمار کی الماری میں ہندسوں والی کسی قسم کی ایک مشین دیکھ رکھی تھی جسے وہاں بھی کوئی استعمال نہیں کرتا تھا۔ انھوں نے فون کیا، وہاں گئے اور مشین لے آئے۔ میں نے اسے استعمال کرنا شروع کیا اور تیزی سے ہندسوں کی قطاریں لکھنے لگا جب کہ تجربہ کار کلرک میری طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ کہیں میں ان کا مدِمقابل تو نہیں ہوں۔

میں نے بٹن دبایا اور دل میں خیال کیا: زیک کا دماغ کتنی جلدی خراب ہو جاتا ہے ـــ یا ادبی زبان استعمال کریں تو آدمی کی ضرورت کتنی سرعت سے بڑھ جاتی ہے۔ میں اس لیے غیر مطمئن تھا کہ انھوں نے مجھے اپنے اس ڈھرے سے الگ کر دیا تھا جو میں اپنے ڈربے میں بیٹھا لکھا کرتا تھا۔ اس لیے نامطمئن تھا کہ انھوں نے مجھے کسی اسکول میں کام نہیں دیا تھا۔ اس لیے بے اطمینانی محسوس کر رہا تھا کہ انھوں نے مجھے مجبور کیا تھا ـــ کس کام کے لیے؟ منجمد زمین پر کھدائی کرنے کے لیے؟ برفیلے پانی میں اپنے پیروں سے اینٹوں کا گارا تیار کرنے کے لیے؟ نہیں، انھوں نے مجھے زبردستی بٹھا دیا ہے ایک صاف ستھری ڈیسک پر ایک کیلکولیٹنگ مشین کے بٹن دبانے اور گوشواروں میں ہندسے درج کرنے کے لیے۔ کیمپ کے ابتدائی ایام میں اگر انھوں نے مجھے یہ آرام دہ کام دن کے بارہ گھنٹے کرنے کا حکم دیا ہوتا تو میں فرطِ مسرت سے پاگل ہو جاتا! یہاں تو وہ مجھے اس کام کے لیے ۱۵۰ روپے ماہانہ ادا کر رہے ہیں۔ میں روزانہ ایک لیٹر دودھ پی سکتا ہوں اور میرا یہ عالم ہے کہ ناک بھوں چڑھا رہا ہوں۔ اس سے زیادہ کی خواہش کر رہا ہوں۔ رائے پور ایک ہفتے تک نئی قیمتیں متعین کرنے کے مسئلے سے الجھ رہا تھا (ہر چیز کو اس کی صحیح جنس کے خانے میں رکھ کر مجموعی قیمت کے حساب سے دیہاتی قیمت کے فرق معلوم کرنے کے لیے اس کی از سرِ نو درجہ بندی کرنی پڑتی تھی) اور اس کے باوجود تاحال کوئی دکان فروخت شروع نہیں کر سکی تھی۔ اب توندیل منتظم اعلیٰ نے، جو تمام سست خوروں کا سردار تھا، ہم سب کو اپنے دفتر میں طلب کیا جو خالصتاً تقریبات کے لیے بنا تھا، اور کہا: "اچھا سنو! میڈیکل سائنس کی جدید ترین تحقیقات کے مطابق کسی کو بھی آٹھ گھنٹوں کی نیند کی ضرورت نہیں تھی۔ چار گھنٹے ہر طرح سے کافی ہیں! اس لیے

میرا حکم ہے کہ تم لوگ صبح سات بجے سے کام شروع کرو گے اور اگلے دن صبح دو بجے ختم کرو گے! ایک گھنٹہ دوپہر اور ایک گھنٹہ شام کو کھانے کی چھٹی ملا کرے گی۔

جہاں تک میں سمجھ سکا، ہم میں سے کوئی بھی اس سکتے میں مبتلا کر دینے والے دھماکے سے مسرور نہیں ہوا۔ خوفزدہ بے شک ہوا، ہم سب اپنے اندر سکڑ کر رہ گئے۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔ صرف اتنی ہی جرأت کر سکے کہ شام کے کھانے کی چھٹی کے بارے میں مناسب ترین وقت کے سلسلے میں گفتگو کر لیں۔

یہ وہی چیز تھی — جلاوطن کی تقدیر، جس کے بارے میں مجھے تنبیہہ کی گئی تھی۔ یہ تقدیر اسی قسم کے احکامات سے مرتب ہوتی تھی۔ یہاں کام کرنے والے تمام لوگ جلاوطن تھے۔ اپنی ملازمتوں کے متعلق خائف۔ اگر انھیں برخاست کر دیا گیا تو کوآپریٹیو میں کوئی دوسرا کام حاصل کرنے میں انھیں خاصا وقت لگے گا اور بہر حال یہ منتظم کا کوئی ذاتی کام تو نہیں تھا۔ یہ ملک کے لیے تھا، سب کرنا ہی پڑے گا۔ انھیں میڈیکل سائنس کی جدید ترین تحقیق بھی بالکل مناسب محسوس ہوئی۔ اوہ! میری کیسی شدید خواہش تھی کہ کھڑے ہو کر اس آسودہ مزاج سور کا مضحکہ اڑاؤں! صرف ایک بار ہی کا غبار نکال لوں! لیکن یہ حرکت "سوویٹ دشمن احتجاج" سمجھی جاتی، خالص اور صریح۔ ایک انشداہم کام کی عدم تشکیل کے لیے لوگوں کو ترغیب دینا۔ تم زندگی کی ایک سے دوسری منزل پار کرتے ہو، طفلِ مکتب، طالب علم، شہری، فوجی، قیدی، جلاوطنی — اور ہر بار وہی بات ہے: آقا لوگ ہمیشہ بڑے بھاری ہوتے ہیں۔ آپ کے مقابلے میں بہت طاقتور، چنانچہ آپ کو جھکنا ہوگا اور خاموشی اختیار کرنی ہوگی۔

اگر اس نے رات کے دس بجے تک کہا ہوتا تو میں رک جاتا۔ لیکن وہ ہمیں قتل کا حکم دے رہا تھا، خون بہائے بغیر، مجھے اس جگہ، جہاں میں آزاد تھا، اپنا تخلیقی کام روکنے کا حکم دے رہا تھا! جہنم میں جاؤ تم اور تمہاری قیمتوں کی تخفیف میرے کیمپ کے تجربات نے مجھے بچنے کی ایک ترکیب سمجھائی۔ پلٹ کر جواب نہ دو بلکہ خاموشی کے ساتھ اُلٹا کام کرو۔ میں نے دوسروں کی طرح خاموشی سے حکم سنا لیکن پانچ بجے میں اپنی میز سے اٹھ کر چل دیا اور پھر دوسرے دن صبح نو بجے سے پہلے کام پر نہیں آیا۔ میرے بقیہ تمام ساتھی حسب سابق وہاں بیٹھے تھے اور گنتی کر رہے تھے یا اس کی نمائش کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میں پاگل ہوں۔ م — ز نے، جس نے خاموشی سے میرے رویے کی تائید کی۔ لیکن خود اس کی پیروی کا حوصلہ نہ کر سکا، مجھے تنہائی میں بتایا کہ باس میری خالی میز کے پاس آکر کھڑا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ مجھے سو کلومیٹر دور ریگستان میں ہٹا دے گا۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرا دل گھبرا رہا تھا۔ ایم۔ وی۔ ڈی۔ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ وہ بآسانی وہاں میرا پیچھا کر سکتے تھے، سو کلومیٹر — کیوں نہیں؟ اور یہ ضلع سینٹر کا کچھ ہی دیر کا مہمان تھا۔ لیکن میں خوش نصیب پیدا ہوا تھا، میں مجمع الجزائر میں جنگ کے بعد پہنچا تھا اور سب سے خوفناک دور سے محفوظ رہا تھا اور اب جلاوطنی میں اسٹالن کی موت کے بعد آیا تھا۔ گزشتہ مہینے ہماری مقامی ایم۔ وی۔ ڈی۔ کمانڈ میں بھی کچھ نہیں چیز گھس آئی تھی!

آخر بالآخر دیدہ طور پر ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا۔ مجمع الجزائر کی تاریخ میں ملائم ترین تین سال۔

منتظم اعلیٰ نے مجھے طلب نہیں کیا، نہ خود میرے پاس آیا۔ میں نے دن کا کام ختم کیا اور لپٹ آپ کو تر و تازہ محسوس کرتا رہا، بلکہ میرے چاروں طرف سب لوگ اونگھ رہے تھے اور بہک رہے تھے۔ میں نے شام کو پانچ بجے پھر چپ جاپ کا لفظ یہ پڑھا بھی نہ کی کہ میرا آخری انجام کیا ہوگا۔

کئی بار میں نے اپنی زندگی میں اندازہ کیا ہے کہ انسان عناصر پر گرفت رکھے تو بے خوف کسی بھی ایثار کے آمادہ ہو سکتا ہے۔ وہ ڈراما جو میرے اندر اسپیشل کیمپ کے دورانِ قیام سخت محنت کے دوران پنپ رہا تھا، میں نے اسے قربان کرنے سے انکار کر دیا۔ اور میں فتحیاب ہوا۔ تمام ہفتے وہ رات رات بھر کام کرتے رہے اور انھیں میری خالی میز کی عادت پڑ گئی۔ منتظم اعلیٰ بھی جب کوریڈور میں میرے قریب سے گزرتا تو اپنی نگاہیں دوسری طرف رکھتا تھا۔

لیکن میرے مقسوم میں نہ تھا کہ کا زکستان کے دیہاتی کوآپریٹو کی تنظیم کو درست کروں۔ ایک نوجوان قازق جو ایک شعبۂ تعلیم کا سربراہ تھا، دفعتاً رائے پو میں نمودار ہوا۔ مجھ سے پہلے تک کوکیرٹیک میں تنہا وہی یونیورسٹی کا گریجویٹ تھا اور اس بات پر اسے بڑا گھمنڈ تھا۔ لیکن میری آمد سے اسے حسد نہیں ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ طلبہ کی پہلی کیمپ کے آخری امتحان میں بیٹھنے سے قبل اپنے اسکول کی استعداد بڑھانے کا خواہشمند تھا یا شعبۂ تعلیم کی اس سانپ کی سی خصلت رکھنے والی ڈائرکٹر کو پریشان کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے مجھے ہدایت کی کہ اپنا ڈپلوما جلد لے آؤں۔ میں اسکول کے طالب علم کی مانند اسے لانے کے لیے گھر دوڑا گیا۔ ڈپلوما لے کر اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا اور ایک ٹریڈ یونین میں حصہ لینے کے لیے ذرا نبول چلا گیا۔ تین دن بعد وہ دوبارہ وہاں پہنچا اور میرے روبرو صوبائی شعبۂ تعلیم کے حکم کا ایک جزو رکھ دیا۔ اسی بے شرم دستخط سے، جس نے مارچ میں یہ ثابت کیا تھا کہ ضلع کے تمام اسکولوں میں اساتذہ پوری تعداد میں متعین ہیں، اب اپریل میں ریاضی اور طبیعیات دونوں مضامین دونوں آخری کلاسوں میں پڑھانے کے لیے آخری امتحان سے عین تین ہفتے پہلے بحیثیت استاد میرا تقرر کر دیا تھا! یہ ڈائرکٹر آف اسٹڈیز مجھے ایک آزمائشی موقع دے کر دیکھ رہا تھا۔ سیاسی اعتبار سے اتنا نہیں بلکہ اس لحاظ سے کہ اسے خوف تھا کہ شاید میں کیمپ کے برسوں میں اپنی ریاضی کی مہارت کھو بیٹھا ہوں۔ جب جیومیٹری اور ٹرگنو نامیٹری کے تحریری امتحان کا دن آیا تو اس نے مجھے اپنے طلبہ کے سامنے لفافہ نہیں کھولنے دیا بلکہ تمام اساتذہ کو ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں لے گیا اور جب میں نے سوالات حل کیے تو میرے سر پر کھڑا رہا۔ اس بات سے کہ میرے جوابات وہی تھے جو لفافے میں رکھے ہوئے تھے، وہ اور دیگر اساتذہ بڑے خوشی کے موڈ میں آ گئے۔ اس جگہ ڈسکرلس ثانی بن جانا بے حد آسان تھا! اسی سال آخری امتحان کے ایام میں مجھے مزید معلوم ہوا کہ ضلع سینٹر کے پاس وقفے وقفے سے قصبات سے درخواستیں آتی تھیں کہ ہم یہ سوالات حل نہیں کر سکتے۔ یہ سوال مناسب طور پر تیار نہیں کیا گیا! دراصل اساتذہ نے خود صرف سات سالہ اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔

جو مسرت مجھے کلاس میں جانے اور چاک سنبھالنے میں ہوئی اس کا کیا بیان کروں! حقیقی معنوں میں میری آزادی کا دن یہ تھا۔ مجھے پھر اپنی شہریت مل گئی تھی۔ میں نے ان دیگر امور پر توجہ دینی بند کر دی جو کسی جلاوطن کی زندگی کا لازمی جزو ہوتے ہیں۔

جب میں ایکی بسٹز میں تھا اس وقت ہمارا کالم اکثر مقامی اسکول کے قریب سے گزرتا تھا۔ میں اسے ایک ناقابلِ حصول جنت کی طرح دیکھا کرتا تھا۔ احاطے میں چہار جانب دوڑتے ہوئے بچوں پر، چمکدار پوشاکوں والے اساتذہ پر میری نظر جاتی تھی اور سامنے کے زینوں سے برآمد ہونے والی گھنٹے کی ٹن ٹن میرے سینے پہ ضرب لگاتی تھی۔ میں اپنے مایوس کن جیل کے برسوں سے، کیمپوں میں اپنے عام مزدوری کے برسوں سے ایسی بے تحاشہ آرزومندی کا شکار ہو گیا تھا کہ مجھے گھنٹی بجنے پر ہاتھ میں رجسٹر لیے کلاس روم میں داخل ہونا اور حیرتوں کا پٹارہ

کھولنے والے کے پُراسرار انداز میں سبق کی ابتدا کرنا انتہائی مسرور کن عمل معلوم ہوتا تھا۔ بلاشبہ یہ میری استاد بننے کی ناآسودہ خواہش تھی جو اپنی تسکین چاہتی تھی لیکن شاید یہ کسی حد تک میری عزتِ نفس کی بھوک تھی۔ برسوں کی توہین کے بعد، برسوں کے اس علم کے بعد کہ میں حقیر سمجھا جاتا ہوں، مجھے اس کے تبدیل کرنے کی آرزو تھی۔

لیکن جب میری نگاہ مجموعی طور پر ملک کی سرکاری زندگی پر مرکوز تھی، میں ایک بالکل ہی ابتدائی چیز نہ دیکھ سکا تھا کہ کسی وقت جنگ کے دوران یا اس کے بعد سوویٹ اسکول کی موت واقع ہو چکی ہے، اب اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ صرف ایک متورم لاش باقی ہے، ہوا کا ایک غبارہ۔ دارالسلطنت میں اور مضافات میں اسکول دفنا یا چکے ہیں۔ جب مسموم گیس کی طرح روحانی موت ملک میں عام ہو جاتی ہے تو بے شک سب سے پہلے اسکولوں اور طالب علموں کا دم گھٹتا ہے۔

لیکن یہ بات چند برسوں کے بعد ہی میری سمجھ میں آئی جب میں جلاوطنی کی سرزمین سے میٹروپولیٹن روس واپس ہوا۔ کوکیٹریک میں مجھے اس کی بھنک بھی نہیں ملی۔ ہمارے چاروں طرف نامانوسیت کے خوفناک گھیرے میں جلاوطنوں کے بچے حبسِ دم سے جاں بلب نہ ہوئے تھے، وہ ابھی سانس لے رہے تھے۔

وہ بہت خاص بچے تھے۔ وہ اپنی بدحالی کا شعور لے کر بڑھ رہے تھے۔ اسکول بورڈ کی نشستوں اور دیگر گھپ بازیوں والے سیمیناروں میں انھیں سوویٹ بچے کہا جاتا تھا اور وہ اپنے بارے میں یہ سنتے تھے کہ وہ کمیونزم کے اقتدار میں رہنے کے لیے پروان چڑھ رہے ہیں۔ جن کی نقل و حرکت کی آزادی پر محض عارضی پابندیاں ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک اپنی گردن کے چاروں طرف لپٹے ہوئے طوق کا لمس محسوس کرتا تھا۔ اسے بچپن سے محسوس کرتا آیا تھا، اس عمر سے جب کہ اسے یاد تھا کہ تمام دنیا، جسے وہ رسائل اور فلموں کے وسیلے سے جانتے تھے، اتنی ہمہ گیر، اتنی وسیع، زندگی سے جوش کھاتی ہوئی، ان کے لیے ممنوع تھی اور اس میں فوج کے وسیلے سے بھی لڑکوں کے داخلے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس بات کی بہت ہی دھندلی سی امید تھی کہ بہت محدود لوگوں کو ایم۔ وی۔ ڈی کی چوکی سے کسی شہر میں جانے، وہاں پہنچ کر کسی داخلے کے امتحان میں شرکت کرنے پاس ہونے کی صورت میں کسی ادارے میں داخلہ لینے اور داخلہ ملنے پر اپنی تعلیم کامیابی کے ساتھ پوری کرنے کی اجازت مل سکے گی۔ اس طرح اس وسیع، لامحدود دنیا کے بارے میں وہ جو بھی واقفیت حاصل کریں گے وہ وہیں اسکول میں ہی حاصل کرنی ہوگی جو کافی مدت سے ان کی تعلیم کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور اختتام بھی۔ مزید برآں اس بیابان میں زندگی اتنی سادہ تھی کہ وہ ایسی اِدھر اُدھر توجہ منتقل کرنے والی باتوں اور طاقت سلب کرنے والی فکروں سے آزاد تھے جو لندن سے الماتا تک ہر مقام کے بیسویں صدی کے شہری نوجوان کی زندگی تباہ کر دیتی ہیں۔ شہری مراکز میں طلبہ کے پڑھنے کی عادت اور دلچسپی جاتی رہی تھی وہ اس طرح پڑھتے تھے جیسے کسی پریشان کن ذمہ داری کو نبھا رہے ہوں۔ صرف اس وقت تک کتابوں سے رابطہ رکھنا ہے جب تک وہ اتنے بڑے نہ ہو جائیں کہ باہر جا سکیں لیکن ہماری جلاوطن نوآبادیوں کے طلبہ کے لیے، اگر انھیں اچھی طرح تعلیم دی جائے تو زندگی میں کوئی اور چیز اس سے زیادہ اہم نہیں تھی کوئی اور چیز کچھ معنی نہ رکھتی تھی۔ گہری دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہوئے وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ اپنی ثانوی حیثیت سے بلند ہو رہے ہیں، فرسٹ کلاس بچوں کے ساتھ وہ مساویانہ مقابلہ کر رہے ہیں اور یہ کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہی وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کر سکیں گے۔

رنہیں، دوسری راہیں بھی تھیں۔ اسکول میں انتخاب والے منصب حاصل کرکے کوسومول میں، اور سولہ برس کی عمر سے عام انتخابات میں ووٹ دے کر وہ بے چارے کچھ اور نہیں تو مساوی حقوق کی خوش فہمی میں مبتلا رہا کرتے تھے۔ بہت سے محض نمائش کے لیے کوسومول کے ممبر بن جاتے تھے اور اسے پانچ منٹ کی تقریروں میں خلوص کے ساتھ سیاسی اعلانات کرتے تھے۔ میں نے ایک جرمن لڑکی وکٹوریہ نُس کو جسے ایک دوسالہ تدریسی تربیتی کالج میں امتیازی کامیابی ملی تھی، یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ جلا وطنوں کو اپنی حالت پر فخر کرنا چاہیے۔ جھنجلانا نہیں چاہیے۔ یہ کوشش محض فضول تھی اس نے مجھے دیکھا اور اس طرح دیکھا جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ یقیناً اور بھی لوگ تھے جو کوسومول میں داخل ہونے کے لیے بے چین نہیں تھے انھیں جبراً گھسیٹا جاتا تھا: تم اب بھی شامل نہیں ہوئے حالانکہ تمہیں اس کی اجازت ہے بھئی اس کی کیا وجہ ہے؟ کوکیٹریک میں کچھ نوجوان لڑکیوں کو، جو جرمنی تھیں اور ایک خفیہ مذہبی فرقے کی رُکن تھیں، شامل ہونے کے لیے مجبور کیا گیا ورنہ ان کے والدین کو ریگستان میں اور بھی دُور ہانک دیا جاتا۔ جو بھی ان چھوٹ بھیّوں کو ناخوش کرے..... اس کے لیے بہتر تھا ایک چکی کا پاٹ اپنے گلے میں آویزاں کرے)

اس تمام عرصے میں، میں نے کوکیٹریک اسکول میں "روسی" کلاسوں کے بارے میں ہی عرض کیا ہے۔ (ان میں خالص روسی بمشکل ہی کوئی ہوگا۔ وہ جرمن، یونانی، کورین، تھوڑے کُرد اور چیچین تھے۔ کچھ ان کفنوں کے یوکرینی تھے جو اس صدی کے آغاز میں اس علاقے میں آباد ہو گئے تھے اور وہ قازق تھے جن کے والدین ذمہ دار "منصبوں پر فائز" تھے اور جو اپنے بچوں کو روسی زبان میں تعلیم دلانے کے خواہشمند تھے۔ پھر بیشتر قازق بچے "قازق زبان والی کلاسوں" میں تھے۔ وہ واقعتاً اب بھی وحشی تھے اور ان میں سے اکثر (وہ جو اپنے خاندانوں کی بلند حیثیت کی وجہ سے زوال پذیر نہیں ہوئے تھے) بے حد صاف دل، اور بُرے بھلے کی تمیز رکھنے والے تھے لیکن دروغ گو یا مغرور اساتذہ ان کی فہم و فراست کو مسخ کر دیتے تھے۔ دراصل قازقوں میں ساری تعلیم محض جہالت کی تبلیغ تھی، پہلی نسل اپنے ڈپلومہ کے نصاب میں سے بدقت تمام گزرتی تھی۔ نیم تعلیم یافتہ اور بہت مغرور ہو جاتی تھی اور اگلی نسل کو تعلیم دینے کے لیے اِدھر اُدھر پھیل جاتی تھی جبکہ قازق لڑکیاں مرتاً جاہل، اور کند ذہن ہونے کے باوجود اسکولوں اور تدریسی تربیتی کالجوں سے "تشفی بخش" نمبر حاصل کرکے فارغ التحصیل ہوتی تھیں اس طرح جب یہ پرانے تمام معتقدات جن جانے والے بچے اصل تعلیم کی ایک جھلک پا جاتے تو اس کا نہ صرف دیدہ و گوش سے بلکہ اپنے کھلے منہ سے بھی لذت حاصل کرتے تھے۔

ایسے کسبِ فیض کی صلاحیت رکھنے والے طلبہ کے ساتھ کوکیٹریک میں مجھے اپنی تدریسی سرگرمیوں میں بڑا لطف آتا تھا اور تین سال کے لیے مجھے مسرور رکھنے کو اتنا ہی کافی تھا (اور شاید یہ مزید کئی سال تک کافی رہتا) ٹائم ٹیبل میں میرے لیے اتنے زیادہ گھنٹے نہیں تھے کہ میں سابقہ اغلاط کی تصحیح کرا سکوں یا چھوٹی موٹی چیزوں کی تلافی کر سکوں اس لیے میں نے شام کو اکسٹرا کلاسیں، اجتماعی گفتگو، فیلڈ ورک اور فلکیات کے مطالعے کا وقت متعین کر دیا اور وہ زیادہ تعداد میں، سینما جانے کے مقابلے میں زیادہ دلچسپی کے ساتھ کلاسوں میں آنے لگے مجھے ایک جماعت کا چارج بھی دے دیا گیا۔ یہ ہر طرح سے ایک قازق کلاس تھی۔ لیکن یہ بھی خاصا پر لطف کام تھا۔ لیکن روشن پہلو کی سرحدیں کلاس روم کے دروازے اور پیریڈ کی گھنٹی سے بندھی ہوئی تھیں۔ اشاعت

کے کامن روم میں، اڈائرکٹر کے دفتر میں اور ضلع کے شعبۂ تعلیم میں ماحول محض اس ذلیل اور ہمارے علاقے میں عام ظالمانہ رویے کی وجہ سے ہی مسموم نہیں تھا بلکہ ایک اور خطرناک اعتبار سے بھی زہریلا تھا۔ جو اُن کی جلاوطنی کی سرزمین کا امتیازی وصف تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو دیگر اساتذہ میں کچھ جرمنی اور کچھ انتقامی جلاوطن پہلے سے موجود تھے۔ ہم سب اسی اذیت رساں کیفیت میں تھے۔ ہمیں ہر موقع پر یاد دلایا جاتا تھا کہ پڑھانے کا موقع فراہم کرکے وہ ہم پر عنایت کر رہے ہیں اور نوازشوں کا سلسلہ کبھی بھی منقطع کیا جا سکتا ہے۔ اسٹاف کے جلاوطن اساتذہ دیگر استادوں کی بہ نسبت (حالانکہ وہ اتنے ہی زیادہ دست نگر تھے) اپنے طلبہ کو اچھے نمبر نہ دے کر ضلع کے افسرانِ بالا کی ناراضگی مول لینے سے زیادہ ڈرتے تھے وہ نتیجہ خراب نکلنے کی صورت میں عہدیداروں کی خفگی سے بھی خوف کھاتے تھے اور دانستہ زیادہ نمبر دیتے تھے اور اس طرح عام قازقستان میں جہالت کی توسیع میں اپنا حصہ ادا کرتے تھے۔

مزید برآں جلاوطن استادوں پر (اور ان کے نوجوان قازق رفیقانِ کار پر بھی) خصوصی ادائیگیوں اور کاموں کی ذمہ داریاں بھی عائد کی جاتی تھیں۔ ہر تنخواہ کے دن ۲۵ روبل وضع کر لیے جاتے تھے اور یہ کس کی جیب میں جاتے تھے کسی کو معلوم نہ تھا۔ ہیڈ ماسٹر بریڈنیو فنب دفعتاً اعلان کرتا کہ میری چھوٹی بچی کی سالگرہ ہے اور اساتذہ کو تحائف کے لیے ۵۰ روبل فی کس چندہ دینا پڑتا تھا اس کے علاوہ کسی نہ کسی استاد کو ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں محکمۂ تعلیم میں طلب کیا جائے گا اور اس سے ۳۰۰ یا ۵۰۰ روبل "قرض" دینے کا تقاضا کیا جائے گا لیکن یہ باتیں عوامی رویے اور طریق کار میں رائج تھیں۔ قازق طلبہ کو گریجویشن تقریب میں ایک یا نصف بھیڑ فی طالب علم ادا کرنے کے لیے مجبور کیا جاتا تھا، جو ادا کرتے تھے، انھیں اسناد ضرور مل جاتی تھیں خواہ وہ کچھ بھی نہ جانتے ہوں۔ گریجویشن تقریب والی پارٹی، ضلعی پارٹی کے اراکین کے لیے شراب نوشی کی ایک بڑی تقریب کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ علاوہ ازیں تمام ضلعی افسر خط و کتابت کورس کے وسیلے سے تعلیم حاصل کرتے تھے اور اساتذہ کو ان کے لیے تمام تحریری ٹسٹ مکمل کرنے پڑتے تھے (احکامات اس طرح بھیجے جاتے تھے جیسے وہ کسی نواب کے ہاں سے آئے ہوں۔ ڈائرکٹر آف ناشنڈینہ کے توسط سے، اور اساتذہ غلاموں کے مانند اپنے بیرونی طلبہ پر ایک نظر بھی نہیں ڈال سکتے تھے)

میں نہیں جانتا کہ مستقل نراجی کے باعث، جو میرے عہدے پر کسی دوسرے شخص کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ممکن ہو گئی تھی یا بات اظہر من الشمس ہو گئی تھی، یا پھر اس زمانے کی عام نرمی کی وجہ سے یا شاید دونوں وجوہ سے، مجھے اپنی گردن ان کے جوئے سے محفوظ رکھنے میں معاونت ملی۔ میرے شاگرد اسی وقت تک پڑھنے میں دلچسپی رکھیں گے جب تک میں ایمانداری سے نمبر دوں گا اور ضلع کے سکریٹریوں کی پروا کیے بغیر دیانتداری برتتا تھا۔ نہ میں کوئی رقم وضع کرنے دیتا تھا نہ افسران کو کوئی "قرض" دیتا تھا۔ (شعبۂ تعلیم کی سانپ جیسے سر والی نے مانگنے کی حماقت کی تھی) میں نے اتنا ہی کافی جانا کہ ضرورت مند حکومت ہم سے ہر مئی میں ایک ماہ کی تنخواہ چھین لیتی تھی (جلاوطنی میں ہمیں آزاد افراد جیسا وہ حق حاصل ہو گیا تھا جو کیمپ میں چھین گیا تھا کہ ہم حکومت کے قرض میں پیسہ لگا سکتے تھے) لیکن میری اصول پرستی یہاں آ کر ختم ہو جاتی تھی۔

میں حیاتیات اور علم کیمیا کے استاد جارجی اسٹیپانووچ میٹرووچ کے ساتھ کام کرتا تھا جو سرویا کا باشندہ تھا اور رجعت پسندانہ ٹراٹسکی نواز سرگرمیوں کے لیے کولیما پر دس سال کی سزا بھگت چکا تھا۔ وہ ایک بوڑھا اور مریض ہونے کے باوصف بھی کو کیٹر کے مقامی مسائل کے حل اور انصاف پر عمل درآمد کے لیے سینہ سپر رہا۔

ضلع کے تعلیمی محکمے سے برخاست ہونے کے بعد بھی اسکول نے اسے ملازم رکھ لیا تھا اور اب وہ وہاں بھی اسی رویّے پر کاربند تھا۔ سچ پوچھیے تو کوکیٹز یک میں جہاں دیکھو وہیں طوائف الملوکی سی تھی جو جہالت، وحشی غرور اور خاندانی لن ترانیوں سے مزید بڑھ جاتی تھی۔ یہ طوائف الملوکی ایک تاریک الجھی ہوئی جھاڑی تھی لیکن میٹرودیچ اس کے خلاف بے غرضانہ (اور غیر جانبدارانہ انداز میں نبرد آزما تھا (یہ سچ ہے کہ اپنے ہونٹوں پر لینن کا نام لے کر لڑتا تھا) اساتذہ کی نشستوں میں اور استادوں کے ضلعی اجلاسوں میں اس نے خام کاروں پر انگشت نمائی کی۔ اس نے پارٹی کے اعلیٰ عہدوں پر فائز بیرونی طلبہ اور ایک بھیڑئیے "آخری امتحان پاس کرنے والوں کو فیل کر دیا، صوبائی صدر مقام، اُماتا کو شکایت نامے بھیجے، خروشچیف کو ذاتی نام سے تار بھجوائے (اس کی جانب سے اپیلوں کے لیے ستر والدین کے دستخط کیے گئے تھے اور یہ تار دوسرے ضلع میں جاکر بھیجے گئے تھے کیونکہ وہ ہمارے ضلع کی سرحد نہ پار کر سکتے تھے) اس نے حساب فہمی اور معائنے کی درخواست کی اور انسپکٹروں کی آمد پر اسی کو مخالفت کا شکار ہونا پڑا" اس پر طلبہ میں روس دشمن خیالات کی تشہیر کا الزام عائد کیا گیا (اور وہ گرفتاری سے بال بال بچ گیا!) نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس پر نوجوان آدان گارڈ کے باغیچے کی زمین پر منہ مارنے والی بکریوں سے بدسلوکی کرنے کا الزام لگایا گیا، اسے برخاست کر کے از سر نو متعین کیا گیا۔ اس نے کام سے جبراً غیر حاضر رکھنے کا معاوضہ حاصل کرنے کی کوشش کی تو اس کا تبادلہ دوسرے اسکول میں کر دیا گیا لیکن اس نے جانے سے انکار کر دیا اور دوبارہ برخاست ہو گیا۔ اس نے شاندار جدوجہد کی؟ اگر میں بھی اس وقت اس کے ساتھ ہوتا تو ہم نے اسے مزا چکھا دیا ہوتا۔

اس کے باوجود میں نے اس کی کوئی مدد نہیں کی۔ میں پُرامن رویّہ اختیار کیے ہوئے تھا۔ میں آخری رائے شماری کے وقت ہمیشہ پہلو تہی کر جاتا تھا (تاکہ اس کی مخالفت نہ کرنی پڑے) یا تو کسی کلب کی نشست میں پہنچ جاتا تھا، یا کسی ٹیوٹوریل میں۔ اس طرح میں نے پارٹی کے کارڈ رکھنے والے۔ بیرونی طلبہ کو کامیاب کرنے والے نمبر دینے کے خلاف کچھ نہیں کیا۔ وہی حکومت تھے — وہ جس حکومت کا حصہ ہیں اگر اس کو فریب دیتے ہیں تو دیتے رہیں مجھے اپنی چیز پوشیدہ رکھنی تھی میں لکھ رہا تھا اور لکھتا جا رہا تھا۔ میں بعد میں آنے والی جدوجہد کے لیے اپنی ذات کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن ایک زیادہ وسیع سوال کا جواب دینا ہوگا، کیا میٹرودیچ کی جدوجہد مناسب تھی؟ کیا یہ لازمی تھی؟

اس کی جنگ بالکل مایوس کن تھی اور اسے اس کا علم تھا، کوئی بھی اس الجھی ہوئی ڈور کو نہیں سلجھا سکتا تھا اور اگر وہ آسانی سے فتحیاب ہو گیا ہوتا تو اس سے سماجی نظام یا اس طریق کار کی اصلاح پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ ایک تنگ چھوٹی سی جگہ میں امید کی ایک ہلکی سی چمک پیدا ہو جاتی جو جلد ہی بادلوں سے ڈھک جاتی۔ فتح یاب ہونے سے جو کچھ ہوتا وہ دوبارہ گرفتاری کے خطرے کے مقابلے میں کچھ نہیں تھا۔ یہ قیمت اسے چکانی پڑ سکتی تھی۔ (صرف عہد خروشچیف کی وجہ سے میٹرودیچ محفوظ رہ سکا) ہاں، اس کی جنگ مایوس کن تھی لیکن بے انصافی دیکھ کر غضبناک ہونا، اتنا زیادہ کہ اپنی تباہی کو بھی دعوت دے دی جائے، انسانی فطرت ہے! اس کی جدوجہد کا انجام شکست ہی ہو سکتا تھا لیکن اسے فضول کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ اگر ہم سب اتنے دانشمند نہ ہوئے ہوتے، سب ہمیشہ ایک دوسرے کے سامنے یہ رونا نہ روتے کہ "اس میں کوئی فائدہ نہیں! اس میں کوئی فائدہ نہیں! اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا!" تو ہمارے وطن کی حالت قطعی مختلف ہوتی! میٹرودیچ تو شہری بھی نہیں تھا — وہ صرف ایک جلاوطن تھا — لیکن ضلع کے عہدیداران اس کے چشمے کی چمک سے خوف کھاتے تھے۔

بے شک وہ اس سے خائف تھے لیکن جب انتخابات واپس آتے، وہ خوبصورت دن، جب ہم اپنے محبوب جمہوری حکمرانوں کو انتخاب کرتے ہیں، تو یخوت جگجو میڑ ودیرہ میں (اب اس کا جوش و خروش کہاں تھا؟) مجھ میں اور م۔ ز میں، جو بہت ہی زیادہ کم سخن تھا اور بظاہر ہم سب سے زیادہ نرم مزاج معلوم ہوتا تھا، ساری تفریق ختم ہو جاتی تھی۔ ہم تینوں یکساں طور پر اپنی اذیت اور اپنی پریشانیوں کو چھپاتے تھے اور اس ہتھکنڈوں کے میلے میں حصہ لیتے تھے۔ کم و بیش تمام جلاوطنوں کو انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت تھی، ان پر اتنا کم صرف آتا تھا اور ان جلاوطنوں کو بھی اچانک اپنے نام فہرست میں نظر آجاتے تھے اور وہ لپک کر ووٹ دینے کے لیے پہنچ جاتے۔ کوکیٹریک میں کوئی پولنگ بوتھ بھی نہیں تھا، ایک بکس ہوتا تھا جس پر بعد بھی ڈالا جاتا تھا وہ ایک گوشے میں رکھا جاتا تھا اور اتنا الگ تھا کہ اس تک پہنچنے میں بھی پریشانی ہوتی تھی۔ ووٹ دینے کا مطلب یہ تھا کہ بیلٹ فارموں کو میز پر جلد از جلد لے جائیے اور انھیں اندر ٹھونس دیجیے۔ اس پر امیدوار کا نام پڑھنے کے لیے رکنا بھی شبہ پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ انھیں پڑھتے کس لیے ہو۔ شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ پارٹی کے لوگ نہیں جانتے کہ کس کا نام پیش کریں؟ اپنا ووٹ ڈال دینے کے بعد ہر فرد کو شراب پینے کا حق تھا (لوگ اپنی مزدوری کی شراب پی سکتے تھے یا پیشگی حاصل کر سکتے تھے جو انتخابات کے زمانے میں ہمیشہ مل جاتی تھی) اپنے عمدہ ترین سوٹ زیب تن کر کے وہ سب (جلاوطنوں سمیت) سنجیدگی کے ساتھ سلام دعا کرتے ہوئے ایک دوسرے کے لیے مسرت بخش تعطیل کی خواہش کا اظہار کرتے تھے۔

اس سلسلے میں آپ کیمپوں کی تعریف کر سکتے ہیں کہ وہاں انتخابات نہیں ہوتے تھے!

ایک مرتبہ کوکیٹریک میں ایک عوامی منصف کا چناؤ کیا گیا جو قازق تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اتفاق رائے سے منتخب ہوا۔ ہمیشہ کی مانند انھوں نے اس مبارک دن بھی ایک دوسرے کو مبارک بادیاں دیں لیکن کچھ ماہ بعد اس جج پر ضلع میں ایک قانون شکنی کا الزام عائد کیا گیا جس میں وہ پہلے انصاف کا فرض ادا کرتا تھا (وہاں بھی وہ بھی اتفاق رائے سے چنا گیا تھا) پتہ یہ چلا کہ کوکیٹریک میں بھی اس نے پرائیویٹ لوگوں سے رشوتیں لے کر اپنی جیب گرم کرنے کی کئی مواقع نکال لیے تھے۔ افسوس کہ اسے ہٹانا پڑا اور انھیں ضمنی انتخاب کرنے پڑے۔ اس مرتبہ بھی امیدوار بیرونی ہی تھا۔ وہ بھی قازق تھا اور کوئی اس سے واقف نہ تھا۔ اتوار کو سارے قصبے والوں نے اپنے عمدہ ترین ملبوسات زیب تن کر کے علی الصبح ووٹ دیے اور اتفاق رائے سے اسی کو چنا گیا۔ وہی خوش باش چہرے آنکھوں میں کسی قسم کا حجاب لیے بغیر ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔

سخت مشقتی کیمپ میں ہم نے اس مسخرگی کا ہمیشہ کھلے عام مذاق اڑایا تھا لیکن جلاوطنی میں آسانی سے دوسروں کو اپنے دل کی بات نہیں کہنی چاہیے: جلاوطن کی زندگی آزاد لوگوں کی زندگی کی مانند ہوتی ہے اور آزاد لوگوں کی جو پہلی عادت وہ اختیار کرتا ہے وہ ہے خاموش رہنا! — م۔ ز اُن معدودے چند افراد میں سے تھا جس کے ساتھ میں ایسی باتوں کے بارے میں گفتگو کر سکتا تھا۔

اسے انھوں نے دویز کازگان سے بھیجا تھا اور ایک کوپک دیے بغیر بھیجا تھا۔ اس کا پیسہ راستے میں ہی کہیں روک لیا گیا تھا۔ اس سے ایم۔ وی۔ ڈی کو شمہ برابر تشویش نہیں ہوئی۔ انھوں نے تو بس اسے جیل سے کھانے کی فراہمی بند کر دی اور اسے کوکیٹریک کی سڑک پر ہانک دیا، خواہ وہ چوری کرے یا مر جائے۔ اس وقت میں نے اسے دس روبل قرض دیے تھے اور اسے ہمیشہ کے لیے شکر گزار بنا لیا تھا۔ بہت دنوں بعد ایک دن رک کر اس نے

مجھے یاد دلا دیا کہ کس طرح میں نے اس کی معاونت کی تھی۔ اس کا ایک مستقل امتیاز یہ تھا کہ وہ رحم دلی کو ہمیشہ یاد رکھتا تھا نہ ہی نقصان کو بھولتا تھا (مثال کے طور پر وہ خداشیف سے خار کھاتا تھا وہ چھین لڑکا جو ایک خونی جنگ کا شکار ہوتے ہوتے بچ گیا تھا۔ لیکن اس دنیا میں کسی چیز کو ثبات نہیں۔ خداشیف نے بال بال بچ جانے پر شرارت اور ناواجب طریقے سے اپنی دشمنی م۔ ز کے بیٹے سے نکالی۔)

کسی پیشے میں مہارت نہ رکھنے والے جلاوطن کی حیثیت سے م۔ ز کو کیمپ میں کوئی اچھا کام نہیں مل سکا۔ جو سب سے اچھا کام اس کے ہاتھ لگا وہ اسکول کی تجربہ گاہ میں اسسٹنٹ کا عہدہ تھا جو اسے بے حد پسند آیا لیکن اپنے اس عہدے کی وجہ سے اسے ہر شخص کا حکم بجالانے کے لیے تیار رہنا پڑتا تھا۔ وہ پلٹ کر جواب نہیں دے سکتا تھا اور اپنی عزتِ نفس کا پاس نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے خیالات اپنی ذات تک محدود رکھتا تھا اور ظاہری منکسر المزاجی کے وسیلے سے کسی کو اپنی دلی کیفیت معلوم کرنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔ اور کوئی بھی اس کے متعلق بالکل معمولی باتیں تک نہیں جانتا تھا یہ بھی کوئی نہیں جانتا تھا کہ پچاس برس کی عمر پہنچا بیٹا باوجود اس کا اپنا کوئی پیشہ نہیں تھا ہم دونوں کس طرح دوست بن گئے ہمارا تصادم نہیں ہوا اور ہم اکثر ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ ہمارے ردِ عمل اور ان کے اظہار کے طریقے جو کیمپوں میں سیکھے گئے تھے بالکل ایک جیسے تھے۔ اگرچہ وہ اس بارے میں بہت دن خاموش رہا لیکن بالآخر مجھے اس کی بیرونی اور نجی زندگی کی احتیاط کے ساتھ پوشیدہ رکھی گئی داستان معلوم ہو گئی۔ یہ عبرتناک ہے۔

قبل از جنگ وہ ز۔۔۔ میں ضلعی پارٹی کا سکریٹری تھا اور ایام جنگ میں ایک ڈویژن کے سائفر سکشن کے شعبے (یعنی اس شعبے میں جہاں خفیہ زبان میں پیغامات پڑھے اور بھیجے جاتے ہیں) کا انچارج تھا۔ وہ ہمیشہ اونچے عہدوں پر رہا اور اہم آدمی سمجھا گیا تھا اور اس نے چھوٹے چھوٹے آدمیوں کی دشواریاں ابھی محسوس نہیں کی تھیں۔ ایک بار ۱۹۴۲ء میں ڈویژن کی ایک ریجمنٹ کو پسپا ہونے کا حکم عین وقت پر نہیں ملا اور یہ قصور سائفر سکشن کا تھا۔ غلطی کا ازالہ ضروری تھا لیکن یہ ہوا کہ م۔ ز کے تمام ماتحت مارے گئے تھے یا کہیں غائب ہو گئے تھے اور جنرل نے خود م۔ ز کو اگلے سیکٹر میں بھیجا۔ موت کے جبڑوں میں جو پہلے ہی ریجمنٹ کو اپنی گرفت میں لے رہے تھے۔ انھیں پیچھے ہٹنے کا حکم دو! انھیں بچاؤ! م۔ ز گھوڑے پر گیا، وہ بہت فکرمند اور اپنی زندگی کے بارے میں خوفزدہ تھا۔ راستے میں اس نے اپنے آپ کو ایسے خطرے کے منہ میں پایا کہ آگے نہ بڑھنے کا فیصلہ کیا اور اسے شک تھا کہ جس مقام پر وہ تھا وہاں بھی شاید موت سے نہ بچ سکے گا۔ وہ دانستہ رک گیا اور ریجمنٹ کو اس کی قسمت پر چھوڑ دیا۔ اس نے غداری کی، گھوڑے سے اتر گیا اور ایک درخت سے لپٹ گیا (یا پھٹتے ہوئے گولوں سے بچنے کے لیے پیڑ کی پناہ لی) اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ جیہواہ (یہودیوں کا خدا) کے سامنے قسم کھائی کہ اگر وہ زندہ رہا تو خلوصِ قلب کے ساتھ مذہب کا پابند رہیگا اور مذہبی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے گا۔ انجام خوشگوار رہا۔ ریجمنٹ کا ایک ایک فرد مارا گیا یا قید کر لیا گیا۔ لیکن م۔ ز زندہ واپس آ گیا۔ اسے دفعہ ۵۸ میں دس برس کیمپ میں رہنے کی سزا دی گئی۔ جو اس نے پوری کی اور اب وہ میرے ساتھ یہاں کو کیپ ٹریک میں تھا۔ اس نے بڑی سختی کے ساتھ اپنے وعدے کو نبھایا! اس کے کمیونسٹ ماضی کا اب اس کے دل و دماغ پر کوئی اثر باقی نہیں تھا۔ اس کی بیوی دھوکے سے کھلا دیتی تو دوسری بات تھی ورنہ وہ کبھی ناپاک مچھلی یعنی بغیر فلس کی مچھلی نہیں کھاتا تھا۔ وہ سنیچر کو کام پر آنے سے نہیں بچ سکتا تھا لیکن وہاں رہ کر کچھ بھی نہ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر یہ وہ تمام مذہبی رسوم کا پابند تھا اور عبادت گزار تھا۔ لیکن خفیہ طور پر جیسا کہ سوویٹ حالات

کا تقاضا تھا۔

اچھا ہی تھا کہ اس نے اپنی داستان بہت ہی کم لوگوں پر ظاہر کی تھی۔

مجھے یہ اتنی سیدھی سادی نہیں لگتی۔ اس کے بارے میں یہی بات وہ ہے جو ہمارے ملک میں لوگ تسلیم نہیں کرنا چاہتے کہ ہماری زندگی کی خاص الخاص باطنی ضرورت مذہب ہے پارٹی کے نظریات نہیں!

ہم اس کے بارے میں فیصلہ کیسے کریں؟ آپ جس اصول کے تحت دیکھیں، تعزیری قانون، فوجی قانون، عزت کے اصول، حب الوطنی کے اصول اور پارٹی کے قانون ــــ وہ ہر اعتبار سے مذمت اور موت کا مستحق تھا، اس نے اپنی جان بچانے کے لیے تمام رجمنٹ کو قربان کر دیا۔ یہ بات الگ ہے کہ وہ اس وقت تک یہودیوں کے سب سے زیادہ ہولناک دشمن سے نفرت نہ کر سکا۔

لیکن م۔ ز۔ کسی زیادہ بلند قانون کا سہارا لے سکتا تھا اور جواباً کہہ سکتا تھا کیا تمہارے سارے ماہرینِ جنگ نامردی کے بطن سے ہی نہیں پیدا ہوتے؟ ہٹلر کس وجہ سے روس کی طرف مائل ہوا ــــ نامردی ہی کی وجہ سے ــــ اپنے، اسٹالن اور چیمبرلین کی بزدلی کی وجہ سے ــــ اور اب تم مجھے موت کو گلے لگانے کے لیے کہہ رہے ہو؟ کیا مجھے اس دنیا میں لانے والے تم تھے؟ کچھ لوگ معترض ہوں گے کہ یہ بات فوج میں بھرتی ہونے کے وقت کہنی چاہیے تھی (اور تب تو اسی طرح اس بدقسمت رجمنٹ کے تمام لوگوں کو کہنی چاہیے تھے!) جب وہ اسے ایک خوبصورت وردی پہننے کے لیے دے رہے تھے نہ کہ وہاں درخت سے لپٹ لپٹ کر منطق کے اعتبار سے میں اس کی کوئی صفائی پیش نہیں کرنا چاہتا، منطق کے لحاظ سے مجھے بھی اس سے نفرت کرنی چاہیے تھی، شدید نفرت کرنی چاہیے تھی۔ اس سے مصافحہ کرتے ہوئے گھن آنی چاہیے تھی۔

لیکن اس کے لیے ایسا کوئی جذبہ مجھ میں نہیں تھا کیوں کہ میں اسی رجمنٹ میں نہیں تھا۔ میں نے یہ تجربہ نہیں کیا تھا کہ اس کی حیثیت میں ہونے کا کیا مطلب تھا؟ کیوں کہ مجھے شبہ تھا کہ ان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے سو دیگر اسباب بھی اکٹھا ہو گئے تھے؟ کیونکہ میں نے م۔ ز کو اس کے دورِ عروج میں نہیں دیکھا تھا بلکہ اس وقت دیکھا تھا جب وہ روبہ زوال ہو چکا تھا؟ خواہ کوئی بھی وجہ ہو، ہم روزانہ جوش اور خلوصِ دل کے ساتھ مصافحہ کرتے تھے اور مجھے ایک مرتبہ بھی ایسا احساس نہیں ہوا کہ اس میں کوئی ذلت کی بات تھی۔ ایک شخص ایک ہی زندگی کے مختلف ادوار میں بہت سے کرداروں کا حامل ہو سکتا ہے وہ اپنے شیں اور دوسروں کے لیے بھی کتنا مختلف ہو سکتا ہے اور ان مختلف کرداروں میں سے ایک کو ہم ایک فرمان، ایک قانون ایک اشتعال یا اپنی اندھی غلط فہمی کی ترغیب پر تیزی اور بے قراری کے ساتھ سنگسار کر دیتے ہیں!

لیکن اگر وہ پتھر آپ کے ہاتھ سے پھسل جائے تو کیا ہو؟ اگر آپ ہی گہری دلدل میں پھنسے ہوئے ہوں اور چیزوں کو مختلف آنکھوں سے دیکھنے لگیں؟ جرم کو؟ مجرم کو؟ اور اپنے آپ کو؟

اس ضخیم کتاب میں ہم نے کئی بار بہت اونچی اونچی اصولی باتیں کی ہیں۔ میں حیرت اور غصے کی آوازیں سن رہا ہوں تم حدِ فاصل کہاں کھینچنا چاہتے ہو؟ کیا ہم ہر شخص کو معاف کر دیا کریں!

نہیں، میں ہر شخص کو معاف کر دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ صرف انھیں جو گر گئے ہیں۔ جب عظیم مجسمہ حکم صادر کرتے ہوئے ہمارے سروں پر کھڑا ہے، اس کی تیوریاں چڑھی ہوئی ہیں، انا پسند اور سخت مجسمہ ہماری

زندگیوں کو تہس نہس کر رہا ہے۔ اس وقت مجھے ہی سب سے بھاری پتھر پھینکنے دیجیے! یا آئیے ہم ایک درجن افراد موٹے موٹے ڈنڈے سنبھالیں اور اسے اس بلندی سے نیچے گرا دیں۔

لیکن ایک مرتبہ اس کے گر جانے کے بعد اس کے زمین بوس ہو جانے کے بعد جب اس کے چہرے پر عرفانِ ذات کی پہلی جھلک نظر آ جائے — تو اپنے پتھر نیچے رکھ دیجیے!

وہ کسی کی امداد کے بغیر انسانیت کی راہ پر لوٹ رہا ہے اسے اس خدا کے ودیعت کردہ راستے سے محروم نہ کیجیے۔

مندرجہ بالا جلاوطنی کے مقامات کے بعد مجھے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہم کوکٹیریک والے جلاوطن اور خاص طور پر قازقستان اور کرغیزیہ کے جلاوطن بہتر حالت میں تھے ہمیں ان لوگوں نے آباد علاقوں میں بسایا تھا جہاں پانی تھا اور زمین مکمل طور پر بنجر نہیں تھی (چو وادی اور کوروٹیں ضلع میں تو یہ بے حد زرخیز تھی) ہم میں بہت سے شہروں میں پہنچے (دزانبول، چمکینٹ، طلاس، حتیٰ کہ الماتا یا فرونزے) جہاں حقوق میں کمتر ہم لوگوں میں اور حقوق کے حامل شہری لوگوں میں کوئی واضح تفریق نظر نہ آتی تھی۔ کھانا سستا تھا اور کام ان شہروں میں، خاص طور پر صنعتی بستیوں میں آسانی سے مل جاتا تھا۔ کیوں کہ مقامی عوام میں صنعت، مہارت والے پیشوں اور ذہنی کاموں کے لیے جوش و خروش کم تھا۔ لیکن جو لوگ دہقانی علاقوں میں پہنچے ان سب کے سب کو کولخوزوں میں نہیں جوتا گیا۔ ہمارے کوکٹیریک میں چار ہزار آدمی تھے جن میں بیشتر جلاوطن تھے لیکن شہر کے کچھ قازق جیسے ہی ایک کولخوز کے تحت آتے تھے بقیہ تمام لوگ مشین اور ٹریکٹر اسٹیشن پر جیسے تیسے کام حاصل کر لیتے تھے یا کسی جگہ معمولی تنخواہ پر برائے نام ملازمت کر لیتے تھے اور چوتھائی ہیکٹر والے باغ کے سہارے زندگی بسر کرتے تھے جس کے ساتھ ایک گائے، چند سؤر اور کچھ بھیڑیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ بات معنی خیز تھی کہ ہمارے درمیان بستے ہوئے مغربی یوکرین کے ایک گروہ کو (جو پانچ سال تک کیمپوں میں قیام کے بعد انتظامی جلاوطنی میں تھا) جو مقامی تعمیری ایجنسی کے لیے محنت سے کچے مکانات بنا رہا تھا کوکٹیریک کی مٹیالی زمین پر (جو اچھی آبپاشی کی کمی کے باعث دھول بن جاتی تھی لیکن کم از کم کولخوز جیسی زمین نہ تھی) زندگی اپنے خوش حال اور عزیز یوکرین کے کولخوز کی زندگی کے مقابلے میں اتنی آرام دہ محسوس ہوئی کہ جب رہائی کا زمانہ آیا تو وہ سب کے سب ہمیشہ کے لیے کوکٹیریک میں ہی آباد ہو گئے۔

کوکٹیریک میں افسرانِ تحفظ بھی کاہل الوجود تھے۔ یہ ایک مثال تھی جہاں قازقوں کی عام کاہلی مفید ثابت ہوتی تھی۔ ہم میں سے کچھ مخبر بھی تھے لیکن ہم اس کو بمشکل پہچان سکتے تھے اور ان سے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

لیکن ان کی بے عملی کا اور ڈسپلن کے متواتر نرم ہونے کا اصل سبب خروشچیف کے دور کا آغاز تھا اس کا اثر جو راستے کے دھکوں اور رکاوٹوں سے سست رفتار ہو گیا تھا۔ بالآخر ہم تک بھی پہنچ گیا۔

ابتدا میں ایک مایوسی بھی ہوئی "وورو شیلوف عام معافی" جیسا کہ اسے مجمع الجزائر میں عام طور پر کہا جاتا تھا۔ ہر چند کہ اس کا نفاذ سات بیریوں نے کیا تھا) یہ سیاسی قیدیوں کے ساتھ ۲۷ جولائی ۱۹۵۳ کا ایک ظالمانہ مذاق ایک سبق تھا جو گہرائی تک نہیں پہنچا اور فراموش کر دیا گیا۔ کیمپ میں بھی اور جلاوطنی میں بھی عام معافی کی افواہیں سرگوشیوں میں پھیل رہی تھیں۔ لوگوں میں واہمات کی خصوصی صلاحیت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اینا سامین گروکوفا جو کئی بار سزا پا کر پندرہ سال جیل میں رہ چکی تھی، اپنی جھونپڑی کی دیوار پر شفاف آنکھوں

والے وورو شیلوف کی ایک تصویر آویزاں رکھتی تھی اور یہ سمجھتی تھی کہ وہ کوئی کرامت دکھائے گا۔ ہاں کرامت رونما ہوئی یہ وورو شیلوف کے دستخطوں کے تحت ایک حکم نامے میں تھی جس کے مطابق حکومت نے ۲۷ مارچ ۱۹۵۳ء میں ہمیں پھر بیوقوف بنا کر لطف حاصل کیا۔

ٹھیک ٹھیک کہا جائے تو مارچ ۱۹۵۳ء میں فوری طور پر ایک مصیبت زدہ ملک کے مصیبت زدہ حکمرانوں کے لیے مجرمین کو رہا کرنے کا کوئی آسان اور قرین فہم حیلہ تلاش کرنا ممکن نہ تھا بشرطیکہ وہ اچانک دنیا کے فانی ہونے کے احساس سے سرتاسر شرابور نہ ہو جائیں۔ اگرچہ کوٹوشیخن ہمیں مطلع کرتا ہے کہ قدیم روس میں بھی کسی زار کی تجہیز و تکفین کے روز مجرموں کے رہا کرنے کا رواج تھا جو ضمناً لوٹ مار کے کاموں کے لیے ایک اشارہ تھا (ماسکو والے فطرتاً خدا سے ڈرنے والے نہیں ہیں وہ سڑک پر مرد اور عورت دونوں کے کپڑے اتروا کر لے بھاگتے ہیں اور انھیں مارتے مارتے موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں) بلجوہی بات اس وقت بھی ہوئی۔ اسٹالن کے قبر میں پہنچ جانے کے بعد اس کے ورثاء عوامی ہردلعزیزی حاصل کرنے کے لیے بیقرار تھے اگرچہ اس کی وضاحت عام معافی کو "ہمارے ملک میں جرم کی صفائی" سے تعبیر کرتی تھی (تو پھر وہ اندر بیٹھے ہوئے تمام لوگ کون تھے؟ اگر بات سچ ہوتی تو رہا کرنے کے لیے کوئی آدمی نہ ہوتا) لیکن چونکہ وہ اب بھی اسٹالن کے عہد کی نقابیں پہنے ہوئے تھے؟ اب بھی غلاموں کی مانند انھیں فرسودہ تصورات کے حامل تھے اس لیے انھوں نے چوروں اور بدمعاشوں کو عام معافی دے دی لیکن ۵۸ والے صرف انھیں لوگوں کو معاف کیا گیا جنھیں صرف پانچ سال تک کی سزا تھی اچھی حکومتوں کے رویے کا توقع لگانے ناتجربہ کار لوگ شاید یہ خیال کریں کہ پانچ سال تک سے تین چوتھائی سیاسی قیدیوں کو گھر جانے کا موقع مل جائے گا۔ اصل میں صرف ہمارے جیسے دو فی صد کو ہی اس قسم کی طفلانہ سزائیں ملی تھیں (چور مقامی باشندوں پر ٹڈی دل کی طرح چھوڑ دیے گئے تھے اور کچھ عرصے بعد ہی اور کافی جانفشانی کے بعد ملیشیا نے عام معافی میں رہا کردہ بدمعاشوں کو ان کے قدیم محفوظ مقامات پر پہنچایا)

عام معافی کے ہمارے جلاوطنی کے مقام پر دلچسپ ردعمل ہوئے۔ ہم میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جنھوں نے اپنے زمانے میں طفلانہ سزا (پانچ سال تک کی) بھگتی تھی۔ لیکن اس کے بعد انھیں گھر جانے کا موقع دینے کی بجائے مقدمہ چلائے بغیر جلاوطن کر دیا گیا کوکتیریک میں یہ عمل بیشتر محض یوکرین اور مغربی بائیلوروس کے مردوں اور عورتوں کے ساتھ روا رکھا گیا تھا وہ دنیا کے سب سے غریب اور مصیبت زدہ لوگ تھے عام معافی کے بعد وہ بے حد مسرور ہوئے اور انتظار کرنے لگے کہ اب انھیں گھر بھیجا جائے گا لیکن تقریباً دو ماہ بعد مروج قسم کی سنگدلانہ وضاحت آئی: چونکہ انھیں (کیمپوں میں اپنی مدت مکمل کر لینے کے بعد اور مقدمے کے بغیر) پانچ برس کے لیے نہیں بلکہ مستقل طور پر جلاوطن کیا گیا تھا۔ اس لیے پانچ سال کی قید سے پہلے والی مدت، جس کی وجہ سے انھیں جلاوطنی میں بھیجا گیا تھا، شمار نہیں کی جائے گی اور عام معافی ان پر منطبق نہیں ہوتی پھر وہاں تونیا تعز ایچک نام کی ایک خالصتاً آزاد روسی عورت تھی جو اپنے جلاوطن شوہر کے ساتھ رہنے کے لیے یوکرین سے آئی تھی صفائی کی خاطر اسے جلاوطن نوآباد کی حیثیت سے درج کیا گیا تھا جب عام معافی کا اعلان ہوا تو وہ بھاگ کر ایم۔ وی ڈی کی چوکی پر پہنچی ___ "اوہ!" انھوں نے بڑا معقول جواب دیا "تمھیں اپنے شوہر کی طرح پانچ سال کی سزا تو نہیں ہوئی تھی تم تو یہاں غیر معینہ مدت کے لیے ہو اس لیے عام معافی کا اطلاق تم پر نہیں ہوتا!"

ڈرکیو اسرون اور جسٹینین قوانین کے خالق غصے سے ابل پڑتے......

اس طرح عام معافی سے کسی کو کچھ ہاتھ نہیں لگا لیکن جیسے جیسے گزرے بطور خاص بیریا کے زوال کے بعد [illegible]

تھوڑی تھوڑی کر کے کوئی شور و غل مچائے بغیر کچھ رعایتیں جلاوطنوں کے ملک میں دخل پانے لگیں۔ انھوں نے پانچ سال والوں کو گھر جانے کی اجازت دے دی، وہ جلاوطنوں کے بچوں کو آس پاس کے اداروں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلہ دینے لگے کام میں انھوں نے جلاوطنوں کو تحقیر کے ساتھ مخاطب کرنا بند کر دیا۔ زندگی بتدریج سہل ہوتی جا رہی تھی۔ جلاوطنوں نے اپنے پیشوں میں ترقی کرنی شروع کر دی۔

ایم۔ وی۔ ڈی کی چوکی میں کرسیاں خالی رہنے لگیں۔ وہ دوسرا افسر... کہاں ہے وہ؟ وہ اب یہاں کام نہیں کرتا۔ ملازمین کافی کم کیے جا رہے تھے اور جو تھوڑے رہ گئے تھے۔ انھوں نے ہم سے مزید نرمی برتنی شروع کر دی۔ پولس میں حاضری دینے کا فرض اب اتنا مقدس نہیں رہا۔ اگر کوئی آدمی شام کے کھانے کے وقت نہیں پہنچتا — وہ کوئی بات نہیں — اگلی مرتبہ وہ آجائے گا۔ ایک کے بعد ایک فرقے اور گروہ کو کچھ اختیارات دیے گئے۔ ضلع کے اندر سفر کرنے پر سے پابندی اٹھالی گئی اور دیگر صوبوں کے سفر میں زیادہ آزادی برتی جانے لگی۔ افواہیں بڑھتی گئیں۔ "وہ ہمیں گھر واپس چلا جانے دیں گے!" بے شک انھوں نے ترکمانوں کو چلا جانے دیا (ان لوگوں کو جو اسیر جنگ ہونے کے سبب جلاوطن کیے گئے تھے) پھر کردوں نے اپنے مکانات فروخت کرنے شروع کیے اور مکانوں کی قیمتیں یک لخت گر گئیں۔

انھوں نے کچھ سن رسیدہ انتقامی جلاوطنوں کو بھی رہا کر دیا۔ لوگوں نے ماسکو میں ان کے حق میں وکالت کی تھی اور تماشا دیکھیے کہ انھیں باعزت بری کر دیا گیا۔ جلاوطنوں میں جوش اور ولولہ پھیلنے لگا۔ جس سے وہ مشتعل اور مشکوک ہو گئے "کیا ہم واقعی یہاں سے چل دیں گے؟ کیا یہ سچ مچ ممکن ہے؟....."

مضحکہ خیز! جیسے وہ حکومت کبھی بھی کچھ رحم دل ہو سکتی تھی۔ کیمپ نے مجھے اپنے خیال پر مستحکم رہنے کی تعلیم دی اور مجھے یقین کرنے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہاں، عظیم روس کی قلبی سرزمین میں نہ میرا کنبہ تھا نہ دوست جبکہ وہاں جلاوطنی میں کچھ اطمینان جیسی بات محسوس کر رہا تھا۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں نے اتنے آرام سے پہلے کبھی زندگی بسر کی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنی جلاوطنی کے پہلے سال ایک خطرناک مرض مجھے تکلیف پہنچا رہا تھا جیسے اس نے میرے جیلروں سے سازش کر رکھی ہو۔ اور کوکیٹریک میں پورے ایک برس تک کوئی تشخیص نہ کر سکا کہ وہ کون سا مرض ہے۔ مجھے اپنی کلاس کے سامنے پیروں پر کھڑے ہونے میں بھی دشواری ہوتی یا اچھی طرح نیند نہیں آتی تھی اور بھوک بہت کم لگتی تھی، میں نے کیمپ میں جو کچھ لکھا تھا اور اپنے حافظے میں محفوظ کیا تھا اور جو کچھ میں نے اس وقت تک جلاوطنی کے عالم میں تخلیق کیا تھا وہ سب کچھ مجھے عجلت کے ساتھ قلمبند کرنا اور زمین میں دفن کر دینا پڑا۔ تاشقند کو روانگی سے ایک رات قبل ۱۹۵۳ء کی آخری رات، مجھے صاف صاف یاد ہے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میری زندگی اور ادب کا خاتمہ ہو رہا ہو۔ میں لٹا لٹا سا محسوس کر رہا تھا۔

لیکن میری بیماری میں کمی آگئی اور واقعتاً خوبصورت جلاوطنی کے میرے دو برسوں کا آغاز ہوا محض ایک پریشانی ایک محرومی کا احساس مجھ پر سایہ فگن ہو رہا تھا: میں نے شادی کرنے کی جرأت نہیں کی کیوں کہ ایسی کوئی خاتون نہ تھی جس پر میں اعتماد کر سکتا، اسے اپنی سنسان زندگی، اپنی تخلیق اور اپنی روپوشی کے مقامات کا راز بتا سکتا۔ لیکن میرے ایام مسلسل انتہائی خوشگوار اور اعلیٰ تصورات کی کیفیت میں بسر ہوتے اور مجھے اپنی آزادی پر کسی بھی بندش کا احساس نہیں ہوا۔ اسکول میں میں جتنے اسباق چاہتا پڑھا سکتا تھا اور دونوں شفٹوں میں — اور ہر سبق سے ایک ولولہ انگیز احساس مرتب ہوتا تھا کبھی تکان یا بیزاری نہیں ہوتی تھی اور روزانہ مجھے لکھنے کے لیے کچھ وقت مل جاتا تھا — اور وہاں مجھے کبھی اپنے خیالات کو مستقل کرنے میں دشواری نہیں ہوتی تھی جیسے جا ہیں قلم اٹھاتا۔ سطر بہ سطر خود بخود جڑتی چلی جاتیں ان اقوال کو جب میں

چقندر کے قتلے تراشنے کے لیے نہیں نکالا جاتا تھا، میں بے نکان لکھتا رہتا تھا ___ تمام اتواروں کو جب میں وہاں مقیم تھا، میں نے ایک ناول کی تخلیق میں صرف کیا (جو دس سال بعد ضبط کر لیا گیا) اور میرے پاس مستقبل کے لیے لکھنے کا بہت سا مواد تھا جہاں تک اشاعت کا سوال تھا اس کی توقع میری موت کے بعد ہی کی جا سکتی تھی۔

اب تک میرے پاس کچھ پیسہ جمع ہو گیا تھا اس لیے میں نے اپنے واسطے ایک کچا مکان خرید لیا اور لکھنے کے لیے ایک مضبوط میز کا آرڈر دے دیا لیکن میں بدستور انھیں ننگی لکڑیوں کے فرش پر سوتا رہا۔ میں نے ایک شارٹ ویو ریڈیو سیٹ بھی خریدا۔ رات کو میں اپنی کھڑکی کا پردہ کھینچ دیتا اور اپنے کان اسپیکر کے بالائی ریشمی پردے پر لگا لیتا تھا اور جیمنگ کی دھڑا دھڑ کے دوران اپنے دل پسندیدہ ممنوعہ خبریں سننے کی کوشش کرتا تھا اور عام طور پر وہ اجزا اپنے طور پر تیار کر لیتا تھا جو سننے میں نہیں آتے تھے۔

ہم برسوں سے ایسی بیہودہ باتیں سن سن کر اتنے بیزار آ چکے تھے کہ سچائی کے ایک ذرا سے ٹکڑے کے لیے مچلتے رہتے تھے خواہ وہ کتنی ہی شکستہ حالت میں کیوں نہ ہو اور پھر بھی یہ عمل اس دور کی عام قیمت سے کمتر تھا جو میں اس پر خرچ کرتا تھا: بچکانہ مغرب کے پاس ہم میں سے ان لوگوں کو عطا کرنے کے لیے کوئی دانش یا حوصلے کی دولت نہیں تھی جن کی پرورش مجھے الجزائر نے کی تھی۔

میرا چھوٹا سا گھر بستی کے بالکل آخری مشرقی کنارے پر تھا۔ میرے گیٹ کے سامنے ایک آبپاشی کی نہر، اسٹیپ اور ہر صبح کا طلوعِ آفتاب تھا۔ جب کبھی ہوا کے جھونکے آتے، میرے پھیپھڑے بڑے اشتیاق کے ساتھ انھیں پی جاتے تھے۔ شام کو اور رات میں، خواہ وہ تاریک ہو یا چاندنی سے لبریز، میں وہاں باہر اکیلا گشت کرتا اور پاگل کی طرح سانس لے لے کر چھوڑتا تھا۔ سو میٹر کے فاصلے تک کوئی مکان نہیں تھا، دائیں بائیں یا پیچھے کسی طرف نہیں۔

میں یہاں قیام کے لیے ہر طرح آمادہ تھا "ہمیشہ کے لیے" نہ سہی تو بھی کم از کم بیس برس کے لیے (میں نہیں سمجھتا کہ عمومی آزادی کے حالات اس سے قبل پیدا ہو سکیں گے اور میرا خیال خاص غلط بھی نہیں نکلا) ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کہیں اور جانے کی میری خواہش ہی ختم ہو گئی ہے (حالانکہ جب کبھی میں وسطِ روس کا کوئی نقشہ دیکھتا تھا تو میرے دل کی دھڑکن رُکنے لگتی تھی) میں تمام دنیا کو کسی باہری مقام سے اشارہ کرتی ہوئی چیز کی صورت میں دیکھتا تھا۔ اس لیے اس کے متعلق لکھنے کے سوا میرے لیے اور کوئی کام نہ ہوتا تھا۔

میں لبریز تھا۔

جب ریڈ شچیف جلاوطنی میں تھا تو اس کے دوست کنوزوف نے اسے لکھا تھا: "تمھیں یہ مطلع کرتے ہوئے مجھے رنج ہو رہا ہے میرے دوست، لیکن تمھاری موجودہ کیفیت کے کچھ فائدے بھی ہیں۔ سب انسانوں سے الگ، ان تمام باتوں سے دور جو ہماری آنکھوں کو چکاچوند دیتی ہیں، تم زیادہ بہتری کے ساتھ اپنے باطنی سفر کو جاری رکھ سکتے ہو، تم غیر جذباتیت کے ساتھ اپنے آپ کو دیکھ سکتے ہو اور انجام کار ان باتوں کے بارے میں نسبتاً غیر جانبدارانہ فیصلے کر سکتے ہو جن پر تم پہلے خواہشات اور دنیاوی تفکرات کے پردے میں سے نگاہ کرتے تھے۔ شاید بہت سی چیزوں کے تمھیں بالکل نئے پہلو نظر آئیں گے۔"

بالکل یہی صورت تھی اور چونکہ میں اس پاک نگاہ کو پسند کرتا تھا جو مجھے اس طرح حاصل ہوتی تھی اس لیے مجھے پورے طور پر احساس تھا کہ جلاوطنی میرے لیے ایک نعمت ہے!

اس دوران جلاوطنی کی دنیا کے تضادات اور سرگرمیاں مجھے زیادہ سے زیادہ متوجہ کرنے لگیں یا ہم دی ہوئی

کے افسران واضح طور پر رحم دل بن گئے اور ان کی تعداد میں مزید کمی آگئی۔ فرار کی صورت میں اب برائے نام پانچ سال کی سزا دی جاتی تھی۔ اور یہ بھی واقعتاً عمل میں نہیں لائی جاتی تھی۔ یکے بعد دیگرے فرقوں اور جماعتوں نے ایم۔ وی۔ ڈی میں حاضری دینا بند کر دیا اور پھر انھیں وہاں سے جانے کا حق مل گیا۔ مسرت اور امید کی لہریں ہماری پرسکون جلاوطن آبادی میں لرزش پیدا کرنے لگیں۔ اچانک بغیر کسی اشارے یا تنبیہ کے ایک دوسری عام معافی ہم پر نازل ہوئی۔ ستمبر ۱۹۵۵ء کی "ایڈینائر عام معافی"۔ یہ ایڈینائر کے ماسکو آنے اور یہ شرط رکھنے کے بعد منظور ہوئی کہ خروشچیف تمام جرمنوں کو رہا کر دے۔ جیسے ہی نکیتا نے ان کی رہائی کا حکم دیا ویسے ہی حالات کی مضحکہ خیزی جرمنوں کو رہا کر دینا اور ان کی معاونت کرنے والے روسیوں کو بیس برس تک قید رکھنا ــــ سامنے آگئی۔ لیکن چونکہ وہ سب پولیزئی، جرمنوں کے متعین کردہ بستیوں کے مکھیا یا ذلاسوداشٹ تھے اس لیے کوئی بھی اس عام معافی کی جانب عوام کی توجہ مبذول کرنے کا اشتیاق نہ رکھتا تھا اور بہر صورت ہمارے ملک میں معلومات کی تشہیر کے بارے میں ایک عام قانون ہے، حقیر باتوں کو اچھل اچھل کر شور مچا کر عام کیا جاتا ہے اور اہم خبریں آہستہ آہستہ چپکے سے بتائی جاتی ہیں۔ اس طرح انقلاب اکتوبر کے بعد ملنے والی سب سے بڑی عام معافی کے نام پر کوئی خاص دن نہیں منایا گیا اور وہ ۹ ستمبر کو صرف ایک مرتبہ "ازویستیا" میں مشتہر کی گئی اور وہاں بھی اندرونی صفحے پر، جس کے ساتھ نہ کوئی وضاحت تھی نہ کوئی تشریحی مضمون۔

میں منتشر الدماغی سے کیسے بچ سکتا تھا؟ میں نے اسے پڑھا: "ان اشخاص کے لیے عام معافی جنھوں نے جرمنوں کے ساتھ تعاون کیا تھا۔" اس میں میں کہاں سے آتا تھا؟ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا اطلاق مجھ پر نہیں ہوتا۔ میں نے تمام وقت سرخ فوج کی ملازمت کی تھی۔ بھاڑ میں جاؤ۔ مجھے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پھر میرے دوست ایل۔ زیڈ۔ کوشلیو نے ماسکو سے لکھا: اُس نے وہ عام معافی والا اخبار ماسکو کے ایک ملیشیا اسٹیشن پر جا کر دکھلایا اور ان سے گفتگو کر کے ایک عارضی سکونتی پروانہ طلب کیا۔ کچھ مدت کے بعد انھوں نے اسے بلوایا: "بات کیا ہے؟ ہمیں فریب دینے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟ تم تو معاونت کرنے والوں میں نہیں تھے، کیوں؟" "نہیں۔" "اور تم تو سوویٹ سپاہ میں ملازم تھے؟" "ہاں۔" "ٹھیک ہے، چوبیس گھنٹے کے اندر ماسکو سے باہر نکل جاؤ۔" وہ بیشک وہیں رہا جہاں تھا۔ لیکن "رات کے ڈیڑھ بجے کے بعد میں کان کھڑے رکھتا ہوں۔ گھنٹی کی ہر ٹن ٹن پر میں سمجھتا ہوں کہ وہ مجھے پکڑنے کے لیے آرہے ہیں!"

میں نے مسرور ہو کر سوچا کہ میں کتنا خوش نصیب ہوں! جب ایک مرتبہ میں نے اپنے مسودات چھپا دیے (میں ہر شام کو یہ عمل کرتا تھا) اس کے بعد میں بچے کی طرح سو جاتا تھا۔

اچھے صاف ستھرے ریگستان میں "پر ہجوم" بے سکون، مصنوعی ٹریفک بھڑک والے دارالسلطنت کا تصور کرتا تھا! اور وہاں جانے کے لیے مجھ میں کوئی خواہش پیدا نہیں ہوتی تھی۔

لیکن میرے ماسکو کے دوستوں نے اصرار کیا: "تم نے اپنے دل میں وہاں رہنے کی کیوں ٹھان لی ہے؟..... انصاف پر نظرِ ثانی کے لیے عرضی بھیجو۔ انھوں نے ان معاملات پر از سرِ نو غور کرنا شروع کر دیا ہے۔"!

میں کیوں درخواست کروں؟..... جہاں میں تھا وہاں میں پورے ایک گھنٹے تک چاہوں تو چیونٹیوں کو دیکھتا رہوں۔ جنھوں نے میرے مکان کی بنیادوں میں قورمیتوں، وارڈروں یا کیمپ ڈویژن کے کمانڈروں کی نگرانی کے بغیر ایک سوراخ کر لیا ہے اور وہ اپنے ساتھیوں کی ضرورت کے لیے بھوسی لے جا رہی ہیں۔ ایک دن یہ دفعتاً غیر حاضر پائی گئیں اگرچہ مکان کے باہر زمین پر بھوسی سی بکھری ہوئی تھی۔ سمجھا یہ تھا کہ کسان کی کھڑکی میں پہلے ہی آگیا تھا، انھیں معلوم

ہو چکا تھا کہ اس دن بارش ہوگی۔ حالانکہ روشن اور صاف آسمان پر ایسے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ بارش کے بعد ابھی بادل گھنے اور سیاہ تھے کہ وہ کام پر آ گئیں۔ انھیں یقینی طور پر معلوم تھا کہ اب بارش نہیں ہوگی۔

وہاں جلاوطنی کے سکون میں، پورے اعتماد کے ساتھ پشکن کی زندگی کا سچا راستہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کے مسرت کن دور کا پہلا جزو جنوب کی طرف اس کی جلاوطنی تھی جو اس کی دوسری عظیم جلاوطنی تھی جس میں اسے میخائلوفسکوئے بھیجا گیا تھا۔ دوسرے مقامات کی خواہش کرنے کی بجائے اسے وہیں رہنا چاہیے تھا اور قیام کو طول دینا چاہیے تھا کون سی ایسی مجبوری اسے پیٹرسبرگ کھینچ لے گئی؟ قسمت کی کس طاقت نے اسے شادی کر لینے کی ترغیب دی۔

پھر بھی جہاں تک عقل لے جاتی ہے وہاں تک انسان کے دل کی رسائی مشکل ہے تنکے کا سیلاب کے رخ پر نہ بہنا دشوار ہے۔

بیسویں کانگریس آئی۔ بہت عرصے تک ہمیں خروشچیف کی تقریر کا کوئی پتہ نہ چل سکا تھا۔ انھوں نے کونکریک میں کچھ لوگوں کے سامنے اسے پڑھنا شروع کیا لیکن جلاوطنوں سے اسے پوشیدہ رکھا گیا اور ہمیں اس کے متعلق بی، بی۔ سی سے معلوم ہوا لیکن میرے لیے ایک معمولی اخبار میں میکویان کے یہ لفظ کافی تھے: فلاں فلاں سنہ کے بعد سے یہ پہلی لینن پرست کانگریس ہے۔ میں سمجھ گیا دشمن اسٹالن کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ میں بلندی کی طرف گامزن ہو سکتا ہوں۔

اور اس طرح میں نے اپنے معاملے پر نظر ثانی کے لیے عرضداشت روانہ کی:
پھر موسم بہار میں انھوں نے تمام ۵۸ والوں پر سے جلاوطنی کی سزائیں ہٹا لیں۔
اپنے کمزور لمحات میں، میں نے اپنا پرسکون جلاوطنی کا دور ختم کر دیا اور باہر کی دھندلی کائنات میں چلا گیا

کسی سابق زیک میں مشرق سے مغرب کی جانب وولگا پار کرتے ہوئے تمام دن جنگل سے بھرے ہوئے روسی میدان پر گھڑگھڑاتی ہوئی ریل میں سفر کے دوران جو جذبات پیدا ہوتے ہیں وہ اس باب کا موضوع نہیں ہیں۔

ماسکو میں ان گرمیوں میں، میں نے سرکاری وکیل کے دفتر فون کر کے یہ دریافت کیا کہ میری اپیل کا کیا حشر ہوا۔ انھوں نے مجھے دوسرے نمبر ڈائل کرنے کو کہا جہاں سے ایک انٹراگیٹر کی پرخلوص اور شیریں آواز نے مجھے گپ شپ کرنے کے لیے لوبیانکا آنے کی دعوت دی مزنیٹسکی موسٹ پر واقع مشہور دفتر میں، جہاں پروانے جاری کیے جا سکتے ہیں! انھوں نے مجھ سے انتظار کرنے کو کہا۔ یہ شک ہونے پر کہ کسی کی نگاہ پہلے ہی سے مجھ پر ہے جو میرا چہرہ پڑھ رہی ہے میں نے اپنی باطنی کشیدگی کے باوجود اپنا چہرہ مطلق تکان کا سا بنا لیا اور یہ نمائش کی کہ میں ایک بچے کو دیکھ رہا ہوں جو کسی دلچسپی کے بغیر ویٹنگ روم کے درمیان کھیل رہا تھا۔ بالکل ویسا ہی، جیسا کہ میں نے سوچا تھا! میرا نیا تفتیش کنندہ افسر وہاں شہری پوشاک میں ملبوس تھا لمبے منہ سے دیکھ رہا تھا! جب اس نے یہ اطمینان کر لیا کہ میں سخت گیر دشمن نہیں ہوں تو وہ میرے پاس آیا اور بڑی محبت کے ساتھ مجھے لوبیانکا میں لے گیا۔ ہم ابھی راستے ہی میں تھے کہ وہ اظہار افسوس کرنے لگا کہ میری زندگی کو اس بیدردی کے ساتھ تباہ کر دیا گیا تھا (کس کے ہاتھوں؟)، کہ مجھے بال بچوں کی صحبت سے محروم کر دیا گیا۔ لیکن لوبیانکا کے حبس زدہ بجلی کی روشنی سے منور برآمدے اس وقت

کے مقابلے میں بدلے نہیں تھے۔ جب مجھے ان میں سے سر منڈا کر، ہاتھ پشت پر باندھ کر لے جایا گیا تھا تمہیں کتنا وحشی تفتیش کنندہ نصیب ہوا تھا ـــــ وہ یزیریوف ـــــ مجھے اس کا نام یاد ہے۔ اس کا اس وقت سے تنزل کر دیا گیا ہے۔ (غالباً وہ اگلے کمرے میں بیٹھا ہوا اس شخص کو گالیاں دے رہا ہوگا)" میں انسداد سراغرسانی کی بحری شاخ، 'اسمرش' میں تھا" ہمارے ہاں اس طرح کے لوگ نہیں تھے!" زریوین تمہارے ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔ تمہارے یہاں لیفشن اور لیبن تھے) لیکن میں سادہ لوحی کے ساتھ سر کو ہلا ہلا کر تائید کرتا رہا۔ وہ اسٹالن کے بارے میں میرے ۱۹۴۴ء کے لطیفوں پر ہنسا بھی! "تم نے یہ چیز بڑی وضاحت کے ساتھ لکھی ہے!" اس نے ان کہانیوں کی تعریف بھی کی جو میں نے سوچ رکھی تھیں اور جو فائل پر شہادت کے طور پر موجود تھیں۔ "ان میں تو مخالف روس کوئی بات نہیں ہے! تم چاہو تو انھیں لے جا سکتے ہو۔ انھیں شائع کرانے کی کوشش کرو۔" لیکن میں نے مری مری ہوئی آواز میں کہا "نہیں، خدا بچائے میں نے ادب سے بہت عرصہ ہوا توبہ کر لی ہے۔ اگر میں کچھ اور سال زندہ رہا تو طبیعیات کے مطالعے کی خواہش ہے۔"

(موسمی احتیاط! آئندہ ہم یہی کھیل کھیلیں گے۔)

* سزا نہ دینے سے آدمی بگڑ جاتا ہے۔ قید خانے سے ہم نے یقیناً کچھ سیکھا تھا۔ خواہ یہی کہ چیکا۔ جی۔ پی۔ کے روبرو کیسا رویہ اختیار کیا جائے۔

ساتواں باب

زیکوں کی آزادی

اس کتاب کے ایک باب کا عنوان ہم نے "گرفتاری" قرار دیا تھا کیا اب ایک باب کا عنوان "آزادی" قائم کرنے کی ضرورت ہے؟

جن افراد پر کسی بھی زمانے میں گرفتاری کی بجلی گری تھی (میں صرف ۵۸ والوں کی بات کروں گا) انکا پانچواں بلکہ شاید آٹھواں حصہ بھی اس "آزادی" سے فیضیاب ہونے کے لیے زندہ رہا ہو اس میں مجھے شبہ ہے۔

اور ہر حالت میں رہائی ایسی چیز ہے جسے ہر شخص سمجھتا ہے اس کا عالمی ادب میں بار بار تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور بہت سی فلمیں اس موضوع پر تیار کی گئی ہیں۔ میری تنہائی کی کوٹھری کا دروازہ کھلتا ہے۔ باہر دھوپ میں آتا ہوں ہجوم خوشی سے پاگل ہو جاتا ہے۔ اعزا بانہیں پھیلا کر بغل گیر ہونے لگتے ہیں۔

لیکن مجمع الجزائر کے خوشی سے عاری آسمان کے تلے "رہا" ہونے والوں پر کوئی عتاب ہے اور جیسے جیسے وہ آزادی کے علاقے میں آگے بڑھیں گے مطلع زیادہ ابر آلود ہوتا جائے گا۔

رہائی کی راہ طویل ہے۔ یہ عالم نشاط میں طے کی جاتی ہے۔ غیر ضروری موشگافیوں (اب قانون کو عجلت برتنے کی کیا ضرورت ہے؟) ان اعتبارات سے برفباشی کی مانند کی جانے والی گرفتاری سے مختلف ہوتی ہے اور ہر لحاظ سے رہائی دوبارہ گرفتاری کی ہی دوسری صورت ہے۔ اسی طرح ایک ریاست سے دوسری ریاست میں جانے پر سزا دینے کا کام، آپ کے دل، آپ کی زندگی اور نظریات کے ڈھانچے کو چکنا چور کر دینے والا احساس کے بدلے میں کوئی مدد نہ کرنے والا کام ہے۔

اگر گرفتاری کسی سیال کی سطح پر کہرے کا تیکھا لمس ہے تو رہائی دو کہرباریوں کے درمیانی وقفے کی نیم صفائی ہے۔ دو گرفتاریوں کے درمیان۔

دو گرفتاریوں کا درمیانی وقفہ — خروشچیف سے پہلے چالیس برسوں تک رہائی کا مفہوم یہی ہوتا تھا۔ یہ مجمع الجزائر کے درمیان پھینکی ہوئی ایک لائف بیلٹ تھی..... چھپ چھپ کرتے ہوئے ایک کیمپ سے دوسرے میں پہنچ جاؤ!.....

اولیں دن اور آخری دن کے مابین انتظار کرنے کہ قید کی میعاد کا مطلب۔ ایک کیمپ کی حد سے دوسرے کیمپ کی حد تک چلنا، یہ ہے رہائی کا مفہوم۔

آپ کا گندہ سبز پاسپورٹ، جس سے شاعر نے بعد اصرار تمام لوگوں کو ہلاک کرنے کی تلقین کی تھی، پاسپورٹ قوانین کی دفعہ ۳۹ سے منسلک والی روشنائی میں لتھڑا ہوا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کسی شہر میں، چھوٹے قصبے میں بھی رہنے کا پرمٹ حاصل نہیں کر سکتے۔ کیمپ میں کم از کم آپ کو راشن تو ملتا تھا لیکن یہاں وہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔

مزید برآں آپ کی نقل و حرکت کی آزادی مصنوعی ہے.....

ان بدنصیب لوگوں کی حالت کو "رہائی" کا نام دینے کی جگہ "جلا وطنی سے محروم" کہنا مناسب ترین بیان ہوگا۔ قسمت کے اشارے پر جلا وطنی کی نعمت جن کے لیے ممنوع ہے وہ لوگ زبردستی کراسنویارسک کے جنگلات یا قازق ریگستان میں نہیں جا سکتے۔ جہاں اُن جیسے بے شمار افراد ہیں۔ چار رجانب اتنی کثیر تعداد میں "سابق کچھ" ہیں! انہیں وہ آزادی کی پُرصعوبت دنیا کے عمق میں غوطہ لگاتے ہیں۔ جہاں ہر شخص ان سے روگردانی کرتا ہے اور جہاں وہ نشان زد افراد ہیں یا قید کی نئی میعاد کے امیدوار ہیں۔

"نتالیہ آئیوانوفنا اسٹولیاروفا، ۲۶ر اپریل ۱۹۴۵ء کو کارلاگ سے رہا ہوئی تھی۔ وہ فوراً وہاں سے روانہ نہ ہو سکی: اسے پاسپورٹ لینا تھا۔ اس کے پاس روٹی کا کارڈ نہیں تھا۔ رہائشی جگہ نہیں تھی۔ اسے ملنے والا واحد کام شہتیر چیر کر ایندھن تیار کرنا تھا۔ جب اندرونی دوستوں کے جمع کیے ہوئے کچھ روبل اس کے پاس ختم ہو گئے تو اسٹولیاروفا لوٹ کر کیمپ کے پھاٹک پر آ گئی اور اس نے پہریداروں سے کچھ ایسی بات کہی کہ مجھے اپنا سامان لانا ہے (مقامی طریقے گرہستی والوں کے سے تھے) اور اپنی جھونپڑی میں جا کر بیٹھ رہی..... اسے ایسا اطمینان کبھی نصیب نہیں ہوا تھا! اس کے دوستوں نے اسے گھیر لیا اور اس کے لیے باورچی خانے سے دلیہ لائے (اوہ، اس کا ذائقہ کتنا لذیذ تھا!) ہنستے رہے اور اس کی روداد سنتے رہے کہ باہر وہ کتنی کھوئی کھوئی سی بے گھر بار کی تھی۔ نہیں شکریہ — یہاں ہم زیادہ آرام سے ہیں۔ ہماری ایک نہیں ہزار بار! ڈیوٹی افسر نے ڈانٹ ڈپٹ تو کی لیکن رات کو اسے کیمپ میں رہنے دیا (یوم مئی کے پہلے کی شام) تاکہ وہ صبح چلی جائے۔

اسٹولیاروفا نے کیمپ میں شدید محنت کی ہے، کبھی آرام نہیں کیا (وہ کمسنی میں پیرس سے سوویت یونین آئی تھی اور کچھ ہی دنوں بعد اندر ڈال دی گئی تھی اور آزاد ہونے کے لیے بے قرار تھی تاکہ وہ اپنی مادرِ وطن کا کچھ حصہ دیکھ سکے!) اس کے اچھے کام کے صلے میں اسے خصوصی شرائط کے ساتھ رہا کیا گیا۔ اسے کسی خاص بستی کے نام نہیں لکھا گیا جو لوگ کسی خاص مقام پر بھیجے گئے تھے وہ کسی نہ کسی طرح کام حاصل کر لیتے تھے۔ ملیشیا انھیں اور کہیں نہیں ہانک سکتی تھی۔ لیکن اسٹولیاروفا، جس کا رہائی کا تصدیق نامہ صاف تھا، گھر سے باہر نکال دیے جانے والے کتے کی طرح تھی۔ وہ جہاں بھی جاتی ملیشیا اس کا نام درج کرنے سے انکار کر دیتی تھی۔ ماسکو کے جن خاندانوں سے اس کی اچھی شناسائی تھی وہ اس کے لیے چائے بناتے تھے لیکن کوئی بھی اس سے اپنے ہاں سو جانے کو نہیں کہتا تھا۔ وہ اپنی راتیں اسٹیشنوں پر بسر کرتی تھی (ایک بُری بات یہ تھی کہ ملیشیا والے تمام رات چاروں طرف گشت کر کے لوگوں کو سونے سے منع کرتے تھے اور صبح ہونے سے قبل انھیں وہاں سے ہٹا دیتے تھے تاکہ فرش کی صفائی کی جا سکے۔) لیکن اتنا ہی کافی نہ تھا۔ جو ایک بھی کبھی کسی بڑے اسٹیشن سے گزرا ہے، اسے یاد ہوگا کہ کسی ملیشیا والے کی آمد پر اس کا دل کس طرح بیٹھ جاتا تھا۔ وہ کتنا سخت مزاج نظر آتا ہے۔ یقیناً اس کی قوت شامہ اسے بتا دیتی ہے کہ آپ سابق زیک ہیں کسی بھی لمحے وہ آپ کے کاغذات طلب کرے گا اور وہ آپ کی رہائی کا تصدیق نامہ لے لیگا اور بس، آپ دوبارہ زیک ہو گئے۔ ہمارے لیے حقوق قوانین، حتیٰ کہ انسانیت بھی کوئی چیز نہیں ہے، دستاویز ہی سب کچھ ہے! اب وہ کسی بھی وقت آپ کی دستاویز پر ہاتھ رکھ دے گا — اور بس، بات ختم ہو گئی۔ یہ ہمارے جذبات ہیں.....) اتفاقاً میں اسٹولیاروفا کا مکمل کام چاہتی تھی ہوسٹانے بننے کا کام، نہ صرف عام مزدوری کے لیے بلکہ جرمن اسیرانِ جنگ کے یہاں انھوں نے

صرف اسے ملازم رکھنے سے انکار کر دیا بلکہ باس نے اس کی توہین بھی کی اور سب کے سامنے اس سے کہا: "تم ہماری تنظیم میں چور دروازے سے داخل ہونا چاہتی ہو! ہم تمہاری عیارانہ چالوں سے واقف ہیں ہم نے شینن کی تخلیقات پڑھ رکھی ہیں! اور وہ مجوابشینن! اگر اس میں ذرا بھی غیرت ہوتی تو اپنے آپ کو پھانسی لگا لیتا!) یہ ایک مسموم دائرہ ہے۔ رہائشی پرمٹ کے بغیر ملازمت نہیں مل سکتی اور ملازمت کے بغیر پرمٹ نہیں ملتا۔ اور ملازمت کے بغیر آپ کو راشن کارڈ بھی نہیں دیا جاتا سابق زیک یہ قانون نہیں جانتے تھے کہ ایم۔ وی۔ ڈی کا یہ فرض بھی ہے کہ ان کے لیے کام تلاش کرے اور جنھیں معلوم بھی تھا تو وہ گزارش کرتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں ہمیں پھر اندر نہ بند کر دیا جائے.....

بے شک آپ آزاد ہو گئے ہیں لیکن اب تو آپ کی پریشانیوں کا آغاز ہوا ہے۔

میری طالب علمی کے زمانے میں اوسٹوف یونیورسٹی میں ایک عجیب و غریب پروفیسر تھا جس کا نام این۔ اے ٹریفونوف تھا اس کا سر شانے کی طرف کھنچا رہتا تھا اور وہ ہمیشہ گھبرایا ہوا سا اور اعصابی کشیدگی میں مبتلا رہتا تھا اسے یہ بات پسند نہ تھی کہ لوگ اسے برآمدے میں آواز دیں۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اندر رہ چکا تھا اور جب کوئی اسے برآمدے میں پکارتا تھا تو اسے خیال آتا تھا کہ شاید افسر تحفظ نے اسے طلب کیا ہے۔

جنگ کے بعد اوسٹوف میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں ایک کیمپ سے رہائی پانے والا ڈاکٹر جسے اپنی دوبارہ گرفتاری کا یقین تھا انتظار کرنے کے لیے تیار نہ تھا چنانچہ اس نے خودکشی کر لی۔ جو بھی کیمپ میں رہ چکا تھا انھیں بخوبی پہچانتا ہے اور بآسانی یہ عمل کر سکتا ہے کیوں کہ یہ کیمپ میں قیام کرنے سے زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔

دراصل وہ لوگ بدنصیب تھے جو بہت جلد رہائی پا گئے! ایوینیٹر بورلیوف کی باری ۱۹۴۶ء میں آگئی۔ کسی بڑے شہر میں جانے کی بجائے وہ اپنی جائے ولادت پر چلا گیا۔ اس کے تمام قدیم احباب، جو اس کے ساتھ پروان چڑھے تھے، سڑک پر اس سے نگاہ بچائے گفتگو کیے بغیر نکل جانے کی کوشش کرتے تھے (اور یہ کل کے بے خوف آوارہ گارڈ کے سپاہی تھے) اگر بات کرنی لازمی ہو جائے تو سوچ سمجھ کر گول مول جواب دیتے تھے اور آگے کھسک جاتے تھے۔ کسی نے بھی کبھی اس سے دریافت نہیں کیا کہ ان تمام برسوں کی زندگی میں اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا (اگرچہ ہم میں سے بیشتر لوگ جتنا وسطی افریقہ کے بارے میں جانتے ہیں مجھے الجزائر کے متعلق اتنا بھی نہیں جانتے) (کیا ہماری آئندہ نسل کو کبھی یہ احساس ہوگا کہ ہمارے آزاد شہری کتنے تربیت یافتہ لوگ تھے!) لیکن اس کے ایک ہم جماعت دوست نے ایک شام کو اندھیرا ہو جانے کے بعد اسے چائے پر مدعو کیا۔ کیا رفاقت ہے! کتنی محبت ہے! اندرونی حرارت کے بغیر سمجھنا ممکن نہیں ہے ایوینیٹر نے کچھ پرانی تصویریں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور دوست نے اسے دکھانے کے لیے البم نکالا۔ دوست بھول گیا تھا اور یہ دیکھ کر متعجب ہوا کہ ادنیٹر دفعتاً اٹھا اور چائے کا انتظار کیے بغیر نکل گیا۔ اندازہ کیجیے، جب اسے تمام تصویروں میں اپنے چہرے پر سیاہی پتی ہوئی نظر آئی ہوگی تو اس کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی!

بعد ازاں ایوینیٹر دنیاوی اعتبار سے کامیاب ہوا اور ایک یتیم خانے کا سربراہ بن گیا۔ اس کی نگرانی میں پرورش پانے والے بچے قریب ہی کے تھے اور سب متمول والدین کے بچے ان کے سربراہ کو "جیلر" کہتے تھے تو وہ بچے مغموم ہو جاتے تھے کیونکہ ان کے آس پاس کوئی نہیں ہوتا۔ انھیں ان کے والدین کو جیلر کہنا چاہیے اور ایوینیٹر کو جیل کا مارا ہوا کیونکہ صدی میں روسی لوگ اپنی زبان کے بارے میں اتنے لاپرواہ ہرگز نہیں تھے!

کارٹیل ہر چند دفعہ ۵۸ کے تحت اندر گیا تھا لیکن اسے ۱۹۴۲ء میں پھیپھڑے کے ناکارہ ہو جانے کے باعث استطائی کارروائی کے ذریعے رہا کر دیا گیا تھا۔ اس کے پاسپورٹ پر ایک سیاہ نشان تھا۔ وہ کسی شہر میں قیام نہیں کر سکتا تھا اور ہر شخص اس سے دور بھاگتا تھا..... پھر رنگروٹوں کو بھرتی کرنے والا کمیشن عجلت میں آیا۔ وہ لڑنے کے لیے سپاہیوں کی تلاش میں تھا۔ حالانکہ اس کی تپ دق بڑھ چکی تھی لیکن کارٹیل نے اپنے آپ کو تندرست ظاہر کیا۔ وہ اپنے برابر والوں کے ساتھ مر جائے گا! اس نے تقریباً جنگ کے اختتام تک مورچے پر کام کیا۔ صرف اسپتال کے تیسرے سیکشن کی آنکھوں نے اس ایثار پیشہ فوجی میں چھپے ہوئے عوام دشمن کو شناخت کر لیا۔ ۱۹۴۹ء میں اسے دوسری بار گرفتار کرنے کے لیے نشان زد کر دیا گیا لیکن فوجی رجسٹریشن کے شعبے کے نیک نفس لوگوں نے اس کی معاونت کی۔

اسٹالن کے دور اقتدار میں رہائی پانے کے بعد بہترین صورت یہ تھی کہ پھاٹک سے باہر نکل جاؤ اور وہیں رہ پڑو۔ ایسے لوگوں کے بارے میں پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ کام پر ہیں اور انہیں ملازمتیں مل جاتی تھیں۔ ایم۔ وی۔ ڈی والے بھی انھیں سڑک پر دیکھ کر سمجھتے تھے کہ یہ وہ افراد ہیں جن کی تربیت مکمل ہو چکی ہے۔

لیکن ہمیشہ نہیں ـــ جب پرد خوردت ـــ اسٹوفر ۱۹۴۰ء میں رہا ہوا تو اس نے بالملاگ میں آزاد انجینئر کی حیثیت سے سکونت اختیار کر لی۔ شعبۂ تحفظ کے افسر اعلیٰ رودزان بٹ نے اس سے کہا: "تم کو رہا ضرور کر دیا گیا ہے لیکن یاد رکھو کہ تمہیں بہت سنبھل کر چلنا ہو گا۔ قدموں کو ذرا سی لغزش ہوئی کہ تم پھر زیک بن جاؤ گے۔ ہمیں تم پر مقدمہ بھی نہیں چلانا پڑے گا اس لیے پھونک پھونک کر چلنا اور اس گمان میں نہ رہنا کہ تم آزاد شہری ہو۔"

اس قسم کے سمجھدار زیک، جو کیمپوں کے نزدیک ہی سکونت اختیار کر لیتے تھے اور جیل کو رضاکارانہ طور پر آزادی کی ایک قسم سمجھتے تھے، اب بھی لاکھوں کی تعداد میں دور دراز کے جنگلات میں ناٹروب یا ناریم جیسے اضلاع میں موجود ہیں اور اگر انھیں پھر اندر جانا ہو تو کوئی خاص زحمت نہ تھی، جیل بغل ہی میں تو موجود ہے۔

کولیما میں واقعتاً پسند کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ لوگوں سے چھپے رہتے تھے۔ رہا ہونے والا زیک اپنی مرضی سے ایک حلف نامہ داخل کرتا تھا کہ وہ ڈلسموئی کے لیے کام کرتا رہے گا۔ (اصل سرزمین پر جانے کی اجازت حاصل کرنا رہا ہونے سے بھی مشکل کام تھا) مثال کے طور پر این۔ وی۔ سروفتیسفا بدنصیبی کے ہاتھوں اپنی رہائی کی منزل تک پہنچ گئی۔ کل تک اس نے بچوں کی بستی میں کام کیا تھا جہاں وہ گرم کمرے میں رہتی تھی اور اچھا کھانا کھاتی تھی لیکن اب اسے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے باہر نکال دیا گیا کیوں کہ دوسرا کوئی کام نہیں تھا۔ کل تک وہ لیٹنے اور کھانے کی طرف سے بے فکر تھی اور اب نہ اس کے پاس کھانے کا بندوبست تھا نہ سر چھپانے کا ٹھکانہ۔ وہ ایک خستہ حال مکان میں چلی گئی جس کا فرش ٹوٹ چکا تھا (یہ سب کولیما پر!)۔ وہ بچوں کی بستی والے اپنے دوستوں کی احسان مند تھی جو اس کی رہائی کے کافی عرصے بعد تک اسے چپ چاپ کھانا پہنچا دیتے تھے۔ "آزادی اندر ہے"۔ بوجھ ان الفاظ کے ساتھ اس نے اپنے نئے تجربات کا ذکر کیا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی اور آخر میں ایک مکان کی مالک بن گئی! دیکھیے وہ کس فخر کے ساتھ ایک جھونپڑے کے سامنے ایستادہ ہے جسے قیام گاہ کے طور پر کتے بھی ناپسند کریں گے (تصویر نمبر ۲)۔

(اگر قارئین یہ سوچتے ہیں کہ یہ تمام باتیں محض ناگفتہ بہ کولیما ہی پر صادق آتی ہیں تو آئیے وسط ایشیا چلیں لو۔ ایک عام، وی۔ بی۔ ایس (عارضی سول تعمیر) کی جھونپڑی دیکھیں جس میں آزاد آبادی کے خوشحال امکان ـــ

سابق زیک رکھے جاتے ہیں (تصویر نمبر ۵)

اس طرح آزادی کا مطلب اس سے کہیں بدتر ہے۔ جرائم پی یعقوبووچ کے ذہن میں تھی۔ کارگنڈلسے کچھ ہی دوری پر ایک جیل کو معذوروں کی قیام گاہ میں تبدیل کر دیا گیا — مخوموف ہوم — اور اسے رہائی کے بعد یہاں رکھا گیا۔ اسے نگرانی میں رہنا پڑا اور وہاں سے کہیں اور جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔

روڈکونسکی کو جب کہیں پناہ نہ ملی (میں نے اتنی ہی صعوبتیں جھیلیں جتنی کیمپوں میں جھیلی تھیں) تو وہ کوستانائی کے قریب نئی غیر آباد زمینوں پر چلا گیا ("وہاں آپ کو ہر قسم کے لوگ ملتے ہیں۔") آئی۔ وی۔ شوئیڈ کی قوت سماعت نوریلسک میں ہونے برفیلے طوفان کے دوران ٹرین اسمبل کرتے ہوئے ضائع ہو گئی تھی بعد ازاں اس نے متواتر بارہ برس روزانہ بارہ گھنٹے کوئلہ جھونکنے کا کام کیا۔ لیکن اس کے پاس ضروری تصدیق نامے نہیں تھے سماجی حفاظت کے عہدیداروں نے اپنے شانے جھٹکے "کیا تم گواہ پیش کر سکتے ہو؟" جی ہاں، وہاں الرس (دریائی جانور) تھے..... آئی۔ ایس کارپونیچ نے کولیما میں بیس سال گزارے تھے اور وہ نحیف و مریض تھا۔ لیکن ساٹھ سال کی عمر میں ابھی اس کے پاس اُجرت کے ساتھ روزی کمانے کے پچیس برس جمع نہیں ہو سکے تھے اس لیے کوئی پنشن نہیں! کوئی فرد کیمپ میں جتنی زیادہ مدت تک مقیم رہا تھا اتنا ہی زیادہ بیمار تھا اور اس کا سروس ریکارڈ اسی مناسبت سے کم مدت کے لیے تھا اور اسی لحاظ سے اسے پنشن ملنے کی گنجائش بھی کم تھی۔

ہمارے یہاں ظاہر ہے کہ قیدیوں کی معاونت کرنے والا ویسا کوئی ادارہ نہیں جیسے کہ انگلینڈ میں قائم ہیں۔ اس قسم کی نظم و نسق کو نقصان پہنچانے والی کسی بات کے بارے میں سوچنا تک خطرناک ہے۔[۲]

لوگ مجھے لکھتے ہیں کہ "کیمپ آئیوان ڈینیسووچ کی زندگی میں ایک دن تھا — اور باہر واپس آنا اس کی زندگی کا دوسرا دن۔"

ذرا توقف کیجیے! یقیناً اس کے بعد سے آزادی کا سورج ابھر چکا ہے؟ یقیناً ہاتھ دردمندوں تک پہنچ چکے ہیں۔ "ایسا پھر کبھی نہ ہو سکے گا"؟ یقیناً پارٹی کانگریسوں کے اسٹیج پر آنسو بھی بہائے گئے ہیں؟

زدکوف (کو فروف سے) "لیکن ہمیں اب بھی عادی مجرم کہا جاتا ہے اور جب ملازمین کی تخفیف ہوتی ہے تو سب سے پہلی ضرب ہم پر پڑتی ہے....." پی۔ جی مخونوف: "مجھے از سر نو آباد کر دیا گیا ہے اور میں ایک تحقیقی ادارے میں کام کرتا ہوں۔ کیمپوں کے آقاؤں کی طرح احمق الذہن اب بھی ہم پر دھونس جماتے ہیں۔" جی۔ الیف۔ پ دف: "کوئی ذرہ کچھ بھی کہے یا کرے لیکن میرے ساتھیوں کو صرف یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ میں جیل میں تھا اور بس — وہ اچانک مجھ سے کنی کاٹنے لگتے ہیں۔"

جی ہاں۔ شیطان بہت قوی ہے! ہماری مادرِ وطن کچھ اس قسم کی ہے کہ اس نے ظلم کی طرف ایک گز ہٹانے کے لیے کسی ابرو کا تر ہونا یا ہلکی سی کھانسی کافی ہے لیکن اسے آزادی کی راہ پر ایک انچ کھینچنے کے لیے آپ کو سو بیل جوتنے پڑیں گے اور ہر ایک کے پیچھے ڈنڈا لے کر بیٹھنا ہوگا۔ "دیکھو! تم کدھر جا رہے ہو؟ دیکھنا تم کدھر کھینچ رہے ہو!"

نوآبادکاریت کے قوانین کی کیا کیفیت تھی؟ پچ — نام کی ضعیف خاتون کو ایک خشک فرمان ملا "کل صبح دس بجے ملیشیا کے روبرو حاضری دے۔" اور کچھ نہیں۔ اس کی لڑکی حکم نامہ لے کر عجلت میں وہاں پہنچی، جب اس کی

زندگی کی فکر ہے' اس کو دیکھ کر اس کی جان نکل جائے گی۔ یہ سب کس چیز کے بارے میں ہے؟ میں اس کا ذہن کس بات کے لیے ہموار کروں؟" "درست' یہ اس کے لیے خوشی کا باعث ہوگا۔ اس کے مرحوم شوہر کو بے گناہ تسلیم کر لیا گیا ہے" لیکن شاید یہ خبر اس کے لیے ورم ووڈ (Wormwood) کی مانند ہو گی یہ بات اس کے ان خیر اندیشوں کی سمجھ میں کبھی نہیں آ سکتی۔

اگر ہماری رحم دلی کا یہ عالم ہے تو ذرا سوچیے کہ ہماری سنگدلی کی نوعیت کیا ہو گی؟

نوآبادوں کا کیسا سیلاب آیا ہوا تھا! لیکن یہ بھی ہمارے بے حس معاشرے کی سنگین ظالمانہ نفسیات کو نہیں بدل سکا! وجہ یہ تھی کہ سیلاب اس شاہراہ پر نہیں آیا جس پر آپ کو صرف ابرو پر بل ڈالنے ہوتے ہیں' بلکہ اس راستے پر آیا جہاں آپ کو ایک ہزار بیل جوتنے کی ضرورت پڑتی ہے!

"نوآبادکاری سرتاسر ایک اسٹنٹ ہے! پارٹی کے پاس آپ سے کھل کر کہیں گے" حد سے زیادہ لوگوں کی نوآبادکاری کی گئی تھی!

ولادیمر زارین (روسٹوف آن دی ڈان) نے پندرہ کی کمسنی اور آئندہ دس برسوں تک اپنی زبان کو بند رکھا پھر ۱۹۶۰ء میں اس نے اپنے ساتھیوں کو یہ بتا دینا مناسب سمجھا کہ کیمپوں کی حالت کتنی بُری تھی۔ اس کے بارے میں تفتیش شروع کر دی گئی اور کے۔ جی۔ بی کے ایک میجر نے اس سے کہا "نوآبادکاری کا یہ مطلب نہیں کہ بے قصور تم تھے مطلب صرف یہ ہے کہ تمہارے جرائم اتنے شدید نوعیت کے نہ تھے۔ لیکن کچھ نہ کچھ تو ہمیشہ باقی رہ جاتا ہے۔"

ریگا میں ۱۹۶۰ء میں تاپیٹروپا فکوفسکی کے ایک ایک دوست مل کر لگا تار تین ماہ تک اس کی جان بینیتی میں کیسے رہے کیونکہ اس نے یہ بات پوشیدہ رکھی تھی کہ اس کے باپ کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا تھا ۱۹۳۷ء میں.....

کو موگور کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا "آجکل کیسے درست سمجھا جاتا ہے اور کیسے غلط؟ یہ" اس وقت کہا، بائیں جب کوئی بازاری غنڈہ اچانک مساوات اور بھائی چارگی کے بارے میں تقریر شروع کر دیتا ہے؟

اپنی نوآبادکاری کے بعد مارکیلو۔ نسے کوئی ایرا غیرا نہیں۔ ایک انڈسٹریل انشورنس کونسل کا صدر یا آسان زبان میں کہا جائے تو اس کی ٹریڈ یونین کی برانچ کا صدر بن گیا کونسل کا صدر عوام کے ذریعہ منتخب کیے ہوئے اس آدمی کو اپنے دفتر میں ایک منٹ کے لیے بھی تنہا چھوڑنے کا روادار نہ تھا! اور پارٹی بیورو کا سکریٹری بالیوف جو ساتھ ہی ساتھ عملی شعبے کا انچارج بھی تھا' اپنے آپ' محفوظ رکھنے کے لیے مارکیلوف کے نام ٹریڈ یونین کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے آنے والی تمام ڈاک درمیان میں کھول لیا کرتا تھا: "مقامی کمیٹیوں کے لیے ضمنی انتخابات کے بارے میں ایک کاغذ' کیا وہ تمہاری نگاہ سے گزرا ہے؟" "ہاں تھا تو۔ کوئی ایک ماہ قبل" "مجھے اس کی ضرورت ہے" "تو پھر' کہو۔ لو اسے دیکھ لو' ذرا جلدی سے' اب گھر جانے کا وقت ہو رہا ہے" "دیکھو' یہ میرے نام آیا ہے۔ میں اسے کل واپس کر دوں گا!" "کیسی بات کرتے ہو تم! یہ سرکاری دستاویز ہے" ذرا اپنے آپ کو مارکیلوف کی جگہ تصور کر کے دیکھیے جبکہ بالیوف جیسا بدمعاش آپ کی ٹوہ میں ہو۔ ذرا خیال کیجیے کہ آپ کی تنخواہ اور سماجی پروانہ اسی بالیوف کے قبضہ قدرت میں ہے اور اپنے بیسیوں سال آزادی کی ہوا سے بھر لیجیے!

ایک اسکول کی استانی دیفا کو "دیانتداری کے جرم میں برخاست کر دیا گیا" اس نے شادی کر کے اپنے پیشے کے وقار کو نقصان پہنچایا ہے اس کا شوہر ایک رہا شدہ قیدی تھا (جو کیمپ میں اسی سے پڑھا کرتا تھا۔)!

اور یہ صورت حال خروشچیف کے عہد اقتدار میں تھی۔ اشالن کے نہیں۔

آپ کو اپنے ماضی کے لیے سرٹیفکیٹ کے سوا اور کچھ نہیں پیش کرنا ہے۔ ایک چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ بارہ سینٹی میٹر ضرب اٹھارہ سینٹی میٹر۔ وہ زندوں کو نوآباد اور مردوں کو مرحوم ثابت کرتا ہے۔ موت کی تاریخ کے تعین کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ جائے وفات ـــــ ایک بڑا سا زیڈ کا حرف (جس کا مطلب ہے "جیل میں") موت کا سبب ـــــ آپ سو اوراق دیکھ جائیے، ہر جگہ ملے گا: "دقتی بیماری" بعض مرتبہ (فرضی) گواہوں کے نام بھی درج ہوتے ہیں۔

جبکہ اصل گواہ خاموش رہتے ہیں۔

ہم خاموش ہیں۔

آئندہ نسلیں کسی سے کچھ سیکھ سکتی ہیں؟ دروازہ مقفل ہے، کیلوں سے جڑا ہوا ہے۔ دروازوں پر کاغذ چپکا دیے گئے ہیں۔۔۔۔

• نوجوان تنگ" ورپوفسکی گلہ کرتا ہے "نوآبادوں کو شبہ اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں"۔

لیکن سب نہیں، بیشتر نوجوانوں کو اس بات سے کوئی غرض ہی نہیں ہے کہ ہمیں نوآباد کیا گیا یا نہیں، بلکہ ایک کروڑ بیس لاکھ آدمی تاحال قید میں ہیں یا اب نہیں ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا اُن پر کیا اثر پڑتا ہے۔ جب تک وہ خود آزاد ہیں، ان کے ٹیپ ریکارڈر ہیں اور ان کی اڑتی ہوئی زلفوں والی معشوقائیں ہیں!

مچھلی کبھی مچھلی خانے کے خلاف بغاوت نہیں کرتی ـــــ وہ صرف جال میں سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کیا کرتی ہے۔

جس طرح کوئی عام مرض علیحدہ علیحدہ افراد میں الگ الگ طریقے سے شدت اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح ہم پر آزادی کے اثرات مختلف صورتوں میں مرتسم ہوئے ہیں جیسا کہ زیادہ باریکی سے تجزیہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے۔

پہلے اس کے مادی اثرات سے ابتدا کریں۔ کچھ لوگوں نے کیمپوں میں زندہ رہ کر اپنا وقت گزارنے کی غرض سے لڑنے میں خود کو بے حد تھکا ڈالا۔ انھوں نے وہ تمام مصائب فولادی آدمیوں کی مانند برداشت کیے تھے مکمل دس سال تک جسمانی ضرورت سے بہت کم خوراک حاصل کی، کام کیا، عملاً زندگی بسر کی، برفیلے موسم میں نیم برہنہ رہ کر پتھر توڑے اور کبھی سردی میں مبتلا نہیں ہوئے لیکن ایک مرتبہ سزا کی میعاد مکمل ہو جانے پر، ایک بار بیرونی غیر انسانی دباؤ ہٹ جانے پر ان کی اندرونی کشیدگی بھی کم ہو گئی۔ ایسے لوگ دباؤ کے دفعتاً ختم ہو جانے پر غارت ہو جاتے ہیں، دیو قامت چلپینوف جیسے شہتیر تراشنے میں سات برسوں کے دوران کبھی سردی تک نہیں لگی، آزاد ہو کر متعدد امراض میں مبتلا ہو گیا۔ جی۔ اے سوروکن: "نوآبادکاری کے بعد میری ذہنی صحت، جس سے کیمپ میں میرے ساتھی رشک کھاتے تھے، ابتر ہو گئی۔ متعدد نیوراسسی امراض اور سائیکوسس۔۔۔۔۔" آئیگرکامینوف: "اپنی رہائی کے بعد میں کمزور ہو گیا اور میرے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور باہر آکر کام کیمپ کی بہ نسبت دشوار محسوس ہوتے ہیں"۔

لوگوں میں پہلے ایک کہاوت رائج تھی: مصیبت آپ کو قوی بناتی ہے اور اچھے دن آپ کو شراب کی راہ پر لگاتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک آدمی کے تمام دانت ایک سال کے اندر گر جائیں گے۔ بعض اوقات وہ ایک ہی رات میں بوڑھا ہو جائے گا۔ کوئی گھر واپس آکر اپنی تمام قوت کھو دے گا اور دہ جل کر مر جائے گا۔

لیکن کچھ اور لوگ بھی تھے جنھوں نے رہائی کے بعد حوصلہ قائم رکھا۔ ان کے لیے اب اور زیادہ جوان ہونے

کا اپنے بازو پھیلانے کا وقت آیا تھا۔ میں ہی اس پہلے فوٹو کی بہ نسبت جو میں نے جلا وطنی کے دوران کھنچوایا تھا، اب زیادہ جوان لگتا ہوں) اچانک الہام کی طرح یہ بات نظر آتی ہے کہ آزادی مل جانے پر آپ کے لیے زندگی آسان ہو گئی ہے اور یہاں مجمع الجزائر میں قوتِ کشش بالکل مختلف ہوتی ہے آپ کو اپنی ٹانگیں اتنی وزنی لگتی ہیں جیسے ہاتھی کی ہوں لیکن یہاں وہ اس تیزی کے ساتھ چلتی ہیں جیسے کسی چڑیا کی ہوں۔ وہ تمام مسائل جو ان لوگوں کو تنگ کرتے ہیں اور اذیت پہنچاتے ہیں جو ہمیشہ آزاد رہے ہیں، ہم لوگ زبان کی ایک گردش سے حل کر لیتے ہیں ہمارے اپنے مسرور کن معیارات ہیں: "پہلے حالت اس سے بھی خراب رہ چکی ہے" چونکہ پہلے حالت اس سے خراب تھی اس لیے اب سب ٹھیک ہے۔ ہم اس بات کا اعادہ کرتے ہوئے نہیں تھکتے "پہلے حالات خراب تر تھے! حالات اور خراب رہ چکے ہیں۔"

لیکن جذبات اور نفسیات کی کشیدگی سے انسان کے مستقبل کا زاویہ زیادہ مستحکم انداز میں متعین کیا جا سکتا ہے۔ یہ کشیدگی متفرق صورتیں اختیار کر سکتی ہیں۔ گارڈ ہاؤس کی دہلیز پر ہی آپ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ آپ اپنے پیچھے جو کچھ چھوڑے جا رہے ہیں وہ آپ کی جیل بھی تھی اور آپ کا گھر بلکہ وطن بھی ——— یہ آپ کی باطنی جائے ولادت تھی اور آپ کی روح کا ایک نادیدہ عنصر یہاں ہمیشہ رہے گا جبکہ آزادی کی بے زبان اور غیر مخلص وسعت میں آپ کے پیر گھسٹ گھسٹ کر چلیں گے۔

کیمپوں میں انسان کا کردار نکھر جاتا ہے لیکن یہی بات رہائی پر بھی صادق آتی ہے۔ الکسے ییفا کورنیفا، جس سے ہم اپنی داستان میں پہلے مل چکے ہیں، ۱۹۵۱ء میں ایک اسپیشل کیمپ سے رہا ہوئی: "پانچ میٹر والے پھاٹک میرے نکلتے ہی بند ہو گئے اور اگرچہ میں خود اس پر بدقت یقین کر سکی لیکن باہر آزادی کی دنیا میں قدم رکھنے کے وقت میں اشکبار تھی۔ کس چیز کے لیے رو رہی تھی؟ میں یہ محسوس کرتی تھی کہ جیسے میں نے اپنے دل کو اس چیز سے جو میری نظر میں سب سے زیادہ محبوب اور بیش قیمت تھی یعنی اپنی بدقسمتی کے ساتھیوں سے کاٹ کر علیحدہ کر لیا ہے۔ پھاٹک بند ہو گیا ——— اور یہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ میں ان لوگوں سے پھر کبھی نہ مل سکوں گا۔ ان کی کوئی خبر مجھے نہیں ملے گی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں دوسری دنیا میں پہنچ گئی تھی ....."

دوسری دنیا میں! ..... رہائی موت کی شکل میں؟ شاید ہم رہا نہیں ہوئے تھے؟ شاید ہم مر گئے تھے؟ قبر کے دوسری طرف ہر اعتبار سے ایک نئی زندگی بسر کرنے کے لیے! کسی حد تک آسیبی زندگی گزارنے کے لیے جس میں ہم اپنے چاروں طرف کی اشیاء کو احتیاط سے محسوس کرتے تھے اور اس طرح انھیں شناخت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

زندوں کی دنیا میں رہائی کو ہم نے بیشک بالکل مختلف انداز میں سوچا تھا ہم نے اس کا وہ نقشہ بنایا تھا جیسا کہ پشکن نے تیار کیا تھا: "اور تمہارے بھائی تمہاری تلوار تمہیں واپس کر دیں گے"* لیکن یہ سعادت قیدیوں کی بہت کم نسلوں کو مقسوم ہوئی ہے۔

ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہماری آزادی چرائی گئی ہو۔ وہ معتبر نہیں تھی جن لوگوں نے ایسا محسوس کیا انھوں نے اپنی مسروقہ آزادی کے ملبے کو جمع کیا اور اس کے ساتھ کسی سنسان مقام پر چلے گئے۔ کیمپ میں تو میرے تقریباً تمام ساتھی میرے ہی طرح یہ سوچتے تھے کہ اگر خدا نے ہمیں کبھی کیمپ سے زندہ نکالا تو ہم شہروں حتی کہ گاؤں میں بھی قیام نہیں کریں گے بلکہ کہیں گھنے جنگلوں میں مسکن بنائیں گے۔ ہم فارسٹر، ریفیر یا یہ بھی ممکن نہ ہوا تو چرواہوں کی طرح کام کریں گے اور لوگوں سے، سیاست سے، دنیا کے تمام جنجال سے، توہات سے حتی الامکان دور رہیں گے۔" (بی۔ بی۔ یو چیٹ، رہائی کے کچھ عرصے بعد ایونیٹر لورنیوت دوسرے لوگوں سے گریز کرتے ہوئے گاؤں میں جاکر پناہ گزین ہوا۔" مجھے خواہش ہوتی تھی کہ ہر

کھجور اور چنار کے درخت کو گلے سے لگالوں، بوسہ دوں۔ گرے ہوئے پتوں کی سرسراہٹ (میں موسم خزاں میں رہا کیا گیا تھا) مجھے موسیقی آمیز معلوم ہوتی تھی اور میری آنکھیں بھر آئیں۔ مجھے اس بات کا رنج نہیں تھا کہ مجھے صرف پانچ سو گرام روٹی دی جاتی ہے۔ میں اس خاموشی کو مسلسل گھنٹوں کان لگائے سنتا رہتا تھا اور کتب بینی بھی کرتا تھا۔ اب آزاد ہو کر مجھے ہر قسم کا کام آسان اور سہل معلوم ہوتا تھا۔ دن گھنٹوں کی طرح اڑتے تھے۔ زندگی کے لیے میری تشنگی کسی طرح سیر نہ ہوتی تھی۔ اگر دنیا میں کہیں مسرت کا وجود ہے تو بلاشبہ یہ وہ ہے جو کسی کو ایک آزاد انسان کی حیثیت سے رہنے پر اپنے پہلے سال میں نصیب ہوتا ہے.....!

ایسے لوگ کسی چیز کا مالک بننے کی کوشش بڑی تاخیر سے کرتے ہیں۔ انھیں یاد رہتا ہے کہ املاک بہت آسانی سے غارت ہو جاتی ہے ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ ان میں نئی چیزوں کے لیے تقریباً اندھی عدم انسیت ہوتی ہے۔ وہی پرانا لباس پہنتے چلے جاتے ہیں۔ انھیں قدیم خستہ حال کرسیوں پر بیٹھتے ہیں۔ میرے ایک دوست کے پاس ایسا ڈھیلا ڈھالا فرنیچر تھا کہ ایسی کوئی چیز نہ تھی جس پر حفاظت کے ساتھ بیٹھا جا سکے یا جس کا سہارا لیا جا سکے۔ وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے "یہ طریقہ ہے جینے کا۔۔۔ دو کیمپوں کے درمیان" (اس کی بیوی بھی اندر رہ چکی تھی)

ایل۔ کوپلیف ۱۹۵۵ء میں واپس آیا اور اسے ایک نئی بات کا علم ہوا: "میں کامیاب لوگوں کے پاس جاکر بے چینی محسوس کرتا ہوں! میں اپنے پرانے دوستوں میں سے صرف ان لوگوں سے رابطہ رکھتا ہوں جو کسی حیثیت سے بدنصیب ہوں"

لیکن پھر وہ لوگ انسان کی حیثیت سے دلچسپ ہوتے ہیں جو کیریئر یا دنیاداری کے زینے پر زیادہ اوپر نہیں جا پاتے کامیاب کیریئر والے آدمی سے زیادہ بیزار کن اور کوئی نہیں ہوتا۔

لیکن لوگ الگ الگ قسم کے ہوتے ہیں اور بہت سے لوگوں نے آزادی کی فصیل بہت سے دوسرے مقاصد کے ساتھ پارکی تھی (بطور خاص ان ایام میں سب چھپا رہے۔ ہاں۔ یہاں کی انجمنیں کچھ بندش لگتی ہیں) افادہ اعتماد ہوں۔ ایک بات کی میں سنجیدگی کے ساتھ قسم کھاتا ہوں۔ اندر پہنچ جا نہیں جانوں کا اب کچھ ضائع ہو چکا ہے اس سب کی تلافی کروں گا۔

کچھ لوگ وہ عہدے حاصل کرنا چاہتے ہیں جہاں انھیں ہونا چاہیے تھا۔ کچھ وہ (تعلیمی یا فوجی) امتیازات حاصل کرنا چاہتے ہیں جو ان کے پاس ہونے چاہئیں۔ کچھ وہ دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں جو انھوں نے کمائی ہوتی۔ اور بس اندر کر لیے ہیں جو میں تو نہ جانوں یا کفایت کی ذات کے بارے میں گفتگو نامحسوس طور پر تعصب کی حامل ہو جاتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اپنی ان تمام باتوں کا علم نہیں رکھتے) کچھ لوگ ان بچوں کی پیدائش کرنے کے آرزو مند ہوتے ہیں جو پیدا نہیں کیے جا سکے کچھ اور...... میرے ولیشچین ایم۔ جیل میں ہمارے سامنے قسمیں کھایا کرتا تھا کہ جتنی لڑکیوں کو وہ یاد کرتا ہے باہر نکل کر ان سب کی کمی پوری کرے گا اور اپنی بات کا پاس کرتے ہوئے واقعی وہ ہر سال دن بھر کام کرتا اور اپنی تمام شامیں ہفتوں کے درمیان نئی لڑکیوں کی صحبت میں بسر کرتا۔ ہمیشہ نئی لڑکی! وہ رات میں صرف چار یا پانچ گھنٹے سوتا تھا۔ اس طرح وہ تجربہ کار اور بوڑھا ہو گیا۔ کچھ لوگ کھانے کی کمی کی تلافی کرنا چاہتے ہیں یا فرنیچر یا جو سات (یہ فراموش کرنے کی غرض سے کہ ان کے باپ کس طرح ٹوٹے تھے ان کی بہترین چیزیں سلگانے کے اسٹرلائزیشن روم میں کیسے بالکل غارت ہو گئی تھیں) ہر چیز پر خرید ان کا مقصد ہو گیا۔

آپ انھیں قصوروار کیسے کہہ سکتے ہیں جب کہ وہ پیچھے ہٹ آتے بہت سی چیزوں سے محروم رکھے گئے ہیں! جب انکی زندگی کا ایک جزو غالب منقطع کر دیا گیا ہے؟

آزادی پر یہ دو ردِ عمل ہیں اور انھیں کے مطابق ماضی کے قیدی دو رخے ہیں۔

آپ نے بھیانک سال گزارے ہیں۔ آپ کوئی بدکردار قاتل نہیں ہیں کوئی فریبی اور جعلساز نہیں ہیں — تو آپ جیل اور مشقتی کیمپوں کو فراموش کرنے کی کوششیں کیوں کریں؟ آپ کو ان پر ندامت کی کیا ضرورت ہے؟ کیا آپ کے لیے یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ ان تجربات سے اپنی ذات کو زیادہ اہم محسوس کریں! کیا ان پر تفاخر کا احساس زیادہ مناسب نہیں ہے؟

اس کے باوجود اکثر لوگ (ان میں سے کچھ تو نہ لاغر ہیں نہ احمق، ایسے افراد جن سے آپ اس کی توقع نہیں کرتے) بھول جانے کی امکانی کوشش کرتے ہیں! اتنی جلد فراموش کر دیں جتنا ممکن ہو! ہر اعتبار سے اور قطعاً بھول جائیں! اس طرح فراموش کر دیں جیسے یہ کبھی ہوا ہی نہ ہو!

فائی نچ ویندلیشن: "عموماً یہی جی کرتا ہوں کہ یاد نہ کیا جائے — یہ ایک مدافعتی احساس ہے۔" پرونیمن: "دیانتدارانہ بات یہ ہے کہ میں کیمپ کے قدیم مکینوں سے ملنا نہیں چاہتا تھا کیوں کہ اس طرح مجھے کیمپ کی باتیں یاد آتی تھیں۔" ایس۔ اے۔ لیسودک: "جب میں کیمپ سے لوٹا تو میں نے ماضی کو بھلانے کی کوشش کی اور آپ جانتے ہیں کہ میں تقریباً کامیاب رہا۔" (تاوقتیکہ اس نے 'دن ڈھے' کا مطالعہ نہیں کیا) ایس۔ اے۔ بوگدانوف: (مجھے عرصے سے علم تھا کہ ۱۹۵۱ء میں وہ مجھ سے پہلے لوبیانکا میں اسی سیل میں تھا جس میں میرا قیام تھا میں نے اسے نہ صرف اپنے جیل کے ساتھیوں کے نام بتانے کی پیشکش کی بلکہ ان کے نام بھی جن کے ساتھ وہ سیل میں مقیم تھا، ایسے لوگوں کے بھی جنہیں میں پہلے کبھی نہ جانتا تھا۔ اور مجھے یہ جواب ملا) "میں نے ان سب کو فراموش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو میرے ساتھ بند تھے۔" (ظاہر ہے اس کے بعد میں نے اسے جواب دینے کی زحمت نہیں کی)

یہ بات میری سمجھ میں آتی ہے کہ آرتھوڈاکس یا راسخ العقیدہ کمیونسٹ کیمپ کے پرانے ساتھیوں سے پہلو تہی کریں وہ جو کے "مقلب" یہ تنہا بھونک بھونک کر تھک گئے ہیں، ان کی یادداشتیں بے معنی سی ہیں! بہر صورت وہ ان گندے غیر متمدن لوگوں سے کیا توقع کریں؟ اور وہ اپنے آپ کو وفادار کمیونسٹ کیسے کہہ سکتے ہیں اگر وہ اسے بھول جائیں اور رد نہ کر دیں اور اپنی سابقہ حیثیت حاصل کر لیں؟ بالآخر انھوں نے اس کے لیے سالوں میں چار بار عرضیاں بھجوائی تھیں "مجھے واپس لے لو مجھے واپس لے لو! میں نیک آدمی تھا اور نیک ہی رہوں گا۔" ان کے واپس جانے کا مطلب کیا تھا؟ سب سے بڑا یہ کہ پارٹی کارڈ واپس مل جائے۔ ان کے سروس ریکارڈ مل جائیں ان کی پینشنیں بحال ہو جائیں۔ ان کے توصیفی انعامات مل جائیں۔

باعزت رہائی — اور جب میں اپنی پارٹی کا کارڈ از سر نو حاصل کرتا ہوں
تو نرم و گرم ہوا مجھے سہلاتی ہے۔

کیمپ کا تجربہ ایک گھنونا تعدی مرض ہے جس سے وہ اپنی ذات کو جلد از جلد آزاد کر لینا چاہتے ہیں۔ جی بھر کر نہاؤ دھوؤ! آپ کو اپنے کیمپ کے تجربات میں ایک بھی طلائی ذرہ نہیں مل سکتا!

سین گرائی قدیم بولشویک واسلے جن کی مثال موجود ہے؟ اسے دو مرتبہ دس دس سال کی سزا ہوئی اور ہر سزا کے ساتھ پانچ سال کے لیے حقوق سے محرومی (شہری اختیارات سلب کرنا)۔ پولٹ بیورو نے ایک خصوصی پنشن دی تھی۔ میری گزر بسر کا معقول بندوبست ہے۔ آخر یہ ہے میری پارٹی اور میرے عوام پر؟ (عجیب و غریب الفاظ ہیں) جب سے صاحب نے مثالی شائع کی ہے اس کے بعد اس تحریف اور سمجھ بوجھ کی جا سکی، اس کے زخموں، مویشیوں کے نقصانات، انسانی بچوں کی وفات، اس کی توہین وغیرہ سب بیکار ہیں — تیرا نام سلامت رہے! سینٹ وہ کوئی آوارہ نہیں ہے وہ اسیٹ محض آوارہ گرد نہیں ہے۔ میں رائفلوں کو ختم کرنے کے ... قائد رہے آپ ٹیٹ اور کن ہوتے باغی تو دیگر وہ محض

کرتا ہے جہاں تک اس کے مضمن قومی اجازت دیتے ہیں اس عہد کے ایک خراب قانونی استعمال میں معاون ہو تلے، یہاں آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں — صداقت — وفاداری کا چہرہ!.....

یہ بات بھی اسی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ مخبر کسی بات کو یاد رکھنا یا لوگوں سے ملنا نہیں چاہتے؛ وہ انکشافِ حال کی صورت میں ہونے والی مذمت سے ڈرتے ہیں۔

لیکن باقیماندوں کا کیا حال ہے؟ کیا وہ انتہائی غلامانہ فطرت کا مظاہرہ نہیں کر رہے ہیں؟ کیا وہ اپنی خوشی سے یہ عہد کرتے ہیں چونکہ وہ خائف ہیں کہ دوبارہ نہ گرفتار کر لیے جائیں۔ نا سیلینکا۔ دی جو گولی کا زخم لے کر وہاں پہنچی تھی۔ اپنی کنپٹیاں ہاتھوں سے دبا لیتی ہے اور وفورِ جذبات میں کہتی ہے: "میں اس سب کو کسی فریبِ نظر کی طرح فراموش کر دینا چاہتی ہوں۔ اُن ڈراؤنے کیمپوں میں بسر کردہ اپنے ماضی کی ہولناک صعوبتوں کو طاقِ نسیاں کی نذر کر دینا چاہتی ہوں۔" کلاسیکل عالم ا۔ ڈی۔ جس کا عمومی کارنامہ قدیم تاریخ کے واقعات پر غور و فکر کرنا ہے وہ اپنے آپ کو یہ سب فراموش کر دینے کا سبق کیسے دے سکتا تھا؟ اگر وہ ایسا کر سکتا ہے تو کیا وہ تاریخِ انسان کی کوئی بھی چیز سمجھ سکتا ہے؟

پیلگنیا۔ ڈی، ۱۹۶۵ء میں شادی سے قبل ۱۹۲۱ء میں لوبیانکا میں بسر کردہ اپنے ایامِ اسیری کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے مجھ سے بولی: "لیکن میں نے اس کے بارے میں اپنے مرحوم شوہر سے ایک لفظ بھی نہیں کہا — میں بھول گئی!" اپنے قریب ترین عزیز کو بتانا بھول گئی! اس شخص کو جس کے ساتھ اس کا زندگی بھر کا ناطہ تھا! شاید ہمیں زیادہ عرصے تک جیل میں رکھنے کی ضرورت ہے!

یا آپ کا خیال ہے کہ میں بیحد سنگدلی کے ساتھ فیصلہ کر رہا ہوں۔ اغلباً یہ اوسط آدمی کا عمومی رویہ ہے؟ آخرکار کہاوتیں لوگوں کے بارے میں ہی بنائی گئی ہیں: "اگر کل آپ کو فائدہ پہنچے گا تو آپ اپنے تمام آلام فراموش کر دیں گے!" "جیسے جیسے پیٹ بڑھتا ہے، حافظہ کمزور ہوتا جاتا ہے۔" ہاں — لوگ اپنی شخصیت، اپنی یادداشت کھو بیٹھتے ہیں۔

میرا دوست اور ساتھی ملزم، نکولائی دی — اپنے جن طفلانہ کارناموں کی وجہ سے ہم جیل میں پہنچے تھے، انہیں وہ میرا برابر کا شریک تھا، وہ تمام ماضی کو ایک عذاب، کسی احمق آدمی کی شرمناک ناکامی سے تعبیر کرتا تھا۔ وہ علم حاصل کرنے میں مشغول ہو گیا جو سب سے زیادہ محفوظ عمل ہے اور اس طرح اپنی قسمت بنانے کی توقع کرتا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں میں نے اس سے پاسٹرناک کی بابت گفتگو کا آغاز کیا جو تا حال بقیدِ حیات تھا لیکن اس کے اذیت رسانوں نے اس کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ وہ اس کے متعلق سننے تک پر آمادہ نہیں ہوا۔ "اس گندگی کے بارے میں دماغ پراگندہ نہ کرو، ذرا یہ سوچو کہ میں اپنے شعبے میں کیسے جدوجہد کر رہا ہوں!" (وہ ہمیشہ کسی کے ساتھ طاقت آزمائی کرتا رہتا تھا اور عہدے میں ترقی کا آرزومند رہتا تھا) پھر بھی ٹربیونل نے اسے دس سال تک کیمپ میں رکھنے کے لائق سمجھا شاید وہ دتے کھانے کے لیے مناسب آدمی تھا!

پھر گریگوری م۔ ز تھا۔ اسے رہا کر دیا گیا تھا اور اسے دی جانے والی سزا منسوخ کر دی گئی تھی۔ اسے از سرِ نو آباد کر کے انہوں نے اس کے پارٹی کارڈ بھی واپس کر دیے تھے (یقیناً کوئی ٹھہر کر یہ دریافت نہیں کرتا کہ اس دوران تم نے جہوواہ کی پرستش شروع کر دی، ہے یا حضرت محمدؐ کے عقیدے پر کاربند ہو۔ کوئی بھی اس امکان کو تسلیم نہیں کرتا کہ اس تمام مدت میں تمہارے قدیم عقائد کا شمہ برابر حصہ بھی ضائع ہو گیا — یہ لو اپنا پارٹی کارڈ!) وہ قازقستان سے اپنے گھر کو چلتے ہوئے میرے شہر سے گزرا اور میں نے اس سے ریل پر ملاقات کی۔ وہ اب کیا سوچ رہا تھا؟ دم سادھ لو — کیا وہ پھر کسی خفیہ! ایجنسی یا خصوصی محکمے میں شمولیت کی توقع کر سکتا تھا؟ ہمارا تبادلۂ خیال اکھڑا اکھڑا سا رہا اس نے

مجھے دوبارہ کوئی خط نہیں لکھا......

پال ایف۔ ریڈز کو لیجیے۔ آجکل وہ ایک رہائشی بورڈ کا سربراہ ہے اور ملیشیا کی معاونت کے لیے قائم کردہ رضاکار دستے کا رکن بھی ہے۔ وہ اپنی موجودہ زندگی کے بارے میں بڑی بے دلی کے ساتھ باتیں کرتا ہے اور ہر چند کہ وہ ماضی کو بھول نہیں سکتا ہے۔ بھلا کوریا میں بسر کردہ چودہ سال کوئی بھلا بھی سکتا ہے؟ لیکن کوریا کے بارے میں بہت کم گرمجوشی کے ساتھ بات کرتا ہے، سوچتا ہوا سا، جیسے اسے یہ یقین نہ ہو کہ یہ سب کچھ واقعی ہوا تھا..... اس نے اپنا ماضی جھاڑ پونچھ کر پھینک دیا ہے۔ وہ خوش ہے اور عام دنیا سے مطمئن ہے۔

جو جو چھوٹتے ہیں، سپاہی جو رہا کر دیے جاتے ہیں اور سابق سیاسی قیدی جو بھلا دیے جاتے ہیں تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔ اب کہ وہ اپنے لوگوں میں لوٹ آئے ہیں اور دنیا پھر سے خوشگوار ہو گئی ہے۔ یہ نہ خلش پیدا کرتی ہے نہ ضرب لگاتی ہے جس طرح وہ سوچا کرتے تھے کہ ہر شخص گرفتار ہے بالکل اسی نہج سے اب سوچتے ہیں کہ کوئی بھی گرفتار نہیں ہے۔ یوم مئی اور انقلاب کی سالگرہ نے اپنے قدیم خوشگوار مفاہیم دوبارہ حاصل کر لیے ہیں۔ اب اس قسم کے سخت خطرناک ایام نہیں ہیں جنھیں وہ سڑکوں پر ایستادہ رہ کر غیر معمولی تکلیف دہ باریکی سے جامہ تلاشی لینے والوں کے سامنے حاضری دیتے تھے اور کیمپ جیل کی تنگ کوٹھڑیوں میں گنجائش سے زیادہ تعداد میں ٹھونس دیے جاتے تھے لیکن ان باتوں سے دماغ کیوں پراگندہ کیا جائے۔ اگر اپنے دن کے کام میں کنبے کے سربراہ کی تعریف اس کا مالک کرے تو یہ ایک شاندار دن ہے اور رات کا کھانا دعوت جیسا پر لطف محسوس ہوگا۔

صرف گھر میں اپنے خاندان کے ساتھ یہ کسی زمانے کا تذکرہ بعض اوقات گلہ کیا کرتا تھا۔ صرف وہاں وہ کبھی کبھار یاد کر لیتا تھا تاکہ وہ اس سے متاثر ہوں اور اسے مزید اہمیت حاصل ہو۔ دروازے سے باہر نکلا اور وہ سب کچھ فراموش کر دیتا تھا!

لیکن ہمیں اتنا سخت رویہ نہیں اختیار کرنا چاہیے۔ یہ یقیناً کوتاہ نظرانہ وصف ہے؛ چوٹ کھانے کا تجربہ کرنے کے بعد انسان اپنی پرانی حیثیت میں لوٹ آتا ہے اپنی بہت سی عادتیں اور رسوم (جو لازمی نہیں کہ لائق تعریف ہوں) پھر اختیار کر لیتا ہے یہ اس کے وجود کا استحکام، اس کے نسلی امتیاز کا اظہار ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو انسان اغلباً انسان نہ ہوتا۔ اسی شارس سنیچیکو نے جس کے پاس سیٹ آیز اشعار پہلے پیش کیے جا چکے ہیں دس برس کے بعد مسرور ہو کر لکھا تھا کہ میری باطنی شخصیت کا ایک خط بھی تبدیل نہیں ہوا ہے۔ میں اپنے قادر مطلق خدا کا تہِ قلب و دماغ سے شکر گزار ہوں کہ اس نے میرے بھیانک تجربات کو اپنے فولادی پنجوں سے میرے عقائد کو گرفت میں نہیں لینے دیا ہے۔

لیکن وہ بھولنے کی کیا ترکیب کرتے ہیں؟ یہ فن کیسے سیکھا جا سکتا ہے؟

"نہیں، آیم آئی۔ کالینیفا رقمطراز ہے۔ کچھ نہیں بھلایا جا سکتا اور میری زندگی میں کوئی مناسب بات نہیں تھی جیسی ہوں ویسی ہونے سے پہلے کوئی طمانیت نہیں تھی ممکن ہے کہ میں اچھی طرح کام کر رہی ہوں۔ میری خانگی زندگی بھی سب کچھ باقاعدگی سے چل رہا ہو، مگر پھر بھی کوئی چیز ہمیشہ میرے دل میں چبھتی رہتی ہے اور میں بے پناہ تعجب محسوس کرتی ہوں مجھے توقع ہے کہ تم یہ نہیں سوچو گے کہ کیمپوں سے رہائی پانے والے لوگ سب کچھ فراموش کر چکے ہیں اور مسرور ہیں رشمیہ لینیز... وہ کہتے ہیں کہ ہم بُرا سب بھلا دو۔ لیکن جب یاد کرتے... لیے کوئی اچھی چیز نہ ہو تو

کیا کیا جائے؟.....

دو صدیوں سے یورپ مساوات کے بارے میں بڑھ چڑھ کر باتیں کرتا آ رہا ہے لیکن ہم سب ایک دوسرے کتنے مختلف ہیں! زندگی ہماری ارواح پر جو شکنیں ڈال دیتی ہیں وہ کیسی مختلف نوعیت رکھتی ہیں! ہم گیارہ برسوں میں کچھ بھی فراموش نہیں کر پاتے ــــ یا اگلے ہی دن سب کچھ بھول جاتے ہیں.....

آشیوان ڈوبریاک: "وہ سب میرے پیچھے ہے، لیکن سبھی کچھ نہیں۔ مجھے از سرِ نو آباد کر دیا گیا ہے لیکن سکون نصیب نہیں ہوتا۔ ایسے ہفتے بہت کم ہوتے ہیں جب میں چین کے ساتھ سو سکوں۔ مجھے کیمپ کے خواب نظر آتے ہیں۔ میں آنسو بہاتا ہوا اُچھل پڑتا ہوں یا پھر کوئی ڈر جاتا ہے اور مجھے بیدار کر دیتا ہے۔"

انیس برشٹین کو گیارہ برس کے بعد بھی کیمپ کے سوا اور کوئی خواب نہیں دکھائی دیتا۔ پانچ سال تک میں خود بھی خواب میں ہمیشہ قیدی ہوا کرتا تھا کبھی آزاد انسان نہیں ہوتا تھا۔ ایل۔ کو۔ ہیلیت اپنی رہائی کے چودہ سال بعد بیمار ہوا اور اپنی سرسامی کیفیت میں وہ فوراً واپس جیل پہنچ گیا۔ "کیمپ" اور "وارڈ" جیسے الفاظ ہماری زبانوں سے نکلتے ہی نہیں ــ ہم انھیں ہمیشہ "سیل" کہتے ہیں۔

شیفرن: "آج تک میں جرمنی کتوں کو دیکھ کر پرسکون نہیں رہ پاتا!"

ملینیوٹ ایک جنگل سے گزرتا ہے لیکن وہ گہری سانس نہیں لے پاتا اور خوشی کا احساس نہیں کر سکتا: "میں چیڑ کے درخت دیکھتا ہوں۔ اوہ، یہ عمدہ قسم کے درخت ہیں۔ ان میں زیادہ گانٹھیں نہیں ہیں نہ کوئی ٹوٹ پھوٹ ہے کہ موقتی بن جائیں۔ ان سب سے عمدہ بلاک بنتے ہیں....."

آپ کیسے بھول سکتے ہیں، اگر آپ ملشیو گاؤں میں سکونت اختیار کر لیں جہاں کے نصف باشندے کیمپوں میں رہ کر آئے ہیں؟ یہ درست ہے کہ ان میں سے اکثر سرقے کے جرم میں قید تھے۔ جب آپ یرزان اسٹیشن کے نزدیک پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ باڑ ٹوٹی ہوئی ہے اور تین کھمبے غائب ہیں۔ کوئی بھی سوراخ درست نہیں کرتا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اسے یوں ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ سٹولی پن جیل کاڑیاں اس اسٹاپ کے عین مقابل ٹھہرتی ہیں ــ وہ اب بھی وہاں رکتی ہیں! وہ آج بھی وہاں رکتی ہیں! سیاہ ماریا کاڑیوں کو خالی جگہ تک پیچھے کی طرف ہٹایا جاتا ہے اور زکیوں کو ان میں دھکیل دیا جاتا ہے (زکیوں کو پُر ہجوم پلیٹ فارموں پر سے لے جانے کی بہ نسبت یہ کم بھونڈا طریقہ ہے)۔ کل یونین انسدادِ بطالت کا ادارہ آپ سے ایک تقریر کرنے (۱۹۵۰ء؟) کی درخواست کرتا ہے اور آپ دیکھتے ہیں کہ یہ درشاستیبر کالونی نمبر ۳ سے متصل خواتین کی جیل کے لیے ہے۔ آپ گارڈ ہاؤس جاتے ہیں اور نگرانی کی کھڑکی پر ایک جانا پہچانا کیمپ نظر آتا ہے۔ آپ نظم و ضبط کے ساتھ جیل کا یارڈ پار کرتے ہیں اور بے ترتیب ڈھالو عورتیں، قبل اس کے کہ آپ ان کی تنظیم کر سکیں، آپ کو سلام کرنے لگتی ہیں۔ اب آپ سیاسی شعبے کے سربراہ کے ساتھ بیٹھے ہیں اور جب وہ آپ کا تعارف کرا رہا ہے تو ادھر سر سے پرہ وہ عورتوں کو ان کی کوٹھڑیوں سے کھینچ رہے ہیں، خوابیدہ عورتوں کو جھنجھوڑ رہے ہیں، ذاتی باورچی خانہ استعمال کرنے والوں کے ہاتھ سے برتن چھین رہے ہیں۔ آپ لیکچر دینے بیٹھ جاتے ہیں اور اس معاملے میں پابندیٔ وقت کے قائل نظر آتے ہیں، وہ اتنی کافی عورتوں کو گھیر گھار کر لاتے ہیں کہ ہال بھر جاتا ہے۔ ہال میں سینہ بر آمد ہے یہ بیٹھی ہے سیلو ہیں شاید اور زیادہ ہیں۔ عام مشقت کش عورتیں، تقریر کے دوران اونگھتی رہتی ہیں اور دوسری بہاریں کا حصولِ گھر کرکے جھکنے کی سی کمزور چہرے والی ادھم گھونسے..

والی کھانسیاں۔ انھوں نے کپڑے عورتوں کی طرح نہیں بلکہ عورتوں کے کارٹونوں کی طرح پہن رکھے ہیں۔ جوان عورتیں بھی اتنی نحیف و لاغر ہیں جتنی کہ بوڑھی عورتیں اور وہ سب تکان سے چور ہیں اور چاہتی ہیں کہ میری تقریر جلد ختم ہو جائے۔ مجھے شرم محسوس ہوتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ دھوئیں میں تحلیل ہو جاؤں اور نگاہوں سے چھپ جاؤں۔ "سائنس اور ٹیکنالوجی کی افادیت" پر تقریر کرنے کی بجائے میں ان سے چیخ کر کہتا ہوں "خواتین! یہ سب کتنے دنوں تک چلے گا؟" میری نگاہ تھوڑا کچھ تر و تازہ نظر آنے والی اچھی پوشاکوں میں ملبوس عورتوں پر پڑتی ہے جن میں سے چند نے جمپر بھی پہن رکھے ہیں (یہ بیزار دکھی) ہیں اگر میں (اپنی نظر ان پر) بیالوں اور کھانسیوں پر توجہ نہ دوں تو میں آرام سے لیکچر پورا کر سکتا ہوں۔ وہ اشتیاق کے ساتھ سنتی ہیں، اپنی نگاہ نیچے پر نہیں پڑنے دیتیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ میری بکواس پر قطعی دھیان نہیں دے رہی ہیں..... میں بہت سی باتوں کا تصور کرنے لگتا ہوں۔ اب کسی بھی لمحے میرا پرمٹ ضبط کر لیا جائے گا اور مجھے یہیں رہنا پڑے گا۔ اور یہ دیواریں، جس سڑک سے میں بخوبی آشنا ہوں، یہ کہ ایک اسٹاپ ہے جو چند میٹر ہی کے فاصلے پر ہے، مجھے ہمیشہ کے لیے زندگی سے منقطع کر دیں گی۔ دیواروں کی جگہ سال بن جائیں گی نہیں نہیں! میں سیدھا یہاں سے چلا جاؤں گا! چالیس کوپک ادا کر کے میں ٹرالی بس سے گھر چلا جاؤں گا اور وہاں لذیذ کھانا کھاؤں گا۔ مگر مجھے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ سب یہیں مریں گی۔ وہ اسی طرح کھانستی رہیں گی۔ بے شمار برسوں تک کھانستی رہیں گی۔

ہر سال اپنی گرفتاری کی سالگرہ پر میں اپنے لیے ایک "یوم زیک" مناتا ہوں۔ صبح میں ۶۵۰ گرام روٹی تراش لیتا ہوں، ایک پیالے میں دو چمچے شکر ڈالتا ہوں اور ان پر گرم پانی انڈیلتا ہوں۔ لنچ کے لیے میں ان سے بتاتا ہوں کہ میرے لیے کچھ شوربہ اور ایک پیالہ گوشت پلا دیں اور میں کتنی جلدی اپنی پرانی حالت میں پہنچ جاتا ہوں۔ دن کے اختتام تک میں اپنے منہ میں ڈالنے کے لیے ایک ایک ٹکڑا سمیٹتا ہوں اور پیالہ چاٹتا ہوں۔ پرانے تکلیف دہ احساسات از سر نو زندگی حاصل کر لیتے ہیں۔

میں اپنے ہمراہ نمبروں کی پٹیاں بھی لے آیا تھا اور انھیں اب بھی محفوظ رکھتا ہوں۔ کیا میں تنہا ہی اس قسم کا آدمی ہوں؟ کچھ گھروں میں وہ آپ کو مقدس تبرکات کی طرح دکھائی جائیں گی۔

ایک مرتبہ میں نوسلوبودسکایا شاہراہ پر گزر رہا تھا۔ بورڈ لگا تھا "پارسل وصول کرنے کا دفتر"۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ یہ بھرا ہوا تھا زیادہ تر عورتوں سے لیکن کچھ مرد بھی تھے۔ تو یہ وہ جگہ تھی جہاں سے ہمارے پارسل آیا کرتے تھے! کتنی دلچسپ بات ہے! قطعی انجان جگہ میں قانون قاعدہ پڑھنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ لیکن ایک موٹے منہ والے سارجنٹ نے اپنی عقابی نگاہ سے بھانپ لیا اور میری طرف آیا۔ "تمھیں کیا چاہیے شہری؟" اس کی ناک نے اسے بتا دیا کہ یہ آدمی کوئی پارسل لینے نہیں آیا ہے بلکہ کسی دوسری فکر میں ہے۔ ظاہر ہے کہ مجھ میں تا حال قید کی بو موجود ہے۔

کیا ہمیں مُردوں کے پاس جانا چاہیے؟ آپ کے اپنے مُردہ لوگ تو وہاں پڑے ہیں یہاں آپ کو بھی پڑا ہونا چاہیے تھا جو سنگینوں کا شکار ہو گئے؟ اے۔ وان اولینیف جو اس وقت تک بوڑھا ہو چکا تھا۔ ۱۹۶۵ء میں اپنے شانے پر بولا اٹھا کر عصا کا سہارا لیتے ہوئے وہ پہلے کے سیڈیبل سلشن میں پہنچ گیا اور وہاں سے پہاڑوں کے اوپر (کیرکی۔ تی کے نزدیک) چلا گیا جہاں قبرستان تھا۔ پہاڑی کے قریب دیوار میں کھوپڑیاں اور ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ آج کل یہاں کے باشندے اسے ہڈیوں کا ٹیلہ کہتے ہیں۔

ایک دور افتادہ شمالی شہر میں جہاں نصف سال دن رہتا ہے اور نصف سال کی رات ہوتی ہے۔ [illegible] رہتا ہے۔ ساری دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے اور یہ وہ اپنا گھر کہتا ہے وہ ایک ردی اور پر شور قسم کا گوشہ ہے اس کا دل سب متحدیہ ہے کہ کتابیں پڑھ کر تھوڑا سا جا سکتا ہے، ادنیٰ درجہ کی شراب، کا آرزو رہتا ہے اور اپنا وقت مگر یہ اور شراب پینے

میں اور زیدوس کے لیے کام کرنے" میں صرف کرتی ہے۔ اس کے گہرے دوست کینڈے کے موسیقار اور فنکار ہیں۔" بہت سے لوگ جو آپ کو جانتے ہیں کہاں سے آئے ہیں، اپنے ماضی کو پوشیدہ رکھتے ہیں۔ مجھے اپنی داستانِ حیات پر فخر ہے۔"

سابق زیکوں کے ادارے سال میں ایک مرتبہ علیحدہ علیحدہ مقامات پر ملتے اور گزشتہ باتیں یاد کرنے کے لیے جلسے کرتے ہیں" اور عجیب بات ہے" ڈی۔پی۔ گیلیٹین کہتا ہے" کہ ماضی کی جو تصویر پیش کی جاتی ہے وہ سیاہ اور پریشان کن ہی نہیں ہے اس میں ہماری بہت سی خوشگوار اور پُرجوش یادیں بھی ہیں۔"

ایک اور عجوبہ انسانی وصف اور بدترین نہیں۔

"ایپ یا میرا اشاعتی نمبر بیری ۳ سے شروع ہوتا تھا" دی مائن گنسبرگ بڑے اشتیاق سے مجھے مطلع کرتا ہے۔ "اور انھوں نے مجھے جو پاسپورٹ دیا ہے وہ 'زیک' کے سیریز میں ہے۔"

آپ اسے پڑھتے ہیں اور ایک جوش کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ نہیں، چپ چاپ ——— پھر بھی جو بہت سارے خطوط آپ کے پاس آتے ہیں ان میں زیکوں کے مکاتیب صاف الگ نظر آتے ہیں۔ ان میں کسی معنی خیز پختگی دکھائی دیتی ہے۔ مقصد کی ایسی وضاحت اور ساتھ ہی آتی گرمجوشی اور مستقل مزاجی۔ ہمارے عہد میں اگر آپ کو کوئی خود ترحمی سے قطعی مبرا خطوط واقعتاً رجائیت آمیز تو یہ کسی سابق زیک کا ہی ہوگا۔ انہیں دنیا سے جو بدترین سلوک مل سکتا تھا وہ ملا ہے اور کوئی بھی چیز ان کے عزم و ہمت کو کم نہیں کر سکتی۔

مجھے اس طاقتور قبیلے کا ایک رکن ہونے پر فخر ہے۔ ہم کوئی قبیلہ نہیں ہیں لیکن انھوں نے ہمارا قبیلہ بنا دیا ہے۔ انھوں نے ہمارے درمیان ایسے باہمی رشتے پیدا کر دیے ہیں جو ہم اپنے دوستوں اور خیر اندیش دوستوں میں جہاں انسان ہر دوسرے انسان سے خوف کھاتا ہے، خود کبھی استوار نہ کر سکتے تھے۔ آرتھوڈاکسوں (راسخ العقیدہ کمیونسٹوں) اور بزدلوں نے رہا ہونے پر اپنے آپ کو ہمارے قبیلے سے از خود علیحدہ کر لیا۔ ہمیں ایک دوسرے کی حمایت کرنے کے لیے کسی واضح اقرار نامے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں اب ایک دوسرے کی آزمائش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ملتے ہیں، ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہیں، دو ایک الفاظ کا تبادلہ کرتے ہیں ——— اور اس سے زیادہ وضاحت کی کیا ضرورت ہے؟ ہم ایک دوسرے کو مصیبت سے نکالنے کے لیے مدد کرنے کو تیار ہیں۔ ہمارے قبیلے کے دوست ہر جگہ ہیں اور ہماری تعداد لاکھوں میں ہے۔

اینا اوٹولیارونا جو ۱۹۴۴ء میں اپنا رشتہ پیریس سے اس دام میں گرفتار ہونے کے لیے آئی تھی۔ جب اس کی زندگی کا طویل وسطی حصہ گزر گیا، اپنے آپ کو پشیمانی کی کوفت میں مبتلا کرنے اور اپنی آمد کے دن کو کوسنے کی بجائے کہتی ہے: "میں نے اپنا سارا [illegible] کے لوگوں کی بات نہ مانی؟ منطق کی بات نہ سن کر اور روس آ کر اچھا ہی کیا! روس کی بابت ایک بات ہی نہ جانتی۔ میں بالکل ٹھوس [illegible] سمجھ گئی تھی کہ یہ سب [illegible] کا ہی ہے۔"

ایک زمانہ [illegible] فارچونیلیر نیٹن نے [illegible] جن میں [illegible] پر جوش کامیاب [illegible] بریگیڈ کا [illegible] تھا، اسپیشل سیشن کی پیش کردہ فہرست [illegible] فیصلے [illegible] نیچے [illegible] شدید ترین سزا [illegible] اور پھر ہم اسے جنگلوں کے درمیان ایک خیمہ [illegible] قطعہ آراضی [illegible] وہ اپنے باغیچے کو [illegible] اپنا [illegible] کو دانستہ [illegible] آباد کاری کے لیے درخواستیں نہیں بھیجتا۔ وہ روس [illegible] کے بارے

میں ملفوظات سناتا ہے۔ جو بھی ریڈیائی نشریے وہ سنتا ہے اور جو بھی اخباری مضامین اس کی نظر سے گزرتے ہیں۔ ان کے طویل ترین جوابات لکھ کر وہ صفحات پر صفحات بھر دیتا ہے لیکن چند سال اور گزر جاتے ہیں ــــ اور زرمی سکان کا فلاسفر متفکرانہ انداز میں یہ مقولہ پیش کرتا ہے۔

"بنی نوع انسان سے محبت کرنا ہی کافی نہیں ہے ــــ آپ میں لوگوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیے۔" اور اپنی وفات سے عین پیشتر اس نے لکھا، تحریر میں لفظ تو اسی کے تھے لیکن ایسے چونکانے والے لفظ تھے کہ آپ محسوس کریں جیسے یہ کسی علامت نگار یا شاید بوڑھے ٹالسٹائی کے الفاظ ہیں۔

"میں نے تمام چیزوں کا تجزیہ اور فیصلہ اس بنیاد پر کیا ہے کہ انھوں نے مجھے کس طرح متاثر کیا۔ لیکن اب میں دوسرا انسان بن گیا ہوں اور میں نے اشیاء کے بارے میں اس بنیاد پر فیصلہ کرنا بند کر دیا ہے۔"

منفرد دی۔ پی۔ ٹارنوفسکی اپنی سزا مکمل کرنے کے بعد گویا ہی میں بس گیا وہ شعر کہتا ہے۔ لیکن کسی کو بھیجتا نہیں ہے۔ اس قسم کے اشعار؛

میری زندگی بسر ہو رہی ہے اس دور افتادہ مقام پر،
خدا کی مرضی کے مطابق سکوت میں۔
کیوں کہ میں نے 'کین' کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ہے۔
اور اپنے آپ کو قتل کرنے پر راضی نہیں ہوا ہے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ ہم سب کے سب یکے بعد دیگرے موت کی آغوش میں پہنچ جائیں گے اور کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کر سکیں گے۔

آزادی سے سابق قیدیوں کو کچھ چیزیں بھی ملی ہیں۔ خاندانوں اور دوستوں سے دوبارہ ملاقات والدین سے بچوں کا ملاپ۔ شوہروں کا بیویوں سے ملاپ۔ اور اکثر ایسا نہیں ہوتا کہ ان دوبارہ ملاقاتوں سے فائدہ ہی پہنچتا ہو۔ ہمارے دس یا پندرہ سال علیحدہ رہنے کے بعد ہمارے بچے کس طرح ہم سے ہم مزاج ہو سکتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اجنبی ہوتے ہیں یا کبھی وہ دشمن ہوتے ہیں۔ نہ اُن عورتوں کو، جنھوں نے وفاداری کے ساتھ اپنے شوہروں کا انتظار کیا ہے، ان کی وفاداری کا ثمرہ مل پاتا ہے۔ اتنے طویل عرصے کی علیحدگی کے بعد انسان پوری طرح بدل جاتا ہے اور اب صرف اس کا نام ہی پُرانا رہ گیا ہے۔ اس مرد کے تجربات اور اس عورت کے تجربات ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہوتے ہیں اور اب پھر ایک نقطے پر آ جانا ان کے لیے دشوار ہو جاتا ہے۔

اس موضوع پر دوسرے لوگ فلمیں تیار کر سکتے ہیں اور ناول قلم بند کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کتاب میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

میں صرف ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ماریا کاڈالسکایا کا واقعہ (تصویر ۳ میں کاڈالسکایا اور اس کا شوہر جوانی کے دور میں نظر آ رہے ہیں اور تصویر ۴ میں کاڈالسکایا اپنی موجودہ حالت میں دکھائی دیتی ہے۔)

"پہلے دس برسوں میں میرے شوہر نے مجھے تیس خطوط لکھے اور اگلے دس برسوں میں صرف ایک۔ اور اس ایک خط کو پڑھ کر میری آرزو تھی کہ میں مر جاتی۔ جب اسے انیس برس کے بعد پہلی بار رخصت ملی تو وہ اپنے اعزا کے ساتھ رہنے کے لیے چلا گیا اور مجھے

اور میرے بیٹے سے ملنے کے لیے راستے سے گزرتے ہوئے چار دن کے لیے آیا۔ جس گاڑی سے ہم اس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے وہ اس دن منسوخ ہو گئی تھی۔ تمام رات بیدار رہ کر میں آرام کرنے کے لیے لیٹ گئی۔ میں نے گھنٹی کی آواز سنی۔ ایک اجنبی آواز نے کہا "میں ماریا رینیڈ کٹوفنا سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے دروازہ کھولا۔ برساتی پہنے اور ٹوپ لگائے ہوئے ایک ہٹا کٹا بزرگ آدمی اندر آیا۔ وہ ایک لفظ بھی کہے بغیر اندر بڑھتا گیا۔ تا حال نیم غنودگی کے عالم میں میں بھول گئی کہ اپنے شوہر کی منتظر ہوں۔ ہم وہاں کھڑے ہو گئے "کیا تم مجھے نہیں پہچانتیں؟" "نہیں۔" میں یہی سوچ سکی کہ وہ میرا کوئی رشتہ دار ہے۔ میرے بہت سے رشتے دار تھے جن سے میں برسوں سے نہیں مل سکی تھی۔ پھر میں نے اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ دیکھے، مجھے یاد آیا کہ میں اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی اور میں بے ہوش ہو گئی۔ میرا بیٹا آیا اور معاملہ اس وجہ سے مزید بگڑ گیا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے ہم تینوں وہاں چار دن رہے اور ایک بار بھی میرے واحد کمرے سے باہر نہیں نکلے۔ باپ بیٹا ایک دوسرے سے باتیں کیے بغیر بیٹھے رہے۔ نیز مجھے اپنے شوہر سے باتیں کرنے کا بمشکل کوئی موقع مل سکا۔ گفتگو معمولی قسم کی تھی اس نے ہمیں اپنی زندگی کے بارے میں بتایا اور یہ معلوم کرنے میں اسے قطعاً دلچسپی نہ تھی کہ ہم نے اپنی زندگی کیسے بسر کی تھی؟ واپس سائبیریا جاتے ہوئے اس نے مجھ سے آنکھیں چار کیے بغیر الوداع لی۔ میں نے اس سے کہا کہ میرا شوہر الپس میں وفات پا گیا تھا (وہ اٹلی میں رہ چکا تھا جہاں اتحادی حکومتوں نے اسے آزاد کر دیا تھا)

لیکن اس سے مختلف اور زیادہ طربیہ قسم کی ملاقاتیں بھی تھیں۔

آپ کی کسی وارڈر یا کیمپ کمانڈر سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ شیرڈ نسک سیاحتی مرکز پر آپ دفعتاً جسمانی ورزش کے اتالیق سلاوہ کو نوریلسک کے جیل افسر کی حیثیت میں پہچان لیتے ہیں یا میتا بکٹ کو لینن گراڈ گیسٹرونوم میں اچانک ایک مانوس چہرہ دکھائی پڑتا ہے اور دوسرا آدمی بھی اسے بغور دیکھتا ہے۔ کیمپ ڈویژن کا کمانڈر کیپٹن گزاک اب وردی اتار چکا ہے "ٹھیرو، ذرا ٹھیرو۔ کہیں میں نے تمہیں وہاں اندر تو نہیں دیکھا...؟ اوہ ہاں۔ یاد آیا! ہم نے تمہاری خراب کام پر تمہارے پارسل ضبط کر لیے تھے!" اسے یاد ہے! لیکن یہ سب انھیں فطری محسوس ہوتا ہے جیسے کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہمارے انچارج بنا دیے گئے ہوں اور موجودہ صورتحال محض ایک مختصر سا عبوری وقفہ ہے)

آپ کی (ولیسکی کی مانند) اپنے یونٹ کمانڈر کرنل رودڈیکو سے ملاقات ہو سکتی ہے جس نے اپنے آپ کو بدنامی سے بچانے کے لیے عجلت میں آپ کی گرفتاری پر تائید کا اظہار کر دیا تھا۔ شہری لباس اور ایک فرجیسی ٹوپی میں اب وہ عالمانہ انداز اختیار کر چکا تھا۔

آپ کی ملاقات اپنے تفتیش کنندہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ وہی جو آپ کو زدوکوب کرتا تھا یا کھٹملوں کی خوراک بننے کے لیے اندر بند کر دیا کرتا تھا — آجکل وہ اچھی پنشن وصول کرتا ہے۔ مثال کے طور پر خواش کی مانند، جس نے وا یدوف سے پوچھ تاچھ کی تھی اور اسے قتل کیا تھا اور اب؟ کی اسٹریٹ پر قیام فرما ہے۔ ایسی ملاقات سے خدا آپ کو محفوظ رکھے۔ اب بھی آپ ہی کے دل کو مجروح ہونا پڑے گا اس کے دل کو نہیں۔

پھر آپ کی ملاقات اس آدمی سے ہو سکتی ہے جس نے آپ کی مذمت یا رپورٹ کی تھی جس نے آپ کو بند کرایا تھا اور اب بظاہر موٹا ہو رہا ہے۔ کسی وجہ سے خدا اس پر بجلی نہیں گراتا۔ جو قیدی اپنے آبائی وطن کو پلٹتا ہے اسے قدرتی طور پر وہ لوگ نظر آئیں گے جنہوں نے اس کے خلاف مخبری کی تھی "مگر تم اس پر مقدمہ کیوں نہیں دائر کر دیتے؟" کوئی گرم مزاج دوست اسے ورغلائے گا۔ "اس طرح کم از کم لوگوں پر اس کا بھانڈا تو پھوٹ جائے گا!" (زیادہ سے زیادہ جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے) "نہیں، میرا یہ نیا ... نہیں ہے۔ جیسا ہے ویسا ہی رہنے دو۔"

کیونکہ اس قسم کا مقدمہ دائر کرنے کے لیے آپ کو سو بیل جوتنے سے آغاز کرنا ہوگا۔

"زندگی انھیں از خود سزا دے گی" ایوینیز لبد لیسوف شانے جھٹک کر کہتا ہے۔

وہ اس سے زاید کہہ بھی کیا سکتا ہے؟

"وہ جو عورت اس طرف ایستادہ ہے، جو ہماری یونین کی رکن ہے، اس نے ایک مرتبہ مجھے جیل بھجوا دیا تھا!" موسیقار، کے۔ نے شیشا کو دیچ سے کہا "تحریری بیان پیش کرو۔" شیشا کو دیچ نے غصے میں کہا "ہم اسے یونین سے خارج کر دیں گے؟ (لیکن اس پر مکمل یقین مت کرو!) کے سنے اس خیال کو جھٹک دیا۔ "نہیں شکریہ۔ میری ڈاڑھی پکڑ کر مجھے ہر فرش پر گھسیٹا گیا ہے۔ اب میں مزید الجھنا نہیں چاہتا۔"

لیکن کیا صرف انتقام کا معاملہ ہے؟ جی۔ پولیٹ محکہ گزار ہے کہ "جب میں باہر آیا تو جس سؤر کے بچے نے مجھے پہلی بار جیل پہنچایا تھا اس نے مجھے دوبارہ وہیں پہنچا دیا ہوتا اگر میں اپنا خاندان اور شہر چھوڑ کر چلا نہ جاتا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوتا۔"

دراصل یہ چیز اسی طرح ہونی چاہیے۔ ہمارا کام کرنے کا سوویٹ انداز یہی ہے!

خواب کیا ہے، سراب کیا ہے؟ ماضی — یا حال؟

۱۹۵۵ء میں ریفرونسن نے ڈپٹی پراسیکیوٹر جنرل سالن کو لاشنکو کے خلاف جرائم کے الزامات کی ایک مکمل جلد دی۔ "ہم اس کے خلاف کارروائی کرنے کی حیثیت میں نہیں ہیں۔" سالن نے اس سے کہا۔ "مرکزی کمیٹی کو اس کی بابت لکھو دو۔"

وہ کب سے اس حیثیت میں نہیں رہے؟ یا یہ بات انھوں نے تیس سال قبل کیوں نہیں تسلیم کر لی تھی۔

وہ دو جھوٹے گواہ، جنھوں نے چلپینوف ماسکو سوویٹ کے کنزیومر سروس بیورو میں، کسی ایسے آدمی کو ہمراہ لے کر جسے اپنی یونٹ میں وہ دونوں جانتے تھے، سریوگین سے ملاقات کے لیے گیا۔ "آؤ! تمہارا تعارف کرا دوں! یہ سخالن معاملے میں ہمارے ساتھ تھا۔ تمہیں یاد ہے نا؟" "نہیں مجھے یاد نہیں پڑتا۔" اس کا نام چلپینوف ہے — تمہیں اس کے بارے میں یاد نہیں؟" "نہیں مجھے نہیں یاد آتا۔ جنگ نے ہمیں ادھر اُدھر بکھرا دیا ہے۔" "تو تمہیں معلوم نہیں کہ اس کا کیا حشر ہوا؟" "مجھے بالکل خیال نہیں آتا۔" "اوہ سالے! حرام کی اولاد!"

اس سے زیادہ کہنے کے لیے اور کیا ہے۔ جس ضلع پارٹی کمیٹی کے رجسٹر میں سریوگین کا نام ہے، یہ سچ نہیں ہو سکتا! وہ حقیقی معنوں میں سچا کارکن ہے!

کارکن......

نہ کسی شخص نے جنبش کی، ہے نہ کسی شے نے، بادل دوا ایک بار گرجا اور ایک بوند پانی برسائے بغیر چلا گیا!

نہیں، چیزیں بالکل نہیں ہیں جو پہلے تھیں — حتیٰ کہ دور افتادہ شمالی زبانوں کا ماہر وائی۔ اے۔ بکر ٹیلنو دیچ اسی ادارے میں، اسی سیکٹر میں انھیں لوگوں کے ساتھ کام کرنے گیا، جنھوں نے اسے بند کروایا تھا اور جو اب بھی اس سے نفرت کرتے تھے؛ انھیں لوگوں کے ساتھ وہ اپنا اوورکوٹ لٹکاتا ہے اور روزانہ کانفرنس ٹیبل کے پاس بیٹھتا ہے۔

"یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسے آسکوٹز کے نشانہ ادران کے سابق نگراں مل کر ایک فینسی سامان کا کھوکھا لگا لیں۔"

ادبی دنیا میں بھی او برگروپن مخبر موجود ہیں۔ وائی۔ ایلبرگ نے کتنی زندگیاں تباہ کی ہیں یا یسیوچینسکی نے! ہر شخص ان کے بارے میں جانتا ہے — اور کوئی انھیں ہاتھ لگانے کی ہمت نہیں کرتا۔ انھیں انجمن مصنفین سے خارج کرنے کی کوشش ناکام ہوئی انھیں ملازمتوں سے علیحدہ کرنے کی توقع تو اور بھی کم ہے اور یہی بات پارٹی سے متعلق کہی جا سکتی ہے۔

جب ہمارے تعزیزی قوانین بنائے جا رہے تھے (۱۹۲۶ء) تو یہ حساب لگایا گیا تھا کہ غلط تشہیر سے کیا جانے والا قتل، چاقو سے قتل کرنے کی بہ نسبت ½ حد تک سنجیدہ اور لائق تعزیر ہے اور کسی صورت میں یہ بات قرینِ قیاس نہ تھی کہ پرولتاری تاناشاہی میں کوئی رسوائی جیسے بورژوائی حربے کا استعمال کرے گا! دفعہ ۹۵ کے تحت دانستہ کی جانے والی جھوٹی شکایت یا شہادت دینے کے جرم پر جو (الف) کسی سنجیدہ جرم کے الزام سے (ب) ذاتی مفاد کی تحریک سے (ج) مصنوعی شہادت تیار کرنے سے مزید بڑھ جاتا ہے، آزادی سے محروم کرنے کی سزا ہے جس کی مدت دو سال سے زائد نہیں ہوگی — اور یہ صرف چھ ماہ کی بھی ہو سکتی ہے۔

اس دفعہ کی تشکیل کرنے والے یا تو قطعی احمق تھے یا حد سے زیادہ دور اندیش۔

میرا قیاس یہ ہے کہ وہ دور اندیش تھے۔

تب سے ہر عام معافی (۱۹۴۵ء میں اسٹالن عام معافی ۱۹۵۳ء وورو شلوف عام معافی) پر انھوں نے ان لوگوں کو اس کے تحت لانے کی بات ہمیشہ یاد رکھی جنھیں اس دفعہ کے تحت سزا ہوئی تھی۔ اپنے سب سے زیادہ قریبی حامیتیوں کی نگہداشت کرنا وہ کبھی نہیں بھولے۔

پھر آئینی اخلاقیات ہے۔ اگر آپ پر (دفعہ ۵۸ کے تحت) جھوٹا الزام عائد کیا جائے تو وقت کی حد مقرر نہیں ہے۔ اگر آپ نے جھوٹا الزام لگایا ہے تو وقت کی حد مقرر ہے جو آپ کی حفاظت کرتی ہے۔

اناتھیوژنگاچ اور اس کے کنبے کے خلاف دائر کردہ کیس جھوٹی شہادتوں کا پلندہ تھا۔ ۱۹۴۴ء میں وہ اس کا باپ، اس کے دو بھائی، اس کی بھابی یا نند کے مبینہ قتل کے نتیجے میں گرفتار کیے گئے اور الزام یہ تھا کہ قتل سیاسی وجوہ سے کیا گیا ہے۔ جیل میں تینوں مردوں کو ختم کر دیا گیا (وہ اقبالِ جرم کے لیے تیار نہ تھے) اناتا نے دس برس کی جیل بھگتی۔ بھابی بخیر و عافیت آ گئی! لیکن آئندہ دس برس اناتا نے نو آبادی کی درخواستیں دینے میں ضائع کیے۔ ۱۹۶۴ء تک پراسیکیوٹر کے دفتر کا جواب یہ تھا "تمھیں قانون کے دائرے میں رہ کر سزا دی گئی ہے اور نظر ثانی کے لیے کوئی ٹھوس جواز موجود نہیں ہے۔" جب اتنی کوششوں کے باوصف انھوں نے اسے نو آباد نہیں کیا تو ناقابل شکست اس کو پنکو فانے اناتا کی جانب سے ایک یادداشت قلم بند کی جس میں کہا گیا تھا کہ غلط شہادتیں دینے والوں پر مقدمات چلائے جائیں۔ سوویٹ یونین کے عوامی پراسیکیوٹر جی۔ ٹیرپوخوف شچ نے جواب دیا — "میعاد گزر جانے کی وجہ سے ناممکن .....۔"

تیسری دہائی میں انھوں نے ان ناواقف کسانوں کو جنھوں نے چالیس برس پہلے ندوڈوفولنس* کو مہورزار کی عدالت کے حکم پر پھانسی دی تھی، تلاش کر لیا، جیل میں گھسیٹا اور گولی سے اڑا دیا۔ لیکن وہ کسان "ہمارے نہیں" تھے البتہ یہ مخبر یقیناً ہمارے لختِ جگر ہیں۔

یہ ہے وہ آزادی جس میں سابق زیکوں کو رہائی نصیب ہوئی۔ خواہ جدھر نگاہ کیجیے! کیا اس کی نظیر تاریخ میں کہیں اور نظر آتی ہے؟ کب اتنے وسیع پیمانے پر صاف پہچان میں آنے والی بدمعاشی کو فیصلے اور سزا کے بغیر چھوٹ دی گئی تھی!

ہمیں اس سے کہیں بہتر نتیجے کی توقع کیوں کرنی چاہیے۔ اس بدبودار بددیانتی سے اور کیا چیز حاصل ہو سکتی تھی!

مجمع الجزائر کے اس سنگدلانہ منصوبے کو کتنی شاندار کامیابی نصیب ہوئی ہے؟

حصّہ ہفتم

اِسٹالن نہیں رہا

"نہ وہ اپنے قاتلانہ کارناموں پر پشیمان ہوئے"
(ریویلیشن ۲۱:۹)

وضاحت:۔
مصنف کی خواہش کے مطابق حصّہ ہفتم کے وہ اجزا اردو ترجمے میں شامل نہیں ہیں جو روسی ایڈیشن میں چھوٹے ٹائپ میں طبع کیے گئے تھے کیونکہ غیر روسی قارئین کے لیے ان میں کسی خاص دلچسپی کا سامان نہیں ہے۔

پہلا باب

گزشتہ واقعات پر ایک طائرانہ نگاہ

یقیناً ہم نے اس امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑا کہ ہماری داستان عام ہوگی، کیوں کہ جلد یا تاخیر تاریخ کے تمام واقعات کی صداقت عیاں ہو کر رہتی ہے لیکن ہمارا خیال یہ تھا کہ اس کا موقع مستقبل بعید میں آئے گا۔ جب ہم میں سے بیشتر مر کھپ چکے ہوں گے اور حالات کی نوعیت یکسر تبدیل ہو جائے گی۔ میں اپنے آپ کو مجمع الجزائر کا تقویم کار تصور کرتا تھا میں مسلسل لکھتا رہا لیکن مجھے کبھی اپنی زندگی میں اس کی اشاعت کی کوئی توقع نہ تھی۔

تاریخ ہم میں سے سب سے زیادہ واضح نگاہ رکھنے والے کو بھی حیرت انگیز باتیں دکھاتی ہے ہم قبل از وقت یہ نہیں سمجھ سکتے تھے، یہ حیرت کس نوع کی ہوگی، کس طرح کوئی نادیدہ ناگزیر سبب زمین میں لرزہ پیدا کر دے گا۔ کیسے اندھے کنوئیں کے دروازے پر عرصے کے لیے خواہش نہ ہوتے ہوئے بھی کھولے جائیں گے تاکہ صداقت کے دو تین پرندے ان کے بند ہونے سے قبل ہی اڑ جائیں اور دروازے مستقبل میں پھر بہت طویل عرصے کے لیے مقفل ہو جائیں گے۔

میرے اتنے بہت سے پیشرو اپنی تحریریں مکمل نہیں کر سکے یا جو کچھ انھوں نے قلم بند کیا تھا اسے محفوظ نہیں رکھ سکے۔ یا اسے کسی طرح چوری چھپے محفوظ مقامات تک منتقل نہیں کر سکے۔ لیکن مجھے یہ خوش نصیبی ودیعت ہوئی: میں اس سے قبل کہ آہنی پھاٹکوں کے جبڑے کھٹکے کے ساتھ دوبارہ بند ہو جائیں ان میں سے مٹھی بھر سچائی باہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔

غیر مادے میں ملفوف مادے کی طرح اس میں فوری دھماکہ ہو گیا۔

اس دھماکے نے پھر خطوط کے دھماکے پیدا کیے۔ اس کا تو امکان بھی تھا۔ لیکن اخباری مضامین کے بھی دھماکے ہوئے جو دانت پیستے ہوئے، نفرت اور افسوس کے جذبات کے تحت تحریر کیے گئے تھے۔ سرکاری توصیف کے دھماکے، جن سے میرے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا۔

جب سابق زیکوں نے تمام اخبارات سے ایک سُر میں بجتی ہوئی یہ شہنائی سنی اور انھیں معلوم ہوا کہ کیمپوں کے متعلق کس قسم کی داستان سامنے آئی ہے اور کہ صحافی ان کی تعریفوں کے پُل باندھ رہے ہیں تو ان کی متفقہ رائے یہ تھی: "مزے دروغ بافیاں! ان کریہہ کذب بیانیوں سے کسی کو مفر نہیں! ہمارے جو اخبارات عادتاً بڑھ چڑھ کر باتیں کیا کرتے ہیں وہ اچانک سچائی کی تعریف کرنے میں ایک دوسرے کو مات دینے کی کوشش کرنے لگے۔ اس بات کا قیاس کرنا بھی کسی کے لیے ممکن نہیں تھا! ان میں سے کچھ لوگ میری داستان سے اپنے ہاتھ گندے کرنے کی خواہش ہی نہ رکھتے تھے۔

لیکن جب انھوں نے اسے پڑھنا شروع کیا تو ان ہزاروں اشخاص کے منہ سے ایک ہی کراہ برآمد ہوئی۔ مسرت کی اور رنج کی کراہ خطوط کا سیلاب امڈ پڑا۔

ان خطوط کی میری نگاہ میں بڑی قیمت ہے۔ ہمارے ہم وطنوں کو عوامی اہمیت کے مسائل پر گفتگو کرنے کا موقع بہت کم نصیب ہوتا ہے ان کا اعتماد غلط ثابت ہوا تھا ان کی توقعات اتنی بار بے بنیاد ثابت ہوئی تھیں۔ پھر بھی مطلب

یقین کرنے لگے کہ صداقت کا دور واقعتاً شروع ہو رہا ہے، کہ آخر ش جرأت کے ساتھ بولنا اور لکھنا ممکن ہے۔

اور یقیناً وہ سوؤیں بار مایوس ہوئے.....!

"صداقت فتحیاب ہوئی ہے لیکن بڑی تاخیر کے ساتھ!" انھوں نے لکھا۔

جتنا وہ خیال کرتے تھے اس سے بھی زیادہ تاخیر کے ساتھ کیوں کہ تاحال اسکی فتح نہیں ہوئی تھی۔

کچھ متوازن افراد بھی تھے جنھوں نے خطوط کے آخر میں اپنے نام ظاہر نہیں کیے تھے ("اپنے پاس بچے ہوئے تھوڑے سے وقت میں مجھے اپنی صحت کی فکر کرنی ہوگی") یا جنھوں نے اسی وقت جب صحافیانہ توصیف کے دو نگرے برس رہے تھے، براہ راست دریافت کیا: "میں سوچتا ہوں کہ آخر دو لکونلٹے* نے آپ کو یہ روداد شائع کرنے کی اجازت کیسے دی؟ ازراہ عنایت جواب دیجیے، مجھے اس وجہ سے تشویش ہے کہ کہیں آپ تعزیری کوٹھڑیوں میں نہ بند ہوں۔" یا "تمہارا اور تواڈوورفسکی کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیا گیا؟"

اس کا سبب یہ ہے کہ ان کا جال ناکارہ ہو گیا اور کام نہیں کر سکا ہے۔ تب پھر دو لکوفیوں کو کیا کرنا چاہیے! بقیہ لوگوں کی مانند انھیں بھی اپنے قلم سنبھال لینا چاہیے! خود مراسلے لکھنے چاہئیں۔ یا اخبارات میں تردید کرنی چاہیے! اور وہ واقعی بڑے تعلیم یافتہ ثابت ہوئے۔

خطوط کے دوسرے سیلاب سے ہمیں ان کے ناموں اور اپنے تذکرے میں استعمال شدہ ان کے طریق کار کا علم ہوتا ہے۔ ہم تاحال مناسب لفظ کی جستجو میں تھے کیمپ کے پاس کیمپ کے کارکن "تے" نہیں! نہیں: "عملی کارندے" صحیح لفظ ہیں۔ سنہرے الفاظ ہیں یہ! "چیکسٹ" لفظ کسی وجہ سے ہر طرح مناسب نہیں تھا۔ "عملی کارندے" یہ الفاظ انھیں پسند ہیں۔

اور وہ رقم طراز ہیں:

"آئیوان ڈینی سودچ ایک سرکاری بچھو ہے۔" (وی۔ وی۔ اولینک اکیوبنسک)

"شوخوف کے تئیں نہ نفرت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے نہ احترام کا" (وائی مارٹیوشیف، ماسکو)

"شوخوف کو سزا دینا مناسب ہی تھا....." (وی۔ آئی۔ سیلنٹ سچیڈررونسک)

"ان بدمعاش کمینے جانوروں کے ساتھ عدالتوں نے انتہائی نرم برتاؤ کیا مجھے ان لوگوں پر بالکل ترس نہیں آتا۔ جن کا رویہ مادر وطن کے ایام جنگ میں مشتبہ رہا۔" (ای۔ اے۔ اگینیڈوویچ، اکوفسک)

"شوخوف بیحد ماہر اور فطین غلاظت ڈھونڈنے والا ہے۔ بے حد خود پرست، صرف اپنے پیٹ کی خاطر زندگی بسر کرتا ہے۔" (وی۔ ڈی۔ اوسپینسکی، ماسکو)[1]

"مصنف نے ۱۹۳۷ء میں سب سے زیادہ وفادار شہریوں کی تباہی کا منظر پیش کرنے کی بجائے ۱۹۴۱ء کا انتخاب کیا ہے جب زیادہ تر خود غرض لوگ ہی جیل گئے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں کوئی شوخوف نہیں تھا اور لوگ انتہائی وفادارانہ خاموشی کے ساتھ اپنی موت سے بغلگیر ہو جاتے تھے، یہ نہ سمجھتے ہوئے کہ آخر کسی کو اس سب کی کیا ضرورت آپڑی ہے۔" (پی۔ اے۔ پینکوف، کراما ڈورسک)

کیمپوں کے حالات کے بارے میں:

"ان لوگوں کو بہت سی خوراک کیوں دی جائے جو کام نہیں کرتے؟ ان کی قوت صرف ہی نہیں ہوتی میرا کہنا ہے کہ مجرم دنیا کے ساتھ ضرورت سے زیادہ شرافت کا برتاؤ کیا جا رہا ہے۔" (ایس۔ ٹی۔ گورودن۔ الکوفسک)

• جہاں راشن کا سوال ہو وہاں ایک بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ کہ وہ تعطیلات گزارنے کے لیے تفریحی مقامات پر نہیں گئے ہیں۔ انھیں اپنے جرائم کا کفارہ دیانتداری کے ساتھ کام کر کے ادا کرنا چاہیے۔" (اوختیا کون کا سارجنٹ میجر بازولوف، عمر ۵۵، کیمپ کی ملازمت میں بال سفید کر لیے)

• اور کسی سوویٹ ادارے میں اختیارات کا اتنا کم ناجائز استعمال نہیں ہوتا جتنا کیمپوں میں ہوتا ہے (!!) میں اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کیمپوں میں اب پہلے سے زیادہ سختی کے ساتھ قوانین کی پابندی کی جاتی ہے۔"

(وی۔ کارخانوف، ماسکو ایریا)

• یہ کہانی فوجیوں، سارجنٹوں اور موپ* (MOOP) کے افسران کی توہین کرتی ہے۔ عوام تاریخ کے خالق ہیں لیکن اسمیں عوام کی ترجمانی کیسے کی گئی ہے؟ جیسے وہ بدکردار، احمق اور بدھو ہوں۔" (بازولوف)

• "ہم جلاد بھی انسان تھے بہادری کا مظاہرہ کر سکتے تھے۔ ہم نے ہر گرنے والے قیدی کو گولی نہیں ماری اور ایسا نہ کر کے اپنی ملازمتوں کو خطرے میں ڈالا۔" (گریگوری ٹریفو مووچ، زیلیز نیاک)

• "کہانی میں تمام دن قیدیوں کے ساتھ سر تا سر بدسلوکی کا بیان ہے اور انتظامیہ کا کردار صحیح نہیں دکھایا گیا۔۔۔ کیمپوں میں قیدیوں کا بند رہنا شخصیت پرستی کے دور کے حالات کی وجہ سے نہیں تھا۔ بلکہ اس کا تعلق صرف تعزیری بندوبست سے تھا۔" (اے۔ آئی۔ گریگو ریئف)

• پہریداروں کو یہ علم نہیں تھا کہ کون سا قیدی کس جرم کی وجہ سے قید میں ہے۔"

• سولنتسن کیمپ کے تمام کاموں کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جیسے وہاں پارٹی کی قیادت بالکل ختم ہو گئی ہو لیکن اس وقت پارٹی تنظیم موجود تھی جیسے کہ آج موجود ہے اور اپنے ضمیر کے مطابق وہ ہمارے تمام اقدامات میں رہنمائی کرتے تھے۔"

عملی کارندے، صرف مستقل احکامات، درمیان میں پہنچنے والی ہدایات اور اوپر سے آنے والے کام سے متعلق فیصلوں پر عملدرآمد کرتے تھے۔ وہی لوگ جو اس وقت وہاں کام کر رہے تھے، اب بھی وہیں کام کر رہے ہیں (!!) (شاید دس فی صد ملازم نئے ہوں گے) ان کے کاموں کی متعدد بار تعریف کی گئی ہے۔ اپنے پیشے کے لوگوں میں ان کی اچھی شہرت ہے۔"

"موپ کے تمام کارکن مجروح غضب سے لبریز ہیں۔۔۔۔ اس تخلیق کی کینہ پرور تلخی بڑی حیران کن ہے۔۔۔۔ وہ دانستہ عوام کو ایم۔ وی۔ ڈی سے برگشتہ کر رہا ہے۔ ہمارا شعبۂ تحفظ لوگوں کو 'موپ' کی تضحیک کرنے کی اجازت کیوں دیتا ہے؟ یہ ہتک آمیز ہے!" (اناطولی فیوفانو، خاروزنا۔ صوبہ ارکوٹسک۔ ۱۹۵۰ء سے ایم۔ وی۔ ڈی میں ہے ۱۹۵۶ء سے پارٹی کا رکن ہے!)

ذرا سنیے۔ ان کی بات سنیے۔ "یہ ہتک آمیز ہے!" خلوصِ قلب سے نکلی ہوئی آواز ہے! پینتالیس برس تک انھوں نے ہموطنوں کو اذیتیں پہنچائیں اور وہ سب عزت مندانہ تھا لیکن کوئی اس کے بارے میں ایک تخلیق پیش کرتا ہے تو وہ ہتک آمیز ہے!

• "ایسی غلاظت مجھے پہلے کبھی برداشت نہیں کرنی پڑی ۔۔۔ اور یہ صرف میری رائے نہیں ہے ہم میں سے بہت سے لوگ یہی محسوس کرتے ہیں۔ ہمارا نام لیجن (ہزار) ہے۔"

• مختصر آ سولنتسن کی تخلیق کو تمام کتب خانوں اور دارالمطالعوں سے ہٹا لینا چاہیے۔" (اے کُمذمین، اوریل)

اسے ہٹا تو دیا گیا لیکن بتدریج۔

"اس کتاب کو شائع نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس کے بجائے اس کا مواد کے۔جی۔بی۔ کے شعبوں میں محفوظ کر دینا چاہیے تھا۔" (گمنام — کوئی اکتوبر کا ہمعصر)

اکتوبر کا ہمعصر کوئی روشن ضمیر ہے۔ تقریباً اسی طرح ہوا تھا۔

ایک اور گمنام حاضر ہے جو شاعر بھی ہے:

اے روس میری بات سُن
ہماری روحیں بے داغ ہیں
اور ہمارے ضمیر پر کوئی دھبہ نہیں.....

پھر وہی کمبخت نقاب پوش۔* یہ معلوم ہوتا تو بہتر تھا کہ کیا اس نے خود لوگوں کو گولیاں ماری تھیں یا انھیں صرف موت کے دہانے تک پہنچا دیا تھا یا پھر وہ محض ایک عام راسخ العقیدہ شہری ہے —

لیکن افسوس، وہ گمنام ہے! گمنام، بالکل گمنام.....

آخر میں ایک وسیع فلسفیانہ خیال آتا ہے:

"تاریخ کو ماضی کی ضرورت کبھی نہیں تھی (!!) اور اشتراکی ثقافت کی تاریخ کو اس کی سب سے کم ضرورت ہے۔" (اے۔ کوزمن)

تاریخ کو ماضی کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے بے عقل نکموں کے پاس اب یہی تصور رہ گیا ہے! تو اسے کس چیز کی ضرورت ہے؟ شاید مستقبل کی؟ اور یہ ہیں وہ لوگ جو ہماری تاریخ لکھتے ہیں!.....

ہم ان کی اس بھاری بھرکم جہالت کے پیشِ نظر ان کی بات کا کیا جواب دے سکتے ہیں؟ ہم انہیں بھلا کس طرح سمجھا سکتے ہیں؟.....

معلوم ہوتا ہے کہ صداقت ہمیشہ شرمیلی ہوتی ہے اور دروغ کی پُرشور دخل اندازی پر بآسانی خاموش ہو جاتی ہے۔

کسی ملک کے اندر کافی عرصے تک اطلاعات کی کھلی آمد و رفت پر پابندی سے آبادی کی پوری پوری جماعتوں کے درمیان، لاکھوں اور لاکھوں کے درمیان از خود خلیج بن جاتی ہے۔

ہم ایک قوم یا فرقہ نہیں رہ جاتے کیونکہ ہم واقعی الگ الگ بولیاں بولتے ہیں۔

———— ❖ ————

با ایں ہمہ ایک راستہ تو کھلا تھا! اوہ یہ بے حد پائیدار جھوٹ کی فصیل، اتنی پائیدار کہ معلوم ہوتا تھا تا ابد قائم رہے گی لیکن ایک شگاف نظر آیا اور لوگوں کو علم ہوا۔ کل تک تو ہمارے ہاں کوئی کیمپ نہیں تھا کوئی مجمع الجزائر نہیں تھا اور آج وہ تمام چیزیں عوام کے سامنے، ساری دنیا کی نگاہوں کے سامنے موجود ہیں — جیل کیمپ، مزید برآں یہ کہ فاشسٹ قسم کے کیمپ!

کیا کیا جائے؟ تمہیں اندرونی باتوں کو کرید کر باہر نکالنے میں عرصے سے مہارت حاصل ہے! اے محترم بیرو چیے! یقیناً تم اس سلسلے کو جاری نہ رہنے دو گے؟ — تم.... ظاہر ہے کہ تم پیچھے نہیں ہٹو گے؟ تم جیسے لوگ..... ان کے لیے راستہ چھوڑ دو؟

بے شک وہ راستہ نہیں چھوڑیں گے! تخریب کاری کے ماہر طلب کیے بغیر شگاف کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ ان تمام برسوں میں بس اسی کا انتظار کر رہے تھے' اپنے سرمئی پروں والے اجسام سے ڈھانکنے کے لیے اور اپنے بازوؤں کی پُرمسرت ـــــ ہاں پُرمسرت پھڑپھڑاہٹ سے برہنہ مجسمۂ الجزائر کو حیران و ششدر ناظرین کی نگاہ سے پوشیدہ رکھنے کی خاطر!

ان کا پہلا نعرہ ایک لمحے کے اندر از خود ان کے ذہن میں آ گیا' یہ تھا: ایسا پھر کبھی نہیں ہو سکے گا! پارٹی زندہ باد! ایسا پھر کبھی نہیں ہو سکے گا!

ایسے چالاک لوگ! ایسے ماہر شگاف پُر کرنے والے! ظاہر ہے اگر ایسا پھر کبھی نہ ہو سکے گا تو اس سے از خود یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ آج بھی ایسا نہیں ہو رہا ہے' مستقبل میں اس قسم کی کوئی بات نہ ہو گی اس لیے بلاشبہ حال میں بھی اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔

انھوں نے شگاف کے سامنے ایسی چالاکی کے ساتھ اپنے بازو پھڑپھڑائے کہ مجسمۂ الجزائر کی جھلک نظر آتے ہی ایک فریب نظر بن گیا۔ اس کا وجود نہیں ہے' اس کا وجود نہیں ہو گا اور اگر بہر طور کچھ کہنا ہی ہے تو آپ تکلف کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی زمانے میں اس کا وجود ہوا کرتا تھا...... لیکن یقیناً وہ شخصیت پرستی کا دور تھا (یہ شخصیت پرستی کی اصطلاح بڑی سہولت بخش ہے' اسے اعتماد کے ساتھ پیش کر دو اور ظاہر کرنے لگو کہ تم نے کسی بات کی تعریف پیش کر دی ہے) جو صاف صاف موجود ہے' جو ہمیشہ برقرار رہے گا وہ ہے "پارٹی زندہ باد!" (تعریف پہلے تو اسی وجہ سے ہونی چاہیے کہ "یہ پھر کبھی نہیں ہو سکتا" لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد یہ مجسمۂ الجزائر کی توصیف کی صورت اختیار کر لیتا ہے ـــ دونوں باتیں مل کر ایک ہو جاتی ہیں اور انھیں الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے اسے ہر طرف سنا' اس سے بھی قبل جب انھیں میری تخلیق پڑھنے کا موقع ملا تھا "پارٹی زندہ باد!" اس جزو پر پہنچنے سے کہیں پہلے جس میں یہ بتایا تھا کہ ماسکو والے (انجمن مصنفین) کس طرح تازیانے برسایا کرتا تھا "پارٹی زندہ باد!" کے نعرے چاروں جانب گونجنے لگے۔

اس طرح جھوٹ کے فرشتوں نے' انھیں کے محافظوں نے خطرے کے اولین لمحات کو قابل تعریف انداز میں جھیل لیا۔

جب خروشچیف نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے "آئیوان ڈینی سوچ" کی اشاعت کی اجازت عطا فرمائی تو اسے پورا یقین تھا کہ یہ تخلیق استالن کے کیمپوں کے بارے میں تھی اور اس کے اپنے کوئی کیمپ نہیں ہیں۔

ٹوارڈوفسکی بھی جب وہ ملک کے اعلیٰ ترین لوگوں میں اس کی اشاعت کی اجازت دے کر تشویش پیدا کر رہا تھا' اپنے دل میں یقین رکھتا تھا کہ یہ سب کچھ ماضی میں ہوا تھا کہ یہ جا چکا ہے' ختم ہو چکا ہے۔

ٹوارڈوفسکی کو معاف کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ارد گرد ماسکو کی عوامی زندگی میں ہر آدمی اس ایک تصور سے کسب حیات کر رہا تھا' برف اب پگھل رہی ہے: انھوں نے لوگوں کا استحصال بند کر دیا ہے۔ دو بار کانگریس کے ہمدردانہ اجلاس ہو چکے ہیں۔ لوگ نہ جانے کہاں کہاں سے واپس پلٹ رہے ہیں اور کثیر تعداد میں پلٹ رہے ہیں! مجسمۂ الجزائر نو آبادکاری کے گلابی دھندلکے میں روپوش ہو گیا تھا اور بالکل نظر نہیں آتا تھا۔

لیکن میں (میں بھی!) دھوکا کھا گیا اور میں لائق در گزر نہیں ہوں۔ میرا مقصد ٹوارڈوفسکی کو فریب میں مبتلا کرنا نہیں تھا میں بھی واقعی یہ اعتقاد رکھتا تھا کہ جو داستان میں نے اس کے روبرو بیان کی ہے وہ ماضی کے بارے میں ہے۔ کیا میری زبان دینے کا فقرہ فراموش کر سکتی تھی! میں نے کبھی نہ سمجھنے کا اعتراف کیا تھا کیا میں کسی وجہ سے کتوں کو تنبیہ دینے والی

کی فطرت کبھی سیکھ نہیں سکا تھا؟ جب میں نے اپنے آپ کو مجمع الجزائر کا مورخ بنانے کے لیے تیاری کی تھی اس وقت کیا میں یہ سمجھنے میں تساہل برت سکتا تھا کہ یہ حکومت سے کتنی مماثلت رکھتا ہے اور اس کے لیے کتنا ضروری بھی ہے؟ مجھے یقین کامل تھا کہ کم از کم میں اس قانون کا پابند نہیں ہوں جس کا میں نے ذکر کیا ہے :-

"پیٹ بڑھتا ہے تو یادداشت ختم ہو جاتی ہے۔"

میں پہلے کے مقابلے میں کچھ فربہ ضرور ہو گیا تھا۔ میں اس میں الجھا اور..... یقین کرنے لگا۔ میں نے مطلق سرزمین خاص کی باتوں پر اعتماد کر لیا۔ ان باتوں پر اعتماد کر لیا جن پر میری نئی نئی خوشحالی نے مجھ سے یقین کرنے کو کہا۔ اور میرے آخری دوستوں کی بیان کردہ کہانیاں، آپ جانتے ہیں، کہاں سے آئی تھیں۔ حالات نسبتاً سہل تھے! ڈسپلن نرم پڑ گیا تھا! وہ لوگوں کو ہر وقت باہر نکال رہے تھے! تمام کیمپوں کے علاقے بند کر رہے تھے۔ این۔ کے۔ وی۔ ڈی کے لوگوں کو سبکدوش کر رہے تھے!

نہیں — ہم لوگ مٹی کے فانی انسان ہیں۔ اس کے قوانین کے پابند ہیں۔ کتنا ہی عظیم دکھ ہو، وہ ہمیں ہمیشہ کے لیے وسیع آلام کے تئیں دلسوزی میں مبتلا نہیں رکھ سکتا۔ اور جب تک ہم اپنی مٹی کے امتیازات سے بلند نہیں ہو جاتے اس وقت تک کوئی بھی دنیا میں منصفانہ معاشرتی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ خواہ وہ جمہوری ہو یا آمرانہ!

اس طرح میں اس وقت حیران و ششدر رہ گیا جب مجھے پھر لفافوں کی تیسری باڑھ موصول ہوئی — آج کے — زمانۂ حال کے زیکوں کی جانب سے، حالانکہ یہ سب سے زیادہ فطری امر تھا اور مجھے ان کی وصولیابی کی توقع سب سے پہلے کرنی چاہیے تھی۔

کاغذ کے شکن آلود پرزوں پر پھیکی پنسل سے خطِ شکستہ میں، خستہ حال لفافوں پر جنھیں اکثر آزاد کارکنوں نے پتے لکھ کر سپرد ڈاک کیا تھا، بالفاظِ دیگر چوری سے، آج کے مجمع الجزائر نے اپنی تنقیدیں اور بعض اوقات غیظ و غضب کے طور پر مجھے مکاتیب ارسال کیے۔

یہ خطوط بھی بہت سی زبانوں کی متحدہ آوازیں تھے۔ لیکن وہ آواز جو یہ کہتی تھی: "ہمارے بارے میں یہ کیا بکواس ہے!!!؟"

میری داستان کے بارے میں پیدا ہونے والے شور و غوغا میں پریس نے تیزی کے ساتھ وہ تمام باتیں عام کر دیں جو آزاد شہریوں اور غیر ملکیوں کو بتانا غیر ضروری تھیں اور ان کا ڈھول پیٹنے والا فقرہ یہ تھا "ہاں ایسا ہوا تھا لیکن پھر کبھی ایسا نہ ہوگا۔" اور زیکوں نے غل مچایا: "تمہارا مقصد کیا ہے، پھر کبھی نہیں ہوگا! ہم تا حال یہاں اندر بند ہیں اور ہمارے حالات ویسے کے ویسے ہی ہیں۔

" آئیوان ڈینی سووچ کے زمانے کے مقابلے میں کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا ہے۔" مختلف مقامات سے الگ الگ موصول ہونے والے خطوط میں بھی ایک پیغام تھا۔

" اور جو زیک تمہاری تصنیف کا مطالعہ کریگا وہ تلخی اور جھنجھلاہٹ محسوس کریگا۔ کیونکہ ہر بات جیسی تھی آج تک بعینہٖ ویسی ہی ہے۔"

• اگر عہدِ اسٹالن میں جاری کردہ پچیس سالہ سزا کا بندوبست کرنے والے تمام قانون آج بھی رائج ہیں تو تبدیل کیا ہوا ہے؟

• ایک بار پھر ہمیں بے وجہ اندر ڈالا جا رہا ہے اس بار کس شخص کی پرستش کے اصول کو الزام دیا جائے؟

• ایک سیاہ کہرے نے ہمیں ڈھانپ لیا ہے اور ہمیں کوئی بھی دیکھ نہیں پاتا۔"

• وولکووئے جیسے لوگوں کو سزا دیے بغیر کیسے چھوڑ دیا گیا؟ وہ اب بھی ہمارے تربیت نو کے انچارج ہیں۔

• غیر مہذب وارڈن سے لے کر کیمپ کی انتظامیہ کے صدر تک ان تمام لوگوں کے لیے کیمپ، کا وجود ایک اہم ترین نقطۂ نظر ہے..... وارڈر حقیر سے حقیر بہانے کے وسیلے سے ہم پر الزام عائد کر دیتے ہیں، افسران تحفظ ہماری ذاتی فائلیں سیاہ کرتے رہتے ہیں۔ مجھ جیسے پچیس سال والے قیدی ان کی محبوب چیز ہیں اور وہ ہم پر خوب ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ یہ بدکردار لوگ جن کا کام ہمیں نیکی کی راہ پر گامزن ہونے کی ترغیب دینا ہے۔ وہ بالکل ان نوآبادکاروں کی طرح ہیں جو یہ ظاہر کیا کرتے تھے کہ ریڈ انڈین اور حبشی ارذل قسم کی مخلوق ہیں۔ رائے عامہ کو ہمارے خلاف کرنے کے لیے کچھ بھی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ "اسیرانِ جیل" کے عنوان سے ایک مضمون لکھ دیجیے۔ اور اگلے دن لوگ ہمیں بھٹیوں میں نذرِ آتش کرنے کے مطالبے لے کر عام جلسے منعقد کرنے لگیں گے!

سچ ہے اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔

• آپ نے عقبی محافظ کا فریضہ انجام دیا ہے۔ وانیا الکیگیف میرے بارے میں فکرمندی کے ساتھ لکھتا ہے۔

اور یہ تمام مراسلے پڑھتے ہوئے، میں نے، جو اپنے آپ کو ہیرو تصور کر رہا تھا، دیکھا کہ میرے پاس کھڑے رہنے کے لیے گنجائش نہیں ہے۔ دس برسوں میں مجمع الجزائر کے ساتھ منسلک میرا شیرازۂ حیات منتشر ہو گیا ہے۔

ان کے لیے، موجودہ دور کے زیکوں کے لیے میری تصنیف کوئی حیثیت نہیں رکھتی، میری صداقت کوئی صداقت نہیں ہے اگر وہ مستقبل کی باتیں بھی نہ بتائے۔ اگر میں ان کے بارے میں مزید نہ لکھوں۔ حقیقت ضرور بیان کرنی ہوگی اور حالات کو تبدیل ہونا ہی چاہیے! اگر الفاظ حقیقی باتوں کے بارے میں نہیں ہیں اور ان کی بنا پر واقعات رونما نہیں ہوتے تو ان کا کیا فائدہ ہے!

(یہ خیال میں اپنے جدیدیت پسندوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں: ہمارے لوگ ادب کے بارے میں عام طور پر اسی نہج سے سوچتے ہیں۔ ان کی یہ عادت جلد نہیں تبدیل ہوگی۔ کیا آپ کے خیال میں انھیں اس سے دستبردار ہونا چاہیے؟)

اور اس طرح میں اپنے ہوش میں آگیا اور جلاوطنی کے گلابی خوشبودار بادلوں میں سے جھانک کر میں مجمع الجزائر کے مانوس پتھریلے ٹیلوں، نگرانی کی برجیوں سے ٹوٹی ہوئی اس کی سرمئی شکل و صورت کو شناخت کر سکا۔

ہماری سوسائٹی کی صورتحال ایک برقی مقناطیسی علاقے کی اصطلاح میں زیادہ بہتر طور پر واضح کی جا سکتی ہے اس کی طاقت کے تمام خطوط آزادی کے برعکس ظلم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ خطوط بڑے مستحکم ہیں اور انھوں نے اپنا نقش کندہ کر لیا ہے اور کھانچوں میں پختگی کے ساتھ جم گئے ہیں انھیں بے اثر کرنا، منتشر کرنا یا سرکا دینا تقریباً ناممکن ہے کوئی بھی قوت یا مادہ جو اس کے حلقۂ اثر میں داخل ہوگا فی الفور ظلم کی طرف حرکت کرنے لگے گا اور کبھی آزادی کی سمت نہیں بڑھ سکے گا۔ اس کے لیے دس ہزار بیلوں کی طاقت لگانی ہوگی۔

اب تو میری تصنیف کو علی الاعلان مضرت رساں قرار دے دیا گیا ہے۔ اس کی اشاعت کو غلطی (ادب میں جب ایسا کام کرنے کا انجام) تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اب یہ آزاد بستیوں کے استعمال میں آنے والے کتب خانوں سے بھی ہٹائی جا رہی ہے آئیوان ڈینی سووچ یا میرے نام کا محض تذکرہ تک مجمع الجزائر میں ایک ناقابلِ اصلاح باغیانہ روش کے مترادف بن گیا ہے لیکن ان ایام میں بھی جب خروشچیف نے مجھ سے مصافحہ کیا تھا اور تالیوں کے شور میں مجھے ان تین سو اشخاص کے روبرو پیش کیا تھا جو اپنے آپ کو فنکاروں کا اعلیٰ جوہر تصور کرتے تھے۔ جب ماسکو کے اخبارات میں میری بابت خوب لکھا جاتا تھا۔

اور نامہ نگار اشتیاق کے ساتھ میرے ہوٹل کے کمرے کے باہر انتظار کیا کرتے تھے، جب یہ واضح اعلان کر دیا گیا تھا کہ ایسی تصنیف کو پارٹی اور حکومت کی تائید حاصل ہے۔ جب سپریم کورٹ کے فوجی کالیجیم کو مجھے از سر نو آباد کر دینے پر فخر ہوا کرتا تھا (بالکل اسی طرح اپنے اس عمل پر اسے اب ندامت ہے) اور وکیل کرنلوں نے اپنی بنچ سے اعلان کیا تھا کہ اس کتاب کا مطالعہ کیمپ والوں کو کرنا چاہیے۔ اس وقت بھی خاموش، نادیدہ اور گمنام طاقتیں خفیہ طور پر مزاحمت میں مشغول تھیں..... اور کتاب ممنوع قرار دیدی گئی! جائز وسیلوں سے کیمپوں تک یہ بہت کم پہنچ سکی جہاں قارئین اسے شعبۂ ثقافت و تعلیم کی لائبریری سے حاصل کر سکتے ہوں۔ اسے کیمپ کے کتب خانوں سے خارج کر دیا گیا۔ اگر باہر سے بذریعہ بک پوسٹ اسے روانہ کیا جاتا تو اسے وہ ضبط کر لیتے تھے آزاد کارکن اپنے کوٹ کے نیچے چھپا کر اسے اندر پہنچا دیتے تھے اور زیکوں سے ایک بار کے پانچ روبل وصول کرتے تھے (خردہ قیمت روبل! زیکوں سے! لیکن جو شخص کیمپوں کے گرد و نواح کے اس بے حیا ماحول سے واقف ہے اسے اس امر پر حیرت نہیں ہوگی) زیک اسے تلاشی کی جگہ سے چاقو کی طرح چھپا کر لاتے تھے، دن میں اسے چھپائے رکھتے تھے اور راتوں میں مطالعہ کرتے تھے۔ شمالی یورال کے کسی کیمپ میں انھوں نے اس کی خاطر دھات کی ایک جلد تیار کی تھی تاکہ یہ زیادہ دن چل سکے!

لیکن زیکوں ہی کے بارے میں کیوں باتیں کی جائیں جبکہ وہی خاموش لیکن عام طور پر مسلّمہ ممانعت کیمپوں کے چاروں طرف تمام دنیا پر بھی نافذ کر دی گئی تھی۔ شمالی یورال کے ولیس اشٹیشن پر ایک آزاد خاتون ماریا آسلیفا نے "لٹریری گزٹ" کے نام ایک مراسلہ روانہ کر کے اس کہانی کی تائید کی تھی اور اس نے مراسلہ ڈاک کے سپرد کیا یا ناعاقبت اندیشی کے تحت میز پر ہی چھوڑ دیا۔ اپنی رائے کاغذ پر قلمبند کرنے کے پانچ گھنٹے کے بعد ہی پارٹی انتظامیہ کے سکریٹری وی۔ جی۔ ششکین نے اس پر سیاسی طور پر گمراہ کرنے (کیسے کیسے الفاظ ان کے ذہن میں آجاتے ہیں!) کا الزام عائد کیا اور اسے وہیں فوری طور پر گرفتار کر لیا گیا۔[۱۱]

ٹراسپول میں اصلاحی مشقتی کیمپ نمبر ۲ میں مجسمہ ساز نیڈوف نے، جو خود قیدی تھا، اپنے نمبر دار کی ورکشاپ میں ایک قیدی کی مورت تیار کی (تصویر نمبر ۱) جو پہلے پلاسٹیسین کی تھی۔ ڈسپلن افسر کیپٹن سولوڈیانکن کو اس کا علم ہو گیا "تو تم ایک قیدی بنا رہے ہو! یہ حق تمھیں کس نے دیا، یہ انقلاب دشمنی ہے!" اس نے مورت کی ٹانگیں پکڑ کر اسے اٹھایا اور ٹانگیں چیر کر دو ٹکڑوں میں منقسم کر دیا اور دونوں ٹکڑے فرش پر پھینک دیے۔ "تم لوگ آئیوان ڈینی سووچ شاید بہت پڑھتے رہتے ہو!" (لیکن اس نے اس پر مہر نہیں لگائی اور نیڈوف نے ٹکڑوں کو چھپا دیا) سولوڈیانکن کی شکایت پر نیڈوف کو کیمپ کے صدر بکاشیف سے ملنے کے لیے طلب کیا گیا لیکن اس اثنا میں اسے شعبۂ تعلیم و ثقافت میں کچھ اخبار ہاتھ لگ گئے تھے۔ "ہم تم پر مقدمہ چلائیں گے!" بکاشیف غرّایا "تم لوگوں کو سوویٹ حکومت سے باغی بنانے کی کوشش کر رہے ہو!" (تو وہ یہ بات جانتے تھے کہ کسی زیک کو دیکھنے کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے!) "صدر محترم! از راہ کرم ذرا یہ ملاحظہ فرمائیے: نکیتا سرگئیوچ اس میں کہتا ہے..... اور یہ کامریڈ الیچیف کا قول ہے" — "تم ہم سے برابری کے ساتھ گفتگو کرتے ہو؟" بکاشیف معاملے کو ختم کرتے ہوئے کہتا ہے۔ چھ ماہ کے بعد کہیں نیڈوف کو دونوں ٹکڑے جوڑنے کا حوصلہ ہوا۔ اس نے انھیں ہموار کر کے چسپاں کر دیا۔ بیٹ میٹل کا ایک کاسٹ تیار کیا اور مجسمہ کیمپ سے باہر بھجوا دیا۔

اصلاحی مشقتی کیمپ ۵ میں اس کتاب کے سلسلے میں بار بار تلاشیاں لی گئیں۔ رہائشی مقامات کے چپے چپے

پر باریکی سے معائنہ کیا گیا لیکن کتاب نہ مل سکی۔ ایک دن نیڈوف نے طے کیا کہ اپنی کتاب واپس لے آئے وہ کام کے بعد ٹیفیکیلیان کی تصنیف "گرنیا ٹیٹ نہیں جھکتا" لے کر بیٹھ گیا اور ایسا ظاہر کیا جیسے وہ کوئی چیز کرے کے بقیہ لوگوں سے چھپا رہا ہو (مخبروں کو سنتے ہوئے اس نے لڑکوں سے اکٹھا کر لینے کی درخواست کی) لیکن اس طور پر بیٹھا کہ کھڑکی سے ضرور نظر آ تا رہے۔ مخبروں نے اپنا فرض مستعدی سے ادا کیا۔ تین وارڈر جھپٹتے ہوئے آئے (ر چو تھا باہر کھڑا رہا اور کھڑکی سے دیکھتا رہا کہ نیڈوف کتاب کسی اور کو نہ دیدے) انھوں نے کتاب چھین لی۔ وہ اسے وہاں سے وارڈروں کے کمرے میں لے گئے اور کتاب تجوری میں بند کر دی گئی۔ وارڈر چیزک اپنا بھاری بھرکم چابیوں کا گچھا لٹکائے بازو پھیلا کر چیخا۔ "ہم نے کتاب ضبط کر لی ہے۔ اب تمہیں قید تنہائی بھگتنی پڑے گی!" لیکن دوسرے دن صبح ایک افسر نے کتاب پر نظر ڈالی: "او احمقو!..... جاؤ یہ اسے واپس کر دو!"

اس طرح زیک لوگ وہ تصنیف پڑھتے تھے جو "پارٹی اور عوام کی منظور شدہ" تھی۔

سوویٹ حکومت کے ۴ ۱۹۶ء کے ایک اعلان میں ہم نے پڑھا: "ہولناک جرم کرنے والے مناسب سزا سے کسی بھی صورت میں کبھی بھی نہیں بچ سکیں گے۔ فاشسٹ قاتلوں کے جرائم کی جن کا مقصد پوری کی پوری نسل کو تباہ کرنا تھا تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔"

یہ اعلان فیڈرل جرمن ریپبلک کو بیس برس گزر جانے کے بعد مجرمین جنگ کے لیے مدت کا تعین کرنے والا قانون بنانے سے باز رکھنے کے لیے کیا گیا تھا۔

لیکن وہ خود عدالت کا سامنا کرنے کی کوئی خواہش ظاہر نہیں کرتے اگرچہ ان کا مقصد بھی "پوری کی پوری نسل کو تباہ کرنا تھا۔

ہمارے اخبارات میں مغربی جرمنی کے مفرور مجرموں کو سزا دینے کی اہمیت پر بہت سے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بھی ہیں جو ایسے مضامین کے ماہر ہیں۔ مثلاً لیفگنبرگ نامی نے لکھا ہے (کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم صاف صاف دیکھیں): "نازیوں کو اجتماعی قتل فطری اور مناسب معلوم ہوا اس کے لیے انھیں کون سی اخلاقی تربیت حاصل کرنی پڑی تھی؟!" اب قانون ساز یہ کہہ کر اپنی صفائی پیش کرنا چاہتے ہیں کہ ہم سزا پر عمل کرنے والے لوگ نہیں تھے اور جنھوں نے عمل کیا وہ یہ کہہ کر کہ قانون ہم نے نہیں بنایا تھا۔

یہ سب فرسودہ کہی سنائی باتیں ہیں۔ ہم ابھی پڑھ چکے ہیں کہ ہمارے "عملی کارندے" کیا کہتے ہیں: "قیدیوں کی حراست عدالتوں کے فیصلے پر عمل کرنے کا معاملہ ہے۔ پہریدار نہیں جانتا کہ کون کس جرم میں اندر ہے۔"

تو تمہیں یہ معلوم کرنا چاہیے تھا۔ اگر تم انسان ہو۔ یہ چیز تمہیں شیطان بنا دیتی ہے کہ تم اپنی حراست میں موجود آدمی کو نہ تو ساتھی شہری سمجھتے ہو نہ ساتھی انسان۔ کیا نازیوں کے بھی اپنے ضابطے نہیں ہوتے تھے؟ کیا نازیوں کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ وہ آریہ قوم کی حفاظت کر رہے ہیں؟

نہ ہمارے تفتیش کرنے والوں کو جواب دینے میں دشواری ہوگی (وہ پہلے ہی جواب تیار کر کے بیٹھے ہیں) وہ پوچھتے ہیں کہ قیدی اپنے خلاف بیان کیوں دیتے تھے؟ دوسرے الفاظ میں "جب ہم انھیں اذیتیں پہنچاتے تھے تو انھیں مستقل مزاج رہنا چاہیے تھا۔" اور مخبر جھوٹی اطلاعات کیوں فراہم کرتے تھے؟ ہم ان پر اس طرح یقین کر لیتے تھے

جیسے وہ حلفیہ شہادت کی حیثیت رکھتی ہوں!

کچھ مدت تک وہ بے چین رہے۔ ایم۔جی۔بی۔ کے سابق لیفٹننٹ جنرل دی۔این۔ ایلین نے، جس کا ذکر ہم نے پہلے بھی کیا تھا، اسٹولینوفسکی (جنرل گوبار توُف کا وہ تفتیش کنندہ جس کا اس نے حوالہ دیا تھا) کے بارے میں کہا: "ارے پیارے بھائی! یہ کیسا ہولناک فعل ہے! اتنی ساری پریشانیاں، وہ بھگت رہا ہے اور بے چارے کو اتنی عمدہ پنشن ملتی ہے"۔ اس وجہ سے بھی اے۔ ایف۔ زخاروفا نے اپنا قلم سنبھالا۔ اسے یہ تشویش تھی کہ ان سب کی تنقید جلد ہی عام ہو جائے گی۔ کیپٹن لخوشیر سٹوُف (۱)ؔ کے بارے میں، جس کی ڈیا کوف نے "مذمت اور چغلی کی تھی"، اس نے جذباتی انداز میں لکھا: وہ تا حال کیپٹن ہے اور پارٹی کی ایک تنظیم کا سکریٹری ہے (۱) اور اپنی محنت کاشت میں صرف کرتا ہے۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اب اس کے لیے کام کرنا کتنا دشوار ہوگا۔ جب لوگ اس کے متعلق ایسی باتیں لکھ رہے ہوں، لخوشیر سٹوُف کی تفتیش کی باتیں ہو رہی ہیں اور شاید اسے عدالت میں بھی کھینچا جائے گا[۱۲] کس بات کے لیے؟ اگر یہ معاملہ باتوں تک ہی محدود رہے تو ٹھیک ہے لیکن اب یہ ممکن نہیں کہ وہ اسے عدالت بھی پہنچا دیں۔ اس طرح موپ کے اراکین میں واقعی تہلکہ مچ جائے گا۔ اس کی تحقیقات کیجیے۔ ان قوانین کی تکمیل کے لیے جو اسے اوپر سے پہنچائے گئے تھے۔ کیا اب اس سے ان کی طرف سے جواب دینے کی توقع کی جاتی ہے جنھوں نے یہ قوانین بنائے تھے؟ کیسی عیارانہ بات ہے! جب کوئی حادثہ ہو جائے تو قصور سو پچ تین کے سر منڈھ دو!"

لیکن ہلچل جلد ہی ختم ہو گئی۔ نہیں کسی کو جلد ہی نہیں کرنی پڑے گی۔ کسی کے خلاف تحقیقات نہیں کی جائیگی۔

شاید کچھ مقامات پر اشاعت میں کمی کر دی گئی تھی لیکن ذرا صبر سے کام لیجیے۔ اور وہ پھر بڑھا دیے جائیں گے۔

اس اثنا میں افسران تحفظ جو ابھی پنشن کی عمر کو نہیں پہنچے، اور وہ جو اپنی بیش از بیش پنشن لینا چاہتے ہیں، مصنف، صحافی، مدیر، مذہب کے خلاف تقریریں کرنے والے، نظریاتی مبلغ یا ان میں سے چند صنعتی اداروں کے منتظم بن گئے ہیں وہ سب اپنے دستانے تبدیل کریں گے اور جب سابق ہمارے رہنما بنے رہیں گے۔ یہ زیادہ محفوظ طریق کار ہے (اگر کوئی شخص اپنی پنشن پر گزر بسر کر کے قانع ہے تو اسے اطمینان سے موج اڑانے دو۔ مثال کے طور پر لیفٹننٹ کرنل (وظیفہ یاب) خورڈینکو کو لیجیے۔ لیفٹننٹ کرنل،...... بڑا بلند منصب ہے یہ! یقیناً وہ پہلے کسی بٹالین کا کمانڈر رہا ہوگا؟ نہیں۔ اس نے ۱۹۳۸ء میں محض ایک جیل افسر کی حیثیت سے ابتدا کی تھی۔ وہ زبردستی کھانا کھلانے کی نلی استعمال کرتا رہتا تھا)

ریکارڈ آفس میں وہ آرام کے ساتھ تفتیش کرتے ہیں اور غیر مطلوبہ دستاویزات نذرِ آتش کر دی جاتی ہیں، گولی کا نشانہ بننے والوں کی فہرستیں، قیدیوں کی تنہائی کی سزا یا ڈسپلن بیرک میں مقید رکھنے کے احکامات، کیمپوں میں کی جانے والی ایجادات کی فائلیں مخبروں کی فراہم کردہ شکایتیں، عملی کارندوں اور کانوائے گارڈوں سے متعلق غیر ضروری کاغذات ہوتے ہیں جن سے اطلاعات حاصل کی جا سکتی ہیں......

خاموش آسیبوں کی طرح ہم شرکت کرتے ہیں۔
تمہاری دعوت میں۔
اور تم جو زندگی میں ہم سے نفرت کرتے ہیں،
ہمارے میزبان بنو گے۔
لیکن مُردہ اور بے زبان۔

ہم ہیں انتقام لینے والے سائے،
جن سے تمہیں خوف کھانا ہوگا۔
وکٹوریا۔ جی۔ کولیما کیمپوں کی ایک خاتون گریجویٹ۔

چلتے چلتے ایک بات اور۔ اصل میں ہمیشہ سوچتی ہی پر ہی الزام کیوں عائد کیا جاتا ہے؟ ٹریفک کنٹرول کرنے والوں کا کیا ہوتا ہے؟ ان کی کیا حالت ہے جو افسر جیل سے کچھ بلند ہیں؟ عملی کارندے تفتیش کنندگان؟ وہ جنھوں نے صرف ایک انگشت نمائی کی تھی؟ وہ جنھوں نے کسی اسٹیج سے صرف چند الفاظ کہے تھے؟.....

پھر یہ کیسے چلتا ہے؟ ہولناک جرائم کرنے والوں کو..... کسی بھی صورت میں..... منصفانہ انتقام..... تاریخ میں نظیر نہیں ملتی..... پوری کی پوری نسل کو تباہ کرنا مقصود تھا.....

شش! شش! اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیوں اگست ۱۹۶۵ء میں نظریاتی اجلاس (ہمارے اذہان کن خطوط پر کاربند ہوں اس موضوع پر ایک خصوصی کانفرنس) کے اسٹیج سے مندرجہ ذیل اعلان کیا گیا تھا: عوام کے دشمن کی ٹھوس اور کارآمد تعریف کو پھر سے سمجھ لینے کا وقت آگیا ہے!

دوسرا باب

حکمراں بدلتے ہیں مجمع الجزائر برقرار رہتا ہے

اسپیشل کیمپ اسٹالن کی ضعیفی کے سب سے لاڈلے ذہنی بیٹوں میں سے ہوں گے۔ سزا دینے اور از سرِ نو تعلیم یافتہ بنانے کی بہت سی آزمائشوں کے بعد، یہ پختہ اور بے عیب چیز آخر میں برآمد ہوئی تھی؛ لوگوں کی جگہ نمبروں کا یہ گنجان اور بے چہرہ تنظیم جس مادرِ وطن نے اسے جنم دیا ہے اس سے ذہنی اعتبار سے منقطع، صرف دشمنوں کو نگلنے والی اور صنعتی اشیاء اور لاشیں پیدا کرنے والی۔ اگر اس دور اندیش معمار نے اس عظیم طریقِ کار کا دیوالیہ پن دیکھ لیا ہوتا تو اسے کتنی شدید تکلیف بحیثیت خالق ہوئی ہوتی اس کا تصور بھی دشوار ہے۔ اس کی زندگی میں ہی اس کو جنبش آ گئی تھی، اس سے چنگاریاں اٹھنے لگی تھیں اور اس میں چاروں طرف شگاف پڑ گئے تھے لیکن شاید احتیاط کامیاب رہی اور ان باتوں کی اطلاع اسے نہیں دی گئی جب اسپیشل کیمپ کا طریقہ رائج ہوا تھا اس وقت یہ ناکارہ، سست اور بے فکر تھا لیکن شدید حرارت کے ایک ایسے عمل سے گزرا کہ چند سالوں میں ہی اس کی حالت کسی کھولتے ہوئے آتش فشاں جیسی ہو گئی اگر وہ عظیم استاد سال ڈیڑھ سال اور زندہ رہ جاتا تو اس دھماکے کو اس سے پوشیدہ رکھنا ناممکن ہو جاتا اور اس کا مضمحل و شکستہ ذہن ایک نئے فیصلے سے وزنی ہو جاتا کہ اس کا محبوب منصوبہ یا تو ختم کر دیا جائے ورنہ اسے دیگر کیمپوں میں ضم کر دیا جائے یا پھر اس کے برعکس ان تمام نمبروں کو سلسلے وار طریقے سے گولیوں سے بھون دیا جائے۔

لیکن آہ و بکا اور تزئین کے مابین، مفکر، اس اعتبار سے کچھ قبل ہی وفات پا گیا[1] وہ مر گیا اور کچھ ہی مدت کے بعد اس کے اکڑے ہوئے ہاتھ نے تا حال گلابی رخساروں والے صحت مند اور قوی رفیقِ کار کو دفعتاً تحت الثریٰ میں لا پھینکا۔ یہ تھا ان غیر معمولی، دبیز، پیچیدہ اور ناقابلِ برداشت داخلی امور کا وزیر!

مجمع الجزائر کے آقا کے زوال سے اسپیشل کیمپوں کی شکست کے عمل کی رفتار میں افسوسناک اضافہ ہو گیا (یہ ناقابلِ اصلاح تاریخی اہمیت کی غلطی تھی، اس میں کیا تک ہے کہ خفیہ امور کے وزیر کی آستیں کھینچ لی جائیں! آسمانی نیلی شلنے کی پیٹیوں پر گندے ہاتھ لگائے جائیں!)

نمبروں کی پٹیاں — بیسویں صدی کی تعزیری سائنس کی سب سے بلند ایجاد سرعت کے ساتھ نوچ پھینکی گئیں فراموش کر دی گئیں! صرف اسی واحد سبب سے مجمع الجزائر کی کرخت یکسانیت زائل ہو گئی۔ اب اس کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ جبکہ جھونپڑوں کی کھڑکیوں سے سلاخیں اور دروازوں سے قفل ہٹا دیے گئے تھے جس سے اسپیشل کیمپوں کے خوشگوار زندانی اوصاف، جس کی وجہ سے یہ اصلاحی مشقتی کیمپوں سے ممتاز نظر آتے تھے، ختم ہو گئے (شاید انھیں سلاخیں ہٹانے میں اتنی عجلت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ لیکن انھیں تاخیر کی گنجائش بھی نہیں ملی تھی اس قسم کے دور میں یہی ظاہر کرنا مناسب ہے۔ اچھا ہوتا ہے کہ آپ کہاں کھڑے ہوئے ہیں) اگرچہ یہ افسوسناک بات تھی لیکن ابھی لبرل کا سنگین زندہ جاویدوں کے سامنے استوار رہا تھا۔ اب تو ڈھیا گیا، سرکاری طور پر مسمار کر دیا گیا[2] لیکن آپ کیا توقع کر سکتے تھے اگر وعدہ فنا

اسپیشل کیمپ کے ایک ایک آسٹرین، ہنگرین، پولش اور رومانین قیدی کو ان کی پندرہ بیس برس کی میعادِ قید کی شتہ برابر پروانہ کرتے ہوئے رہا کر دیتے اور اس طرح طویل سزا کا خوف بالکل زائل کر دیتے۔ انھوں نے مراسلت پر سے بھی پابندی اٹھالی جس کی وجہ سے اسپیشل کیمپوں کے قیدی اپنے آپ کو واقعی زندہ مدفون محسوس کرنے لگے تھے۔ انھوں نے ملاقاتوں پر سے ممانعت بھی ختم کر دی ——— ہولناک خیال۔ ملاقات کے لیے آنا!..... (باغی کینگر میں بھی وہ اس کام کے لیے علیحدہ چھوٹے چھوٹے مکان تعمیر کرنے لگے) وسیع النظری کی لہر پہلے کے اسپیشل کیمپوں پر برق رفتاری کے ساتھ پہنچ گئی۔ قیدیوں کو حسبِ مرضی فیشن کے مطابق بال رکھنے کی رعایت مل گئی (اور باورچی خانے سے ایلومونیم کی طشتریاں غائب ہونے لگیں اور ان کے کنگھے بنائے جانے لگے) جیت کھاتوں کی جگہ غلامو، کو عام سوویٹ سکّے استعمال کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی اور وہ باہر کے لوگوں کی مانند نقد رقم دے کر اپنے بلوں کی ادائیگی کرنے لگے۔

بے احتیاطی سے، بے خیالی سے انھوں نے اس طریقِ کار کو ختم کر دیا جو ان کی شکم پروری کرتا تھا۔ اس طریقِ کار کو گُننے، باندھنے اور ٹھونک پیٹ کر ایستادہ کرنے میں انھوں نے کئی دہائیاں صرف کی تھیں۔

اور کیا وہ پختہ کار مجرم اس تمام تملق شعاری سے نرم پڑ گئے؟ نہیں، وہ نرم نہیں ہوئے۔ انجام اس کے برعکس ہوا۔ انھوں نے نہایت نامناسب، ناگوار اور بے معنی ایک لفظ 'بیریا آنٹس' (بیریا پرست) اختیار کر کے اپنی بدمعاشی اور محسن کشی کا اظہار کیا۔ اور اب جب کوئی چیز انھیں بُری لگتی تو وہ وفادار کانوائے گارڈوں، عرصے سے تکلیف برداشت کرنے والے وارڈروں ان کے پُرجوش محافظوں اور کیمپ کے اعلیٰ عہدیداروں پر یہ توہین آمیز لفظ اچھال دیتے تھے۔ نہ صرف یہ لفظ رحم دل عملی کارندوں کو تکلیف پہنچاتا تھا، بلکہ بیریا کے زوال کے بعد اتنی جلد اس کا استعمال خطرناک بھی ہو سکتا تھا کیونکہ کوئی اسے کسی الزام کا نقطۂ آغاز بھی بنا سکتا تھا۔

اسی باعث کینگر کیمپ ڈویژن میں سے (جس میں سے تمام باغیوں کو نکالا جا چکا تھا اور ان کی جگہ ایکی لسٹ کے قیدی لائے جا چکے تھے) ایک کے صدر کو اسٹیج سے مندرجۂ ذیل تقریر کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑا: "لوگو! (۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۶ء تک کے ان تھوڑے سے برسوں میں ان کے لیے قیدیوں کو "لوگو" کہہ کر مخاطب کرنا ممکن ہو گیا) تم نے ان پر 'بیریا آنٹس'، کا فقرہ چسپاں کر کے کارکنوں اور پہریدار فوجیوں کے جذبات کو مجروح کیا ہے! ازراہِ کرم یہ سلسلہ ختم کر دو۔" اس پر پستہ قامت دی۔ جی۔ ولاشو نے جواب دیا "آپ کے جذبات کو گزشتہ چند ماہ کے دوران چوٹ پہنچی ہے لیکن میں نے سابقہ اٹھارہ برسوں میں آپکے گارڈوں کی زبان سے 'فاشسٹ' کے سوا اپنے لیے دوسرا لفظ نہیں سنا۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ ہمارے بھی کوئی جذبات ہیں یا نہیں؟ اور اس طرح میجر نے گالی کی طرح "فاشسٹ" لفظ کے استعمال کو ترک کر دینے کا وعدہ کیا ——— سودا اچھا تھا!

ان تمام ہلکی اور غارتگر اصلاحوں کے بعد ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اسپیشل کیمپوں کی مخصوص تاریخ ۱۹۵۴ء میں مکمل ہو گئی اور بعد ازاں ان میں نیز اصلاحی مشقتی کیمپوں میں امتیاز کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔

سارے کے سارے معکوس مجمع الجزائر میں ۱۹۵۴ء سے قبل ہی نرمی کا زمانہ شروع ہو گیا اور یہ ۱۹۵۶ء تک جاری رہا سب سے مثالی صفائی کا دور تھا۔ شاید اس کی تاریخ میں زیادہ سے زیادہ آزادی کا زمانہ تھا۔ اگر ۱۹۲۵ء کے آس پاس کے پی ڈبلیو زیڈ ٹی (غیر پیشہ ور مجرموں کی نظر بندی کے مراکز) کو شمار نہ کیا جائے۔

کیمپوں میں وسیع المشترانہ رویّے کے پیش از بیش اطلاق کو فروغ دینے والے احکام یکے بعد دیگرے صادر ہوتے رہے۔ ایک انسپکٹر دو نمبر سے ست بازی لے جانے کی کوشش کرتا تھا جبلات میں خاتون مزدوروں کے استعمال کی اجازت واپس لے لی گئی۔

یہ تسلیم کیا گیا کہ شہتیر چیرنا غالباً خواتین کے لیے مزدوری سے زیادہ سخت کام ہے (ہر چند کہ درمیان میں ضابطے کے مطابق تیس [۳۰] برسوں تک اس کا چلن ثابت کرتا تھا کہ یہ اتنا زیادہ سخت کام ہرگز نہیں تھا!) ان لوگوں کے لیے پیرول پھر رائج کر دیا گیا جو اپنی سزا کا دو تہائی حصہ مکمل کر چکے تھے۔ انھوں نے تمام کیمپوں میں نقد رقم کی شکل میں مزدوری کی ادائیگی کا آغاز کیا اور دکانوں پر قیدیوں کے ہجوم نظر آنے لگے جن پر کوئی دور اندیشانہ نظم و نسق سے متعلق پابندیاں نہیں تھیں اور پابندیاں ہو بھی کیسے سکتی تھیں جب اتنے بہت سے قیدی زیادہ مدت تک پہرے کے بغیر رہتے تھے! سچ پوچھیے تو خواہشات کے مطابق وہ بستی میں جا کر بھی اپنا پیسہ خرچ کر سکتے تھے۔ تمام جھونپڑوں میں ریڈیو کے لیے تار لگوا دیے گئے۔ قیدیوں کو خواہش سے بڑھ کر اخبار اور دیواری اخبار فراہم کیے جانے لگے۔ ہر گروہ کے لیے احتجاج کرنے والے نمائندگان متعین کر دیے گئے۔ کامریڈ لیکچرر (کرنل بھی) کیمپ کے مقیموں کو مختلف موضوعات پر تقریر سنانے کے لیے آنے لگے۔ الکیئی ٹالسٹائے نے تاریخ کو مسخ کرنے کی بابت لکھ دیا — لیکن انتظامیہ کو سامعین جمع کرنے میں اتنی آسانی نہیں تھی (اب وہ انھیں ڈنڈوں سے تو ہانک نہیں سکتے تھے، اور دباؤ نیز ترغیب کے لیے زیادہ مؤثر طریقوں کی ضرورت تھی) ہال میں وقفے وقفے سے باہمی گفتگو کی آوازیں سنائی دیتی تھیں اور کوئی مقررین کی جانب توجہ نہ دیتا تھا۔ قیدیوں کو سرکاری قرضہ جات میں روپیہ لگانے کی اجازت تھی اور وفاداروں کے سوا کوئی اس جانب مائل نہیں ہوتا تھا اور ان کے صلاح کاروں کو ہر قیدی کو باہیں تھام کر روپیہ دینے والوں کی فہرست میں نام لکھانے کے لیے کھینچنا پڑتا تھا اور اس کی جیب سے دس کا سکہ (ایک رُوبل، خروشچیف اسٹائل) زبردستی نکالنا پڑتا تھا۔ وہ اتواروں کو مردوں اور عورتوں کے لیے مخلوط شو کرنے لگے۔ ان میں لوگ اپنی مرضی سے ہجوم در ہجوم شریک ہوتے تھے اور مرد کیمپوں کی دکانوں سے اپنے لیے ٹائیاں بھی خرید لیتے تھے۔

مجمع الجزائر کا کافی لیس انداز کیا ہوا روپیہ پھر عوامی استعمال کے لیے جاری کر دیا گیا۔ بے لوث رضاکارانہ کاموں کا، جو عظیم نہروں کے ایام میں جاری تھے، دوبارہ احیاء ہو گیا۔ اچھے کام کرنے والوں کی مجلسیں قائم کی گئیں جن کے سیکٹر مقامی ٹریڈ یونین کمیٹیوں کی طرز پر بنائے گئے (یہ صنعتی تربیت، ثقافت و تفریح نیز خدمات کے لیے تھے) اور ان کا مطمع نظر زیادہ پیداوار کے لیے جدوجہد اور اچھا ڈسپلن قرار پایا۔ کامریڈوں کی عدالتیں پھر تشکیل دی گئیں جنھیں مجرموں کی مذمت کرنے کا حق حاصل تھا اور وہ انتظامی کارروائی کے لیے یا "دو ثلث" کا قانون نافذ نہ کرنے پر یاددہانی کر سکتی تھیں۔

ان تدابیر نے کسی زمانے میں ہمارے قائدین کو بہت فائدہ پہنچایا تھا۔ لیکن یہ ان کیمپوں میں پہنچا تھا جہاں قتل اور بغاوت والا اسپیشل کیمپوں کا کورس نہیں چلا تھا۔ اب حالات زیادہ سہل تھے ایک بہترین کام کرنے والوں کی مجلس کے صدر کو (کینگر میں) قتل کر دیا گیا، دوسرے کو زدوکوب کیا گیا اور اچانک کوئی بھی ان مجلسوں میں شمولیت کا خواہش مند نہ رہ گیا (کیپٹن سیکنڈ کلاس، برکوفسکی اس وقت ایک بہترین کام کرنے والوں کی مجلس میں کارکن تھا، دیانتداری اور خلوص نیت کے ساتھ کام کرتا تھا لیکن چونکہ اسے ہمیشہ چاقو سے دھمکیاں دی جاتی تھیں اس لیے وہ بھی بے حد محتاط تھا اور اپنے کاموں پر تنقید سننے کے لیے بینڈ ورسٹ بریگیڈ کی نشستوں میں حاضری دیا کرتا تھا)

پھر بھی دیع انتظامیہ کے بعد روانہ حملوں سے کیمپوں کا نظام لرزتا اور ڈگمگاتا رہا۔ "نرم ڈسپلن والے کیمپ ڈویژن" قائم کیے گئے (اس قسم کا ایک کینگر میں بھی تھا) انجام یہ ہوا کہ آپ کے لیے کیمپ کے علاقے میں صرف سونا ضروری تھا کیونکہ کام کرنے کے لیے پہرے کے بغیر کسی بھی راستے سے جس وقت جی چاہے جا سکتے تھے (دراصل ہر شخص جلد روانہ ہو کر تاخیر سے پلٹنا چاہتا تھا۔ اتوار کی شام کو کھانے سے قبل ایک تہائی تعداد شہر میں چھوڑ دیے جاتے تھے، ایک تہائی کو کھانے کے بعد اجازت

تھی صرف ایک تہائی کو یہ اجازت نہیں ملی تھی۔[۳۴]

ایک ایم۔ وی۔ ڈی۔ افسر نے، جو ۱۹۶۴ء میں ایک سائبیرین ٹرین پر میرا ہمسفر تھا، کیمپوں کی زندگی کا ۱۹۵۴ء سے قبل تک کے دور کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا: "حالات بالکل قابو سے باہر ہوگئے! جو لوگ نہیں چاہتے تھے کام پر نہ جاتے تھے وہ اپنی ہی رقوم کے ٹیلی ویژن خرید لیتے تھے۔"[۳۵] اس کے ذہن میں اس قلیل لیکن رنجیدہ مدت کی بڑی سیاہ یادیں مرتسم تھیں۔ سبب یہ تھا کہ جب قیدی کا مصلح سامان فراہم کرنے والے کی طرح اس کے سامنے کھڑا ہو، اس کے ہاتھ میں تازیانہ ہو نہ تحریری کوٹھڑیاں ہوں نہ آخری سزا کے طور پر تھوڑا تھوڑا راشن کم کرنے کا اختیار ہو تو پھر کیا فائدہ ہو سکتا ہے!

لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ اتنا ابھی کافی نہیں تھا۔ مجمع الجزائر پر اگلا حملہ ایک گرز سے کیا گیا جو آف کیمپ (باہر رہنے کا طریقہ) کہلاتا تھا۔ قیدیوں کو ہر طرح گھومنے پھرنے، مکانات خریدنے اور کنبے رکھنے کی اجازت دیدی گئی، انھیں آزاد شہریوں کی طرح اجرت ادا کی جاتی تھی (کیمپ پہریداروں اور انتظامیہ کے اخراجات کے لیے اب کوئی رقم وضع نہیں کی جاتی تھی) کیمپ کے ساتھ اُن کا اتنا ہی تعلق باقی رہ گیا تھا کہ انھیں پندرہ دن میں ایک مرتبہ وہاں حاضری دینے کے لیے جانا پڑتا تھا!

یہ انتہا تھی دنیا کا خاتمہ یا مجمع الجزائر کا خاتمہ، یا دونوں کا بیک وقت خاتمہ۔ لیکن قانونی شعبوں نے آف کیمپ طریق کار کو ہمدردانہ انسانی اور اشتراکی نظام کی نئی ایجاد کہہ کر اس کی تعریف کی![۳۶]

ان ضربوں کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کیمپوں کو ختم کر دینے اور ان سے دستبردار ہو جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے۔ عظیم مجمع الجزائر کو تباہ کرنا، لاکھوں عملی کارندوں کو، جن کی بیویاں، بچے اور پالتو جانور بھی ہیں۔ تباہ کر کے منتشر کر دینا اور پست ہمت کر دینا۔ وفاداری کے ساتھ انجام دی جانے والی ملازمت، عہدے، عمدہ ریکارڈ کو کارِ فضول بنا دینا ہی باقی رہ گیا تھا۔

معلوم ہوتا تھا کہ اس کا آغاز پہلے ہی ہو چکا تھا: سپریم سوویٹ کے کمیشن یا زیادہ آسان الفاظ میں کہیں تو "مال اتارنے والی پارٹیاں" کیمپ میں آنے لگیں، کیمپ کے عہدیداران کو نظر انداز کرتی ہوئی، اسٹاف کے جھونپڑوں میں اپنے جلسے کرتی ہوئی اور رہائی کے احکامات اتنے غیر ذمہ دارانہ انداز میں ہلکے پھلکے موڈ میں جاری کرتی ہوئی جیسے وہ گرفتاری کے وارنٹ ہوں۔

عملی کارندوں کی پوری نسل پر ایک مہلک تلوار معلق تھی۔ انھیں کچھ نہ کچھ سوچنا ہوگا۔ انھیں لڑنا پڑے گا۔

* * *

سوویٹ یونین میں کسی بھی اہم سماجی واقعے کے دو انجام ہو سکتے ہیں: یا تو اسے دبا دیا جائے یا پھر یہ بدنامی کا ہدف بنے۔ میں اپنے وطن میں ایسے کسی اہم واقعے کی بات نہیں سوچ سکتا۔ جو راہ کی اس رکاوٹ کو پار کر سکا ہو۔ یہی کیفیت مجمع الجزائر کے زمانۂ وجود میں بھی تھی۔ زیادہ تر مدت میں اسے دبایا جاتا تھا اور اس کی بابت جو کچھ کہا جاتا تھا وہ کذب بیانی تھی خواہ وہ عظیم نہروں کے دور میں ہوا ہو یا ۱۹۵۶ء کے "مال اتارنے والے" کمیشنوں کے متعلق ہو۔

جہاں تک ان کمیشنوں کا تعلق تھا ہم نے خود ہی اخبارات کو کسی عیارانہ ترغیب یا بیرونی دباؤ کے بغیر ہی جذباتی وحدت گروی کے کام میں معاونت دی تھی۔ کون بُری طرح متاثر نہ ہو جائے گا۔ ہم اس بات کے عادی تھے کہ ہم نے اپنے

وکیل بھی ہم پر حملہ کریں اور اب سرکاری وکیل ہماری حمایت کر رہے تھے! ہم آزادی کے لیے بے قرار تھے، ہم محسوس کرتے تھے کہ وہاں باہر ایک نئی زندگی کا آغاز ہو رہا تھا۔ اتنی بات تو کیمپوں میں پیدا شدہ تبدیلیوں سے ہی نظر آ جاتی تھی — اور اچانک وہاں ایک کراماتی اور با اقتدار کمیشن آیا۔ جس نے ہر قیدی سے پانچ دس منٹ بات کی پھر اسے ریل کا ٹکٹ اور ایک پاسپورٹ دیا (ان میں سے کچھ نے تو ماسکو کے لیے بھی نام درج کرایا) ہم قیدیوں کی نحیف و لاغر چھاتیوں سے جو پرانی کھانسی سے خرخراہی تھیں تعریف کے سوا اور کون سے الفاظ بر آمد ہو سکتے تھے!

لیکن اگر ہم ایک لمحے کے لیے اس مسرت سے بلند ہو کر سوچتے جس کی وجہ سے ہمارے قلوب تکلیف دہ تیزی کے ساتھ دھڑک رہے تھے، ہم اپنے چیتھڑے تھیلیوں میں ٹھونسنے کے لیے دوڑ رہے تھے اور اپنے آپ سے دریافت کرتے کہ کیا اسٹالن کے تمام جرائم کی مناسب تلافی یہی ہے، تو کیا رہتا؟ کیا کمیشن کو قیدیوں کی ایک عام قطار کے سامنے کھڑے ہو کر اور سر اٹھا کر یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔

"بھائیو! ہمیں سپریم سوویٹ نے آپ سے معذرت طلب کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ آپ نے سالہا سال تک یہاں صعوبتیں جھیلی ہیں حالانکہ آپ کا کوئی قصور نہ تھا جبکہ ہم جگمگاتے ہوئے جھاڑ فانوسوں کے نیچے تقریبات کے ہالوں میں جمع ہوتے رہے اور آپ کی بابت ہم نے کبھی ایک بات بھی نہیں سوچی۔ ہم نے پست ہمتی کے ساتھ اس آدم خور کے غیر انسانی قوانین کو قبولیت کا درجہ بخشا، ان میں سے ہر ایک کو پاس کر دیا۔ ہم اس کے ہاتھوں ہونے والے قتلوں میں شریک رہے ہیں اور اگر تم سے ممکن ہو سکے تو ہماری اس تاخیر سے پیش کردہ پشیمانی کو قبول کر لو۔ پھاٹک کھلے ہیں اور تم آزاد ہو۔ وہاں باہر طیارے دوائیں، غذائیں اور گرم کپڑے پہنچا رہے ہیں، جہاز پر ڈاکٹر موجود ہیں۔

بہر طور انھوں نے اپنی آزادی حاصل کر لی لیکن آزادی عطا کرنے کا یہ طریقہ نامناسب تھا اس کے سچے مفہوم کو رد کرنے کا طریقہ تھا: مال اتارنے والا کمیشن اسٹالن کی قے پر چلنے والے ایک محتاط چوکیدار کی مانند تھا اور تندہی سے اس کی صفائی کر رہا تھا، بس اتنی ہی بات تھی یہ ہمارے معاشرے کی نئی اخلاقی بنیادیں استوار کرنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔

اے۔ کرسٹنکوفا کے فیصلے کے بعد جو کچھ پیش آیا میں اس کی مثال دیتا ہوں جس سے میں ہر طرح اتفاق کرتا ہوں قیدی یکے بعد دیگرے دفتر میں طلب کیے جاتے ہیں (ہمیشہ کی طرح انھیں غیر متشکل رکھنے کے لیے) جہاں کمیشن بیٹھا ہے۔ ہر شخص کے کیس کے بارے میں کچھ حقیقت پر مبنی سوالات کیے جاتے ہیں۔ سوالات کا لہجہ نرم ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مقصد بھی نیک ہے، لیکن ان کا مطمح نظر یہ ہے کہ قیدی کو اپنے جرم کا اقبال کرنا ہوگا (سپریم سوویٹ کو نہیں بلکہ ہر رنجور قیدی کو!) اسے خاموش رہنا ہوگا، اسے اپنا سر جھکانا ہوگا، اسے معذرت طلبی کا انداز اختیار کرنا ہوگا۔ معاف کرنے والے کی حیثیت اس کی نہیں ہوگی۔ بالفاظِ دیگر وہ آزادی کا وعدہ کر کے ابھی سے وہ باتیں زبردستی قبول کرانا چاہتے ہیں جو قبل ازیں اذیتیں پہنچا کر تسلیم نہیں کرائی جا سکیں کیوں؟ آپ دریافت کرنا چاہیں گے۔ یہ بہت اہم پہلو ہے۔ وہ ایک خوفزدہ انسان بن کر آزادی میں قدم رکھے! ساتھ ہی کمیشن کے ریکارڈ تاریخ پر یہ ظاہر کریں گے کہ جو لوگ قید تھے انھیں سے بیشتر مجرم تھے۔ کہ ظالمانہ قانون شکنی کے الزامات محض فریب ہیں (اس سے اچھا اقتصادی فائدہ بھی ہو سکتا ہے: بغیر نوآبادکاری کے کسی نقصان کی تلافی کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی) اگر اس کا اس سے زائد کوئی مفہوم نہ تھا تو قیدیوں کی رہائی سے کوئی خطرہ نہیں تھا، اس طرح کیمپ کا نظام کا نیست و نابود نہیں ہوا۔ اس نے نئے داخلوں پر کوئی پابندی نہیں عائد کی (جو ۱۹۵۰ اور ۱۹۵۲ میں بھی بے روک ٹوک چلتے رہے) اور نو واردوں کو ان کی باری آنے پر ہانکنے کی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کیا۔

ان کا کیا حشر ہوا جنھوں نے اپنی کج فہمی اور خودداری کے تحت کمیشن کے روبرو اقبالِ جرم نہیں کیا؟ انھیں اندر ہی چھوڑ دیا گیا۔ ان کی تعداد کم ہی تھی (۱۹۵۶ء میں ڈبروفلاگ میں اظہارِ ندامت نہ کرنے والی خاتون قیدیوں کو پکڑ کر کیمیرروفرمیں بھیج دیا گیا)

اسکر پنکوفا ہمیں مندرجہ ذیل واقعہ بتاتی ہے: ایک مغربی یوکرینی عورت کو اس بنا پر دس سال کی سزا دی گئی تھی کہ اس کا شوہر بنیڈورا کا حامی تھا۔ اب اس سے کہا گیا کہ وہ تسلیم کرے کہ وہ اس وجہ سے قید کی گئی تھی کہ اس کا شوہر ڈاکو تھا۔ "نہیں، میں یہ بات تسلیم نہیں کر سکتی۔" "اگر تسلیم کرو تو تم آزاد کر دی جاؤ گی!" "نہیں، میں ہرگز نہیں کہہ سکتی۔ وہ ڈاکو نہیں ہے وہ او۔یو۔این۔ میں ہے۔" "ٹھیک ہے، اگر تم نہیں آزاد ہونا چاہتیں تو قید میں رہ سکتی ہو!" کمیشن کے چیئرمین سوفیوف نے کہا۔ کچھ دن بعد اس کا شوہر اس سے ملنے آیا۔ وہ شمالی علاقے سے گھر جا رہا تھا۔ اسے پچیس سال کی سزا دی گئی تھی لیکن اس نے فوراً تسلیم کر لیا کہ وہ ڈاکو تھا اور اسے معاف کر دیا گیا۔ اس نے اپنی اہلیہ کی مستقل مزاجی کی کوئی تعریف نہیں کی اور اسے خوب برا بھلا کہا۔ "تو نے کیوں نہیں کہہ دیا کہ میں مجسّم شیطان ہوں کہ تو نے میری دُم اور پھٹے ہوئے سُم دیکھے ہیں؟ اب میں فارم اور بچوں کی نگہداشت کیسے کروں گا؟"

ہمیں یہ بھی بتا دوں کہ اسکر پنکوفا نے خود اپنا جرم بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور مزید تین سال تک قید بھگتی تھی۔ اس طرح آزادی کا دور بھی مجمع الجزائر میں وکیل کا گاؤن پہن کر وارد ہوا۔

پھر بھی عملی کارندے کی تنبیہ بے بنیاد نہ تھی۔ ۱۹۵۶ء-۱۹۵۵ء میں مجمع الجزائر کے خانگی حالات ایسے تھے جیسے کہ پہلے کبھی نہیں دیکھے گئے۔ یہ اس کے لیے واقعات سے پُر زمانہ تھا اور اس کے آخری برس رہے ہوں گے۔

جن لوگوں کو اعلیٰ ترین اقتدار حاصل تھا اور جو اپنے ملک کے بارے میں اپنی واقفیت کی وسعت کے باعث وزنی ہو گئے تھے اگر وہ اپنے اس اصول میں شرا بور رہبا ہوتے بلکہ اس سے خلوصِ قلب اور سچائی کے ساتھ عقیدت رکھتے تو یقیناً یہ برس ان کے لیے بڑی نفرت کے ساتھ پلٹ کر پیچھے دیکھنے اور بآوازِ بلند سسکنے کے دن تھے۔ وہ "اشتراکی حکومت" میں یہ خونی بوجھ پیٹھ پر لاد کر کیسے داخل ہو سکتے تھے؟ اس سے خون رِستا ہے، ان کی پشت پر ایک بڑا سا سرخ دھبہ ہے انھوں نے سیاسی قیدیوں کو چھوڑ دیا ہے۔ لیکن کس قدر یا حالات نے ان لاکھوں غیر سیاسی (اور غیر پیشہ ور) مجرمین پیدا کیے ہیں؟ ہمارے "پیداواری رابطوں" نے؟ معاشرتی حالات نے؟ خود ہم نے..... شاید آپ نے؟

انھیں اپنا خلائی پروگرام بھاڑ میں جھونکنا چاہیے تھا! ہوشیار ترقی کی بحری فوج اور کولے انکرومہ کی گارڈ رجمنٹیں اپنی فکر خود کر لیں گی! انھیں کم از کم سکون کے ساتھ بیٹھ کر غور کرنا چاہیے تھا: اب آگے ہم کدھر جائیں؟ ہمارے قوانین کو، جو دنیا بھر میں بہترین ہیں، ہمارے ہی لاکھوں شہری کیوں قبول نہیں کرتے؟ وہ کس وجہ سے اس قاتل جوئے کے نیچے اپنی گردن دینے کے لیے اس طرح آمادہ رہتے ہیں۔ اور یہ جتنا زیادہ ناقابلِ برداشت ہوتا جاتا ہے وہ اتنی ہی کثیر تعداد میں اسے اپنے شانے پر رکھنے کے لیے آ جاتے ہیں؟ ہمیں اس رویے کو روکنے کے لیے کیا اقدامات کرنے چاہییں؟ شاید ہمارے قوانین وہ نہیں ہیں جو انھیں ہونا چاہیے؟ اور اس مقام پر تھوڑا سا اسکولوں کی پریشانی، نظرانداز کردہ دیہاتوں اور ان سب چیزوں کے بارے میں غور کرنا بھی مناسب ہو گا جنھیں ہم صرف "بے انصافی" کہہ سکتے ہیں۔ جس پر کوئی طبقہ ایسے نہیں ہے۔ ہم پسماندوں کو کیسے نئی زندگی عطا کر سکتے؟ وہ در وہ مغلوب گلہائے معافی جیسی ستی اقدامات، نمائشوں سے نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک کو اس کے کیس اور اس کے

کردار کو سمجھنے کی ہمدردانہ کاوش کرسکے۔

ہمیں مجمع الجزائر کو ختم کردینا چاہیے یا نہیں! یا یہ ابدی ہے؟ چالیس برس تک یہ ہمارے جسم کا ناسور بنا رہا ہے' کیا یہ کافی نہیں ہے؟

ظاہر ہے کہ نہیں! یہ کافی نہیں ہے! کوئی بھی اپنے ذہن کے عضلات کو تھکانا نہیں چاہتا۔ ضمیر میں کوئی جواب دینے والی تمنّا نہیں ہے۔ مجمع الجزائر کو مزید پچاس سال تک برقرار رہنے دو جب کہ اس طرف ہم اسوان باندھ اور عربوں کو متحد کرنے میں منہمک رہیں گے۔

جو مورخین نکیتا خروشچیف کے دس سالہ عہدِ اقتدار کا جائزہ لیں گے۔ جب وہ مادّی اصول، جنکی ہمیں عادت پڑ چکی ہے، دفعتاً معطل ہوتے ہوئے نظر آتے تھے' جب چیزیں کراماتی انداز میں بڑتی۔ مقناطیسی حلقۂ اثر کی قوت کی مخالفت کرنے لگیں' ارضی قوتِ کشش کا مقابلہ کرنے لگیں ـــ وہ لازماً یہ دیکھ کر سکتے میں پڑ جائیں گے کہ ان ہاتھوں میں کتنے بہت سے مواقع کچھ عرصے کے لیے یکجا ہوگئے تھے اور انھیں حقارت کے ساتھ ایک طرف پھینک دینے سے قبل کتنے مضحکانہ اور ارزل طریقے سے استعمال کیا گیا۔ ہماری تاریخ میں اسٹالن کے بعد بقیہ تمام افراد سے زیادہ قوی یہ شخصیت' اپنی طاقت کم ہوجانے کے باوجود بے پناہ تھی، اس نے اس طاقت کا استعمال کرائیلوف کے میشکا کی مانند جنگل صاف کرنے میں' اپنا ہتھیار پہلے اس راہ پر اور پھر اس راہ پر لڑھکانے میں کیا۔ سب کچھ بے مقصد۔ اسے آزادی کے خطوط کھینچنے کا موقع تین مرتبہ ہاتھ آیا۔ زیادہ استقلال کے ساتھ حد کھینچنے کا موقع پانچ مرتبہ ملا لیکن وہ اپنے فرض کو سمجھنے میں ناکام رہا۔ اس نے اسے کوئی کھیل سمجھ کر ترک کردیا۔ خلا کے لیے۔ مکا کے لیے۔ کیوبا میں راکٹوں کے لیے۔ برلن الٹی میٹم کے لیے۔ چرچ کے انسداد کے لیے۔ صوبائی پارٹی کمیٹیوں میں انتشار پیدا کرنے کے لیے۔ تجریدی آرٹ سے نبرد آزما ہونے کے لیے!

اس نے کسی بھی چیز کو تکمیل تک نہیں پہنچایا۔ جنگ آزادی کو تو بالکل ہی نہیں! سب سے زیادہ آسان کام یہ تھا کہ اسے دانشور طبقے کے خلاف برہم کردیا جائے۔ اس کے ہاتھوں کا' جن ہاتھوں نے اسٹالن کے کیمپ توڑ ڈالے' انھیں اب کیمپوں کو مستحکم بنانے کے لیے استعمال کیا جائے؟ وہ آسانی سے کامیاب ہوگئے! اور ذرا غور کیجیے، کب!

۱۹۵۶ء میں' جس سال بیسویں کانگریس ہوئی' کیمپ کی تنظیم کی نرمی کو محدود کرنے کے لیے پہلے احکامات صادر کیے گئے تھے! ۱۹۵۸ء میں ان میں مزید اضافہ ہوا ـــ اسی سال خروشچیف نے غیر منقسم اقتدار حاصل کرلیا تھا۔

لیکن عملی کارندوں کی تسلی اب بھی نہیں ہوئی۔ فتح کی بو پا کر وہ تلے پر اتر آئے ہم اس طرح چلتے نہیں رہیں گے کیمپ نظام' سوویٹ حکومت کا بنیادی ستون ہے اور وہ گر رہا ہے۔

بیشتر یہ دباؤ ذہانت کے ساتھ ڈالا گیا۔ سرکاری دعوتوں میں' طیاروں کے سواری کیبن میں، ڈاچا (دیہی) کشتی پارٹیوں میں ـــ لیکن بعض اوقات ان کی سرگرمیاں منظرِ عام پر آگئیں۔ مثلاً سپریم سوویٹ کے ایک اجلاس میں پی۔ آئی۔ سیمسونوف کی تقریر میں (دسمبر ۱۹۵۸ء): اس نے کہا کہ قیدی ضرورت سے زیادہ آرام سے بسر کرتے ہیں۔ وہ اپنی خوراک سے مطمئن (!) ہیں (جبکہ انھیں مستقلاً غیر مطمئن رہنا چاہیے....) ان کے ساتھ مناسب سے زیادہ بہتر برتاؤ کیا جاتا ہے (ایک ایسے اجلاس میں جس نے کبھی اپنی گزشتہ غلطی کو تسلیم نہیں کیا تھا ظاہر ہے کسی نے سیمسونوف کو پھٹکارا نہیں) یا "اسیرانِ جیل" کے عنوان سے شائع ہونے والے (۱۹۶۰ء) مضمون میں۔

اس دباؤ کے سامنے جھک کر کسی بھی بات کو بغور تحقیق کیے بغیر اس نکتے پر توجہ دیے بغیر کہ گزشتہ پانچ برسوں میں جرائم

میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا دیا اگر ہوا تھا تو اس کے اسباب سیاسی طریق کار میں تلاش کرنے چاہییں) بغیر یہ سوچے ہوئے کہ یہ نئے اقدامات اشتراکیت کی کامیابی کی راہ میں اس کے عقائد سے کس طرح مطابقت رکھتے ہیں، یا معاملے پر گہرائی کے ساتھ غور کرنے کی کوشش کے بغیر یا اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سعی کے بغیر ہی اس ذات نے جس نے اپنی تمام زندگی سڑک پر بسر کی تھی" بغیر سنجیدہ فکر و تامل کے ان کتیوں کے آرڈر پر دستخط کر دیے جن سے پھانسی کی ٹکٹکی کو دوبارہ جلد از جلد ٹھونک کر تیار کیا جا سکے۔ اس کی پرانی شکل میں اور ہمیشہ کے لیے مضبوط حیثیت کے ساتھ۔

اور یہ سب ہوا کسی ـــ ۱۹۶۱ء کے دوران جب نکیتا نے آزادی کی کاڑی آسمان کی بلندی پر پہنچانے کی اپنی آخری جان توڑ کوشش کی۔ ۱۹۶۱ء، بیسویں کانگریس کے سال میں ہی اصلاح شدہ قیدیوں (بالفاظ دیگر مجرموں) اور نگران کارکنوں (ایسی چیز جو کبھی نہیں دیکھی گئی تھی) کے خلاف "دہشت پسندانہ عمل" کرنے پر کیمپوں میں سزائے موت دینے کا قانون پاس کیا گیا تھا اور سپریم سوویٹ کے پلینم نے (جون ۱۹۶۱ء میں) کیمپوں میں ـــ اب اسٹالن کے نہیں، خروشچیف کے کیمپوں میں ـــ چار انتظامی طبقات کے لیے ضابطوں کو منظوری دے دی۔

جب نکیتا، اسٹالن کے مظالم پر دوسری یلغار کرنے کے لیے کانگریس کے اسٹیج پر چڑھا تو تقریباً اسی وقت اس نے خود اپنے نظام کے پیچ میں بھی اسی سختی کے ساتھ کسنے کے احکامات صادر کر دیے تھے اور اسے واقعی یقین تھا کہ یہ سب باتیں ایک ساتھ چل سکتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہو سکتی ہے۔

آج کیمپ ویسے ہی ہیں جیسے بیسویں کانگریس میں پارٹی نے منظور کیے تھے۔ چھ برس کے بعد بھی وہ بالکل اسی طرح ہیں جیسے پہلے تھے۔

انتظامی طریق کار میں وہ اسٹالن کے کیمپوں سے مختلف نہیں ہیں بلکہ آبادی کی تنظیم میں مختلف ہیں، اب لاکھوں کروڑوں دفعہ دالے نہیں ہیں لیکن اب بھی لاکھوں قیدی ہیں اور عین پہلے کی مانند ان میں سے بہت سے انصاف کی بدنظمی کا شکار ہیں۔ صرف اس لیے مقید ہیں کہ نظام جاری رہے اور اس کی شکم پروری ہوتی رہے۔

حکمراں تبدیل ہو جاتے ہیں لیکن مجمع الجزائر برقرار رہتا ہے۔

یہ اس لیے برقرار رہتا ہے کیوں کہ وہ مخصوص سیاسی نظام اس کے عدم موجودگی میں زندہ نہیں رہ سکتا اگر وہ مجمع الجزائر کو ختم کر دے تو خود اس کا وجود ختم ہو جائے گا۔

ہر داستان کا ایک خاتمہ ہونا چاہیے۔ اسے کسی جگہ توڑنا چاہیے۔ اپنی محدود اور ناکافی صلاحیت کے مطابق ہم نے مجمع الجزائر کی تاریخ، اس کی ولادت کے وقت کی خوشگوار بوچھاروں سے لے کر جلا وطنی کے طلاطم خیز، گہرے تک اپنی استعداد کے موافق پیش کی ہے۔ نرمی کے زمانے میں اور کیمپوں کو دوبارہ سخت بنانے کے بیچ خروشچیف کی تدابیر سے عین قبل ایک نئی حرکت سے پیشتر ہمیں اپنی کہانی کو ختم سمجھنا چاہیے۔ دیگر مورخین آئیں گے۔ وہ مورخین خود مصیبتیں برداشت کر کے بہتر خروشچیف اور اس کے بعد کے ادوار کے کیمپوں کے احوال ہم سے بہتر بیان کر سکیں گے۔

سچ پوچھیے تو ایسے دو مورخین منظر عام پر آ بھی چکے ہیں۔ ایس۔ کرادا اسکی اور اناتولی مارچینکو۔ وہ اور بڑی تعداد میں سامنے آئیں گے کیونکہ جلد بہت جلد روس میں اشاعت کا دور آ جائے گا۔

مثال کے طور پر مارچینکو کی کتاب سماجی جیسے جیسے ایک تنہا کیمپ کے ہر شخص کے دل میں بھی نفرت اور لذت پیدا کرتی ہے۔

موجودہ جیل کے حالات کا بیان کرتے ہوئے ہمیں اس جیل سے بھی مختلف اور نئی جیل کے ڈھرے سے روشناس کراتی ہے، جس کے بارے میں میرے گواہ بولتے ہیں۔ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ بیٹنگ، قید کا دوسرا سینگ (دیکھیے حصہ اول، بارہواں باب) اور زیادہ اُبھر کر نکلا ہے، قیدی کی گردن میں پہلے سے زیادہ گہرا دھنس گیا ہے۔ ولاڈیمیر مرکزی زنداں کی عمارتوں، عہدِ زار اور سوویٹ دور کی عمارتوں کا موازنہ کرکے مارچینکو نے ٹھوس انداز میں ثابت کیا ہے کہ روس تاریخ کا عہدِ زار سے تقابل کہاں ختم ہو جاتا ہے۔ عہدِ زار کی عمارت خشک اور گرم ہے۔ سوویٹ عمارت گیلی اور سرد ہے (آپ کے کان قید کی کوٹھری میں پالے سے سُن ہو سکتے ہیں، پھر اُو جیکیٹیں کبھی بھی اتاری نہیں جا سکتیں) عہدِ زار کی کھڑکیاں سوویٹ اینٹوں کی چار تہوں سے بند ہیں اور مزلوں (بند ہونے والے دریچوں) کو فراموش نہ کیجیے۔

———— ❖ ————

این۔ کے۔ وی۔ ڈی کے افراد ملک کی ایک قوت ہیں۔ یہ محض عوامی نظم و نسق کی حفاظت کرنے والی وزارت کی بات نہیں ہے۔ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ اخبار اور سپریم سوویٹ کے اراکین کتنے اشتیاق کے ساتھ ان کی تائید کرتے ہیں۔

کیوں کہ وہ ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ اتنی بہت سی چیزوں کی ریڑھ کی ہڈی۔

ان میں قوت ہے لیکن وہی واحد شے نہیں ہے۔ ان کے پاس دلائل بھی ہیں۔ ان کے ساتھ بحث کرنا ہنسی کھیل نہیں۔ میں نے بحث کرکے دیکھی ہے۔

یہ بات نہیں کہ مجھے اس کا شوق تھا۔ لیکن ان خطوط نے مجھے اس کی ترغیب دی۔ آج کل کے غلاموں کے مراسلات، جن سے میں کلیتاً غرقِ حیرت ہو گیا۔ غلام لوگ مجھ سے توقع وابستہ کیے ہوئے تھے اور انھوں نے مجھ سے استدعا کی کہ میں ان کی کہانی بیان کروں، ان کی صفائی پیش کروں، انھیں انسانوں کی صف میں شامل کروں۔

لیکن کہانی کس سے بیان کروں؟ آپ سمجھتے ہیں کہ کوئی میری بات سنے گا؟..... اگر ہمارے اخبارات آزاد ہوتے تو میں یہ سب کچھ شائع کر دیتا: وہاں یہ سب کچھ کھلے میں ہے، آئیے اب ہم اس نکتے پر غور کر دیکھیں!

آج کل (جنوری ۱۹۶۳ء) جس قسم کے حالات ہیں ان میں ایک بزدل اور خفیہ آوارہ گرد کی طرح مختلف اداروں کے برآمدوں میں بھٹکتا پھرتا ہوں۔ اُن بیم و ادروازوں کے سامنے سر خم کرتا ہوں جن سے پروانے جاری کیے جاتے ہیں۔ ڈیوٹی پر متعین فوجیوں کی ناپسندیدگی اور مشتبہ نگاہیں اپنے جسم پر محسوس کرتا ہوں۔ لیکن مصنف یا عوامی مسائل کے مبصر کو کتنی محنت مشقت کے بعد مصروف سرکاری افسران مناسب عزت دیں گے اور از راہِ کرم نصف گھنٹہ اُس کی باتیں سننے کے لیے نکالیں گے۔

لیکن یہی سب سے بڑی دشواری نہیں ہے۔ میری سب سے بڑی دشواری وہی ہے جو لتنے عرصے پہلے ایکی ابسٹرز میں فورمینوں کی میٹنگ میں تھی: میں ان سے کس موضوع پر گفتگو کر سکتا ہوں؟ اور کس زبان میں؟

اپنے کسی حقیقی نظریے کے بارے میں جو اس تصنیف میں پیش کیے گئے ہیں، گفتگو کرنا خطرناک اور ہر طرح مایوس کن ہوگا۔ میں کسی اندرونی دفتر کی پُرسکوت تنہائی میں کیوں غصّے کا اظہار کروں، جہاں کی کوئی بات عوام تک نہیں پہنچے گی، ان لوگوں کو بھنک بھی نہیں پڑے گی جو اسے سننے کے مشتاق ہیں اور اس طرح میں اپنے مقصد کو ایک کلومیٹر آگے بھی نہیں بڑھا سکوں گا!

تو پھر میں کیسے گفتگو کروں؟ ان کی آئینے جیسی دہلیز پار کرتے ہوئے، نرم و دبیز قالینوں سے آراستہ زینے چڑھتے ہوئے مجھے اپنی مرضی سے اپنی زبان کو، اپنے کانوں کو، اپنی پلکوں میں پروئے ہوئے ریشمی دھاگوں سے باندھنا ہوگا جو پھر میرے شانوں پر میری پشت کی جلد پر اور میرے پیٹ پر سلے ہوئے ہیں۔ مجھے ابتدا میں ہی وہ باتیں بخوبی ذہن نشین کرنی چاہییں۔

۱۔ پارٹی عظیم ہے ہمارے حال، ماضی اور مستقبل سب کے لیے! (جس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری عمومی تعزیری پالیسی غلط نہیں ہو سکتی) میں اپنے اس خیال کا اظہار نہیں کر سکتا تھا کہ مجمع الجزائر کے وجود کی کبھی ضرورت نہیں تھی اور مجھے یہ اصرار نہیں کرنا چاہیے کہ اکثر لوگ کسی مناسب وجہ کے بغیر مقید ہیں۔

۲۔ جن اعلیٰ عہدیداروں سے میں گفت و شنید کروں گا وہ اپنے کام کے لیے وقف لوگ ہیں اور قیدیوں کے لیے متفکر ہیں۔ اُن پر غیر حقیقت پسندی، بیزاری یا لاعلمی کا الزام لگانا عبث ہو گا (اگر کوئی شخص تندہی سے اپنا کام کرتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کے بارے میں سب کچھ نہ جانتا ہو!)

میرے اس معاملے میں دخل اندازی کے لیے محرک جذبات کافی مشکوک ہیں۔ میں کیا کرنا چاہتا ہوں؟ میں کیوں ایسا کر رہا ہوں جبکہ مجھے کوئی سرکاری کام نہیں کرنا ہے؟ غالباً میرے اپنے کوئی گندے مفادات ہیں؟ میں کس لیے ٹانگ اڑاتا ہوں جبکہ پارٹی سب کچھ دیکھتی ہے اور میری مدد کے بغیر ہی سب کچھ ٹھیک کر دے گی؟

اپنی حیثیت قدرے مستحکم ظاہر کرنے کی غرض سے میں اس مہینے کا انتخاب کرتا ہوں جس میں لینن انعام* کے لیے میرا نام تجویز کیا جا رہا ہے اور میں کسی اہم پیادے (شطرنج کی بازی کا سب سے کم اہمیت والا مہرہ) کی مانند اپنے قدم اٹھاتا ہوں: وہ اب بھی دنیا میں بلندی پر جا سکتا ہے اور رخ (شطرنج کا مہرہ) بن سکتا ہے۔

سوویٹ یونین کی سپریم سوویٹ کی آئینی تجاویز کا کمیشن مجھے پتہ چلتا ہے کہ گزشتہ چند برسوں سے یہ ایک نئی اصلاحی مشقتی تعزیرات کا مسودہ تیار کرنے میں مصروف ہے — یہ تعزیرات مجمع الجزائر کے تمام مستقبل حیات پر حکمرانی کرے گی اور ۱۹۳۳ کی تعزیرات کا مقام لے گی جو کبھی بھی اور کہیں نہیں تھی، جو کبھی زیرِ تحریر نہیں لائی گئی اور اب انھوں نے مجھ سے ملنے کا بندوبست کیا ہے تاکہ میں، جو مجمع الجزائر کا اولڈ بوائے ہوں، ان کی دانشمندی سے آشنا ہو سکوں اور ان کے روبرو اپنے احمقانہ خیالات پیش کر سکوں۔

وہ آٹھ افراد ہیں۔ ان میں سے چار اتنے کم سن ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ بالکل لڑکے جنھیں ابھی بمشکل اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کرنے کی دعوت ہی ملا ہے۔ وہ کس تیزی کے ساتھ اقتدار کے منصبوں پر پہنچ رہے ہیں۔ اس تنگ پر کے فرش والے سل میں جس میں مجھے بڑی احتیاط برتتے ہوئے داخل ہونے کی اجازت دی گئی ہے وہ اتنے مانوس نظر آ رہے ہیں۔ کمیشن کا صدر آئیوان آندریئیوچ بائدوخن ہے۔ وہ اس میں بیہودہ شخص ہے اور بڑی ہی اچھی طبیعت کا معلوم ہوتا ہے اتنا کہ اگر اس کے بس میں ہو تو کل مجمع الجزائر کو ختم کر دے لیکن اس کا کردار یہ ہے کہ پچھلی نشست پر بیٹھے رہنا اور ہماری گفتگو کے دوران کچھ نہ کہنا۔ اصل صیاد تو دو پستہ قامت بوڑھے ہیں۔ گریبیوڈوف میں مذکور ان بزرگوں کی طرح جنھیں اوچاکوف پکڑا گیا اور تاتاری دب گیا* یاد تھا۔ وہ ایسے انداز میں جم کر بیٹھے ہیں جو انھوں نے بہت عرصہ تک اختیار کیا تھا۔ میں قسمیہ کہنے کو تیار ہوں کہ انھوں نے ۵ مارچ ۱۹۵۳ء کے بعد سے کوئی اخبار کھول کر نہیں دیکھا۔ اس لیے یہ بات پکی ہے کہ ان کے خیالات کو تبدیل کرنے والی کوئی بات کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ ان میں سے ایک نیلے کوٹ میں ملبوس ہے اور میرا قیاس ہے کہ وہ کیتھرین کے دربار میں پہنچ جانے والی کسی وردی کا حصہ ہے۔ میں وہ بٹن بھی شناخت کر رہا ہوں جو کیتھرین کا فرغل تنگ ٹانکنے کے لیے بٹن کھونٹے بن گیا ہے جس سے اس کا سینہ ڈھکا رہتا ہو گا۔ جب وقت پر دہلیز پار کرتا ہوں اس لمحے سے دونوں بوڑھے مجھے اور میری آمد کو ناپسند کر رہے ہیں لیکن انھوں نے قوتِ برداشت کی نمائش کا تہیہ کر رکھا ہے۔

اس وقت بات کرنے میں سخت دشواری ہوتی ہے۔ جب آپ کے پاس کہنے کے لیے بہت زیادہ ہو علاوہ ازیں میں نے سارے دھاگے اپنے اوپر ہی رکھے ہیں اور میں ہر حرکت پر انھیں محسوس کرتا ہوں۔

پھر بھی میرے پاس اپنا طویل لکچر تیار ہے اور میں ان دھاگوں پر کسی تکلیف دہ بوجھ کا امکان نہیں محسوس کر رہا ہوں میں اس طرح گویا ہوتا ہوں:

یہ خیال کہاں سے آیا ہے (میں یہ تسلیم کرنے کی نمائش کرتا ہوں کہ یہ ان کا نہیں ہے) کہ جیل کیمپوں کے صحت افزا آرام گاہوں میں منتقل ہو جانے کا اندیشہ ہے اور اگر کسی کیمپ میں سردی اور بھوک کا پہرہ نہیں رہے گا تو وہاں فردوسی آسائش کا دور دورہ ہو جائے گا' ان کے خام ذاتی تجربات کے باوجود میں کہتا ہوں کہ وہ مصائب اور سزاؤں کے دبیز محاصرے میں پھنسے ہوئے اس ڈھیر کا' جو قید کی حقیقت ہے' تصور کرنے کی کوشش کریں: انسان اپنے اصل مقام سے محروم ہے؛ وہ ان لوگوں کے ساتھ رہتا ہے جنکے ساتھ رہنے کی اسے قطعی خواہش نہیں ہے' وہ اپنے اعزا و اقربا کے ساتھ رہنا چاہتا ہے' لیکن نہیں رہ سکتا' وہ اپنے بچوں کی افزائش نہیں دیکھ سکتا اسے اس کے عام ماحول سے' اس کے گھر سے' اس کے سامان سے' اس کی رسٹ واچ تک سے محروم کر دیا جاتا ہے' عام طور پر اس کے لیے اپنا پیشہ اختیار کرنے کے امکان ختم کر دیے جاتے ہیں وہ اجنبیوں کا دباؤ محسوس کرتا ہے جن میں کچھ اس کے مخالف ہوتے ہیں۔ دیگر قیدیوں کا دباؤ' جن کے پس منظر' نظریات اور عادات اس سے مختلف ہوتی ہیں۔ جنس لطیف کی نازک حسیات کے اثر سے اسے محروم کر دیا جاتا ہے (جسمانی صعوبتیں تو ہوتی ہی ہیں) اور اس کے علاج کا بندوبست بھی بے حد ناقص ہوتا ہے، یہ تمام باتیں کس اعتبار سے بحر اسود کے کسی صحت افزا مقام سے مماثلت رکھتی ہیں؟ وہ "صحت بخش آرام گھر" کے طعنے سے اتنا خوف کیوں کھاتے ہیں؟

نہیں۔ یہ خیال انھیں ذرہ بھی بوس نہیں کرتا۔ وہ اپنی کرسیوں پر جنبش تک نہیں کرتے۔

چنانچہ میں اپنے موضوع کو وسعت دیتا ہوں: ہم ان لوگوں کو دوبارہ سماج میں بسانا چاہتے ہیں یا نہیں چاہتے؟ اگر چاہتے ہیں تو پھر ہم انھیں عاق کردہ لوگوں کی طرح زندگی بسر کرنے کے لیے کیوں مجبور کرتے ہیں؟ ہمارے تمام نظم و نسق کا مرکزی نقطہ قیدیوں کی باقاعدہ توہین کرنا اور انھیں جسمانی اعتبار سے بالکل لاغر کر دینا کیوں ہے؟ انھیں اپاہج بنا دینے سے حکومت کو کیا فائدہ ہوگا؟

تو میں نے اپنی بھڑاس نکال لی ہے اور وہ مجھے مطلع کرتے ہیں کہ میری بات میں خامی کہاں ہیں۔ مجھے کوئی حقیقی علم نہیں ہے کہ موجودہ "جماعت" کیسی ہے' میں پرانے تجربات کی بنا پر فیصلہ کر رہا ہوں اور وقت سے پیچھے رہ گیا ہوں (ہاں یہ میری دکھتی ہوئی رگ ہے: میں واقعی یہ نہیں دیکھ سکتا کہ آج کے قیدی کون ہیں) عادی مجرموں کے لیے' جنھیں قید سخت کی سزا دی گئی ہو' میری بیان کردہ فہرست میں کوئی بھی بات تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ موجودہ نظم و نسق کی ذمہ دار حکومت ہی انھیں راہ راست پر لا سکتی ہے (میرے دھاگوں پر دو تکلیف دہ جھٹکے۔ یہاں وہ ماہرین کی حیثیت رکھتے ہیں انھیں تجربی علم ہے کہ اندر کون قید ہے) انھیں معاشرے میں دوبارہ لانا؟..... ہاں بے شک' بے شک۔ بوڑھے مشینی آواز میں کہتے ہیں اور میں سنتا ہوں تے نہیں۔ انھیں بے تکلف مر جانے دو۔ اس طرح ہماری زندگی زیادہ آرام دہ ہو جائے گی اور آپ کی بھی...."

نظم و نسق کی ذمہ دار حکومت؛ اور ہاکرف کا ایک پنشن یافتہ آدمی' ایک سرکاری وکیل' نیلے کوٹ والا' جسکے سینے پر ستارہ ہے' اور سفید بالوں کے ہلکے گچھے ہیں۔ جو قد سے سیاروف سے بھی مماثلت رکھتا ہے۔

٭ سخت ڈسپلن کی ابتدا سے ہمیں نتائج بھی دکھائی دینے لگے ہیں۔ سال میں دو ہزار قتلوں کی جگہ — یہاں کہا جا سکتا ہے

صرف کچھ درجن قتل کے واقعات ہوتے ہیں۔

ایک اہم تعداد! میں اسے باحتیاط نوٹ کر لیتا ہوں۔ میری آمد کا یہ سب سے کارآمد نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔
اندر ہے کون؟ ظاہر ہے کہ جیل کی تنظیم پر غور کرنے کے لیے آپ کو اس کا علم ہونا ہی چاہیے کہ اندر کون ہے۔
درجنوں ماہرینِ نفسیات اور وکیلوں کو اندر جانا ہوگا اور بغیر دخل اندازی کے قیدیوں سے گفتگو کرنی ہوگی تبھی ہم اس موضوع پر بحث کرنے کے قابل ہوں گے۔ صرف یہ امر ایک ایسا ہے جو مجھے کیمپوں سے خط لکھنے والے اپنے مراسلات میں کبھی نہیں لکھتے۔ وہ اور ان کے ساتھی قید میں کیوں ہیں؟

ہماری گفتگو کا عام جزو ختم ہو گیا اور اب مخصوص حصے کی طرف مڑتے ہیں۔ یقیناً کمیشن کو کسی قسم کے تذبذب نہیں ہیں اور وہ ہر بات کے متعلق پہلے ہی اپنی رائے قائم کر چکا ہے۔ میں ان کے لیے کسی مصرف کا نہیں ہوں، وہ محض یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ میرا رویّہ کیسا ہے؟

پارسل؟ ایک بار میں صرف پانچ کلوگرام اور اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی مقدار وہی۔ میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ کم از کم پارسل کی مقدار دوگنی کرنے کا قانون بنا دیں اور پارسل دوبارہ منگانے کا اختیار دیا جائے۔ وہ وہاں بھوکوں مرتے ہیں! فاقہ کرانا قیدیوں کی اصلاح کا کوئی طریقہ نہیں ہے!

"کیا کہا۔ بھوکے؟" کمیشن کا غصہ ہمہ گیر ہے۔ "ہم خود وہاں معائنہ کر کے آئے ہیں اور ہم نے ایک کیمپ کا چھوٹا کھانا ٹرکوں میں بار کیے جاتا دیکھا ہے!" (وارڈروں کے سؤروں کے لیے! تمہارا مطلب ہے!)

میں کیا کر سکتا ہوں؟ چیخنے لگوں: "تم بکواس کرتے ہو! یہ بات کبھی سچ نہیں ہو سکتی" لیکن میں اپنی زبان پر ایک تکلیف دہ کشیدگی محسوس کرتا ہوں جو ایک دھاگے سے بندھی ہے اور یہ دھاگا میرے شانوں کے اوپر سے ہو کر میری پشت کے پیچھے ایک مقام تک پہنچ رہا ہے۔ مجھے اپنے کام کرنے کے مستحکم تصورات کو ضرب نہیں لگانی چاہیے: انھیں بخوبی علم ہے، وہ خلوصِ قلب کے ساتھ کام کرتے ہیں اور فکرمند ہیں۔ کیا میں انھیں زکو ایک دو مراسلے دکھاؤں جو مجھے لکھے گئے ہیں؟ یہ ان کی سمجھ میں بالکل نہ آئیں گے اور پر سرخ مخملیں میز پوش پر ہاتھوں کے نشانات سے میلے شکن آلود کاغذ کے ٹکڑے بھونڈے اور ناقابلِ توجہ نظر آئیں گے۔

"لیکن زیادہ پارسل منگانے کی سہولت دی گئی تو حکومت پر کوئی بوجھ نہیں پڑے گا!"

"آہ..... لیکن زیادہ سے فائدہ کیسے ہوگا؟" وہ جواب پھینکتے ہیں "خاص طور پر متمول خاندانوں کو" (وہ لفظ "متمول" استعمال کرتے ہیں۔ نظریات سے متعلق حقیقت پسندانہ گفتگو اس کے بغیر نہیں کی جا سکتی) "جن کے پاس بہت سا مسروقہ مال چھپا ہوا ہے۔ اس طرح پارسلوں کی تعداد بڑھا کر ہم کام کرنے والے خاندانوں کو نقصان پہنچائیں گے!"

اب دھاگے کھینچنے لگے ہیں اور کاٹ رہے ہیں! اس نظریے کو جھٹلایا نہیں جا سکتا: محنت کش طبقات کا مفاد سب سے بلند ہے۔ یقیناً وہ محنت کشوں کے مفادات کی خاطر ہی وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔

مجھے کوئی جواب نہیں سوجھتا۔ میں نہیں جانتا کہ کس جواب سے اپنی مدافعت کی جائے۔ میں کہہ سکتا تھا: "میں قائل نہیں ہوا۔۔۔ تو ان کی بلا سے۔ میں اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہوں؟ ان کا باس یا کچھ اور؟

میں بات کو دھکیلتا رہتا ہوں۔ "دکانوں کی کیا صورتحال ہے؟ اُجرت کا شتراکی اصول کہاں آڑے آتا ہے؟ اگر کسی نے کچھ کمایا ہے تو کمائی اس کے سپرد کر دو!"

وہ جوابی وار کرتے ہیں "اسے جمع رکھا جائیگا اور رہائی کے وقت دیدیا جائیگا ورنہ جب وہ باہر آئیگا تو حکومت پر بوجھ بن جائیگا۔"

حکومت کے مفادات کو اولیت حاصل ہے وہ میری پیٹھ پر ٹنگا ہوا ہے میں اسے کھینچنے کی جرأت نہیں کر سکتا نہ میں یہ تجویز پیش کر سکتا ہوں کہ قیدیوں کی اُجرت میں اضافہ کرکے حکومت کا خرچ بڑھا دیا جائے۔

"کم از کم اتوار کو تو ان کی تعطیل ہو؟"

"یہ تو قوانین میں درج ہے۔ اتوار کو تو تعطیل ہوتی ہے۔"

"لیکن کیمپ میں اتوار کو ضائع کرنے کے سینکڑوں طریقے ہیں۔ صاف صاف لکھ دیجیے کہ ایسا کوئی نہ کرے۔"

"ہم اتنی چھوٹی چھوٹی وضاحتیں قوانین میں شامل نہیں کر سکتے۔"

کیمپوں میں دن میں آٹھ گھنٹے کام ہوتا ہے میں بیدلی کے ساتھ ان کے سامنے خیال پیش کرتا ہوں کہ سات گھنٹے کافی ہیں لیکن اپنے دل میں مجھے خود معلوم ہے کہ یہ گستاخی ہے: یہ بارہ گھنٹے یا دس گھنٹے نہیں ہیں کیا تم کبھی قناعت کروگے!

"خط و کتابت سے قیدی محسوس کرتا ہے کہ وہ ہمارے اشتراکی نظام کی زندگی میں شامل ہے (میں نے اس قسم کی دلیلیں سیکھ لی تھیں) اس پر پابندی کیوں عائد کی جائے؟"

لیکن وہ نظرثانی نہیں کر سکتے۔ کوٹہ متعین ہو چکا ہے اور اتنی سختی کے ساتھ نہیں جتنا کہ ہمارے زمانے میں تھا....

وہ مجھے ملاقاتوں کی فہرست بھی دکھلاتے ہیں جن میں تین دن کی "پرائیویٹ" وزٹ بھی ہے۔ اور ہمیں برسوں تک کوئی بھی موقع نہیں دیا گیا تھا اس لیے یہ کچھ مناسب سا نظر آتا ہے۔ سچ پوچھیے تو ملاقاتوں سے متعلق بندوبست مجھے خاصا زم معلوم ہوتا ہے اور میں ان کی تعریف کرنے سے اپنے آپ کو بمشکل روکتا ہوں۔

میں مضمحل ہو چکا ہوں۔ میں ہر طرح سے ہلا ہوا ہوں۔ میں ایک مخفلہ بھی نہیں ہو سکتا۔ میں یہاں کوئی بھی کارآمد کام نہیں کر رہا ہوں۔ اب جانے کا وقت ہو گیا ہے۔

اور واقعی اس چمکیلے خوشنما کمرے میں ان آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ کر ان کی فراٹے کے ساتھ جاری خوش گفتاری کے توسط سے دیکھا جائے تو کیمپ ہولناک نہیں بالکل منصفانہ چیز نظر آتے ہیں۔ آپ کو نظر آتے ہیں رجھوٹے کھانے سے لدے ہوئے ٹرک۔ اچھا، کیا تم ان بھیانک لوگوں کو معاشرے میں کھلا چھوڑ دینا چاہتے ہو؟ مجھے استاد چوروں اور ان کے بھتے کٹوروں کی یاد آتی ہے۔ دس سال پیشتر میں خود اندر تھا، یہ اندازہ لگانا میرے بس کے باہر ہے کہ اب وہاں کون ہے! کہا جاتا ہے کہ مجھ جیسے سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا ہے.... 'نسلی جماعتیں آزاد کر دی گئی ہیں.....

دوسرا غیر دلچسپ آدمی بھوک ہڑتالوں کے بارے میں میرے خیالات جاننا چاہتا ہے: ظاہر ہے کہ میں جبراً کھلانے کی مذمت نہیں کر سکتا اگر فراہم کردہ خوراک دلیے سے زیادہ قوت بخش ہو جائے۔

میں اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر ان پر دہاڑتا ہوں کہ زیک کو نہ صرف بھوک ہڑتال کرنے کا حق ہے کہ اپنی حفاظت کے لیے اس کے پاس یہ واحد حربہ ہے، بلکہ اسے بھوکے رہ کر مر جانے کا حق بھی حاصل ہے!

میری دلیلیں انھیں بے سروپا نظر آتی ہیں لیکن میں ہر طرح سے جکڑا ہوا ہوں۔ میں بھوک ہڑتالوں اور ملک میں رائے عامہ کے باہمی تعلق پر گفتگو نہیں کر سکتا۔

میں اضمحلال اور ندامت کے احساس کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں۔ مجھے اپنی خود اعتمادی میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے جبکہ وہ ذرہ برابر متاثر نہیں ہوئے ہیں۔ وہ من مانی کریں گے اور سپریم سوویٹ اتفاق رائے کے ساتھ ان کی توثیق کر دے گی۔

———•———

داؤس اسٹیپا نووچ تکونوف تحفظ امن عامہ کا وزیر۔ کیسی بے سروپا تخیل کی اڑان ہے یہ؟ کہ میں بے نام و نشان سزا یافتہ شخص ش ح ۲۳۲ وزارت داخلہ کے وزیر کو یہ سکھانے کے لیے جانے پر تیار ہو جاؤں کہ وہ مجمع الجزائر میں کیا نظام رائج کرے!.....

وزیر تک پہنچنے کے راستوں پر محض کرنل ہیں، فولادی خود زیب سر کیے۔ استخوانی زرد چہرے لیکن بےحد چاق و چوبند۔ کوئی بھی دروازہ چیف سکریٹری کے کمرے کے پار نہیں لے جاتا۔ جہاں اسے ہونا چاہیے وہاں ایک بہت بڑی آئینے کی جڑاؤ پلّوں والی الماری ہے جس کے کانچ کے پیچھے ریشم کے لپٹے ہوئے پردے آویزاں ہیں۔ یہ الماری اتنی بڑی ہے کہ گھوڑوں کی پشت پر سوار دو آدمی اس میں سے گزر جائیں۔ یہ وزیر کے ذاتی کمرے میں داخل ہونے کا دروازہ ثابت ہوتی ہے اس کے دفتر میں دو سو افراد آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔

وزیر بیماری کی حد تک فربہ نکلتا ہے اور اس کا جبڑا بھاری ہے اس کا چہرہ صراحی نما ہے جو ٹھوڑی کی جانب چوڑا ہوتا جاتا ہے۔ تمام گفتگو کے دوران اس کا انداز بالکل سرکاری ہے وہ میری بات فرض کے طور پر سن رہا ہے لیکن اس کے انداز میں دلچسپی کے کوئی آثار نہیں ہیں۔

میں اس پر بھی صحت گاہ کے بارے میں وہی حملہ کر دیتا ہوں۔ اور ایک بار وہی پرانے سوالات: کیا ہمارے مشترکہ مقاصد (اس کے اور میرے) یہ ہیں کہ زکیوں کی اصلاح ہو؟ اصلاح کے بارے میں میرے نظریات حصہ چہارم میں بیان ہو چکے ہیں) ۱۹۶۱ء میں راستے میں دفعتاً تبدیلی کس لیے؟ وہ چار طریقہ ہائے بند و بست کیوں؟ میں اس کے سامنے الجھن پیدا کرنے والی چیز کا ذکر کرتا ہوں۔ وہ تمام باتیں جو میں نے اس باب میں قلمبند کی ہیں۔ خوراک، کیمپ کی دکانوں، پارسلوں، کپڑے، کام، دھمکانے والے وارڈروں، عملی کارندوں کی نفسیات کے بارے میں۔ (میں نے خط و کتابت کا تذکرہ نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اس خوف سے کہ یہاں کوئی شخص خطوط ضبط نہ کر لے۔ میں صرف ان میں سے اقتباسات درج کر کے لایا ہوں جن پر راقم کے نام نہیں لکھے گئے۔) میں اس کے سامنے چالیس منٹ تک بولتا رہتا ہوں۔ بہرصورت یہ خاصا طویل وقفہ معلوم ہوتا ہے اور مجھے خود حیرت ہے کہ وہ میری بات پر کان لگائے ہوئے ہیں۔

وہ بیچ بیچ میں لقمہ دیتا ہے لیکن صرف کسی بیان کو براہِ راست تسلیم کرنے یا رد کر دینے کی غرض سے میں تردید کی پرزور کوشش نہیں کرتا۔ میں کورینی کی سیاہ دیوار کی توقع رکھتا تھا لیکن وہ نسبتاً بہت نرم ہے جو کچھ میں کہتا ہوں اس کے بیشتر اجزا سے اسے اتفاق ہے! وہ تسلیم کرتا ہے کہ دکان پر خرچ کیے جانے کے لائق رقم کی حد بڑھا دینی چاہیے اور پارسل زیادہ ہونے چاہییں اور ہر پارسل کے اندر سامان کی اتنی باریکی سے چیکنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے جتنا کہ آئینی تجاویز کا کمیشن سفارش کر رہا ہے (لیکن اس پر اس کا قابو نہیں ہے۔ نہیں اصلاحی مشقتی تعزیرات یہ تمام باتیں طے کرے گی۔ وزیر نہیں) وہ اس نکتے پر متفق ہے کہ جو اشیائے خوردنی قیدیوں نے خود خریدی ہوں انھیں ابالنے اور سینکنے کی انھیں اجازت ملنی چاہیے (لیکن انھیں ایسی کوئی سہولت نہیں دی جاتی) اور ڈاک سے ارسال کردہ خطوط اور مطبوعہ مواد کی تعداد پر کوئی حد بندی نہیں ہونی چاہیے (ہرچند کہ اس سے کیمپ کے سنسر ڈپارٹمنٹ پر بہت بوجھ پڑے گا) وہ ہمیشہ ایسے سخت گیر ڈسپلن افسران کے خلاف ہے جو قواعد اور قطار بندی کے سلسلے میں انتہا پسند ہیں۔ (لیکن درمیان میں مداخلت کرنا خلافِ مصلحت ہے، ڈسپلن کو تباہ کر دینا آسان ہے اور اسے دوبارہ قائم کرنا دشوار ہوتا ہے) وہ اتفاق کرتا ہے کہ کیمپ کے علاقے سے گھاس نہ ہٹائی جائے (ڈابرو فلاگ میں انجینئرنگ ورکشاپوں کے آس پاس جو کچھ ہوا تھا وہ قطعی دوسرا معاملہ تھا انھوں نے چھوٹے

باورچیخانے کے باغیچے لگا لیے تھے۔ مشین آپریٹر اپنی نصف تعطیل کے دوران وہاں مصروف رہتے تھے اور ہر شخص نے دو یا تین میٹر میں ٹماٹر یا کھیرے بو دیے تھے لیکن وزیر نے انھیں کھود کر برابر کر دینے اور اس روش کو روک دینے کے احکامات صادر کر دیے اور اسے اس پر فخر ہے۔ میں اسے بتاتا ہوں کہ "زمین کے ساتھ انسان کے روابط کا ایک اخلاقی پہلو ہے" اور وہ مجھے مطلع کرتا ہے کہ افراد کے اپنے باغیچوں کے پلاٹ سے ملکیت کے جذبے کی تصدیق ہوتی ہے) وزیر اس خیال سے کانپ اٹھتا ہے کہ لوگوں کو باہر رہنے کے بعد دوبارہ تاروں کے پیچھے بھیج دیا گیا (میں اس سے یہ نہیں دریافت کرنا چاہتا کہ اس وقت اس کی کیا حیثیت تھی اور اس نے اسے روکنے کے لیے کیا اقدامات کیے) اس سے بڑی بات یہ کہ وزیر یہ تسلیم کرتا ہے کہ زکیوں کو آئیوان ڈینی سووچ کے زمانے سے زیادہ سخت حالات میں رکھا جاتا ہے۔

ایسی صورت میں مجھے اسے سمجھانے کے لیے اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہیے! ہمارے پاس غور و خوض کے لیے کوئی موضوع نہیں ہے (اور جس شخص کی کوئی سرکاری حیثیت نہیں ہے اس کی تجاویز پر توجہ دینا اس کے لیے بے معنی ہے)

میں کیا تجویز پیش کر سکتا ہوں! تمام مجمع الجزائر کو توڑ دو اور قیدیوں کو پہریداروں کے بغیر رہنے دو! میرے منہ سے الفاظ نہیں نکلتے۔ یہ خیالی اڑان ہوگی اور بہر صورت کسی بڑے مسئلے کا حل کبھی بھی کسی فرد واحد پر منحصر نہیں ہوتا۔ یہ ٹیڑھا میڑھا چلتا ہوا متعدد شعبوں سے گزرتا ہے اور ذاتی کسی کا نہیں ہوتا۔

دوسری جانب وزیر کا یہ یقین واثق ہے کہ دھاری دار وردی عادی مجرمین کے لیے لازمی ہے ("اگر آپ کو معلوم ہوتا کہ وہ کس قسم کے آدمی ہیں") وارڈروں اور کانوائے فوجیوں کے بارے میں تنقیدی بیانات اسے محض کبیدہ خاطر کرتے ہیں "آپ کو بدگمانی ہے یا پھر آپ کے ذاتی تجربات نے آپکے زاویۂ نگاہ میں انوکھا پن پیدا کر دیا ہے۔" وہ مجھے یقین دلاتا ہے کہ اب جیل کے کام کے لیے رنگروٹ بھرتی کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ سابقہ اختیارات سلب کر لیے گئے ہیں (اس سے عام لوگوں کے صحت مند زاویۂ نظر کا علم ہوتا ہے کہ وہ بھرتی نہیں ہوتے" میرے منہ سے نکلنا چاہتا ہے لیکن میں اپنے کانوں، اپنی پلکوں، اپنی زبان پر تنقید کرنے والا کمپنیوں سو ان سوس کرتا ہوں پھر بھی میں کسی بات کو نظر انداز کر رہا ہوں، صرف سارجنٹ اور کارپورل ہی تو نہیں بھرتی ہونگے آپ افسروں کو باہر نہیں کر سکتے! انھیں جبری بھرتی کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ پھر میری بات کی تردید کرتے ہوئے وہ بتاتا ہے کہ صرف قیدی گندی زبان استعمال کرتے ہیں جبکہ وارڈر ہمیشہ قیدیوں کے ساتھ مناسب انداز میں پیش آتے ہیں۔

جب "تغیر زکیوں کے مراسلات اور ایک وزیر کی گفتگو کے مابین زیادہ تفاوت ہو تو ہم کس پر اعتماد کریں؟ ظاہر ہے کہ قیدی کذب گوئی سے کام لے رہے ہیں۔

وہ خود اپنی مشاہدہ کی ہوئی باتوں کا ذکر بھی کرتا ہے کیونکہ وہ ظاہر ہے کیمپوں کے کچھ حصوں کا خود مشاہدہ کرتا ہے اور میں نہیں دیکھتا۔ شاید میں کسی کیمپ کا جائزہ کرنا پسند کروں؟ کرد کو تو یا ڈبروفلاگ؟ (یہ دو نام اسکے ہونٹوں پر اتنی آسانی سے آتے ہیں کیوں کہ وہ واضح طور پر توقف طرز پر ہیں۔ علاوہ ازیں میں کس حیثیت سے جاؤں گا وزارت کے مبصر کی حیثیت سے! اگر میں اس طرح گیا تو میں زکیوں سے آنکھیں ملا کر بات نہیں کر سکوں گا،

میں انکار کر دیتا ہوں۔

وزیر مجھ سے غیر متفق ہوتے ہوئے یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ زکیوں میں جوش کی کمی ہے اور وہ اپنے پیشے کی جانب والی کوششوں کا رد عمل نہیں قبول کرتے۔ "آپ یہاں سے گزرو گو رنکسا کا دفتر جا کر دریافت کریں۔" آپ کو اپنے ساتھ ہونے والے سلوک کے بارے میں کوئی شکایت ہے؟" اور کیمپ ڈویژن کا مصر آ رہا ہوتا ہے۔ کیا آپ یقین کرینگے کہ وہ یک زبان کہتے ہیں "بالکل نہیں!"

اب ان باتوں کو لیجیے جنھیں وزیر کیمپوں کی تربیت نو کے پروگرام کا شاندار نتیجہ قرار دیتا ہے :
جب ایک مشین آپریٹر کے کیمپ ڈویژن کے صدر نے اس کی تعریف کی تو اسے کتنا فخر کا احساس ہوا۔
ان قیدیوں کا جذبۂ تفاخر جن کا کام (وہ کتیلیان بناتے تھے) بیادر کیوبا کو بھی بھیجا جائے گا۔
اندرونی بندوبست کے شعبوں کی رپورٹیں اور انتخابات (یعنی کتیا میں منڈ گشتی گو) *
ڈیرو فلاگ میں (حکومت کے فراہم کردہ) پھولوں کی افراط
اس کی بنیادی تشویش یہ ہے کہ ہر کیمپ میں ایک آزاد صنعتی اساس تیار کر دی جائے۔ وزیر حساب لگاتا ہے کہ دلچسپ کاموں کی تعداد بڑھا کر فرار کی کوششوں میں کمی لائی جا سکتی ہے۔ (جب میں معترض ہوتا ہوں کہ سب انسان آزادی کے خواہشمند ہوتے ہیں تو بس یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی)
میں اس مضحکہ خیز احساس سے دوچار ہوا کہ اس کا کوئی اختتام نہیں ہو سکتا۔ کہ میں اپنا مقصد ذرہ برابر بھی آگے نہیں بڑھا سکا اور وہ ہمیشہ ایک آخری حربہ توڑنے کے لیے گرز استعمال کریں گے۔ میں یہ محسوس کر کے متاسف ہوا کہ دو انسان اتنے مختلف طریقوں سے سوچ سکتے ہیں۔ زنیک وزیر کی بات اس وقت سمجھے گا جب وہ مسند صدارت پر متمکن ہو گا اور وزیر بھی زنیک کی بات تبھی سمجھ سکتا ہے جب وہ تاریک پیچھے جائے گا اس کی اپنی پھلواری کچل کر مسمار کر دی جائے گی اور اس کی آزادی کے بدلے میں اسے کسی مشین پر کام کرنا پڑے گا۔
جرائم کے سرچشموں کے مطالعات کا ادارہ۔ یہ دو مہذب ڈپٹی ڈائرکٹروں اور تحقیقاتی اسٹاف کے درمیان ہونے والی ایک دلچسپ گفتگو تھی۔ زندہ دل لوگ، ہر ایک کی اپنی اپنی رائے۔ آپس میں بحث کرنے کے عادی۔ بعد ازاں ایک ڈپٹی ڈائرکٹر کوڈریا وشیف نے کوریڈور میں میرے ساتھ چلتے ہوئے مجھے پھٹکارا: "یہ سب بہت اچھا ہے لیکن آپ تمام زاویوں پر غور نہیں کرتے ہیں۔ ہمارا لسانی بھی ایسا ہی کرتا ...." اور اچانک میں نے دیکھا کہ اس نے چالاکی سے مجھے ایک موڑ پر لا کھڑا کیا ہے: "ذرا اندر جھانک لیں اور ڈائرکٹر آئیگر آئیو الدوچ کارپشیں سے ملتے چلیں۔"
یہ ملاقات پروگرام کا حصہ نہیں تھی۔ ہم اپنی بات چیت ختم کر چکے تھے اس میں کیا تک تھی؟ لیکن خیر تہذیب ہے میں مصافحہ کرنے کے لیے چلا جاؤں گا۔ یہاں مجھے منکسرانہ دعا سلام کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ یقین کرنا دشوار تھا کہ جن ڈپٹی ڈائرکٹروں اور صدور شعبہ سے میں مل چکا ہوں وہ اس قسم کے باس کے لیے ہر کام کرتے ہیں اور وہی اس ساری تحقیقاتی اسکیم کا افسر اعلیٰ ہے (اس کے متعلق اس اہم بات کا علم مجھے سب سے آخر میں ہوا کہ کارپشیں جمہوریت پسند کیسوں کا عالمی تنظیم کا نائب صدر تھا!)
جو شخص مجھ سے ملاقات کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوا وہ فاتحانہ جذبہ رکھتا تھا اور مغرور تھا ایسا کہ مجھے یاد ہے اپنی پانچ منٹ کی گفتگو میں ہم تمام وقت کھڑے رہے) جیسے کہ میں نے اس سے ملاقات کرنے کے لیے درخواست اور اصرار کیا ہو اور وہ خلاف منشا مجھے ملنے کے لیے وقت دے رہا ہو۔ اس کے چہرے پر میں نے کھلے پیے آدمی کا اطمینان" استقلال اور (اپنے لیے) عدم دلچسپی کا جذبہ دیکھا۔ اپنے نفیس سوٹ کی پرواہ کرتے ہوئے اس نے سینے پر ایک بڑا بیج جس سے ٹانک رکھا تھا جیسے وہ کوئی تمغہ ہو" ایم۔ وی ڈی۔ حروف کے اوپر ایک معلق تلوار پر کسی چیز کو تراش رہی تھی۔ (معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی بہت اہم بیج تھا۔ یہ ظاہر کرتا تھا کہ اسے اپنے سینے پر سجانے والا شخص دوسرے بیشتر لوگوں کے مقابلے میں بہت پہلے سے صاف ہاتھوں گرم دل اور ٹھنڈے دماغ کا مالک ہے۔
"اچھا تو آپ کس موضوع پر باتیں کر رہے ہیں؟" وہ تیوری چڑھا کر پوچھتا ہے۔ میرے لیے اس کا کوئی استعمال نہیں ہے لیکن شرافت کی خاطر میں ان میں سے چند باتیں دہراتا ہوں۔

"اچھا دہ —" جمہوریت پسند دکیں کہتا ہے جیسے کہ اس نے کافی سن لیا ہو۔ "کشادہ پالیسی — ایں! زکیوں کی جانور کی مانند پرورش!" اس کے بعد وہ اچانک باہر نکل آتے ہیں — ان تمام سوالات کے مکمل جوابات جو میں سنگِ مرمر کے فرش پر آئینے جڑی ہوئی دیواروں کے درمیان فضول ہی سے کر گیا تھا!

قیدیوں کا معیارِ زندگی بلند کریں؟ نہیں کیا جا سکتا! کیونکہ قرب و جوار کے آزاد مرگ زکیوں کی بہ نسبت کم اچھی طرح زندگی بسر کر رہے ہوں گے اور اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

پارسل کی بار و معمول رسکیں اور زیادہ وزنی؟ ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کا وارڈروں پر غلط اثر پڑے گا جنھیں ماسکو کی دکانوں سے کھانے کی کوئی چیز فراہم نہیں کی جاتی۔

وارڈروں کو ڈانٹیں اور بہتر سلوک کرنے کی تربیت دیں؟ نہیں دیا سکتی! ہم انھیں ملازمت میں رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں! کوئی بھی یہ نوکری نہیں کرنا چاہتا۔ زیادہ تنخواہ نہیں دے سکتے اور ان کے کچھ خصوصی اختیارات سلب کر لیے گئے ہیں۔

ہم قیدیوں کو ان کے کام کی اجرت اشتراکی اصولوں کے مطابق ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں! یہ ان کی اپنی غلطی ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو ہمارے اشتراکی معاشرے سے منقطع کر لیا ہے!

لیکن کیا ہم انھیں عام زندگی بسر کرنے کے لیے سدھارنا نہیں چاہتے؟

انکی اصلاح!!!؟ جج بوار ششدر رہ جاتا ہے "کیمپ اس کام کے لیے نہیں ہیں۔ کیمپ تو انتقام لینے کی جگہ ہیں!"

"انتقام!" یہ لفظ پورے کمرے میں گونجتا ہے۔

انتقام!

ان ان ان — تق تق تق — ام ام ام!!!

"تلوار سیدھی کھڑی ہے، وار کرنے کے لیے، ٹکڑے کر دینے کے لیے — آپ اسے پھر میان میں نہیں رکھ سکتے۔

مجمع الجزائر برقرار ہے۔ مجمع الجزائر ہمیشہ قائم رہے گا!

———— ❖ ————

اس کے جیز آواں کار ڈاصولوں کی غلطیوں کے لیے سزا کون بھگتے گا؟ اس بات کے لیے کون سزا جھیلے گا کہ لوگ ان سانچوں میں ڈھلتے ہیں جو ان کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔

تیسرا باب

قانون کی موجودہ صورتِ حال

قارئین نے اس تصنیف میں ملاحظہ کیا ہے کہ عہدِ اسٹالن کی ابتدا سے ہی ہمارے ملک میں کوئی سیاسی قیدی نہیں تھے
ہجوم در ہجوم وہ آپ کی نگاہوں کے سامنے ہانکے جاتے رہے۔ لاکھوں افراد ۵۰ والے لاکھوں مردوزن محض معمولی مجرم تھے۔
مزید برآں خوش باش اور شگفتہ خورنکیتا سرگیئی ویچ (خروشچیف) نے لاتنے بہت سے اسٹیجوں سے اتنے بہت سے
سلام قبول کیے: سیاسی قیدی؟ ایک بھی نہیں! ہمارے یہاں ایسے قیدیوں کا وجود ہی نہیں ہے!
اور جیسے جیسے غم کا احساس مندمل ہوتا گیا، جیسے جیسے فاصلے نے چبھنے والے ابھاروں کو ملائم کیا، جیسے جیسے جلد کے
نیچے چربی جمع ہوئی، ہم اس بات پر یقین سا کرنے لگے۔ پہلے کے زیک بھی۔ لاکھوں زیک رہا کردیے گئے تھے اور سب نے دیکھا تھا۔
اس لیے شاید واقعی اب کوئی سیاسی قیدی باقی نہیں رہا تھا؟ ہم واپس آگئے تھے اور لوگ بھی ہمارے ساتھ آملے تھے۔ ہمارے
احباب اور خاندان واپس آگئے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شہری دانشور طبقے میں ہماری چھوٹی سی دنیا کی خالی جگہیں پُر ہو گئی
تھیں۔ آپ بےکھٹکے سو سکتے تھے اور جب آپ بیدار ہوں گے تو مکان سے کسی کو باہر نہیں لے جایا جا رہا ہوگا۔ دوست ٹیلیفون
کرتے۔ کوئی ندارد نہیں ہے۔ یہ بات نہ تھی کہ ہم اس بیان پر مکمل طور پر یقین کرتے تھے لیکن عملی اعتبار سے ہم یہ تسلیم کرتے تھے
کہ اب جیل میں سیاسی قیدی نہیں ہیں لیکن آج (۱۹۶۸ء میں) چند سو بالٹ لوگوں کو اپنے جمہوریوں کو جانے کی اجازت نہیں ہے اور
کریمیا کے تاتاروں کے اوپر سے عتاب ختم نہیں ہوا ہے۔ لیکن بہت جلد، بلاشبہ...... ہمیشہ کی طرح باہر سے (جیسا کہ اسٹالن
کے زمانے میں بھی ہوتا تھا) سب کچھ صاف ستھرا تھا۔ کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔
اور نکیتا وہاں تھا۔ اپنے اسٹیج سے چپکا ہوا۔ "اس قسم کے کام اور حادثات نہ تو پھر کبھی پارٹی میں رونما ہو سکیں گے نہ
ہمارے ملک میں (مئی ۱۹۵۹ء وہ نوووچرکاسک سے پہلے کی بات ہے) اب ہمارے وطن میں ہر فرد آزادی سے سانس لے سکتا ہے
حال یا مستقبل کے بارے میں تشویش کے بغیر" (مارچ ۸، ۱۹۶۳ء نووچرکاسک کے بعد)
نووچرکاسک! روس کی تاریخ میں خاصی اہمیت کا حامل شہر، جیسے خانہ جنگی کافی زخموں کے نشانات نہ چھوڑ گئی
ہو۔۔۔ اس نے اپنے آپ کو دوبارہ تلوار کے نیچے ڈال دیا۔
نووچرکاسک! پورا کا پورا شہر بغاوت کرتا ہے اور ہر نشان چاٹ کر صاف کردیا گیا اور چھپا دیا گیا۔ خروشچیف کے
دور میں بھی ہر طرف چھائی ہوئی لاعلمی کا گہرا اتنا دبیز تھا کہ غیر ملکوں میں کسی کو بھی نووچرکاسک کے بارے میں معلوم نہیں ہو
سکا۔ ہمیں اس کی واقفیت مغربی ممالک کے نشریوں سے نہیں ہوئی اور متعدد افواہیں بھی پھیلنے سے قبل ہی دبا دی گئیں تاکہ ہمارے
بیشتر ساتھی، شہری یہ معلوم کر سکیں کہ نووچرکاسک نام کے ساتھ اور ۲ جون ۱۹۶۲ء کی تاریخ کے ساتھ کون سا حادثہ مربوط ہے۔
تو جو معلومات میں یکجا کر سکا ہوں وہ سب یہاں پیش کیے دیتا ہوں۔
یہ مبالغہ آرائی نہ ہوگا کہ روس کی جدید تاریخ میں یہ ایک سنگِ میل ہے بشرطیکہ ہم چوتھی دہائی کے آخیراور فوجیوں

کو شمار نہ کریں (انھوں نے وسیع پیمانے پر ہڑتال کر دی تھی لیکن اس کا اختتام تشدد کے بغیر ہو گیا تھا) تو نوفوچرکاسک کا دھاکہ اکتالیس سال میں وہ پہلا موقع تھا (کرانشاٹ اور تانبوف کے بعد سے) جب لوگوں نے زبان کھولی تھی، کسی تنظیم کے بغیر کسی قیادت کے بغیر، کسی ابتدائی غور و فکر کے بغیر ــــ یہ ایک جماعت کی باطنی آواز تھی جو اب اس طرح نہیں رہ سکتی تھی جیسے کہ اب تک رہتی آئی تھی۔

جمعہ، یکم جون کو ان کافی بھیجے بوجھے قوانین میں سے جو خروشچیف کو بے حد عزیز تھے، ایک قانون پوری سوویٹ یونین میں شائع کیا گیا۔ گوشت اور مکھن کی قیمتوں میں اضافہ کیا گیا۔ اُسی دن ایک مختلف اور بالکل الگ اقتصادی منصوبے کے پروگرام کے مطابق نوفوچرکاسک کے عظیم الشان بجلی سے چلنے والے ریل انجن کارخانے (نیوز) میں ہر شعبہ پر شرح مزدوری میں تخفیف کر دی گئی۔ یہ تخفیف کچھ صورتوں میں تیس فی صد تک تھی۔ اس دن صبح دو ورکشاپوں (فورج اور فاؤنڈری) کے مزدور، جو عام طور پر عادتاً فرمانبردار ملازمین تھے، اپنے آپ کو کام کے لیے آمادہ نہ کر سکے۔ ان کے لیے حالات اتنے ہی ناقابلِ برداشت ہو چکے تھے۔ ان کی آواز بحث و تکرار از خود ایک عوامی جلسے کی صورت اختیار کر گئی۔ مغربی ممالک میں یہ روزمرّہ کی بات ہے لیکن ہمارے لیے یہ ایک غیر معمولی چیز تھی۔ انجینئر اور چیف انجینئر انھیں مطمئن نہ کر سکے۔ کارخانے کا منیجر کروچکن آیا۔ جب مزدوروں نے اس سے دریافت کیا: "اب ہم کیا کھا کر زندہ رہیں گے؟" تو اس موٹی تنخواہ والے اژدہے نے جواب دیا "تمہیں تو گوشت اور پراٹھے نگلنے کی عادت ہے۔ اس کی جگہ جام کا استعمال کرو۔" اسے اور اس کے حامیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا لیکن وہ بال بال بچ گئے (اگر اس نے نرم انداز میں جواب دیا ہوتا تو شاید یہ سارا معاملہ رفع دفع ہو جاتا)

دوپہر تک ہڑتال اُس وسیع و عریض پورے انجن کارخانے میں عام ہو گئی (پیغام رساں دوسرے کارخانوں میں بھی روانہ کر دیے گئے جہاں مزدور ڈانواڈول تو ہوئے لیکن حمایت کے لیے باہر نہیں آئے) ماسکو۔ روستوف ریلوے لائن کارخانے کے قریب ہی سے گزرتی ہے۔ یا تو یہ طے کر کے کہ اس طرح خبریں ماسکو جلد پہنچ جائیں گی یا فوجیوں اور ٹینکوں کی وہاں آمد کو روکنے کے لیے بہت سی عورتیں گاڑیوں کو روکنے کے لیے پٹڑیوں پر بیٹھ گئیں اور مرد ریل پٹڑیاں اکھاڑنے اور رکاوٹیں کھڑی کرنے لگے۔ اتنی جرأتمندانہ ہڑتالی کارروائی روسی مزدور تحریک کی تاریخ میں غیر معمولی تھی۔ کارخانے کی عمارت پر نعرے لکھ دیے گئے۔ "خروشچیف! مردہ باد!" "خروشچیف کا گوشت پکا کر کھاؤ!"

جب یہ سب ہو رہا تھا تو فوجی اور پولس والے کارخانے پر اکٹھا ہونے لگے (کارخانہ اور اس کی بستی ٹزلوف ندی کے پار نوفوچرکاسک کے تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر ہے) شام سے دوسرے دن صبح تک شہر کے اندر یا پل کے پار جانا مکمل طور پر ممنوع تھا۔ رات میں بھی مزدوروں کی بستی ایک منٹ کے لیے بھی پرسکون نہیں ہوئی۔ رات کے بعد تقریباً تیس مزدوروں کو "سرغنہ" کے طور پر گرفتار کر لیا گیا اور انھیں شہر کے پولس تھانے پر پہنچا دیا گیا۔

۲ر جون کی صبح شہر کے کچھ دیگر صنعتی اداروں نے ہڑتال کر دی (لیکن سب نے نہیں) نیوز میں ایک دوسرے از خود شروع ہو جانے والے جلسۂ عام میں طے کیا گیا کہ گرفتار شدہ مزدوروں کی رہائی کا مطالبہ کرنے کے لیے شہر تک ایک احتجاجی جلوس مارچ کرے گا۔ جلوس (جس میں ابتدا میں صرف تین سو افراد تھے ــــ آپ میں جرأت ہونی چاہیے) لینن کی تصویر اٹھا کر پُرامن نعرے لگاتا ہوا پل کے اوپر سے ٹینکوں کے قریب سے بغیر کسی مداخلت کے گزر گیا۔ پھر چڑھائی طے کر کے شہر میں پہنچ گیا۔ یہاں ان کی تعداد متجسس تماشبینوں، دیگر اداروں کے متفرق مزدوروں اور چھوٹے چھوٹے لڑکوں کی شمولیت سے بڑھ گئی۔ شہر کے کئی مقامات پر لوگوں نے لاریاں روک لیں اور انھیں تقریر کرنے کے لیے اسٹیج کے طور پر

استعمال کیا۔ تمام شہر اُبل رہا تھا۔ نیوز کے مظاہرین نے شارعِ عام (ماسکو فسکایا) پر مارچ کیا اور کچھ لوگوں نے یہ سوچ
کر شہر کے پولیس تھانے کے قفل توڑنے کی کوشش شروع کی کہ ان کے ساتھی مقید ہیں۔ ان پر پستول سے گولیاں چلائی
گئیں اور آگے سڑک یادگارِ لینن کی طرف جاتی تھی اور دو تنگ راستوں سے، جو ایک عوامی پارک کے چار جانب بنے ہوئے
تھے، شہر کمیٹی پارٹی کے ہیڈ کوارٹر تک جاتی تھی (جو پہلے آتمن کا محل تھا جس میں جنرل کالیڈن نے ۱۹۱۸ء میں اپنے آپ
کو گولی ماری تھی) تمام سڑکیں لوگوں سے بھری ہوئی تھیں اور اس چوک پر ہجوم سب سے زیادہ تھا۔ بہت سے چھوٹے لڑکے
اچھی طرح دیکھنے کے لیے درختوں پر چڑھ گئے تھے۔

پارٹی کے دفتر خالی پائے گئے۔ شہر کے عہدیداران روستوف بھاگ گئے تھے۔ عمارت کے اندر ٹوٹا ہوا کانچ
تھا اور فرش پر دستاویزات بکھری پڑی تھیں جیسے کہ خانہ جنگی میں پسپا ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ دو ایک درجن مزدور محل
میں داخل ہوئے، اس کی اولیں چھجے پر آئے اور وقفے وقفے کے ساتھ تبدیل ہو کر انھوں نے مجمع کے سامنے تقریریں کیں۔

صبح کے تقریباً گیارہ بجے تھے۔ شہر میں کہیں پولیس نظر نہیں آتی تھی لیکن بیش از بیش فوجی دکھائی پڑ رہے تھے۔
(کیسی آنکھیں کھول دینے والی تصویر ہے۔ ذرا سے ابتدائی دھکے پر ہی غیر فوجی افسران نے فوج کی پناہ لے لی) فوجیوں
نے ڈاک گھر، ریڈیو اسٹیشن اور بینک پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت تک تمام نو فوچرکاسک محاصرے میں لے لیا گیا تھا اور
ہر داخلے اور نکاس کے راستے پر پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں (اس کام کے لیے دیگر چیزوں کے علاوہ روستوف کے
آفیسر ٹریننگ کالجوں کے زیرِ تربیت طلبہ کو لائے تھے اور صرف چند کو شہر میں گشت لگانے کے لیے چھوڑ آئے تھے) ٹینک آہستہ
آہستہ ماسکو فسکایا سڑک پر رینگنے لگے اور انھوں نے وہ راستہ اختیار کیا جس پر ہو کر مظاہرین پارٹی ہیڈ کوارٹرس کی طرف
گئے تھے۔ لڑکوں نے ٹینک پر چڑھ کر دیکھنے کی دراز کے سامنے رکاوٹیں لگانی شروع کر دیں۔ ٹینکوں نے کچھ ہوائی گولے
برسائے جن سے تمام سڑک کی دکانوں اور مکانوں کی کھڑکیاں کھڑکھڑانے لگیں لڑکے بکھر گئے اور ٹینک آگے بڑھتے چلے۔

اور طلبہ! نو فوچرکاسک یقیناً طالب علموں کی بستی ہے وہ سب کہاں تھے؟..... کچھ اداروں کے، جس میں
پالٹکنیک بھی شامل ہے اور چند ٹکنیکل ماڈل اسکولوں کے طلبہ کو ان کے ہوسٹل یا تدریسی عمارتوں میں علی الصبح سے ہی
نظر بند کر دیا گیا تھا۔ ان کے ریکٹروں نے بہت سرعت کے ساتھ غور کیا تھا لیکن ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ طلبہ نے اپنی جانب
سے کسی شہری جرأت کا مظاہرہ نہیں کیا وہ شاید کچھ بھی نہ کرنے کے اس بہانے سے مسرور ہوئے۔ آج مغرب میں باغی
طلبہ کو باز رکھنے کے لیے صرف ایک کنجی گھما دینا کافی نہیں ہوگا (اور روس میں بھی ایامِ گزشتہ میں یہی صورت تھی۔)

پارٹی بلڈنگ کے اندر دست درازیاں شروع ہو گئیں اور زینہ بہ زینہ معترضین کو اندر کھینچ لیا گیا اور فوجی چھجے
پر آ گئے اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں آتے گئے (یاد رہے، فوج نے کس طرح اشپیلاگ ہیڈ آفس کے چھجے سے کینگر
کی بغاوت کو کس طرح دیکھا تھا؟) رائفل برداروں کی ایک صف نے محل کے سب سے قریبی چھوٹے چوک سے ہجوم کو پارک
کے ریلنگ کی طرف دھکیلنا شروع کیا (کئی شاہدین بیک زبان کہتے ہیں کہ یہ فوجی سب غیر روسی تھے۔ کاکیشین لوگ
جنھیں صوبے کے دوسرے سرے سے لایا گیا تھا اور وہاں پہلے سے تعینات گیریسن (شہری تحفظ دستہ) کے محاصرے کی
جگہ متعین کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس نکتہ پر تمام گواہوں کو اتفاق نہیں ہے کہ پہلے محاصرہ کرنے والوں کو گولی چلانے کا حکم
دیا گیا تھا اور اس حکم کی تعمیل نہیں کی گئی تھی کیونکہ جب کیپٹن کو یہ حکم ملا تھا اس نے اپنے جوانوں تک یہ حکم منتقل کرنے
کی بجائے انھیں کے سامنے اپنے آپ کو گولی ماری۔ ایک افسر نے خودکشی کر لی تھی اس میں تو کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

لیکن ان حالات کی تفصیلات مبہم ہیں اور اس باطن کے مجاہد کا نام کوئی نہیں جانتا) بھیڑ تو پیچھے ہٹ گئی لیکن تب سے بُری بات کی توقع کسی کو بھی نہ تھی۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ حکم کس نے دیا تھا۔٭ لیکن ان فوجیوں نے اپنی رائفلیں اٹھائیں اور پہلی بار ہجوم کے سروں پر گولیاں چلائیں۔

شاید جنرل پلیٹ٭ کا ہجوم پر گولی چلانے کا کوئی فوری ارادہ نہیں تھا۔ شاید حالات قابو سے باہر ہو گئے۔ ہجوم کے سروں پر چلنے والی گولیاں جھنڈے سے پارک کے درختوں اور ان پر چڑھے ہوئے لڑکوں کو جا لگیں جن میں سے کچھ زمین پر گر پڑے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غضبناک بھیڑ نے نعرے لگائے جس پر فوجیوں نے اخواہ حکم ملنے کی وجہ سے یا خطرہ محسوس کرتے ہوئے گھبراہٹ میں ہجوم پر اندھادھند فائرنگ شروع کر دی ــــ اور ہاں ــــ ڈمڈم گولیوں سے٭! (کینگر یاد ہے؟ گارڈ ہاؤس پر حملہ!) ہجوم میں گھبراہٹ کی وجہ سے بھگدڑ پڑ گئی جس کی وجہ سے باغ کے چہار جانب تنگ راستے رک گئے اور جب وہ پیچھے ہٹ رہے تھے تب بھی فوجی ان کی پیٹھ پر گولیاں برسا رہے تھے۔ وہ اس وقت تک گولیاں چلاتے رہے جب تک پارک کے پیچھے کا بڑا چوک اور لینن مجسمہ مکمل طور پر خالی نہیں ہو گیا تمام سابق پلاڈفسکی پراسپکٹ پر ماسکوفسکایا شاہراہ تک (ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ وہ علاقہ لاشوں کا ایک بہت بڑا ٹیلہ نظر آتا تھا لیکن وہاں پر بہت سے لوگ یقیناً محض مجروح ہوئے تھے) کئی وسائل سے حاصل ہونے والی معلومات اس نکتہ پر تقریباً یک زبان ہیں کہ تقریباً ستر یا اسّی افراد مارے گئے۔٭ فوجیوں نے بسوں اور لاریوں کے لیے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، ان پر قبضہ کیا، مردوں اور زخمیوں کو ان پر لادا اور انھیں اونچی دیواروں والے فوجی اسپتال روانہ کر دیا (اس کے بعد دو ایک دن تک یہ بسیں خون آلود نشستوں کے ساتھ ہی چلتی رہیں)

اس دن کینگر کی طرح موڈی کیمروں نے سڑکوں پر باغیوں کی تصاویر کھینچیں۔

گولی چلنے کا سلسلہ بند ہوا، دہشت ختم ہوئی، مجمع پھر چوک پر اُمڈ پڑا اور اس پر پھر گولی چلائی گئی۔

یہ سب دوپہر اور سہ پہر میں ایک بجے کے قریب ہوا۔

مشاہدین میں سے ایک تیز نظر رکھنے والے نے تیسرے پہر دو بجے دیکھا "پارٹی ہیڈ کوارٹرس کے چوک پر مختلف اقسام کے تقریباً آٹھ ٹینک کھڑے ہیں۔ لوگوں کی چھوٹی چھوٹی سی ٹولیاں ہیں، بیشتر کم عمر کے، جو ادھر ادھر ایستادہ ہیں اور فوجیوں پر چیخ رہے ہیں۔ چوک پر فرش پاتھ پر خون کے لوتھڑے جم گئے ہیں۔ میں مبالغہ آرائی نہیں کر رہا ہوں تا حال مجھے کبھی یہ خیال نہیں ہوا تھا کہ اتنا بہت سا خون بہہ سکتا ہے۔ عوامی پارک کے جنگلے سے ٹیکے ہوئے درختوں کے تنوں پر خون کے دھبے ہیں۔ تمام چوک پر ٹینکوں کے چلنے کے نشانات پڑے ہیں۔ ایک سرخ پرچم جو مظاہرین نے اٹھا رکھا تھا پارٹی ہیڈ کوارٹرس کی دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا گیا ہے اور ایک سرمئی پڑی جس پر سرخ بھورے رنگ کے دھبے ہیں، اس کے کھمبے کے سرے پر پڑی ہوئی ہے۔ پارٹی کی عمارت کی دیوار کے اوپر ایک بینر معلق ہے جو کچھ دیر پہلے وہاں لٹکایا گیا ہے: "عوام اور پارٹی متحد ہیں۔"

"لوگ فوجیوں کے نزدیک پہنچتے ہیں انھیں کوسنے کے لیے یا ان کے ضمیر سے اپیل کرنے کے لیے۔ "تم نے یہ سب کچھ کیسے کر ڈالا؟ تم کیا سمجھ رہے تھے کہ کس پر گولیاں چلا رہے ہو؟" وہ حیلہ سازی کرتے ہیں "اس کے ذمہ دار ہم نہیں ہیں۔ ہم تو ابھی پہنچے ہیں اور یہاں تعینات کیے گئے ہیں۔ ہمارا اس میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔"

ہمارے قاتل لستہ ملا رہے ہیں (اور پھر بھی لوگ دفتری تساہل کی باتیں کرتے ہیں) وہ فوج پہلے ہی ہٹائے جا چکے ہیں اور ان کی جگہ پریشانی میں مبتلا دوسرے فوجیوں کو طلب کر لیا گیا ہے۔ وہ اپنا کام جانتا ہے وہ جنرل پلیف.......

پانچ یا چھ بجے کے قریب چوک پھر بتدریج لوگوں سے بھر گیا (وہ بہادر تھے۔ وہ نوفوچرکاسک کے باشندے! شہر کا ریڈیو

ان سے اپیل کرتا رہا "شہریو! اودھم نہ مچاؤ، سکون کے ساتھ اپنے گھروں کو چلے جاؤ!" رائفل بردار اب بھی وہاں ایستادہ تھے۔ خون صاف نہیں کیا گیا تھا اور وہ پھر آگے بڑھ آئے) بھیڑ کا شور و غل، بیش از بیش افراد۔ اور ایک دوسرا بغیر تیاری کا جلسۂ عام۔ اب تک انھیں علم ہو چکا تھا کہ مرکزی کمیٹی کے چھ اراکین طیارے کے ذریعے وہاں پہنچ چکے ہیں (شاید پہلے ہی گولی چلنے سے قبل ہی آ گئے ہوں؟) کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان میں کوبان (بڈاپسٹ جیسے ہنگاموں کا ماہر) اور فرول کازلوف بھی شامل تھے (دیگر چار کے ناموں کا یقینی طور پر علم نہیں ہے) وہ کُکس* عمارت میں ٹھہرائے گئے (جو پہلے کیڈٹ کور کا ہیڈ کوارٹر تھا) جیسے وہ کوئی قلعہ ہو۔ اور نیوز سے نوجوان محنت کشوں کا نمائندہ وفد انھیں یہ مطلع کرنے کے لیے بھیجا گیا کہ کیا ہوا تھا! بھیڑ میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، "کوبان یہاں نیچے آئے! وہ اپنی آنکھوں سے ہمارا خون دیکھے! کوبان نیچے نہیں آئے گا۔ شکریہ۔ لیکن ایک سرلفٹ سالزسکی کاپٹر نے تقریباً چھ بجے چوک کے اوپر نچلی پرواز کی۔ اس کا مشاہدہ کیا اور پھر اُڑ گیا۔

تھوڑی دیر بعد مزدوروں کا نمائندہ وفد کُکس سے واپس آیا جیسا کہ طے ہوا تھا اس کے مطابق محاصرہ کرنے والے فوجیوں نے وفد کو جانے دیا اور افسران انھیں پارٹی بلڈنگ کے پیچھے تک پہنچانے کے لیے آئے۔ خاموشی۔ نمائندگان نے مجمع کو بتایا کہ وہ مرکزی کمیٹی کے اراکین سے ملے اور انھیں اس "خونی سنیچر" کے بارے میں بتایا اور کوزلوف نے گولیوں کی پہلی بوچھار پر درختوں سے بچوں کے گرنے کا واقعہ سنا تو وہ اشکبار ہو گیا (آپ فرول کوزلوف سے واقف ہیں جو لینن گراڈ پارٹی کے گینگ کا باس تھا اور اسٹالن پرستوں میں سب سے سنگدل شخص ہے! وہ اشکبار ہوا!.....) مرکزی کمیٹی کے اراکین نے واقعات کی تفتیش کرنے اور ذمہ دار افراد کو سخت سزا دینے کا وعدہ کیا ہے (وہی وعدے جو بیا دسو بلاگ میں کیے گئے تھے) لیکن اس وقت ہر آدمی گھر چلا جائے تاکہ شہر میں نئی گڑبڑ نہ ہو۔

لیکن عوام نہیں گئے! شام کے قریب مجمع اور بڑھ گیا۔ نوفوچرکاسک کا مایوسی سے پیدا شدہ حوصلہ! (ایک یہ کہانی بھی رائج ہے کہ پولٹ بیورو گروہ نے اس شام یہ فیصلہ کیا تھا کہ شہر کی تمام آبادی ایک ایک مرد و زن کو دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے میں اس بات پر یقین کر سکتا ہوں۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی جبکہ قبل ازیں پوری کی پوری نسلیں ہٹائی جا چکی تھیں۔ جب وہ عمل ہوا تھا تو یہی کوبان ہی تو اسٹالن کا دست راست تھا؟)

شام کو تقریباً نو بجے انھوں نے ٹینکوں کے ذریعے لوگوں کو محل سے دور ہٹانے کی کوشش کی لیکن جیسے ہی ڈرائیوروں نے اپنے انجن اسٹارٹ کیے لوگ ٹینکوں کے چار جانب ہجوم کی شکل میں کھڑے ہو گئے جس کی وجہ سے پیچھے اور دیکھنے کے اسکرین بیکار ہو گئے۔ ٹینک کھڑے رہ گئے۔ رائفل بردار ساتھ کھڑے رہے اور انھوں نے ٹینک ڈرائیوروں کی مدد کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

ایک گھنٹے کے بعد ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں چوک کی دوسری سمت سے آتی ہوئی نظر آئیں جن پر پہرے کے لیے ٹامی گن والے بیٹھے تھے (ہماری جنگ کا تجربہ کچھ کام آسکتا ہے! ہمیں نے فاشسٹوں کو ہٹایا تھا!) تیز رفتار سے آگے بڑھتے ہوئے (فٹ پاتھ پر ایستادہ نوجوانوں کے فقروں کے درمیان۔ شام کے قریب طلبہ کو رہا کر دیا گیا تھا) انھوں نے ماسکو فسکایا اسٹریٹ اور سابق پلیوٹوفسکی پراسپکٹ کو صاف کر دیا۔

آخر کار نصف شب کے آس پاس رائفل والوں نے ہوا میں ٹریسر گولیاں برسانی شروع کیں اور ہجوم رفتہ رفتہ چھٹ گیا (دھاندلی میں کتنی طاقت ہے! یہ تمام سیاسی صورتحال کو کتنی جلد تبدیل کر دیتی ہے۔ گزشتہ رات وہاں کرفیو نافذ تھا اور لوگ خوفزدہ تھے لیکن اب تمام شہر سڑکوں پر ٹہل رہا تھا اور فوجیوں پر طعن و تشنیع کر رہا تھا۔ عوام کی مکمل قلب ماہیت کیا یہ چیز اس نصف صدی کی پرت چیر کر ایک عمومی مختلف ماحول بنانے کے لیے تیار کھڑی ہے؟)

۴ر جون کو شہر کے ریڈیو نے کویان اور کوزلوف کی تقریریں نشر کیں۔ کوزلوف نے گریہ نہیں کیا۔ نہ اب انھوں نے (اسطے! عہدوں پر فائز) مجرم اشخاص کا پتہ لگانے کا وعدہ کیا۔ اس بار انھوں نے کہا کہ یہ حادثات دشمنوں کے بھڑکانے کا نتیجہ ہیں اور ان دشمنوں کو سخت سزا دی جائے گی (اس وقت تک لوگ بے شک چوک سے جا چکے تھے) مکویان نے مزید کہا کہ ڈمڈم گولیاں سوویٹ افواج کے گولہ بارود میں کبھی شامل نہیں کی گئیں اس لیے ان کا استعمال حکومت کے دشمنوں نے ہی کیا ہوگا۔

لیکن یہ دشمن کون تھے؟ کیا وہ ملک کے اندر پیراشوٹ کے ذریعے پہنچ گئے تھے؟ وہ کہاں پوشیدہ تھے؟ ہمیں صرف ایک دیدار کرادو! ہمیں بے وقوف بنانے کی بہت عادت پڑ گئی ہے، وہ کہتے ہیں "دشمن" اور ہر بات کی وضاحت ہو گئی۔ عہدِ وسطیٰ میں "شیطان" کہا کرتے تھے۔ ؎

دکانوں میں فوراً مکھن، اچار اور دوسری بہت سی ایسی اشیاء جو اس علاقے میں مدت سے نظر نہ آئی تھیں، یا راجدھانی سے باہر کہیں بھی نہیں ملتی تھیں، بڑی مقدار میں آگئیں۔

تمام مجروحین غائب ہو گئے ہو گئے اور ان کے نشانات تک نہ ملے۔ ان میں سے کوئی بھی گھر نہیں پہنچا۔ اس کے معاوضے میں زخمیوں اور ہلاکین کے خاندانوں کو (جو یقیناً یہ جاننا چاہتے تھے کہ ہمارے نواسوں اور بیٹوں کا کیا حشر ہوا) سائبیریا میں جلاوطن ؎ کر دیا گیا۔ یہی حال ان کا ہوا جو مظاہرے میں پُرجوش تھے دیکھے گئے تھے یا تصاویر میں نظر آتے تھے۔ کچھ حصہ لینے والوں پر بند کمروں میں خفیہ مقدمات چلائے گئے۔ دو "عوامی مقدمات" بھی ہوئے (فیکٹری کے پارٹی عہدیداران اور شہری افسران کو داخلے کے پاس فراہم کیے جاتے تھے) ان میں سے ایک میں نو افراد کو گولی مار دینے اور دوسرے میں دو عورتوں کو پندرہ پندرہ سال کی سزائے قید دی گئی۔

شہر کی پارٹی کمیٹی کی ممبرشپ حسبِ سابق رہی۔

خونی سنیچر سے اگلے شنبہ کو شہری ریڈیو نے اعلان کیا کہ "بجلی کے انجن بنانے والے کارخانے میں مزدوروں نے سنجیدگی سے عہد کیا ہے کہ وہ اپنا ہفت سالہ منصوبہ قبل از وقت مکمل کریں گے۔"

اگر زار اتنا سادہ لوح نہ ہوتا تو اس نے لازماً یہ محسوس کر لیا ہوتا کہ پیٹرسبرگ میں اسے صرف اتنا کرنا تھا کہ علمبردار مزدوروں کو مار کاٹ کر پھینک دیتا اور ان پر ڈکیتی کے الزامات لگا دیتا اس کے بعد کوئی قابلِ ذکر "انقلابی تحریک" باقی نہ بچتی۔

نووچرکاسک سے ایک سال پہلے ۱۹۶۱ء میں الیگزنڈروف میں پولس نے ایک آدمی کو گرفتار کیا اور مارتے مارتے ہلاک کر دیا۔ مزید برآں اس کی لاش کو اپنی چہار دیواری کے پاس سے قبرستان نہیں لے جانے دیا۔ ہجوم نے پولس تھانے کو فرطِ غضب میں نذرِ آتش کر دیا۔ فوراً گرفتاریاں کی گئیں (تقریباً اسی زمانے میں ایسا ہی واقعہ مورادم میں پیش آیا تھا) اب مناسب الزام کیا ہو؟ اسٹالن کے دور میں اگر کوئی درزی کسی اخبار میں سوئی بھی چبھوتا تھا تو اسے دفعہ ۵۸ کے تحت سزا مل سکتی تھی۔ اب زیادہ دانشمندانہ رویّہ اختیار کیا گیا! کسی پولس تھانے کو سپردِ آتش کر دینا سیاسی کارنامہ نہیں تصور کیا جانا چاہیے۔ یہ معمولی غنڈہ گردی ہے۔ اوپر سے اس قسم کے احکامات بھیجے گئے: "اجتماعی بدنظمی ؎ کو سیاسی جرم نہیں سمجھنا چاہیے۔ (اگر یہ سیاسی نہیں ہیں تو پھر سیاسی کیا ہے؟)

چنانچہ بیک قلم۔ کوئی سیاسی قیدی نہیں رہا۔

لیکن ایک چشمہ سوویٹ یونین میں کبھی خشک نہیں ہوا اور تا حال رواں ہے۔ ایسے مجرموں کا سلسلہ جو زندگی میں لائی جانے والی معقول لہر سے بیگانہ ہیں۔ وہ لہر جان تمام دہائیوں میں بے روک ٹوک بہتی رہی۔ خواہ لینن کے نظریات کی خلاف ورزی ہوئی ہو یا مکمل تعمیل۔ خروشچیف کے دور میں اس کی روانی مزید تیز ہو گئی۔

میرا مطلب ہے مذہبی عقیدہ رکھنے والوں کی لہر۔ جنہوں نے بربریت آمیز صورتوں کے نزول اور کلیساؤں کو وسیع پیمانے پر بند کیے جانے کی مخالفت کی۔ جو راہب اپنے معبدوں سے نکال پھینکے گئے (زکراسنوف لوڈمین نے اس کے متعلق بہت سی معلومات فراہم کی ہیں)؛ راسخ العقیدہ لوگ بطور خاص وہ لوگ جنھوں نے فوجی خدمات انجام دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن آپ براہ راست شہنشائیت پسندوں کی معاونت کر رہے ہیں۔ فی الحال ہم آپ کو معمولی سی سزا دے کر چھوڑ دیتے ہیں۔ پہلی مرتبہ یہ سزا پانچ سال ہے۔

وہ کسی بھی پہلو سے سیاسی قیدی نہیں ہیں وہ فرقہ پرست ہیں لیکن باہم ان کی تربیت تو لازمی ہے۔ مذہب پرستوں کو اپنی مذہبی ذہنیت کی وجہ سے ملازمتوں سے برخاست کر دینا چاہیے انھیں مجبور کرنا چاہیے کہ ملحدانہ تقریریں سنیں انکی کمر دیکیا توڑنے پر کومسومول کو مامور کر دینا چاہیے۔ کلیساؤں کے دروازے بلو پمپ اسٹوو سے تباہ کر دینے چاہییں۔ گنبدوں کو ٹریکٹروں کے بازوؤں سے مسمار کر دینا چاہیے، بوڑھی خواتین کی مجلسیں فائر بریگیڈ کے نلوں سے درہم برہم کر دینی چاہییں (فرانسیسی کامریڈو ! کیا باہمی گفتگو کا مطلب آپ کے نزدیک یہی ہے؟)

جیسا کہ پوچائیف معبد کے راہبوں سے مزدوروں کے نمائندگان کی سوویٹ میں کہا گیا تھا "اگر ہم ہمیشہ سوویٹ قوانین کی پابندی کریں تو ہمیں کمیونزم کی آمد کے لیے بہت عرصے تک انتظار کرنا پڑے گا"۔

صرف انتہائی اہم معاملات میں جن میں سبق آموز طریقے، کارگر نہیں ہوتے، قانون کا سہارا لینا ضروری ہوتا ہے۔

یہاں ہم اپنے موجودہ قوانین کی ہیرے جیسی چمک دمک سے چکا چوند پیدا کر سکتے ہیں۔ ہم سبھی لوگوں پر بند عدالتوں میں چلائے جاتے تھے۔ اب ہم ان پر ان کی عدم موجودگی میں مقدمات نہیں چلاتے۔ اب ہم ان پر نیم سرکاری انداز میں مقدمے چلاتے ہیں (یعنی نیم سرکاری عوام کی موجودگی میں!)

میرے ہاتھ میں ایک کاغذ ہے جو جنوری ۱۹۶۴ء میں ڈونباس میں نکشینکا مقام پر کچھ بپٹسٹوں پر چلائے جانیوالے مقدمات کا ریکارڈ ہے۔

اس معاملے کی روداد یہ ہے کہ شناخت کرنے کے بہانے بپٹسٹوں کو جو مقدمے میں حصہ لینے آئے تھے، تین دن جیل میں رکھا گیا (انھیں خوفزدہ کرنے کے لیے اس وقت تک کہ مقدمہ ختم نہ ہو گیا)؛ کسی شخص (آزاد شہری) نے ملزمین پر پھول برسائے۔ اسے دس دن کی سزا دی گئی۔ یہی سزا ایک بپٹسٹ کو دی گئی جس نے مقدمے کا ریکارڈ رکھا تھا اور یادداشتیں قلمبند کی تھیں۔ (اس کے باوجود ریکارڈ کی ایک نقل محفوظ رہی) عوام کے روبرو کومسومول کے کچھ منتخب لوگ اندر لائے گئے تاکہ وہ سامنے کی قطاروں کا محاصرہ کر سکیں۔ مقدمے کے دوران تماش بینوں نے آوازیں لگائیں: "ان سب پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دو!"

عدالت نے اس مشتعل مجمعے کو دبانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے طریق کار کی مثالیں: اس نے دشمن ہمسائیوں اور خوفزدہ نابالغوں کی شہادتیں بھی تسلیم کیں۔ نو اور گیارہ سال کی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو عدالت کے روبرو پیش کیا گیا (اس کی انھیں خاک پروا نہیں کہ اس کا ان پر کیا اثر پڑے گا، ہمیں تو اپنے حق میں فیصلہ درکار ہے) ان کی نوٹ بکیں جن پر مذہبی صحیفوں کے اقوال درج تھے، شہادت کے مواد کے طور پر پیش کی گئیں۔

ایک ملزم بازمیٹن، جس کے نو بچے تھے، ایک کان کن تھا جسے اپنے پیٹ (جانے کہاں) پر یونین کمیٹی سے کبھی کوئی مدد نہیں مل سکتی کیونکہ وہ بپٹسٹ تھا لیکن وہ اس کی بیٹی نینا کو جو اسکول کی آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی اس طرح بدگمان کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ یونین کمیٹی سے پچاس روبل دلا کر ایک انسٹی ٹیوٹ میں داخل کرا دیا جائے گا بشرطیکہ وہ دوران تفتیش اپنے باپ کے

خلاف یہ عجیب و غریب بیان دیدے کہ اس کے باپ نے اسے ایک کھٹا مشروب پلا کر زہر دینے کی کوشش کی تھی جب مذہب پرست اپنی عبادت کے لیے جنگلات میں روپوش تھے (بستی میں انھیں پریشان کیا گیا تھا) تو ان کے پاس ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر تھا۔ ایک اونچا درخت صاحب کے چاروں طرف تار لپٹے ہوئے تھے۔ بعدازاں یہ جھوٹی شہادت نینا کے ضمیر کو پریشان کرنے لگی اور وہ نفسیاتی امراض میں مبتلا ہو گئی اور ایک پاگل خانے کے متشددانہ امراض کے وارڈ میں رکھی گئی پھر بھی اسے اس توقع پر عدالت میں پیش کیا گیا کہ وہ اپنی گواہی پر قائم رہے گی لیکن اس نے اس کے ہر ایک لفظ کی تردید کی! "مجھے جو کچھ کہنا تھا اس کے ایک ایک لفظ کو خود تفتیش کنندہ نے مجھے ادا کرنے کے لیے کہا تھا!" اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ بے شرم جج نے اس کے آخری بیان کو چھوڑ دیا اور اس کے ابتدائی بیان کو ہی تسلیم کیا (جب کبھی سرکاری فریق کے لیے موافق گواہی غلط نکل آتی ہے، تو ہمیشہ عدالت یہی عیاری برتتی ہے۔ جو کچھ کورٹ میں پیش کیا گیا ہو وہ اسے نظرانداز کر دیتے ہیں اور ابتدائی تفتیش میں حاصل کردہ فرضی شہادت کو اپنی اساس قرار دیتے ہیں۔ "اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ تم نے اپنی شہادت میں کیا کہا ہے۔ دوران تفتیش تم نے یہ بیان دیا تھا تمہیں اب اپنی بات سے پھرنے کا کیا حق ہے؟ یہ بھی ایک جرم ہے، جانتے ہو!")

جج کو کیس کی اصلیت میں، صداقت میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بپٹسٹوں کو اس لیے پریشان کیا گیا کہ وہ حکومت کے فرستادہ ملحدانہ تصورات کو عام کرنے والے معلموں کو قبول نہیں کرتے بلکہ اپنے ہی واعظین کو ترجیح دیتے ہیں۔ (بپٹسٹ اصولوں کے مطابق کوئی بپٹسٹ برادری کا سپل صحیفے پر وعظ بیان کر سکتا ہے) صوبائی کمیٹی پارٹی کا فرمان ہے اُن پر مقدمات دائر کرو اور ان کے بچے زبردستی ان سے چھین لو اور اس کی تعمیل کی جائے گی۔ اگرچہ بائیں ہاتھ سے سپریم سوویٹ کے صدارتی بورڈ نے ابھی (۲ر جولائی ۱۹۶۲ء) کو "تعلیمی میدان سے تفریق دور کرنے کی جنگ" سے متعلق عالمی کنونشن پر دستخط کیے ہیں جس کا ایک نکتہ یہ ہے کہ "والدین کو اپنے عقائد کے مطابق اپنے بچوں کو مذہبی اور اخلاقی تعلیم دینے کی سہولت لازمی ملنی چاہیے۔ لیکن عین یہی سہولت ہم نہیں دے رہے ہیں! جو بھی عدالت میں معاملے کے حقائق پر لب کشائی کرتا ہے، جو بھی تنازعے کی وضاحت کرنا چاہتا ہے اسے جج ہمیشہ ٹوک دیتا ہے، اس کے خیالات کا شیرازہ منتشر کر دیا جاتا ہے، دانستہ گمراہی پھیلائی جاتی ہے وہ بحث کو اس سطح پر رکھتا ہے، "آپ دنیا کے خاتمے کی بات کیسے کہہ سکتے ہیں جبکہ ہم نے اشتراکیت کے استحکام کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے۔"

ایک کمسن بچی زینیا خلوپونینا کے بیان کے آخری جزو کا اقتباس ملاحظہ کیجیے: "سینما یا رقص دیکھنے کی جگہ میں بائبل کی تلاوت کرتی تھی اور دعا مانگتی تھی ــ اور صرف اتنی سی خطا پر آپ میری آزادی سلب کر رہے ہیں۔ ہاں آزادی بڑی راحت بخش چیز ہے لیکن بے گناہ ہونا اور بھی زیادہ باعثِ اطمینان ہے لینن نے کہا تھا کہ ترکی اور روس میں بھی مذہبی ایذا رسانی قسم کے شرمناک واقعات اب بھی ہوتے ہیں۔ میں ترکی کبھی نہیں گئی اور اس کے بارے میں قطعی لاعلم ہوں لیکن روس میں صورتحال کیا ہے یہ آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔" اسے درمیان میں ہی خاموش کر دیا گیا۔

سزائیں: ان میں سے دو کو پانچ سال اور دو کو چار سال کیمپ میں رہنے کی سزا دی گئی۔ اور باز بیی کو، جو تمام بچوں کا والد تھا، تین سال کی قید ملی۔ ملزمین نے بخوشی اپنی سزائیں سنیں اور ایک مناجات پڑھی۔ اداروں کے نمائندگان "چیخے" سزا بہت کم ہے اس میں اضافہ کرو! (ان پر مٹی کا تیل چھڑک دو اور دیا سلائی لگا دو!.....)

ایک لمبے عرصے سے مصائب میں مبتلا بپٹسٹوں نے نوٹ کر لیا اور حساب رکھا: اور قیدیوں کے اعزا کی ایک کونسل بنا دی جو تمام مصیبت زدگان کے بارے میں دستی اخبار جاری کرنے لگی۔ ان اخباروں سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ ۱۹۶۱ء سے جون

۱۹۶۴ء تک، ۹۱ پینٹیکوسٹلوں کو سزا دی گئی جن میں پندرہ خواتین تھیں۔[9] (ان سب کے اسماء کی فہرست درج ہے۔ قیدیوں کے پسماندگان کی جو اب بے سہارا ہو چکے ہیں گنتی بھی فراہم کی گئی ہے۔ ۲۴۲ جن میں سے ۱۴۳ اسکول جانے کی عمر کو بھی نہیں پہنچے ہیں) بیشتر کو پانچ سال کی جلاوطنی کی سزا ہوئی ہے۔ لیکن کچھ کو انتظامی کیمپ میں پانچ سال رہنے کی سزا دی گئی ہے (یہ پختہ کار مجرمین کی صحبت میں پہنچنے سے بال بال بچ گئے!) اور اس کے ساتھ ہی تین سے پانچ سال تک کی جلاوطنی ہے۔ صوبہ خارکوف کے اولشانی کے باشندے پی۔ ایم۔ زڈوروفیٹس کو اپنے مذہبی عقائد کی بناء پر سات سال کے سخت بندوبست والے کیمپ میں رہنے کی سزا دی گئی ہے۔ چھپنتر سالہ دائی۔ ایم۔ آر ینڈ کو جیل میں ڈال دیا گیا اور اسی طرح پورے لوز وفوئے کنبے کو (ماں باپ بیٹا) سیفرنی ایم۔ سرد خن کو جو مادرِ وطن کے لیے جنگ میں اپاہج (گروپ نمبرا) ہونے والا پنشن یافتہ فوجی تھا۔ دونوں آنکھوں سے معذور تھا، صوبہ خارکوف کے زمیسکی ضلع میں قصبہ سوکولوو میں تین سال تک ایک کیمپ میں رہنے کی سزا دی گئی کیونکہ وہ اپنے بچوں، لیوبا، نادیا اور راعیہ کو عیسائی مذہب کے مطابق پروان چڑھا رہا ہے۔ بچے عدالت کے حکم پر اس سے چھین لیے گئے۔

پینسٹھ ایم۔ آئی۔ بروڈوفسکی پر مقدمہ (نکولائیف میں، ۶ر اکتوبر ۱۹۶۶ء کو) کی سماعت کرتے ہوئے کورٹ نے بیڈ چھنگے پن سے تیار کردہ فرضی کاغذات کی کوئی جانچ پڑتال نہیں کی جب ملزم نے احتجاج کیا۔ "یہ تم بے ایمانی کر رہے ہو!" تو جواباً وہ اس پر بھونکنے لگے "قانون تمہیں کچل دے گا، مسل دے گا، پامال کر دے گا!"

قانون میرے دوست! "غیر منصفانہ انتقام لینے کے لیے تمہارے اعمال کا نام نہیں بلکہ وہ شے ہے جس پر ان برسوں میں عمل ہو رہا تھا جب اصول کا احترام کیا جاتا تھا۔"

ہمیں حال ہی میں ایس۔ کارلماننسکی کی، ضمیر کو سکتے میں ڈال دینے والی "عرضداشت" کا علم ہوا ہے جو اسی کیمپ میں بیرونی دنیا کو بھیجی گئی ہے۔ مصنف کو پچیس سال کی سزا ہوئی تھی جن میں سے سولہ (۱۹۶۰ء۔۱۹۶۴ء) وہ بھگت چکا تھا اور کیا گیا تھا (ظاہر ہے دو ثلث کے قانون کے تحت) اس نے شادی کر لی اور یونیورسٹی میں تعلیم کا سلسلہ جاری کیا ـــــ لیکن نہیں! ۱۹۶۵ء میں وہ پھر اسے گرفتار کرنے پہنچ گئے۔ تیار ہو جاؤ! تمہاری سزا کے نو سال ابھی باقی ہیں۔

۔ اس قسم کی بات ہمارے علاوہ اور کس ملک کے قانون میں ممکن ہے؟ انھوں نے ربع صدی کی سزائیں لوگوں کی گردنوں میں طوقِ آہن کی طرح آویزاں کر دی تھیں۔ ایسی سزائیں جو کہیں آٹھویں دہائی میں جاکر مکمل ہوں گی۔ اچانک ایک نیا قانون تیار ہوتا ہے (۱۹۶۱ء) کہ پندرہ سال سے زیادہ کی سزا نہیں دی جا سکتی۔ قانون کا سالِ اوّل کا طالب علم بھی سمجھ سکتا ہے کہ اس طرح وہ پچیس سالہ سزائیں منسوخ ہو جاتی ہیں۔ صرف ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ وہ رد ہو جاتی ہیں۔ چیخ چیخ کر گلا خراب کر لو، چاہو تو اپنا سر دیوار سے پھوڑ لو، وہ رد نہیں ہوتیں۔ بلکہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ تمہیں دوبارہ جیل میں لوٹنا ہوگا اور اپنی سزا کی میعاد مکمل کرنی ہوگی!

اس قسم کے بہت سے لوگ ہیں۔ جو خروشچیف کے عہدِ حکومت میں رہائیوں کی وباؤں سے متاثر نہیں ہوئے تھے۔ جماعت کے ساتھی، کوٹھری کے ساتھی اسفری جیلوں کے شناسا جنہیں ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اپنے نئے دورِ حیات میں ہم انھیں بہت عرصہ گزرا فراموش کر چکے ہیں لیکن وہ اب نامرادانہ اداسی کے ساتھ لغزیدہ قدموں سے پامال مٹی کے انھیں قطعات کے چاروں طرف انھیں نگراں برجیوں اور خاردار تاروں کے حصار میں گھرے ہوئے ادھر ادھر چکر کاٹ رہے ہیں۔ کاغذات میں چہرے بدل جاتے ہیں۔ لوگ شخصیت پرستی کے خلاف لڑتے ہیں اور پھر لڑنا بند کر دیتے ہیں لیکن ۲۵ برس والے قیدی، اسٹالن کے پرورش کردہ بچے اب بھی اندر ہیں......

کارافانسکی نے ایسے کئی لوگوں کے "خون منجمد کردینے والے" جیل کے واقعات کی تفصیلات فراہم کی ہیں۔

مغرب کے تمام حریت پسند لیساری مفکرو! تم نے محنت کش طبقے کو چھوڑ دیا۔ اے ترقی پسند امریکی، جرمن اور فرانسیسی طالب علموں! جہاں تک تمہارا تعلق ہے، تمہارے لیے ان میں سے کسی کی بھی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ تمہیں میری یہ کتاب بیکار نظر آئے گی، پھر کسی دن اچانک تم اس کا حرف بحرف سمجھ جاؤ گے لیکن اسی وقت، جب تم خود سنو گے — "ہاتھ پیٹھ کے پیچھے!" اور ہمارے بحیرہ الجزائر کے ساحل پر آنکلو گے۔

پھر بھی آج کے سیاسی قیدیوں کی تعداد میں اور عہدیداران کے اعداد و شمار میں واقعتاً کوئی مناسبت نہیں ہے ان کا شمار کروڑوں یا لاکھوں میں نہیں ہوتا۔

کیا اس وجہ سے کہ اب قانون میں اصلاح کر لی گئی ہے؟

نہیں، صرف اس وجہ سے کہ جابر نے (کچھ عرصے کے لیے) راستہ تبدیل کر لیا ہے۔ عدالت کے کمرے میں دبائیں بالکل پہلے کی مانند ہی پھوٹ پڑتی ہیں اور قانونی اذہان کی جانفشانی کو ظاہر کرتی ہیں۔ اخبارات بھی آپ کو نوبہ نو اطلاعات فراہم کرتے رہتے ہیں بشرطیکہ آپ کو معلوم ہو کیسے پڑھنا چاہیے! جب وہ غنڈوں کے بارے میں خامہ فرسائی کا آغاز کریں تو آپ جان لیجیے کہ عدالت غنڈہ گردی کے الزام میں لوگوں کو بکثرت جیل بھیج رہی ہے۔ اگر سرکاری خزانے سے ہونے والے سرقے کے بارے میں لکھا جائے تو سمجھ لیجیے کہ اس وقت چسپاں کیے جانے والا الزام غبن ہو گا۔

آج کی نوآبادیوں سے خط لکھتے ہوئے زیک مایوسی کے انداز میں ہمیں مطلع کرتے ہیں کہ: "انصاف پانے کی امید فضول ہے۔ اخباروں میں آپ جو کچھ پڑھتے ہیں وہ ایک بات ہے اور حقیقی زندگی قطعی دوسری بات" (وی۔ آئی۔ ڈی)

"میں اپنے معاشرے اور اپنے لوگوں سے خارج ہو کر غارت ہو گیا ہوں لیکن میں انصاف کہاں حاصل کر سکتا ہوں؟ تفتیش کنندہ کی بات میری بات سے زیادہ وزن رکھتی ہے، پھر بھی اسے تیئس ۲۳ برس کی ایک دوشیزہ کو کیا علم غیب ہو سکتا ہے؟ وہ یہ کیسے سوچ سکتی ہے کہ وہ کسی شخص کی کیسی درگت کر سکتے ہیں؟" (وی۔ کے)

"جس وجہ سے وہ معاملات پر نظرثانی نہیں کرتے، وہ یہ ہے کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان میں سے کچھ لوگوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔" (ل۔ ن)

"تفتیش اور مقدمے کے عہدیداران کے طور طریقے بس سیاست سے جرائم کی دنیا میں پہنچ گئے ہیں اور بس اس معاملے میں اتنی ہی پیش رفت ہوئی ہے۔" (جی۔ الیس)

ان مصیبت زدہ افراد نے ہمیں جو کچھ بتایا ہے اسے احتیاط کے ساتھ نوٹ کرنا چاہیے:

۱۔ دوبارہ مقدمہ ناممکن ہے (کیوں کہ اس طرح منصف طبقہ تباہ ہو جائے گا)

۲۔ آج کل وہ لوگوں کا بھرتہ بنانے کے لیے مجرمانہ دفعات استعمال کرتے ہیں جیسے کہ کسی زمانے میں دفعہ ۵۸ مستعمل تھی (اگر وہ ایسا نہ کریں تو کیا کھا کر جییں گے؟ اور مجمع الجزائر کا کیا ہو گا؟)

مختصر یہ کہ فرض کر لیجیے ایک شہری دوسرے ناپسندیدہ شہری کو دنیا سے نیست و نابود کرنا چاہتا ہے (ظاہر ہے کہ سیدھی طرح پسلیوں میں چاقو بھونک کر نہیں بلکہ قانونی طریقے سے) ایسا کرنے کا تیر بہدف نسخہ کیا ہے؟ پہلے اسے دفعہ ۵۸ کے تحت ایک مذمتی

شکایت نامہ لکھنا پڑتا تھا لیکن اب لسے پیشہ وروں (تفتیش کنندہ افسران، پولیس والوں، عدالت کے عہدیداروں) سے صلاح مشورے کے بعد آغاز کرنا چاہیے۔ اس قسم کے غیری کے ایسے احباب بکثرت ہوتے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اس برس کس الزام کا فیشن چل رہا ہے، کس قسم کے مجرموں کے لیے جال پھیلائے جا رہے ہیں؟ کس طبقے کے جرائم میں عدالتوں کو اپنے فرائض زیادہ انجام دینے ہیں۔ مناسب دفعہ کا علم حاصل کر لیجیے اور اسے اس پر چسپاں کر دیجیے۔ یہ حربہ اتنا ہی کارگر ہے جتنا کہ چاقو!

— اس طرح زنا بالجبر والی دفعہ کے تحت الزامات کا ایک طوفان بہت دن تک جاری رہا جب نکیتا نے کسی غصے کے عالم میں اس کے لیے کم از کم بارہ سال کی سزا کا حکم دے دیا تھا۔ ہر بستی میں ہزاروں ہتھوڑے ٹھکا ٹھک بارہ سال کی بیڑیوں کے حلقے جوڑنے میں لگ گئے کیوں کہ لوہاروں کو کبھی بیکار نہیں بیٹھنا چاہیے۔ دراصل یہ دفعہ نازک اور انتہائی نجی معاملات سے تعلق رکھتی ہے اسے احتیاط کے ساتھ دیکھیے تو نظر آئے گا کہ کچھ پہلوؤں سے دفعہ ۱۴۰ سے مماثل ہے۔ ہر دو کے تحت آنے والے جرائم خفیہ طور پر اور تنہائی میں کیے جاتے ہیں اور ان کی صداقت کا پتہ چلانا دشوار ہوتا ہے گواہ ان میں گواہی دینے سے شرماتے ہیں اور بالکل یہی وہ چیز ہے جس کی عدالتوں کو ضرورت ہوتی ہے۔

س۔ د کا معاملہ لیجیے۔ لینن گراڈ کی دو عورتوں کو پولیس نے تھانے میں طلب کیا کہ کیا وہ کچھ مردوں کے ساتھ کسی پارٹی میں شریک تھیں؟ ہاں۔ کیا جنسی تعلق قائم کیا گیا تھا؟ (یہ بات ایک معتبر مخبر کے وسیلے سے پہلے ہی پختہ کر لی گئی تھی) اور ... ہاں ٹھیک ہے۔ تو بات یہ ہے تمہارے ساتھ مباشرت تمہاری مرضی سے کی گئی یا اس میں تمہاری خواہش کو دخل نہیں تھا اگر تمہاری مرضی شامل تھی تو ہم تمہیں طوائف سمجھنے پر مجبور ہوں گے۔ تم اپنے پاسپورٹ داخل کرو اور اڑتالیس گھنٹے کے اندر لینن گراڈ سے نکل جاؤ۔ اگر یہ عمل تمہاری مرضی کے خلاف کیا گیا تھا تو زنا بالجبر کا الزام درج کراؤ! عورتیں لینن گراڈ چھوڑنے پر آمادہ نہیں چنانچہ ہر ایک مرد کو بارہ بارہ سال کی سزا مل گئی۔

ہمارے کند ذہن، ہمارے کور بیں شیطانی اور وحشی نظام عدل کی زندگی اسی وقت تک ممکن ہے جب تک وہ کٹر ہو۔ وحشی اسی وجہ سے اپنے بارے میں اتنا اکثر باز اور اتنا مستقل مزاج ہوتا ہے کہ وہ کبھی اپنے فیصلے پر دوبارہ غور نہیں کرتا۔ کورٹ کا ہر افسر اس کے چاروں جانب حسب مرضی محفوظ رہ سکتا ہے کیونکہ اسے یقینی طور پر معلوم ہے کہ کوئی بھی اسے درست کرنے کے لیے نہیں آئے گا اس اعتبار سے ایک خاموش معاہدہ ہے کہ ہر شکایت، خواہ وہ کتنی ہی بلند شخصیت کے پاس بھیجی جائے اسی افسر کے پاس آئے گی جس کی آپ شکایت کر رہے ہیں۔ کورٹ کے کسی بھی افسر (سرکاری وکیل یا تحقیق کنندہ) کی مذمت نہیں کی جانی چاہیے۔ خواہ اس نے اپنے عہدے کا ناجائز استعمال کیا ہو، کھلے عام بد مزاجی یا ذاتی انتقام کے تحت کام کیا ہو، کوئی غلطی کی ہو یا کسی مقدمے کو غلط طور پر چلایا ہو۔ ہم اسے محفوظ رکھیں گے۔ اس کی حفاظت کریں گے! اس کے چاروں طرف ایک دیوار بنائیں گے! ہم قانون ہیں اور قانون کا کام یہی ہے۔

کسی تفتیش کا آغاز کرنے اور پھر الزام نہ لگانے کا کیا فائدہ؟ کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تفتیش کرنیوالے نے تضیع اوقات کی ہے۔ سزا کے بغیر سماعت کا کیا مطلب؟ کیا اس سے عوامی عدالت تفتیش کنندہ کو ذلیل نہیں سمجھے گی؟ اور اس کا وقت برباد نہ ہو گا اس کا کیا فائدہ کہ سپریم کورٹ نے ایک اور بدنما کرداروں کی استغاثہ کے ریکارڈ میں جوڑ دیا۔ ذرا سوچو کہ تم اپنے اہم پیشہ ساتھیوں کے لیے کتنی دشواری پیدا کر رہے ہو۔ اس کی کیا تمک ہے! ایک مرتبہ شروع ہونے والی تفتیش، جسے فرض کیجیے کسی شکایتی مراسلے کے نتیجے میں جاری کیا گیا تھا، کسی استثناء کے بغیر ایسی سزا پر ہی منتج ہونی چاہیے جو منسوخ نہ کی جا سکے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک دوسرے کی سبکی نہ ہونے دو، اور ریکوم کا زوال نہ ہونے دو۔ معاوضے میں وہ خیال رکھیں گے کہ تمہیں کوئی ضرر نہ پہنچ سکے۔

موجودہ عدالتوں کی بابت ایک اور اہم بات، نہ کوئی ٹیپ ریکارڈر ہے نہ اسٹینوگرافر صرف ایک موٹی انگلیوں والا کلرک ہے جو اٹھارویں صدی کی اسکولی لڑکی کی مانند آرام سے لکھتا ہے اور کارروائی کا کچھ حصہ "لانگ ہینڈ" میں لکھتا ہے یہ ریکارڈ سیشن کے دوران پڑھ کر سنایا نہیں جاتا اور یہ اس وقت کسی کو دکھایا نہیں جاتا جب تک جج نے اس پر نگاہ نہ ڈال لی ہو اور اس کی توثیق نہ کر دی ہو۔ جو کچھ جج منظور کرے گا وہی ریکارڈ پر رہے گا اور کورٹ میں وہی وقوع پذیر ہوا ہوگا! اس طرح جو باتیں ہم نے کانوں سے سنی ہیں وہ دھوئیں کی طرح اڑ جائیں گی۔ وہ کبھی ہوئی ہی نہ تھیں۔

اپنی باطنی آنکھ سے جج صداقت کا چمکدار سیاہ چہرہ ہمیشہ دیکھ سکتا ہے اس کے چیمبر کا ٹیلی فون۔ یہ صدائے غیب آپ کو کبھی دھوکا نہیں دے گی تاوقتیکہ آپ اس پر عمل کرتے رہیں جو وہ کہتی ہو۔

برداشت کرو اور پھولو پھلو اے منصفین کی سرزمین! ہمارا وجود تمہارے لیے ہے۔ تمہارا وجود ہمارے لیے نہیں۔ انصاف کو اپنے پیروں تلے کا ایک دبیز قالین بنا رہنے دو۔ اگر وہ تمہارے لیے ٹھیک ہے تو سب کچھ ٹھیک ہے!

نظامِ عدل کا مستمر اعتبار پولس کی زندگی کو نسبتاً بہت آسان بنا دیتا ہے انہیں وہ طریقہ بے خوفی سے اختیار کرنے دیتا ہے جسے "ٹریلر" یا "کرائم سیک" (جرائم کا پٹارہ) کہتے ہیں۔ مقامی پولس کے تساہل، نااہلی، غبی الذہنی کے باعث جرائم کا طویل سلسلہ لاینحل پڑا رہتا ہے لیکن اندراجات درست رکھنے کی غرض سے مجرموں کا انکشاف ہونا چاہیے (اور کیس بند ہونے چاہییں) اس لیے وہ مناسب مواقع کی جستجو میں رہتے ہیں۔ ایک آدمی پولس کتھانے کی لپیٹ میں آتا ہے۔ کوئی سادہ لوح بآسانی دھمکی سے متاثر ہونے والا آدمی جو تیز نہیں ہے اور وہ لوگ تمام تصفیہ طلب کیس اس کے سر منڈھ دیتے ہیں۔ وہی تنہا ہے۔ اس پورے سال میں اچکہ دیتے رہنے والا ماہر مجرم! اس کی مرمت کرو، بھوکا رکھو تاوقتیکہ وہ اقبالِ جرم نہ کرلے، اپنا نام اس سب پر چسپاں نہ کر دے۔ اپنے لیے اپنے تمام جرائم کے مجموعے کے برابر سزا نہ حاصل کرلے اور اس طرح ضلع سے ایک بدنما داغ مٹا دو!

معاشرے کی صحت بہت اچھی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ہر گناہ گار کو سزا ملتی ہے اور انسدادِ جرائم کی ذمہ دار پولس کو انعامات تقسیم کیے جاتے ہیں۔

معاشرے کی صحت مزید اچھی ہو گئی ہے اور گزشتہ کچھ برسوں میں انصاف اور بھی مضبوط ہو گیا ہے۔ جب سے یہ نعرہ بلند ہوا ہے کہ دوسروں کی محنت پر زندہ رہنے والوں کو پکڑ لو ان پر مقدمات دائر کرو اور انھیں جلاوطن کردو۔ یہ قانون جبکہ ار دفعہ ۲۰۹ جواب محض ایک یاد بن کر رہ گئی ہے کی جگہ جزوی طور پر لے لیتا تھا۔ اس کے تحت عائد کردہ الزام اتنا ہی کینہ پرور اتنا ہی بے ڈھنگا اور اتنا ہی ناقابلِ تردید ثابت ہوتا تھا، انھوں نے لے شاعر آئی۔ برادسکی کے خلاف استعمال کرنے کا موقع نکال لیا تھا!)

اس لفظ کا مفہوم ابتدا ہی سے مہارت کے ساتھ مسخ کیا گیا تھا۔ حقیقی معنوں میں دوسروں کی محنت پر زندہ رہنے والے بڑی بڑی تنخواہیں پانے والے ناکارہ مسندِ عدالت پر یا ان کی نوکر شاہی میزوں پر بیٹھے تھے جبکہ ان سزاؤں کی بوچھار ان مفلسوں پر ہوتی تھی جو مہارت اور صناعی کے ساتھ دن کا کام مکمل کر لینے کے بعد اپنے لیے کچھ فاضل کمائی کرنے کی غرض سے پسینہ بہاتے تھے کتنی تنگدلی کے ساتھ زیادہ کمانے پیسے لوگوں میں نافوں کشوں کے تئیں جو نفرت ہوتی ہے اس کے تحت وہ ان "فاضل وقت گزارنے والوں" پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ اڈزدبیٹی کے جن بے حیا صحافیوں نے یہ کہنے کی گستاخی کی کہ دوسروں کی محنت پر زندہ رہنے والوں کو ماسکو سے بہت دور واقع مقامات پر جلاوطن نہیں کیا جا رہا ہے انھیں اعتراف ہے کہ پارسل اور پیسہ حاصل کرنے کی اجازت ہے! ڈسپلن زیادہ سخت نہیں! "ان سے صبح تا شام مشقت نہیں لی جاتی" یہی ان کے الفاظ ہیں "صبح تا شام" ہم

سوچنے لگتے ہیں کہ کون سا کمیونسٹ سویرا، کون سا آئینی نظام اس طرح اصرار کر سکتا ہے؟

ہم نے کئی اہم دفعات کا ذکر کیا ہے جو غبن کرنے والوں کے لامحدود سیلاب سے مل کر یہ طے کر دیتی ہیں کہ مجمع الجزائر بیچ بیچ میں اپنا خلا پُر کرتا رہے۔ نہ یہ "عوامی بریگیڈ ون" (ڈروزنکی) کے لیے بیکار کی محنت ہے۔ وہ لٹیرے اور حملہ آور افراد جو ملیشیا کے ہاتھوں استعمال ہوتے ہیں جن کا آئین میں کوئی ذکر نہیں ہے اور جو قانون کے سامنے جوابدہی سے آزاد ہیں۔ کہ وہ شاہراہوں پر گشت کریں یا قیدیوں کے دانت توڑتے ہوئے آرام کے ساتھ اپنی کمانڈ چوکیوں میں اینڈتے رہیں۔

مجمع الجزائر کو کمک ملتی رہتی ہے اور ہر چند کہ ہمارے ہاں اتنے طویل عرصے سے غیر طبقاتی معاشرہ موجود ہے، اگرچہ کمیونسٹ لن ترانیوں سے آسمان گونج رہا ہے لیکن ہمیں اس خیال کی عادت سی ہو گئی ہے کہ جرائم کبھی ختم نہیں ہوتے کبھی کم نہیں ہوتے اور سچ پوچھیے تو آجکل کوئی کبھی کسی بات کا وعدہ کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ چوتھی دہائی میں انھوں نے ہمیں یقین دلایا تھا: ہم تقریباً وہاں پہنچ گئے ہیں۔ بس کچھ ہی برسوں کی بات ہے۔ اب وہ اس نوع کے بیانات کبھی نہیں جاری کرتے۔ —

ہمارے ملک میں جس طرح کا طاقتور اور لچکیلا قانون ہے ویسی "قانون" نام کی کوئی چیز دنیا میں کہیں اور نہیں پائی جاتی۔

احمق رومن لوگوں نے ایک فارمولا بنا رکھا تھا "قانون کا اطلاق ماضی سے نہیں ہوتا" ہمارے یہاں یہی ہوتا ہے! ایک قدیم رجعت پسند کہاوت ہے "جو گزر چکا ہے، کیا جا چکا ہے اس کے لیے قانون نہیں لکھے جاتے"۔ ہمارے ملک میں یہ لکھے جاتے ہیں! اگر بھونڈے فیشن کا نیا آئین آئے اور قانون کو خارش پیدا ہو کہ اسے پہلے سے سزا یافتہ قیدیوں پر لاگو کیا جائے تو — کیوں نہیں؟ اس کا نفاذ ہونا چاہیے! روپیے کا سٹہ کھیلنے والوں اور رشوت خوروں کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا۔ فرض کیجیے کہ فہرستیں کیمپ سے ماسکو روانہ کی گئیں جہاں ان لوگوں کے نام نشان زد کر دیے گئے جن پر قانون کا اطلاق پچھلے وقت سے ہو سکتا تھا (اور انھیں زیادہ طویل سزائیں دیدی گئیں یا اس کے مطابق ترقی دے کر نو گرام سیسے کی گولی پلا دی گئی)

پھر ہمارے ملک کا قانون غیر موجود باتوں کو دیکھ لیتا ہے۔ آپ شاید سمجھتے ہوں کہ مقدمے کے آغاز سے پہلے ساعت کا سلسلہ اور فیصلہ نامعلوم ہوگا لیکن آپ دیکھیں گے کہ اشتراکی قانونی نگاہ جریدے میں مقدمہ چلنے سے پیشتر ہی سب کچھ شائع کر دیگی۔ اسے کیسے علم ہوا؟ یہ سوال اپنے آپ سے دریافت کیجیے!!

پھر سوویٹ قانون جھوٹی شہادت دینے کے گناہ کے باب میں سب کچھ فراموش کر بیٹھا ہے اور بس اسے جرم تسلیم نہیں کرتا۔ ہمارے درمیان جھوٹے گواہوں کی ایک پوری فوج مزے اڑا رہی ہے۔ وہ محنت کے بغیر ہی عزت کی کرسی تک پہنچ جاتے ہیں اور اپنی زندگی کے اختتام پر سنہرے غروب آفتاب سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور تاریخ میں واحد ہمارا ملک ایسا ہے جہاں جھوٹی شہادتیں دینے والوں کو خوش رکھا جاتا ہے!

پھر سوویٹ قانون قاتل ججوں اور قاتل سرکاری وکلاء کو سزا نہیں دیتا۔ وہ سب طویل اور باعزت مدتِ عمل سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور شریف بزرگ بن جاتے ہیں۔

پھر کوئی بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ سوویٹ قانون میں ایسی ہنگامی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں ایسے ناگہانی پیچ و خم آجاتے ہیں جو تمام تر تجسس تخلیق فکر کی خصوصیت سے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات قانون کا انداز یہ ہوتا ہے کہ "ایک ہی سال میں جرائم میں شدید کمی ہو جائے! کم افراد کو گرفتار کرو! کم پر مقدمات دائر کرو! سزا یافتگان کو اچھے چال چلن کی ضمانت پر رہا کر دو اور بعض اوقات اس کا جھکاؤ مختلف سمت میں ہوتا ہے۔ جرائم کرنے والوں کی تعداد بے تحاشا بڑھ جاتی ہے۔ اب اچھے چال چلن کی ضمانت نہیں چلے گی! زیادہ افراد کو قید با مشقت کے لیے اور خصوصی انتظام کے کیمپوں میں روانہ کرو! پہلے سے سخت سزائیں!

بدمعاشوں کو گولی مار دینے کی سزا دو!

خواہ کوئی بھی طوفان اسے جھٹکے دے لیکن قانون کا جہاز صفائی اور شان کے ساتھ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ ہماری سپریم کورٹ، ہمارے اعلیٰ ترین وکیل پرانے شاطر ہیں اور وہ کسی بھی آندھی سے پریشان نہیں ہوتے۔ وہ اپنے عظیم الشان اجلاس منعقد کریں گے، وہ اپنی ہدایات جاری کریں گے — اور راستے کی ہر نامعقول تبدیلی کو عرصے سے محسوس کی جانے والی ضرورت، ہماری تمام تر تاریخی ترقی کا ایک منطقی انجام ثابت کیا جائے جس کی "واحد اصولِ صادق" میں قبل از وقت پیش بندی کر لی گئی تھی۔

سوویٹ قانون کا جہاز سب سے زیادہ تیکھا موڑ لینے کے لیے تیار ہے۔ اگر کل لاکھوں افراد کو ان کے طریقِ فکر کی وجہ سے اندر کرنے کے احکامات صادر ہوں، یا پوری کی پوری نسلوں کو (انھیں سابقہ نسلوں کو یا دوسروں کو) یا باغی شہروں کو جلاوطن کرنے کے فرمان جاری ہو جائیں یا قیدیوں پر چار ہندسے دوبارہ ٹانکنے کا حکم دے دیا جائے۔ تو اس کا طاقتور جھکولا اس کی اساس کو قطعی متزلزل نہیں کر سکتا۔

وہ چیز قائم ہے جو ڈرزیون ہمیں بتاتا ہے جسے وہی اپنے قلوب میں محسوس کر سکتے ہیں جنھیں اس کا تجربہ ہو چکا ہے —

"غیر منصفانہ عدالتیں راہزنی سے زیادہ خراب ہوتی ہیں"۔

ہاں یہ بات آج بھی سچ ہے اتنی ہی سچ جتنی کہ اسٹالن کے دور میں تھی، بہت سے بنیادی اصول، آئین اور قوانین باہم متخالف یا تکمیلی نافذ کیے گئے یا شائع کیے گئے ہیں۔ ہمارا ملک ان کے مطابق نہیں چلتا ہے اور گرفتاریاں ہوتی ہیں مقدمات چلتے ہیں۔ ماہرانہ رائے دی جاتی ہے۔ محض ان تھوڑے سے (شاید پندرہ فی صد؟) معاملات میں، جنہیں تفتیش یا عدالتی کارروائی کا موضوع نہ تو سرکاری مفادات پر اثر انداز ہوتا ہے، نہ حکومت کرنے والے نظریات پر نہ کچھ عہدیداروں کے مفادات یا عیش و آرام پر — بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ عدالت کے افسران کسی معاملے کی سماعت کے دوران ہدایات حاصل کرنے کے لیے ٹیلی فون کیے بغیر عمل کرتے ہوں اور اس کے اچھے بُرے پہلوؤں کی بنیاد پر اور اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق سماعت کرتے ہوں۔ اور تمام معاملات میں جو تناسب میں بے حد کم ہوتے ہیں۔ فوجداری ہو یا دیوانی، اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ لازمی طور پر کسی اہم صورت میں کسی کو لحوز یا دیہی سوویٹ کے صدر یا کسی ورکشاپ کے فورمین، کسی فیکٹری کے منیجر، کسی نو آبادکار بیورو کے سربراہ، کسی بلاک افسرِ اعلیٰ، تفتیش کنندہ، کسی پولس ضلع کے کمانڈر، کسی اسپتال کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ، کسی اعلیٰ افسر منصوبہ، انتظامیہ یا وزارتوں کے عہدیداروں خصوصی شعبوں یا عملی صیغوں، ضلع یا صوبے کی پارٹی کمیٹیوں کے سکریٹریوں — اور ان سے اوپر پھر اُن سے بھی اوپر والوں — کے مفادات پر اثر پڑتا ہے۔ ایسے تمام کیسوں میں۔ اندرونی دفتر سے دوسرے کو فون کیا جاتا ہے! اطمینان کے ساتھ نرم آواز میں مشورہ دیا جاتا ہے وہ فیصلہ واضح اور صاف نظر آتا ہے جاتا ہے جو کسی پیچیدہ سازش کے شکار کسی حقیر فقیر آدمی کے معاملے میں کیا جاتا ہے۔ اپنے خلاف افسروں کی اس سازش کا اگر ملزم کو علم بھی ہو تو وہ اسے سمجھ نہیں پائے گا۔ معصومیت کے ساتھ باور کرنے والے اخباروں کے قارئین عدالت کے کمرے میں اس خیال کے تحت جاتے ہیں کہ ان کا فریق حق پر ہے۔ وہ اپنی منطقی دلیلیں دل ہی دل میں بار بار دہراتے ہیں اور وہ مسندِ عدل پر متمکن نیم غنودہ نقاب جیسے چہروں کے سامنے یہ دلیلیں پیش کرتے ہیں ان کے دل میں شبہ تک نہیں ابھرتا کہ انھیں سزا پہلے ہی دی جا چکی ہے

—— کہ کوئی اپیل سننے والی عدالت کوئی مناسب راستہ اور صحیح طریق کار متعین نہیں ہے جن کے وسیلے سے کسی ظالمانہ غیر منصفانہ یا ضمیر کو سوخت کر دینے والے فیصلے کو تبدیل کرایا جا سکے۔

وہاں ہے —— صرف ایک دیوار اور اس کی اینٹیں جھوٹ کے مصالحے سے جوڑی گئی ہیں۔ ہم نے اس باب کا عنوان قائم کیا "یہاں کوئی قانون نہیں ہے"۔

وہی عیارانہ رازداری، وہی بے انصافی کی دھند فضا میں اب بھی معلق ہے جو شہر کی چمنیوں سے زیادہ مسموم ہے۔

نصف صدی سے بھی زائد مدت تک گرانڈیل حکومت فولادی پٹیوں کو کمر کو باندھے ہوئے ہمارے سروں پہ کھڑی رہی ہے، پٹیاں اب بھی موجود ہیں۔ قانون کوئی نہیں ہے۔

پس لفظ

میں تنہا یہ کتاب تصنیف کروں، اس سے بہتر تھا الگ الگ ابواب ان موضوعات کے ماہرین قلمبند کرتے اور پھر ہم لوگ ادارتی جلسہ کرتے اور تمام مواد کو مناسب سیاق و سباق میں رکھ کر ایک دوسرے کی معاونت کرتے۔

لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔ جنھیں علیحدہ علیحدہ ابواب لکھنے کے لیے کہا گیا وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے اور اس طرح کے ابواب قلمبند کرنے کی بجائے انھوں نے تحریری یا زبانی واقعات بیان کیے جنھیں میں حسب مرضی استعمال کرسکتا تھا۔ میں نے ورلم شالاموف کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ ہم پوری کتاب مشترکہ طور پر لکھیں لیکن اس نے بھی انکار کردیا۔

واقعتاً جس بات کی ضرورت تھی وہ یہ تھی کہ عمدہ اسٹاف پر مشتمل ایک دفتر ہوتا اخبارات میں اور ریڈیو پر اشتہارات نشر ہوتے ("ازراہ عنایت جواب دیجیے!") آزادانہ مراسلت کی جاتی۔ وہ عمل کیا جاتا جو بریسٹ قلعے کی داستان کے سلسلے میں اپنایا گیا تھا۔*

میرے لیے اپنے آپ کو اس طرح محیط کرنا ممکن نہ تھا۔ مجھے خود یہ منصوبہ، اپنے خطوط، اپنا مواد پوشیدہ رکھنا پڑتا تھا۔ انھیں بکھرا ہوا رکھنا، ہر کام انتہائی رازداری کے ساتھ کرنا پڑتا تھا۔ مجھے تصنیف پر صرف کردہ وقت کو بھی چھپانا پڑتا تھا اور ایسا ظاہر کرنا پڑتا تھا کہ میں کسی دوسری چیز پہ کام کررہا ہوں۔

کتاب کی ابتدا کرنے کے بعد میں نے اس سے دستبردار ہوجانے کا ارادہ کیا میں فیصلہ نہ کرسکا: ایسی تصنیف میں خود تحریر کروں یا نہ کروں؟ اور کیا مجھ میں اس کی سکت ہے؟ لیکن جب، جو کچھ میں نے یکجا کیا تھا اس کے علاوہ، تمام ملک سے قیدیوں کے خطوط میرے پاس آنے لگے تو میں نے محسوس کیا کہ چونکہ یہ سب مجھے عطا کیا گیا ہے اس لیے اب میرا فرض ہوجاتا ہے۔

مجھے یہ واضح کردینا چاہیے کہ کسی بھی وقت یہ مکمل تصنیف، اس کے تمام حصے بیک وقت میری میز پر نہیں رہے! ستمبر ۱۹۶۵ء میں جب اس تصنیف پر سب سے زیادہ اہم کام ہو رہا تھا تو مجھے ایک جھٹکا لگا۔ میرے ذخیرے پر چھاپہ مارا گیا اور میرا ناول* ضبط کرلیا گیا۔ اس وقت اس کتاب کے تاحال قلم بند کردہ اجزا اور دیگر حصوں کا مواد تتر بتر ہوگیا اور دوبارہ پھر یکجا نہ ہوسکا۔ میں خطرہ مول نہیں لے سکا بطور خاص جبکہ تمام صحیح نام درج کیے گئے ہوں۔ میں اپنی یادداشت کے لیے، کہ کیا کچھ رکھنا ہے اور کیا خارج کردینا ہے، نشانات لگاتا رہا اور کاغذ کے ان پرزوں کے ساتھ مختلف مقامات پر بھٹکتا رہا۔ تصنیف کی ناہمواری، اس کی خامیاں ہمارے ایذا رسیدہ ادب کا سچا نشان ہیں۔ تصنیف جیسی کچھ بھی ہوسکی پیش خدمت ہے۔

میں نے اس تصنیف کے سلسلے کو آگے جاری رکھنا اس لیے بند نہیں کردیا کہ میرے خیال میں یہ مکمل ہوچکی ہے بلکہ اس وجہ سے بند کیا ہے کہ میں اپنی زندگی کا مزید حصہ اس پر صرف نہیں کرسکتا۔

معذرت طلبی کے ساتھ میں خلوصِ دل سے اشکبار ہونا چاہتا ہوں۔ جب بھی وقت اور مواقع نصیب ہوئے آپ تمام احباب، جو زندہ بچ گئے ہیں اور کہانی سے بخوبی واقف ہیں، یکجا ہوں۔ میری کتاب کے ساتھ چھپنے کے لیے اپنے اپنے تاثرات قلم بند فرمائیں، جہاں ضرورت ہو اس کی اصلاح کریں اور اس میں اضافہ کریں (لیکن اسے بہت زیادہ ضخیم نہ بنا دیں جو کچھ اس میں موجود ہے اس کو دوبارہ نہ لکھیں) اسی وقت یہ تصنیف مستند ہو سکے گی۔ خدا اس تصنیف پر رحمت نازل کرے۔

مجھے حیرت ہے کہ میں اسے موجودہ صورت میں بھی پیش کر سکا۔ میں نے کئی بار سوچا کہ وہ مجھے اسے مکمل کرنے کا موقع نہ دیں گے۔

میں اسے ایک دُہری سالگرہ (اور دونوں سالگرہیں باہم متعلق ہیں) پر ختم کر رہا ہوں۔ انقلاب کو جس سے گلاگ مجمع الجزائر کی ولادت ہوئی، پچاس برس ہو گئے اور گرفتار تار کی ایجاد کو سو برس (۱۸۶۷ء) گزر چکے ہیں)۔ یہ دوسری سالگرہ یقیناً بے توجہی کے عالم میں گزر جائے گی۔

ریازان لیو کریو شیچے
اپریل ۲۷، ۱۹۵۸ء ——— فروری ۲۲، ۱۹۶۷ء

باز نوشت

جو کچھ آپ نے مطالعہ فرمایا وہ میں نے اس وقت لکھا تھا جب میں عجلت میں تھا کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ میں نے مصنفین کی کانگریس کو جو مراسلہ بھیجا ہے اس سے پیدا شدہ دھلکے میں اگر میں مر نہیں سکا تب بھی میری آزادیٔ تحریر اور اپنے مسودات تک دسترس تو یقیناً ممکن نہ رہے گی لیکن ہوا یہ کہ مراسلے کے نتیجے میں مجھے گرفتار تو خیر کیا ہی نہیں گیا بلکہ مجھے ایک مستحکم اساس مل گئی۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ مجھے اس کتاب کو مکمل اور مدوّن کرنا چاہیے اور میں یہ کام کر سکتا ہوں۔

اب کچھ احباب نے اسے پڑھ لیا ہے اور انھوں نے اس کی اہم خامیوں کی جانب میری توجہ مبذول کی ہے۔ میں نے اسے بہت زیادہ لوگوں کی نگاہ سے گزارنے کی کوشش نہیں کی اور اگر کبھی ایسا ممکن ہوا تو اس وقت تک میرے لیے بہت دیر ہو چکی ہوگی۔

اس آخری سال میں میں نے اسے ایک واضح شکل دینے کی حتی الامکان کوشش کی ہے کوئی مجھے اس کی عدم تکمیل پر خطا کار نہ سمجھے۔ جن چیزوں کا اس میں اضافہ کیا جا سکتا ہے ان کی کوئی انتہا نہیں ہے اور جس جس شخص کا اس موضوع سے معمولی سا بھی تعلق رہا ہے یا جس جس نے اس کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا ہے وہ بھی کوئی نہ کوئی بات — اکثر کوئی بیش قیمت چیز — اس میں جوڑ سکتا ہے۔ لیکن تناسب کے بھی کچھ اصول ہیں۔ ضخامت میں میری تصنیف آخری حد تک پہنچ گئی ہے ایک تنکا مزید رکھ دیجیے اور اونٹ کی پیٹھ ٹوٹ جائے گی۔

بعض بات مناسب اسلوب میں نہ کہنے کے لیے، کہیں کہیں اعادے کے لیے اور کہیں جملوں کی ساخت ڈھیلی رہ جانے کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ آخر کار مجھے سکون کے ساتھ ایک برس رہنا بھی نصیب نہیں ہوا اور گزشتہ چند ماہ سے میرے پیروں تلے زمین اور میرے ہاتھوں کے نیچے میز پھر بہت گرم ہونے لگی ہے۔ یہ آخری صورت تشکیل دیتے ہوئے بھی میں کبھی ایک مرتبہ بھی مکمل کتابت بیک وقت نہیں دیکھ سکا ہوں۔ ایک ہی وقت میں یہ پوری کتاب کبھی میری میز پر نہیں رہ سکی ہے۔

جن لوگوں کے بغیر اس کتاب کی تصنیف، اس کی اصلاح اور اس کی حفاظت ناممکن تھی ان کی مکمل فہرست ابھی شائع نہیں کی جا سکتی۔ انھیں معلوم ہے کہ وہ کون ہیں۔ میں ان کا ممنون ہوں۔

روزڈ یسفو۔ نا۔ الیٹے

مئی ۱۹۶۸ء

اِشاریہ

کٹورگا: یہ لفظ حصہ پنجم کا عام عنوان بھی ہے۔ اس کا لغوی اردو ترجمہ ہے "شدید مشقت" یا "قید سخت" اور روسی لفظ جس یونانی لفظ سے مشتق ہے وہ جہاز کی پتوار کے ساتھ زنجیر سے جکڑے غلام سے بالجبر لی جانے والی مزدوری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں اس اہم بات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ لفظ کٹورگا (اس کے پہلے جزو میں تاکید ہے) ایک مخصوص زارشاہی قسم کی سزا کے لیے رائج تھا اس سے سائبیریا کی کالونی میں گھٹتے ہوئے اصول پسند انقلابیوں کا تصور ذہن میں ابھر آتا تھا۔

کٹورگا کی سزا پانے والا شخص کٹورزانن (صیغۂ مذکر) کہلاتا تھا اس کی جمع ہے کٹورزانے

ڈی۔ او۔ پی۔ آر (ڈوپر): مخفف نام (کئی الفاظ پر مشتمل نام کے لفظوں کے پہلے حروف سے بنایا ہوا) ہے جس کا مطلب ہے "جبری مشقت کا ادارہ"۔

آئی۔ ٹی۔ ایل: مخفف نام جس کا مطلب ہے "اصلاحی مشقتی کیمپ"

"افسر"، "جنرل" وغیرہ: یہ نیز فوجی اور دفتری اصطلاحات کے کئی دیگر الفاظ، ۱۹۱۷ء میں یہ کہہ کر ترک کر دیے گئے تھے کہ وہ بورژوائی نظام کی دین ہیں۔ لفظ افسر بطور خاص بدنام تھا کیونکہ شاہی افسر طبقے کے اکثر افراد نے خانہ جنگی میں وہائٹس (انقلاب دشمنوں) کا ساتھ دیا تھا۔ سولژینٹسن کی مختصر کہانی "کریچیٹوفکا اسٹیشن کا حادثہ" جو ۱۹۴۱ء کے تناظر میں لکھی گئی تھی، اس کا بنیادی کردار محض اس اندیشے سے کہ اس کے ساتھ سفر کرنے والا کردار کوئی "روپوش افسر" ہو سکتا ہے، اتنا بدحواس نظر آتا ہے جیسے اسے "سنگین بھونک دی گئی ہو"۔

لفظ "جنرل" ۱۹۴۰ء میں دوبارہ بحال کر دیا گیا، "افسر" ایک معیاری فوجی لفظ کی حیثیت سے ۱۹۴۲ء میں واپس لایا گیا "ڈائرکٹر" (منتظم یا منیجر) اور "سپریم" (اعلیٰ ترین) چوتھی دہائی میں پھر عام استعمال میں آ گئے۔

زیک: یعنی "مجرم جس کا قصور ثابت ہو چکا ہو" یا "قیدی" اس لفظ کے ارتقا سے متعلق خیالات کے لیے ملاحظہ ہو جلد دوم —

اٹھائیس حروف: روسی (سیرلک) حروف تہجی کی تعداد تینتیس ہے لیکن ان میں سے پانچ و یو۔ ای کرانکوئے "سخت علامات" اور یری "نرم علامات" عام طور پر کسی عدد شماری کے لیے جو حروف کے ذریعے کی جاتی ہو، استعمال میں نہیں لائے جاتے۔

پولیزئی، برگوماسٹر: یہ الفاظ بالترتیب جرمنوں کے مقبوضہ علاقوں کی آبادی میں سے بھرتی کیے جانے والے پولیس دستوں کے کارکنان کے لیے اور جرمنوں کے متعینہ چھوٹے مقامی عہدیداروں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

آرگن: سرکاری تحفظاتی وسائل۔ لفظ آرگن کسی اسم صفت کے بغیر اندرونی حفاظتی ایجنسیوں کے اراکین استعمال کرتے ہیں۔

کاباتیجا: الیگزینڈر اور استروفسکی کے ڈرامے "دی تھنڈر اسٹارم" (۱۸۶۰ء) میں مذہبی ریاکار ظالم عورت۔

اوکتیابر: پرولتاری مصنفین کی ادبی درجہ بندی جو ۱۹۲۲ء میں کی گئی تھی۔ انھوں نے اس نام سے ایک ماہنامہ ۱۹۲۴ء میں شائع کرنا شروع کیا تھا۔ تیسری دہائی میں نظریاتی انتہاپسندی میں منفرد یہ جریدہ راسخ العقیدہ پارٹی کے نظریات کا ترجمان رہا ہے۔

او۔ جی۔ پی۔ یو (اوگپو): مخفف نام جو "متحدہ سرکاری سیاسی تنظیم" کے لیے مستعمل ہے یہ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۴ء تک سوویٹ اندرونی حفاظتی ایجنسی کا نام تھا۔ ۱۹۲۲ء کے دوران ایجنسی کا نام صرف جی۔ پی۔ یو تھا اور یہ مختصر شکل اکثر اس کے بعد بھی غیر رسمی طور پر استعمال میں آتی رہی۔

لیویٹن: یوری لیویٹن سوویٹ یونین کا مشہور ترین ریڈیو اناؤنسر ہے وہ ایک پشت سے بھی زیادہ عرصے تک ماسکو میں سرکاری خبریں نشر کرتا رہا ہے۔

ولاسوف تحریک: دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں روسیوں کی کمیونسٹ مخالف تحریک جس کے ساتھ جنرل آندرے ولاسوف کا نام منسوب ہے (دیکھیے فرہنگِ الفاظ) جو جرمن افواج کے تعاون سے سوویٹ حکومت کو مسلح جد و جہد کی مدد سے اکھاڑ پھینکنے کا تہیہ کرکے عمل پیرا تھے۔ عملاً ولاسوف عام طور پر سوویٹ اسیرانِ جنگ کی بھاری تعداد میں سے جرمن افواج کے لیے (مسلح اور غیر مسلح دونوں طرح کی) معاونت فراہم کرنے میں منہمک تھا نازی افسران ولاسوف تحریک کو بڑے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انھوں نے اسے مشرقی مورچے پر اپنی فوج جمع کرنے کی اجازت نہیں دی نہ جنرل ولاسوف کو جرمن افواج کی روسی یونٹوں پر رسمی اقتدار ہی خاتمۂ جنگ سے پہلے تک کبھی حاصل ہوا۔ اس تحریک پر سولنیٹسن کے گزشتہ نوٹ گلاگ مجمع الجزائر کی جلد اوّل میں ملاحظہ فرمائیے۔

چیکسٹ: اصلاً اور محدود معنی میں اولیں سوویٹ داخلی تحفظ کی ایجنسی، چیکا کے اراکین، اکثر یہ نام مفہوم میں وسعت کے ساتھ بعد والی تحفظاتی ایجنسیوں کے اراکین کے لیے بھی مستعمل ہے۔

سی۔ پی۔ ایس۔ یو (بی) کا پولٹ بیورو یا صدر آرگ بیورو: قوسین کا "بی" بولشویکوں کے لیے آیا ہے اور پارٹی کا باقاعدہ نام ۱۹۵۲ء سے قبل تک "سوویٹ یونین کی کمیونسٹ پارٹی (بولشویک)" تھا۔

پولٹ بیورو کمیونسٹ پارٹی کا خصوصی پالیسی ساز ادارہ ہے آرگ بیورو پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا ایک ذیلی ادارہ ہے اور اس کا تعلق تنظیم اور طریق کار کے معاملات سے رہتا ہے۔

ریکوم اور گورکوم: مخففات جن کا مطلب ہے ریان سطح پر اور شہری سطح پر کمیونسٹ پارٹی کے مقامی تنظیمی ادارے (ریان کسی اوبلاسٹ یا بڑی میونسپلٹی کے علاقائی حصے کو کہتے ہیں)

پگاچیو بغاوت: ییملیان پگاچیو (پگاچوف) ۱۷۷۳-۱۷۷۵ء میں ایک بڑی عوامی بغاوت کا سربراہ تھا اس نے سرف (زرعی غلاموں) کو آزاد کرانے کا عزم کیا تھا اور اسے دونگا اور یورال علاقوں میں بے حد حمایت حاصل ہوئی۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے کیتھرین ثانی کی حکومت کو غیر معمولی کاوش کرنی پڑی تھی۔

کادیت (کیڈٹ) روس کی آئینی ڈیموکریٹوں کا مروجہ نام — یہ نرم مزاج اور وسیع النظر تھے اور ان کی پارٹی ۱۹۰۵ء میں قائم ہوئی تھی جسے بولشویکوں نے غیر قانونی مشتہر کر دیا تھا (کادیت پارٹی کے نام کا روسی مخفف ہے)

گورلاگ وغیرہ —

گورلاگ: گورنی لاگیر ـــــ کوہستانی کیمپ۔

برلاگ: بریگوفوئی لاگیر ـــــ ساحلی کیمپ۔

منلاگ: منرلنی لاگیر ـــــ معدنی کیمپ۔

ریچلاگ: ریچنوئی لاگیر ـــــ لب دریا پر واقع کیمپ۔

ڈبروفلاگ: ڈبروفنی لاگیر ـــــ سبز باغاتی کیمپ۔

اوزرلاگ: اوزرنوئی لاگیر ـــــ جھیلوں پر واقع کیمپ۔

اسٹیپلاگ: اسٹیپنوئی لاگیر ـــــ اسٹیپی کیمپ۔

پیشچلاگ: پیشچانی لاگیر ـــــ ریگستانی کیمپ۔

گلاگ: لگادوئی لاگیر ـــــ گھاس کے میدانوں کے کیمپ۔

کامشلاگ: کامیشوئی لاگیر ـــــ سرکنڈہ کیمپ۔

سُرخ پٹیوں کو شانے پر لگانے والے پہریدار: باقاعدہ سپاہ سے لیے جانے والے پہریدار۔

"ہر حالت میں عام ڈیوٹی سے پرہیز کرو": اس خصوصی کام والے قیدی اور اس کے مشورے کے بارے میں ملاحظہ فرمایئے گلاگ مجمع الجزائر، جلد اول۔

اسٹولی پن کار: قیدیوں کو منتقل کرنے والی ریل گاڑی۔

شکی یا پچیز یا "کتیا": پیشہ ور مجرمین جو عہدیداروں کے ساتھ سازش کرکے رہتے تھے۔

کم یا گاڈ فادر: اعلیٰ افسر تحفظ کے لیے جیل خانے میں مستعمل لفظ۔

ایس۔ آر: اشتراکی انقلابی۔ اس انتہا پسند ہردلعزیز پارٹی کی روس میں اکثریت کی حمایت حاصل تھی اور اسے حکومت نے ۱۹۲۲ء میں غیر قانونی قرار دیا تھا۔

مزل: جیلوں کی کھڑکیوں پر لگے ہوئے شٹر یا پردے۔

انھوں نے خود تخم ریزی کی تھی: سوویٹ حکومت کے قیام میں لٹوین رائفل ریجمنٹ نے اہم کردار ادا کیا تھا اس کی طرف اشارہ ہے۔

تانبوف کسان: ۱۹۲۱ء ـــ ۱۹۲۰ء میں سوویٹ حکومت کے خلاف ایک بڑی کسان بغاوت صوبہ تانبوف سے شروع ہوئی تھی جس کا سرغنہ الگزینڈر انیطونوف تھا جو ایس۔ آر پارٹی کا معتقد تھا۔

آداں گارڈ اصول: مارکسی لینن نظریات جو دنیا کے سب سے ترقی یافتہ فلسفہ ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔

برف پر مہم: اسے اولیں کوبان مہم بھی کہتے ہیں ـــ روسی خانہ جنگی کا یہ واقعہ فروری ۱۹۱۸ء میں روسٹوف آن دی ڈان سے سفید (انقلاب مخالف) رضاکار سپاہ کے پسپا ہونے، منجمد اسٹیپی کو پار کرکے کوبان ندی کے علاقے تک مارچ کرنے اور تقریباً تین ماہ کی متواتر جنگ کے بعد ڈان علاقے میں اس کی فتح کے بعد واپسی کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

یسری سے شروع ہونے والے ہندسے: روسی شمار ترتیب جو سیریلک حروف تہجی سے کیا جاتا ہے (یسری کا ابجد) عام طور سے استعمال میں نہیں آتا۔

وہ: بائبل میں مستعمل لفظ "اِٹ" (وہ) کا مترادف جس کا مطلب ہے زمینی جانور جس نے شہنشاہیت کا آغاز کیا۔

فنش جھونپڑیاں، فن لینڈ سے درآمد کردہ تیار شدہ جھونپڑیاں یا ان کی طرز پر بنائی ہوئی جھونپڑیاں۔

گوفر: روسی زبان میں مستعمل ایک تضحیکی لفظ۔ ریگستانی جانوروں کا حوالہ جن کے علاوہ وہاں جیل گاڑیوں کا نظارہ کرنے والا اور کوئی ذی روح نہ ہوگا۔ گوفر (سسلیک) "چوہا" کی طرز کا ایک توہین آمیز لفظ ہے۔

ملک کے جلسے: زیمسکی سوبورا کا ترجمہ۔ یہ لفظ سولہویں اور سترھویں صدی میں ماسکووی میں منعقدہ جلسوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ سترہویں صدی کے ابتدائی حصے میں انتشار کے زمانے میں نظم و نسق دوبارہ قائم کرنے میں ان جلسوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔

ایس۔ کے: سخت مشقت کے لیے جلاوطن کردہ۔

دسمبری بغاوت: وسیع النظر خیالات رکھنے والے متمول افسران نے ۱۸۲۵ء میں زار شاہی حکومت کو پلٹ دینے کی ناکام کوشش کی تھی۔ ۱۴ دسمبر ۱۸۲۵ء کو سینٹ پیٹرسبرگ میں سینٹ اسکوائر پر تقریباً تین ہزار باغی فوجی یکجا ہو گئے لیکن شام تک بغاوت فرو کر دی گئی آخر میں پانچ سربراہوں کو پھانسی دی گئی۔ کئی درجن کو سائبیریا جلاوطن کر دیا گیا۔

"سینیٹ دراسکوائر پر" یعنی دسمبری باغیوں کے ساتھ (ملاحظہ ہو مندرجہ بالا نوٹ) شاعر الگزینڈر پشکن کے متعدد قریبی دوست دسمبری قائدین میں شامل تھے لیکن بغاوت کے زمانے میں وہ اپنے والدین کے ساتھ دیہی زراعت میخائلوفسکوئے میں مقیم تھا۔ زار نکولس اوّل نے جب اسے ملاقات کے لیے طلب کیا تو اس نے کھل کر باغیوں کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔

اسکرا: پہلا روسی اشتراکی اخبار جسے لینن نے ۱۹۰۰ء میں جاری کیا تھا اور جو غیر ممالک میں ۱۹۰۵ء سے قبل تک شائع ہوتا رہا۔ اسکرا میں لینن کے اہم ابتدائی مضامین شائع ہوئے تھے۔

اسٹولی پن ردِّ عمل: ۱۹۰۵ء کی بغاوت کے انسداد کے بعد کے زمانے کے لیے انقلابیوں کی اصطلاح جو وزیر داخلہ پی۔ اے۔ اسٹولی پن (۱۹۱۱ء — ۱۸۶۲ء) کی پالیسیوں سے متعلق تھی۔

نووچرکاسک میں تعزیری کارروائی: جون ۱۹۶۲ء میں نووچرکاسک میں ہونے والے فسادات کو روکنے کے لیے قتلِ عام کی ہدایات۔ اس واقعہ کی تفصیلات حصہ ہفتم کے تیسرے باب میں درج ہیں۔

لیویڈیا: یالٹا کے نزدیک شاہی خاندان کے لیے موسم گرما کی قیام گاہ۔

ڈیل: ولادیمیر ڈیل انیسویں صدی کا ایک ممتاز لغت نویس تھا اس کی مرتبہ روسی زبان کی چار جلدوں والی لغت میں ایسا کافی مواد ہے جو دوسری کسی لغت میں نہیں پایا جاتا اور یہ سولژینٹسین کے پسندیدہ ماخذوں میں سے ہے۔

واسیلی ٹیورکن: الگزینڈر ٹوارڈوفسکی کی طویل بیانیہ نظم جو دوسری عالمگیر جنگ کے ایام میں بالاقساط شائع ہوئی تھی اور جس میں ایک خوشحال ذہن روسی کے اگلے مورچے پر فوجی کی حیثیت سے انجام دیے ہوئے دلیرانہ کارناموں کا تذکرہ ہے۔ یہ نظم بے حد مقبول ہے۔

کاڈی مقدمہ: ملاحظہ ہو گلاگ مجمع الجزائر جلد اوّل۔

متسری: میخائل لیرمونتوف کی اس عنوان سے ایک بیانیہ نظم کا ہیرو (۱۸۴۰ء)۔ متسری ایک اناڑی ہے جو اپنی مادرِ وطن تک پہنچنے کی کوشش میں ایک کاکیشین معبد سے فرار ہو جاتا ہے اور ناکام رہتا ہے۔ قرب و جوار کے جنگلات میں اس کی تگ و دو زندگی کے لافانی لپکے کی علامت ہے۔

میں مشرقی پروسیا کی سڑکوں پر تھا: یعنی "پروشین نائٹس" کے عنوان سے طویل بیانیہ نظم کی تکمیل میں غرق تھا جس میں سولژینٹسین نے دوسری عالمی جنگ کے آخری دور میں مشرقی پروسیا میں سوویٹ افواج کی ہنگامی یلغار کا ذکر کیا ہے۔

گوزسس: دو خود یا گی یا بستر مرگ۔ جیل میں ان زیکوں کے لیے مستعمل بھونڈا لفظ جن کی جسمانی صحت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب وہ لب گور ہے۔

نو جنوری: اتوار ۹ جنوری ۱۹۰۵ء کو مزدوروں کے ایک بڑے جلوس نے زار کو ایک عرضداشت پیش کرنے کی کوشش کی تھی جس کا استقبال بندوق کی گولیوں سے کیا گیا۔ سیکڑوں زخمی ہوئے۔ یہ حادثہ "خونی اتوار" کے نام سے مشہور ہو گیا اور اس دن سوویٹ یونین میں ہر سال یادگار منائی جاتی ہے (لیکن آگے ملاحظہ فرمائیے)

این۔ ای۔ پی: نئی اقتصادی پالیسی — اس میں زراعت، تجارت اور صنعت کے میدانوں میں ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۸ء کے مابین سختی میں عارضی لچک آ گئی تھی۔ اس دور میں ہر نوع کی نجی صنعتیں پروان چڑھیں۔

دوخلا: جیل میں اس زیک کے لیے مستعمل تضحیک آمیز لفظ جو پیشہ ور مجرم کی طرح کام کرتا ہے۔

شاک ورکر: سوویٹ یونین کے وہ مزدور جن کی پیداوار اوسط سے بہت زیادہ ہے۔

محوزکا: موٹا گھٹیا قسم کا تمباکو۔

سبز ہم: جیل سے فرار ہونے کے لیے جیل کیمپ میں مستعمل اصطلاح۔

بیشبرماک: "قازقوں میں مستعمل گوشت کا ایک کھانا۔

اکساکال: "سفید داڑھی" قازق لوگوں میں یہ لفظ احتراماً استعمال ہوتا ہے۔

یوک: "کوئی نہیں ہے" قازق زبان میں۔

سوفخوز: سوویٹ فارم جن کا انتظام براہِ راست حکومت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ اسے صنعتی کارخانے کی طرح چلاتی ہے۔ سوفخوز میں اجتماعی فارم (کولخوز) کا امتیازی باہمی اشتراک والا نظم و نسق نہیں ہوتا۔

"طبقاتی دوست" قسم کے قیدی: یعنی عام پیشہ ور مجرمین۔ یہ لفظ، جس کی جگہ سماجی دوست یا یکساں مذہبی طبقے کے لوگ بھی کہا جا سکتا ہے، مارکسی لینینی طبقاتی نظریات سے برآمد ہوا ہے جس میں مجرموں کو اشتراکی نظام کی تشکیل میں معاون قرار دیا گیا ہے کیوں کہ ان کا پس منظر پرولتاری ہے۔ "طبقاتی دوست" کا متضاد لفظ "سماجی اعتبار سے دشمن عناصر" ہے اسکی تعریف بھی سماجی تناظر کے پیش نظر ہی کی جاتی ہے۔

اسٹالن فرکا: یعنی کسی بھی قسم کے فرق کے بغیر۔

نیلی ٹوپی (بلیو کیپ) سوویٹ حفاظتی ایجنسیوں کے رکن۔ این۔ کے۔ وی۔ ڈی۔ کے اراکین کی وردی میں ہلکے نیلے رنگ کی پٹی دار ٹوپی ہوتی ہے۔

"قلاق تخریب" قلاق (لفظی معنی گھونسہ) کے رمزیہ معنی "دیہاتی سُود خور" تھے لیکن سوویٹ دور میں ہر ایسے کسان کو "قلاق" کہا جانے لگا جو کامیاب یا متمول تھا۔ ۱۹۲۹ء میں زراعت کی بالجبر اجتماعیت کی پالیسی کی مدافعت کو "قلاق تخریب" کا نام دیا گیا تھا۔

کولیا: گیہوں یا چاول اُبال کر اور شہد ملا کر کھایا جانے والا ایک قسم کا کھانا جس میں عموماً خشخش کے دانے کشمش یا میوے بھی ڈالتے ہیں۔ اسے کرسمس سے پہلے والی رات کو کھانے کا رواج ہے۔

سیپریٹ جیل (آئسولیٹر) اہم سیاسی قیدیوں کے قیام کے لیے ایک خصوصی جیل یا کیمپ۔

یفتوشینکو کی نظم: جنوب مشرقی سائبیریا میں دریائے انگارا کے ساحل پر واقع شہر براتسک میں ایک عظیم الشان آبی بجلی گھر ہے جو سا تویں دہائی میں مکمل ہوا تھا۔ یوزینی یفتوشینکو نے اس منصوبے کی تکمیل پر منائی جانے والی تقریب میں ایک طویل

بیانیہ نظم پڑھی تھی۔

تیرہ سال پیشتر اس موسم گرما میں: ۱۹۴۱ء کی گرمیوں میں جب جرمنی نے سوویٹ روس پر دفعتاً حملہ کر دیا تھا۔

وِٹّہ کمیٹی: یہ اس تنظیم کی کسی صوفیائی شاخ کا ہدایت نامہ معلوم ہوتا ہے جو روسی صنعتی ترقی کو فروغ دیتی تھی۔ کاونٹ سرگیئی وِٹّہ (۱۹۱۵ء۔ ۱۸۴۹ء) جو ۱۸۹۲ء تا ۱۹۰۳ء روس کا وزیرِ خزانہ تھا اور اس نے صنعتوں کے فروغ کے لیے بہت کچھ کیا۔

سبوٹنک: سرکاری اصطلاح کے مطابق "سماجی اعتبار سے کارآمد محنت کرنے کے لیے رضاکارانہ اپنا نام پیش کرنا یا منتقلِ خدمات اس کام کی کوئی اجرت ادا نہیں کی جاتی تھی اور یہ پہلے سنیچر کو کیا جاتا تھا۔

وار کمیونزم: ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان سوویٹ حکومت کی بطورِ خاص اقتصادی میدان میں اختیار کردہ پالیسی اور طریقِ کار کا نام۔ اس میں کسانوں کی پیداوار کو بڑے پیمانے پر سرکاری قبضے میں لے لینا اور صنعت و تجارت کا قومیانا بھی شامل ہے۔

اسٹخانووائٹ: یہ مہم حکومت نے مزدوروں کی پیداوار بڑھانے کے لیے شروع کی تھی۔ مہم کا نام ایک کوئلے کے کان کن الکیئی اسٹخانوف کے نام پر رکھا گیا جس کے بارے میں دور دور تک شہرت تھی کہ اس نے ۱۹۳۵ء کے ایک بڑھیا دن میں پیداوار کو ۱۴ درجے آگے بڑھا دیا جو مزدور اس قسم کے کارناموں کی تقلید کرتے تھے اور جو صدقِ دل سے اس کی کوشش کرتے تھے انھیں "اسٹخانووائٹ" کہا جاتا تھا اب اس کی جگہ "شاک واکر" یا "انوکھے محنت کش" کی اصطلاح رائج ہے۔

ایس۔ ڈی: سوشلسٹ جمہوری پارٹی کا رکن۔ یہ وہ روسی تھے جنھوں نے بولشویزم کو قبول نہیں کیا تھا۔

میگنٹو گورسک بلڈنگ آپریشن: پہلے پنجسالہ منصوبے میں ایک مخصوص صنعتی منصوبہ میگنٹو گورسک میٹل ورکس کی تعمیر کا تھا۔ یہ یورال میں میگنٹو گورسک شہر کے ساتھ ساتھ ۱۹۳۱ء۔ ۱۹۲۹ء میں مکمل کیا گیا تھا اور ایک عظیم الشان فولادی کارخانہ تھا۔ متعدد مصنفین کارخانے کا معائنہ کرنے گئے اور انھوں نے نثر و نظم میں منصوبے کی توصیف کی۔ اس نوع کی مشہور تخلیقات میں ویلینٹن کاٹائیف کا ناول "ٹائم فارورڈ" (۱۹۳۲ء) بھی شامل ہے۔

ٹیورین: سولژنٹسین کے ناول "وَن ڈے اِن دی لائف آف آئیوان ڈینی سووچ" (آئیوان ڈینی سووچ کی زندگی کا ایک دن) کا ایک جہاندیدہ اور کیمپ کا تجربہ رکھنے والا بریگیڈ رہنما۔

ایڈنائر معافی: ۱۹۵۵ء میں خروشچیف کا ان لوگوں کے لیے معافی نامہ جن پر دوسری جنگِ عظیم میں جرمنوں کے ساتھ تعاون کرنے کا الزام تھا۔ یہ تقریباً ایک ہزار جرمن اسیرانِ جنگ کی وطن کو واپسی کا نتیجہ تھا جس کے لیے چانسلر کونریڈ ایڈنائر نے ماسکو میں مصالحتی گفت و شنید کی تھی۔

چھبیس ٢٦ تن: دلیل کے طور پر مصنف یہاں اُن چھبیس بولشویک کیساروں سے موازنہ کر رہا ہے جنھیں ۱۹۱۸ء میں برطانوی فوجیوں نے گولیوں مار دی تھی۔ سوویٹ یونین میں ان چھبیس افراد کی یادگار منانے کے لیے ایک بہت بڑا دبستانِ فکر قائم کیا گیا ہے اور بہت سی ادبی تخلیقات میں اس موضوع کو برتا گیا ہے (سب سے زیادہ مشہور سرگیئی الیسینن کی "دی بیلیڈ آف ٹوئنٹی سکس" ہے)

تین مربع رشین آراضی: یعنی قبر کے لیے درکار زمین۔ رشین روس میں مستعمل طوالت کا پیمانہ ہے جو ۸۴ انچ کے مساوی ہوتا ہے۔ قبر کے لیے تین رشین لمبی اور ایک رشین چوڑی جگہ درکار ہوتی ہے۔

ایرک اروِڈ اینڈرسن: اس پُراسرار قیدی کی سوانحِ حیات کا کچھ حصہ "گلاگ مجمع الجزائر" جلد اول میں شامل ہے۔

سات بویرس: اسٹالن کی موت کے بعد "اجتماعی قیادت" کے ابتدائی زمانے میں اسٹالن کے سات جانشینوں کو سولژنٹسین کا

عطا کردہ نام۔ وہ ہیں: نکولائی بلگانن، لازار کاگانووچ، نکیتا خروشچیف، جارجی مالنکوف، اناستاس مکویان، دیاچیسلاف مولوٹوف اور کلمنٹ ووروشلوف۔ سات بویرس: لفظ روس کی تاریخ سے ماخوذ ہے جس میں اس کا استعمال ایک بویرا اقلیتی طبقے کے احکامات کے لیے ہوتا تھا۔

چیکا۔ جی۔ پی: ایک مرکب لفظ جس میں تمام سوویٹ داخلی تحفظاتی ایجنسیاں آجاتی ہیں۔ سب سے پہلی چیکا سے لیکر آج کی کے۔ جی۔ بی۔ تک۔

پاسپورٹ: ولاڈیمیر مایاکوفسکی کی وہ نظم جس کا عنوان ہے "ایک سوویٹ پاسپورٹ کے بارے میں نظم" (۱۹۲۹ء) اس میں شاعر نے اپنی سوویٹ دستاویزات سے کسی غیر ملکی افسر پر مرتسم ہونے والے اثرات کا تذکرہ بڑے پرلطف انداز میں کیا ہے:

اسے پڑھو،
اور رشک سے سیاہ پڑجاؤ۔
میں شہری ہوں۔
سوویٹ یونین کا۔

"اور تمہارے بھائی تمہاری تلوار واپس کردیں گے" الگزینڈر پشکن کی نظم "سائبیریا کے نام پیغام" (۱۸۲۷ء) سے ماخوذ جو سائبیریا میں جلاوطن دسمبریوں سے مخاطب ہو کر کہی گئی ہے۔ پشکن اپنے اس منظوم خط کے اختتام پر بڑی پرامید تاثر کا اظہار کرتا ہے:

جھولتی ہوئی وزنی زنجیریں گر پڑیں گی۔
ایک لفظ، اور دیواریں زمیں بوس ہو جائیں گی۔
اور نورانی فضا میں آزادی تمہارا استقبال کرے گی۔
اور تمہارے بھائی تمہاری تلوار واپس کردیں گے۔

نورودوولتسی: خفیہ دہشت پسند تنظیم 'نرودنایا وولیا' (خواہش عوام) کے اراکین جو ۱۸۷۹ء میں قائم ہوئی تھی ان کا خاص مقصد اعلیٰ عہدوں پر فائز افسروں کو قتل کرنا اور زار کا خاتمہ کرنا تھا کئی کوششوں کے بعد نورودوولتسی کو ۱۸۸۱ء میں الگزینڈر دوم کو قتل کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ نتیجے میں تنظیم کے پانچ افراد کو پھانسی کی سزا دی گئی۔

وولکووائے: لیفٹیننٹ وولکووائے جیل کیمپ میں اس خونخوار افسر نظم و نسق کا نام ہے جس کا تذکرہ سولنسٹین نے "ون ڈے ان دی لائف آف آئیوان ڈینی سووچ" میں کیا ہے۔

مگوب (ایم۔ او۔ او۔ پی): مخففات جن کا مطلب ہے عوامی نظم و نسق کے تحفظ کی وزارت ایم۔ وی۔ ڈی کو ۱۹۶۲ء میں یہ نام تفویض ہوا تھا لیکن ۱۹۶۸ء میں پھر پہلے والا نام (ایم۔ وی۔ ڈی) اختیار کرلیا گیا۔ مگوب کا خاص کام اپنی پیشرو اور بعد کی ایم۔ وی۔ ڈی کی طرح ہی کیمپوں اور جیلوں کا نظم و نسق سنبھالنا تھا مگر بہت سی حفاظتی تدابیر، فسادات کے انسداد سے لے کر سرحدوں کی حفاظت تک، اس کے تحت کی جاتی تھیں۔ سولنسٹین کے محولہ مکتوب کا مصنف اگر عمیق نگاہ سے دیکھیں تو انحطاط پذیر زمانے کی علامت ہے جو آئیوان ڈینی سووچ میں مذکور پہریداروں کو مگوب کے لیے کام کرنے والا ظاہر کرتا ہے: ناول کے کینوس کا ماحول ۱۹۵۱ء کا ہے جب یہ کام ایم۔ وی۔ ڈی کے سپرد تھا لیکن جیسا کہ دوسرے خط کے افسوسناک اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے ان تمام برسوں میں انتقامی کارکنان کم و بیش وہی رہا ہے۔

مکتوب نقاب پوش: نکولائی گوگول کے ڈرامے "دی انسپکٹر جنرل" (۱۸۳۶ء) کا ایک مشہور حوالہ۔

لیونٹیسٹروف (۱) : استعاریہ علامت عجیب قسم کے نسلی اسم کی طرف توجہ مبذول کرتی ہے جس کا مطلب "معذرت رساں فرجیا" ہے۔

او۔ یو۔ این : یوکرینی قوم پرست تنظیم' یہ ایک جفاکش تنظیم تھی جس نے دوسری جنگِ عظیم میں جرمنوں کے ساتھ بعض مواقع پر تعاون کیا۔ جنگ کے اختتام پر متعدد یوکرینی قوم پرست گروہ (جنھیں عام طور پر بینڈرسٹ کہا جاتا تھا) کچھ مدت تک روسی سپاہ کے ساتھ گوریلا جنگ کرتے رہے اس نوع کی مسلح مدافعت کو روس والے ہمیشہ راہزنی کا نام دیتے رہے ہیں تاکہ اس خیال کی تردید ہو کہ انھیں عوام کی کوئی بڑی حمایت حاصل تھی۔

لینن پرائز کے لیے میرے نام کی پیش کش : سولنیٹسن کے ناول "دن ڈے اِن دی لائف آف آئیوان ڈینی سووچ" کے لیے دسمبر ۱۹۶۳ء میں ادب کا لینن پرائز اُسے پیش کرنے کی تجویز رکھی گئی تھی (یہ انعام آخر میں ایک کم متنازعہ ہستی کو دے دیا گیا)

اوچاکوف گرفتار اور تاتاری پامال ہوا : گریبوڑوف کی مذاحیہ تصنیف "ووے فرام وٹ" (۱۸۲۴ء) کا حوالہ۔ ڈرامے کا منظر نامہ انیسویں صدی کی تیسری دہائی کا ہے اور یہ انداز بے حد دقیانوسی ذہنیت کا مظہر ہے۔ اوچاکوف کو روسیوں نے ۱۷۸۸ء میں پکڑا تھا اور کریمیا کے تاتار خان کی مملکت کو ۱۷۸۳ء میں اپنی حکومت میں شامل کر لیا تھا۔

پوٹمکیں ڈھانچے : مصنوعی تنظیم جو کیمپوں کی عام صورتحال کو قطعی منکشف نہیں کرتی۔ کیتھرین اعظم نے جب نئے مفتوحہ کریمیا کے علاقے کا ۱۷۸۷ء میں دورہ کیا تو اس کے مشیر کار اور منظورِ نظر گریگوری پوٹمکین نے اس علاقے کی آبادی اور دولت کو بڑھا چڑھا کر دکھانے کے لیے بہت بڑا انتظام کیا۔ دیگر باتوں کے علاوہ اس نے کیتھرین کے راستے میں کئی فرضی گاؤں آباد کر دینے کا حکم دیا ـــــ اس وقت سے "پوٹمکین گاؤں" کی اصطلاح بیرونی لوگوں کو فریب دینے کی غرض سے کی گئی جعل سازیوں کے لیے مستعمل ہے۔

"کتیا چلی مرڈگشتی کو" : روسی زبان میں ایک پیچیدہ ضرب المثل۔ اپنی تصنیف "میں گواہی دیتا ہوں" میں اناطولی' مارچینکو نے بتایا ہے کہ زیک لوگوں نے روس کے مخفف لفظ۔ ایم۔ وی۔ ڈی کو (اصلاً میکنشیا ہنوٹرینو گو پوریاڈکا ـــــ داخلی تحفظاتی شعبہ جو کیمپ کا بندوبست کرتا ہے) ایس۔ وی۔ ڈی (ظریفانہ انداز میں "سوکا وانشلا پوگلیات ـــــ کتیا چلی مرڈگشتی کو) بنا دیا ہے۔ یہاں کتیا کے معنی ہیں افسران کا معاون کار اور اسی لیے مندرجہ بالا مقولہ کی اساس یہ حقیقت ہے کہ داخلی انتظامات کے شعبوں کو عام طور پر دغا باز لوگوں اور مخبروں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔

ملیعت : "پلی!" (" پالی!") کمانڈ کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں گولی چلاؤ!

گکس : مخفف (گھوڑے سوار افواج میں کمانڈ کی تنظیم کا معیار بلند کرنے کا نصاب)

جو حشر بریسٹ قلعے کی داستان کا ہوا : پولینڈ کی سرحد کے نزدیک بریسٹ شہر پر قبل از وقت حملہ کر دیا گیا کیونکہ جرمنوں نے روس پر یلغار کی تھی۔ یہاں جرمنوں کو غیر متوقع طور پر سخت مدافعت کا سامنا کرنا پڑا اور بریسٹ کا قلعہ مقابلتاً بے حد زبردست فوج کی یلغار کے باوصف ایک ہفتے سے زیادہ مدت تک نبرد آزمائی کرتا رہا۔ اسٹالن کے بعد

دور میں جب بریسٹ کی حفاظت کے لیے نبرد آزمائی کرنے والوں کو مادرِ وطن کا غدّار تسلیم نہیں کیا جاتا تھا (جنگ میں جن لوگوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے ان سب کو از خود غدّار قرار دے دیا گیا تھا) مصنّف سرگیئی اسمرنوف کو اس واقعے سے متعلق دستاویزات اور یادداشتیں جمع کرنے کی اجازت مل گئی۔ اسمرنوف نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے اخباروں میں اپیل شائع کی اور خصوصی ریڈیو نشریے بھی جاری کیے۔ اس طرح جمع شدہ مواد "بریسٹ کی مدافعت" سے متعلق دو کتابوں میں محفوظ ہو گیا جو اسمرنوف نے چھٹی دہائی کے آخری حصّے میں شائع کی تھیں۔

میرا ناول: سولنسٹین کا "دی فرسٹ سرکل" جو اس وقت تک کہیں بھی شائع نہیں ہوا تھا۔

اس ایڈیشن کے لیے اشاریہ الکسس کلیموف نے تیار کیا ہے۔

شخصی تعارف

یہ فہرست کچھ منتخب اشخاص کی ہے قارئین کو دیگر ناموں کے لیے متعلقہ جلد اوّل اور دوم دیکھنی چاہیے۔

اکساکوف آئیوان سرگیئی ویچ : (۱۸۸۶ء–۱۸۲۳ء) سلاف پسند مضمون نگار اور مفکر۔ سلافک معاملات پر ایک تقریر کے بعد ۱۸۷۶ء میں اسکی ماسکو میں سکونت پر پابندی لگادی گئی۔

الکسیئی میخائلووچ : (۱۶۷۶–۱۶۲۹ء) ۱۶۴۵ء سے ماسکو کا زار۔

الگزینڈر اوّل : (۱۸۲۵–۱۷۷۷ء) ۱۸۰۱ء میں زار بنا۔

الگزینڈر دوم : (۱۸۸۱–۱۸۱۸ء) ۱۸۵۵ء میں زار ہوا۔ انقلابی دہشت پسندوں نے قتل کردیا۔

الگزینڈر سوم : (۱۸۹۴–۱۸۴۵ء) ۱۸۸۱ء میں زار بنا۔ اس کے دورِ حکومت میں انقلابی تحریکوں کیخلاف مہم تیز کردی گئی۔

ارکچیئیف، الکسئی آندریئیویچ : (۱۸۳۴–۱۷۶۹ء) الگزینڈر اوّل کے دَورِ حکومت میں جنرل اور وزیر دفاع، فوجی نوآبادیوں کا موجد جو فوجی کسانوں کے ذریعے سخت بند دبست کے تحت چلائی جاتی تھیں۔ اسکا نام رجعت پسندی کا مترادف بن گیا تھا۔

ارانی جانوس : (۱۸۸۲–۱۸۱۷ء) ہنگری کا شاعر ۴۹–۱۸۴۸ء کے انقلاب کا حامی۔

بینڈر داستیپان : (۱۹۵۹–۱۹۰۹ء) زنار ویوکرینی قوم پرست تحریک کا رہنما۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جرمنوں کے ساتھ تعاون کرنے کی کوشش کی لیکن اس الزام کے تحت گرفتار کرکے نظر بند کردیا گیا کہ وہ بہت ناقابلِ اعتماد اور آزاد منش ہے۔ اس کے مقلدین کو بینڈرسٹ کہتے ہیں۔

بردیائیف نکولائی الیگزینڈروویچ : (۱۹۴۸–۱۸۷۴ء) دانشور، مضمون نگار، انسانی آزادی میں نظریات کی جبری دخل اندازی کے خلاف ممتاز مجاہد۔ ۱۹۲۲ء کے بعد غیر ممالک میں رہا۔

بیریا، لاورینتی پاولوویچ : (۱۹۵۳–۱۸۹۹ء) ۱۹۳۸ء اور ۱۹۵۳ء کے درمیان اسٹالن کی داخلی حفاظتی تنظیم کا منحوس صدر۔

بریشکو، بریشکوفسکی نکولائی نکولائیویچ : (۱۹۴۳–۱۸۷۴ء) ادنیٰ درجے کے درجنوں چار آنے والے ناولوں کا مصنف جو غیر ملک میں مقیم تھا۔

بلگاکوف، میخائل افاناسیویچ : (۱۹۴۰–۱۸۹۱ء) ڈراما نگار، نثار

برلشیٹ ولادیمیر لفوویچ : (۱۹۴۲–۱۸۶۲ء) عوام دوست انقلابی، بیسویں صدی کے آغاز میں غیر ممالک میں جا بسا "بائلوئے" نام کا جریدہ نکالا تھا جس میں انقلابی تحریک کی تاریخ خاص طور پر زیر بحث آتی تھی۔ ۱۹۱۷ء میں روس پلٹ آیا لیکن خانہ جنگی کے زمانے میں پھر غیر ممالک کو چلا گیا۔

کیتھرین دوم: (۱۷۲۹-۱۷۹۶ء) ۱۷۶۲ء میں ملکہ بنی۔

چانگ تسولن: (۱۸۷۳-۱۹۲۸ء) بااثر چینی فوجی رہنما۔ ۱۹۱۱ء میں منچوریا کا گورنر کئی مرتبہ پکنگ پر قبضہ کیا۔

چیخوف انیتون پاؤلووچ: (۱۸۶۰-۱۹۰۴ء) ممتاز نثر نگار اور روس کا عظیم ڈراما نویس۔ ۱۸۹۰ء میں اس نے سخالن جزیرے میں سزا یافتہ لوگوں کی بستی دیکھنے کے لیے وہاں کی سیاحت کی اس نے اپنے تاثرات پر مشتمل ایک کتاب ۱۸۹۵ء میں شائع کی۔

کوٹ پیرے: (۱۸۹۵ء.....) ترقی پسند فرانسیسی سیاسی قائد۔ عالمی امن کونسل کا رکن۔

ڈینکن، انیتون آئیوانووچ: (۱۸۷۲-۱۹۴۷ء) روسی سپہ سالار جو ۱۹۱۸-۱۹ء میں خانہ جنگی کے ایام میں مغربی روس میں بولشویک مخالف افواج کا کمانڈر رہا۔

دمیتری تسارے وچ: (۱۵۸۲-۱۵۹۱ء) ادگلیچ کا شہزادہ۔ ہولناک آئیوان کا بیٹا۔ اسکی موت اتفاقی حادثے کے تحت ہوئی یا کسی سازش کا نتیجہ تھی اس ضمن میں مورخین میں اختلافات ہیں۔

ڈولگوروکی، یوری: (۱۰۹۰-۱۱۵۷ء) روسی شہزادہ جو ۱۱۴۷ء میں ماسکو کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

ڈوروشیوچ، ولاس میخائلووچ: (۱۸۶۴-۱۹۲۲ء) خانہ جنگی کے دوران سفید روسی افواج کا رہنما۔ نومبر دسمبر ۱۹۱۷ء میں اورنبرگ علاقے میں ایک قازق بغاوت کی قیادت کی۔

ڈیاکوف، بورس الگزینڈروچ: (۱۹۰۲ء.....) سوویٹ قلم کار۔ ۱۹۴۹ء میں گرفتار رہا۔ ساتویں دہائی میں جیل کیمپ کی یادداشتوں پر مشتمل دو کتابیں قلمبند کیں جن میں اس نے پارٹی پر اپنے بے پناہ اعتماد کا اظہار کیا۔

ڈزرژنسکی، فلیکس ایڈمنڈووچ: (۱۸۷۷-۱۹۲۶ء) پہلی سوویٹ داخلی تحفظ کی ایجنسی چیکا کا تشکیل دینے والا اور سربراہ۔ مرنے سے پہلے تک بعدازاں قائم کردہ حفاظتی ایجنسیوں جی۔ پی۔ یو اور او۔ جی۔ پی۔ یو کا صدر بھی رہا۔

اہرنبرگ۔ ایلیا گریگوریوچ: (۱۸۹۱-۱۹۶۷ء) شاعر، نثر نگار اور صحافی۔ پارٹی کے نظریات کی تبدیلی کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کر لینے کے لیے شہرت یافتہ۔ دوسری جنگ عظیم کی سوویٹ امن کی مہمات میں خاص کردار ادا کیا۔

الیزبتھ اول (الیزاویتا پیترووینا): (۱۷۰۹-۱۷۶۲ء) پیٹر اعظم کی بیٹی۔ ۱۷۴۱ء میں ملکہ بنی۔

الیسبرگ، یعقوب یرفیمووچ: (۱۹۰۱ء.....) نقاد اور ادبی مورخ۔ پارٹی کی بیسویں کانگرس کے بعد یہ الزام عائد کیا گیا کہ اس نے بہت سے مصنفین کے خلاف شکایتیں درج کرائیں اور ان کی گرفتاری کا موجب ہوا۔ انجمن مصنفین سے اخراج کا خدشہ ہونے پر ایک مراسلہ اپنی مدافعت میں لکھا جس میں اس نے وضاحت کی کہ وہ بھی "پارٹی کے ساتھ غلط فہمی کا شکار" تھا۔

فرونزے میخائل واسیلیوچ: (۱۸۸۵-۱۹۲۵ء) فوجی اور سیاسی رہنما۔ ٹراٹسکی کے بعد فوجی امور کا کیسار مقرر کیا گیا۔

گیلنسکوف، یوری تیموفئیوچ: (۱۹۳۹-۱۹۷۲ء) متنازعہ شاعر، رسالہ "سانہ دات" کا مدیر "سوویٹ مخالف" سرگرمیوں کے لیے گرفتار کیا گیا۔ جیل میں وفات پائی۔

گنسبرگ، الگزینڈر ایلیچ: (۱۹۳۷ء.....) متنازعہ فیہ سینیافسکی ڈانیل مقدمے پر مشتمل قرطاس ابیض تیار کیا۔ ۱۹۶۸ء میں گیلنسکوف کے ساتھ ملزم تھا۔ سیاسی قیدیوں کے خاندانوں کی معاونت کرنے پر ۱۹۷۷ء میں دوبارہ گرفتار ہوا۔

گوربا ٹوف، الگزینڈر واسیلیئویچ: (۱۸۹۱ء.....) ایک سپہ سالار جو ۱۹۲۹ء میں گرفتار کیا گیا تھا اور کولیما میں جلاوطن ہوا تھا۔
۱۹۴۱ء میں رہائی ملی۔ کیمپوں سے متعلق سرکاری پالیسی کے مطابق یادداشتوں کا مصنف۔

گریبوئیڈوف، الگزینڈر سرگئیویچ: (۱۷۹۵-۱۸۲۹ء) مصنف۔ سیاسی نظموں میں اس کی عظیم تصنیف "وہوم فراہم وٹ" (۱۸۲۴ء) میں وسیع النظر خیالات رکھنے والے اصول پسند اشراف کا تصادم ماسکو کے راسخ العقیدہ سماج کے ایک نمائندے سے ہوتا ہے۔

گملیوف، نکولائی اسٹیپانووچ: (۱۸۸۲-۱۹۲۱ء) اکمیئسٹ نظریات کا ممتاز شاعر جسے بالشویکوں نے رجعت پسندانہ سرگرمیوں کا الزام عائد کر کے پھانسی دے دی تھی۔

ہرزن، الگزینڈر آئیوانووچ: (۱۸۱۲-۱۸۷۰ء) لبرل اشتراکی مصنف اور صحافی، ۱۸۴۷ء کے بعد غیر ممالک میں رہا اور بااثر مہاجر جریدے "کولوکل" (جرس) کا اجراء کیا۔ ہرزن نے روسی توسیع پسندی کے خلاف پولینڈ والوں کی ۱۸۶۳ء کی بغاوت کی حمایت کی تھی۔

الیچیف، لیونڈ فیوڈوروویچ: (۱۹۰۶ء.....) کمیونسٹ قائد۔ مرکزی کمیٹی کا رکن ۱۹۶۱-۶۶ء۔ نکیتا خروشچیف کے عہد میں نظریاتی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے متعین کیا گیا تھا۔

اسکوفسکی، میخائل وگسیلیوچ: (۱۹۰۰ء.....) سوویٹ دیہی شاعر۔

آئیوان چہارم (ہولناک آئیوان): (۱۵۳۰-۱۵۸۴ء) ۱۵۴۷ء روس کا پہلا زار رہا۔

جوکیلسن (آئیوکیلسن)، ولاڈیمیر ایلیچ: (۱۸۵۵-۱۹۴۳ء) "خواہشِ عوام" دہشت پسند تحریک کا ایک مجاہد ۱۸۸۸ء میں کولیما کو جلاوطن ہوا۔ ماہر نسلیات ۱۹۲۲ء کے بعد امریکہ میں سکونت پذیر رہا۔

کالیڈن، الکسی میکسموویچ: (۱۸۶۱-۱۹۱۸ء) زار کی فوج کا جنرل۔ علاقہ ڈان میں ایک وہائٹ روسی بغاوت کی رہنمائی کی۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء تا فروری ۱۹۱۸ء خودکشی کر لی۔

کلیائیف آئیوان پلیٹینووچ: (۱۸۷۷-۱۹۰۵ء) اشتراکی انقلابی جماعت کا رکن۔ ۱۹۰۴ء میں پلہیف کے قتل کی سازش میں شامل تھا۔ ۴ فروری ۱۹۰۵ء کو اس نے ماسکو کے گورنر پر بم پھینکا تھا اور اسے ہلاک کر دیا تھا۔

کامو (ٹیر پیٹروسیان، سیمیون ارکاکوویچ) (۱۸۸۲-۱۹۲۲ء) جارجیا کا بالشویک اور اسٹالن کا دوست۔ دونوں نے مل کر کامیابی کے ساتھ کئی بڑی ڈکیتیاں کرائی تھیں۔

کاراوانسکی، سلواٹوسلوف: (۱۹۲۰ء.....) یوکرینی متنازعہ شخص۔ ۲۵ سال سے زائد جیلوں اور کیمپوں میں رہا۔

کاربینکو کاری (ٹولیبووچ آئیوان کارپووچ): (۱۸۴۵-۱۹۰۷ء) یوکرینی ڈراما نویس اور اداکار۔

کاربھٹ، ییفٹنی پافلوویچ: (۱۸۵۷-۱۹۲۶ء) ڈراما نویس اور تھیئٹر کا ہدایت کار۔ پاپولسٹ (عوام دوست) تحریک میں شامل ہوا۔

کارساقنا، تمارا پلیٹنوفنا: (۱۸۸۵ء.....) ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۹ء تک سرگی ڈیاگلیف کے بیلے پروگرام کی ممتاز رقاصہ۔ انقلاب کے بعد وہ لندن میں بس گئی اور بیلے کی تربیت دینے لگی۔

کساٹکن، آئیوان سیناٹوویچ: (۱۸۸۰-۱۹۳۰ء) مصنف اور لینڈ اسکیپ پینٹر، سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا رکن۔ انقلاب کے دوران یتیم ہونے والوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ جو کچھ دہائی کے دوران سرکاری اشاعتی ادارے میں ملازم رہا۔ اسٹالن کی صفائی مہم کا شکار ہوا۔

کوٹسکی، کارل: (۱۸۵۴-۱۹۳۸ء) جرمن سوشل ڈیموکریٹ، سیکنڈ انٹرنیشنل کا قائد "نیوزیٹ" کا مدیر اـــــ
(۱۸۸۳-۱۹۱۷ء)

خلتورین، اسٹیپن نکولائیوچ: (۱۸۵۶-۱۸۸۲ء) روسی انقلابی، اس نے فروری ۱۸۸۰ء میں سرمائی محل پر بم پھینکا تھا۔

کیریلوف، ولاڈیمیر ٹموفیئیوچ: (۱۸۹۰-۱۹۴۳ء) ایک بحری کارکن، اس نے ۱۹۰۵ء کے انقلاب میں حصہ لیا تھا اور اسے جلاوطن کر دیا گیا تھا ایک ممتاز پرولتاری شاعر بن گیا۔ اسٹالن کی پارٹی میں صفائی کا شکار رہا۔

کرچیٹومت ولسفولوڈ انیسیوویچ: (۱۹۱۲-۱۹۷۳ء) اشتراکی حقیقت پسندانہ اسلوب تحریر کا نمائندہ کئی ناولوں کا مصنف ہے۔

کون، فیلکس یعقوبلیوچ: (۱۸۶۴-۱۹۴۱ء) پولینڈ کا انقلابی بعدازاں بولشویک۔ انقلاب اکتوبر کے بعد سوویٹ یونین میں سکونت اختیار کر لی۔ تیسری انٹرنیشنل کا رکن تھا۔

کوپلیف، لیوزینوفیوچ: (۱۹۱۲ء......) جرمن دانشور، سولنٹسین کا رفیق "زنداں" یادداشتوں کا مصنف۔

کورنیچک، الگزینڈر یفیمووچ: (۱۹۰۵-۱۹۷۲ء) روسی۔ یوکرینی ڈراما نویس اور اعلیٰ سرکاری افسر، انجمن مصنفین اور امن تحریک کا ڈائریکٹر، مرکزی کمیٹی کا رکن، یوکرینی سوویٹ اشتراکی جمہوریہ کا سپریم سوویٹ کا رکن، پانچ بار اسٹالن پرائز حاصل کیے۔

کوزلوف، کاریووچ: (۱۹۰۸-۱۹۶۵ء) کمیونسٹ لیڈر، صدارتی بورڈ کا رکن ۱۹۵۷-۱۹۶۴ء لینن گراڈ کی پارٹی میں صفائی مہم کے بعد شہری کمیٹی کا سکریٹری تھا۔

کراسن لیونڈ بورسیووچ: (۱۸۷۰-۱۹۲۶ء) انجینئر اور بالکل ابتدائی بولشویکوں میں سے ایک، سوویٹ روس کا پہلا فرانسیسی سفیر ۱۹۲۵ء

کراسنوف، پیوٹر نکولائیوچ: (۱۸۶۹-۱۹۴۷ء) خانہ جنگی کے زمانے میں سفید روسی افواج کا قائد۔ ۱۹۴۵-۱۹۴۴ء میں ایک قازق یونٹ کا رہنما تھا جو بولشویکوں سے برسرِ پیکار تھا ہوئی تھی انگریزوں نے اسے اسٹالن کے سپرد کر دیا اور پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

کراوچینکو، وکٹر آنڈریوچ: (۱۹۰۵-۱۹۶۶ء) اعلیٰ سوویٹ عہدیدار جو ۱۹۴۴ء میں مغرب کو فرار ہو گیا۔ "آئی چوز فریڈم" (میں آزادی منتخب کرتا ہوں ۱۹۴۶ء) شائع کی جو اسٹالن جرائم کا کچا چٹھا پیش کرتی ہے۔ جب فرانسیسی کمیونسٹ اخبارات نے یہ لکھا کہ اس کی روداد فرضی ہے تو اس نے ان کے ڈائرکٹروں پر مقدمہ دائر کر دیا۔

کروپسکایا، نادیزدا کونسٹنٹینوفا: (۱۸۶۹-۱۹۳۹ء) لینن کی اہلیہ اور رفیق کار۔

کرزیزانوفسکی، گلیب میکسمیلیانوویچ: (۱۸۷۲-۱۹۵۹ء) ۱۹۱۷ء سے قبل انقلابی تحریک میں لینن کا ایک خاص رفیق کار، بعدازاں بجلی لگانے اور طاقت کے وسائل کی توسیع میں ایک اہم منصب پر فائز رہا۔ ۱۸۹۷-۱۹۰۰ء کا زمانہ سائبیریا کی جلاوطنی میں بسر کیا۔

کروچکن واسیلی اسٹیپانوویچ: (۱۸۳۱-۱۸۷۵ء) طنز نگار شاعر اور صحافی۔

لاوروف، پیوٹر لاوروویچ: (۱۸۲۳-۱۹۰۰ء) انقلابی، اس کے "ہسٹوریکل لیٹرز" (تاریخی مکاتیب ۱۸۶۸-۱۸۶۹ء) پاپولسٹ (عوام دوست) تحریک کی فلسفیانہ اساس تھے۔

لیرمونتوف، میخائل یوریویچ: (۱۸۱۴-۱۸۴۱ء) ممتاز روسی شاعر اور ناول نگار۔ کاکیشین جلاوطنی کے ایام میں مبارزتی جنگ میں کام آیا۔

لیسیوچکی نکولائی واسیلیوچ: (۱۹۰۰ء......) سوفیشل پبلشنگ اشاعتی ادارے کا منتظم اعلیٰ چوتھی دہائی کے اواخر میں کئی مصنفین کی شکایت کرنے کا الزام اسکے سر تھا جن کی بنا پر وہ حراست میں لیے گئے تھے۔

میکڈونالڈ جیمس ریمسے: (۱۸۶۶-۱۹۳۷ء) انگلینڈ کو مزدور رہنما، وزیراعظم ۱۹۲۹-۱۹۲۴ء - ۱۹۳۵ء میں سوویٹ یونین کے ساتھ کئی معاملات میں ملوث تھا۔

مالنکوف، میکسیملین ژوویچ: (۱۹۰۲ء......) اسٹالن کا سکریٹری بعدازاں ۱۹۵۳ء میں حکومت کے صدر کی حیثیت سے اسکا وارث - ۱۹۵۷ء میں سیاسی زندگی سے ہٹا دیا گیا۔

مینڈلیسٹم نادیژدا یفوفینا: (۱۸۹۹ء......) شاعر اوزپ مینڈلیسٹم کی بیوہ، شاعر کی وفات ۱۹۳۸ء کے قریب عارضی کیمپ میں ہوگئی تھی۔ ان یادداشتوں کی مصنفہ جنہیں روس کی بیسویں صدی کی فکری تاریخ کو سمجھنے کے لیے پڑھنا اشد ضروری ہے۔

مارچینکو، اناطولی تخونوویچ: (۱۹۳۸ء......) ۶۷-۱۹۶۰ء کی مدت جیل میں بسر کی ان تجربات کا اظہار "مائی ٹیسٹیمنی" (میں گواہی دیتا ہوں) میں کیا بعدازاں کئی بار گرفتار رہا۔

ماسلینکوف، آئیوان آئیوانوویچ: (۱۹۰۰-۱۹۵۴ء) جنرل - دوسری عالمی جنگ میں اتحادی افواج کا کمانڈر - قبل از جنگ اور بعد از جنگ جی۔ پی۔ یو، این۔ کے۔ وی۔ ڈی اور ایم۔ وی ڈی سے متعلق رہا۔

مایاکوفسکی، ولادیمیر ولادیمیرووچ: (۱۸۹۳-۱۹۳۰ء) "انقلاب روس کی شاعر" کہلاتا ہے۔ خودکشی کرلی۔

میئرہولڈ، وسیوولوڈ ایمیلیوچ: (۱۸۷۴ تا ۱۹۴۲ء) اداکار۔ آوار گارڈ قاعدہ اسٹالن کی پارٹی کی صفائی مہم نابود ہوگیا۔

میخائلوفسکی، نکولائی کونسٹنٹینوویچ: (۱۸۴۲-۱۹۰۴ء) رجائیت پسند فلسفی ادبی نقاد اور مصلح۔ پاپولسٹ تحریک کے خاص نظریات کا خالق۔

مکویان، انستاس آئیوانوویچ: (۱۸۹۵ء......) بولشویک پولٹ بیورو کا ممبر ۱۹۳۵ء تا ۱۹۶۶ء اسٹالن کا قریبی رفیق کار خارجہ پالیسی میں خروشچیف کا مشیر کار۔ "دشوار حالات" کا ماہر۔ ۱۹۵۶ء کی بغاوت کے وقت بڈاپسٹ روانہ کیا گیا تھا۔ سوویٹ میزائلوں کی واپسی کے بعد کیوبا بھیجا گیا تھا۔

موکروسوف، بورس آندریئیوچ: (۱۹۰۹ء......) موسیقار، نغمہ نگار۔ اسٹالن پرائز یافتہ۔

ناڈیژڈن، نکولائی آئیوانوویچ: (۱۸۰۴-۱۸۵۶ء) مضمون نگار اور ادبی مبصر۔ ماسکو یونیورسٹی میں پروفیسر ۳۶-۱۸۳۰ء جلاوطن۔

نکولس اول، (۱۷۹۶-۱۸۵۵ء) ۱۸۲۵ء میں زار بنا، دسمبریوں کا زور کم کیا۔ لبرل تصورات سے متنفر تھا۔

نکولس دوم: (۱۸۶۸-۱۹۱۸ء) ۱۸۹۴ء تا ۱۹۱۸ء زار رہا۔ بولشویکوں نے اسے خاندان سمیت گولی سے اڑا دیا۔

نوگن، وکٹر پاولووچ: (۱۸۷۰-۱۹۲۴ء) بولشویک، کئی بار گرفتار ہوا۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے بعد تجارت و صنعت کا عوامی کیار مقرر ہوا۔

اوسٹروفسکی، الگزینڈر نکولائیوچ: (۱۸۲۳-۱۸۸۶ء) ممتاز روسی ڈراما نگار۔

پانن، ڈمیٹری: (۱۹۱۱ء......) انجینیر، سولزنٹسین کا رفیق۔ یادداشتیں قلمبند کی ہیں آجکل فرانس میں مقیم ہیں۔

پروس، پارویس (ہیلفنڈ) الگزینڈر عزرائیلوویچ: (۱۸۶۷-۱۹۲۴ء) انقلاب ۱۹۰۵ء میں سینٹ پیٹرسبرگ سوویٹ کا باعمل رکن۔ تین سال کی جلاوطنی کی سزا ہوئی، غیر ملک کو فرار ہوگیا اس نے بے پناہ دولت

جمع کی اور بولشویک تحریک کی مالی معاونت کی۔

پٹلیورا، سائمن واسیلووچ: (۱۸۷۹ء-۱۹۲۶ء) یوکرینی قوم پرست لیڈر (۱۹۱۸-۲۰ء) اس کے مقلدین پٹلیورووائٹ کہلاتے ہیں۔

پیٹوفری، سینڈور: (۱۸۲۳-۱۸۴۹ء) ہنگری کا شاعر سیگیسوار کی جنگ میں کام آیا۔

پسارلیف، ڈمیری آئیوانووچ: (۱۸۴۰-۱۸۶۸ء) انتہا پسند ادبی نقاد "فن برائے فن" کا شدید مخالف پیٹر اور پول قلعے میں چار سال مقید رہا۔

پلاٹوف، ماٹوے آئیوانووچ: (۱۷۵۱-۱۸۱۸ء) ڈان کے قازقوں کا رہنما۔ ۱۸۱۲ء کی جنگ کا جانباز ہیرو۔ نووچرکاسک میں دفن ہوا۔

پلیہو، ویاچیسلاف کونسٹنٹووچ: (۱۸۴۶-۱۹۰۴ء) ۱۹۰۲ء سے وزیر داخلہ قتل کیا گیا۔

پوڈبیفسکی، واڈم نکولائیوچ: (۱۸۸۷-۱۹۲۰ء) بولشویک ۱۹۲۰ء میں محکمۂ ڈاک کا کمیسار۔

پشکن، الگزینڈر سرگئیوچ: (۱۷۹۹-۱۸۳۷ء) عظیم روسی شاعر ۲۶-۱۸۲۰ء تک جلاوطن رہا (اولڈ یسا - مولڈیویا میخائلوفسکوے)

ریڈیشچیف، الگزینڈر نکولائیووچ: (۱۷۴۹-۱۸۰۲ء) روسی سردار اور مصنف اپنی تصنیف "اے جرنی فرام سینٹ پیٹرسبرگ ٹو ماسکو" (پیٹرسبرگ سے ماسکو تک ایک سفر۔ ۱۷۹۰ء) میں روس میں زرعی غلاموں پر مالکانہ حقوق کے رواج کی مخالفت کرنے کی وجہ سے سائبیریا میں جلاوطن رہا۔

روڈینکو، رزمن آندریئیوچ: (۱۹۰۷ء-....) نوریمبرگ میں سوویٹ یونین کا سرکاری وکیل ۴۶-۱۹۴۵ء۔ سوویٹ یونین کا اٹارنی جنرل ۱۹۵۳ء سے۔

سازونوف، آئیگر ایس: (۱۸۷۹-۱۹۱۰ء) اشتراکی انقلابی۔ پلیہو کے قاتلوں میں سے ایک۔

سیاشکو، نکولائی الگزینڈرووچ: (۱۸۷۴-۱۹۴۹ء) سوشل ڈیموکریٹ، بعد ازاں بولشویک۔ ۱۹۰۵ء میں غیر ممالک کو چلا گیا۔ فروری ۱۹۱۷ء کے بعد روس لوٹا صحت کا کمیسار ۱۹۳۰-۱۹۱۸ء میڈیسین کا پروفیسر۔

سیمیونوف، ٹیان شانسکی پیوٹر پیٹرووچ: (۱۸۲۷-۱۹۱۴ء) مشہور مہم جو اور جغرافیہ داں روس کا انیس جلدوں پر مشتمل جغرافیہ اسکی کلاسیکی تصنیف ہے۔

شالاموف۔ ورلم ٹخونووچ: (۱۹۱۷ء......) مصنف، سترہ برس تک کولیما کیمپوں میں رہا اس کی تصنیف "کولیما اسٹوریز" (پیرس ۱۹۶۹ء) اور "اسیز آن دی کریمنل ورلڈ"۔

شئینن، لیوروما نووچ: (۱۹۰۵-۱۹۶۷ء) سوویٹ مصنف اور سرکاری وکیل۔ پارٹی کی صفائی مہم کے ایام میں تفتیش کنندہ کی حیثیت سے کام کیا۔ جاسوسی فکشن کا مصنف مثلاً "دی ملٹری سیکریٹ"۔ شئینن نے "نوٹس آف این انوسٹیگیٹر" (۱۹۳۸ء) میں اپنے فرائض کے کچھ پہلوؤں کی جانب اشارہ کیا ہے۔

شیفچنکو، طارس گریگوریئیوچ: (۱۸۱۴-۱۸۶۱ء) سب سے عظیم یوکرینی شاعر۔ قوم پرستانہ کارناموں کے لیے دس برس جلاوطنی میں بسر کیے۔

شوستاکووچ، دامیتری ڈمیتریوچ: (۱۹۰۶-۱۹۷۵ء) موسیقار، متعدد مواقع پر اپنی قدامت پرستی کی وجہ سے ہدف تنقید بنے

اسکوروپاڈسکی، پاویل پیڑووچ: (۱۹۴۵-۱۸۷۳ء) زار کی سپاہ کا جنرل۔ یوکرینی رہنما۔ اپریل۔ دسمبر ۱۹۱۸ء جرمنوں نے امداد کی۔ ہجرت کر گیا۔

سولوفیوف، الگزینڈر کونسٹنٹینووچ: (۱۸۷۹-۱۸۴۶ء) انقلابی۔ ۱۸۷۹ء میں الگزینڈر دوم کے قتل کی ناکام کوشش کی۔ پھانسی دے دی گئی۔

اسپریڈونوفا، ماریا الگزینڈروفنا: (۱۹۴۱-۱۸۸۴ء) تامبوف میں پیدا ہوئی۔ ۱۹۰۶ء میں ایک کسان بغاوت کرنیوالے پولس چیف کو گولی مارنے کے جرم میں قید کی سزا ہوئی۔ ۱۹۱۷ء میں وہ اشتراکی انقلابیوں کے لیباری بازو کی رہنما بن گئی۔ ایک سوویٹ کیمپ میں وفات پائی۔

اسٹاروسیلسکی، ولاڈیمیر الگزینڈرووچ: (۱۹۱۶-۱۸۶۰ء) زرعی ماہر اقتصادیات۔ صوبہ کتیئی (جارجیا) کا گورنر (۱۹۰۷-۱۹۰۵ء) انقلابیوں کی مدد کی بعد ازاں بولشویک بن گیا۔

اسٹراخووچ، کونسٹینٹن آئیوانووچ: روسی سائنسداں ہوائی رفتار کا ماہر۔ گلاگ مجمع الجزائر کی ترتیب سولنسٹین کو معلومات فراہم کرنے والا۔

سرکوف، الکسئی الگزینڈرووچ: (۱۸۹۹ء .....) سوویٹ شاعر، کئی اسٹالن پرائزوں کا مستحق گردانا گیا۔ عالمی امن کونسل کا رکن۔ انجمن مصنفین کا ایک ڈائرکٹر۔

سفورن، الکسئی سرنوئیوچ: (۱۹۱۲-۱۸۴۳ء) جہاندیدہ صحافی اور مبلغ، ادبی مفکر اسٹیج ڈائرکٹر۔

سفوروف، الگزینڈر واسیلئیوچ: (۱۸۰۰ء-۱۷۳۰ء) ممتاز روسی فوجی کمانڈر۔ اٹھارویں صدی کے اختتام پر روسی افواج کو اس کی رہنمائی میں ترک اور فرانسیسی افواج کے مقابلے میں کئی فتوحات حاصل ہوئیں۔

ٹان، بوگوراز ولاڈیمیر جرمنوویچ: (۱۹۳۶-۱۸۶۵ء) "خواہش عوام" دہشت پسند تحریک میں حصہ لینے کے جرم میں انیسویں صدی کے اواخر میں کولیما میں جلا وطن کیا گیا۔ ماہر نسلیات و لسانیات عوامی ادب کا تدوین کار۔ شمالی سائبیریا کے معاملات کا ماہر۔

ٹیلیکیلیان، ورکینس اروشیونووچ: (۱۹۶۷-۱۹۰۲ء) پارٹی کا ممبر، ایک ٹکسال بل کا ڈائرکٹر، مصنف، اس کے ناول "گریناٹس از ناٹ میلٹ" (پتھر پگھلتا نہیں) میں چیکسٹوں کی مدح سرائی ہے۔

ٹخونوف، نکولائی سیمیونووچ: (۱۸۹۶ء .....) سوویٹ شاعر اور نثر نگار۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سوویٹ امن کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے اس نے متعدد بار غیر ممالک کا سفر کیا۔

ٹالسٹائی، الکسئی نکولائیوچ: (۱۹۴۵-۱۸۸۲ء) ناول نگار قبل از انقلاب بھی مشہور۔ انقلاب کے بعد ہجرت کر گیا ۱۹۲۳ء میں سوویٹ یونین لوٹا۔ کئی بار اسٹالن پرائز حاصل کیے۔

ترگنیف، آئیوان سرگئیوچ: (۱۸۸۳-۱۸۱۸ء) ممتاز روسی ناول نگار۔ گوگول پر ایک تعزیتی مقالہ لکھنے کی وجہ سے سنسر نے اس پر پابندی عائد کر دی تھی ۱۸۵۲ء میں جلاوطن کر کے اپنی زمینداری پر بھیج دیا گیا۔

ٹواردوفسکی، الگزینڈر ٹرفیمووچ: (۱۹۷۱-۱۹۱۰ء) شاعر اور صحافی ۱۹۵۸ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان نووی میر کا مدیر اعلیٰ۔ یہ اپنے وقت کا سب سے موثر اور سب سے زیادہ لبرل سوویٹ ادبی ماہنامہ تھا۔ ٹواردوفسکی

کی حمایت کی وجہ سے سولنسٹین کی تخلیق "ون ڈے ان دی لائف آف آئیوان ڈینی سووچ" سوویٹ یونین میں شائع ہو سکی اور یہ ناول سب سے پہلے "نو نی میر" کے صفحات پر شائع ہوا۔

ولاسوف، اندریئی آندریئیویچ: (۱۹۴۶ـ..۱۹ء) سوویٹ سپاہ کا جنرل۔ ۱۹۴۲ء میں جرمنوں کے ہاتھ گرفتار ہوا۔ ایام جنگ میں روسی کمیونسٹ مخالف تحریک کے ساتھ اپنا نام شامل کرنے پر رضامند ہو گیا۔ ۱۹۴۵ء میں امریکی افواج کے سامنے خود سپردگی کی۔ سوویٹ افسران کے سپرد کر دیا گیا اور گولی کا نشانہ بنا۔

یرمک تموفیئیویچ: (۱۵۸۵ء ....؟) قازق رہنما۔ مشرقی سائبیریا کا فاتح (۱۵۸۲ـ۱۵۸۱ء)۔

سیفلیمیشنکو، ییوزینی الگزینڈرووچ: (۱۹۳۳ء .....) "کشادگی" کا شاعر کبھی قدامت پسند اور کبھی صاف گو۔

زکوفسکی، واسیلی آندریئیویچ: (۱۸۵۲ـ۱۷۸۳ء) شاعر جو بعد میں الگزینڈر دوم کا اتالیق بنا۔ اس نے دربار کے ساتھ اپنے تعلق کی بناء پر پشکن کی متعدد بار معاونت کی۔

فٹ نوٹ

پہلا باب

۱ چیخوف نے ہمیں مطلع کیا ہے کہ عہد زار کے کٹورگا میں یہ پیچیدگی بہت کم ہوتی تھی۔ الیگزنڈر فسکایا (سخالن) کی جیل میں کٹورزانے دن اور رات میں کسی بھی وقت آنگن تک تو نکل ہی سکتے تھے یا بیت الخلاء تک تو جا ہی سکتے تھے (وہاں فضلے کی بالٹیاں قطعی مستعمل نہ تھیں) وہ دن کے کسی بھی وقت شہر جا سکتے تھے۔ اس طرح اسٹالن لفظ کٹورگا کا صحیح مفہوم — ایسی کشتی جس میں ملاح زنجیر کے ذریعے پتوار سے بندھا ہوتا تھا — سمجھنے والا اولین شخص تھا۔ ص ۹ س ۵

۲ چیخوف کے زمانے میں سخالن میں قیدیوں کی تعداد ۵۹۰۵ تھی۔ ان سب کے لیے حروف تہجی کے چھ حرف کافی ہوتے تھے۔ ایکیو سٹوز بھی ہمارے علم کے مطابق اتنا ہی وسیع تھا اور اسپاسک اس سے کافی بڑا تھا۔ سخالن کے نام سے دل لرزتا ہے۔ لیکن یہ کیمپوں کے سلسلے کا محض ایک کیمپ تھا۔ صرف اسٹیپلاگ میں سخالن جیسے بڑے بڑے بارہ اور اسٹیپلاگ جیسے دس کیمپ تھے۔ اب آپ اندازہ کر لیں کہ ہمارے یہاں کتنے سخالن تھے۔ ص ۱۰ س ۹

۳ سخالن میں عورتوں سے سخت مشقت کے کام نہیں لیے جاتے تھے (چیخوف) ص ۱۰ س ۱۷

۴ یہاں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ ۱۹۴۶ء کے بعد ایسے لوگوں کا از سر نو علاقائی تعین ہوا اور انھیں کٹورگا کی بیس سالہ سزا کے بدلے دس سال کی اصلاحی مشقت کی سزا سنائی گئی۔ ص ۱۳ س ۱۰

۵ انھوں نے ہمارے ساتھ تیسری دہائی کے برسوں کا تلخ پیالہ نہیں دیکھا اور کچھ فاصلے سے یورپ سے ان کے لیے یہ آسان تھا کہ عظیم روسی عوام کے عظیم حب الوطنی کے کارناموں کا تمسخر اڑائیں اور ملک میں بارہ سال تک جاری رہنے والے قتلِ عام کو نظر انداز کر دیں۔ ص ۱۶ س ۵

۶ کراشیلنکو، زاپیاٹ لیٹ (۱۹۲۲ء — ۱۹۱۸ء) صفحہ ۲۲۷۔ ص ۱۹ س ۲۰

۷ چوتھی دہائی میں ہی محنت کش طبقے کا پیٹی بورژوا میں مکمل انضمام ہو گیا اور وہ اس کا جزو غالب بن گیا۔ ص ۲۲ س ۵

۸ ملاحظہ ہو ۱۹۲۱ء میں قائم کردہ خصوصی مقاصد کے کیمپ۔ ص ۳۳ س ۲۶

دوسرا باب

۱ یوکرین قوم پرست تنظیم۔ ص ۴۲ س ۲۵

۲ جو لوگ اپنے آپ کو روسی سمجھتے ہیں اور جو خود کو یوکرینی قرار دیتے ہیں۔ ان کا اوسط یوکرین کے مختلف صوبوں میں مختلف ہے۔ جس کی وجہ سے کئی الجھنیں پیدا ہوں گے۔ ہر صوبے میں رائے عامہ کا لحاظ اور بعد ازاں علیحدہ ہونے کی خواہش رکھنے والوں کے جذبات کا احترام کر کے ان کی مدد کرنا دانش مندانہ اور لازمی عمل ہوگا اپنی موجودہ سرکاری سوویٹ سرحدوں کے اندر کا سارا یوکرین دراصل یوکرین نہیں ہے۔ بائیں ساحل کے کچھ علاقے البتہ روس کے تئیں ایک قسم کی یگانگت کا

جذبہ رکھتے ہیں۔ ص ۵۴ س ۲۷

ؔ۲ کہا جاتا ہے کہ فرانسیسی اعداد و شمار کے مطابق پہلی اور دوسری عالمگیر جنگوں کے مابین جرائم کی شرح دیگر قدیم فرقوں کے مقابلے میں مہاجرین میں کم تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد صورتحال متضاد نظر آتی تھی ـــــ تمام قدیم باشندوں میں سے روسیوں کی ـــــ فرانس میں پلنے والے سوویٹ شہریوں کے جرائم کی شرح سب سے زیادہ تھی۔ ص ۸۴ س ۳

ؔ۳ مقام افسوس ہے کہ شوستاکووچ نے اس جگہ گیت نہیں سنا وہ یا تو اس موضوع کو چھیڑتا ہی نہیں ورنہ پھر اس کی سابقہ اہمیت کی بجائے موجودہ صورتحال پر اظہار خیال کرتا۔ ص ۸۵ س ۷

تیسرا باب

لؔہ میں اسے اسی نام سے یاد کروں گا جو قیدیوں کے لیے اصلاحی مشقت کیمپ کی حیثیت رکھتا تھا اور وہ عادتاً اسے یہی نام دیتے تھے۔ اگرچہ یہ موجودہ سیاق و سباق میں درست نہیں ہے۔ یہ کیمپ کی جیل تھی نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ ص ۵۷ س ۲۳

ؔ۲ سخالن پر، دوروشیویچ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ قیدی جیل کے گورنر کی آمد پر اپنی ٹوپیاں احتراماً اتار لیتے تھے۔ لیکن ہمیں ایک معمولی وارڈر کی آمد پر ہر بار اپنی ٹوپی اتارنی پڑتی تھی۔ ص ۵۹ س ۸

ؔ۳ اسپاسک میں ۱۹۴۹ء میں دفعتاً کچھ ہو گیا فورمینوں کو ملازمین کے کمروں میں طلب کیا گیا، انھیں ڈنڈے رکھ دینے کی ہدایت کی گئی اور کہا گیا کہ مستقبل میں ان کے بغیر کام چلائیں۔ ص ۶۰ س ۹

ؔ۴ یہ ڈاکٹر کوشگوف ایک ایکسپرٹ تھا۔ جس نے کچھ ہی عرصے قبل کاٹین کمیشن کے جھوٹے نتائج پر دستخط کیے تھے (ان کا مقصد یہ تھا کہ پولس افسروں کا قتل ہم نے نہیں کیا تھا) اس کے نتیجے میں انصاف کے مقدس نظام نے اسے اس کیمپ میں تعینات کر دیا تھا۔ لیکن دنیاوی طاقتیں ایسا کیوں چاہتی تھیں؟ تاکہ وہ زیادہ بول نہ سکے۔ اوتھیلو ناکارہ ہو گیا۔ ص ۶۰ س ۱۲

ؔ۵ ۱۸۸۶ء کے ایک قانون کے مطابق کسی ایسے کام کی اجازت نہ تھی جو صحت کے لیے مضر ہو، خواہ اسے قیدی نے خود پسند کیا ہو۔ ص ۶۱ س ۱۷

ؔ۶ قارئین کو یہ بتا کر جلد مطمئن کر دینا ضروری ہے کہ یہ سب چیپٹ، مشن اور لوروبیوت نیز وانڈر نوفگورود کے نہال بار آور ہو رہے ہیں۔ چیپٹ کا راگنڈا میں جنرل کے عہدے سے سبکدوش ہوا۔ ان میں سے کسی پر بھی مقدمہ نہیں چلایا گیا نہ کبھی چلایا جائے گا اور ان پر مقدمہ کس الزام کے تحت چلایا جا سکتا تھا؟ وہ تو محض احکامات کی تعمیل کر رہے تھے۔ ان کا موازنہ ان نازیوں سے نہیں کیا جا سکتا جو صرف احکامات کی تعمیل کر رہے تھے۔ اگر انھوں نے کسی حالت میں احکامات سے آگے جا کر بھی کام کیا ہو تو اس کا سبب ان کے نظریات کی پاکیزگی تھی اور ان کی نیت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں معلوم ہی نہ تھا کہ بیریا بھی، جو عظیم اسٹالن کا دستِ راست تھا، بین الاقوامی سامراجیت کا ایجنٹ تھا۔ ص ۶۴ س ۶

(چوتھا باب)

۱۔ برسبیل تذکرہ، کاراکوزوف کا ایک بھائی تھا، اس شخص کا بھائی جس نے زار کو گولی سے مارنے کی کوشش کی تھی! اُسے کیا سزا ملی؟ اُسے حکم دیا گیا کہ وہ اپنا نام تبدیل کر کے ولادیمیروف رکھ لے۔ نہ اُسے حق ملکیت سے محروم کیا گیا نہ اُس پر جائے رہائش سے متعلق کوئی پابندی عائد کی گئی۔ ص ۷۹ س ۱۹

۲۔ یوٹا لسٹائی روی وو سپومینا نیاف سو فریمینیکوف (یوٹا لسٹائی کے بارے میں اس کے ہمعصروں کی یادداشتیں) جلد ۱ ۱۹۵۵ء ص ۱۸۰ ص ۷۹ س ۲۳

۳۔ تحقیقات کے دوران یہ بھی ثابت ہو گیا کہ آنا اولیانوف کو ویلنا سے روانہ کردہ ایک خفیہ تار ملا: "بہن سخت بیمار ہے" جس کا مطلب تھا "اسلحہ راستے میں ہے" آنا کو کوئی حیرت نہیں ہوئی ہرچند کہ ویلنا میں اُس کی کوئی بہن نہیں تھی اس نے یہ تار کسی سبب سے الگزینڈر کو پہنچا دیا ظاہر تھا کہ وہ اُس کی ساتھی تھی ہمارے زمانے میں اُسے کم از کم دس سال کی سزا ملتی لیکن آنا سے اس کی جواب طلبی تک نہیں کی گئی اسی معاملے سے ثابت ہو گیا تھا کہ ایک اور آنا (زخیدورکونا) کو بھی جو پیکا ٹیرینڈور میں استانی تھی، زار کے قتل کی منصوبہ بندی سازش کی براہِ راست اطلاع تھی اور وہ خاموش رہی ہمارے عہد میں اس کا کیا حشر ہوتا؟ اُسے گولی مار دی جاتی اور اُنہوں نے اسے کیا سزا دی.... دو سال .... ص ۸۰ س ۲۴

۴۔ سخالن میں سیاسی قیدی تھے لیکن کوئی بھی قابلِ ذکر بولشویک (یا مینشویک) وہاں کبھی نہیں رہا۔ ص ۸۱ س ۴

۵۔ ذرا تصور کیجیے کہ کیا بوشیوایا انسائیکلوپیڈیا بیر دیائیف سے متعلق کسی مہاجر کا مقالہ شائع کر سکتا ہے۔ ص ۸۳ س ۱۰

۶۔ انقلاب فروری میں اُسے رہا کر دیا گیا لیکن پھر ۱۹۱۸ء میں چیکا (پولس) نے اُسے کئی بار گرفتار کیا اُسے دیگر سوشلسٹوں کی مانند گرفتار کیا گیا، قید میں رکھا گیا اور بالآخر عظیم "تھیم آف پیشنس" میں چھوڑ دیا گیا اُس نے کچھ مدت، سمرقند، تاشقند اور ازگھا میں جلاوطنی میں بسر کی بعد میں اُس کا سراغ سیاسی بے تعلقی میں گم ہو جاتا ہے۔ اُسے کسی مقام پر گولی مار دی گئی۔ ص ۸۳ س ۲۸

۷۔ بی۔ ایل۔ آندرئیف، ڈستفو (بچپن) سے ماخوذ ص ۸۴ س ۱۸

۸۔ یہ نینز آئندہ کے شہنشاہ سے متعلق مواد گرینیٹ انسائیکلوپیڈیا جلد ۴۱ ص ۲۴۵-۲۴۷) میں شائع شدہ اُس کی خود نوشت سوانح عمری سے اخذ کیا گیا ہے۔ ص ۸۶ س ۱۷

۹۔ نوفار شخ گوبرنیٹور (کامریڈ گورنر) نوفمبر ۱۹۶۶ء جلد ۲ ص ۸۶ س ۲۹

۱۰۔ میں یہ واقعہ اس کے بے گناہ اعزا کی ہمدردی میں درج کر رہا ہوں۔ خود ٹخا چیفسکی

ایک نئے نظریے کا محرک بنتا جا رہا ہے جس میں شمولیت کا مجھے کوئی شوق نہیں۔ اُس نے جو پھل پایا اُس کی تخم ریزی اُس نے اُسی وقت کی تھی جب اُس نے کرانشٹٹ بغاوت اور تامبوف میں کسان بغاوت کو فرو کرنے کی مہم اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ ص ۸۸ س ۱۵

۱۱؎ ثالثائی وی دو سپومنیا نیا نخ سو فریتیکوف، جلد دوم ۱۹۵۵ء ص ۲۳۲ ص ۸۸ س ۲۵

۱۲؎ بائلوئے شمارہ ۱۴/۲، فروری ۱۹۰۷ء ص ۸۸ س ۲۶

۱۳؎ بائیلوئے کے مذکورہ بالا مضمون میں ان حقائق سے انکار نہیں کیا گیا ہے۔ ص ۸۹ س ۸

۱۴؎ بائیلوئے ۱۴/۲، ص ۸۲ ص ۸۹ س ۲۷

۱۵؎ میں اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا دور معیار اور تکنیکی سطح کے اعتبار سے مختصر "عدلیہ نظام کے ضمن میں عہد زار سے بڑھ کر ہے (کسان بغاوت کا انسداد ۱۹۱۹ء ۱۹۱۸ء تا مبوف کی سرکشی ۱۹۲۱ء، خوبان اور قازقستان ۱۹۳۰ء) ص ۹۰ س ۱۱

۱۶؎ ای۔ اہرنبرگ کو وی۔ برمیلوف کا جواب ص ۹۲ س ۵

۱۷؎ یہاں ہم کچھ اہم تفصیلات ای۔ این۔ کوفلسکایا زنسکایا کارٹوگا (خاتون سیاسی قیدی) گوسزداٹ ۱۹۲۰ء ص ۹۔۸، اور جی۔ ایف۔ اوسمولوفسکی کارٹسکایا ٹریڈڈیا (کارا کا المیہ) ماسکو، ۱۹۲۰ء سے پیش کر رہے ہیں۔ سیزڑا نے بے وجہ اس افسر کو مارا اور اس پر تھوکا کیونکہ سیاسی قیدیوں میں مجنونانہ ماحول تھا بعد ازاں فوجی پولس کے افسر (ماسیوکوف) نے ایک سیاسی قیدی (اوسمولوفسکی) سے تفتیش کے لیے کہا۔ جیل کا افسر پشیمانی کے تحت لقمۂ اجل بن گیا اور پادری بھی اُس کے لیے کلماتِ تشفی نہ ادا کر سکا (کاش ہمارے جیلروں کا ضمیر بھی ایسا ہوتا!) سیزڑا کو اس کے کپڑے اتارے بغیر زد و کوب کیا گیا اور کوفلسکایا کے کپڑے دوسری عورتوں نے تبدیل کیے تھے۔ کپڑے مردوں کے روبرو نہیں بدلے گئے تھے جیسی کہ عام طور پر افواہ تھی۔ ص ۹۳ س ۸

۱۸؎ بائیلوئے شمارہ ۲۴/۲، ۱۹۱۷ء میں پی۔ این زوٹیف کے نام ایل۔ اے۔ اٹائیف کا مکتوب۔ آگے چل کر اٹائیف نے روس اور باہر کی عام صورتحال کے بارے میں مطلع کیا ہے: "جاسوس اور خود کار مخبر کہیں موجود نہ تھے (سوائے دو دارالسلطنتوں کے۔ اے ایس) اگر عمومی ضرورت ہو تو نگرانی کا کام غیر کمیشن یافتہ فوجی پولس افسران سادہ لباس میں انجام دیتے تھے جو شہری لباس میں بعض اوقات اپنی سرکاری ٹوپیوں سے طرّہ نکالنے بھول جاتے تھے۔۔۔۔ ان حالات میں انقلابیوں کو صرف یہ کرنا تھا کہ وہ اپنی سرگرمیاں دارالسلطنت کے باہر رکھیں اور وہ شعبۂ پولس کے لیے ناقابلِ حل اسرار بن جائیں۔ اس طرح انقلاب کے بنیادی مراکز، تشہیر اور تحریک کے اڈّے قائم کر لیے جاتے تھے۔

ہمارے قارئین اس دور اور سوویٹ عہد کے حالات میں بآسانی تمیز کرسکیں گے۔ آئیگر سیندونوف نے وزیر پلیہینے کے قتل کا موقع تلاش کرنے کے لیے گاڑیبان کا بھیس بدلا اور اپنی ڈریشکی میں بم چھپا کر وہ تمام دن محکمہ پولس کے صدر دروازے کے باہر کھڑا رہا۔ (!!) اور کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی یا اس سے دریافت نہیں کیا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ کلیا ئیف نے، جسے ابھی تجربہ نہ تھا، پلیہینے کے فونٹنکا میں واقع مکان کے سامنے کھڑے ہو کر سارا دن انتظار کیا اور اُسے پوری اُمید تھی کہ وہ گرفتار کر لیا جائے گا لیکن کسی نے اُسے ہاتھ بھی نہیں لگایا.... سنہرے دن تھے..... ان حالات میں انقلاب کا راستہ ہموار تھا۔ ص ۹۴ س ۲۸

پانچواں باب

۱ہ ہر چیز اضافی ہے۔ واسیلی گروچکن کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ "اسکرا" بند ہو جانے کے بعد اس کی زندگی کے نوسال " ذہنی کرب کے حقیقی سال تھے اس کے پاس اپنا اخبار نہیں رہ گیا تھا۔ ہم لوگوں کے لیے جو اپنے ذاتی اخبار کا تصور بھی نہ کرسکتے تھے، اس کی کیفیت کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے، اس کے پاس ایک پرسکون کمرہ، ایک میز، روشنائی، کاغذ تھے۔ بدن کی تلاشی نہیں لی جاتی تھی اور اس کے تحریر کردہ کاغذات کوئی ضبط نہیں کرتا تھا پھر ذہنی کوفت کس لیے تھی؟ ص ۹۷ س ۲۲

۲ہ یاکوف نے اس طرح کے "فنی کام" کی مثال پیش کی ہے دمتر یئفسکی اور چیٹویریکوف نے ایک ناول تخلیق کرنے کا منصوبہ تیار کیا اور اس کا خاکہ عہدیداروں کو دکھا کر ان کی منظوری حاصل کرلی۔ افسر تحفظ نے یہ انتظام کیا کہ انھیں جنرل ڈیوٹی پر نہ لگایا جائے بعد ازاں انھیں پوشیدہ طور پر کیمپ کے علاقے سے باہر لے جایا گیا۔ (کہیں بینڈر کے مقلد (بینڈرسٹ) ان کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کردیں) تاکہ وہ اپنا کام جاری رکھ سکیں؛ قبر کے پتھروں کے نیچے شعر کہتے رہو لیکن وہ ناول کہاں ہے؟ ص ۹۸ س ۱۶

۳ہ یہ ظلم خیر وشچیت کے عہد میں اس اعتبار سے کم شدید ہو گیا تھا کہ سزا کچھ کم دی جاتی تھی، ورنہ یہ اتنا ہی خراب دور تھا (ملاحظہ فرمائیے حصہ ہفتم) ص ۱۰۷ س ۱۷

۴ہ پھر بھی وہ کسی عام آدمی کی مانند ایک معمولی دل کے دورے سے جلد مر گیا۔ ص ۱۰۹ س ۲۲

۵ہ اس کو عرصہ گزر چکا ہے ریوپورٹ بعد ازاں اس تکلیف سے دستبردار ہو گیا تھا اور مجھے اس کے اقتباسات پیش کرنے کی اجازت حاصل ہے۔ ص ۱۱۱ س ۴

۶ہ لیکن ایسی کون سی چیز ہوسکتی ہے جسے خصوصی کیمپ میں پڑھنا خطرناک نہ ہو! انگرشینڈر استوٹنک وزیر کا زگان میں ماہر اقتصادیات تھا شام کو خاموشی سے "دی گیڈ فلائی" کا ترجمہ پڑھا کرتا تھا اس کی رازداری کے باوجود مذمت کی گئی۔ خود کیمپ کمانڈر افسروں کے ایک گروہ کے ساتھ تلاشی لینے آیا: "امریکیوں کا منتظر ہے"۔ انھوں نے اسے بآواز بلند پڑھنے پر مجبور کیا: "ابھی نہیں

کتنے دن اور رہنا ہے؟" "دو سال" "لے بیس سال کر لو" "انھیں کچھ شعر بھی آتے" "کیا تمہیں عشق سے دل چسپی ہے؟ اسے اتنی پریشانی میں رکھو کہ اس کی انگریزی پاک نہیں روسی بھی ہوا ہو جائے" مزید برآں غلامانہ ذہنیت والے مخبر اسنوٹک پر طنز کرتے "تم ہمیں بھی پھنساؤ گے۔ وہ ہم سب کو پھر کام پر لگا دیں گے" ص ۱۱۱۲ س ۲۳

۸ کہا جاتا ہے کہ اسٹالن کی موت کے بعد جانوس کو پھر بے قصور تسلیم کیا گیا تو اسے فکر ہوئی کہ اپنی سزا کے فیصلے کی ہنگری زبان میں نقل طلب کرے تاکہ اسے معلوم ہو سکے کہ آخر اس نے یہ نو سال جیل میں کیوں بسر کیے لیکن اسے ایسا کرتے ہوئے ڈر لگا وہ سوچنے لگا کہ میں اس نقل کو کیا کروں گا؟ اور پھر مجھے اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں ہے۔ وہ ہمارے طریق فکر سے آشنا ہو گیا تھا۔ واقعی اب اس کے بچنے کی کیا توقع تھی!

۹ کیا کوئی مجھے سمجھا سکتا ہے کہ یہ سلوک کس نظریے کا تابع ہو سکتا ہے۔ (پاکوف کے کمیونسٹ میڈیکل اردلی سے اس کا موازنہ کیجیے) "دانت میں درد! یہ سور جیسے تھوبڑے والے یوکرینی لٹیرے!)

۱۰ مجھ سے غیر ملکیوں نے ایک سے زائد مرتبہ کہا ہے کہ ہمیں لرمونتوف دیگر تمام روسی شعراء سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ بالآخر پشکن نے "روس کو بدنام نہ کرنے والوں کے نام" لکھا تو تھا ہی لیکن سرمونتوف نے زارشاہی کی کوئی خدمت نہیں کی۔ ص ۱۱۴ س ۲۹

۱۱ اسٹالن کی وفات کے بعد تمام ہنگرین قیدیوں کو اپنے وطن جانے کی اجازت مل گئی جس کی وجہ سے جانوس، مشتری کا کے انجام کو پہنچنے سے بچ گیا۔ حالانکہ وہ اس کیلئے بالکل تیار تھا۔

بارہ سال بہت چکے ہیں جن میں ۱۹۵۶ء بھی شامل ہے۔ جانوس ناگی کنیزہ کے چھوٹے سے شہر میں کلرک ہے جہاں کوئی شخص روسی نہیں جانتا، روسی کتابیں نہیں پڑھی جاتیں اور اب وہ مجھے کیا لکھتا ہے؟

"جو کچھ گزر چکا ہے اس سب کے بعد میں صدق دل سے کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنے ماضی کی بازیافت نہیں چاہتا میں نے ایک تکلیف دہ درس گاہ میں وہ کچھ سیکھا ہے جسے دوسرے کبھی نہیں جان سکتے: جب مجھے رہا کیا گیا تو میں نے پیچھے رہ جانے والے ساتھیوں سے وعدہ کیا تھا کہ میں روسی عوام کو کبھی فراموش نہیں کروں گا ان کے مصائب کی بنا پر نہیں بلکہ ان کی صلاحیت کے باعث میں نے اپنی پہلی مادر وطن کے بارے میں اخبارات میں شائع شدہ خبریں اس دل چسپی کے ساتھ کیسے پڑھ سکتا ہوں؟ روس کی کلاسیکی تخلیقات سے میرے کتب خانہ کا پورا شیلف بھرا ہوا ہے میرے قبضے میں دوسری زبان کی اکتالیس اور یوکرینی زبان کی چار کتابیں... دیگر افراد روسی کے ساتھ انگریزی یا جرمن مصنفین کی تخلیقات بھی پڑھتے ہیں۔ لیکن میرے پڑھنے کا انداز مختلف ہے میرے لیے شالن شائی، تماسین سے زیادہ معتبر ہے۔

تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں روس کے بارے میں کسی سے گفتگو نہ کر سکنے کی وجہ سے کتنا کھویا کھویا سا رہتا ہوں۔ بعض اوقات لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں کیا پاگل ہو رہا ہوں اس ملک نے مجھے کیا فائدہ پہنچایا؟ میں بد سیوی کی طرح جھکاؤ کیوں رکھتا ہوں؟ کیسے سمجھاؤں انھیں کہ میرے بھی ایام شباب وہاں گزرے ہیں اور کہ زندگی تیز قدمی کے ساتھ بھاگتے ہوئے ایام کی ابدی جدائی کا نام ہے میں روسے بچے کی طرح اپنا مونہہ کیسے موڑ لوں نو برس تک میری اور تمہاری قسمت یکساں

رہا ہے۔ میں انہیں کیسے سمجھاؤں کہ جب ریڈیو پر کوئی روسی لوک گیت سنتا ہوں تو کس طرح لمحہ بھر کے لیے میرے دل کی دھڑکن رک جاتی ہے؟ میں خود مدہم سروں میں گانے لگتا ہوں: "دیکھو تین پہیوں کی گاڑی بھاگ رہی ہے اندھا دھند..." لیکن اس سے آگے لکھنے میں مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ میرے بچے مجھ سے روسی زبان سیکھنا چاہتے ہیں۔ کچھ دن انتظار کرو بچو! تم کیا سمجھتے ہو، میں روسی کتابیں اور کس کے لیے یکجا کر رہا ہوں؟" ص ۱۱۵ س ۱۰

(چھٹا باب)

لہ ہیشا خیڈاروف نے فرار کی کئی کوششیں کیں۔ عہد خروشچیف کے آسان ترین برسوں میں بھی جب کہ عادی مفرورین پرسکون تھے اور قانونی طریقوں سے رہائی کا انتظار کر رہے تھے، اس نے اور اس کے ساتھیوں نے، جنہیں معافی کی کوئی توقع نہیں تھی، اکٹی یوزین خصوصی جیل اینڈ زیوب ۳۰۷ سے فرار کی کوشش کی تھی۔ ساتھی سازشیوں نے پہرے داروں کی توجہ ہٹانے کی غرض سے نگرانی کی برجیوں کے نیچے ہاتھ سے تیار کردہ ہینڈ بم اچھالے جب کہ مفرورین نے کیمپ کے داخلی علاقے کے تار کلہاڑیوں سے کاٹ کر بھاگنے کی سعی کی لیکن انہیں مشین گن کی گولیوں نے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ ص ۱۴۲ س ۲۵

ٹہ۔ نومبر ۱۹۵۱ میں بورو بیوف پانچ دوسرے اسیروں کے ہمراہ ایک جائے تعمیر سے گندگی کے ٹرک میں پھر فرار ہوا۔ وہ دو تین دن میں پکڑ لیے گئے۔ افواہ یہ ہے کہ ۱۹۵۲ء میں نوریلسک کے فساد میں بورو بیوف بھی فساد کی ایک جڑ تھا اور بعد ازاں الکسنڈر انڈر وفسک مرکزی جیل میں لایا گیا تھا۔ اس عجیب وغریب انسان کی سوانح حیات جو قبل از جنگ کے ان ابتدائی برسوں سے شروع ہوتی ہے اور گوریلا کی حیثیت سے زمانۂ جنگ میں اسکے کارناموں پر مشتمل ہے شاید ہمارے عہد کو اس سے کہیں بہتر طور پر سمجھنے میں معاونت کرے جتنا کہ ہم اسے سمجھتے ہیں۔

ساتواں باب

لہ سرتاسر اتفاق! اس جیل گاڑی کی مانند جو ان دوسرے مفرورین کو اتفاقاً مل گئی تھی! ایک بالکل ہی غیر متوقع حادثہ! ہمارے لیے قدم قدم پر موافق یا ناموافق اتفاقی حادثات منہ پھاڑے کھڑے رہتے ہیں۔ لیکن صرف مفرور کو ہی، جو تلوار کی دھار پر بھاگتا ہے۔ یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنی اہمیت کے حامل ہیں۔ بالکل اچانک کیمپ کے علاقے میں ایک دو منٹ کے لیے بجلی ٹھیک اس وقت فیل ہو گئی جب نیلے اور زرد رنگ کے راکٹ برابر نکل رہے تھے اور محض اسی وجہ سے روشنی کے گولے جو اس وقت ایکی لیبلز میں وافر تعداد میں موجود تھے، اتنی کثیر تعداد میں چھوڑے گئے تھے۔ اگر مفرورین پانچ منٹ کے بعد رینگ کے نکلے ہوتے تو سنتریوں نے، جو اس وقت چاک و چوبند ہو گئے تھے، انھیں دیکھ لیا ہوتا اور انھیں گولی مار دی جاتی۔ اگر مفرورین نے تابناک روشنی سے منور آسمان کے نیچے اپنے سوا سب کو قابو میں رکھا ہوتا۔ ٹھنڈے دل سے کیمپ کے علاقے کا جائزہ لیا ہوتا اور دیکھنے کی

بجلیاں اور برجیوں کی سرچ لائٹیں گل ہو گئی ہیں تو وہ سکون کے ساتھ کسی موثر لاری کی تلاش میں نکل پڑتے اور ان کی فرار کی سمت بالکل مختلف ہوتی لیکن ان کی سی حالت میں ریگستان کے باہر نکلنے کے فوراً بعد کیمپ کے علاقے میں روشنی کے گولے دیکھ کر کوئی بھی یقین کر سکتا تھا کہ ان کی تلاش شروع کر دی گئی ہے۔ اور انھیں جان بچانے کے لیے دوڑنا چاہیے۔ بجلی کی ذرا دیر کی گڑبڑ نے ان کے فرار کے پورے منصوبے کو الٹ پلٹ دیا۔ ص ۱۵۴ س ۲۹

ف۲ ہوا یہ تھا کہ سویرے کچھ قیدیوں کو نمبر والی جیکٹیں ہاتھ لگیں اور راتی سردتیں کہ ظاہر ہو گیا وہ تمام رات باہر پڑے رہے ہیں۔ انھوں نے ان کے نمبر ہٹا کر انھیں اپنے قبضے میں کر لیا۔ نمبر دار جیکٹ سنبھال کر رکھنے کی چیز ہے وارڈروں نے یہ چیزیں دیکھی ہی نہیں نہ دوشنبے کے تیسرے پہر تک کے ہونے تاران کی نگاہ میں آئے۔ اصل میں انھیں یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کون لوگ فرار ہو گئے ہیں، تمام دن ریکارڈ اور فہرستوں کی جانچ پڑتال کرنی پڑی، مفرورین دن میں بھی پوشیدہ رہنے کی کوشش کے بغیر ہا پیادہ یا سواری سے سفر کر سکتے تھے! آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ان کے روشنی کے گولوں کا صحیح مقصد سمجھنے کی وجہ سے کتنا فرق پڑ گیا۔ کیمپ میں لوٹنے پر اتوار کی شام کو فرار کا نقشہ رفتہ رفتہ واضح ہو گیا۔ لوگوں کو یاد آیا کہ بجلی فیل ہو گئی تھی اور انھوں نے توضیحی انداز میں کہا "کیا وہ چالاک نہیں ہیں؟ کیا وہ عقلمند نہیں ہیں؟ پھر بھی انھوں نے روشنی گل کرنے کا بندوبست کیسے کر لیا؟" بہت عرصے تک لوگ یہ خیال کرتے رہے کہ بجلی فیل ہونے کی وجہ سے مفرورین کو بڑی مدد ملی ہوگی۔ ص ۱۵۶ س ۱۹

ف۳ ۱۹۲۳ء کے برسوں میں قازقستان میں چاروں طرف ایسی اجڑی ہوئی بستیاں تھیں پہلے بڈینی اپنی گھڑ سوار فوج کے ساتھ وہاں سے گزرا (آج تک ان کے نام سے منسوب کوئی کولخوز، اجتماعی فارم یا کوئی تصویر قازقستان میں دیکھنے میں نہیں آتی) اور پھر قحط! ص ۱۶۳ س ۲۹

ف۴ کیا یہ ویسی ہی نفرت نہیں ہے جو ہمارے دہندگان کے دلوں میں ہمیں تباہ کرنے کے وقت جاگزیں ہوتی ہے؟

ف۵ داستان گو نے قازق الفاظ "بیش دینگا (پانچ روبل)" کو روسی زبان بیز دینگ (بغیر قیمت پر) سمجھا تھا۔ ص ۱۶۹ س ۲۲

ف۶ علاوہ ازیں ٹینو کو ہیجے فیلیا تھا وہ فرار ہونے کی کسی مہم سے پیچھے نہیں ہٹا جبکہ ایک بھی خراش اس کے لیے جان کا خطرہ پیدا کر سکتی تھی۔ ص ۱۸۴ س ۲۴

ف۷ جب قارئین یہ کتاب ملاحظہ فرمائیں گے اس سے قبل جارجی یا فلودوپچ ٹینو، کھلاڑی اور کھیلوں کا آزاد نظریہ کار ۲۲ر اکتوبر ۱۹۶۷ء کو ایک قسم کے کینسر سے مر چکا ہے۔ جو بڑی سرعت سے شدت اختیار کر گیا پہلے سے بستر علالت پر پڑا ہوا ٹینو صرف اتنے عرصے تک زندہ رہ سکا کہ ان ابواب کو پڑھ سکے اور ان میں ان انگلیوں سے تصحیح کر دے جنھیں لمس محسوس کرنے کی قوت زائل ہوتی جا رہی تھی۔ مرنے کا یہ وہ طریقہ نہیں تھا جس کا اس نے اپنے احباب سے اور خود سے وعدہ کیا تھا۔ ایک مرتبہ تو اس کے فرار کے منصوبے کے تحت اسے موت آئی تھی، بعد میں وہ میدان جنگ

میں لوٹتے ہوئے مرنے کا خواستگار تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں مرتے ہوئے اپنے ساتھ ایک درجن قاتلوں کو لے جانے کا ارادہ رکھتا ہوں جنھیں پہلا دیا جک کرزونی (یعنی مولوڈف) اور بہر صورت فاٹ (جارلیٹ سے ملکیں کا تفتیش کنندہ) بھی ہوگا۔ یہ قتل نہیں؛ منصفانہ سزا ہوگی کیوں کہ حکومت کا قانون قاتلوں کی حفاظت کرتا ہے" اپنی پہلی دو گولیوں سے تم نے اپنی زندگی کا مصرف ثابت کر دیا ہے" تیبوئے کہا تھا "اور تم نے اس منصوبے کو خوشی کمل کر دیا ہے" لیکن مرض نے اسے دفعتہً مغلوب کر دیا جس سے اس کی قوت زائل ہوگئی اور اسلحہ سنبھالنا اس کے لیے ناممکن ہوگیا۔ اپنی پہلی بیماری کے دوران تیبو مصنفین کی کانگریس کے نام ارسال کردہ میرے مراسلے کی نقلیں چار جانب چسپاں کرتا ہوا ماسکو بھر میں گھوما تھا اس کی آرزو تھی کہ اسے الٹونینا میں دفن کیا جائے یہ بادری قیدی رہ چکا تھا ہٹلر کے کیمپوں میں بھی اور اسٹالن کے کیمپوں میں بھی!

مولوڈف حفاظت کے ساتھ بقید حیات ہے۔ پرانے اخبارات کے صفحے اُلٹتا ہوا اور ایک عوامی جلاد کی یادداشتیں قلم بند کرتا ہوا! فورث بھی ام، گورکی اسٹریٹ پر آج بھی اپنی پنشن سکون کے ساتھ فرہم کر رہا ہے۔ ص ۱۸۸ س ۱۷

(آٹھواں باب)

ا۔ لیکن تاشقند کے کینسر کلینک میں ایک کیمپ کے ازبک پہریدار نے مجھے بتایا تھا کہ یہ کوشش حقیقتاً کامیاب ہوئی تھی —— وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی کوشش کی تعریف کرنے پر مجبور تھا۔ ص ۲۰۲ س ۱

۲۔ ملاحظہ ہو دسواں باب۔ ص ۲۰۲ س ۱۲

نواں باب

ا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ کسی کو یہ پتہ لگانا ہوگا کہ کیا وہ اپنی پنشنوں کے ساتھ شاندار بنگلوں میں پرسکون ہیں۔ ص ۲۲۲ س ۱

۲۔ ضمناً میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا ہمیں معلوم ہے کہ ان منحوس مخففات کی جوڑی ایس ایس کا جو ایک کے بعد ایک حرف کی صورت میں موجود ہیں اور جن میں سب سے پہلے کے پی۔ ایس۔ ایس (سوویٹ یونین کمیونسٹ پارٹی) اور کے، پی۔ ایس۔ ایس او فشی (ارا کین کیمٹی) آتے ہیں۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ضابطے بھی ایس۔ ایس (سوفرشینو سیکریٹنی —— انتہائی صیغۂ راز) ہیں جس طرح کہ ہر چیز صد درجہ خفیہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جنھوں نے ان ضابطوں کا مسودہ تیار کیا۔ انھیں بھی ان کے خفیہ ہونے کا علم تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے ان کا مسودہ تیار کیا اور تیار بھی کس دور میں کیا؟ ہم نے ابھی جرمنوں کو اسٹالن گراڈ سے واپس بھگایا تھا۔ عوام کی فتح کا ایک اور ثمرہ! ص ۲۲۲ س ۲

۳۔ اگرچہ ہم بہت پہلے اس بات کے عادی ہو چکے تھے کہ کبھی بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن پھر بھی کچھ

ناگہانی باتیں ابھی باقی ہیں۔ چوں کہ اس کی مطلقہ بیوی کا دوسرا شوہر گرفتار ہوا ہے اس لیے کیا کسی آدمی کو اپنے چار سالہ بچّے سے اپنے تعلقات منقطع کرکے اعلان کر دینا چاہیے اور وہ کوئی عام آدمی نہیں۔ چیکا میں کمانڈر تھا۔ ص ۲۲۲ س ۳۰

(دسواں باب)

۱ے میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ ان بغاوتوں کے بارے میں میری بیان کردہ تفصیل بالکل درست ہے جو مجھے میری خامیوں سے آگاہ کریں گے اُن کا شکر گزار ہونگا۔ ص ۲۲۶ س ۲۶

۲ے اُس کا اصل نام پوشیدہ رکھنا مقصود نہیں ہے بس وہ مجھے یاد نہیں آرہا ہے۔ ص ۲۲۹ س ۱۴

۳ے یہاں کچھ دیگر نوعیت کی باتوں کا تذکرہ بھی مناسب ہوگا۔ سب کچھ اتنا صاف ستھرا معاملہ نہیں تھا جتنا کہ عام رویّے کی نمائندگی کے لیے یہاں بیان کیا گیا ہے۔ مخالف گروہ — اعتدال پسند اور انتہا پسند بھی وہاں موجود تھے ذاتی پسند اور ناپسندیدگی اور قائد بننے کے خواہشمند لوگوں میں مفادات کا تصادم بھی ہونے لگا۔ مارنے والے ریوڑ کے نوجوان بچھڑے سیاسی نظریات نہیں رکھتے تھے کچھ اپنے کام کا معاوضہ زیادہ راشن کی صورت میں طلب کرتے تھے اور اسے حاصل کرنے کے لیے اسپتال کے باورچیخانے کے خانساماں کو دھمکیاں دیتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں وہ بیماروں کے حصّے کی خوراک مانگتے تھے اور اگر خانساماں دینے سے انکار کرتا تھا تو اُسے کسی رسمی اخلاقی عدالت کے فیصلے کے بغیر ہی مار ڈالتے تھے۔ انہیں اس کی مشق ہوگئی تھی۔ نقاب اور ہاتھوں میں چاقو۔ مختصراً بدنظمی اور انحطاط پوری تاریخ میں انقلابی تحریکوں کے پُرانے اور مستقل اجزا رہے ہیں اور اندر سے تندرست جسم میں پہلے ہی گھُن کی طرح لگے ہوئے تھے۔

ایک معاملہ صریحاً غلطی کا تھا۔ ایک چالاک مخبر نے ایک اچھے کردار کے محنتی قیدی کے ساتھ اپنا بستر بدلنے سے انکار کر دیا اور صبح اس قیدی کو قتل کر دیا گیا۔

لیکن ان غلطیوں کے باوجود تحریک بحیثیت مجموعی مناسب راہ پر رہی۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہم کہاں جارہے ہیں۔ سماجی سطح نظر حاصل ہوگیا تھا۔ ص ۲۳۶ س ۸

۴ے "غنڈوں کے گروہوں کا باہمی تصادم" پر اس کتاب میں ایک علیحدہ باب ہونا چاہیے لیکن بہت سا فاضل مواد فراہم کرنا ہوگا۔ میں قارئین کو وِدلام شالاموف کی تصنیف "ادچیرکی پرنیٹیپنو گو میرا" (جرائم کی دنیا پر مضامین) کے مطالعے کی صلاح دوں گا ہرچند کہ وہ بھی نامکمل ہے۔ مختصراً غنڈوں کے گروہوں کا باہمی تصادم" (اگر چوروں اور "غنڈوں کے گروہوں" کے درمیان ہونے والے متفرق معمولی تصادموں کو چھوڑ دیا جائے) ۱۹۴۹ء کے آس پاس رونما ہوئے تھے۔ ۱۹۵۱ء—۵۲ میں یہ اپنی سب سے خونخوار شکل میں تھے۔ مجرم دنیا کئی الگ الگ حصّوں میں منقسم تھی خالص چوروں اور غنڈوں کی ٹولیوں" کے علاوہ "لامحدود" میز فروشی اوپھدو فروشی، پسودفروشی، ریڈ رائیڈنگ ہُڈس، نقلی نیم، کروبار بیلٹیڈ بھی تھے اور بعض استنے بچانہ تھے۔

اس وقت تک گلاگ کے حکمراں مجرموں کی تعلیم نو سے متعلق نظریات میں اعتماد سے دستکش ہو چکے تھے اور ظاہر تھا کہ انہوں نے ان جھگڑوں کو ہوا دے کر پہلے ایک فریق کو اور پھر دوسرے فریق کو امداد دے کر اور بقیہ کو ختم کرنے کے لیے اپنے چاقو استعمال کر کے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ مار دھاڑ علی الاعلان اور وسیع پیمانے پر چلتی رہی۔

اس کے بعد عادی مجرموں نے، جو قتل عام کا آغاز کر چکے تھے، اپنا وطیرہ بنا لیا کہ یا تو وہ کسی کے ہاتھوں مارے جاتے تھے یا مارتے تھے اور جب خود مارتے تھے تو کسی دوسرے کو اس کا الزام اپنے سر لینے کے لیے تیار کر لیتے تھے۔ اس طرح نوجوان اتفاقی مجرم، سابق فوجی یا افسر قتل کی دھمکی سے خوفزدہ ہو کر دیگر لوگوں کے قتل کا الزام اپنے اوپر لے لیتے تھے۔ دفعہ ۵۹/۳ (ڈکیتی) کے تحت پچیس سال کی سزا پاتے تھے اور اب بھی اندر تھے۔ اس طرف وہ چور، جو ان گروہوں کے سرغنہ تھے ۱۹۵۳ء میں "وروشلوف عام معافی" کے تحت صاف چھوٹ گئے (لیکن ہمیں بہت رنجیدہ نہ ہونا چاہیئے اس کے بعد سے وہ ایک یا دوبار اندر جا چکے ہیں)

جب ہمارے اخبارات نے مجرموں کی اصلاح کے بارے میں جذباتی افسانوں کا فیشن دوبارہ رائج کیا تو کیمپوں میں ہونے والی مار دھاڑ کے متعلق بھی ان کی رپورٹیں جو بلاشبہ مبہم اور جھوٹی تھیں، اخباروں کے کالموں میں آنے لگیں جن میں "غنڈوں کے گروہوں کے باہمی تصادم" اسپیشل کیمپوں کی مار کاٹ اور کسی دوسرے غیر معروف قتلِ عام کا دانستہ خلط ملط کیا جائے گا کیمپ تمام سوویٹ لوگوں کا دلچسپ موضوع ہے ایسے مضامین بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں لیکن معاملہ فہمی میں ان سے کوئی مدد نہیں ملتی (اسی غرض سے وہ لکھے جاتے ہیں) اس طرح اخبار نویس گالیچ نے جولائی ۱۹۵۹ء میں "ازویستیا" میں کسی کورسخ کے بارے میں ایک مشتبہ سا بیانیہ افسانہ شائع کیا۔ افسانے کے مطابق اس کورسخ نے کیمپ سے ایک اسّی صفحہ کا ٹائپ شدہ مراسلہ بھیجا جو سپریم سوویٹ کے ہاں میں چھپ گیا:

(۱۔ اسے ٹائپ رائٹر کہاں سے مل گیا؟ کیا وہ افسر تحفظ کی مشین تھی؟ ۲۔ مکمل اسّی صفحات بھلا کون پڑھے گا ــــ وہ لوگ جو ایک صفحہ پڑھ کر ہی جماہی لینے لگتے ہیں اور اپنا سر الگ ہٹا لیتے ہیں؟) یہ کورسخ پچیس سال سے کیمپ میں تھا۔ اسے کسی ایسے جرم کے لیے جو اس نے کیمپ میں کیا تھا، دوسری بار سزا ملی تھی۔ لیکن کیا کیا تھا؟ اس سوال پر گالیچ، اور یہ ہمارے اخبار نویس کا خصوصی وصف ہے، واضح اور بامفہوم تحریر کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔ یہ سمجھ پانا ممکن نہیں کہ کورسخ نے کسی غنڈے کو قتل کیا تھا یا کسی مخبر کو (جس کی وجہ سے یہ عمل سیاسی بن جائیگا لیکن یہ خاص بات ہے۔ تاریخی پس منظر میں دیکھتے ہیں تو ہر بات کو ایک ڈھرے پر لگا دیا جاتا ہے اور اسے خندہ گردی کہہ دیتے ہیں۔ کوئی ملک گیر اخبار سائنسی تعریف کی شکل میں سب تجربات بھی کہہ سکتا ہے، "اس وقت کیمپوں میں بیریا کے ایجنٹ باعمل تھے": (اس وقت؟ اور اس سے قبل نہیں؟)" قانون کی سختی سے پابندی ان لوگوں کے غیر قانونی اعمال کی وجہ سے

ممکن نہ تھی جو اس کی پابندی کے لیے تعینات کیے گئے تھے (کیسے؟ کیا وہ کھلے عام ضابطے کی خلاف ورزی کرتے تھے؟) قیدیوں کے مختلف طبقوں میں" عداوت پھیلانے کے لیے وہ پوری کوشش کرتے تھے" (جملے کے نیچے خط میں نے کھینچ دیا ہے۔ اتنی بات صحیح ہے۔ الف سین) اس فارمولے کے تحت مجرموں کو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے (وہاں وحشت، جنگلی پن اور بربریت آمیز عداوت مصنوعی ذرائع سے پیدا کی گئی تھی)

پچیس۲۵ سالہ سزاؤں کے ذریعے کیمپوں کی مار دھاڑ کو روکنا یقیناً ناممکن ثابت ہوا۔ بہت سے قاتل پہلے پچیس۲۵ سال کے لیے سزا یافتہ تھے اس لیے ۱۹۶۱ء کے ایک فرمان نے کیمپوں میں قتل کے لیے (جس میں بلاشبہ مخبروں کے قتل بھی شامل تھے) گولی مار دینے کی سزا متعین کر دی۔ خروشچیف کے دور کے اس فرمان نے وہ کمی پوری کر دی جو عہد اسٹالن کے اسپیشل کیمپوں میں باقی رہ گئی تھی! ص ۲۳۹ س ۷

گیارہواں باب

۱ہ پھر بھی اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے تھے لیکن یہ کام ہم نے نہیں، چوروں نے کیا جو ہمارے بعد ایکی بسٹز میں ۱۹۵۴ء میں آئے تھے۔ وہ سخت دل لیکن جی دار آدمی تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ ص ۲۴۹ س ۱۶

۲ہ یہ دلچسپ بات لائق توجہ ہے کہ اس زمانے کے آس پاس روسی کلینڈروں میں "خون آلود اتوار" کے اندراجات بند کر دیے گیے۔ جیسے یہ بالآخر ایک بے حد معمولی واقعہ تھا جس کی یادگار منانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ص ۲۴۹ س ۲۵

۳ہ جو لوگ تشدد کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کے لیے شاید یہ لازمی ہے میں دیکھتا ہوں کہ کاموکے حملہ آور بینکوں پر ڈاکہ ڈالنے کے بعد ساری رقم پارٹی فنڈ میں دے کر اپنی جیبیں خالی نہیں کر دیتے اور کیا ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ کوبا، جوان کارستانیوں کا بلان بناتا تھا اپنے لیے شراب کے پیسے بھی رکھتا ہوگا؟ خانہ جنگی کے زمانے میں جب تمام روس میں شراب نوشی پر پابندی عائد کر دی گئی تھی وہ کریملن میں کم و بیش علی الاعلان شراب کا ایک خفیہ ذخیرہ رکھتا تھا۔ ص ۲۷۱ س ۳۰

۴ہ جیسا کہ کلوچیفسکی نے لکھا ہے شریف طبقے کی نجات کے اگلے دن (شریف طبقے کے اختیارات سے متعلق احکام فروری ۱۸، ۱۷۶۲ء) کسانوں کو بھی آزاد کر دیا گیا تھا (فروری ۱۹، ۱۸۶۱ء) لیکن ننیانوے برسوں کے بعد! ص ۲۷۳ س ۲۴

۵ہ دیگر بیانات کے مطابق انھوں نے دراصل یہ نعرہ لگایا تھا "ہمارے لیے آزادی اور ہمارے وطن کے لیے کوئلہ!" "ہمارے لیے آزادی" کہنا ہی حکومت سے بغاوت کے مترادف تھا اس لیے انھوں نے فی الفور" اور ہمارے وطن کے لیے کوئلہ" جیسے معذرت خواہانہ الفاظ کا اضافہ کر لیا۔ ص ۲۷۵ س ۳

(بارہواں باب)

ا۔ بلاشبہ کیمپ کے عہدیداران نے دیگر مقامات پر، مثلاً نوریلسک میں اسی قسم کی وارداتیں جلد کرانے کے لیے اقدامات کیے۔ ص ۲۷۷ س ۲۲

۲۔ برلن کے جون ۱۹۵۳ء کے فسادات کے بعد سرکاری لغطیات میں "بیکار پڑے رہنے" کا استعمال بہت بڑھ گیا تھا۔ اگر بیلجیم میں کسی جگہ عام لوگ تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کریں تو اسے لوگوں کا "اجتماعی غضب" کہا جاتا ہے لیکن ہمارے وطن کے سادہ لوح عوام سیاہ روٹی کے لیے جدوجہد کریں تو اُن پر "بیکار پڑے رہنے" کا اطلاق ہوتا ہے۔ ص ۲۷۹ س ۲۸

۳۔ ان میں سے ایک کرنل چیف اسی تذبذب کا شکار ہو گیا۔ وہ فروری کی وارداتوں کے بعد ریٹائر ہو گیا اور پھر اُس کا کوئی سُراغ نہ ملا بعد میں معلوم ہوا کہ کاراگنڈا میں اپنی پنشن پر چل رہا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ کیمپ کا نڈریف سنگیئف کتنے عرصے کے بعد اوزرلاگ سے دنعان ہوا۔ "ایک عمدہ منتظم اور خوش مزاج ساتھی"۔ وہ براٹسک کے ہائیڈرو الیکٹرک سکشن کا نائب صدر ہو گیا۔ (پیفلشکو کی نظم میں اُس کا کوئی حوالہ نہیں ہے)* ص ۲۸۰ س ۲۹

۴۔ ایک وعدہ معاف گواہ مکیٹیف نے یہ بات محسوس کی تھی۔ ص ۲۹۱ س ۶

۵۔ بغاوت کے بعد افسروں نے یہ حماقت کی کہ تمام عورتوں کا عمومی ڈاکٹری معائنہ کرایا اور جب انہیں علم ہوا کہ اُن میں اکثر اب تک کنواری ہیں تو وہ بہت حیران ہوئے۔ ایمہ۔تم لوگ سوچ کیا رہے تھے! اتنے دنوں تک یکجا رہ کر۔ ۔ ۔ واقعات کے بارے میں غور کرتے ہوئے وہ لوگ اپنے ذاتی اخلاقی معیار سے بلند ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ ص ۲۹۵ س ۲۷

۶۔ جب یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور عورتوں کا کالم کام پر جانے کے لیے بستی سے گزرا تو شادی شدہ عورتیں روسی خواتین سڑک کے کنارے یکجا ہو گئیں اور اُن پر چیخنے لگیں — "فاحشہ عورتو! بدکار طوائفو! تم اس کے بغیر رہ نہیں سکتی تھیں؟ کیا تم ..." اور اس سے بھی زیادہ تلخ باتیں۔ یہی بات اگلے دن بھی ہوئی لیکن اس دن عورتیں کیمپ سے تیار ہو کر آئی تھیں اور انہوں نے ان بے عزتی کرنے والوں پر سنگباری شروع کر دی۔ پہریدار فوجی ہنس کر رہ گئے۔ ص ۳۰۶ س ۲۰

۷۔ حصہ سوم، بائیسواں باب۔ ص ۳۰۶ س ۲۸

۸۔ کینگر میں موجود دیوکریئی لوگوں نے اسے یوم ماتم قرار دیا۔ ص ۳۰۷ س ۲۹

۹۔ کہا جاتا ہے کہ یہ طریقہ پہلے نوریلسک میں آزمایا جا چکا تھا۔ وہاں بھی انہوں نے کمزور دل والوں کو خائف کرنے کے لیے کئی مقامات سے دیوار توڑ دی تھی اُن کے ذریعے چوروں کو مشتعل کیا جاتا تھا اس طرح فوجیوں کو مداخلت کر کے نظم و نسق برقرار رکھنے کی کارروائی کرنے کا حیلہ ہاتھ آتا۔ ص ۳۰۸ س ۶

۱۰۔ یقیناً دیر لب بھی تعزیری کارروائی کی رپورٹوں کے ساتھ پیچیدہ کہیں نہ کہیں ضرور محفوظ ہوں گی۔ شاید کوئی یہ زحمت نہ کرے گا کہ آئندہ نسلوں کی نگاہ پڑنے سے پیشتر انہیں ضائع کر دے۔ ص ۳۰۹ س ۲۷

۱۱ گیارہ سال بعد وہ اس درجہ نادم تھا کہ اپنی یادداشتوں میں جو اغلباً معذرت خواہی کی اپیل کے طور پر تیار کی گئی تھیں، رقمطراز ہے کہ میں نے غیر ارادی طور پر اپنا سر پھاٹک سے باہر نکالا اور دوسری طرف سے لوگوں نے جھپٹ کر میرے ہاتھ باندھ لیے! ص ۳۱۰ س ۹

۱۲ شاید وہ واقعی آ گیا تھا؟ غالباً اُسی نے احکامات جاری کیے تھے؟ ص ۳۱۴ س ۲۳

۱۳ وہ صرف تاریخ سے پوشیدہ ہو گئے۔ یہ جنگ باز کون تھے، اتنے تیز اور ایسے مطمئن؟ ہمارے وطن نے کینگریس حاصل ہونے والی اُن کی فتح کا جشن کیوں نہیں منایا؟ قدرے دشواری سے وہاں کے اہم ترین لوگوں سے نہ سہی مگر ایسے لوگوں کے جو کسی بھی اعتبار سے غیر اہم نہ تھے، نام معلوم کیے جا سکتے ہیں مثلاً حفاظتی کارروائی کے شعبے کا سربراہ کرنل یوزنٹسوف، اشپیلاگ کے سیاسی شعبے کا صدر رسیو شکن .... ذرا مدد کیجیے، فہرست میں اور نام درج کرائیے۔ ص ۳۱۵ س ۷

۱۴ ایک ٹینک میں کیمپ کی ڈاکٹر نجینا شراب میں مخمور بیٹھی تھی۔ وہ وہاں معاونت کرنے کے لیے نہیں، تماشہ دیکھنے کے لیے آئی تھی۔ ص ۳۱۵ س ۱۹

۱۵ ہوشیار! برٹرینڈ رسل، جین پال سارترے، اور مجرمانِ جنگ کی عدالتو! غلط سفر! ہوشیار! یہاں آپ کے لیے مواد ہے۔ ایک اجلاس کیوں نہیں منعقد کرتے؟ وہ میری باتیں نہیں سن سکتے .... ص ۳۲۶ س ۱

۱۶ ۹ جنوری ۱۹۰۵ء کو مارے گئے لوگوں کی تعداد تقریباً یکصد تھی۔ ۱۹۱۲ء میں لینا گولڈ فیلڈ پر ہونے والے مشہور قتلِ عام میں، جس سے تمام روس کو صدمہ پہنچا تھا، ۲۷۰ افراد ہلاک اور ۲۵۰ زخمی ہوئے تھے! ص ۳۲۶ س ۲۳

حصہ ششم

پہلا باب

۱ یہ تمام اطلاعات سیمیونوف ٹیان شنسکی کی کئی جلدوں پر مشتمل جغرافیائی تصنیف "ایشیا" کی جلد ۱۱ (مغربی سائبیریا) سے ماخوذ ہیں نہ صرف یہ مشہور جغرافیہ داں بلکہ اس کے بھائی بھی اپنی عوامی زندگی میں کٹر بے غرض لبرل تھے اور انھوں نے ہمارے وطن میں آزادی کی روشنی پھیلانے میں بڑا کام کیا۔ ایامِ انقلاب میں ان کا پورا خاندان تباہ کر دیا گیا۔ ایک بھائی کو دریائے رانوف کے ساحل پر واقع اس کی خوشحال زرعی سرزمین پر گولی مار دی گئی، مکان نذرِ آتش کر دیا گیا اور بڑے باغ کو، جس میں لیمو اور چناروں کی لمبی لمبی قطاریں تھیں، اجاڑ دیا گیا! ص ۳۲۰ س ۲۰

۲ پی۔ ایف۔ یعقوبووچ "برادری سے خارج لوگوں کی دنیا میں"۔ ص ۳۲۰ س ۲۲

۳ ٹان لوگوراز، وی۔ آئی۔ زوکیلسن، ایل۔ وائی۔ شٹیرنبرگ۔ ص ۳۲۱ س ۲۳

۴ قانونی معاملات میں بالکل کورا ہونے کی وجہ سے یا شاید اپنے عہد کے مزاج کے مطابق چیخوف نے اپنی سخالن کی سیاحت کے لیے کوئی پروانہ یا سرکاری کاغذ حاصل نہیں کیا تھا پھر بھی اسے مجرموں کی تعداد وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے سے نہیں روکا گیا اور جیل کے کاغذات بھی اسے دکھا دیے گئے (اس کا تقابل ہمارے تجربات سے کیجیے! این۔ کے۔ وی۔ ڈی سے اجازت نامہ حاصل کیے بغیر کسی

جگہ کا معائنہ کرنے کی کوشش تو کیجیے!) اس پر محض ایک پابندی عائد کی گئی کہ ایک بھی سیاسی قیدیوں سے نہ ملے۔ ص ۳۲۱ س ۲۴

۵ فلیکس کون "راپیاٹ ڈیس یاٹ لیٹ ٹوم ۲" نا پوسیلینیئی پچاس برس، جلد ۲ جلاوطن" ص ۳۲۲ س ۶

۶ اس انقلابی کو جس کے نام پر کئی روسی شہروں میں پوسٹ آفسوں کی سڑکوں کے نام رکھے گئے تھے کام کرنے کی مشق کبھی نہیں پڑی۔ حتیٰ کہ پہلے "سبوٹنک" میں حصہ لیتے ہوئے اس کے ہاتھوں پر چھالے پڑ گئے تھے اور وہ متعدی مرض کا شکار ہو کر مر گیا۔ ص ۳۲۲ س ۳۰

۷ تخاچیفسکی؛ جنگ اور انقلاب ۱۹۲۶ء نمبر ۷ صفحہ ۱۰۲ پر "رجعت پسندی بغاوت کے خلاف جدوجہد"۔

۸ "روسی سوویٹ یونین اشتراکی جمہوریتوں کے فرامین کا مجموعہ" ۱۹۲۲ء نمبر ۶۵ صفحہ ۸۴۴۔ ص ۳۲۴ س ۱۶

۹ الیف۔ کون۔ ایضاً ص ۳۲۵ س ۱۵

۱۰ لیپے شنسکی (زمورٹ پر) ص ۳۲۵ س ۱۷

۱۱ "انقلاب اکتوبر کے مرکزی حکومت کے قدیم مسودات ۲۸/۳۰/۲۲۔۴۰۔ صفحہ ۳۵۔۳۴ ص ۳۲۶ س ۳

۱۲ ایضاً ۴/۸۴/۲۹۳ صفحہ ۹۷ ص ۳۲۶ سطر ۱۹

۱۳ جن مغربی ممالک کے اشتراکیوں نے "سوویٹ یونین کی ہی طرح اشتراکی ہونے پر اظہارِ شرمندگی کے لیے ۱۹۶۷ء تک انتظار کیا وہ اس نتیجے پر چالیس پینتالیس برس پہلے بخوبی پہنچ سکتے تھے۔ اس وقت روسی کمیونسٹ پہلے پیش رو اشتراکیوں کو تباہ کر رہے تھے۔ لیکن دوسرے کے دانت کی تکلیف پر کون کراہتا ہے۔ ص ۳۲۷ س ۲۹

۱۴ یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ زیونسٹوں (یہودی ملک پسند) کی اس فطری اور مہذب خواہش کو، کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کی پیروی کریں اور تین ہزار برسوں کے انتظار کے بعد پھر وہاں جمع ہوں کم از کم یوروپی اقوام کی مشترکہ تائید اور حمایت حاصل ہوگی۔ سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ کریمیا میں قومی گھر بنانے کی بات زیونسٹ تصور کی حقیقی شکل نہیں تھی اور شاید یہ اسٹالن کا مذاق تھا کہ اس نے میڈیٹرینین لوگوں کو جنگل کے کنارے واقع ورد بیڈین کو اپنا فلسطینِ ثانی بنانے کے لیے مدعو کیا سست رفتار خفیہ سازشیں تیار کرنے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا اور غالباً اس طرح کی دعوت اس جلاوطنی کی ریہرسل کی حیثیت رکھتی تھی جو ۱۹۵۳ء میں ان کے لیے اس نے دل ہی دل میں طے کر رکھی تھی۔ ص ۳۲۹ س ۲

۱۵ سائبیریا ۱۹۲۶ء میں ونگوفسکی کی شہادت۔ ص ۳۳۱ س ۲۵

دوسرا باب

۱ بعد ازاں جو کچھ ہوا اس کا تعلق متعلقہ موضوع سے نہیں ہے لیکن اپنے دور کے بارے میں ہمیں بہت پتہ چلتا ہے کچھ عرصے بعد ھوتی کو آرکیبل میں کام مل گیا۔ ایک دوسری بند "سامیز فیکٹری" میں جہاں وہ پھر دو تربیت یافتہ آدمیوں میں سے ایک تھا اور اس مرتبہ ان کے اوپر (ایک منیجر بھی تھا) اس کی پہلی سامیز فیکٹری محنت کش

طبقے کے لیے خطرہ ہونے کی وجہ سے بند کر دی گئی تھی اور یہ دوسری اس لیے بند کر دی گئی کہ مزدوروں کو اس کام کا علم نہ ہو سکے۔ وہ اس شمالی آب و ہوا میں حکمرانوں کو بھی طور پر کئی قسم کی مہنگی ساسیز فراہم کرتے تھے۔ بعض اوقات خود شونی علاقائی پارٹی کے سکریٹری کامریڈ آسٹرن کے گھر۔ جہاں لیبینک اسٹریٹ؛ چنبار وف۔ لوچکی اسٹریٹ سے ملتی ہے، وہاں ایک اونچی باڑ کی پشت پر ایک منزلہ مکان پر اور ضلع کے این۔ کے۔ وی۔ ڈی کے صدر کامریڈ شیروں کے یہاں سامان پہنچانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ص ۲۴۷ س ۱۹

(تیسرا باب)

۱ اگر شوہر کو بھی جلا وطن کیا جا رہا ہو تو وہ اپنی بیوی کے ہمراہ سفر نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ایک مستقل ہدایت تھی کہ سزا یافتہ خاندانوں کے افراد علیحدہ علیحدہ مقامات پر روانہ کیے جائیں۔ اس طرح جب کشینیف کے وکیل آئی۔ کے۔ گورنیگ کو زیونسٹ (یہودی حکومت کے حامی) ہونے کی وجہ سے کراسنویارسک علاقے میں بھیجا گیا تو اس کے کنبے کو سائبیریا پہنچایا گیا۔ ص ۲۵۰ س ۱۵

۲ اُسے بالائی سودیٹوں کے قانون جاننے کی ضرورت نہیں تھی اور قیدیوں کو بھی اس کی واقفیت نہیں ہونے دیتے تھے۔ مثلاً اس کی تعزیرات کی دفعہ ۳۵ کہتی ہے "جلا وطنوں کو خوراک لازماً دی جائے گی ورنہ اُجرت پر کام دینا ہوگا"۔ ص ۲۵۴ س ۲۸

۳ حصہ پنجم، پانچواں باب۔ ص ۲۵۹ س ۱

چوتھا باب

۱ اسٹالن "کارنامے" ماسکو ۱۹۵۱ء جلد نمبر ۱۳ صفحہ ۲۵۸ ص ۲۶۴ س ۱۷

۲ ۱۹۶۰ء کی ابتدائی دہائی میں صوبۂ تا بیریڈا کے مالکان آراضی اور انتظامیہ نے حکومت کو درخواست بھیجی کہ کریمیا کے تمام تاتاریوں کو نکال کر ترکستان میں ہانک دیا جائے۔ الگزینڈر ثانی نے انکار کر دیا ۱۹۴۲ء میں کریمیا کے گولیٹر نے یہی درخواست کی اور ہٹلر نے انکار کر دیا۔ ص ۲۶۷ س ۱۹

۳ یقیناً عظیم کمان دار بھی تاریخ کے تمام عجیب موڑ پہلے سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں تاتاری نوابوں اور دیگر اونچے لوگوں کو کریمیا سے نکال دیا گیا تھا۔ اس میں اتنی شدت نہیں برتی گئی جتنی روس میں انھیں گرفتار نہیں کیا گیا بلکہ از خود وسط ایشیا میں چلے جانے کی ہدایت کی گئی۔ وہ وہاں مقامی باشندوں میں جو خود مسلمان تھے اور ایک برادری کے تھے رفتہ رفتہ گھل مل گئے اور آرام کے ساتھ گزر کرنے لگے پھر پندرہ سال بعد تمام محنت کش تاتاریوں کو پکڑ کر اسی جگہ بھیج دیا گیا، پرانے شناسا پھر مل گئے محنت کرنے والے غدار اور جلا وطن تھے جب کہ ان کے سابق نوابین مقامی حکومت میں، سرکاری مشینری میں محفوظ ملازمتوں پر فائز تھے اور بہت سے پارٹی میں شامل تھے۔ ص ۲۶۸ س ۷

۴ یہ ایم۔ وی۔ ڈی کے ذہن ـــ جو کچھ وہ کر رہے تھے اس کے بارے میں کتنا سمجھتے تھے اور اس پر کس انداز میں سوچتے تھے؟ ماریا سومبرگ کو سائبیریا کے ایک سپاہی نے دریائے چلم سے بے دخل کیا تھا کچھ عرصے بعد وہ ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔ گھر گیا وہاں اس سے ملا اپنے حد مسرور ہو کر مسکرایا

اور پرجوش انداز میں اسے خطاب کیا ـــــ

"کیوں جی مجھے جانتی ہو!......" ص ۳۰۷ س ۳۰

۵ سومیالوف ٹیان شنسکی، "رشیا" (۱۹۱۴ء-۱۸۹۹ء) جلد سولہ ص ۳۴۷ س ۱۰

پانچواں باب

۵ل ۱۹۱۷ء کے اواخر میں واسیلیئیف عملی طور پر شعبۂ اصلاح آراضی کا سربراہ تھا۔ ص ۳۸۶ س ۶

۵ٹ پاویل سیبلوف (اسٹاک ہوم) جواب سوویٹ افسروں کے ذریعے گرفتار شدہ سویڈش باشندوں کے دیگر معاملات کا مطالعہ کر رہا ہے، اپنے بارے میں ای۔ اے۔ اینڈرسن کی بیان کردہ روداد کا تجزیہ کرنے کے بعد مندرجہ ذیل تاثرات کا اظہار کرتا ہے: اس کے چہرے سے اور جو نام بتایا تھا اس سے یہ بات زیادہ قرین قیاس نظر آتی ہے کہ ای۔اے۔ اینڈرسن ناروے کا تھا۔ وہ نامعلوم وجہ سے اپنے آپ کو سویڈ بتا کر کام چلانا چاہتا تھا۔ ۱۹۴۰ء کے بعد ناروے والے اپنے وطن سے اکثر بھاگ کر برطانوی فوج میں ملازمت کر لیتے تھے۔ اگرچہ ایسی ملازمت کرنے والے سویڈوں کی تعداد بہت محدود تھی۔ اغلباً ای۔ اے۔ برطانیہ میں کسی رابرٹسن کا رشتہ دار ہوگا۔ لیکن اس نے ایم۔ بی کی نگاہ میں اپنے آپ کو اہم ظاہر کرنے کے لیے اپنے عزیزداری جنرل رابرٹسن سے ظاہر کی۔ یہ بھی ناممکن نہیں کہ اس نے جنگ کے بعد مغربی برلن میں دوست ممالک کی خفیہ سروس میں کام کیا ہو جس کے باعث وہ ایم۔جی۔بی کی دلچسپی کا مرکز بن گیا ہو۔ وہ کسی برطانوی یا نارویجین یا کسی سویڈش ثقافتی وفد کے رکن کی حیثیت سے غالباً ماسکو گیا تھا (میرے خیال میں اس وقت ایسا کوئی سویڈش ثقافتی وفد وہاں نہیں گیا تھا) لیکن شاید اس وفد میں وہ ایک غیر اہم رکن رہا ہوگا۔ شاید ایم۔جی۔بی نے اسے دونوں طرف کا جاسوس بننے کے لیے کہا ہوگا اور غالباً اس پیشکش کو نامنظور کرنے کی وجہ سے اسے بیس سال کی سزا دے دی گئی ہو۔ ایرک کا باپ کوئی تاجر ہوگا لیکن اتنا بڑا نہیں جتنا کہ وہ ظاہر کرتا تھا۔ ایرک اکثر مبالغہ آرائی کیا کرتا تھا۔ دیگر امور کے علاوہ اس نے کہا کہ میرے والد کا امریکہ میں اثر تھا (اسی وجہ سے ایم۔جی۔بی نے اسے گریمیکو کو دکھلایا تھا) تاکہ ایم۔جی۔بی بھی دلچسپی لینے لگے اور اس طرح مغربی ممالک کو اس کی گرفت کا علم ہو جائے۔ ص ۳۸۹ س ۲۱

۵ٹ کئی برسوں کے بعد میرے ہاتھوں میں سوویٹ یونین اشتراکی جمہوریہ کے تعزیری قوانین آئے اور ان کی دفعہ ۱۵ میں، میں نے نہایت اطمینان کے ساتھ پڑھا کہ جلا وطنی کی سزا تین سے دس سال کی مدت کے لیے ہی دی جا سکتی ہے یا قید کے بعد پانچ سال تک کے لیے اضافی سزا کے طور پر دی جا سکتی ہے۔ یہ سوویٹ ماہرین انصاف کے لیے فخر کرنے کی بات ہے کہ ۱۹۲۲ء کے ضابطۂ تعزیرات کی آمد پر غیر متعینہ مدت کے لیے شہری حقوق کے خاتمے اور دیگر تمام سزاؤں کا سوویٹ آئین سے وجود ختم ہو گیا۔ سوائے اس سے کہیں زیادہ ہولناک سزا کے ـــ سوویٹ یونین کے علاقے سے مستقلاً باہر نکال دینا۔ اس معاملے میں سوویٹ اور یورژوا قانون میں اصول کا ایک اہم

فرق ہے"۔ (ملاحظہ ہو مجموعۂ مضامین "فرام دی پریزنس") یہ خواہ جیسا بھی ہو۔ لیکن ایم/ڈی/ڈی کی محنت بچانے کے لیے سب سے آسان چیز ہے کہ مستقل سزا لکھ دی جائے اس وقت تک خلتے کے نزدیک آنے والی سزاؤں پر نگاہ رکھنے اور اس فکر میں اپنا دماغ خراب کرنے کی ضرورت نہیں رہیگی۔ کہ ان سزاؤں کو دوبارہ جاری کرنے کی کیا ترکیب نکالی جائے! ص ۳۸۷ س ۲۵

۴ بے شک چھ ماہ بعد یہ کے۔جی۔بی کی شکل میں انھیں کارکنوں کے ساتھ واپس آگئی۔ ص ۳۹۰ س ۵

چھٹا باب

۱ میں پلیخانوف کی "روسی معاشرتی فکر کی تاریخ" کا حوالہ دے رہا ہوں۔ ماسکو ۱۹۱۹ء جلد اوّل، حصّہ دوم ص ۱۰۱۴ س ۹

ساتواں باب

۱ پانچ برس بعد دوست نے اس حرکت کے لیے اپنی بیوی کو قصوروار ٹھیرایا۔ اس کے دس سال بعد (۱۹۶۱ء میں) بیوی ضلع ٹریڈ یونین کمیٹی میں الیونیٹر کے پاس ساچی جانے کے لیے اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے آئی جو الیونیٹر نے دے دیا۔ بیوی نے اس وقت اس کی قدیم دوستی کا پرجوش تذکرہ کیا۔ ص ۴۱۸ س ۲۵

۲ آج کل اس نوع کی چیز باٹو دکی (غیر سیاسی مجرمین) کے ساتھ پیش آتی ہے۔ اے۔آئی۔ بلیرک انا نیف ضلعی پارٹی کے ہیڈ کوارٹر پر گیا "یہ کوئی روزگار دفتر نہیں ہے! شہری سوویٹ میں گیا: تمھیں انتظار کرنا چاہیے"۔ وہ پانچ ماہ بے روزگار رہا (۱۹۶۴ء)۔ (۱۹۶۵ء میں) انھوں نے نوخورد سیلک میں پی کے ریگورونٹ سے ایک عہدنامے پر دستخط کرائے کہ میں چوبیس گھنٹوں میں شہر چھوڑ دوں گا۔ شہر کی مجلس منتظمہ کو اس نے "بہترین کام" کے لیے کیمپ سے ملنے والا سرٹیفکیٹ دکھایا اور وہ ہنس پڑے۔ کمیٹی کے سکریٹری نے اسے باہر نکلوا دیا۔ وہ چلا گیا پھر کسی کو رشوت دی اور نوخوردشیک میں قیام جاری رکھا۔ ص ۴۲۰ س ۱۵

۳ نوجوان جج نے ساده لوح لڑکی سے ایک ریچ میں اپنے تمام چالیس کارڈ دکھانے کو کہا۔ ہر ایک پر اسی رسم الخط میں وہی جگہ کا مرض درج تھا اور پھر اس قسم کی بات بھی ہوتی تھی: تمہارا شوہر ایگزینڈر پیٹرووچ مالیا کو واشکوفسکی مقدمہ چلائے جانے سے قبل ہی وفات پا گیا۔ اس لیے اسے از سرنو آباد نہیں کیا جا سکتا"۔ ص ۴۲۴ س ۴

۴ جب ۱۹۶۵ء میں وہ کثیر تعداد میں باہر آئے تو ان کا نعرہ یہی تھا وہ اپنے ہمراہ چوتھی دہائی کی مسموم ہوا بھی لائے جیسے انھوں نے کوئی کچا پکا بھری ہوئی تجوری کھول دی ہو اور عین اس نقطے سے آغاز کرنے کی کوشش کی جہاں انھوں نے اپنی گرفتاری سے قبل چھوڑا تھا۔ ص ۴۲۵ س ۱۹

۵ جلد سوم، انیسواں باب ص ۴۲۷ س ۲۱

۶ سچائی کا تقاضہ ہے کہ میں یہ بھی لکھ دوں جو بعد میں رونما ہوا، وہ کولیما چھوڑ کر چلا گیا اور اس نے شادی کی جو المناک رہی اس کا ذہنی توازن غارت ہو گیا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس دلدل سے کس طرح نجات حاصل کرے۔

۷ اس کی بابت سچ ہی کہا گیا ہے کہ عوامی خواہش یار!" کے کچھ اراکین نے تو جلاوطنی میں حاصل شدہ آزادی کی بنیاد پر شہرت حاصل کر لی لیکن کرٹینووچ نے اپنی شہرت اشاعت کے کیمپوں کے بار برابر برقرار رکھی۔ گویا میں بھی اس نے لیکا گر زبان کا بھر پور مطالعہ نہ کیا۔ ص ۴۳۳ س ۲۶

حصۂ ہفتم

پہلا باب

۱ھ کیا یہ اوسپنسکی وہ شخص ہوتا ہے جس نے اپنے پجاری باپ کو قتل کر دیا تھا اور اس کی بنا پر کیمپوں میں عمدہ منصب حاصل کر لیا تھا۔ ص ۴۲۱، س ۲۲

۲ھ اس کا مطلب ہے سادہ لوح افراد جن کا پارٹی سے تعلق نہ تھا۔ اسیرانِ جنگ ص ۴۲۸، س ۱۵

۳ھ آپ حیران رہ جائیں گے!..... اس قسم کے لوگ آپ جیسے لوگوں سے زیادہ تھے! ص ۴۲۸ س ۲۵

۴ھ وہ کتنے بڑے مفکر تھے ویسے وہ اتنے پرسکون نہ تھے کہ وہ سب بار بار اظہارِ پشیمانی اور رحم کی درخواست کرتے ہوئے موت کے منہ میں گئے۔ ص ۴۲۸ س ۲۶

۵ھ زیلینیز نیاک کا دعویٰ ہے کہ اسے میں بھی یاد ہوں۔" وہ ہتھکڑیاں پہنے ہوئے آیا تھا اور گڑبڑ پیدا کرنے کے لیے بدنام تھا بعد ازاں اسے دو ویز کازگان بھیج دیا گیا اور وہی نیز کزنیٹسوت باغیوں کی قیادت کر رہے تھے۔" ص ۴۲۹ س ۱۰

۶ھ ہمیں کیا معلوم؟" ہم صرف احکامات کی تعمیل کر رہے تھے۔" ہمیں معلوم نہیں تھا۔" ص ۴۲۹، س ۱۸

۷ھ بے حد اہم اطلاع ہے۔ ص ۴۲۹، س ۱۸

۸ھ بالکل درست ــــ ان کا نام لیجن (ہزار) ہے وہ اتنی عجلت میں تھے کہ بائبل سے اپنا مناسب نام تلاش نہیں کر سکے۔ وہ یقیناً شیاطین کے لیجن تھے۔ ص ۴۲۹ س ۲۸

۹ھ ایک اور فرد جسے اپنی شناخت منظور نہیں کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ کس کو پتہ کہ اگلی مرتبہ ہوا کس رخ پر چلے گی۔ ص ۴۳۰ س ۲

۱۰ھ کاسیوکوف اور موچانسکایا "ایرانِ جیل" سوویتسکایا روشیا ۲۷ اگست ۱۹۶۰ء۔ سرکاری حلقوں کی ترغیب پر قلمبند کیا ہوا ایک مضمون جس نے مجمع الجزائر میں نرمی کے ایک مختصر دور (۱۹۵۵ء ـ ۱۹۶۰ء) کا اختتام کر دیا۔ مصنفین کی رائے میں کیمپوں میں پیدا شدہ حالات نے انھیں "خیراتی اداروں" کی صورت دے دی ہے۔ "تعزیر کو بھلا دیا گیا" قیدی اپنے فرائض نہیں سمجھنا چاہتے جب کہ انتظامیہ کے اختیارات قیدیوں کے حقوق سے کم ہیں" (؟) وہ ہمیں یہ باور کراتے ہیں کہ کیمپ "مفت غذا فراہم کرنے والے باورچی خانے" ہیں (کسی وجہ سے دھلائی، حجامت اور غسلخانوں کے لیے کوئی قیمت نہیں لی جاتی)۔ انھیں اس بات پر بہت غصہ آتا ہے کہ کیمپوں میں ہفتے میں صرف چالیس گھنٹے کام ہوتا ہے اور در اصل وہ کہتے ہیں۔" قیدی کام کرنے پر مجبور نہیں ہیں" (؟؟) وہ "سخت اور شدید حالات" کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ مجرم جیل سے خوف کھائیں (سخت مشقت، برہنہ تختے جن پر کوئی بستر نہیں ہوتا، شہری کپڑوں پہ پابندی،" مٹھائی فروخت کرنے والی دکانیں اب نہیں" وغیرہ) وہ قبل از وقت رہائی کا سلسلہ بھی ختم کرانا چاہتے ہیں (اور اگر کوئی شخص ڈسپلن کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے "میعاد سے زیادہ مدت تک جیل میں رکھنا چاہیے") اور وہ یہ سفارش بھی کرتے ہیں کہ "اپنی سزا مکمل کرنے کے بعد قیدی کو خیرات کے بھروسے پر نہیں رہنا چاہیے۔" ص ۴۴۳، ۲

۱۱ھ اس واقعے کا انجام بھی معلوم نہیں ہے۔ ص ۴۴۴ س ۱۷

۱۲ھ اس پر مقدمہ قائم کرنے کی بات نرمی ہے اور وہ ان الفاظ کا استعمال کرنے کو تیار نہیں۔ ص ۴۴۶، ۹

دوسرا باب

۱ دور کٹا کی غلاظت کے انبار پر، اور اس طرح چلا گیا جیسے عارضی شہرت۔ ص ۴۴۸ س ۱۲

۲ اور ہمیں وہاں نو بیا دہائی میں ایک میوزیم کھولنے کے امکان سے محروم کر دیا گیا۔ ص ۴۴۸ س ۲۷

۳ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر نرمی عام تھی۔ تعزیری کیمپ ڈویژن بھی برقرار رکھے گئے۔ جیسے براٹسک کے پاس اینڈزیا یوس "کل یونین تعزیری کیمپ" جس کا سربراہ اور زلاگ والا ہمارا پرانا دوست خونخوار کیپٹن مشین تھا۔ ۱۹۵۵ء کے موسم گرما میں وہاں خصوصی سزا کے لیے تقریباً چار سو قیدی تھے (جن میں منتو بھی تھا) لیکن وہاں بھی وارڈر نہیں، قیدی کیمپ کے مالک تھے۔ ص ۴۵۱ س ۱

۴ اگر وہ کام نہیں کرتے تھے تو رقم کہاں سے آتی تھی؟ اگر شمال میں یہ حال تھا۔ اور پھر ۱۹۵۵ء میں تو ٹیلی ویژن سٹ کہاں تھے؟ پھر بھی میں نے اسے گفتگو کے دوران ٹوکا نہیں۔ میں نے اس کی بات منہ سے لے کر سنی۔ ص ۴۵۱ س ۴

۵ ہم یہاں یہ بھی کہہ دیں کہ اس کا (اور سائنٹری اچھے برتاؤ کے لیے تخفیف" اور "قبل از وقت مشروط رہائی" کا): بیان پچھوف نے "مخالف" میں کیا ہے۔ جن قیدیوں کی درجہ بندی "اصلاح کی توقع ہے" کے تحت ہوتی تھی، انھیں گھر بنانے اور شادی کرنے کا اختیار تھا۔ ص ۴۵۱ س ۱۳

۶ اتفاقاً ۱۹۵۵ء کے آغاز میں ایک تجویز تھی کہ اندر بیٹھے ہوئے ہر ایک برس کے لیے ہرجانہ ادا کیا جائے۔ یہ سراسر قدرتی بات تھی اور اس قسم کی ادائیگی مشرقی یورپ میں واقعی کی جا رہی تھی لیکن اتنے طویل برسوں کے لیے نہیں! انھوں نے ان سب کا حساب لگایا اور گھبرا گئے "ہم حکومت کو تباہ کر دیں گے!" اس طرح انھوں نے دو ماہ کا ہرجانہ دینے کا تصفیہ کیا۔ ص ۴۵۲ س ۲۹

۷ ایس، کارادانسکی، "عرضداشت" سامزدات، ۱۹۶۶ء ص ۴۵۵ س ۲۷

۸ اے، مارچینکو "میری شہادت" سامزدات، ۱۹۶۷ء نیویارک مری، پی اوٹن ۱۹۶۹ء ص ۴۵۵ س ۲۷

۹ ان عادی مجرمین کی متنوع اقسام ہمارے تخیل کو تھکا دیتی ہے۔ مثال کے طور پر ٹانڈنسک کالونی میں ایک ستائیس سالہ آدمی ہے جو پہلے زار کی فوج میں اور غالباً پھر کسی "سفید فوج" میں بھی افسر تھا۔ ۱۹۶۲ء تک وہ اپنی دوسری بار کی بیس سالہ سزا کے اٹھارہ برس گزار چکا تھا۔ وہ فادر کرسمس جیسی ڈاڑھی رکھتا ہے اور دستانوں کی فیکٹری میں اکاؤنٹنٹ ہے۔ ہم یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ کیا اپنی جوانی کے نظریات کے لیے چالیس سال کی سزا پانا زیادہ قیمت ادا کرنے کے مترادف نہیں ہے؟ اور اس قسم کے کتنے بہت سے بدنصیب افراد ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نرالا ہے پہلے ہمیں ان میں سے ہر ایک کے بارے میں واقفیت حاصل کرنی ہوگی، اس کے ... ملہ کر سکیں گے جو ان پر تھوپ دی گئی ہے! ص ۴۵۹ س ۹

۱۰ لیکن مارچینکو ہمیں ایک نئے طریقے سے باخبر کرتا ہے۔ نرغے کو خراب ... مثلاً ص ۴۶۰ س ۲۳

۱۱ اور ابھی زیادہ آسانی سے کیوں کہ جیسا مارچینکو ہمیں مطلع کرتا ہے وہ اب مفرورین کو گرفتار کرنے کی کوشش نہیں کرتے سیدھے انھیں گولی مار دیتے ہیں! ص ۴۶۳ س ۷

تیسرا باب

۱ھ یہ کلاڈ کے تیار کردہ آئمن پلانٹولوف کے مجسمے کی جگہ پر تیار کی گئی تھی جسے فضول کہہ کر پگھلا دیا گیا تھا۔ ص ۴۶۷ س ۳

۲ھ رودسٹوف صوبائی پارٹی کمیٹی کا اول سکریٹری باسوف اور شمالی کاکیشین فوجی ضلع کا کمانڈر پلیف ان دونوں کے ناموں کا توصیفی کتبہ اجتماعی گولی باری کے مقام پر کسی دن نصب کیا جائے گا۔ اسی دوران نوفوچرکاسک میں یہ لوگ پہنچ گئے تھے دہشت کھا کر واپس رودسٹوف بھاگ گئے۔ (یہ بھی کہا جاتا ہے کہ باسوف دوسری منزل کے ایک چھجے پر کود کر ہی فرار ہونے کے قابل ہو سکا تھا) نوفوچرکاسک کے حادثات کے فوراً بعد وہ ایک وفد کے ساتھ مجاہد کیوبا میں گیا تھا۔ ص ۴۶۷ س ۷

۳ھ اس بیان کے مطابق جن فوجیوں نے مجمع پر فائر کرنے سے انکار کر دیا انھیں یا کوٹیا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ ص ۴۶۷ س ۳

۴ھ جو لوگ کافی قریب کھڑے ہوئے تھے وہ جانتے ہیں لیکن یا تو وہ مارے گئے یا انھیں بند کر دیا گیا۔ ص ۴۶۷ س ۶

۵ھ اس بات کی باوثوق شہادت موجود ہے کہ سینتالیس افراد محض ڈمڈم گولیوں سے مارے گئے تھے۔ ص ۴۶۷ س ۷

۶ھ سرمائی محل کے سامنے مردہ افراد سے کچھ کم لیکن تمام روس کو جنوری ۹ء سے چوٹ پہنچی تھی اور ہر سال اس کا یادگاری دن منایا جاتا تھا۔ ۲ رجون کا یوم ہم کب سے منانا شروع کریں گے؟ ص ۴۶۸ س ۱۲

۷ھ ۱۹۶۸ء میں ایک ٹرین میں اسکول کے اساتذہ نے اس طرح تصدیق کی "فوجیوں نے کسی کو گولی نہیں ماری۔ انھوں نے محض تنبیہ کے طور پر ایک ہوائی فائر کیا تھا۔ گولیاں تخریب کاروں نے چلائی تھیں اور ڈمڈم گولیاں بھی انھیں نے استعمال کیں یہ ان کے پاس کہاں سے آئیں؟ تخریب کار ہر چیز کہیں نہ کہیں سے حاصل کر لیتے ہیں۔ انھوں نے فوجیوں اور مزدوروں پر یکساں انداز میں گولی باری کی..... معلوم ہوتا ہے مزدور پاگل ہو گئے تھے انھوں نے فوجیوں پر حملہ کر کے انھیں پیٹا لیکن فوجی کیسے قصوروار ہوئے؟ بعد از کوپانوں نے سڑکوں پر گشت کیا اور یہ معلوم کرنے کے لیے لوگوں کے گھروں پر بھی گیا کہ وہ کس طرح رہتے ہیں۔ عورتوں نے اسے اسٹرابیریاں پیش کیں"۔ تاریخ نے مستقبل کے لیے یہ بات محفوظ کی ہے۔

۸ھ لیکن بے شک ہم نے اس پر دستخط امریکہ کے نیگرو لوگوں کی حمایت میں کیے تھے۔ ورنہ اس کا ہم سے کیا واسطہ؟ ص ۴۶۸ س ۱۶

۹ھ سو سال پہلے پاپولسٹوں کا ایک مقدمہ "۱۹۳ کا کیس" کہلاتا تھا۔ یا الٰہی! وہاں کس قدر شور و غل تھا! جذبات کتنے مشتعل ہوئے تھے۔ اس کا حوالہ نصابی کتب تک میں داخل پا گیا۔ ص ۴۷۳ س ۱

۱۰ھ ازولیٹیا ۲۴ رنومبر ۱۹۶۴ء ص ۴۷۶ س ۲۸

۱۱ھ ملاحظہ ہو انیٹیلی اسٹیپچکا "از کوزسٹ" (سوویٹ یونین کے وکیل سرکار کے دفتر کا جریدہ) نمبر ۱ جنوری ۱۹۶۲ء۔ اشاعت کے لیے ۲۰ دسمبر ۱۹۶۱ء کو روانہ کیا گیا صفحہ ۴۷-۴۳ پر گگورٹیف (گروزنوا) (جسے فاشسٹ جلاد کہتے ہیں) کا ایک مضمون ہے۔ اس میں مارولی پکھ جنگی مجرمین کے مقدمات کی رپورٹ ہے۔ مصنف نے گواہوں سے کی جانے والی جرح، کورٹ کے سامنے پیش کردہ مواد، ایک ملزم کا بیانِ صفائی (قاتل نے لاپرواہی سے جواب دیا) عوامی ردِ عمل اور وکیل کی تقریر کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس نے یہ رپورٹ بھی دی کہ سزائے موت ہوئی۔ اصل میں یہ تمام چیزیں بالکل ویسے ہی پیش آئیں جیسے درج کی گئی ہیں۔ لیکن ۱۲ جنوری ۱۹۶۲ء سے قبل نہیں۔ (ملاحظہ ہو پراودا بابت ۱۰ جنوری؟) جبکہ یہ جریدہ چھپ کر فروخت کے لیے آ چکا تھا (مقدمہ ملتوی کر دیا گیا تھا اور جریدے کو اس کی اطلاع نہیں تھی) متعلقہ نامہ نگاروں کو ایک ایک سال کی جبری مشقت کی سزا دی گئی) ص ۴۷۷ س ۱۹